ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری
RARE BOOK
DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

CALL NO. 168L-1.13
Accession No. 13449

Rare.
Call No. 810.08 Acc. No. 73449
168L1.13 23 FEB 1981

وَ مَنْ یُؤْتِ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْراً کَثِیْراً
البقرة (۲٦۹)

جسے حکمت و دانائی عطا ہوئی اسے بہت بڑی بھلائی مل گئی

تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند

تیرھویں جلد

علاقائی ادبیات مغربی پاکستان

(جلد اوّل)

مدیرِ خصوصی گروپ کیپٹن سید فیاض محمود

پنجاب یونیورسٹی، لاہور

جملہ حقوق بحق پنجاب یونیورسٹی محفوظ ہیں

طبع اول : ۱۹۷۱ء
تعداد : ایک ہزار
طابع : پنجاب یونیورسٹی
ناشر : گروپ کیپٹن سید فیاض محمود
مطبع : علمی پرنٹنگ پریس، ہسپتال روڈ ۔ لاہور

پاکستان وہند

کی

اسلامی تہذیب

کے

نام

اراکینِ مجلسِ منتظمہ

پروفیسر علاء الدین صدیقی	صدر مجلسِ منتظمہ
جسٹس ایس اے رحمٰن	ممبر
ڈاکٹر شیخ محمد اکرام	ممبر
کرنل مجید ملک	ممبر
سیکرٹری وزارت تعلیم حکومت پاکستان	ممبر
سیکرٹری فنانس صوبہ پنجاب	ممبر
گروپ کیپٹن سید فیاض محمود	ممبر

مجلسِ ادارت

پروفیسر علاء الدین صدیقی	مدیرِ اعلیٰ
گروپ کیپٹن سید فیاض محمود	مدیرِ عمومی

پہلی جلد	مقدمہ	مصنف	سید فیاض محمود
دوسری جلد	(عربی ادب ۷۱۲ء - ۱۹۷۰ء)	مدیرِ خصوصی	پروفیسر عبدالقیوم
تیسری جلد	(فارسی ادب ۱۰۰۰ء - ۱۵۲۶ء)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر وحید مرزا
چوتھی جلد	(فارسی ادب ۱۵۲۶ء - ۱۷۰۷ء)	مدیرِ خصوصی	پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشانی
پانچویں جلد	(فارسی ادب ۱۷۰۷ء - ۱۹۷۰ء)	مدیرِ خصوصی	پروفیسر وزیر الحسن عابدی
چھٹی جلد	(اردو ادب ۱۷۱۲ء - ۱۷۰۷ء)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر وحید قریشی
ساتویں جلد	(اردو ادب ۱۷۰۷ء - ۱۸۰۳ء)	مدیرِ خصوصی	پروفیسر سید وقار عظیم
آٹھویں جلد	(اردو ادب ۱۸۰۳ء - ۱۸۵۷)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمد
نویں جلد	(اردو ادب ۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر عبادت بریلوی
دسویں جلد	(اردو ادب ۱۹۱۴ء - ۱۹۷۰)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض مود
گیارھویں جلد	(بنگالی ادب ـ اول)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر سید علی اشرف
بارھویں جلد	(بنگالی ادب ـ دوم)	مدیرِ خصوصی	ڈاکٹر سید علی اشرف
تیرھویں جلد	(علاقائی ادبیات مغربی پاکستان ـ اول)	مدیر خصوصی	سید فیاض محمود
چودھویں جلد	(علاقائی ادبیات مغربی پاکستان ـ دوم)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
پندرھویں جلد	(علاقائی ادبیات ہند)	مدیرِ خصوصی	سید فیاض محمود
سولھویں جلد	(خلاصہ جملہ جلد ہائے ادبیات در انگریزی)	مؤلف	سید فیاض محمود

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند

تیرھویں جلد (علاقائی ادبیات مغربی پاکستان جلد اول)

فہرست مضامین

سندھی

پیش لفظ

تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ان فکری عوامل اور شعائرِ زندگی کی نشاندہی کی جائے جس سے اس برِصغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی زندگی اور معاشرتی اقدار کی تعمیر ہوئی۔ ادب سے مُراد یہاں ان خیالات و جذباتِ عالیہ کا مؤثر اظہار ہے جن سے قلب و نظر کی جلا ہوتی ہے اور جن سے انسانی زندگی بامعنی بنتی ہے۔ ایسے خیالات و تصوّرات جہاں ہمیں ادراک کی منتہیات کا راستہ دکھاتے ہیں وہاں رُوحانی تسکین کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ ان سے ہمارے ایّام بھی روشن ہوتے ہیں اور ہمارے لمحات بامُراد۔ ادب میں مذہب، تصوّف، فلسفہ، اخلاقیات، تاریخ، لسانیات، شاعری، افسانے، انشائیات، مکتوبات، ہر چیز شامل ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ جس جس زبان میں برِصغیر کے مسلمانوں نے اپنے رنج و مسرّت، اپنی فکر و نظر، اپنی اُمنگوں اور عزائم کو متجسّم کیا ہے، ان کے شاہپاروں اور ان کے مصنّفین سے اپنے ہم وطنوں اور باہر کی دُنیا کو رُوشناس کرایا جائے۔ تاکہ ہم پہچان سکیں کہ ہماری زندگی کس قسم کی تہذیب و ثقافت پر استوار ہے اور ہمیں اس بات کا مستقل احساس ہو جائے کہ مسلمانانِ پاکستان و ہند خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، شمال میں ہوں یا جنوب میں، ایک ہی ثقافتی رشتہ میں منسلک ہیں اور ایک ہی تہذیبی روایت کے علمبردار ہیں۔

محمد علاء الدین صدیقی

(پروفیسر علاء الدّین صدّیقی مدیرِ اعلیٰ)

تعارف

مسلمانوں کو اس برِ صغیر میں آئے ہوئے سوا تیرہ سو سال ہو چکے ہیں یہ اس لئے درست ہے کہ مکران ۲۳ھ میں فتح ہوگیا تھا۔ اس طویل عرصے کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ دور جو سلطان محمود غزنوی کی فتوحات پر ختم ہوا۔ یہ کوئی پونے چار سو سال کی مدت ہے۔ اس عرصے میں برِ صغیر کے شمال مغربی علاقوں پر عربی زبان و ادب اور عربی تہذیب و تمدن کا تسلط رہا۔ دوسرا دور کوئی پانچ سو سال کا ہے، جو غزنوی عہد اور "عہد سلاطین" پر مشتمل ہے۔ اس دور میں برِ صغیر "دار السلام" کہلایا اور تہذیبی طور پر ملتِ اسلامیہ کی عالمی وحدت کا رکن رہا۔ پانچ سو سالوں کے اس دور میں، جس کا آغاز محمود غزنوی کے ورود سے ہوتا ہے، فارسی ادب کا رواج ہوا اور فارسی زبان اظہار کا ذریعہ رہی۔ ویسے مغربی پاکستان کی سرزمین میں فارسی زبان اس عہد سے بھی پہلے پہنچ چکی تھی۔ بلکہ ملتان کے علاقے میں عام تکلمی زبان کی حیثیت[1] حاصل کر چکی تھی پھر تیسرا دور مغلیہ عہد ہے، جو ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک کی مدت پر محیط ہے۔ اس میں ملتِ اسلامیانِ پاکستان و ہند نئے تہذیبی اثرات سے روشناس ہوئی اور معاشرے میں فکری مد و جزر کارفرما رہا۔ اس دور میں افکار اور خیالات میں وسعت پیدا ہوئی، اور اگرچہ اعتقادات میں ایک حد تک تزلزل کے آثار نمایاں ہونے لگے، لیکن تخریب اور انتشار کے ساتھ ساتھ تعمیر کا عمل بھی جاری رہا۔ اس پوری مدت میں فارسی

---

[1] دیکھئے، چوتھی صدی ہجری کے ابن صاعد اندلسی کی تالیف "طبقات الاسلام"

کی ادبی اقدار ہماری تہذیبی زندگی کا محرک اور غالب عنصر تھیں۔ اس کے بعد مغربی تہذیب، اس کے اصول زندگی اور اس کے معاشی، سماجی اور معاشرتی افکار کی اشاعت ہوئی۔ چونکہ یہ دور نشر و اشاعت کا دور ہے، اور اس میں بعض وسائل فراہم ہونے سے تعلیم عوام تک پھیل گئی، اس لئے خیالات میں انقلاب پیدا ہونے لگا۔ اس ذہنی انقلاب نے کئی نئی صورتیں اختیار کیں اور اس کے نتائج آجکل ہماری خانگی، اجتماعی، سیاسی اور مذہبی زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ گذشتہ تین چار سو سال کی مدت میں اردو، بنگلہ اور دیگر زبانوں اور بولیوں کا علاقائی ادب بھی فنی پختگی کے ساتھ ساتھ حسنِ اظہار کا وصف پیدا کر چکا ہے۔

ادب میں معاشرتی اور تعلیمی عوامل منعکس ہوتے ہیں۔ زندگی کے تقاضے اظہار، احتجاج، طنز، شکایت، دعا یا الحاح کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس تاریخ ادبیات کا مقصد یہ ہے کہ ادب کو معاشرے کے ایک تقاضے کے طور پر پیش کیا جائے، تاکہ زندگی کے ہر رخ، قلبِ انسانی کی ہر کیفیت، روحِ کائنات کے ہر پرتو میں ہم آہنگی نظر آئے اور مسلمانانِ برِ صغیر کی پوری زندگی اور ان کی تہذیب کا جامع عکس، ملی وحدت کا مکمل ثبوت، ہر اس زبان اور اس کے ادب میں یقین آفریں انداز میں پیش ہو، جو یہاں بولی جاتی رہی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ہم جس تہذیبی ورثے کے مالک ہیں، وہ کتنا پائیدار ہے اور اس میں کتنی توانائی اور استقامت موجود ہے۔

اس تاریخ کی تدوین میں دو تین باتیں خاص طور پر ملحوظِ خاطر رکھی گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ کسی قوم کی تہذیبی اور ادبی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس قوم کی لسانی، ادبی اور معاشرتی سرگرمیوں کا پوری طرح اور ہمدردانہ انداز سے محاسبہ نہ کیا جائے۔ اس لئے ہم نے کوشش کی ہے کہ عربی، فارسی، ترکی، اردو، بنگلہ، پشتو، پنجابی، سندھی، کشمیری، بلتی، شینا، بروشسکی، کھوار، ہندکو، سرائیکی، بلوچی اور براہوی، غرض ہر اس زبان کے معاشرتی اور فکری پس منظر کی نشاندہی کی جائے، جو پاکستان میں بولی گئی ہے یا بولی جاتی ہے، اور جو ادبی تخلیقات اس ماحول سے ابھرتی ہیں، خواہ وہ ضرب الامثال ہوں یا لوک کہانیاں، گیت ہوں یا لوریاں، ان میں رزم، تصوّف، فکر اور عمیق جذبات کی ترجمانی ہو یا محض

تخفیفِ طبع کا سامان، سبھی کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ سے کر اپنی قوم کی ادبی تاریخ مرتب کی جائے۔ چنانچہ ہم نے زندگی کے ہر پہلو، زبان کے ہر انداز اور فکر کی ہر جہت کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے اس طرح یہ تاریخ کامل طور پر اور صحیح معنوں میں ہماری ثقافت کی آئینہ دار ہو جاتی ہے۔

علاقائی ادبیات میں خاص طور پر لوک ادب کا مقام بہت بلند ہے۔ اور ہم نے اسے ادب عالیہ کا ایک رکن تصور کیا ہے، اس لئے کہ ہر قوم کی ادبی تاریخ میں؛ لوک ادب ایک معنی خیز کردار ادا کرتا ہے۔ اکثر لوگوں کی زندگیاں اسی ادب کی اقدار سے متاثر ہوتی ہیں، اور اسی کے کردار علامت بن کر اُن کے محرک بنتے ہیں اور ان کے استعمال کا جواز پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ادبی تاریخ میں اس کا ذکر ضروری ہے۔

یہی حال ان مصنفین کا ہے، جو عام طور پر دوسرے درجے کے، یا بالفاظِ دیگر چھوٹے مصنف شمار ہوتے ہیں۔ یہ تو بدیہی امر ہے کہ کسی قوم کی رفعتِ فکر اور اسکی جذباتی بلندی صرف انہی مصنفین کے کلام یا تصانیف میں نظر آئے گی، جن کی نگاہ وسعت، بلندی اور گہرائی کے لحاظ سے روزمرہ کے تجربات کے حدود میں مقید نہ ہو، اس لئے کہ چھوٹے شاعر یا افسانہ نگار یا ناول نویس یا نثر لکھنے والے اپنے اپنے تجربے اور فنی کوشش کے دائرے میں محدود اور محصور ہوتے ہیں۔ مگر یہاں یہ بات نظر انداز نہیں ہونی چاہیئے کہ اس دائرے سے اچھی طرح واقف ہونے کے باعث وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو جن سے عام لوگوں کی زندگی عبارت ہوتی ہے، زیادہ توجہ سے قلم بند کرتے ہیں۔ ان کی نظر وسیع نہیں ہوتی مگر وہ روزمرہ کے تقاضوں اور زندگی کے عام مشاغل اور قلبی واردات کے سطحی تاثرات کو صاف طور پر بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں عام زندگی کی عکاسی عظیم شعراء یا مصنفین کی نسبت بہتر طریقے سے ہوتی ہے۔ اس لئے کسی قوم کی تہذیبی تاریخ مرتب کرتے وقت ان چھوٹے اہلِ قلم کی تخلیقات کا جائزہ لینا بھی اسی قدر ضروری ہوتا ہے جتنا ادبی عظماء کا۔ چنانچہ اس تاریخ میں یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اس طرح ہمارا خیال ہے کہ یہ تاریخ مسلمانانِ پاکستان وھند کی پوری ادبی زندگی کی ترجمان بن گئی ہے۔

مذکورہ مطالب کے حصول کے لئے ہر ادب کا ذکر کرنے سے پہلے اس کے سیاسی اور معاشرتی پس منظر کو سامنے لایا گیا ہے، تاکہ قارئین کو معلوم ہو سکے کہ جن لوگوں کے تاثرات اور خیالاتِ عالیہ کی ہم عکاسی کر رہے ہیں، وہ اپنی اجتماعی زندگی کن ضوابط، کن پابندیوں اور کن اصولوں کے تحت بسر کرتے تھے۔ اس بنا پر اس تاریخ ادبیات کو دراصل ملّتِ اسلامیانِ پاکستان و ہند کی تہذیبی تاریخ تصوّر کرنا چاہیئے۔

سید فیاض محمود

گروپ کیپٹن سیّد فیاض محمود
مدیر عمومی

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان

حصہ پشتو

پہلا باب

تعارف

پشتون یا پختون پاکستانی قوم کے وہ افراد ہیں جو پشتو بولتے ہیں۔ یہ لوگ پاکستان کے مغربی حصے کی شمال مغربی سرحد میں رہتے ہیں۔ پشتو بولنے والے اور لوگ بھی ہیں جو افغانستان میں مقیم ہیں۔ مگر ہمارا موضوعِ بحث پشتو بولنے والے وہ لوگ ہیں جو پاکستان کے باشندے ہیں۔ وضاحت کے لیے ہم انہیں پشتون کے عمومی نام سے ہی پکاریں گے۔ پشتو معاشرہ ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ پشتونوں کی روایات بھی دوسرے معاشروں سے الگ ہیں۔ پشتون سپاہی پیشہ مرد میدان ہیں اور جنگ و جدل ان کا قدیم وطیرہ ہے۔ مگر جب انہیں علم کا ذوق ہو یا جب وہ رشد و ہدایت سے بہرہ ور ہو جائیں تو ان جیسے راسخ الاعتقاد مسلمان دنیا میں کم ملینگے۔

پشتو کی جو حقیقی تعریف کی جاتی ہے اور اس کے جو اصطلاحی معنی بیان کیے جاتے ہیں وہ اکثر و بیشتر اسلامی اقدار اور اسلامی اخلاق و شعار پر مبنی ہیں۔ بہت سے لوگ پشتونوں کی زبان اور ان کے ادب اور ان کی تہذیب سے ناآشنا ہیں۔ کوئی انہیں خونخوار اور وحشی سمجھتا ہے تو کوئی جاہل و غیر مہذب۔ یہ اس لیے کہ ایک تو ہندوؤں نے پشتونوں کو ہمیشہ ہوّا مشہور کیے رکھا۔ اپنے بچوں تک کو "پٹھان" کے لفظ سے ڈراتے رہے۔ دوسرے بہ سبب سیاسی رقابت، کیونکہ وہ شروع ہی سے مغلوں کے حریف رہے۔ اس لیے اکثر تاریخ نے ان کے ساتھ منصفانہ سلوک نہیں کیا۔ بلکہ انہیں بدنام کیا گیا اور ناشائستہ اور نازیبا ناموں سے یاد کیا گیا۔ حتیٰ کہ ان کے حسب نسب اور اصل نسل کے متعلق بھی من گھڑت افسانے تراشے گئے۔ ان کے بعد رہی سہی کسر انگریزی عملداری میں پوری کر دی گئی۔ بلکہ عملاً پشتونوں کی ناکہ بندی کر کے ان کے درمیان جگہ جگہ ایسی سیاسی دیوارِ افتراق کھینچی گئی

اور منافرت و مناقشت کی ایسی خلیج حائل کی گئی کہ وہ آپس میں بھی ایک دوسرے سے بیگانے ہو گئے اور اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہو کر، بھائی بھائی کا اور بیٹا باپ کا مخالف بن گیا۔

مرورِ زمانہ سے اِن لوگوں کو جو برصغیر میں بستے تھے پٹھان کے نام سے تعبیر کیا گیا اور اٹھارویں صدی میں جب احمد شاہ ابدالی پہلا افغان بادشاہ بنا اور اس نے ایک قومی مملکت قائم کی اور اس ملک کو افغانستان کے نام سے پکارا گیا تو وہاں کے باشندوں کو افغان کہا جانے لگا۔ یاد رہے(۱) کہ یہ علاقہ قرون وسطیٰ میں اور ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ شمالی حصے کو تخارستان کہتے تھے اور جنوبی حصہ سجستان کے نام سے معروف تھا۔ پھر یہاں غزنی حکومت قائم ہوئی۔ اس وقت یہ علاقہ غزنوی شہنشاہیت کا جزو تھا۔ ان کے بعد غوریوں نے یہیں سے خروج کیا (۱۱۵۱ء-۱۲۰۶ء)۔ غوریوں کے بعد یہ علاقہ خوارزم شاہ کے زیر نگیں رہا (۱۲۰۶ء-۱۲۲۱ء)۔ اس کے بعد پچیس سال تک (۱۲۲۱ء-۱۲۴۶ء) منگولوں نے اس ملک پر حکومت کی۔ ۱۲۴۵ء سے ۱۳۸۹ء تک قرط لوگ اپنے پایۂ تخت ہرات سے اس علاقہ پر مسلط رہے۔ ۱۳۸۱ء سے ۱۳۸۹ء تک قرط امیرانِ ہرات امیر تیمور کو خراج ادا کرتے رہے۔ اس کے بعد یعنی ۱۳۸۹ء میں یہ سب علاقہ تیموریوں کے زیر نگیں آ گیا۔ کوئی سوا سو سال تک تیموری بادشاہوں نے (شاہ رخ، بےسنقر مرزا اور شاہ حسین بیقرہ) ہرات کو اپنا ایک مرکز اور بعد میں پایۂ تخت رکھا اور یہیں سے انہوں نے علوم و فنون، ادب اور ثقافت کی سرپرستی کی۔ ۱۴۹۴ء کے بعد شاہان تیموری ازبکوں کی یلغار کے سامنے پسپا ہونے شروع ہوئے اور سلطان ظہیرالدین بابر نے ماوراالنہر سے ادھر مراجعت کی اور اپنے رشتہ کے چچا کی وفات پر کابل کی حکومت پر اپنا تسلط جما لیا۔ سولھویں صدی کے شروع سے لیکر اٹھارویں صدی کے پہلے ربع تک یہ علاقہ مغلیہ سلطنت کا حصہ رہا۔ ۱۷۳۸ء میں اسے نادر شاہ نے فتح کیا اور ۱۷۴۷ء میں اس کی وفات پر اس کے جرنیل احمد شاہ ابدالی نے یہاں پہلی قومی سلطنت قائم کی۔

افغان قوم کی وجہ تسمیہ تو ظاہر ہے لیکن پشتو بولنے والی قوم اپنے آپ کو ہمیشہ سے پشتون کہتی چلی آ رہی ہے۔ حکومت مغلیہ اور انگلشیہ کی سرکاری درباری زبان میں انہیں افغان کہا گیا۔ لیکن ہندو اور پاک و ہند کے دوسرے باشندے سب انہیں پٹھان کے نام سے یاد کرتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے تعلیم و تربیت، زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کی فراہم کردہ تمام سہولتوں سے بڑی تندہی کے ساتھ استفادہ کیا ہے اور بالکل قلیل عرصے میں ان کی بڑی حد تک اصلاح

---

(۱) باقی کا پیراگراف میری ایزاد ہے.........مدیر عمومی

ہو گئی ہے ۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب کبھی پشتونوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو مؤلفین ، مصنفین و مضمون نگار ، قارئین و ناظرین تمام کا ذہن اکثر ان قبائلی پشتونوں کی طرف منعطف ہو جاتا ہے جو ایجنسیوں کے کوہستانی علاقوں میں بود وباش رکھتے ہیں اور ان کی نصف سے زیادہ آبادی جو اضلاعی باشندوں پر مشتمل ہے ، نظر انداز کر دی جاتی ہے ۔ یہ بات درست نہیں کیونکہ اضلاعی باشندوں کے بغیر پشتون قوم کا تصور نامکمل اور مبہم رہ جاتا ہے ۔

پشتون لوگ طبعاً آزادی خواہ اور آزادی پسند واقع ہوئے ہیں ۔ ان کے اس جذبۂ حریت پسندی کو دنیا کی جابر سے جابر شخصی طاقت بھی نہیں مٹا سکی ۔ صدیوں سے پشتونوں کو بیرونی حملہ آوروں سے سابقہ پڑتا رہا ۔ سب اسی علاقے سے آئے گئے ۔ مگر جس نے بھی کبھی ان سے تعرض کیا انہوں نے اُس کا جوانمردی سے مقابلہ کیا ۔ مگر پشتونوں کو اپنی طبیعت کی مناسبت سے صرف حکومت پاکستان کی تشکیل پسند آئی ۔ اس کے لیے انہوں نے بڑھ کر لبیک کہا ۔ چنانچہ پاکستان کے حصول و قیام اور بقا و استقلال کے لیے انہوں نے جو کچھ کیا اور حکومت سے جس غیر مشروط طور پر اپنی وفاداری کا اعلان کیا ، اس کا اعتراف خود قائد اعظم محمد علی جناح کے ان تاریخی الفاظ میں ملاحظہ ہو جو انہوں نے قبائلی علاقوں سے تمام سابقہ حفاظتی فوجوں کو واپس بلاتے ہوئے استعمال فرمائے :۔

”میں ان خدمات سے بخوبی واقف ہوں ، جو آپ حضرات نے قیام پاکستان کے سلسلے میں سرانجام دیں ۔ قیام پاکستان کے لیے جد و جہد اور جنگ میں آپ نے جس ہمدردی اور حمایت کا اظہار کیا ، اس کے لیے شکر گزار ہوں اور آپ کے اظہارِ وفاداری ، حمایت اور قول و اقرار کے پیش نظر ہم نے اپنی تمام افواج کو واپس بلا لیا ہے ۔ ہمارے اس اعتراف سے ظاہر ہے کہ ہم آپ پر مکمل بھروسا رکھتے ہیں “۔

الغرض وہ لوگ جن کی زبان اور جن کے ادب کی تاریخ ، تشریح اور تفصیل آئندہ اوراق میں پیش کی جا رہی ہے ، ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں اور انہیں اپنے پاکستانی ملت ہونے پر ناز ہے ۔

پہلا باب

اگرچہ ہمیں مسلمانان پاکستان و ہند کی ثقافتی اور ادبی تاریخ لکھتے ہوئے فقط پشتو زبان و ادب کی خصوصیات کا جائزہ ہی لینا چاہیے تاکہ پشتو میں رقم کردہ خیالاتِ عالیہ ، جذباتِ لطیفہ اور خواص و عوام کے قلبی اور ذہنی واردات کا منصفانہ محاسبہ ہو سکے ، مگر غالباً اس حقیقت کی نشاندہی سے پشتو ادب کی خصوصیات زیادہ

نمایاں ہو سکیں گی کہ پشتون جو اب پاکستانی قوم کا جزو لاینفک ہیں ، کہاں سے آئے اور تاریخ عالم میں انہوں نے قدیم زمانے سے کیا کردار ادا کیا ہے ۔

مسلمانوں کے کسی طبقے کے حسب نسب اور اس کی اصل نسل کے معاملے کو نہ تو مذہب کی رو سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور نہ سیاسی لحاظ سے ۔ کیونکہ اسلام نے ملک و وطن اور رنگ و نسل کی اونچ نیچ کو ہموار کیا اور کافہ المسلمین کے لیے جس بھائی چارے ، برادری یا اخوت و مواخات قائم کرنے اور بنائے رکھنے کی تاکید کی ہے ، وہ صرف ''انما المومنون اخوۃ'' والی برادری ہے ۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو پشتون مسلمان ہے ، قطع نظر اس سے کہ پہلے وہ کیا تھا ۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود طبقۂ انسانی میں شعوب و قبائل کا فرق و امتیاز اور لسانی اختلاف و تنوع کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی انسان کی فطرت میں اپنے ماضی کی تحقیق و دریافت کے لیے خواہش اور کھوج لگانے کی طلب ودیعت کر دی ہے ، اس لیے ہم اختصار کے ساتھ چند ایک نظریوں سے بحث کرینگے ۔

اس سلسلے میں جن تین نظریوں پر ذیل میں تبصرہ کیا جائے گا وہ یہ ہیں :—

اول یہ کہ پشتون بنی اسرائیل کے بارہ گم شدہ قبائل کی اولاد ہیں ، جنہیں بخت نصر نے بیت المقدس اور شام کا ملک فتح کرنے پر (۵۸۶ ق-م) دیگر یہودیوں کے ساتھ ملک بدر کر دیا تھا ۔

دوئم یہ کہ وہ بین الاقوامی آریا یا انڈو یورپین نسل کی ایک شاخ ہیں ۔

سوئم یہ کہ وہ آریاؤں کے خروج کے وقت بلھہ یا بلخ کے گردونواح میں متمدن زندگی بسر کرتے تھے ۔

اول : پشتون بحیثیت بنی اسرائیل ۔

خیال کیا جاتا ہے کہ جب بخت نصر نے ۵۸۶ ق-م میں بیت المقدس پر قبضہ کیا تو دیگر یہودیوں کے ساتھ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کو بھی ہجرت پر مجبور کیا اور یہ کوہستان غور میں آکر آباد ہو گئے ۔ بعد میں ان میں سے کچھ عربستان چلے گئے اور مکہ معظمہ کے قرب و جوار میں جا بسے ۔ ان قبیلوں کے جد امجد کا نام افغانہ تھا ۔ اس لیے اس کی اولاد کا نام بھی افغان ہی رہا ۔ افغانہ آرمیا کا بیٹا تھا اور آرمیا طالوت کا جو بنی اسرائیل کے نبی بادشاہ ہو گزرے ہیں ۔ یہ قبیلے نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی بعثت تک اپنے سابقہ مذہب پر قائم رہے ۔ ان روایات میں حضرت خالد کو بھی انہی افغان قبائل سے مانا جاتا ہے ۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں جس وقت حضرت خالد مسلمان ہو گئے تو انہوں نے اپنے اعزہ و اقربا کو جو

بہت عرصہ پہلے کوہستان غور میں آ کر آباد ہو گئے تھے ، اسلام قبول کرنے کی دعوت دی ۔ ادھر اعلانِ نبوت کا چرچا سن کر غور کے افغانوں نے ازخود بھی اپنے قبیلے کے چند بڑے بوڑھوں اور نمائندہ اصحاب کا ایک وفد ، قیس نامی سردار کی سربراہی میں اسلام کے مطالعے اور اسے سمجھنے کے لیے مکّہ مکرمہ بھیجا. حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس جرگے کو بطیب خاطر شرف باریابی بخشا اور انہیں دعوتِ اسلام دی ۔ جرگے نے اسلام قبول کیا، اس کے بعد حضورصلعم نے قیس کو اسلامی نام عبدالرشید سے خطاب فرمایا ۔ ان سب کو دعا دی اور واپسی پر کچھ عرب مبلغین ساتھ کر دیے ۔ تقریباً چالیس سال کے عرصے میں یہاں کے تمام قبائل مسلمان ہوگئے ۔ واپس آتے وقت حضرت خالد نے قیس عبدالرشید کو اپنی بیٹی نکاح میں دے دی ، جس سے عبدالرشید کو خدا پاک نے تین بیٹے دیے ۔ سب سے بڑے بیٹے کا نام سڑبن دوسرے کا نام بٹن اور تیسرے کا غورغشت رکھا گیا ۔ پھر قیس عبدالرشید کے ان تین بیٹوں کو خدا پاک نے اتنی زیادہ اولاد دی کہ ان میں سے ہر ایک بڑے بڑے قبیلوں کا جد امجد بن گیا ۔ سڑبن کے دو بیٹے ہوئے ایک کا نام شرخبون تھا اور دوسرے کا خرشبون۔ شرخبون کے پانچ بیٹے پیدا ہوئے جن سے ابدالی (درانی) ترین ، شیرانی اور کیتران (خطران) پیدا ہوئے اور خرسبون کی اولاد سے یوسفزئی ، محمدزئی ، خلیل ، مہمند، راودی اور گگیانی قبیلے بنے ۔ بٹن کی بیٹی سے جس کا شوہر ایک ایرانی تھا ، خلجی ، لودھی اور نتوری قبیلے چلے اور غورغشت کے تین بیٹوں سے کاکڑ ، وزیر ، محسود ، شیتک ، توری خٹک ، افریدی اور شنواری قبیلے بنے (۱) ۔

اگرچہ اس بیان میں بڑا اختلاف اور ابہام ہے ، پھر بھی تاریخ کی جتنی کتابیں اور نسب نامے دریافت ہوئے ہیں ، سب میں تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ یہی کچھ ملتا ہے ۔ حسب نسب کے تمام شجرے آج تک اسی بنیاد پر قائم ہیں ۔ انہی کی بنا پر بندوبست و مالیات کے معاملوں میں حقوقِ ملکیت تسلیم کیے جاتے ہیں اور مقدمات کے فیصلے کیے جاتے ہیں ۔

دوم

دوسرا نظریہ بہت بعد کا ہے اور یورپ اور افغانستان کے محققوں اور مؤرخوں کا قائم کیا ہوا ہے ۔ اس میں پشتونوں کا آریاؤں کی نسل کی ایک شاخ سے ہونا بتایا گیا ہے ۔ اس طویل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ دو ہزار سال ق۔م سے ایک ہزار سال ق۔م تک کے زمانے میں آریائی جماعتیں وسط ایشیا کے کوہستانوں سے نکل کر یورپ ، جنوب مغربی ایشیا کے ملکوں اور ہندوستان میں پھیل گئیں ۔ جہاں کے سابق باشندے زراعت کاری کا پیشہ اختیار کر کے متمدن

---

(۱) قاضی عطا اللہ پشاور ۔ پشتو تاریخ ۔ جلد ۱ ۔ صفحہ ۱۵ تا ۱۸ ۔

زندگی بسر کر رہے تھے (۱) ۔ آریا جب شمالی میدان اعظم سے اتر کر آنے لگے ، تو پہلے پہل سغدیانہ میں داخل ہوئے ۔ مگر یہاں کچھ دیر رہ کر وہ باختر اور اس کے جنوبی علاقوں میں آ بسے ۔ پھر بتدریج ان کے کچھ قبائل مغربی علاقوں کی طرف بڑھے ۔ کچھ ایران میں رہ گئے اور کچھ آگے چلے گئے اور بڑھتے بڑھتے یورپ کے شمال میں ، ادھر سائبیریا اور آگے فن لینڈ ، سکینڈے نیویا (ناروے ، سویڈن) اور پھر جرمنی تک پہنچ گئے اور ایک وقت میں انڈو یورپی ایرئین کہلانے لگے ۔ کچھ قبیلے کوہ ہند و کش کے دروں سے گزر کر سرزمین پاک و ہند کے شمال مغربی سرحدی علاقوں ، سندھ اور پھر آگے بڑھ کر پنجاب اور شمال میں دریائے گنگا کے کناروں تک پھیل گئے ۔ یہ انڈو ایرئین کہلائے۔ چنانچہ افغانستان اور شمال مغربی سرحدی علاقے کے یہی آریا اصلی پشتون ہیں ، جنہوں نے بعد میں اسلام قبول کیا اور مسلمان ہو گئے (۲) ۔

اس نظریے کے بیانات میں بھی زمان و مکان کے بارے میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے ، مگر بنیادی خیال ایک ہی ہے کہ پشتون آریا نسل کی ایک شاخ ہیں ۔

پشتونوں کے بنی اسرائیل ہونے کے متعلق ایک دو نظریئے اور ان کے ثبوت میں جو دلائل پیش کیے گئے ہیں ، ان کے نتیجے میں پشتونوں کو مختلف نام دیے گئے ہیں ۔ جیسے افغان اور اس کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں افغنہ ، اعوان ، اغبان، اوغان، اوگان، ابگان ، ایوکین اور اورگنہ وغیرہ نام لیے گئے ہیں ۔ پٹھان کے ساتھ بطان ، بتان ، بٹن ، بتان اور پسون کے لیے پشتبان اور پشتبوان کی کڑیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائی گئی ہیں ۔

ان دونوں دعووں میں سے پہلا نظریہ کہ پشتون بنی اسرائیل ہیں اور قدیم الایام سے یہاں آ کر بسے ہیں ، بہت دور از کار تاویلات کے ذریعے ثابت کیا جاتا ہے ۔ مگر اس میں خوش عقیدگی زیادہ ہے ۔ پشتونوں کے بنی اسرائیل یا آریا ہونے میں اتنے بڑے اختلاف کا سبب زیادہ تر یہ ہو سکتا ہے کہ پشتون چند سو سال سے افغان اور پٹھان بھی کہلانے لگے ہیں ۔ جس میں سے ایک نام عربی یا عبرانی ہے اور دوسرا ہندی آریائی ۔ بنی اسرائیل ہونے کی دلیل میں اس علاقے کی بعض بستیوں ، پہاڑوں ، دروں ، مختلف مقاموں ، آدمیوں اور بعض اشیا کے نام ایسے گنائے جاتے ہیں ، جیسے کوہ سلیمان ، تخت سلیمانی ، خیبر ، سردم ،

---

(۱) ۔ مرتضیٰ احمد خان، تاریخ اقوام عالم، ۱۹۵۸ء حصہ اول صفحہ ۱۷۰ - ۱۷۱

(۲) یہ عبارت خلاصہ ہے حسب ذیل کتابوں کے بیانات کا جو انہوں نے پشتونوں کو آریا نسل ثابت کرنے کے لیے دیے ہیں ۔ تاریخ افغانستان (احمد علی کہزاد ۔ جلد اول افغانستان (آریانا دائرۃ المعارف کابل) ۔ دپشتو ادبیاتو تاریخ (عبدالحئی حبیبی) ۔ پشتون تاریخ ار ماسی عطا اللہ اور پستانہ و تاریخ پہ رنڑا کے (بہادر شاہ ظفر) ۔ ان میں احمد علی کہزاد اور عبدالحئی حبیبی اولین محققوں میں ہیں جنہوں نے اپنے بیانات کی تاسیس سر تا سر یورپی محققوں کی تحقیقات پر کی ہے ۔ (مؤلف)

پشت ، غور ، موسیٰ خیل ، داؤد خیل ، قیس مسوری ، دشت لوط ، قلعہ یہودی ، بنیر سیبی ، درہ شکن اور تورہ ، کور اور ترخ وغیرہ جو عبرانی اور شامی زبان میں بھی پائے جاتے ہیں اور انہی معنوں میں مستعمل ہیں مگر یہ کوئی ایسی قوی دلیل اس لیے نہیں مانی جا سکتی کہ جب عرب اسلام پھیلانے نکلے تو وہ جہاں جہاں گئے وہیں کے ہو کے رہ گئے ۔ ان میں وطن پرستی کے خیال اور جذبے کو اسلام نے اپنی اولین ضرب یا اپنے انقلابی عمل ''ہجرت'' کے ذریعے ختم کر دیا تھا ۔ چنانچہ عربوں کے ساتھ ان گنتی کے چند ناموں کا آنا کوئی بعید ازقیاس بات نہیں ۔ پھر عربوں کو پشتونخواہ میں آئے ہوئے بارہ سو سال سے زیادہ ہو گئے ہیں ۔ یہی دلیل سنسکرت کے الفاظ کے لیے بھی پیش کی جا سکتی ہے ۔ للہذا پشتو میں سنسکرتی الفاظ کے پائے جانے سے یہ لازم نہیں قرار پاتا کہ پشتون آریا نسل سے ہیں ۔

ان دونوں دعوؤں میں ایک اور بنیادی کمی رہ جاتی ہے جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے ۔ بنی اسرائیلیوں کی بحث میں یہ امر قابلِ غور ہے کہ وہ بنی اسرائیل جو ظہورِ اسلام سے مدتوں پہلے اس علاقے میں رہ رہے تھے ، تعداد میں کافی ہونگے کیونکہ جس وقت ان کا وفد اسلام کی تحقیق کی خاطر قیس کی سربراہی میں عربستان جا رہا تھا تو اس میں مختلف قبیلوں کے اکابر شامل کیے گئے تھے ۔ مگر اسلام لے آنے کے بعد تمام پشتونوں کا سلسلہ ہزاروں اسرائیلیوں میں سے صرف ایک قیس عبدالرشید سے کیونکر لیا گیا ۔ باقی قبیلے کہاں چلے گئے ؟ اگر ساڑھے تیرہ سو سال میں ایک فرد سے ساٹھ ستر لاکھ کی جمعیت قائم ہو سکتی ہے تو ساتھ ہی ساتھ دوسرے ہزاروں افراد کی نسل یقیناً اربوں تک پہنچنی چاہیے ۔ ظاہر ہے کہ یہ استدلال صحیح نہیں ۔

دوسری دلیل ان کے بنی اسرائیل ہونے کی شکل و شباہت ، قد و قامت وضع قطع اور لباس میں مشابہت و مماثلت کی دی جاتی ہے ، مگر ثبوت میں صرف یوسفزئی قبیلوں اور بعض کشمیریوں کو پیش کیا جاتا ہے جو پشتونخواہ کے اس علاقے میں پہلے پہل بابر کے چچا مرزا اولغ بیگ کے زمانے میں قندہار سے کابل اور وہاں سے پندرھویں صدی عیسوی کے بالکل آخر میں ترک سکونت کر کے آئے ہیں ، اگرچہ ان کے آنے سے پہلے یہاں مختلف قبیلوں کے پشتون رہ رہے تھے ۔ ان کو سرے سے بنی اسرائیل ثابت کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی ہے ۔

اسی قسم کی دلیل پشتونوں کو آریا نسل سے ثابت کرنے کے سلسلے میں بھی دی جاتی ہے ۔ ایک جگہ ایرانی آریاؤں میں زرتشت کی مذہبی کتاب ژند آوستا کے حوالے سے بخد ، بخدے اور بختی وغیرہ جیسے نام سرزمین بلخ یا باختر اور وہاں کے قدیم باشندوں کے لیے

بیان کیے جاتے ہیں اور دوسری جگہ ہندی آریاؤں کی مذہبی کتاب رگ وید کے حوالوں سے اسی بلخ اور وہاں کے قدیم باشندوں کے لیے بلھہ ، بلھکا اور پکھت جیسے ناموں کا ذکر کیا جاتا ہے ، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جب آریاؤں نے پہلے پہل اس سرزمین میں قدم رکھا ، اس وقت انہوں نے بلھہ ، پکھت ، بخد یا بخدے کو آباد پایا ۔ یہ امر ہرگز موجب تعجب نہیں ہونا چاہیے(۱) ، کیونکہ تہذیب انسانی اس سے پہلے کئی ایک ادوار سے گزر چکی تھی ۔ سندھ وادی میں لوگ کوئی ساڑھے تین ہزار قبل مسیح میں ایک اعلیٰ متمدن زندگی بسر کرتے تھے ۔ دجلہ و فرات کی وادی کی سمیری تہذیب بھی اسی زمانے کی ہے ۔ مصر میں بھی چار ہزار قبل مسیح کی تاریخ ان کی عمارات سے صاف ظاہر ہوتی ہے ۔ حطی قوم ایشیائے کوچک میں دو ہزار قبل مسیح میں لوہے کے ہتھیار استعمال کرتی تھی ۔ جزیرہ کریٹ میں منوانی تہذیب دو ہزار سال قبل مسیح میں پرانی بھی ہوچکی تھی ۔ اس لیے بلخ ، بلھہ یا بخد میں کسی متمدن قوم کا آباد ہونا کوئی عجوبہ نہیں سمجھنا چاہیے ۔

ان تاریخی شواہد کے باوجود ان باختریوں کو آریا ہی بتایا جاتا ہے ۔ اگر پکھت یا بخد کے قدیم باشندے بھی آریا تھے تو پھر وہ لوگ کہاں چلے گئے جو آریوں کی آمد سے پہلے یہاں بس رہے تھے ؟ اگر یہ کہا جائے کہ جیسے آریوں نے ہندوستان میں آکر اپنے مقبوضہ علاقوں سے یہاں کے قدیم باشندوں (دراوڑوں وغیرہ) کو جنوب کی طرف دھکیل دیا تھا ، ایسے ہی باختر آکر وہاں کے سابق باشندوں کو بھی لڑ بھڑ کر نکال دیا گیا اور وہ لوگ جنوب میں آکر یہاں کی شمال مغربی سرحد کے پہاڑوں میں آ بسے تھے ، تو اس بات سے بھی پشتونوں کو آریا بتلانے والوں کے دعوے کی تردید ہی ہوتی ہے یا کم سے کم تائید نہیں ہوتی ۔ کیونکہ اگر باختر کی سر زمین سے بلھی یا پکھتی لوگ نکل کر یہاں آگئے تو آریا پھر بھی نہیں ہوئے ، کیونکہ اسی وید کے حوالے سے یہاں کے قدیم الایام سے رہنے والے چار قبیلوں کا نام بھی لیا گیا ہے ۔ جیسے آپارتی اور داریکی وغیرہ ۔ بہر حال پشتونوں میں مختلف قبائل کی مختلف جداگانہ خصوصیات ، وضع قطع ، رنگ روپ ، خدو خال اور قد و قامت کو دیکھکر یہ سراغ لگانا ضروری ہے کہ اتنے تنوع و تفرق کے ساتھ پشتو زبان میں سنسکرت ، عربی ، آوستا ، پہلوی ، ترکی اور فارسی (جدید) وغیرہ الفاظ کی اس قدر بھاری آمیزش کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں ؟ چنانچہ اس بحث کے سلسلے میں دو ایک اساسی امور بھی قابل ذکر معلوم ہوتے ہیں(۲) ۔ محققین و ماہرین کا ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ نوع انسانی کی پیدائش و ظہور کا اولین گہوارہ وسط ایشیا کا خطہ ہے ، جس میں ان کی نسو و ارتقا ہوئی ۔ جہاں سے وہ قریب و بعید کے اطراف و اکناف میں پھیلے اور

---

(۱) ذاتی کہ پیراگراف مدیری اضافہ ہے ۔۔ مدیر عمومی

(۲) پشاور ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۹۸-۱۸۹۷ع ۔ صفحہ ۵۴ ۔ ''یوسفزئی'' دوسرا باب

مختلف خطوں میں بس کر الگ الگ شکلیں ، جدا جدا رنگ اور علیحدہ علیحدہ نام اختیار کر گئے اور اپنی بولیاں بدلیں (۱) ۔ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پشتون بھی اصل میں اسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے ، بلکہ یہ بات بھی واضح کی جائے گی کہ خانہ بدوش آریائی قبائل سے پہلے یہ لوگ متمدن یعنی شہری زندگی اختیار کر چکے تھے ۔

سوم :

ارتقائے بنی نوع انسان کے سلسلے میں قبل التاریخی دور کو دو حصوں میں تقسیم کر لینا چاہیے ۔ ایک عہدِ حجری یا پتھر کا زمانہ ، دوسرا عہد برنجی یعنی دھات کا دور ۔ ان میں حجری یا سنگی عہد کے عرصے کا اندازہ پانچ لاکھ سال کیا جاتا ہے ۔ اس قبل التاریخی دور میں محققین کے قیاس و تخمین کے مطابق عرصہ دراز تک ، کرۂ ارضی پر انسانی زندگی ، ہر جگہ ، قریب قریب ایک ہی ڈھب پہ گزری ہے ۔ نہ ان میں ملکی و قومی اختلافات ابھی رونما ہوئے تھے ، نہ یورپ و ایشیا اور امریکہ اور افریقہ کی تفریق تھی اور نہ لال پیلے ، گورے اور کالے کا امتیاز تھا ۔

اس وقت انسان کی ضرورت و احتیاجات لے دے کر پیٹ پالنا تھیں ۔ چونکہ قدرت نے اسے ہمہ خور بنایا ہے ۔ یعنی وہ حیوانی اور نباتی دونوں غذائیں یکساں کھا سکتا ہے ، اس لیے وہ ٹولیوں کی شکل میں صرف خوراک کی تلاش میں ادھر ادھر پھرتا رہا ۔ پھر ایک زمانے کے بعد زمین کے بدلتے ہوئے طبعی حالات کے اقتضا کے مطابق ، یہ شکاری انسان دو تین قسم کے گروہوں میں منقسم ہوگئے ۔ ایک گروہ ویسے ہی حیوانات کے شکار پر گذر بسر کرتا تھا ۔ اسکیمو لوگ آج تک شمالی منجمد منطقے میں اسی قدیم طریقے پر زندگی گذار رہے ہیں ۔ دوسرے گروہ نے حیوانات کا شکار کرتے کرتے ان میں کچھ کام کے جانور پہچان کر انہیں پالنا شروع کیا اور وہ پالتو جانوروں کے دودھ اور ان کے گوشت و پوست پر اپنی گزر اوقات کرنے لگا ۔ اس دوسرے گروہ کو اپنی ضرورت کے لحاظ سے سرسبز و شاداب زمینوں اور ہری ہری چراگاہوں کی تلاش رہنے لگی ۔ جہاں اچھا کاہستان دیکھا وہیں رہ پڑے ۔ معلوم ہوتا ہے آریا اسی دوسرے گروہ کے لوگ ہیں ۔ وہ اپنی اصلی زاد بوم اور اپنے ابتدائی طبقۂ انسانی سے الگ ہو کر وسطی ایشیا کے بالائی حصوں میں جا بسے تھے ۔ تیسرا گروہ وہ تھا جو اپنی قدیم مرزبوم سے کہیں باہر نہیں گیا ۔ یہیں رہ کر اس نے ترقی کی اور زراعت اختیار کرکے مدنیت و عمرانیت کی بنیاد رکھی ۔

اس دورِ زراعت کے متعلق علمائے عصر جدید نے بڑی چھان بین اور عرصے کی

---

(۱) مرتضیٰ احمد خان ۔ تاریخ اقوام عالم ۔ حصہ اول ص ۔ ٦٦ ، ٦٧ ۔

تحقیقات کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ انسان کو جہاں سب سے پہلے اناج (گیہوں) ملا ، وہ زرخیز ہلال کا خطہ ہے -

علمائے تحقیق کے اندازے کے مطابق ، اس ہلال نما زرخیز خطے میں جو صحرائے عرب کی قوس‌نما شمالی سرحد کے اوپر خلیج فارس سے لے کر بحیرہ روم اور قلزم کے شمالی بازوؤں تک پھیلا ہوا ہے ، جیسے دجلہ ، فرات اور اردن کی ندیاں سیراب کرتی ہیں اور جس کے شمال میں ایشیائے کوچک کی سطح مرتفع کا سلسلہ کوہستان طورس اور مشرق میں ایران کا سلسلہ کوہستان زیگراس واقع ہے ، زراعت کاری کی ابتدا دس ہزار سال ق-م میں ہوچکی تھی اور دجلہ و فرات اور اردن کی وادیوں میں زراعت پیشہ انسانوں کی بستیاں آباد ہونے لگی تھیں اور آٹھ ہزار سال ق - م تک اس خطے کا زراعتی تمدن بہت کچھ ترقی کر چکا تھا -

نقشے میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوہستان زیگراس کا سلسلہ ، جو مذکورہ بالا دور کے متمدن علاقے کی حد بنلایا جاتا ہے ، ایران میں قریب قریب وسطی علاقے تک پہنچتا ہے - غالباً بعد کے دو تین ہزار سال میں یہی متمدن طبقۂ انسانی ، آہستہ آہستہ پھیلتا ہوا باختر قدیم تک جا پہنچتا ہے -

اس وقت کا باختر ، علاقہ بھی تھا اور شہر بھی - اس کے بالائی مغربی علاقے میں خشک ریگستان بھی تھا اور پاس ہی دریائے آمو بہتا تھا - دریائے آمو کی وادی آباد و سرسبز اور شاداب علاقہ بھی تھی ، جو اپنی آبادی ، سرسبزی و زرخیزی کے باعث جاذب و پرکشش تھی اور اونچے اونچے(۱) جھنڈوں والی سرزمین کا علاقہ کہلاتی تھی - یہاں کے اونٹ ، گھوڑے ، گدھے اور دلبے بہت مشہور تھے - عرصۂ دراز تک بعض قومیں کھنچ کھنچ کر یہاں آتی رہی ہیں اور اس علاقے پر قبضہ جمانے کی خاطر ایک دوسرے سے برسرپیکار رہی ہیں - غالباً اسی سبب سے تقریباً دو ہزار سال ق-م میں جس وقت شمالی میدان اعظم سے آریا نقل مکانی کرکے آئے تو سب سے پہلے انہوں نے اس علاقے کو منتخب کیا اور پہلے پہل یہیں پڑاؤ ڈالا -

باختر(۲) کو آریوں نے ولہہ یعنی بلہہ (بلخ) بھی کہا ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کو قدیم الایام سے بلخ بھی کہتے آرہے ہیں - کیونکہ "بھیکا(۳)" نام وید کے حوالے سے دیا گیا ہے ، اگرچہ اکثر جغرافیہ دانوں اور مؤرخوں نے لکھا ہے کہ باختر

---

(۱) عبدالحئی حبیبی- تاریخ ادبیات پشتو -

(۲) ایم-ایم- ولیمز- سنسکرت انگلش ڈکشنری - صفحہ ۷۲۴ - کالم ۲ -

(۳) عبدالحئیؒ حبیبی - تاریخ ادبیات پشتو -

کو بعد میں بلخ کہا جانے لگا ۔ عرب مورخوں (۱) نے باختر کو ام البلاد یا ام القریٰ (مادر شہر ہا) لکھا ہے ۔ مختلف ناموں سے باختر کا ذکر پہلے رگ وید (الف اول ق-م) میں، پھر آوستا (چھٹی صدی ق-م) میں اس کے بعد یونانیوں کی تاریخ (پانچویں صدی ق-م) میں، چینی سیاحوں کے سفر ناموں (۴۰۰ء) میں، اور عرب مؤرخوں کی تاریخوں (۹۰۰ء) میں ہوا ہے۔ گویا بلخ کا نام بتلانے والا سب سے قدیم ذریعہ رگ وید ٹھہرا ۔ ویسے بلخ یا باختر کو رگ وید(۲) اور آوستا میں بخد یا بخدے بیان کیا گیا ہے ۔ یہ دونوں مذہبی مقدس کتابیں آریوں نے لکھی اور مرتب کی ہیں ۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ آریوں کی آمد سے پہلے اس علاقے (باختر) کا ایک علیحدہ نام تھا اور یقیناً اس میں اونچے اونچے جھنڈوں والی متمدن قوم آباد تھی ۔ یہاں بمطابق ان متذکرہ بالا شہادتوں کے بلہہ، بلہیکا، پکھت، پکھتی، بخد، بخدی، پشت، پشتی، پکتو اور پکتویک، پشتان اور پشتیں وغیرہ کے نام سے ایک قوم بستی تھی، جو بہ سبب زراعت پیشہ ہونے کے، بمقابلہ آریوں کے زیادہ منظم اور متمدن تھی ۔ آریا(۳) جو پہلے پہل ہمالیہ کے اطراف میں بندھیا چل تک بس گئے تھے، چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں شبانی زندگی بسر کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے انہوں نے ملک پر بتدریج چڑھائی کی ۔ اس قدیم زمانے میں وہ صرف اجرام سماوی اور قوائے فطرتی کی پرستش کرتے تھے ۔ ان میں نہ تعمیر کا فن تھا نہ بت تراشی کا ۔ ان کی کتابوں میں کہیں پتہ نہیں لگتا کہ انہوں نے کسی جگہ پتھر کا مندر یا قصر تعمیر کیا ہو ۔ یہ لوگ چراگاہوں کے کنارے خیموں میں رہتے تھے ۔ آگ (اگنی) کی پوجا کرتے تھے ۔ سوما یا ہوما بوٹی رگڑ کر پیتے تھے اور آگ پر اس کا رس چھڑکتے تھے اور بھجنوں میں انہی چار پانچ چیزوں کے گن گایا کرتے تھے ۔

ایسے(۴) ہی ایران قدیم کے آریوں کا حال تھا ۔ وہاں بھی اسی آگ کی پرستش کی جاتی تھی اور ایک خدا کا تصور ابھی ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا ۔

---

(۱) لغتا مہ دہ خدا ۔ ایران ۔ ب صفحہ ۱۶۸ ۔

(۲) رگ وید میں پکھت کا ذکر ماخوز از ”پشتو ادبیاتو تاریخ“، عبدالحئی حبیبی، مطبوعہ عمومی مطبع، کابل ۱۹۴۲ء ۔ ص ۲۷ ۔ بحوالہ رگ وید ۔ انگریزی ترجمہ ۔ مترجم ۔ رالف ٹی، ایچ، گرفتھ

(الف) جلد دوم ۔ صفحہ ۱۷-۱۸ ۔ ساتواں حصہ گیت ۱۸ ۔ فرد ۶، ۷

(ب) جلد دوم ۔ صفحہ ۱۵۳ ۔ آٹھواں حصہ ۔ گیت ۲۲ ۔ فرد ۔ ۱۰

(ج) جلد دوم ۔ صفحہ ۲۶۰ آٹھواں حصہ ۔ گیت ۔ ۱

(د) جلد دوم ۔ صفحہ ۳۶۵ ۔ دسواں حصہ ۔ گیت ۔ ۶۱

(۳) ڈاکٹر گستاولی بان ۔ تمدن ہند ۔ اردو ترجمہ سعید علی بلگرامی ۔ طبع دوم لاہور ۔ صفحہ ۱۸۱ ۔

(۴) سرپرسی سائیکس، ہسٹری آف پرشیا، ۱۹۵۱ء، ص ۹۶ ۔

ژند آوستا میں آریاؤں کے ابتدائی حالات یوں بیان کیے گئے ہیں - ''آریا قوم(۱) کے لوگ آریا نیم وایجو (آریوں کا گھر) میں بودوباش رکھتے تھے جو شمالی سرزمین میں واقع ہے - دیوتاؤں نے انسان کے لیے جو اچھی چیزیں پیدا کیں ، ان میں ایک آریا نیم وایجو بھی تھا - لیکن تاریکی کے مظہر (بدی کی طاقت) نے اس سرزمین کو برف کے باعث ناقابل سکونت بنا دیا - آریا لوگ جنوب کی طرف حرکت کرتے ہوئے ، سغدیانہ اور مرگیانہ (سغدیانہ اور مورا) کی سرزمین میں آگئے (جنکو بخارا اور مرو سمجھنا چاہیے) - سغدیانہ انہیں ٹڈی دل اور دسمن قبائل (شمالی سرزمین کے تورانی) کے حملوں کے باعث چھوڑنا پڑا اور وہ اونچے جھنڈوں والی سرزمین بخدے (بلخ) میں چلے گئے - بخدے سے وہ نسایا (نشاپور ، اشک آباد) میں پہنچے - یہاں سے ایک ساخ ہاردیہ (ہرات) کی طرف اور دوسری شاخ وائیکرتیا (کابل) . خوشگوار (۲) سایوں والی سر زمین کی طرف چلی گئی - کابل کی شاخ کے بعض قبیلے اردہویتی (اراشو) ہائیتو مند (ہلمند) اور ہپتا ہندو (سپتا سندھو ، سات دریاؤں کی سرزمین) کی طرف ہجرت کر گئے اور بعض قبیلوں نے شمال مغرب کی راہ لی اور اروا (طوس) وئیر کانا (گورگان) ، رہا (رے) اور وانیا (گیلان) میں آباد ہو گئے ''-

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آریا جس شمالی میدان اعظم سے ترک سکونت کر کے آئے وہ وہاں کی سرزمین کو اپنے نام کی نسبت سے آریا نیم وایجو یا آریانہ ویجہ کہتے تھے - یہ الفاظ دیگر آریا ، آریا نیم وایجو کو جو ناقابل رہائش ہو گیا تھا ، بخدے (بلخ). نیشاپور ، ہرات ، کابل ، ہلمند ، طوس ، گورگان ، رے ، گیلان اور ستا سند ھو (یعنی دو دریا سرحدی علاقے کے اور پانچ دریا سندھ اور پنجاب کے) میں آ کر پھیل گئے -

سپتا سندھو میں آبسنے والے آریوں نے جب سروع میں یہاں اپنا قبضہ جما کر تسلط قائم کر لیا تو اس مقام کا نام آری ورس رکھ دیا (سنسکرت میں ورش اس خطہ کو کہتے ہیں جسے پہاڑوں کے سلسلے نے دوسری زمین سے علحدہ کیا ہو) اور اپنے اس نئے قائم کیے ہوئے نظام حیات کا نام آری ورت رکھا - ورت کہتے ہیں اسباب معاش و معیشت اور نان نفقے کو اور ورتنان کے معنی ہیں زیست اور بودوباش کے قاعدے یعنی ضابطہ حیات -

یہی آریا جب ایران میں مستقل طور پر بس گئے تو گو بہت بعد میں ، مگر وہاں کا نام ایران اور آریا سہر رکھا گیا اور بقول افغانستانی مؤرخوں کے ، کابل کے علاقے کو

---

(۱) تاریخ اقوام عالم ، ص ۱۷۵ - ۱۷۶ - نیز دیکھیے ہسٹری آف پرشیا - جلد اول، ص ۹۷ ، ۱۹۶۳ع -

(۲) سائیکس نے کابل کی سرزمین کے متعلق "The land of Noxious Shadows" کے الفاظ نقل کیے ہیں یعنی مضر سایوں والی سرزمین

آریانا کہا جانے لگا ۔ بالفرض اگر یہ نیا دعویٰ مان بھی لیا جائے تب بھی یہ کہیں نہیں ثابت ہوتا کہ انہوں نے باختر ، سغدیانہ اور کابل وغیرہ کا نام بھی آتے ہی بدل کر اپنے نام پر رکھ لیا ۔ بلکہ باختر یا بلخ کو اپنے ہجوں کی مناسبت سے آوستا اور سنسکرت دونوں زبانوں میں ان کے قدیم ناموں سے ہی یاد کیا گیا ہے اور بعد میں یونانیوں نے بھی اپنی تاریخ میں پشتونوں کا ذکر تمام دوسرے آریائی قبائل سے جدا ان کے اپنے اصلی نام یعنی پکتی سے کیا ہے ۔

رگ وید اور ژند آوستا کے بعد قدیم اور اہم تاریخ ہیروڈٹس یونانی (۴۸۴ق - م سے ۴۲۴ق - م) کی ملتی ہے ۔ جس سے پشتونوں کے متعلق معقول طریقے سے استفار اور اس کے بیان کردہ واقعات پر غور کرنے سے ایک ٹھوس اور پختہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے ۔ اس لیے تقریباً تمام مغربی محققین و مؤرخین نے ہیروڈٹس کی تاریخ سے حوالے دیے ہیں ۔

یہاں (۱) ہیروڈٹس کی تاریخ کے چند اقتباسات دیے جاتے ہیں ، جن میں اس نے داریوس اعظم کی سلطنت یا مملکت کی وسعت ثابت کرنے کی خاطر ان اقالیم کا ذکر کیا ہے جو داریوس اعظم کی باج گزار تھیں :-

۱- ہیروڈٹس - باب چہارم - ۴۴

''ایشا کا بیشتر حصہ داریوس نے دریافت کیا ۔ یہ جاننے کے لیے کہ دریائے اندوس جو گھڑیال پیدا کرنے والے ایک اور دریا کو چھوڑ کر واحد دریا ہے جو اپنا پانی سمندر میں کسی جگہ انڈیلتا ہے ، اس نے بہت سے ایسے آدمی بھیجے جن کی صداقت پر اعتماد کیا جاسکتا تھا اور ان میں کاروانڈا سکولیکس بھی شامل تھا ۔ یہ لوگ شہر کسپاتوروس اور پکتویک کے ملک سے روانہ ہوئے اور دریا کے بہاؤ کے ساتھ مشرق کی طرف دریائی راستے سے سمندر کی طرف چلے ۔ پھر وہ مغرب کی طرف مڑ گئے اور تیس ماہ کے سفر کے بعد اس مقام پر پہنچے جہاں سے مصر کے بادشاہ نے لیبوا (افریقہ) کا چکر لگانے کے لیے فوئینشیوں کو بھیجا تھا ۔ یہ سفر ختم ہونے پر داریوس نے ہندیوں پر فتح پائی اور ان کے علاقے میں سمندر کو اپنے استعمال میں لایا" ۔

۲- فصل سوم - ۱۰۲

''ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہندی ہیں جو کسپاتوروس شہر اور پکٹویس ملک کی سرحدوں میں آباد ہیں ۔ یہ لوگ دوسرے ہندیوں کے مقابلے میں شمال کی جانب اور شمالی ہوا کی سمت میں آباد ہیں اور ان کی بودوباش کے طریقے قریب قریب باختریوں جیسے ہیں ۔ وہ تمام ہندیوں میں سب سے زیادہ جنگجو ہیں ۔''

---

(۱) سر اولف کیرو، دی پٹھانز (اردو ترجمہ) ص ۴۵ ۔

۳- فصل سوئم - ۹۱ -

"ستاگودے اور گنداریوئے اور داریکے اور اپارتے نے ، جنہیں آپس میں ملا کر ایک ہی شمار کیا گیا تھا ، ۱۷۰ ٹیلنٹ ادا کیے - یہ ساتویں اقلیم تھی" -

۴- فصل سوئم - ۹۳-

"پکتویک اور آرمینیوں سے ۴۰۰ ٹیلنٹ وصول کیے گئے یہ تیرھویں اقلیم تھی" -

۵- فصل ہفتم - ۶۶-۶۷ - (کیخسرو کی فوج کی تفصیل بتاتے ہوئے) :-

"گنداریوئے اور داریکے بھی ہر لحاظ سے باختریوں کی طرح مسلح تھے -
پکتو پوستین کے لبادے پہنے ہوئے تھے اور اپنے ملک کی کمان اور خنجر سے مسلح تھے"

۶- فصل اول - ۱۲۵-

"سیگار تیوئے جو خانہ بدوش ہیں ، -

۷- فصل ہفتم - ۸۵ -

"خانہ بدوش قبیلہ جو سیگارتیوے کے نام سے مشہور ہے - یہ ایک ایسی قوم ہے جو فارسی بولتی ہے اور لباس کے اعتبار سے نصف ایرانی اور نصف پکتوان ہے ، جس نے فوج کو آٹھ ہزار سوار فراہم کیے" -

ان اقتباسات میں پکتویک ، پکتویس ، پکتو اور پکتوان کے نام سے ایک ایسی قوم کا پتہ چلتا ہے جو لباس اسلحہ اور جنگجوئی کے لحاظ سے باختری یا باختریوں جیسی بتائی گئی ہے - ساتھ ہی اس کے ، چار قبیلے ، ستاگودے ، گنداریوئے ، داریکے اور اپارتے ہیں ، جو قریب قریب ایک جگہ رہتے ہیں - یہی چار قبیلے ویدوں میں بھی بیان کیے گئے ہیں مگر ان کے لیے خود آریوں نے یہ کہیں نہیں کہا کہ یہ آریوں کی شاخیں ہیں یا آریہ قبیلے ہیں -

محققوں کا خیال یہ ہے کہ "یہ چار قبیلے حسب ذیل ہیں :-

(۱) گنداریوے(۱) : یہ نام(۲) رگوید ، مہابھارت اور ہندوؤں کی دوسری پرانی کتابوں میں گندھار اور گندھاری اور گندہرو بیان کیا گیا ہے - یہ ان لوگوں کا نام ہے جو گندہار یعنی وادیٔ پیشاور میں رہتے تھے - ویدوں میں اس طبقے کی بڑی تعریف کی گئی ہے کہ یہ روحانیین ہیں ، کیونکہ سوما (ہوما - ہومالمجوس) بوٹی کے محافظ ہیں -

---

(۱) بہادر شاہ ظفر - پشتانہ د تاریخ پہ رنڑا کے - صفحہ ۸۸ سے ۹۴ تک
(۲) سنسکرت انگلش ڈکشنری

(۲) اپارتے یا اپاریتی یا اپاروتی : ان کے متعلق اکثر علما کا یہ خیال ہے کہ یہ لوگ سفید کوہ کے دامنوں میں رہتے تھے ، اور یہ موجودہ افریدی قبیلوں کے آباواجداد تھے ۔

(۳) ستا گودے یا ستا گیدی : یہ اس علاقے کے باشندے بتلائے جاتے ہیں ، جو کابل سے ہرات اور سرہل سے ہلمند کے درمیان واقع ہے ۔ ان کا ذکر ہیروڈٹس ، بطلیموس بلکہ عیلامیوں اور بابلیوں نے بھی کیا ہے ۔

(۴) داریکے : مورخ سیڑابو نے انہیں دردی اور بطلیموس نے دارادری کے نام سے یاد کیا ہے۔ احمد علی کہزاد (مؤلف تاریخ افغانستان ۔ کابل) کے قول کے مطابق یہ داریک ، ''تاجیک'' ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ ژند آوستا میں ''داکیو'' زراعت پیشہ کو کہتے ہیں ۔ ہوسکتا ہے کہ دہقان نام بھی اسی داکیو سے نکلا ہو ۔ بعض کے(۱) خیال میں یہ لوگ موجودہ دیگان قبیلے سے متعلق ہیں جو پشتونوں کے عزیز ہیں اور زمانۂ قدیم سے انہی کے عرف ، عادات اور لباس میں شریک مانے جاتے ہیں ۔ ان کا کام زراعت اورگاؤں کی سربراہی اور سرپنچی تھا ۔

مندرجہ بالا کوائف سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ پشتو بولنے والی قوم کے لیے پٹھان کا لفظ بھی استعمال ہوتا آیا ہے اور افغان کا بھی ۔ ان میں ''پٹھان'' قدیم نام ہے اور آج تک افغانستان کے پشتونوں کو چھوڑ کر باقی پوری قوم کو اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف لفظ ''افغان'' بھی کم پرانا نہیں ، یہ بھی پشتونوں کے لیے مخصوص چلا آرہا ہے اور صدیوں سے کتابوں میں جملہ پشتونوں کے لیے اور افغانستان کے باشندوں کے لیے بالتخصیص بولا جاتا ہے ۔

پشتونوں میں اسلام کی اشاعت

اس میں شک نہیں کہ پشتونوں میں اسلام ایک دم نہیں پھیلا ۔ کیونکہ ورود اسلام کے وقت پشتون قبائل وسیع و عریض کوہستانی اور میدانی علاقوں میں رہتے تھے ۔ اور یہاں صرف پشتون یعنی پشتو بولنے والے قبائلی ہی نہیں تھے ، بلکہ یہاں یہودی ، زرتشتی ، بدھی اور براہمنی یعنی اصنام پرست جیسے کئی مذاہب کے لوگ موجود تھے۔ ایسے ہی یہاں باختری (پشتو) ، پہلوی (فارسی) ہندی اور سنسکرت جیسی کتنی ہی زبانیں بولی جاتی تھیں ۔ اس وقت(۲) ایران میں یزدگرد سوم کی حکومت تھی ۔ جب عربوں نے ایران

---

(۱) مقالہ محمد امین خوگیانی ۔ کابل مطبوعہ مجلہ سہ ماہی پشتو ۔ (پشتو اکیڈیمی) بنام ''افغان'' ۔

(۲) پشتو مقالہ ، حافظ محمد ادریس ، ہندوکش اور خیبر کے گرد و نواح میں اسلام کیسے پھیلا ، پشتو کورس کی کتاب برائے جماعت یازدہم و دوازدہم ۔ صفحہ ۲۱۶ - ۲۱۷

فتح کیا اور یزدگرد سوم شکست کھا کر بھاگ گیا تو اس کی تلاش میں صحابہ کرام مشرق ایران اور قندھار تک گئے بلکہ پہاڑی علاقوں اور تنگ و تیرہ دروں میں بھی گھس آئے ۔ پشتونوں نے نہ ان کا مقابلہ کیا اور نہ ان کی مزاحمت کی ۔ اس طرح عرب اس علاقے میں گھوم پھر کر واپس چلے گئے ۔ پھر حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں جب اسلامی حکومت کی سرحدات کو خطرہ لاحق ہونے لگا ، تو انہوں نے ۶۵۱ء/۳۱ھ میں حضرت عبداللہ بن عامر کو یہ علاقہ فتح کرنے کے لیے بھیجا ۔ انہوں نے تھوڑے عرصے میں نیشاپور ، ہرات ، کرمان ، سیستان ، بلخ ، غور ، غرجستان اور سرو فتح کر لیے اور سلطنتِ اسلامیہ کی مزید توسیع کی ۔ ان کے بعد ۶۶۴ء/۴۴ھ میں بہ عہد حضرت امیر معاویہؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ کابل کی طرف آئے ۔ انہوں نے سجستان اور مکران کے علاقے فتح کیے اور اسلامی سلطنت کی سرحد کو ہندو برہمن ریاست سے بھڑا دیا ۔

انہی دنوں حضرت مہلب بن ابی صفرہ ، پہلی دفعہ نامانوس راستوں سے ہوتے ہوئے ، کوہ سیاہ کے تنگ دروں سے نکل کر لڑتے بھڑتے بنوں پہنچ گئے ۔ یہاں ایک زبردست جنگ کے بعد دشمن کو سر کر کے بنوں پر بھی فتح حاصل کر لی ۔ اس طرح ہجرت کی پہلی صدی ابھی آدھی بھی نہیں گذری تھی کہ عربوں نے کابل ، لمغان ، جلال آباد اور پشاور کو چھوڑ کر دیگر علاقے فتح کر لیے تھے ۔ کہیں کہیں انہوں نے اپنی حکومتیں بھی قائم کیں اور کہیں مقامی ریاستیں رہنے دیں ۔ یہ مجاہدین یا تو صحابی تھے یا تابعین ، جو اکثر حضور (صلعم) کی صحبت بابرکت سے فیضیاب ہو چکے تھے اور نہایت عابد، زاہد و متقی تھے ۔ قران و حدیث پر عمل پیرا تھے ۔ جہاں جاتے اپنے قول و فعل و کردار سے لوگوں کا دل موہ لیتے ۔ تبلیغ اور نیکی کی تلقین و ہدایت ان کا مشغلہ تھا ۔ لوگوں کو درسِ اخلاق دیتے ۔ اسلامی تہذیب سکھاتے ۔ ان کی روحانی پرورش کرتے ۔ اس طرح لوگ جو شخصی حاکموں کے جور و استبداد کے ہاتھوں خستہ حال اور دوسرے خودساختہ ادیانِ باطلہ کی بیجا سختیوں اور پابندیوں کے باعث تکلیف میں تھے ، اسلامی انس و اخوت اور آزادی و مساوات کے گرویدہ ہو جاتے اور شوق سے اسلام قبول کر لیتے ۔ اس کے علاوہ عرب جہاں جاتے ، فتوحات کے بعد اکثر وہیں رہ پڑتے اور آہستہ آہستہ وہاں اسلام پھیلا کر مقامی لوگوں سے رشتے ناطے کر لیتے ۔

کابل(۱) میں ابھی تک کوشانی خاندان کے جانشین حکمران تھے ، بلکہ سرحد و پنجاب تک کی سرزمین انہیں کے زیر اقتدار چلی آرہی تھی (چینی سیاح ہیووان سانگ نے کوشانی بادشاہوں کو ''کشتری'' لکھا ہے) ۔ ۸۲۵ء/۲۱۰ھ میں ان بادشاہوں نے صفاری عرب حکمرانوں کے حملے سے تنگ آ کر کابل کی راجدھانی چھوڑ دی اور الک کے

---

(۱) تاریخ اقوام عالم ۔ صفحہ ۳۷۹ ۔

شمال میں ایک مقام ویہند کو (جو آج کل ہنڈ کہلاتا ہے) اپنا مرکز بنا لیا - ۸۵۰ء میں ایک برہمن وزیر نے اس خاندان سے حکومت چھین لی اور برہمن شاہی خاندان کی بنیاد رکھ دی - ۹۰۰ء تک کے زمانے میں عمرو لیث صفاری نے سیستان (زابلستان) کی سر زمین سر کی اور اس کے ایک فوجی افسر فروعان نے لوگر (مشرقی افغانستان) کا علاقہ فتح کر کے وہاں کے بڑے سندر کو مسمار کر دیا۔ ۹۳۳ء میں ہرات کے سامانی خاندان کے ایک جرنیل الپتگین نے جو کبھی سامانی بادشاہ کا ترک غلام تھا، صفاریوں کے حاکم سے کابل، لوگر اور سیستان کے علاقے چھین لیے اور اس طرح اس کی حدود پنجاب اور صوبہ سرحد سے مل گئیں، جہاں کے برہمن بادشاہ جےپال سے اس کی لڑائی شروع ہو گئی۔ جےپال ویہند کو مرکز بنا کر حکومت کر رہا تھا - لمغان (موجودہ جلال آباد) کا صوبہ بھی اس کی سلطنت کا حصہ تھا - الپتگیں کے جانشین امیر سبکتگین کی جے پال سے مٹھ بھیڑ ہو گئی اور جے پال کو شکست ہوئی - چونکہ اس نے موعودہ تاوان دینے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے اگلے سال سبکتگین نے اس پر حملہ کیا اور اسے پھر شکست دی - سبکتگن کے بعد اس کے بیٹے سلطان محمود غزنوی نے پشاور کے قریب جے پال کو پھر شکست دی اور جے پال نے پے درپے شکستوں سے رنجیدہ ہو کر خودکشی کرلی - سلطان محمود نے چند ہی سالوں میں سرحد اور پنجاب کا علاقہ فتح کر لیا - اب اس سارے علاقے میں اسلام جاری ہوا اور جلد ہی پھیلنے لگا - اندازہ ہے کہ یہاں مکمل طور پر اسلام کوئی چار سو سال کے عرصے میں پھیلا ہے -

یہ تو ظاہر ہے کہ چشمۂ اسلام سے سیراب و فیضیاب ہو جانے کے بعد، عربوں نے ساری دنیا میں علوم و فنون کو رواج دیا - جس ملک میں گئے پہلے خود وہاں کی زبان سیکھی، پھر اسی مقامی زبان کے ذریعے انہیں عربی کی تعلیم دی - پشتون بھی جوں جوں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، اسلامی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور ہوتے گئے - یوں بھی شریعت و طریقت، فلسفہ و ادب اور اقتصادیات و سیاست جیسی اسلامی تعلیمات کے ذریعے، جو عربی میں تھیں، دوسری زبانوں پر عربی کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ پشتو میں بھی عربی کے علمی و فنّی اسما و افعال اور اصطلاحات و محاورات شامل ہونے لگے - یہاں تک کہ چوتھی صدی ہجری یعنی دسویں صدی عیسوی کے آخر تک پشتو میں، کہیں فارسی کی وساطت سے اور کہیں براہ راست، عربی کے بے شمار الفاظ شامل ہو گئے جو امیر کروڑ (۷۵۶ء) کے پشتو کلام اور چوتھی صدی ہجری یعنی دسویں صدی عیسوی کے شعرا کے کلام کا موازنہ و مقابلہ کرنے سے بہ خوبی معلوم ہو جائینگے - ان کا بالوضاحت بیان اگلے ابواب میں اپنے موقع پر آئے گا -

دوسرا باب

پشتو زبان

پشتو زبان کی ابتدا یا آغاز کے متعلق تو جیسے بابِ ما سبق میں بیان کیا جا چکا ہے، یہی بات صحیح ہے کہ پشتو بولنے والے پاکستانیوں کی زبان اتنی ہی قدیم ہے جتنے یہ لوگ۔ مگر ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ آیا پشتون شروع سے یہی پشتو بولتے آرہے ہیں ، یا یہ زبان ، سنسکرت یا آوستا کی طرح بعد میں بنی ہے۔ جہاں تک زبان کے نام سے اندازہ لگایا جاسکتاہے، وہ یہ ہے کہ جب سے اس کے بولنے والے پشتون کہلائے ، تب ہی سے ان کی بولی بھی پشتون کہلائی ہوگی۔ جیسا کہ عربوں کی زبان عربی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعد کے مختلف ادوار میں ایسے اور زبانوں سے سابقہ پڑتا گیا ہو اور باہمی تعلقات کی بنا پر اس میں دوسری زبانوں کی آمیزش ہوتی گئی ہو۔ یہ معاملہ ہر زبان کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ کوئی زبان بھی ہمیشہ اپنی جگہ جوں کی توں قائم نہیں رہ سکی۔ زبان تو ذریعہ اظہار ہوتی ہے۔ بولنے والے جہاں ، جس ماحول اور جس حال میں ہونگے ، زبان بھی وہی کچھ بتلائیگی یعنی خود بھی وہی صورت اختیار کر لیگی۔

ماہرینِ لسانیات نے دنیا بھر کی زبانوں کا جائزہ لے کر انہیں چند بڑے بڑے خاندانوں میں منقسم کر دیا ہے۔ منجملہ ان کے ایک خاندان انڈویورپین زبانوں کا ہے۔ ان سب زبانوں کی ماں (ام الالسنہ) اس زبان کو سمجھا جاتا ہے جو ۲۰۰۰ سال (ق۔م) کے قریب میں وسطی ایشیا کے میدانوں میں بسنے والے قبائل کی ابتدائی زبان تھی۔ ایک طرف اس کی شاخیں پہلوی ، آوستا ، فارسی، سنسکرت اور پھر ان سے نکلی ہوئی، برصغیر پاک و ہند کی دیگر علاقائی زبانیں ہیں۔ دوسری طرف لاطینی ، یونانی ، فرانسیسی روسی ، ہسپانوی ، اطالوی اور ارمنی وغیرہ ہیں۔ چونکہ ہر دو جانب ، یعنی ہند اور یورپ کی مذکورہ بالا زبانوں کے گروہوں میں ابتدائی الفاظ اور اسما آپس میں بہت حد تک ملتے جلتے ہیں اور کافی مشابہت رکھتے ہیں ، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ یہ زبانیں ایک ہی قبیلے سے چلی اور پھیلی ہیں۔ ہماری غرض یہاں اس ام الالسنہ سے ہے جو ۲۰۰۰ سال (ق۔م) میں ، وسط ایشیا کے متمدن قبیلوں میں بولی جاتی تھی۔

باب گزشتہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ باختر میں آریوں کی آمد سے پہلے پکتئی ، بخدی یا پکتوان کے نام سے ایک قوم رہتی چلی آرہی تھی ، جو متمدن تھی اور اس کی اپنی ایک زبان تھی ۔ اگرچہ اس زبان کا کوئی علیحدہ نام ابھی تک کسی نے متعین نہیں کیا اور نہ کسی نے اس کی ایسی واضح اور بیّن نشاندہی کی ہے، لیکن عام قاعدے کے مطابق جیسے پکتئی قبیلے کی سر زمین کا نام پکتویک یا پکتیکا (پشتونخواہ) تھا ، ایسے ہی ان کی زبان کا نام لازماً پکتو (پختو یا پشتو) ہونا چاہیے ۔ یعنی پکتیکا کے پکتوان ، پکتو بولتے تھے ۔ اس سلسلے میں فقط ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔ اس لیے کہ دوسرے محققین بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں ۔

پروفسر میکس مولر ، ''علم الالسنہ'' جلد اول کے صفحہ ۱۹۴ پر لکھتے ہیں :
''..... جب سنسکرت نے اپنا اصلی اور مناسب مقام حاصل کر لیا اور لوگوں میں یہ خیال عام ہوگیا کہ ایک وقت میں یقیناً ایک ایسی زبان ہوگی جو یونانی ، لاطینی اور سنسکرت سے بہت پہلے بولی جاتی تھی اور جس نے کہ ان زبانوں اور ساتھ ہی ٹیوٹانک ، کیلٹک اور سوانک شاہنائے زبان کے لیے زینہ تیار کیا، یا وہ ان سب میں بطور اساس شامل ہے تو یہ ساری زبانیں اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی مناسبت سے درست ثابت ہو جائینگی'' ۔

ان کا خیال یہ ہے کہ تمام قدیم انڈویوروپین زبانوں میں سے خود ایک زبان بھی ایسی نہیں جسے ام الالسنہ یعنی زبانوں کی ماں کہا جا سکے ۔ یہ سب زبانیں آثار و قرائن سے آپس میں بہنیں ثابت ہوتی ہیں ، جن کے لیے ایک ماں کا ہونا ضروری ہے ۔ چنانچہ اس قسم کی ام الالسنہ کے وجود کو اس کی ضرورت و اہمیت کو بطور ایک مفروضہ تسلیم کر لینے کے بعد یہ تمام محققین یہاں ایک دم رک جاتے ہیں اور صرف یہ کہ کر اپنا عجز اور اپنی لاچاری ظاہر کر کے فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ بولی اب بالکل مفقود و معدوم ہو چکی ہے ۔

البتہ مسٹر والز کنیڈی اور ان کے دو تین دیگر ہم خیالوں نے اپنی طویل بحث و استدلال کے ذریعے بڑی کوشش کی ہے کہ وہ سنسکرت کو قدیم ترین زبان یعنی ام الالسنہ ثابت کریں ۔ مگر بعض مقامات پر کچھ دقتوں اور پیچیدگیوں کو دیکھ کر انہیں بھی اپنے استدلال میں ٹھوس بنیادوں کے فقدان بلکہ کسی قدر خامی کا احساس ہونے لگتا ہے ، جس کے بعد ان کے آگے بھی یہی ایک سوال حائل ہوتا ہے ، کہ اگر سنسکرت وہ زبان نہیں تو پھر کوئی دوسری زبان ضرور ایسی ہو گزری ہے جس کی سنسکرت مصفا شکل ہے ۔ چونکہ سنسکرت کے معنے ہی مصفیٰ کے ہیں ، اس لیے ماہرین لسانیات کی رائے ہے کہ وہ ویدک زبان کی ایک صاف شدہ شکل ہے ۔ مگر ہمیں

اس بات پر بھی غور کرنا ہے کہ آریاؤں کی جنوب کی طرف ہجرت (انتقال مکانی) کے وقت جو زبان بلخ کے علاقے میں بولی جاتی تھی وہ بھی ایسی ہی قدیم ہو سکتی ہے ، جیسی وہ زبان جو آریاؤں کے وسط ایشیائی مستقر میں زمانہ قدیم میں استعمال ہوتی تھی ۔

اس سلسلے میں اب صرف دو شہادتیں مزید پیش کی جاتی ہیں ۔

۱ ۔ سرمونیئر ۔ مونیئر ولیمز اپنی سنسکرت ڈکشنری (مطبوعہ ۱۸۹۰ء ، ۱۹۵٦ء آکسفورڈ یونیورسٹی پریس) کے دوسرے پیش لفظ میں لکھتے ہیں "۔۔۔۔ مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ آرین ، یعنی آریائی نام کے تحت کون کون سی زبانیں شامل کی جا سکتی ہیں ؟ میرا جواب یہ ہے کہ آریائی زبانیں ، جن میں سنسکرت سب سے بڑی بہن ہے اور انگریزی سب سے چھوٹی ، ایک عام مشترک لیکن نامعلوم و گمنام والدین سے چلی ہیں ۔ ان کا اصلی وطن اور خاص گھر وسط ایشیا کے کسی مقام پر واقع تھا ۔ جس کا تعین یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا، البتہ قیاس و تخمین کی رو سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ باختر (بلخ) اور سغد یانہ میں کسی جگہ واقع تھا، جو بخارا اور دریائے آمو کے منابع سے زیادہ دور نہیں تھا ۔ اس مرکز سے آٹھ مخصوص زبانیں نکلی اور پھیلی ہیں ۔ مگر ہر زبان اپنے مخصوص انداز اور مخصوص حالات کی بنا پر چلی ۔ ان کے لیے ابتداً دو ایشیائی راستے مقرر تھے ۔ پہلی جماعت میں : (۱) ہندی یا ہندوستانی ۔۔۔ سنسکرت ، مختلف قدیم پراکرتیں ، جن میں قدیم پراکرتی زبانیں ، قدیم کتبوں کی زبانیں ، پالی اور بدھی کی مقدس تعلیمات کی زبان ، جین مت کی آردھ ماگھدی ، آجکل کی علاقائی زبانیں اور ہندوؤں کی مشترک زبانیں جیسے ہندی ، مرہٹی ، گجراتی ، بنگالی اور اڑیا وغیرہ شامل ہیں اور (ب) ایرانی ۔۔۔ آوستا زبان ، جو عموماً ژند و پاژند کہلاتی ہے ، فارسی قدیم یا ہخامنشیوں کی زبان ، پہلوی ، فارسی جدید اور ان کے ساتھ مشترک آرمنی (آرمائی) اور پشتو ہیں ۔ اور پھر چھ یورپی بنیادی زبانیں ہیں ۔ (۱) کلتی (۲) ہیلینک (۳) اٹالک ، (۴) ٹیوٹانک (۵) سلیوانک اور (٦) لتھوانک ۔ ان میں ہر ایک مختلف شاخوں میں اور آگے پھر شاخ در شاخ منقسم ہوتی ہوئی موجودہ یورپی زبانوں پر منتج ہوئی ہے ۔ چنانچہ آریائی زبانوں کا یہی ایشیائی اور یورپی اشتراک و تعلق ہے جو ان کے ایک نام "انڈویورپین" کہلانے کا سبب بنا"۔

اسکے بعد آوستا کے لیے بھی ایک اسی قسم کی رائے ملاحظہ ہو :-

۲ ۔ دی اوریجن آف دی ایرین فیملی آف لینگویجز (۱۷٦۱ع) میں فاضل مصنف ڈی فرام جی حاشیے پر ایک جگہ دبستان (انگریزی ترجمہ) جلد اول صفحہ ۲۲۲ ۔ نوٹ نمبر ۱ کا حوالہ دیتے ہیں ۔ جس میں لکھا ہے ۔۔۔۔ مسٹر ٹرائیر نے اپنی تحقیقات کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ژند ایک قدیم زبان ہے ، اور اس کا منبع وہی زبان ہے جس سے کہ سنسکرت نکلی ۔ یہ قبل از مسیح سے بہت پہلے زمانے میں بولی جاتی تھی ۔ خصوصاً ان علاقوں

میں جو بحیرہ کیسپین (بحیرہ خضر) کے مغرب میں واقع ہیں ۔ جیسے جارجیا ، ایران خاص اور آزر بائیجان (جو میدیا کے شمال میں ہے) اور اس خیال کی تائید مشہور ماہرین علم الالسنہ مسٹریوجیں برنوف اور فرانسیس بوپ وغیرہ بھی کرتے ہیں ،، ۔

ان اقتباسات سے آوستا ، سنسکرت، ارمنی اور پشتو وغیرہ زبانوں کی قدامت ثابت ہو جاتی ہے ۔ ذیل میں پشتو کے دوسری زبانوں سے تعلق کے متعلق مثالیں دی جاتی ہیں :-

جدول (۱)

پشتو	سنسکرت	ہندی	فارسی
اپت	ات	اپت	آفت
باج	باچھ (تقسیم)		باج (اخراج)
تاؤ	تاپ	ٮاؤ	ناب
تپ	تاپ	تاؤ	تب
کار	کار	کار	کار
کرہسکے :-	کرہسکہ کر پاس	روئی	کرباس

جدول (۲)

پشتو	آوستا	پشتو	آوستا	پشتو	آوستا
سپہ	آسپہ	باڑہ	وارہ	جنئی	جنسی
اژدہا	ازہی دہاکا	دروغ	داروغہ	سوگند	سوک سوکنت
غرمہ	گرم	ماندہ	ماندہ	ورشو	ورش

جدول (۳)

پشتو	ہندی	پشتو	ہندی	پشتو	ہندی
اوجاڑ ویجاڑ	اجاڑ	اچاپت	اچاپت	اچار	اچار
اوژنڈی	اوڑہنی	باجرہ	باجرا	باڑی	باڑی
بال بچ	بال بچے	بالنڈ	بالن (ایندھن)	ویساک	بیساکھ
بچاونڈہ	بچھونا				

جدول (۴)

پشتو	فارسی	پشتو	فارسی	پشتو	فارسی
آتش	آتش	آسان	آسان	پل	پل
تبر	تبر	تند	تند	ٹوپک	توپک ۔ تفنگ
ڈھامہ	دمامہ	دوہ‌نیم	دونیم	ارغیرہ	زرہ
سوار	سہار				

جدول (۵)

پشتو	عربی	پشتو	عربی	پشتو	عربی
اوتر	ابتر	اسباب	اسباب	زیات	زیاد
صابون	صابون	تاخ	طاق	غوٹہ	غوطہ
کشت	قسط	کسب	کسب	مودہ	مدمدت
رخت	وقت				

ان جدولوں اور نقشوں سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ پشتو کا سنسکرت، ہندی، آوستا، پہلوی ، فارسی اور عربی سے گہرا تعلق ہے ۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مختلف زبانوں سے یہ الفاظ خود پشتو نے اخذ کیے ہونگے ۔ یہ درست ہو سکتا ہے کیونکہ ہر زبان ہر دور میں دوسری زبانوں سے الفاظ لیتی رہتی ہے ۔ لیکن جب ایک دفعہ پشتو کے وجود کو قدیم تسلیم کر لیا گیا ، تو پھر ماہرین کو کوئی اور رائے قائم کرنا ہو گی ۔

پشتون جوں جوں خود چاروں طرف پھیلے ساتھ ہی دوسری قومیں یہاں آئیں ، ان کے ساتھ رہیں ، ان میں ملیں اور اسی مناسبت سے پشتو زبان میں الفاظ کی آمیزش بھی ہوتی رہی ۔ اس لیے پشتو زبان کا تجزیہ کرنے سے اس میں ساٹھ فیصد الفاظ ایسے ملتے ہیں جو بجنسہٖ یا کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں لاطینی ، یونانی ، ترکی ، ترکمانی ، اتریزی، جرمنی ، فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں مشترک پائے جاتے ہیں ۔ کہیں سے آمیزش سنسکرت کے ذریعے سے ہوئی ہے اور کہیں یونانی زبان کے وسیلے سے ، کیونکہ یہ دو قومیں بمقابلہ دوسری قوموں کے قدیم زمانے میں پشتونوں سے زیادہ قریب اور متعلق رہی ہیں ۔

پشتو رسم الخط

پشتو زبان کا رسم الخط کب سے شروع ہوا اور کس کس دور میں کون کون سی شکل اختیار کرتا رہا ، ایک اچھا خاصا اختلافی اور الجھا ہوا مسئلہ ہے ۔ محققین نے یہاں آثارِ قدیمہ ، سنگی کتبوں اور مسکوکات سے ازروئے قیاس جو اندازے لگائے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ چوتھی صدی (۱) قبل میلادی میں یہاں یاوانہ کے نام سے ایک ایسا رسم الخط پایا گیا ہے ، جس میں یونانی اور براہمی حروف کا اختلاط ہے ۔ فاضل بوہلو کا خیال ہے کہ قدیم سکوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں سکندر کے حملے سے پہلے ہی یونانی رسم الخط کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا تھا ۔ براہمی خط سامی خط سے مشابہت

---

(۱) پشتانہ د تاریخ پہ رنڑا کے ۔ صفحہ ۲۶۰ اور ۲۶۲ ۔

رکھتا ہے ۔ جیسے کہ لاہور کے عجائب گھر میں رکھے ہوئے سنگی کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے ۔ دارایوش اعظم کے حجری کتبے خط میخی میں ہیں ، جن میں تین(۱) جملے بالکل پشتو ہیں۔ خط میخی کے بعد یہاں خروشتی خط نے بھی رواج پایا ، مگر چند سو سال بعد بالکل ختم ہو گیا ۔ پھر سکندر کے حملے کے بعد یہاں یونانی رسم‌الخط چلتا رہا ۔

کچھ عرصہ (۲) ہوا قندھار میں ایک کتبہ ملا ، جس میں اوپر کے نصف حصے کی عبارت یونانی زبان میں ہے اور نیچے آدھے میں آرامی زبان میں ہے ۔

ایران میں زرتشت کی مذہبی کتاب ژند اور پاژند آوستا میں مرتب ہوئی ۔ یہ رسم‌الخط سامی خط کی طرح داہنے سے بائیں کو لکھا جاتا ہے ۔

مگر موجودہ پشتو کے لیے عربی رسم خط پسند کیا گیا لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے ۔ یعنی اس وقت کی جب پشتون سب کے سب مسلمان ہو گئے ۔ گو یہ بات غیر مصدّقہ ہے مگر بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ پشتو کے لیے عربی الفبا سلطان محمود غزنوی کے دور سے شروع ہوا ہے، یعنی محمود غزنوی کے ایک وزیر حسن مسمندی نے پشتو لہجے کے مطابق تھوڑی بہت ترمیم کر کے عربی حروف تہجی اختیار کیے ۔ اسی سلسلے میں (۳) محمود کے دوسرے وزیر شیخ ابوالفتح کا نام بھی لیا جاتا ہے ۔ بہرحال پشتو، جہاں تک کہ اس میں کتابوں اور دستاویزات کی تحریر کا تعلق ہے ، عربی رسم‌الخط میں چلی آرہی ہے ۔

مگر پشتو چونکہ ہند و ایرانی زبانوں کی ہمسایہ ہے ، اس لیے اس کا لہجہ عربی سے مختلف ہے اور اس میں عربی حروف کے علاوہ تقریباً بیس آوازیں اور بھی شامل ہیں جو عربی میں نہیں ۔ اس لیے ان عربی کے ۲۸ حروف کے ساتھ کچھ دوسری زبانوں کے الف با سے حروف لیے گئے اور کچھ انہی حروف میں رد و بدل اور ترمیم کر کے پشتو حروف تہجی کو عربی طرز پر حسب ضرورت مکمل کیا گیا ۔

کہلانے کو تمام پشتون پشتو بولتے ہیں اور پشتو ہی ان کی زبان کہلاتی ہے ، مگر بولنے والوں کے لہجوں میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے ، کیونکہ قبیلے قبیلے کا لہجہ جدا ہے ۔ سب سے بڑا اختلاف پشتو اور پښتو (پختو) کا ہے ۔ شمال (۴) مشرق قبیلے پښتو (پختو) اور جنوب مغربی قبیلے پشتو بولتے ہیں ۔ پشاور کے تمام قبائل ، دیر ، سوات ، بنیر اور باجوڑ کی زبان پختو ہے ۔ اس حد کے جنوب مغرب میں جو قبائل ہیں، وہ

---

(۱) نہ آریکہ ہم ۔ نہ دروغنہ آہم ۔ نہ زورگرہ آہم ۔ نہ اڑیکے یم ۔ نہ دروغزن یم نہ زور کڑہ یم ۔ نہ اڑیل یم ۔ (ضدی) ہوں۔ نہ زور غکو ہوں ۔ نہ نور کرنے والا ہوں

(۲) پشتانہ د تاریخ پہ رنڑا کے ۔ ص ۲۶۰ سے ۲۶۲

(۳) اللہ بخش یوسفی ۔ آزاد پٹھان ۔ جلد اول ۔ صفحہ ۹۵

(۴) سر اولف کیسرو ”دی پٹھانز“۔ (اردو ترجمہ) صفحہ ۸ ۔

"پشتو"، بولتے ہیں ۔ ان میں سب درانی ، قریب قریب تمام خلجی (جلال آباد کے قریب کے کچھ لوگوں کو چھوڑ کر) خوست اور وزیرستان کے سارے قبائل بنوں اور ڈیرہ‌جات کے قبائل شامل ہیں ۔ ژوب اور بلوچستان کے ان دوسرے علاقوں کے پشتون بھی جو قندھار کے قریب واقع ہیں ، پشتو بولتے ہیں ۔ صرف قبیلۂ خٹک ، زبان کے لحاظ سے دو ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے ۔ اس قبیلے کا اصلی اور بڑا حصہ جو کوہاٹ کے جنوب میں آباد ہے ، پشتو بولتا ہے ؛ لیکن اکوڑہ اور مردان کے خٹک جو خوش حال خان کے قریبی زمانے میں یوسفزئی میں شامل ہو گئے تھے ، پښتو (پختو) بولتے ہیں ۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ گرون (جدون) مہمند ، ترکانی ، یوسفزئی داؤدزی ، ساموندزی ژ کی جگہ و (گ) بولتے ہیں اور دوسری طرف خٹک ، مردت ، شیتک ، بنگش ، محسود ، وزیر ، کاکڑ، اچکزئی اور بلوچستان کے کچھ قبیلے ش اور ژ کا (فارسی لہجے کے مطابق) تلفظ کرتے ہیں ۔ اور عام طور پر یہ اختلاف دو قبیلوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ، یعنی خٹک اور یوسفزئی مثلاً خٹک کہیں گے ، "موژہ پشتانہ یو ، پشتو د موژ مور نئی ژبہ دہ" ۔ اس جملے کو یوسفزئی لہجے کے مطابق یوں لکھا جائے گا ، "مولبز پښتانہ یو ، پښتو حموینزہ مور لئے جبہ دہ ۔ (مونگ پختانہ یو ، پختو زمونگہ مور لئے جبہ دہ) یعنی ہم پشتون ہیں ، پشتو ہماری مادری زبان ہے ۔ یوسفزئی لہجے کے ان جملوں میں پشتو کا شین خے میں بدلا گیا اور موژہ کی ژ گ میں اور ژبہ کی ژ ، ج میں بدلی گئی اور مورنئی کی یائے معروف ، یائے مجہول میں بدل گئی ۔

پشتو میں ایسے الفاظ بکثرت ہیں جن کے شروع، وسط یا آخر میں ژ آتی ہے ۔ جیسے ژکئی، ژیرہ ، اوژد اور کوژ وغیرہ ، پس یوسفزئی لہجے میں یہ ژ گ سے بدل جاتی ہے اور یہ الفاظ یوں بولے جاتے ہیں : ولئے (گلئے) بزیرہ (گیرہ) اورد (اوگد) اور گور (کوگ) اور اسی ژ کو بعض الفاظ میں جیسے ژاولہ ، ژامہ ، وریژے ، ژبہ ، ڈبہ ، ژولد اور ژوبل میں ج کی آواز سے ادا کرتے ہیں ۔ جیسے جاولہ، جامہ، وریجے ، جبہ ، جند اور جوبل ۔ مگر ایسے الفاظ کو جن میں ژ کو ج کی آواز سے بدلتے ہیں ، لکھتے وقت ژ سے لکھیں گے ۔ مشترک ر(گ) سے نہیں ۔ کیونکہ رامہ (گامہ) نہ کوئی بولتا ہے اور نہ سمجھ سکتا ہے اور اگر اسے ج کے ساتھ لکھا جائے تو اس کے معنے لباس کے ہو جائیں گے ۔ بولنے میں اگرچہ ڈاڑھ والے جامہ میں زور "جا" پر رہتا ہے اور لباس والے جامہ میں زور "مہ" پر رہتا ہے ، مگر تحریر میں عموماً کوئی علامتیں اور نشانیاں نہیں لگائی جاتیں ۔ اس لیے اشتباہ کا امکان زیادہ رہتا ہے ۔ چنانچہ مشترک "ښ"، کی طرح مشترک ژ کے لیے بھی اس کے تین نقطے ہٹا کر ایک نقطہ اوپر اور ایک لچھے لگا دیا یعنی ږ ۔ رہے دو حروف ځ (دز) اور څ (تشہ) ان میں سے ، کلیتاً تو نہیں مگر اکثر الفاظ میں ح ، ج

کے بدلے اور ح ، چ کے بدلے بولی جاتی ہے - جیسے جان کو خان (دزان ژان) ، جائے کو حائے (دزائے = زائے) ، جناور کو حناور (دزنا = زناور) وغیرہ اور چادر و خادر (تسارو = سادر) ، چاشت کو خاښت (تساخت = ساخت) چرب کو خرب (تسرب = سرب) اور چرخہ کو خرخہ (تسرخہ = سرخہ) وغیرہ بولتے ہیں - ان دونوں حروف کے صحیح تلفظ اور آواز کے ادا کرنے کا تعلق زیادہ خٹک لہجے سے ہے ، اسی لیے خٹک ، بنگش ، افریدی ، شینواری اور قندھاری ان حروف کا استعمال بخوبی کرتے ہیں - یوسفزئی اور کوہاٹ کی پہاڑیوں کے شمال کی طرف کے خٹک قبائل اپنے لہجے میں اکثر ح اور خ ، ر اور ښ کا تلفظ بالکل سادہ طریق ز - س - گ یا ج اور خ کی آواز سے کرتے ہیں - اس لیے انہوں نے ح اور خ کی اہمیت کو نظر انداز کر کے بہت سے الفاظ کے ہجے بدل ڈالے یعنی خٹک جن الفاظ میں ح اور خ لکھتے بولتے آ رہے ہیں ان کے بدلے اور الفاظ میں ژ اور س لگا دیتے ہیں ، جیسے حا ، غرچنول اور وحی وغیرہ کو رما ، غرزیدل اور وزی اور خانگہ ، خوک اور خٹو کے کو سالگہ ، سوک اور سٹو کے لکھنا شروع کر دیا ہے -

ایسا کرنے میں انہوں نے لہ جانے کیا بڑا فائدہ دیکھا اور پشتو املا میں کیا ایسی خاص خوبی پیدا کر دی کہ اکثریت کے لہجے کونظر انداز کر دیا صرف اس لیے کہ یہ خود یوں نہیں بولتے - بہر طور ، حروف تہجی میں دو حروف رکھ کر الفاظ کی ہجوں سے انہیں خارج کر دینے کی مصلحت آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی ہے- یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہر قبیلہ اور ہر طبقہ صرف اپنے لہجے کو معیاری قرار دیتا ہے اور بہ انتہا پسندی انہیں جادۂ اعتدال سے ہٹا دیتی ہے -

آج سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے کی وہ قلمی کتابیں جو خٹکوں ، خصوصاً خوشحال خان اور ان کی اولاد کی لکھی ہوئی ہیں ، ان کے رسم‌الخط میں یہ چار حروف ح خ ژ اور ش باقاعدہ اپنے لہجے کے مطابق اپنی اپنی درست شکل میں استعمال ہوئے ہیں - مگر اب طبع ہوتے وقت ان میں کافی تصرف اور رد و بدل کر دیا گیا ہے اوراب نئی پود کے خٹکوں میں آہستہ آہستہ یہی یوسفزئی لہجہ پھیلتا جا رہا ہے - اس کا ایک فائدہ ضرور ہوگا کہ سارے صوبے میں کم از کم رسم‌الخط ایک معیار پر آ جائے گا - جس سے کتابت و طباعت ، لتھو اور تایپو گریفی سب میں سہولت ہو جائے گی - اگرچہ اس میں کچھ قباحتیں بھی پیدا ہوں گی ، کیونکہ آج کل ایک انتہا پسند طبقہ اور اٹھ کھڑا ہوا ہے اور وہ اس بات پر مصر ہے کہ جیسے بولو ویسے لکھو - مثلاً جوڑولد کو جوند یا جنہ بولتے ہیں تو انہیں لکھا بھی یوں ہی جائے- عبدالصمد کو اودل سمد بولنے والے لکھیں بھی اسی طرح محی‌الدین کو مخے دین مجاہدین کو مجھے دین ، زین العابدین کو زلابدین ، محمد کو .مامند یا محمد احمد کو امد یا اخمد کہنے والے لکھیں بھی اسی طرح - ظاہر ہے کہ اس معاملے میں

بمقابلہ ایک فرضی سہولت کے مشکلات اور قباحتیں زیادہ ہیں ۔

کچھ عرصے سے بعض اصحاب کی طرف سے پشتو حروف تہجی سے ت د ر ک اور ن نکال کر ان کے بدلے اردو حروف تہجی کے مروّجہ ٹ ڈ ڑ گ اور نڑ شامل کر دینے کی تجویز پیش کی جا رہی ہے ۔ یہ ایک مفید تجویز ہے ۔ اگر اس پر عمل کیا گیا تو پشتو لہجے پر کسی قسم کا اثر پڑے بغیر کافی اصلاح ہو جائے گی ۔ ایک تو پشتو الفبا سے پانچ غیر ضروری حروف کا بار کم ہو جائے گا ، دوسرے ٹائپ میں کافی سہولت آ جائے گی ۔ تیسرے ح اور خ ایسے حروف ہیں جو پشتو سیکھنے والے کی سمجھ میں بہت آسانی سے آ جاتے ہیں کیونکہ ج اور ز اور چ اور س کا تبادلہ خود سرزمین پاک و ہند کی کئی زبانوں جیسے پنجابی ، بنگالی ، میواتی اور مارواڑی زبانوں میں قدیم الایام سے عام چلا آرہا ہے ۔ اس کے بعد صرف دو حروف ر اور ښ رہ جاتے ہیں ، تو دو حروف کا سمجھنا سمجھانا کوئی اتنا دقّت طلب کام نہیں ۔

علمی اور عوامی یا کتابی اور بول چال کی پشتو

علماء و فضلاء کے علاوہ بقیہ لوگ ، لوک یا عوام کہلاتے ہیں ۔ یہ تعداد میں بہت زیادہ ہوتے ہیں اور ان میں اکثریت غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی ہوتی ہے لہٰذا ہر زبان دو بڑی شاخوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ۔ ایک عالمانہ یا علمی کہلاتی ہے اور دوسری عامیانہ یا عوامی ، پس انہی قدرتی قاعدوں کی رو سے پشتو بھی دو قسموں میں منقسم مانی جاتی ہے ۔ ایک علمی دوسری عوامی یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک کتابی اور دوسری بول چال کی پشتو ۔

پشتو بہ حیثیت پشتونوں کے ضابطۂ حیات کے

پشتو اپنے بولنے والوں کا ضابطۂ حیات یا ان کے معاشرے کا دستور و آئین بھی ہے ۔ اسکی واضح مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اگر صوبہ سرحد میں کوئی شخص تہذیب و اخلاق سے گرا ہوا یا قومی رسم روایات کے خلاف کوئی کام کرے تو لوگ فوراً بول اٹھتے ہیں کہ اس نے اپنی پشتو چھوڑ دی یا پشتو کے خلاف چلا ۔ یا یہ کہ اس نے پشتو کے نام پر بٹا لگا دیا ۔ چنانچہ پشتونوں کے علاوہ دنیا کی کوئی قوم اپنے کسی فرد کو خلافِ ضابطۂ اخلاق کام کرنے پر یہ نہیں کہہ سکتی کہ تم اپنی عربی ، چینی ، ہندی یا انگریزی سے منحرف ہو گئے ۔

پشتو ایک زبان یا بولی ہے اور اسکے بولنے والے پشتون ہیں ۔ انہی بولنے والوں کے عقیدے اور روایت میں پشتو ان کی زندگی کے بیشتر حقائق پر حاوی ہے ۔ اس کے

بولنے والے ہر اس خاصیت خوخصلت اور فعل و عمل کو ''پشتو،، سے تعبیر کیا جاتا ہے جو اسلامی اخلاق کے مقتضیات کے مطابق ہے ۔ جنکی غرض و غایت، علم و ادب، تہذیب و شائستگی ، صلح و آشتی ، عروج و ترقی ، آزادی خواہی ، راستبازی اور تکمیلِ انسانیت ہے ۔ گویا پشتو زبان بھی ہے اور ضابطۂ اخلاق بھی ۔ مؤخرالذکر معنوں میں ، پشتو کو پشتون ولی ، پشتون واله یا پشتون گلوی بھی کہتے ہیں ، یعنی پشتون پنا یا پشتونیت ۔ جسکی چند نمایاں اور قابل ذکر خصوصیات سطور بالا میں '' پشتو ،، کے اصطلاحی معنوں کے ضمن میں بیان کی گئی ہیں ۔ ویسے ہی محاورں اور اصطلاحوں کے تحت چند مرکب الفاظ اور بھی پشتو لغات میں ملتے ہیں : جیسے

۱ ۔ پشتو کول :۔ (پشتو کرنا) پشتو پر چلنا یا پشتو کے مطابق عمل کرنا ۔ پشتو کے مشہور شاعر عبدالعظیم کہتے ہیں ''دشیطان سره پشتو کولے نه شے یا رتر ہور عزیز په حق کبنن لکه اور ۔۔،، (شیطان سے بچنے کے لیے تو پشتو پر عمل نہیں کر سکتا : اور اپنے عزیز و قریب کے لیے آگ بگولا رہتا ہے !) یا ایک ٹپہ ہے ۔۔۔ '' پشتوکوه که نه پشتون ہے ۔ ما په پشتو باند گاللی‌دی عمونه،، (پشتو کرو پشتو! اگر تم پشتون ہو ۔ میں نے اسی پشتو کے ذریعے بڑے بڑے غم برداشت کیے ہیں) ۔

۲ ۔ نرپشتوتیسریدل :۔ (پشتو سے گزرنا) ۔ پشتو کو نظرانداز کرنا ۔ پشتو کی پرواہ نہ کرنا ۔ پشتو کے باعزت طور طریقوں کو چھوڑ کر کوئی گرے ہوئے ذرائع اختیار کرنا ۔

۳ ۔ په پشتو دریدل یا ودریدل :۔ (پشتو پر کھڑا ہونا) ۔ پشتو کی راہ و رسم پر ثابت قدمی سے ڈٹے رہنا یا قائم رہنا ۔

۴ ۔ پشتو نه لرل یا نه درلودل :۔ (پشتو نہ رکھنا) ۔ پشتو سے بے بہره یا تہی دامن ہونا ۔

۵ ۔ پشتو گٹل :۔ (پشتو جیتنا) ۔ کھوئی ہوئی عزت اور ننگ و نام کو دوبارہ حاصل کرنا یا بحال کرنا ۔

۶ ۔ پشتو سرته وسول :۔ (پشتو کو آخر تک پہنچانا) ۔ اپنے مقصد و مرام کو حاصل کرنا ۔ اپنے عہد یا قول و قرار کو پورا کرنا ۔ ایک ٹپہ ہے ــــــ راپه پشتو کبنن (کے) چرته نیشته چه سے لوطی دخیل آشنا شره کوی نه ! (پشتو میں یہ کہیں نہیں کہ اپنے دوست سے وعدہ خلافی کرو !)

۷ ۔ دپشتو کاڑے په ابو کنبن نه ورستیږی :۔ (کہاوت) پشتو کا پتھر پانی میں کبھی نہیں گلتا یا گھلتا ۔

اس جیسی اور بھی اصطلاحیں ہیں ۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پشتونوں نے جس وقت اسلام قبول کیا تھا اس وقت یقیناً ان کا مذہب پشتو ہوگا ۔ وہ زندگی کے تمام معاملے اور مسئلےاسی پشتو کے آئین و دستور کے مطابق طے کرتے ہونگے ۔ پشتو کے یہ قوانین اور ضابطے جمہوری نظام پر مبنی ہیں ۔ آج بھی بہت سے قبائل میں جرگے (پنچایت) کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ جرگے کے فیصلے ویسے ہی پابندی سے مانے جاتے ہیں چاہے اس میں کسی فرد یا فریق کو کیسا ہی جانی اور مالی نقصان ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ دین فطرت " اسلام " کو قبول کرنے میں انہیں کوئی زیادہ پس و پیش نہیں ہوا ہوگا۔ البتہ بعض دور افتادہ مقامات میں جہاں کے قبائل اسلامی تعلیم و تربیت سے زیادہ متمتع نہ ہو سکے اور متمدن و ترقی یافتہ دنیا سے کٹے رہے یا ان سے زیادہ ربط و تعلق نہ قائم کرسکے، وہاں ابھی زمانہ جاہلیت کی کچھ رسوم و روایات ایسی پائی جاتی ہیں ، جو اسلامی تعلیمات اور تقاضوں کے منافی ہیں ۔ جیسے دشمن سے بدلا لینا ، خواہ کسی طریقے سے ہو ۔ بیٹی کو جائیداد سے حصہ نہ دینا یا بیٹی کی پیدائش پر افسوس یا رنج و غم کا اظہار کرنا اور ایسی ہی چند ایک اور خرابیاں پائی جاتی ہیں ۔ مگر ترقی سے بہرہ ور ، آباد و خوش حال علاقوں میں ، تعلیم و تربیت اور اقتصادی آسودہ حالی کے سبب حالات تیزی سے بہتر ہوتے جا رہے ہیں ۔

کتابیات

پشتو :-

۱ - تاریخ مرصع (غیر مطبوعہ) پشتو افضل خان خٹک -
۲ - مخزن اسلام (غیر مطبوعہ) پشتو - اخون درویزہ -
۳ - مجلّہ کابل - شمارہ $\frac{560}{3}$
۴ - مجلّہ کابل - شمارہ $\frac{561}{4}$
۵ - مجلّہ کابل - شمارہ $\frac{564}{7}$
۶ - مجلّہ پشتو سہ ماہی ۱۹۵۸ع -
۷ - پښتانہ د تاریخ پہ رنړا کښې - (بہادر شاہ ظفر کاخیل)
۸ - دپښتو تاریخ - قاضی عطاءاللہ خان -
۹ - افغانستان - دائرۃ المعارف - کابل -
۱۰ - پټہ خزانہ - پشتو ټولنہ - عبدالحئی حبیبی - کابل -
۱۱ - پشتو ادبیاتو تاریخ - عبدالحئی حبیبی - کابل -

اردو

۱۲ - تاریخ لودھی -
۱۳ - حیات افغانی -
۱۴ - تاریخ ضلع پشاور - جلد اول ۹۸ - ۱۸۹۷ع -
۱۵ - تمدن ہند - (گستاو لی بان)
۱۶ - تاریخ اقوام عالم - مرتضیٰ احمد خان -
۱۷ - دی پٹھانز - سر اولف کیرو -
۱۸ - تاریخ خٹک - (سرفراز خان خٹک عقاب)
۱۹ - رسالہ تہذیب الاخلاق - مجموعہ مضامین سرسید احمد خاں -
۲۰ - آزاد پٹھان - (اللہ بخش یوسفی)
۲۱ - نسب افغانہ - محمد عبدالسلام - رام پور -

فارسی

۲۲ - تاریخ افغانستان - (احمد علی کہزاد) - کابل -
۲۳ - لغتنامہ دہخدا - (علی اکبر دہخدا) - ایران -
۲۴ - برہان قاطع - (شرح ڈاکٹر معین) - ایران -

۲۵ - فرہنگ نظام -
۲۶ - فرہنگ آموز گار -

27. A Glossary of the Tribes & Castes of the Punjab and N.W.F.P. Vol. III by Sir Denzil Ibbetson (1883).
28. Cyclopaedia of India, by Edward Balfour. Vol. I. (1871).
29. Gazetteer of the Peshawar District. (1897-98).
30. Pathans. (A book of Official use only).
31. The Principal Languages of Asia and Europe, by Vans Kennedy. (1828).
32. Aryan & Dravidian Philology, by Seshagri Shastri. Vol. I. (1884).
33. The Science of Language by F. Max Muller (1885).
34. A History of Persia, by Sir Percy Sykes. Vol. I.
35. A Glossary of the Tribes & Castes of the Punjab & N.W.F.P. Vol. III. (1914).
36. Chambers Encyclopaedia Vol. I.
37. Encyclopaedia Britannica Vol. I, VI.
38. Encyclopaedia Americana Vol. I & VII.
39. Encyclopaedia of Social Sciences Vol. I & II.
40. Sanskrit—English Dictionary, by Monier Monier-Williams.

تیسرا باب

۷۵۶ء سے ۱۶۳۸ء تک

پشتو ادب کی تاریخ

صوبہ سرحد پشتونوں کا علاقہ ہے جس کی زبان پشتو ہے - اس سنگلاخ سر زمین کے باشندے بھی آب و ہوا اور محلِ وقوع کے اعتبار سے جفاکش واقع ہوئے ہیں اور اس طرح ان کے ادب و شعر میں بھی یہی مزاج شروع سے آخر تک رچا بسا نظر آتا ہے - پشتو ادب کا تمام سرمایہ اپنے ماحول کا آئینہ دار ہے - چونکہ اس علاقے کے باشندے اوائل ہی سے جنگ و جدل میں مصروف رہے اور بیرونی حملہ آوروں سے نبرد آزمائی کرتے رہے اس لیے اس رزمیہ اور تیغ و تفنگ کے ماحول نے پشتون قوم کو اگر فنون لطیفہ کے کسی شعبے کی طرف توجہ دینے کی مہلت دی تو وہ شاعری تھی ، جس کے ذریعے وہ اپنےماحول کی عکاسی اور اپنے ضمیر کی ترجمانی بدرجۂ اتم کرتے رہے - یہی وجہ ہے کہ پشتو شاعری ہر دور کی جد و جہد کی منظوم تاریخ معلوم ہوتی ہے -

آج خیبر کی وادی کوئی طلسماتی سر زمین نہیں رہی - نہ ہی اس کے باسی رواتی اجڈ ، افسانوی وحشی اور زمانہ قبل تاریخ کے غیر مہذب انسان ہیں ، بلکہ اس روشن دور میں ان کے علم و ہنر سے لاعلمی کا اظہار خود اپنی جہالت کے اقرار کے مترادف ہوگا - اس روشن دور میں تاریخ کا علم سائنس کا درجہ حاصل کر چکا ہے - انسانی تہذیبیں بنتی بگڑتی رہی ہیں - اگر دستاویزی ثبوت پر ہی انحصار رہتا تو شاید زیادہ دور رس نتائج سامنے نہ آتے کیونکہ اس دھرتی پر انسان کا وجود ہزار ہا سال سے پایا جاتا ہے -

زبان و ادب کی تاریخ کا سراغ لگانے کے لیے تحریری دستاویزات سے آگے صرف عوامی ادب کا خزانہ رہ جاتا ہے ، جہاں تجسس و تفکر سے شواہد و حقائق کا ایسا سلسلہ مل جاتا ہے جس سے تاریخ کے تاریک دور تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے - محققین نے ایک عرصہ کی تحقیق و تدقیق کے بعد اسباب و قرائن سے ثابت کیا ہے کہ پشتون

ایک قدیم قوم ہیں اور پشتو زبان بھی انہی کی طرح قدیم ہے ۔ لیز سنسکرت کا قدیم پشتو سے گہرا تعلق ہے ۔ جہاں تک نشتو ادب کی تاریخ کا تعلق ہے ، اب تک اس کا تحریری ثبوت ۷۵۶ء / ۱۳۹ھ سے ادھر نہیں مل سکا ۔ لہٰذا پشتو قدیم ادب کا کھوج لگانے کے لیے اس کے عوامی ادب کا جائزہ لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پشتو کا قدیم ادب کس قسم کا تھا اور قدیم پشتو زبان کا رسم الخط کیا تھا ۔ پشتو زبان کا موجودہ رسم الخط قاضی سف اللہ کی ذہنی اور فکری کاوش کا نتیجہ ہے جو کم و بیش ۱۰۰۰ء/۳۹۱ھ (۱) میں محمود غزنوی کے عہد میں عربی رسم الخط سے اخذ کرکے بنایا گیا ۔ ۶۶۰ع / ۴۰ھ کے قریب اسلام اس علاقے میں پہنچ چکا تھا ۔ پشتون قوم نے اسے پوری فراخدلی سے اپنایا ۔ اسلام قبول کرنے کے بعد چونکہ اسلام کی تعلیمات عربی زبان میں تھیں ، اس لیے پشتو زبان و ادب پر بھی اسکا گہرا اثر پڑا ، چنانچہ پشتو زبان و ادب کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ اثر نہایت نمایاں نظر آتا ہے ۔ پشتو شاعری کے دریافت شدہ اولین آثار ۷۵۶ء/۱۳۹ھ سے لے کر آخر تک تمام و کمال پر مذہبی خیالات و جذبات اور قومی و ملی احساسات کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے ۔ نئے رسم الخط کا محرک بھی یہی مذہبی جذبہ تھا جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ نئے رسم الخط کی بنیاد عربی رسم الخط پر رکھی گئی ۔

پشتو کے قدیم ادب کی جستجو کرتے ہوئے جب ہم نشتو کے دریافت شدہ قدیم ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں ہندو دیومالا کے اثرات کا شائبہ تک نظر نہیں آتا ۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ جب یہ ادب پیدا ہوا تو تقریباً پوری کی پوری پشتون قوم حلقہ بگوش اسلام ہو چکی تھی ۔ اس لیے نئے عقائد اور نئی تعلیمات ہی کو انہوں نے فطری طور پر اپنے فن کا موضوع بنایا ۔ قبل از اسلام کے پشتو ادب پر ممکن ہے ہندو دیومالا یا بدھ مت کا اثر غالب ہو ۔ پشتون اہل قلم (۲) کی تحقیق کے مطابق نشتو ادب کی قدیم ترین صنف لنڈی یا ٹپہ ہے جو پٹھانوں کی مخصوص ملی صنف ہے ۔ یہ طبعی جذبات و احساسات کا فطری ذریعۂ اظہار ہے اور اس وقت سے رائج ہے جب ویدک اور اوستائی زبانوں کی طرح پشتو زبان بھی اپنی انفرادیت قائم کر رہی تھی ۔ اس لیے قیاس کہتا ہے کہ ٹپے کا آغاز بھی ڈیڑھ دوہزار سال قبل مسیح کے قریب قریب ہوا ۔ اس بات کے زیرنظر یہ کہنا

---

(۱) شاہ محمد عباسی، پشتو زبان و ادب کی تاریخ (قلمی مسودہ)

(۲) رضا ہمدانی ، ادبیات سرحد (پشتو) ص ۲۲۰ پشتو شاعری ص ۲۱ فارغ بخاری ، پشتو لوک گیت ، ص ۱۸ ۔ اجمل خٹک ، سنگ میل (سرحد نمبر) پشاور ، مقالہ پشتو ادب ص ۹۵ ۔

درست معلوم ہوتا ہے کہ پشتو ادب کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہو گی ۔ غالباً ٹپہ پشتو ادب کے تمام نشیب و فراز اور انقلابات دیکھ چکا ہے ۔ اس کی تاریخ کی کڑیاں ملائی جائیں تو پشتو ادب ، زبان ، معاشرت ، تہذیب اور کلچر کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے ۔

ممکن ہے ٹپہ کی ابتدائی شکل یہ نہ ہو جو اب ہے ۔ اس امکان کے باوجود پشتون اہل تحقیق کے نزدیک ٹپہ کی موجودہ (۱) شکل بھی بڑی قدیم ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس طرح سنسکرت ، اوستا اور پہلوی زبانوں میں منظومات کی بنیاد آہنگ پر ہوتی تھی ، منظومات کے ٹکڑے آہنگ کے مطابق ڈھالے جاتے تھے اور قافیہ ردیف نہیں ہوتا تھا ، ٹپہ بھی اسی طرح وضع ہوتا ہے ۔ یہ قدیم آریائی علم عروض کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے ۔ ویدک ادب میں اس علم کو چھند کہا جاتا تھا ۔ ابتدا میں چھند ایک قسم کی نظم کا نام تھا ۔ پھر علم عروض کا یہی نام پڑ گیا اور اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں ۔ البیرونی کہتے ہیں کہ ہندوؤں میں نحو کے بعد چھند یعنی علم عروض اہم علم شمار ہوتا ہے ۔ چھند کا دور غالباً ۱۲۰۰ ق ۔ م سے ۱۰۰۰ ق ۔ م تک ہے ۔ معلوم ہوتا ہے آریوں کے اثرات کی بنا پر پشتونوں نے ٹپہ کو چھند کے مطابق ڈھال لیا ہو گا ۔ چنانچہ ٹپے کا پہلا مصرع '۹' اور دوسرا '۱۳' سیلابوں (حرفی ارکان) پر مشتمل ہوتا ہے ۔

ٹپہ کی قدامت اور ہیئت کے متعلق غور کرنے کے بعد اس بات کو زیر نظر رکھنا ضروری ہے کہ چونکہ پشتونوں کا وطن ابتدا ہی سے بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ بنا رہا اس لیے ان کا ادبی سرمایہ محفوظ نہیں رہ سکا ۔ لے دے کر ان کے قدیم ادب کا دارومدار پشتو لوک گیتوں پر رہ جاتا ہے ۔ ٹپہ کے علاوہ اور بھی پشتو لوک گیت ہیں مگر ان کے سلسلہ میں یہ تصریح ضروری ہے کہ اہل تحقیق کو ٹپہ کی طرح ان کے قدیم ہونے پر اصرار نہیں ۔ ہم مندرجہ ذیل مختلف قسم کے پشتو لوک گیتوں کی ہیئت ، تکنیک اور ان کے موضوعات پر روشنی ڈالتے ہیں ۔

۱ ۔ لوبہ	۲ ۔ چاربیتہ	۳ ۔ نیمہ کئی	۴ ۔ بدلہ
۵ ۔ بگتئی	۶ ۔ اللہ ہو	۷ ۔ لنڈی یا ٹپہ	

لوبہ

لوبہ پشتو میں کھیل کو کہتے ہیں ۔ یہ پشتو لوک گیتوں کی مشہور صنف ہے جو اپنی غنائیت کے باعث عوام میں بہت مقبول ہے ۔ اس میں حسن و عشق کے

---

(۱) عبدالحئی حبیبی ۔ دپښتو ادبیاتو تاریخ ۔ ص ۶۶
اجمل خٹک ۔ سنگ میل (سرحد نمبر) پشاور ۔ مقالہ پشتو ادب ۔ ص ۹۵

قصے اور وارداتیں مخصوص ملی آہنگ اور اس سوز و ساز کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں کہ سننے والے مسحور ہو کر رہ جاتے ہیں ۔ سادہ زبان و بیان لوبہ کا خاصا ہے ۔ اسے عموماً عورتیں گاتی ہیں ۔ بعض لوبے دوگانہ کی صورت میں بھی ملتے ہیں، جنہیں عورت اور مرد مل کر سوال و جواب کی صورت میں الاپتے ہیں ۔ لوبے کا وزن پشتو کے ملی اوزان یعنی "حرفی ارکانوں" پر قائم ہے ۔ مکھڑے کے دونوں مصرعے مختلف الوزن اور بعض اوقات مختلف القافیہ بھی ہوتے ہیں جسے لوبے کا سر کہا جاتا ہے ۔ یہ سر مختلف لوبوں میں مختلف ہوتے ہیں ۔ بعض لوبوں کے سر مستزاد سے ملتے ہیں اور بعض اپنی الگ ہیئت رکھتے ہیں ۔ سر پر لوبہ کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور اس کے نام پر لوبہ مشہور ہوتا ہے ۔ مثال ملاحظہ ہو :-

اب حسرت مجھے رلائیگی ۔
کیونکہ میں غماز کی شرارت سے بے قصور دھتکارا گیا ہوں
میرا مرض لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا ہے ۔
میری حالت کی کسی کو خبر نہیں
تری طرف سے دل پر پتھر رکھ لونگا ،
عشق کی کالی بلا نے مجھ بے گناہ کو ڈس لیا ہے
اب حسرت مجھے رلائیگی ! (ترجمہ)

چاربیتہ

چاربیتہ بڑی ہردلعزیز صنف سخن ہے ۔ یہ طویل نظم سے مشابہ ہے لیکن اسے نظم یا نظم کی کوئی قسم نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اسکے ملی وزن اور آہنگ اسکی انفرادیت کے ضامن ہیں ۔ چاربیتہ کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے کڑہ بند اور نظیری بہت مشہور ہیں اس میں عموماً ملی و مذہبی واقعات ، قدیم روایات، قصے کہانیاں، معجزات اور جنگی حالات نظم کیے جاتے ہیں ۔ اس کا تحریری ذخیرہ کم ملتا ہے ، اس لیے بعض بہترین قسم کے چار بیتے اب ناپید ہیں ۔ ایک چاربیتہ کے دو بند ملاحظہ ہوں :-

ایک نجار کا بیٹا تھا !
روم کے شہر میں
وہ نقاشی کے فن میں ماہر تھا
اسکا نام فرہاد تھا
وہ حسن میں یکتا تھا

شباب کا عالم تھا
شیخ و شاب اس پر فدا تھا۔
ہر جگہ فرہاد کے کمالات کا چرچا تھا
ایک نجار کا بیٹا تھا ! (ترجمہ)

بگتئی

بگتئی لوبہ اور چاربیتہ کے بین بین ایک صنف ہے جسے جوش اور ولولے سے گایا جاتا ہے۔ بگتئی محفل میں گرمی پیدا کرنے اورجذبات کو برانگیختہ کرنے کیلئے مخصوص ہے۔اس کا موضوع عام طور پر عشق و محبت ہوتا ہے۔ آزاد قبائل میں بگتئی ایک مشہور قبیلے کا نام ہے شاید یہ صنف اسی قبیلے کی اختراع ہے، اسلئے اسی نام سے موسوم ہوگئی ہے۔نمونہ ملاحظہ ہو :۔

یہ سیاہ آنکھیں مجھ سے بے اعتنائی برت رہی ہیں!
میرے حال کی انہیں کیا خبر ہو سکتی ہے
محبوبہ سیاہ آنکھیں اور حنائی ہاتھ لیے
اپنے بام پر کھڑی سیر کر رہی ہے
زلفوں میں تازہ پھول لگا رکھے ہیں
موزی ظالم رقیب اس کی بلائیں لے گا
یہ سیاہ آنکھیں مجھ سے بے اعتنائی برت رہی ہیں ! (ترجمہ)

نیمہ کئی

نیمہ کئی پستو شاعری کی آسان ، عام فہم اور مقبول صنف ہے ۔ اسکی تکنیک یہ ہے کہ ایک خاص وزن کا مطلع یا سُر (مکھڑا) بنا لیا جاتا ہے۔ اس کے دو حصے ہوتے ہیں ایک طویل سا مصرع اور دوسرا حصہ مستزاد کے ٹکڑے کی مانند۔ان دونوں مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا لازمی نہیں ہوتا۔ یہی مکھڑا نیمہ کئی کا سُر کہلاتا ہے جسکے ساتھ عام لنڈی یا ٹپے گائے جاتے ہیں اور ہر ٹپے کے بعد اس سُر کو دھرایا جاتا ہے۔ نمونہ حاضر ہے :۔

نوا کئی کے محاذ پر پھول کھلا گئے
کابل کے محاذ پر لڑائی ہو رہی ہے !
کابل کے میدان کو دیکھو
کابل کے محاذ پر جنگ ہو رہی ہے !

گورے فوجیوں کی لاسیں داماں کے گیدڑ نوچ رہے ہیں
کابل کے محاذ پر لڑائی ہو رہی ہے!
دشمن خیبر کی وادی عبور کر چکا ہے
کابل کے محاذ پر جنگ ہو رہی ہے!
اکبر خاں کا لسکر جرار سامنے پڑا ہے
کابل کے محاذ پر جنگ ہو رہی ہے!
دسمن کو عام ہے کہ وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے
کابل کے محاذ پر جنگ ہو رہی ہے! (ترجمہ)

بدلہ

بدلہ پشتو لوک گیتوں کی معروف صنف ہے۔ یہ مثنوی سے مماثلت رکھتی ہے۔ عموماً بحر بھی ایک ہی ہوتی ہے البتہ قافیوں کی تکنیک مختلف ہے۔ کہیں تو مثنوی کی طرح ہر سعر کا قافیہ الگ الگ ہے اور کہیں دو دو سعروں کے یکساں قافیے ہیں اور کبھی تو پورے کا پورا بدلہ ایک ہی قافیہ ردنف میں ملتا ہے۔ اس میں تاریخی ، رومانی اور انقلابی قصے کہانیاں منظوم کی جاتی ہیں۔ پسنو کے تمام رومان اور جنگ نامے بدلہ میں ہی ملتے ہیں۔ ایک بدلہ کی تمہید دیکھئے :-

آج پھر میرے دل میں عسق کی آگ جل رہی ہے ،
اس لیے میرے منہ سے فریاد نکل رہی ہے
محبت کی آگ میرے دل میں بھڑک آئی ہے۔
مچھلی کی طرح دل کے خون میں تلا جا رہا ہوں
متکبر محبوب یہ نہیں سوچتا
کہ ہم دردمند کیوں فریاد کرتے ہیں!
محبوب کی محبت نے میری شرم و حیا کو غارت کر دیا ہے
جیسے پانی سوکھی گھاس کو بہا کر لے جاتا ہے! (ترجمہ)

اللہ ہو

اللہ ہو پسنو میں لوری کو کہتے ہیں۔ پشتو لوک گیتوں میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے اس کے ذریعے یہ آزاد منس قوم آغوش مادر ہی میں بچے کے کانوں میں بہادری، اولوالعزمی اور غیرت و حمیّت کا ایسا افسوں پھونک دیتی ہے جو آئندہ زندگی میں اس کے لیے حرزجاں بن جاتا ہے۔ اللہ ہو اور اردو لوری کی تکنیک میں کوئی فرق نہیں، البتہ موضوع

کے اعتبار سے ان کا انداز جدا ہے۔ ایک نمونہ دیا جاتا ہے :

سوجا میری جان سوجا
سوجا ـــــ سوجا!
تیرا باپ لڑائی پر گیا ہے
اچھی تیز تلوار کمر میں لٹکا کر
وہ اپنا سر وطن کے ناموس پر فدا کرے گا ،
کیونکہ وطن پر فرنگی نے چڑھائی کر دی ہے
سوجا ـــــ میری جان سوجا!
تیرا باپ جہاد کرنے گیا ہے
وہ دشمنوں کو فنا کرے گا
اپنا نام دنیا میں چھوڑ جائے گا
آج لوٹ آئے گا یا کل
سوجا ـــــ میری جان سوجا! (ترجمہ)

لنڈی

لنڈی یا ٹپہ پشتو لوک گیتوں کی سب سے زیادہ قدیم سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور صنف ہے۔ یہ صنف پشتون قوم کے مزاج سے کچھ ایسی مطابقت رکھتی ہے کہ عورت مرد بچے بوڑھے اور جوان سبھی اس پر جان چھڑکتے ہیں۔ یہ پشتو کی منفرد تخلیقی صنف ہے جس کی مثال کسی زبان میں نہیں مل سکتی۔ پنجابی کے ماہیا کی تکنیک لنڈی سے کچھ مماثلت رکھتی ہے لیکن یہ مماثلت محض ہیئتی اعتبار سے ہے، معنوی طور پر ان میں کوئی مطابقت نہیں۔ لنڈی کا میدان نہایت وسیع ہے اس میں شادی و غمی، رزم و بزم اور عشق و محبت، غرض ہر قسم کے موضوعات پر ہزاروں کی تعداد میں ٹپے مل جاتے ہیں۔ یہ عوامی سرمایہ ہے اور عوام ہی اس کے خالق ہیں۔ موضوعات لنڈی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ ابتدا سے لے کر آج تک ایک ہی صورت میں رائج ہے اور سینکڑوں سال گزرنے پر بھی اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سب سے زیادہ نمایاں خوبی اس کی یہ ہے کہ اس میں عوام کے ہر قسم کے جذبات و احساسات کی عکاسی پورے عروج پر نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لنڈی یا ٹپے سارے پختونخواہ کے کہساروں، چراگاہوں، کھلیانوں اور پنگھٹوں میں پشتون عوام کے سینوں کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو کر شب و روز گونجتے رہتے ہیں۔ مذہب کے معاملہ میں پشتون قوم بڑی راسخ العقیدہ واقع ہوئی ہے

اس لیے ان کے ادب و شعر میں بھی مذہبی رجحان غالب ہے ۔ چنانچہ لنڈی میں بھی مذہب ایک موضوع بن جاتا ہے ۔ مثال ملاحظہ ہو :-

غلط بات ایک دن ظاہر ہو جاتی ہے ،
یہ کیسی غلط بات ہے جو ازل سے ابد تک چل رہی ہے
اگر انسان تمام عمر بھی عبادت کرے
تو بھی تیرے احسانوں کا بدلہ نہیں چکا سکتا!
محبت صرف خدا اور رسوؐل کی اچھی ہے
دوسری محبتیں مصنوعی ہیں جو اسی دنیا میں رہ جائینگی (ترجمہ)

مذہب کے بعد اپنی قوم ، ملت اور وطن سے انہیں بہت محبت اور عقیدت ہے ۔ مثلاً موجودہ دور کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے :-

آزادی کی محبوبہ کہتی ہے
غلام یار کو میں ہرگز بوسہ نہیں دوں گی'
خدایا مجھے سو بار زندگی دے
کہ میں اپنے وطن پر سو بار قربان ہو جاؤں
دشمن کو سرخ گولیوں میں دفن کر دوں ۔
کارتوس ختم ہو جائیں تو میں اپنا زیور رہن رکھ کر بارود مہیا کرونگی
اپنی جان شمع وطن پر نثار کر
تاکہ پروانے تیری زیارت کو آئیں ۔
اگر نوجوانوں سے نہ ہو سکا
تو پیارے وطن ! ہم لڑکیاں تیری حفاظت کرینگی
میں نے خواب دیکھا ہے
کہ خدا کے فضل سے ، نوجوان ملک کو آزاد کرائیں گے ۔ (ترجمہ)

ٹپے کا زیادہ تر سرمایہ اسلامی یا وطنی اور ملی موضوعات پر مشتمل ہے ، لیکن عشقیہ اور معاشرتی ٹپوں کی بھی کمی نہیں ۔ عشقیہ ٹپے غزل کی طرح محبت بھرے جذبات کا سیدھا سادہ ذریعہ ہیں جن میں پشتون تہذیب و تمدن اور رسم و رواج کی نادر تصویریں پائی جاتی ہیں اور سماج کی ظالمانہ بندشوں کے خلاف بغاوت کے دبے دبے شعلے بھی دکھائی دیتے ہیں ۔ مثلاً :-

Accession No 73449
Date 13.1.81
Ab.

دیدار کوئی پھول نہیں
کہ مالی کے ہاتھ تیرے لیے بھجوا دوں ۔
اپنے لقرئی بوسے کی قیمت لے لے
سر دینے کے بعد میرے ذمہ کتنی رقم رہ جائے گی ؟
ایک دفعہ پھر اس راہ سے گزرو
پہلے نقش پا گرد کے نیچے دب چکے ہیں ۔
جی چاہتا ہے اس کے کان نوچ لوں
جو غریب کی فریاد نہیں سنتا ۔
اٹک کا پانی لہریں مار رہا ہے
بہار لقرئی چہرے اور طلائی بیزوان لیے آ گئی ہے ۔ (ترجمہ)

یہ تو پشتو کی ملی اصناف تھیں جن کی تکنیک ، ہیئت اور اوزان سب کے سب تخلیقی ہیں اور اپنے مخصوص ملی آہنگ میں درحقیقت یہی چیز پشتو زبان کی قدامت کی بیّن دلیل ہے ۔ کیونکہ پاک و ہند میں شاید کوئی زبان سوائے سنسکرت اور ہندی کے ، اس معاملہ میں پشتو کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔

رباعی

لوک گیتوں کی ان اصناف کے علاوہ پشتو میں ایک صنف رباعی کے نام سے بھی پائی جاتی ہے جس کا اب رواج نہیں رہا ۔ یہ رباعی فارسی کی چہار مصرعہ مشہور صنف رباعی نہیں ، جو اپنا مخصوص محور اور تکنیک رکھتی ہے ، بلکہ برخلاف اس کے وہ ہیئتی اعتبار سے قطعہ سے زیادہ مماثلت رکھتی ہے ۔ پشتو رباعی پشتو شاعری کی کم از کم کوئی ایک ہزار سالہ پرانی صنف ہے جو افغان شعرا کی اختراع ہے ۔ یہ قطعہ کی صورت میں چار سے زیادہ مصرعوں اور موضوع کی پابندی کے علاوہ غزل کی شکل میں مختلف مضمون کے اشعار پر بھی مشتمل ہوتی ہے اور اس کا موضوع بھی زیادہ تر عشقیہ ہوتا ہے (۱) پہلے پہل رباعی کا سراغ ہمیں خرخبون بابا (۱۰۲۰ء/۱۱۴۵ھ) کی شاعری میں ملتا ہے ۔

غزل

یہ پشتو کی اپنی ملی صنف نہیں ، بلکہ باہر سے آئی ہے لیکن پشتو نے اسے کچھ یوں اپنایا کہ یہ اب اسکے خاندان کا ایک مقرر فرد بن چکی ہے ۔ غزل فارسی اور

---

(۱) ٹپہ غزالہ ۔ ص ۱۹ سطر ۶

اردو کی ایک نہایت اہم اور نمایاں صنفِ سخن ہے ۔ فارسی غزل نے جس طرح ہمارے سارے مشرق ادب کو متاثر کیا اس طرح پشتو ادب بھی اس کے سحر سے نہ بچ سکا ۔ قدیم پشتون شعرا نے غزل کو اپنانے میں ایسے انہماک سے کام لیا کہ اپنی مخصوص ملی اصناف کو یکسر فراموش کر بیٹھے ۔ چنانچہ پشتو شاعری کا جائزہ لیا جائے تو متقدمین سے لے کر دور جدید تک پوری پشتو شاعری پر غزل کچھ اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ اگر اسے نکال دیا جائے تو شائد پشتو ادب کا شعری خزانہ خالی نظر آنے لگے ۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ غزل میں پشتون شعرا نے عربی بحور کی بجائے اپنے مخصوص ملّی اوزان (سلابوں) ہی میں کہی ہے ۔ خصوصاً قدیم غزل تو تمام و کمال ملی اوزان ہی میں ملتی ہے، البتہ بعد کے شعرا میں عروضی رجحان پایا جاتا ہے ، لیکن اکثر شعرا آج بھی اپنے قدما کی تقلید میں غیرعروضی غزل کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں ۔

پشتون شعرا فارسی زبان و ادب سے شغف کے باعث غزل کی طرف راغب ہوئے ۔ ایک تو غزل ٹپہ سے زیادہ مترنم، مربوط اور دلکش تھی، پھر ٹپے کی حیثیت علمی نہ تھی ، بلکہ وہ ایک خود رو فصل کی مانند تھا ۔ ادھر غزل میں تنوع تھا ، چاشنی اور نغمگی تھی اور سب سے بڑھکر یہ کہ اس میں ایک وقار اور تمکنت کا احساس ہوتا تھا ۔ اس لیے پشتو شعرا نے اسے جلد قبول کر لیا ۔ تاہم آٹھویں صدی ہجری یعنی چودھویں صدی عیسوی تک پشتو شاعری موجودہ غزل سے آشنا نہ ہوئی تھی ۔ پہلی(۱) پشتو غزل شہر زمینداور کے رہنے والے ایک شاعر اکبر نے کہی ۔ محققین کا خیال ہے کہ اکبر صاحبِ دیوان شاعر تھا لیکن اسکے ضخیم دیوان سے صرف چند اوراق ہی دستیاب ہوئے ہیں ، جو ایک مثنوی اور چند غزلوں پر مشتمل ہیں ۔ اکبرزمینداوری نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) کے آخر میں گزرا ہے ۔ اس عہد میں اکبر کے بعد جتنے چھوٹے موٹے شاعر ہوئے انھوں نے غزل ہی کو ذریعۂ اظہار بنایا اور جب میرزا خان انصاری تک یہ سلسلہ پہنچا تو پشتو غزل خاصی وقیع اور تنومند ہو چکی تھی ۔

میرزا خان انصاری پیر روخان کے مکتبۂ فکر کا ایک نام آور شاعر ، مبلّغ اور عالم دین تھا۔ اس نے پہلے پہل پشتو غزل کو تصوف کی چاشنی سے آشنا کیا۔ تصوف سے آشنا ہوتے ہی پشتو غزل میں نکھار ، سوز و ساز ، وقار ، سنجیدگی اور پاکیزگی آگئی ۔ میرزا کو اس اعتبار سے غزل کا میر درد کہنا بے جا نہ ہوگا ۔ اس نے پشتو غزل میں تصوف کو جگہ دے کر ایک ایسی راہ نکالی جس سے بعد کے شعرا نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور تصوف کی زبان میں ایسے مسائل بیان کیے جن کا ابلاغ اورکسی طرح ممکن نہ تھا۔ اسی طرح یہ سلسلہ پشتو شاعری

---

(۱) رضا ہمدانی، پہلی پشتو غزل ، مطبوعہ ماہ نو اکتوبر ۶۵ء

کے اولین دور کے اختتام یعنی ۱۶۳۸ء/۱۰۴۸ھ تک جاری رہا۔

پشتو لوک گیتوں کے مطالعہ سے فارئبن نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ حقیقتاً ان میں لنڈی یا ٹپہ سب سے زیادہ جاندار، متنوع اور عوامی صنف سخن ہے اور اسکی قدامت کے متعلق محققین و ماہرین کی رائے قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ علامہ ابوریحان البیرونی(۱) کا خیال ہے کہ آریائی نسل کی قدیم اقوام اپنا سعری ادب رکھتی تھیں جو رگ وید کی شکل میں آج بھی ملتا ہے۔ یہ قومیں کلام موزوں میں بڑی دلچسپی لیتی تھیں اور اسکے لیے انہوں نے اپنے الگ اوزان بھی ایجاد کر رکھے تھے۔ رگ وید کا سعری سرمایہ مناجاتوں کی شکل میں ہے اور پستو کے پہلے دور کے شعرا کا بیشتر کلام بھی اسی انداز کا ہے اور ان میں مذہبی رجحان کا غلبہ بھی ہے اور مناجاتی الحاح و زاری بھی ــ قدیم مذہب کی موجودگی میں جب اسلام نے ایک جدید مذہب کی حیثیت سے آریائی اقوام میں قبولیت حاصل کی تھی تو اس خطے میں بسنے والوں کے اعتقادات میں بھی تبدیلی آ گئی جس کے ساتھ ہی سعر کے تیور بھی بدل گئے۔ لیکن روش وہی رہی، چنانچہ پشتو شاعری کے اوّلین دور سے قطع نظر بعد کے ادوار میں بھی شعری سرمایہ کا غالب حصہ مذہبی رنگ میں رنگا ہوا ملتا ہے۔

پشتو کا قدیم ترین ادب نایاب ہی نہیں بالکل عنقا ہے۔ جہاں تک قیاسیات کا تعلق ہے تاریخ کی ترتیب اور ادب کے تجزیہ میں ان سے کام نہیں چلایا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں محققین و ماہرین نے سالہا سال کی عرق ریزی سے اس کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کی کاوشوں کی رسائی دوسری صدی ہجری سے ادھر نہیں جا سکی، دوسری صدی ہجری کی شاعری کا سراغ ایک نایاب قلمی نسخے" ٹپہ خزانہ" (گنج مخفی) سے ملا ہے، جو پشتو کے مشہور فاضل محقق آقائی حبیبی کی دریافت ہے۔ یہ کتاب محمد ہوتک بن داؤد کی تالیف ہے۔ جو ۱۷۲۸ء/۱۱۴۱ھ میں لکھی گئی اور آقائی حبیبی نے اسے ۱۹۰۴ء/۱۳۲۲ھ میں دریافت کیا۔ اس میں اکیاون شعرا کا تذکرہ ہے جن میں سے کچھ مؤلف کے ہمعصر ہیں اور کچھ قدیم شعرا ہیں، جن کے متعلق محمد ہوتک نے اپنے طور پر تحقیق کی ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر اس نے یہ تذکرہ مرتب کیا ہے۔ اس کتاب نے پشتو ادب کی عمر بڑھا دی ہے، ورنہ ٹپہ خزانہ کی دریافت سے پہلے تیسری صدی ہجری سے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ٹپہ خزانہ میں امیر کروڑ (۲) کو پشتو کے پہلے شاعر اور اسکی اکلوتی رزمیہ نظم کو پشتو کی اولین نظم کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جہاں تک اس نظم کے زبان و بیان کا تعلق ہے وہ اتنی ترقی یافتہ ہے کہ اسے پشتو کی ابتدائی کوشش نہیں کہا جا سکتا۔ اسکا مثلی وزن، خالص الفاظ، سادہ افکار اور تشبیہات و

---

(۱) فارغ بخاری و رضا ہمدانی، پشتو شاعری، ص ۱۶ سطر ۱۲ تا ۱۸۔
(۲) ٹپہ خزانہ صفحہ ۲۹ تا صفحہ ۳۷

استعارات سے پاک شستہ اندازِ بیان ، اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ نظم پشتو شاعری کے ارتقائی دور کی پیداوار ہے ۔ پشتو ساعری کے یہ اوصاف ۱۳۴۹ء/۷۵۰ھ تک اسی سطح پر نظر آتے ہیں لیکن اس کے بعد پشتو زبان اسلامی تہذیب و ثقافت سے متاثر ہونے لگی اور فارسی عربی الفاظ کئی واسطوں سے اس میں بکثرت داخل ہونے گئے ۔

ملی اوزان

ملی اوزان کی پشتو شاعری کو پشتو ادب میں اصطلاحاً غیر عروضی دور سے یاد کیا جاتا ہے مثلاً اس شعر کا ہر مصرع گیارہ سیلابوں میں کہا گیا ہے ۔

اسکی تقطیع سیلابوں کے اوزان میں یوں ہو گی(۱) ۔

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱
او	رنگ	زیپ	او	ح	ح	هاں	شوند	اس	را	ف
ص	د	قہ	شہ	بھر	س	صور	غون	د	ند	اف

یا مندرجہ ذیل شعر کی تقطیع دیکھئے جسکا ہر مصرع سات سیلابوں میں ہے

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
د	دل	ب	رو	پہ	در	کاہ
نہ	حر	مب	ل	رم	نہ	بباہ

پشتو کے اپنے مِلّی اوزان کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی مخصوص مِلّی اصاف سخن بھی ہیں جن کا لوک گیتوں کی صورت میں تعارف کرایا جا چکا ہے ۔ ابتدائی دور کی شاعری میں سادہ مگر پرکار قومی ، وطنی اور مذہبی ساعری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں ۔ اس دور کی شاعری میں اگرچہ تفکر ، تجسس اور گہرائی یا گیرائی کی تلاش بے سود ہے تاہم اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ سارے کا سارا کلام پشتو کا اپنا تخلیقی ادب ہے جس پر اس کی انفرادیت کی چھاپ لگی ہے اور جس کی وجہ سے اس کی ساعری کو دنیا کی دوسری زبانوں کی شاعری سے بہ آسانی تمیز کیا جا سکتا ہے ۔

پستو شاعری

پٹہ خزانہ کے مؤلف نے اپنے تذکرے میں اکیاون شعرا کا ذکر کیا ہے ۔ کچھ شعرا "پښتانہ شعرا"، مؤلفہ آقائی عبدالحئی حبیبی میں ایسے ملتے ہیں جو بعد کی دریافت ہیں ۔ اس طرح پشتو شاعری کے پہلے دور میں جو ۷۵۶ء/۱۳۹ھ سے ۱۶۳۸ء/۱۰۴۸ھ تک یعنی نو سو سال کے طویل عرصہ کا احاطہ کیے ہوئے ہے ، ۶۵ شعرا کا یہاں سراغ ملتا ہے جن

(۱) رضا ہمدانی ، ادبیات سرحد ، ص ۳۷

میں صف اول کے شاعر بھی ہیں اور وہ بھی جو دوسرے یا تیسرے درجے کے شعرا شمار ہوتے ہیں ۔ لیکن اس طویل دور کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں انہیں ایک نہایت اہم کڑی کا درجہ حاصل ہے ۔

ان میں سے چند ایک صف اول کے شعرا کا یہاں مختصر تعارف کرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ تاکہ اس دور کی ترقی کی رفتار کا اندازہ لگایا جا سکے ۔

امیر کروڑ (ز - ۷۵۶ء/۱۳۹ھ)(۱)

یہ پشتو ساعری کے پہلے دور کا پہلا دریافت شدہ شاعر ہے جسے اس اعتبار سے پشتو شاعری کا بابا آدم کہیں تو بے جا نہ ہوگا ۔ امیر کروڑ کے والد کا نام امیر پولاد تھا ، وہ ۷۵۶ء/۱۳۹ھ میں غور مندیش کا امیر مقرر ہوا اور اپنی شجاعت کے باعث جہان پہلوان کا لقب پایا ۔ امیر کروڑ تن تنہا ایک سو مردان جنگی و سلح پوش سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتا تھا ۔ اس نے قلعہ غور ، بانسان ، خیار اور برشک پر اپنی فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑے ۔ امیر کروڑ سہاک نسل سے تھا ۔ اس کا خاندان صدیوں سے بانستان، غور اور بست پر حکمران تھا ۔ اس کا سلسلہ نسب سوری سے جا ملتا ہے ۔ امیر پولاد اس جنگ میں سرنک تھا جو ابوالعباس سفاح نے بنی امیہ کے خلاف لڑی اور ابو مسلم نے بھی اس کی حمایت کی تھی ۔ امیر کروڑ نے براہِ راست بھی بنو عباس کے ساتھ لڑائیوں میں حصہ لیا ، اس طرح اس کا شمار اسلامی لشکر کے غازیوں میں ہوتا ہے ۔ وہ ۷۷۰ء/۱۵۴ھ میں جنگ یوشنج میں لڑتا ہوا شہید ہوا ۔

امیر کروڑ ایک اولوالعزم پہلوان اور جانباز سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا ۔ چونکہ اس سے پہلے امتدادِ زمانہ سے پشتو ادب کی تاریخ گونگی معلوم ہوتی ہے ، اس لیے اب تک تمام محققین امیر کروڑ ہی کو پشتو کا اولین شاعر تسلیم کرتے ہیں ۔ ٹپہ خزانہ سے امیر کروڑ کی صرف ایک ہی نظم دستیاب ہوئی ہے جو حماسی شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے ۔ ملاحظہ ہو :-

میں شیر ہوں، روئے زمین پر مجھ ایسا پہلوان نہیں
ہند و سندھ اور تخار و کابل میں بھی نہیں
زابل میں بھی مجھ سے بڑا پہلوان نہیں ۔
میرے عزم و ہمت کے تیر دشمنوں پر بجلی کی طرح برستے ہیں ،
میں میدان جنگ میں شکست خوردہ دشمن پر ترکتاز کرتا ہوں ۔
مجھ جیسا پہلوان روئے زمیں پر نہیں !

---

۱ ۔ ’ ز ‘ - سے مراد زندہ ہے ۔ اس نشان سے مصنف کا عہد متعین کیا جا رہا ہے ۔

آسمان میری فتوحات پر فخر سے جھومتا ہے
میرے گھوڑے کے سموں سے زمین لرزتی ہے، پہاڑ زیر و زبر ہوتے ہیں
میں شہروں کو ویران کرتا ہوں ، مجھ ایسا پہلوان کہیں نہیں !
میری تلوار نے ہرات و حروم کو فتح کیا
غرج و بامیان والے میرے نام کو اپنے دکھوں کا علاج کہتے ہیں !
میں روم میں بھی مشہور ہوں ،
مجھ جیسا پہلوان کہیں نہیں ۔ (ترجمہ)

شیخ رضی لودھی (م۔ ۹۶۲ء/۳۵۱ھ)

شیخ رضی علوم دینوی سے بہرہ مند ایک عالم فاضل انسان تھا ۔ اس کی زندگی کے تفصیلی حالات نہیں ملتے ۔ پٹہ خزانہ میں کامران خان کی کتاب 'کلید کامرانی' کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیخ رضی لودھی شیخ حمید کا بھتیجا تھا ۔ جب شیخ حمید نے ملتان کی حکومت سنبھالی تو شیخ رضی کو حکم دیا کہ جاکر پشتونوں میں اسلام کی تبلیغ کرے ۔ وہ دو سال تک یہ فریضہ انجام دیتا رہا اور اس نے کوہ سلیمان میں بہ کثرت لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا ۔ شیخ حمید کے بعد اس کا بیٹا شیخ نصر ملتان میں تخت نشین ہوا ۔ چونکہ وہ اسماعیلی علماء کے زیر اثر تھا اس لیے اس نے اپنی قلمرو میں اسماعیلی عقائد کی اشاعت شروع کی ، جب شیخ رضی کو علم ہوا تو اس نے نصر کو لکھ بھیجا :۔

تو الحاد کی طرف مائل ہو گیا
اور ہمارے دین کو باطل کہنے لگا !
ہم نے بڑی زحمت اٹھا کر دین کو روشن کیا
تو نے الزام لگا کر اسے تاریک بنا دیا
پہلے ہی تو نے اسے کیوں قبول کیا
اگر اپنا دین تجھے تبدیل کرنا تھا ؟
تو نے اس دین کو چھوڑ دیا
جسے تیرے آبا روشن کرتے رہے ۔ (ترجمہ)

شیخ بیٹن (م۔ ۱۰۰۹ع/۴۰۰ھ)

پشتو کے اکثر تذکرہ نویسوں نے شیخ بیٹن کا ذکر کیا ہے لیکن تفصیلی حالات کہیں نہیں ملتے ۔ بعض اسماءالرجال اور علم الانساب کے ماہرین کا خیال ہے کہ شیخ بیٹن

پشتونوں کا جدِّ امجد ہے اور وہ غرغشت اور سٹر بن کا بھائی ہے ۔ ابوالفضل نے بھی آئینِ اکبری میں یہی رائے ظاہر کی ہے ۔ نعمت اللہ ہروی اور خان جہاں لودھی نے بھی مجمع الانساب و اخبار احمدی کے حوالوں سے اس کی تائید کی ہے اور اخوند درویزہ بھی اس رائے سے متفق ہے ۔ ایک پشتون مؤرخ سلیمان ماکو نے اپنی کتاب ''تذکرۃ الاولیا'' میں شیخ کو ولی اللہ اور صاحب کشف و کرامات بزرگ بتایا ہے ، جس کی تائید نعمت اللہ نے مخزن میں کی ہے ۔ اس کے علاوہ بہت سی ثقہ شہادتوں سے شیخ کی بزرگی اور ولایت کا پتہ چلتا ہے ، لیکن ان کے حالات اور افکار نہیں ملتے ، صرف ایک مناجات کے کچھ اشعار سلیمان ماکو نے کہیں سے محفوظ کیے ہیں ، ملاحظہ ہوں :-

اے عظیم خدا ، اے عظیم خدا !
تیری محبت میں ہر جگہ
پہاڑ تعظیماً ایستادہ ہیں ۔
سب مخلوق تیری ہی عبادت کرتی ہے ،
یہاں پہاڑوں کے دامن میں
جہاں ہمارے ہاں خیمے کھڑے ہیں
اے مخلوق زیادہ کر اے خدا
اے عظم خدا ، اے عظیم خدا !
یہاں ہمارے ہاں آگ جل رہی ہے
چھوٹا سا گھر اور چھوٹا سا ٹھکانہ ہے
ہم نے تیری محبت میں یہاں ڈیرے ڈالے ہیں ،
کسی اور کی طرف نہیں جاتے ۔
آسمان اور زمین تو نے ہی پھیلائے ہیں
موت اور حیات تیری ہی طرف سے ہے
یہ ربوبیت تجھے ہی سجتی ہے
اے عظیم خدا ، اے عظیم خدا !
اے عظیم خدا ، اے عظیم خدا ! (ترجمہ)

شیخ کے نام میں تذکرہ نویسوں نے اختلاف کیا ہے کسی نے بیٹ ، کسی نے بیٹن ، کسی نے بٹن اور کسی نے بیٹ بن لکھا ہے ۔ شیخ اور اس کی اولاد کا مسکن ، ''کسی غر'' تھا جسے کوہ سلیمان کہتے ہیں ، وہاں شیخ کے خاندان اور بعض دوسرے پشتون

بزرگوں کے مقبرے اب بھی ملتے ہیں ۔

شیخ اسماعیل (ز۔ ۱۱۰۶ء/۵۰۰ھ)

شیخ اسماعیل سڑبنی شیخ بیٹن کا فرزند تھا ۔ اس کی پرورش اپنے چچا سڑبن کے زیر سایہ ہوئی ، اس لیے وہ سڑبنی کہلایا ۔ وہ شیخ احمد کا ہمعصر اور ہم طریقت تھا ۔ یہ دونوں حضرات شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی کے مرید تھے ۔ شیخ احمد نے روہستان میں رشد و ہدایت اور تبلیغ کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا ۔ اسی جگہ ان دونوں کی ملاقات ہوئی ۔ حضرت بہاءالدین نے دونوں کو خرقہ ہائے خلافت و مصلائے زہد عطا فرمائے ۔ ان دونوں بزرگوں کے مزار کوہ سلیمان میں مرجع خلائق ہیں ۔

شیخ اسماعیل کا کلام نایاب ہے سلیمان ماکو نے اپنی کتاب میں ان کے صرف چنداشعار نقل کیے ہیں ۔ صوفی منش ہونے کے باعث ان کے اشعار میں اخلاقی رجحان کا غلبہ ہے ۔ دیکھئے :-

شیطان سے بھاگنا چاہیے ۔
جب وہ کسی کو نظر آجائے ،
تو وہاں سے دور رخصت ہو جاتا ہے
اورتمام زمین پر اندھیرا چھا جاتا ہے ،
آدمی شیطان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے
اور وہ کند چھری سے زخمی ہو جاتا ہے ۔
جس نے شیطان کی نہ مانی
وہ شخص زیارت کے قابل ہے ،
جو کوئی ابلیس کے دھوکے میں آگیا
اس کے گھر صفِ ماتم بچھ جاتی ہے ۔ (ترجمہ)

شیخ خرخبون سڑبنی (م۔ ۱۰۲۰ء/۴۱۱ھ)

شیخ خرخبون سڑبنی کوہ سلیمان کے سلسلوں میں رہتا تھا ، وہ عبدالرشید بابا کا پوتا تھا اور صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھا ۔ بعد میں وہاں سے اٹھ کر معہ اہل و عیال قندھار کے جنوب مشرق کی طرف عورہ مرغہ میں جا کر آباد ہوگیا ۔ شیخ خرخبون کی پرورش شیخ اسماعیل نے کی تھی ۔ اسے خرخبون سے بڑا لگاؤ پیدا ہوگیا تھا اس لیے قدرتی طور پر شیخ اسماعیل کو اس جدائی سے بڑا شاق ہوا اور اس نے شیخ خرخبون کی یاد میں فراقیہ اشعار بھی کہے ۔ اس کے جواب میں خرخبون بابا نے جو اشعار کہے ہیں ان کی تکنیک چار

مصرعی ہے، جسے ٹپہ خزانہ کے مؤلف نے (خلوریح د خرخبون بابا) خرخبون بابا کی رباعی کے عنوان سے نقل کیا ہے ، لیکن وہ فارسی رباعی سے مختلف ہے، بلکہ مربع قسم کی نظم یا قطعہ معلوم ہوتا ہے اور موضوع کے اعتبار سے تو اسے بلا تکلف غزل کہا جاسکتا ہے۔ پشتو شاعری میں عشق و فراق کے موضوع پر یہ پہلی نظم ہے اور ساتھ ہی غزل کی پیشرو بھی۔ خرخبون بابا نے ۱۰۲۰ء/۴۱۱ھ میں وفات پائی۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

میرے گھر میں فراق کے نعرے گونج رہے ہیں !
معلوم نہیں کیا پیش آنے والا ہے۔
آنکھوں میں خون لیے دوستوں سے جدا اور دور افتادہ رہوں گا !
میری دونوں آنکھوں سے خون بہہ رہا ہے ،
اے اسماعیل تیری فریاد نے میرے دل کو پارہ پارہ کر دیا ہے
فراق نے خرخبون کو پھر تجھ سے جدا کر دیا ہے !
تو میری یاد سے نہیں اترتا
ہر لحظہ غم کی چھری میرے دل کی رگوں کو کاٹتی ہے !
میں جاتا ہوں کہ طویل سفر درپیش ہے
زاد سفر ساتھ لوں گا
تمہاری یاد ہمیشہ میرے دل کو شاد رکھنے کے لیے کافی ہے ،
خواہ یہ زمین اور پہاڑ زیر و زبر ہوجائیں۔ (ترجمہ)

ملک یار غرشین (ز- ۱۱۷۵ء/۵۷۱ھ)

ملک یار مشہور پشتون قبیلے غرشین سے تعلق رکھتا ہے، جو سڑبن کی ایک شاخ ہے۔ پشتو میں غر پہاڑ کو اور شین سرسبز کو کہتے ہیں۔ روایت ہے کہ ملک یار کے کسی بزرگ نے ایک خشک پہاڑ کو اپنی کرامت سے سرسبز بنا دیا تھا جس کی وجہ سے یہ سارا قبیلہ غرشین کہلانے لگا۔ ملک یار خود بھی بہت بڑا ولی تھا۔ خان جہان لودھی نے لکھا ہے کہ ملک یار ملتان چلا گیا تھا اور وہیں اس نے انتقال کیا۔ لیکن سلیمان ماکو کی تحقیق کے مطابق اس نے دہلی میں وفات پائی۔ اس کا صرف ایک ہی رجز ملتا ہے جو حماسی شاعری کا نادر نمونہ ہے۔ اسے پشتون ماحول کی عکاسی نے لاثانی بنا دیا ہے :-

اللہ ہمارے ساتھ ہے اب ہماری یلغار ہے !
یہ دیس پرایا ہے
غازیو ہوشیار رہو   اللہ ہمارے ساتھ ہے

تلواریں تیز کر لو　　دشمن کو کاٹ ڈالو
اپنے پنجے سرخ کر لو
ہم کیوں بھاگیں　　اللہ ہمارے ساتھ ہے -
اگر ہم ثابت قدم رہے　　تو جیت ہماری ہی ہوگی
کیونکہ ہم شیر ہیں
اسلام ہمارے ساتھ ہے -
اسلام ہمارے پاس ہے　　اللہ ہمارے ساتھ ہے
اے غازیو آؤ　　سب گھیرا ڈال لو
شہاب کی حمایت کرو
دشمن کو کچل دو　　اللہ ہمارے ساتھ ہے !　　(ترجمہ)

بختیار کاکی (م - ۱۲۳۶ء/۶۳۴ھ)

حضرت قطب‌الدین بختیار کاکی مشہور و معروف ولی گزرے ہیں جن کی بے شمار کرامات ہیں - اس لیے وہ صوفیائے کرام کے نزدیک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں - آپ نے ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ یا بقول فرشتہ ۱۲۳۶ء/۶۳۴ھ میں وفات پائی - آپ کا مزار دہلی میں مرجع خلائق ہے - شعر وسخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے فارسی اور پشتو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے - سلیمان ماکو نے اپنے تذکرے میں ان کی صرف ایک نظم رقم کی ہے جو تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے :-

آہ و فریاد نے دل چھلنی کر دیا ہے ، اے محبوبہ میری طرف دیکھ !
تیرے فراق میں دردمند دل سے ہوک اٹھتی ہے !
اے محبوبہ میری طرف دیکھ ، میری طرف دیکھ
تیرے فراق کی آگ دل میں جل رہی ہے !
محبت میں دیوانہ ہوگیا ہوں ، تنکے کی طرح چل رہا ہوں
اے محبوبہ میری طرف دیکھ !
تو نے گیسو بکھیر دیے ہیں ، میرے دل میں آگ لگی ہے !
میں بختیار آتش عشق میں جل کر راکھ ہو چکا ہوں ،
اے محبوبہ میری طرف دیکھ !　　(ترجمہ)

شیخ متی (۱۲۲۶ھ - ۱۲۸۹ھ)

شیخ متی ساتویں صدی ہجری یعنی تیرھویں صدی عیسوی کے غیر اوزانی

دور کا ممتاز شاعر ہے ۔ وہ غوریا خیل سٹر بنی قبیلے سے تھا ، زاہد ، متقی اور فقیر منش عارف تھا ۔ اس نے ملی اوزان میں عارفانہ چاشنی کے ساتھ پشتو مناجات اور منقبت کو اوج اور عظمت سے ہمکنار کیا ۔ کہتے ہیں اس کی کتاب " دخدائے مینہ " (خدا کی محبت) جو عارفانہ اشعار اور مناجات پر مشتمل تھی، اس کے مزار پر پڑی رہتی تھی اور زائرین ذوق و عظمت سے اس کا مطالعہ کرتے تھے لیکن مغلوں کی یلغار میں وہ کتاب ضائع ہو گئی ۔ اس مجموعہ کی صرف ایک مناجات ٹپہ خزانہ کے مؤلف نے اپنے والد کی زبانی سن کر پیش کی ہے :-

"اونچے اونچے پہاڑوں اور صحراؤں میں
ہنگام سحر اور نیم شب آواز نے
اور نوائے طیور ، ماتم زدوں کے نالہ و شیون
یہ سب تیری ہی یاد میں ہے !
یہ تمام مظاہر عشق ہیں !
پھول صحرا میں کھلے ہیں ،
باغ میں ہنس رہے ہیں ،
یا دریائے ترنگ مٹیالہ اور خروشان بہہ رہا ہے
یہ سب کچھ تیری محبت کی وجہ سے ہے !
یہ تمام آرائش و زیبائش تیرے ہی دست قدرت کی مرہون ہے
اے خدا تو بادشاہوں اور حفاظت کرنے والوں کا محافظ ہے "۔ (ترجمہ)

یہ اس طویل نظم کے صرف دو بند ہیں جو سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ فن کا بھی ایک اعلیٰ نمونہ ہیں ۔ اسلوب بیان نے اسے متنوع بنا دیا ہے اور منظر نگاری نے مناجات کو روایتی ، خشک اور بے مزہ اشعار کا مجموعہ نہیں رہنے دیا ۔

ملا مست زلند (۱۵۴۳ء - ۱۵۹۱ء)

ملا مست مشہور و معروف عالم فاضل اور صوفی شاعر تھا ۔ اس کی تصنیفات میں "سلوک الفردات" مشہور و مقبول کتاب ہے ، جس میں جہاد کی تلقین ہے ۔ اسے پشتو کے قدیم ادب میں بہت بلند درجہ حاصل ہے ۔ دوسرے رسائل میں مذہبی ، فقہی اور اخلاق تعلیمات ہیں ۔ ملا مست اخوند توغی کے ممتاز تلامذہ میں سے تھا ۔ اپنی تحریروں میں اس نے اس کا اعتراف کیا ہے اور اپنے استاد کی جگہ جگہ تعریف کی ہے ۔ نثر کے علاوہ ان کا شعری کلام بھی قلمی نسخوں کی صورت میں ملتا ہے جو عقائد ، غزلیات اور مراثی پر

مشتمل ہے ۔ شعری ذخیرہ زیادہ وافر نہیں ، جو ہے اس میں اخلاق اور مذہبی موضوع یا پھر غازیوں کی تعریف اور جہاد بالسیف کی تبلیغ ہے ۔ مثلاً :-

اللہ اسے دونوں جہاں کا سردار بنائے !
جو کوئی نبی کریمؐ کی پیروی کرے ۔
حضرت کو ہمیشہ جہاد سے محبت رہی
امت کو چاہیے کہ اپنے بازو آپ کی راہ میں استعمال کرے ۔ (ترجمہ)

★ ★ ★

دنیا کی دلہن بوڑھی ہے !
ہر کسی سے یہیں رہ جائے گی ، غم نہ کھا۔
اے مست تو قناعت جیسی دولت کا مالک ہے
دونوں جہان تیرے ہیں ، غم نہ کھا ۔ (ترجمہ)

میرزا خان انصاری (م - ۱۶۳۰ء/۱۰۴۰ھ)

میرزا خان انصاری کی تاریخ پیدائش و وفات کا صحیح تعین نہیں کیا جا سکا ۔ البتہ یہ بات مسلم ہے کہ اس کا دور ۱۵۵۲ء/۹۶۰ھ سے ۱۶۳۰ء/۱۰۴۰ھ تک ہے ۔ میرزا کے شاگرد رشید دولت خان لوہانی کے ایک شعر سے مرزا خان کے سن وفات کی تصدیق ہوتی ہے جس کا ذیل میں ترجمہ دیا جاتا ہے ۔

"جب میرزا دکن کی جنگ میں شہید ہوا
تو اس وقت سال (۱۶۳۰ء/۱۰۴۰ھ)تھا"۔ (ترجمہ)

میرزا کا نام فتح خان تھا اور وہ یوسف زئی قبیلے سے تھا ۔ بعض مورخین تیراہ اور بعض خیبر اس کا مسکن بتاتے ہیں ، حالانکہ ان دونوں مقامات پر یوسف زئی نہیں پائے جاتے ۔ یہ قبیلہ سوات اور مردان کی وادی میں ملتا ہے ۔ ہو سکتا ہے تیراہ یا خیبر میں اس نے کچھ وقت گزارا ہو ۔ مرزا خان کے گاؤں کا نام مہندر بتایا جاتا ہے لیکن اس کے متعلق کچھ پتہ نہیں چل سکا کہ یہ گاؤں کس علاقے میں ہے ۔

میرزا پشتو کا سب سے پہلا شاعر ہے جس نے خود اپنا دیوان مرتب کیا ۔ وہ اوزانی دور کا بھی پہلا شاعر ہے اور سب سے پہلے اسی نے پشتو غزل کو تصوف کی چاشنی سے بھی روشناس کرایا ۔ میرزا کی غزل میں جوش ، خلوص اور انہاک ہے ۔ صوفیانہ رنگ کی غزلیں اکثر و بیشتر مسلسل ہیں ، جن میں تصوف کی باریکیوں کو

نہایت سلیس اور پاکیزہ رنگ میں پیش کیا گیا ہے ۔ جہاں کہیں حسن و عشق کے معاملات آ گئے ہیں ، وہاں بھی ابتذال کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا ۔ اس نے آتے ہی پشتو شاعری میں زندگی کی نئی روح پھونک دی ، غزل کو متانت اور سنجیدگی عطا کی اور تصوف کا موضوع دے کر اس میں ایسی حلاوت اور چاشنی پیدا کی ، جس نے پشتو غزل کو قبولیت اور ہر دلعزیزی کی سند دلا دی ۔ چنانچہ پشتو کے سارے علاقے میں اس کا طوطی بولنے لگا ۔

میرزا نے نظم بھی کہی ہے لیکن اس کا حقیقی میدان غزل ہے ، جس میں تصوف کے موضوع کو اس نے نہایت فنکارانہ طور پر سمویا ہے ۔ وہ پیر رو خان کا مریدِ خاص اور دست راست تھا اور اس کے روحانی مکتبۂ فکر کا مبلّغ بھی تھا اور نہایت کامیاب مقلّد بھی ۔ اپنی اس عقیدت کا اظہار اس نے اکثر کیا ہے ۔ مثلاً کہتا ہے :

''میرزا کا کلام پیر روخان کی برکت سے شیریں ہے'' (ترجمہ)

میرزا عالم فاضل اور زاہد و متقی بزرگ تھا ۔ اس کا سارا کلام تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ وہ وحدت الوجودی تھا اور اس فلسفے کو اس نے اپنی غزل کا موضوع بنایا ۔ مثلاً:۔

''وہ کثرت کے بازار میں آ گیا ہے اور ہر چیز میں موجود ہے'' ۔

"جب میں برباد دل کے ساتھ محبوب کی محبت کے خواب دیکھتا ہوں
تو پھر فضول لوگوں کا احسان کیوں اٹھاؤں ،
اپنے دوست نے مجھ پر اپنی یاد کا داغ لگا دیا ،
میں اس داغ کا نقش بعینہٖ اپنی پتلیوں میں رکھوں گا ۔
میں کیا بتاؤں کہ کیا ہوں ، میری نیستی اور ہستی اسی سے ہے ،
جو نیست سے ہست ہو جائے اس ہستی سے مراد میں ہوں ،
وصال کی ہوا میں اڑتا ہوں ۔ میں اس لامکاں کا طائر ہوں !
کبھی سورج کے سامنے ذرہ ہوں ، کبھی پانی پر حباب کی مانند ہوں !
میں نے چار عناصر کی چادر اوڑھ لی ہے اور آسمان کے لیے محو خواب ہوں ،
وحدت سے کثرت میں آ گیا ہوں ایسی کوئی چیز نہیں جو مجھ میں نہ ہو'' (ترجمہ)

مرزا(۱) کی شاعری کا لوہا بعد کے تمام پشتون شعرا نے مانا ہے ۔ خوشحال خان کہتا ہے ۔

(۱) ہمیش خلیل (مرتب)' دیوان مرزا خان انصاری

میں نے پشتو میں کسی میں یہ وزن نہیں دیکھا۔
جو وزن مرزا نے استعمال کیا ہے۔ (ترجمہ)

کاظم خان شیدا نے یوں اعتراف کیا ہے۔
"مرزا دولت اور واصل کا کلام بہترین ہے" (ترجمہ)

اس طرح اشرف خان ہجری اور دولت لوہانی و غنی نے بھی میرزا کے فن کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ میجر راورٹی کی روایت کے مطابق میرزا ایک سیاح تھا جو ہرات سے آگرے تک سارے برِصغیر اور افغانستان میں مشہور تھا اور اس سارے علاقے میں اس کے بے شمار مرید تھے۔ دولت کے کلام سے معلوم ہوا ہے کہ مرزا نے شاہ جہان کی فوج میں ملازمت کر لی تھی، جہاں اس نے دکن کی جنگ میں شہادت پائی۔ دبستان مذاہب کے مؤلف نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

دولت لوہانی(۱) (م - ۱۶۴۸ء/۱۰۵۸ھ)

شیخ دولت اللہ نام تھا دولت تخلص اختیار کیا۔ کہتا ہے:-
میرا نام دولت اللہ ہے
لیکن لوگ مجھے فقیر دولت کہتے ہیں (ترجمہ)
والد کا نام داؤد تھا۔ مثلاً کہتا ہے:-
اے داؤد لوہانی کے بیٹے کمینوں کی تعریف نہ کر! (ترجمہ)

دولت ننھیال کی طرف سے وردگ قوم سے تھا اور دودھیال کی جانب سے لوہانی قبیلے کی ایک شاخ حسن خیل سے تھا۔ لوہانی پشتونوں کی ایک بہت بڑی قوم ہے اور پشتو تاریخ میں اسکا ذکر موجود ہے لیکن یہ قوم لوہانی کی بجائے لوانی کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ معروف مستشرق (۲) راورٹی لکھتا ہے کہ دولت اصل کا ہندو تھا جو بعد میں مسلمان ہوا۔ تاریخ پیدائیس کے متعلق تذکرے خاموش ہیں۔ البتہ ۱۶۴۸ع/۱۰۵۸ھ میں دولت حیات تھا، کیونکہ مرزا خان انصاری کی وفات پر اسکا قطعہ تاریخ موجود ہے، جیسے:-

دکن کی لڑائی میں شہید ہوا خدا اسے بخشے
۱۶۳۰ع/۱۰۴۰ھ میں وہاں گیا تھا
ایک آہ کے ساتھ اسکی روح تن سے جدا ہو گئی
غ - ن - ح اس کی تاریخ شہادت ہے (ترجمہ)
۱۶۴۸ھ/۱۰۵۸ء

---

(۱) کلیات کا قلمی نسخہ مرتبہ ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء برٹس میوزیم میں موجود ہے
(۲) پشتو گرائمر

اسکے علاوہ دولت کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے چالیس برس سے زیادہ عمر پائی :-

میں بچہ تھا تو ایک افسانہ تھا ، دنیا سے بیگانہ تھا !
اب میری عمر چالیس سے زیادہ ہے لیکن ابھی تک دنیا سے بیگانہ ہوں ! (ترجمہ)

دولت روخانی مکتبہ فکر کا ایک مشہور شاعر ہے اور پیر روخان کے حلقۂ ارادت سے تعلق رکھتا ہے ، چنانچہ کہتا ہے

میں فقیر دولت پیر روخان کا مرید ہوں
اسکے دامن سے اپنا ہاتھ الگ نہیں کروں گا (ترجمہ)

دولت صاحب دیوان شاعر ہے اس کا کلیات پانچ ہزار اشعار پر مشتمل دو دفتروں کی صورت میں ہے - وہ پُرگو صوفی شاعر ہے لیکن دوسرے شعرا کے برعکس اس میں سلاست اور روانی ہے - اس نے وحشی الفاظ، نامانوس تراکیب اور دقیق اصطلاحات سے گریز کیا ہے - ملاحظہ ہو :-

جس پھول کو بھی میں غور سے دیکھتا ہوں
اس میں ایک ہی آشنا کا نشان ملتا ہے !
خود بیں کی آنکھیں اندھی ہیں ، وہ دیکھ نہیں سکتا
ورنہ حق ظاہر ہے ، غائب نہیں !
بایزید ، حسن ، جنید ، مولانا رومی ، شمس تبریز
عطار فرید ، مغربی ، سوری ، جامی ، خاقانی
ارزانی ، میرزا انصاری ، مخلص اور احمد سعید میرے بیان کی تصدیق کرتے ہیں !
(ترجمہ)

یہی روح دولت کے تمام کلام میں جاری و ساری ہے جو اکثر غزلوں کی صورت میں ہے، مثلاً :-

ظاہر و باطن صرف ایک ہی اللہ ہے !
صورتیں بہت ہیں لیکن محبوب ایک ہے -
کثرت کے حساب پر نہ جا
مومن بہت ہیں لیکن ایمان ایک ہے !
صدف میں موتی اور سانپ میں زہر بن جاتا ہے ،
حالانکہ ابر نیساں سب جگہ یکساں برستا ہے !

مجاز کی چادروں نے منہ ڈھانپ رکھا ہے ،
لیکن دولت کے دل کا ظاہر باطن ایک ہے ! (ترجمہ)

ارزانی (ز۔ ۱۵۹۱ع/۱۰۰۰ھ)

اخوند درویزہ(۱) لکھتے ہیں کہ ملا علی ارزانی خویشگی میں اپنے دو بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا ، بعد میں ہندوستان گیا اور پیر روخان کا ساتھی بن گیا ۔ ''خیرالبیان'' کی تصنیف میں اس کی کوششیں شامل تھیں ۔ وہ بلند فکر اور فصیح شاعر تھا ۔ عربی ، فارسی ، پشتو اور ہندی چار زبانوں کا ماہر تھا اور چاروں میں شعر کہتا تھا ۔ اس نے ''چہار رما'' کے نام سے پشتو نثر میں ایک کتاب لکھی ۔ خوشحال خان ، رحمان بابا اور دولت نے بھی ارزانی کی تعریف کی ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ مشہور شاعر تھا ۔ چونکہ پیر روخان کا ہم‌عصر تھا اس لیے ۱۵۹۱ع/۱۰۰۰ھ کے لگ بھگ اس کے عہد کا تعین کیا جا سکتا ہے ۔ میجر راورٹی (۲) نے پشتو گرائمر کے دیباچہ میں قاسم علی خان آفریدی کے ایک قصیدے کے حوالے سے اس کا ذکر کیا ہے ۔

مسٹر ڈارمسٹر (۳) نے بھی اپنی کتاب میں ارزانی کو پشتو کے قدیم شعرا میں شمار کیا ہے ۔ وہ ایک صوفی منش اور عالم شاعر تھا۔ کلام کی مثال ملاحظہ ہو :۔

خدا کے بعد تعریف کرتا ہوں
نبیوں اور اپنے عظیم پیغمبرؐ کی !
دس یار اس کے چراغ تھے
جن سے دنیا کو روشنی ملی !
ابوبکر یار غار تھا ، عمر عدل میں بے مثال تھا !
ایک عثمان دوسرا علی تھا ایک بہادر دوسرا حیادار تھا !
سعد ، سعید ، طلحہ اور زبیر سب دنیا سے نفرت کرتے تھے ،
اور عبید اور عبدالرحمٰن تھے جو اہل صفا کا خلاصہ تھے ۔
یہ دس اولیاء عشرہ مبشرہ کہلاتے ہیں ،
اور ارزانی نے پشتو میں سچ مچ یہ نادر غزل کہی ہے ۔ (ترجمہ)

مخلص (ز۔ ۱۵۹۱ع/۱۰۰۰ھ)

مخلص کا نام علی محمد تھا وہ پیر روخان کا ساتھی اور ہم عصر تھا ۔ دولت کہتا ہے

---

(۱) تذکرۃالابرار و الاشرار صفحہ ۱۳۹
(۲) دپښتو گرائمر مقدمہ
(۳) دپختو لخواد شعر نار او بہار

کہ وہ پیر روخان کا خلیفہ تھا ۔ دوست ارزانی اور مخلص کا بہت مداح ہے اور اپنے کلام میں اس نے انہیں بے حد سراہا ہے ۔ مخلص کے بعض دوسرے معاصرین اور بعد کے شعرا نے بھی اس کی بہت تعریف کی ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ صاحب اثر شاعر تھا ۔ مرزا خان انصاری اور دولت ۱۵۹۱ء/۱۰۰۰ھ میں زندہ تھے ۔ مخلص ان کا ہم عصر تھا اس لیے اس کا عہد بھی یہی ہو سکتا ہے ۔ ارزانی کی طرح مخلص کا بھی اخوند درویزے اور مسٹر راورٹی نے ذکر کیا ہے ۔ مخلص صوفی شاعر تھا، اس تمام کلام اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے ۔ مثلاً :۔

عاشق کے دل پر بوجھ ہے
غم ہجر نے دل میں کانٹے چبھو دیے ہیں !
فراق میں وصال کے غم سے چلتا ہوں
کیوں کے وصل میں ہجر کا غم تعاقب کرتا ہے !
بلبل باغ میں اس لیے رو رہی ہے
کہ باد خزاں نے پھولوں کو غارت کر دیا ہے !
عاشق کے چہرے پر ہمیشہ آنسو غمازی کرتے ہیں
اور اس کے دل کا راز فاش کر دیتے ہیں ۔ (ترجمہ)

پشتو نثر

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح پشتو کا نثری سرمایہ بھی شعری سرمایہ کے مقابلہ میں بہت کم ہے، لیکن تاریخی اعتبار سے پشتو نثر اتنی قدیم ہے کہ ایشیائی زبانوں کی اگلی صفوں میں اس کا شمار ہونا چاہیے ۔ کچھ عرصہ پہلے ماہرین آثار قدیمہ نے (ایران میں) ایک کتبہ دریافت کیا جو پانچ صد سال قبل مسیح کا ہے ۔ خط میخی میں کندہ ہے اور اس میں یہ تین فقرات بھی ملتے ہیں (۱) ۔

نہ اڑیک یم	نہ میں ضدی یا اڑیل ہوں
نہ دروژن یم	نہ میں جھوٹا ہوں

(۱) Persian Inscriptions, Tolman, 1893.
Page 69, lines 5 and 6 (Transliteration).
Page 134, lines 17-19 (English Translation).

یہ تین سطور کوہ بستون پر دارا بستاسپس کے چوتھے کتبے سے لی گئی ہیں جو خط میخی میں کندہ کی ہوئی ملتی ہیں اور فارسی قدیم میں ہیں ۔ یہ کتبہ پانچ صد سال قبل مسیح کے قریب کندہ ہوا تھا ۔

نہ زور کڑے یم   نہ میں جابر یا ظالم ہوں

یہ فقرے اپنی ساخت، مفہوم اور معنویت کے اعتبار سے خالص پشتو زبان کے ہیں ۔ ایسی ٹھیٹ پشتو کے جو اڑھائی ہزار سال گذرنے پر آج بھی یہاں کے قبائلی علاقوں میں بعینہٖ اس طرح بولی جاتی ہے ۔ اس دریافت سے نہ صرف پشتو زبان کی قدامت کا ثبوت ملتا ہے بلکہ پشتو نثر کی عمر بھی خاصی طویل ہو جاتی ہے ۔ پشتو کی قدامت کے متعلق مشہور افغان مؤرخ محمد امین خوگیانی لکھتے(۱) ہیں :-

"پشتو کی قدامت مسلم ہے اس لیے کہ ایک تو اوستا، وید اور مہابھارت میں اس کا ذکر آیا ہے دوسرا یونانی مورخین استرابو اور ہیروڈٹس نے اسکندر کے حملے سے پہلے اس کا ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ پشتو ایک عوامی زبان تھی جسے علمی زبان بنانے کے لیے علماً جمع ہوئے ۔ انہوں نے اسے مہذب بنایا ۔ اسے نامانوس اور وحشی الفاظ سے پاک کیا اور اس کے لیے قواعد بنائے، آوازیں متعین کیں اور اس کا الگ نام رکھا"

پشتو میں تلفظ کے اختلاف کے سلسلہ میں راورٹی لکھتا ہے :-

"پہلے زمانہ میں اور ایک حد تک اب بھی پہاڑی علاقوں میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں ان میں تلفظ اور لہجے کا بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے ۔ اس لیے کہ اس علاقے میں بسنے والے قبائل ایک دوسرے سے آزاد ہوتے ہیں ۔ یہاں ذرائع آمد و رفت

---

(۱) پشتو زبان و ادب کی تاریخ (قلمی مسودہ) از محمد امین خوگیانی (اوستا، وید، مہابھارت استرابو اور ہیروڈٹس کے حوالے پوری کوشش کے باوجود نہیں مل سکے ۔ ان میں کہیں بھی ہم پشتو زبان کا ذکر نہیں دریافت کر سکے۔ البتہ اوستا اور وید میں بخد یعنی بلخ (پختونوں کا اولین وطن) اور پکھت یعنی پختون قبیلہ کا ذکر ضرور ملتا ہے ۔ دیکھئے :-

"The fourth of the good lands and countries which I, Ahura Mazda, created, was the beautiful *Bakhdhi*, with high-lifted banners (trans)."

Vedic Index of Names and subjects by Macdonnel and Keith.
Paktha, a tribe of the North-West,
V. I, P. 39, P. 265, P. 320, P. 463, P. 464.
V. II, P. 313, P. 381. P. 542.

ژند اوستا کی عبارت ونیداد سے ماخوذ ہے جو عہد ہخا منشی (۶۵۰ ق م - ۳۳۰ ق م) میں مرتب ہوا ۔ ویدوں کا شماریہ زیادہ تر رگ وید کا ذکر کرتا ہے ۔ مثلاً جلد دوم کے صفحہ ۳۸۱ پر رگ وید کا حوالہ موجود ہے اور ویدوں کی تصنیف تخمیناً ۱۰۰۰ (ق م) سے ۵۰۰ (ق م) کے درمیان ہوئی ۔ رگ وید سب سے پرانا بتایا جاتا ہے ــــــ ادارہ)

محدود ہیں اس لیے زبانیں بھی آپس میں خلط ملط نہیں ہوتیں، نہ ہی باہر کا اثر قبول کرتی ہیں ۔ اس لیے ہر قبیلے کی الگ بولی ہوتی تھی“ ۔

محققین کی ان آرا کی روشنی میں حالیہ دریافت شدہ کتبے کے مذکورہ تین فقرے پشتو کی کم و بیش اڑھائی ہزار سالہ قدامت کا ایک واضح ثبوت ہیں ، جنہیں بنیاد بنا کر ہم آگے چل سکتے ہیں، لیکن اتفاق یہ ہے کہ اس کے بعد سلیمان ماکو کی کتاب تذکرۃ الاولیا مصنفہ ۱۲۱۵ء/۶۱۲ھ تک یعنی سترہ سو برس تک تاریخ کے صفحات گنگ ہیں ۔ اس دریافت شدہ کتبے کے کوئی بارہ سو سال بعد امیر کروڑ ۷۵۶ء/۱۳۹ھ کی اولین نظم سے ہمارا تعارف ہوتا ہے اور اس نظم سے بھی تقریباً پانچ صدی ادھر کہیں جا کر سلیمان ماکوکی نثری تحریر سامنے آتی ہے ۔

اخوند درویزہ(۱) کی تحقیق کے مطابق یوسف زئیوں کے پاس ایک قدیم پشتو کتاب تھی جس کا نام صراح تھا اس میں ان کے خاندانی حالات اور شجرہ نسب وغیرہ محفوظ کیے گئے تھے ۔ ایک اور قدیم(۲) مذہبی کتاب ”پاگان“ بھی ہے جس کا ذکر بعض تذکروں ہی میں ملتا ہے ۔ اس طرح تیسری صدی ہجری یعنی نویں صدی عیسوی کے وسط میں ایک نثری دستاویز (۳) کی نشاندہی ہوتی ہے ۔ ابو محمد ہاشم ابن زیدالسروانی کی اس کتاب ”سالووگمتہ“ (نسیم ریگستان) کا سراغ پٹہ خزانہ سے ملتا ہے ، لیکن یہ کتاب بھی نایاب ہے ۔ محمد ہوتک بن داؤد مولف پٹہ خزانہ شیخ کتہ کی کتاب ”سرغونے پښتانۀ“ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اس کتاب میں عربی فارسی شاعری کی فصاحت و بلاغت کا بیان ہے اس کا مصنف محمد ہاشم پشتو کا ایک نامور شاعر اور فاضل بزرگ تھا ۔

پشتو کے شعری ادب میں جس طرح پشتون اہل فکر نے اپنی تہذیبی اقدار ، معاشرتی مزاج اور رزمیہ کردار کو اپنے فن کا موضوع بنایا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے مذہبی تصورات و معتقدات سے بھی اغماض نہیں برتا ، اس طرح پشتو نثر میں بھی ان کا یہی رجحان کارفرما رہا ۔ خصوصاً دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں تو پشتون قوم عملی اور قلمی طور پر سب سے زیادہ پیش پیش رہی ہے ۔ تاریخ شاہد ہے کہ نہ صرف غزنی سے اٹک تک اسلامی علوم کے کئی بڑے مراکز تھے بلکہ یہاں سے برّصغیر میں دور دور تک علمائے کرام اور اولیائے عظام بڑی کثرت سے جاتے رہے اور انہوں نے اپنے روحانی فیض اور علم و فضل کی مشعلیں روشن کیں ۔

سلیمان ماکو (۴) (ز۔ ۱۲۱۵ء/۶۱۲ھ)

یہی وجہ ہے کہ پشتو ادب میں سب سے پہلی نثری کتاب بھی مذہبی ترویج و ابلاغ

۱، ۲، ۳ پشتو زبان و ادب کی تاریخ (قلمی)

۴، عبدالحئی حبیبی ، پٹانہ شعرا ، ص ۶۳

کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب "تذکرۃالاولیا" ہے جو سلیمان ماکو نے اولیائے کرام کے تذکرہ کے طور پر رقم کی ۔ اس موضوع پر عربی فارسی میں اس وقت بھی بہت کچھ ملتا تھا ، لیکن یہ کتاب جو کوہ سفید کے ایک فاضل پشتون بزرگ نے یہاں ایک گوشے میں بیٹھ کر لکھی ، ایک ایسی طبع زاد اور تخلیقی دستاویز ہے جو کسی دوسری زبان سے اخذ و ترجمہ نہیں کی گئی ۔ اس کے صرف آٹھ صفحات دستیاب ہوئے ہیں ، جن کا عکس آقائی حبیبی نے اپنی تالیف عبدالحئی پختانہ شعرا میں دیا ہے ۔

"تذکرۃالاولیا" میں زبان و بیان کی صفائی ، سلاست اور ثقاہت اس امر کی مقتضی ہے کہ اسے پشتون کی اوّلین دریافت شدہ حماسی نظم کی طرح ایک ترقی یافتہ دور کی تخلیق سمجھا جاسکتا ہے ۔ اس کی تحریر نہ صرف منجھی ہوئی ہے ، بلکہ اس کا اسلوب بھی شگفتہ اور رواں دواں ہے جس میں کسی قسم کا کوئی الجھاؤ یا گنجلک نہیں ۔

سلیمان ماکو بارک خان کا بیٹا تھا وہ سائبرئی قوم سے تھا اور قندھار کے پاس ارغاسن کا رہنے والا تھا اور اپنے وقت کا مشہور صوفی منش دالشور ، ادیب اور مورخ گزار ہے۔ وہ ایک عالم فاضل شخص تھا اور فارسی عربی میں اسے پوری دسترس حاصل تھی۔ اپنی پشتو نثر میں اس نے عربی فارسی الفاظ بے تکلف استعمال کیے ہیں جس سے پشتو پر فارسی عربی کے نمایاں اثر کا اندازہ ہوتا ہے ۔

تذکرۃ الاولیا کے بعد ۱۲۱۵ء-۱۵۹۱ء/۶۱۲ھ-۱۰۰۰ھ تک تاریخ سوری ، لرغونے پختانہ ، د شیخ ملی دختر مرأۃالافاغنہ ، فوائد الشریعہ ، نافع‌المسلمین، بستان الاولیا، تحفہ صالح ، سلوک والغزوات ، تحفہ الخانی ، فقہ کریم داد ، مخزن الاسلام ، تذکرۃ الابرار والاشرار ، ارشادالطالبین اور خیرالبیان وہ مشہور و معروف کتابیں ہیں جو پشتو نثر کے پہلے دور کا تمام و کمال سرمایہ اور اس کی ادبی تاریخ کا سنگ بنیاد ہیں۔

سلیمان ماکو کی تحریر کی پختگی اور اعجاز اس یقین دہانی کے لیے کافی ہیں کہ یہ پشتو نثر کے آغاز کا نشان نہیں بلکہ اس کا ترقی یافتہ سرمایہ ہے ۔

محمد بن علی البستی (۱) ۔ (ز ۔ ۱۳۴۹ء/۷۵۰ھ)

تاریخ سوری محمد بن علی البستی کی وہ تاریخی کتاب ہے جس میں سوری خاندان کے حکمرانوں کا تذکرہ اور اس کے بعد کے سیاسی واقعات قلمبند کیے گئے ہیں ۔ اس کا سن تصنیف ۱۳۴۹ء/۷۵۰ھ بتایا جاتا ہے ۔

شیخ کتہ (۲) (ز ۔ ۱۳۴۹ء/۷۵۰ھ)

لرغونے پختانہ (قدیم پشتون) شیخ کتہ کی مشہور تصنیف ہے جو قدیم پشتون علما و

(۱) پشتو زبان و ادب کی تاریخ (قلمی)
(۲) ایضاً

ادبا ، شعرا اور دوسرے نامور فصحا کے حالات پر مشتمل ہے ۔ شیخ کتہ بہت بڑے عالم دین ، مؤرخ اور ادیب تھے ان کا حلقہ ارادت وسیع تھا ۔ بعض محققین کی تحقیق کے مطابق شیخ کتہ ۱۳۴۹ء/۷۵۰ھ میں حیات تھے ۔

شیخ ملی (۱) (ز - ۱۴۱۷ء/۸۲۰ھ)

۸۲۰ھ میں یوسف زئی قوم کے مشہور سردار شیخ ملی نے "دشیخ ملی دفتر" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو بعض مشہور جنگوں کے حالات اور سوات میں یوسف زئیوں کی فتوحات کی تاریخ ہے ۔ شیخ ملی نے تقسیم اراضی اور بندوبست کے طریقے بھی اس میں درج کیے ہیں ، جو آج تک یوسف زئیوں میں رائج ہیں ۔ اس کتاب کے نسخے بعض فاضل مستشرقین نے دیکھے ہیں ۔ مشہور افغان مورخین اور ادیب افضل خان خٹک، محمد حیات ، شیر محمد اور خوشحال خان خٹک نے بھی اس کتاب کا ذکر کیا ہے ۔

خان جہان لودھی (۲) (ز - ۱۵۱۴ء/۹۲۰ھ)

دسویں صدی ہجری یعنی سولہویں صدی عیسوی کے شروع میں لکھی گئی خان جہان لودھی کی 'مرأۃالافاغنہ ، ایک معرکے کی کتاب ہے جس میں پشتون علما اور شعرا کے حالات و کوائف ملتے ہیں ۔

کجو خان رانی زئی (۳)

اس عہد میں کجو خان رانی زئی نے بھی ایک کتاب لکھی ہے جو پشتون قوم کی تاریخ ہے ۔

پیرو خان(۴) (۱۵۲۵ء - ۱۵۸۰ء)

پیروخان (پیر روشن) کا نام بازید یا بایزید تھا ۔ وہ ۱۵۲۵ء/۹۳۲ھ میں جالندھر میں پیدا ہوئے ۔ اس کے والد شیخ عبداللہ انصاری نے لودھیوں کے عہد میں جالندھر میں بود و باش اختیار کر لی تھی ۔ وہ لودھی امرا میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے ۔ پیر رو خان پشتونوں کے ادمڑ قبیلے سے تھے ۔ بچپن ہی سے ان کے کردار میں سیادت و فضیلت کے جوہر نمایاں تھے اور ان میں غور و فکر کا مادہ پایا جاتا تھا ۔ حصول تعلیم کا جنون کی حد تک شوق تھا ۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں معقولات و منقولات

---

(۱) عبدالحئی حبیبی 'پختانہ شعرا' ۔ ص ۱۲،۱۳

(۲) ایضاً ص ۴۵ ، ۵۴ ، ۶۰

(۳) پشتو نثر مقابلہ مطبوعہ روزنامہ امروز ۔ لاہور

(۴) عبدالحئی حبیبی ، پختانہ شعرا ، ص ۱۳ - ۱۹

میں خاصی دسترس پیدا کر لی - جوانی تک پہنچتے پہنچتے وہ عربی، فارسی، ہندی اور پشتو کے بہت بڑے عالم بن چکے تھے - سیاحت کا ذوق تھا ، چنانچہ برصغیر کے علاوہ انہوں نے افغانستان اور بخارا کا سفر بھی کیا - پیر روخان ایک مستند ادیب ، بلند پایہ سیاست دان اور بہادر جرنیل تھے - حکمران طبقہ کے خلاف نہ صرف خود زندگی بھر نبردآزما رہے بلکہ ان کے بعد اس کے پیرو بھی سالہا سال تک اسی پیکار میں مصروف رہے -

پیر روخان کا حلقہ اثر بہت وسیع تھا - عام مذہبی عقائد سے ہٹ کر آپ نے توحید کا راستہ اختیار کیا اور شرک و بدعت کی سختی سے مخالفت کی ، اس طرح جہاں ہزاروں کی تعداد میں آپ کے مقلدین پیدا ہو گئے وہاں مخالفین کی بھی کوئی کمی نہ تھی - آپ کے مخالفین میں سب سے زیادہ پیش پیش آپ کے ہم عصر اور مشہور پشتون بزرگ اخوند درویزہ تھے ، جنہیں حکومت وقت کی تائید و حمایت بھی حاصل تھی - انہوں نے قلمی اور عملی طور پر آپ کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا -

پیر روخان اگرچہ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھے ، لیکن ان کی ادبی عظمت بہت نمایاں ہے بلکہ پشتو ادب کو زندہ کرنے اور رکھنے کا سہرا انہی کے سر ہے - انہوں نے پشتو نثر کی طرف توجہ فرما کر اسے ترقی یافتہ بنایا اور ایک نئے مکتبۂ فکر کی بنیاد ڈالی - اس مکتبۂ فکر نے بڑے بڑے نامور ادیب اور شاعر پیدا کیے - اس اعتبار سے پشتو ادب ان کے احسان سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا - ان کی مشہور کتاب 'خیرالبیان' فارسی نثر سے متاثر ہو کر مقفیٰ اور مسجع انداز میں لکھی گئی - یہ کتاب شریعت و طریقت اور دینی مسائل سے متعلق ہے اور اس میں پشتونوں کے سیاسی اجتماعی اور بین القبیلوی اتحاد کا بیان ہے - خیرالبیان پشتو ادب کے نثری سلسلہ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے - پیر روخان نے اس کتاب کے ذریعے پشتو نثر کو ایک ایسے اسلوب سے آشنا کرایا جو اس وقت پشتو میں بالکل نیا اور اچھوتا تھا - یہ کتاب اپنے عہد میں بڑی مقبول ہوئی اور اس کے بعد کی تمام مذہبی کتب اسی روش پر لکھی جانے لگیں - یہ کتاب چار زبانوں پشتو ، عربی ، فارسی اور ہندی میں لکھی گئی - جو نقل اس کی پشتو اکیڈیمی کے پاس ہے اس میں چار زبانوں کا التزام صرف شروع کے چودہ صفحات تک قائم ہے جو مقدمہ یا تمہید کے طور پر تحریر کیے گئے ہیں ، نمونہ ملاحظہ ہو:-

یا با یزید کتب علی ہدایت الکتاب تبعظیم الحروف بسم اللہ

یا با یزید بنویس بر آغاز کتاب بہ بزرگی بہ درستی حروف ہا بسم اللہ

او با یزید و کشہ پہ آغاز کتاب پہ شہ درست حرفوں بسم اللہ

اے بایزید لکھ کتاب کے آغاز کے بیان جن کے سارے اکھر (حروف) صحیح ہیں بسم اللہ

پیر روخان صحیح معنوں میں علمی ادبی پشتو نثر لکھنے والوں کے پیشرو ہیں ۔ انھوں نے پشتو نثر میں جس نئے مکتبۂ فکر کی بنا ڈالی خوشحال خان خٹک کے عہد تک پشتو کے تمام نثر نگار اسی ڈگر پر چلتے رہے ، یہاں تک کہ ان کے حریف اور مدمقابل آخونـد درویزہ جو پیر روخان کے عقائد کے شدید مخالف تھے ، انھوں نے بھی اپنی تصالیف میں پیر روخان ہی کے اسلوب کی تقلید کی ۔

اخوند درویزہ (۱) (م - ۱۶۳۸ع/۱۰۴۸ھ)

اخوند درویزہ یا اخون بابا پیر روخان کے ہم عصر بھی تھے اور حریف بھی ۔ ان کا دور حیات ۱۵۹۱ع/۱۰۰۰ھ ہے ۔ عالم فاضل اور صاحب کشف و کرامات برزگ تھے اور دور دور تک اثر و نفوذ رکھتے تھے۔ ان کے والد کا نام اخون گدا تھا ، مغلوں کے دربار میں انہیں کافی رسم و راہ حاصل تھی اور ان کے معتمد خاص کہلاتے تھے ۔ وہ اسلامی حکومت پاکستان و ہند کی وحدت کے قائل تھے ۔ اخون بابا پیشوائے دین ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر اور ادیب بھی تھے ۔ ان کی شاعری تو واجبی سی تھی البتہ بحیثیت ادیب ان کا شمار پشتو کے نامور ادبا میں ہوتا ہے ۔ پیر روخان کو وہ اپنا مد مقابل خیال کرتے تھے کیونکہ پیر روخان پٹھان قومیت کی علیحدہ حیثیت کے قائل تھے ۔ ان کے درمیان باہمی تحریری مناظرے رہتے تھے اور دونوں طرف سے جذبۂ مسابقت میں تصنیف و تالیف کا کام پورے زور شور سے ہوتا تھا ۔ اس طرح اس عہد میں دو بڑے مذہبی گروہ آپس میں متصادم ہوئے اور ایک دوسرے پر کفر کے فتوے عائد کرتے رہے ۔ ان ہر دو بزرگوں کی چپقلش عوام کے لیے گمراہ کن بھی ثابت ہوئی ، تا ہم اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ پشتو ادب کو ان کی باہمی رقابت کے طفیل تصنیف و تالیف کا ایک گرانقدر سرمایہ مل گیا ۔ اخون بابا نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے 'مخزن‌الاسلام' ، 'تذکرۃالابرار والاشرار' اور 'ارشادالطالبین' مشہور ہیں ۔ 'مخزن‌السلام' پیر روخان کی کتاب 'خیرالبیان' کے جواب میں لکھی گئی ۔ اخون بابا کی نثر خیرالبیان کے انداز کی مقفّیٰ نثر ہے ۔ اقتباس ملاحظہ ہو:-

> ہر ایک چیز کا اصل ثابت ہے اس لیے اس کے نام لیے جاتے ہیں
> وہ عقل میں بھی آ سکتی ہیں اورعقل تک ان کی رسائی بھی ہے
> چیزوں کی اصل ثابت ہے ، اوہام نہیں ، تجھے خبردار رہنا چاہیے کہ
> اوہام میں نفع نہیں اور نہ ہی ان سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہے (ترجمہ)

اس طرح اخوند قاسم کی ۱۵۵۹ع/۹۶۷ھ کی 'فوائد الشریعہ' اور نور محمد کی

---

(۱) پشتو نثر مقالہ مطبوعہ روزنامہ امروز لاہور

'نافع المسلمین ، کی نثر بھی اسی قبیل کی ہے۔ ان دونوں کتابوں میں فقہی اور شرعی مسائل کا بیان ہے ۔

شیخ بستان بڑیس (۲) (ز ۔ ۱۵۸۹ع/۹۹۸ھ)

شیخ بستان ٹریچ قندھاری کی کتاب 'بستان الاولیا ، دسویں صدی ہجری کے اواخر کی یادگار ہے جو پشتون ولیوں ، بزرگوں درویشوں اور شاعروں کے حالات پر مشتمل ہے ۔ شیخ بستان خود بھی ایک اچھے شاعر و ادیب اور متقی شخص تھے ۔

اللہ یار الکوزی (۲) ۔ (۱۵۹۱ع/۱۰۰۰ھ)

'تحفہ ہایم ، اللہ یار الکوزی کی تصنیف ہے جس میں اس نے اپنے استاد شیخ صالح الکوزی اور دوسرے بزرگوں اور نامور پشتونوں کے حالات قلمبند کیے ہیں ۔

ارزانی (۳) (ز ۔ ۱۵۹۱ع/۱۰۰۰ھ)

ارزانی پیر روخان کا مرید اور مبلغ تھا اور ایک عالم شخص تھا اس نے 'چھار رماء ، کے نام سے ایک تصنیف چھوڑی ہے جس میں پیر روخان کے عقائد کی تبلیغ کی گئی ہے ۔ وہ ایک نغز گو شاعر بھی تھا ، اس کے حالات شعری حصہ میں درج کیے جا چکے ہیں ۔

کریم دار (۴) (م-۶۲-۱۶۶۱ھ/۱۰۷۲ھ)

اخولد درویزہ کے عالم فاضل اور عارف فرزند عبد الکریم الموسوم کریم داد نے ''تحفۃ الحانی'' اور ''فقہ کریم داد ،، دو مشہور کتابیں لکھیں ۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے والد اخون بابا کی تصنیف میں بھی کریم داد کے زور قلم کو خاصا دخل تھا۔

تنقید و تبصرہ

پشتو

ادب کے اس اولین دور کا جائزہ لیتے ہوئے اس کُلیّے کی تائید ہوتی ہے کہ پشتو کی اولی دریافت شدہ نظم امیر کروڑ کی تخلیق ہے جو ۷۵۶ء/۱۳۹ھ میں لکھی گئی یہ نظم اپنے عہد کی ایک تاریخی دستاویز ہے ، جبکہ اس خطے میں اسلام پھیل چکا تھا اور پشتونوں کے جیوش اسلامی عساکر کی امداد کےلیے عرب و عجم کے محروسہ میں پھیل کر اخوت اسلام کا پرچم لہرا رہے تھے۔ گویا یہ رجز صرف امیر کروڑ ہی کے جذبات کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ ان تمام پشتونوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے جو اس وقت اسلام کے ساتھ تھے۔ لیکن

(۱، ۲، ۳) پشتو نثر مقالہ مطبوعہ روزنامہ امروز، لاہور و پختانہ شعرا صفحہ ۳۴

(۴) پشتو نثر مقالہ مطبوعہ امروز ، لاہور د پختانہ شعرا ص ۳۴

اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ پشتو ادب سب کا سب رزمیہ انداز ہی میں تخلیق ہوا ہے، بلکہ اس کے بعض دوسرے پہلو بھی ہیں - مثال کے طور بیٹ بنکر جو تیسری صدی ہجری یعنی نویں صدی عیسوی کا شاعر ہے مناجاتوں میں مگن ہے - چوتھی صدی ہجری یعنی دسویں صدی عیسوی میں شیخ اسماعیل اور خرخبون بابا ہجر و فراق کا پر سوزموضوع اختیار کرتے ہیں - پانچویں اور چھٹی صدی کے شعرا جن میں اسعد سوری اور شکارندوئی پیش پیش ہیں قصیدہ گوئی میں معروف ہیں - پھر اس دور میں اسعد سوری کا نوحہٗ غم اور ملک یار غرشین کا رجز بھی سنائی دیتا ہے اور جب ہم نویں صدی ہجری یعنی پندرھویں صدی عیسوی میں داخل ہوتے میں تو پشتو شاعری کا ماحول یکسر بدلا ہوا ملتا ہے - اکبر زمینداوری کے ہاں فارسی اور اردو کی طرح کی ایک نئی صنف ملتی ہے جو اس کے پیشروؤں میں مفقود ہے ، یعنی وہ پشتو شاعری کو غزل کی چاشنی سے آشنا کراتا ہے جس سے موضوع اور ہیت کی اکتا دینے والی یکسالیت ختم ہو جاتی ہے - شعری ماحول میں کچھ تنوع محسوس ہوتا ہے اور یہ خوشگوار تغیر پشتو شاعری کو بہت آگے لے جاتا ہے - اس کے فوراً بعد زرغون خان پیدا ہوتا ہے، جس نے پشتو شاعری کو سب سے پہلا 'ساقی نامہ' دیا - اس 'ساقی نامہ' سے نہ صرف یہ کہ پشتو شاعری کو ایک نیا موضوع ملا بلکہ اس میں رنگینی و شیرینی کا بھی اضافہ ہوا -

اس دور تک جتنے شعراً بھی آئے سب اپنی الگ الگ ڈگر اختیار کیے ہوئے ہیں - جہاں پشتو شاعری کی یکلخت کایا پلٹ جاتی ہے ، یہ دسویں صدی ہجری یعنی سولہویں صدی عیسوی ہے اور اس میں پیر روخان اگرچہ خود شاعر نہ تھے ، لیکن انہوں نے اپنی سحر انگیز شخصیت کے اثر سے پشتو نظم و نثر میں ایک صحت مند تغیر پیدا کیا ، جو پشتو شعر و ادب کے مستقبل کے حق میں نیک فال ثابت ہوا -

میرزا خان انصاری اس مکتبۂ خیال کا پہلا شاعر ہے جس نے پیر رو خان کی فکری روش کو اپنا کر پشتو غزل کے قالب کو بدلا اور اسے پہلے پہل تصوف کی پاکیزہ اور شستہ فضا سے مانوس کیا - اس طرح پشتو غزل میں سنجیدگی ، روحانیت اور تقدس کے عناصر آ گئے - مرزا خان انصاری نے غزل کو سوقیانہ پن سے نکالا - اس کے بعد اس میں روحانی مکتبۂ فکر کے مستقبل کے تمام شعراً شامل ہوتے گئے ، جس سے پشتو شاعری میں غزل کا ایک مخصوص مزاج بن گیا جو رحمان بابا کے عہد تک قائم رہا -

اخون بابا ایک الگ حلقۂ فکر کے بانی تھے - انہوں نے اگرچہ کوئی وقیع شعری سرمایہ نہیں چھوڑا ، لیکن ان کے مقلدین شعراً کی تعداد بھی کم نہ تھی - یہ حقیقت

ہے کہ پیررو خان اور اخون بابا تک پشتون شعرا نے اپنا کوئی خاص مکتبۂ خیال پیدا نہیں کیا تھا ، بلکہ ان دو بزرگوں ہی نے آ کر یہ طرح ڈالی اور خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کے عہد تک جتنے شعرا بھی ہوئے وہ تقریباً سب کے سب ان دونوں کے مکاتیبِ فکر میں سے کسی ایک کے پیرو ضرور تھے ۔

پشتو شعر و ادب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام و کمال اپنے دور کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یعنی اگر خانگی تنازعات اور تیغ و تفنگ کے ماحول نے پشتون قوم کو فنونِ لطیفہ کے کسی شعبہ کی طرف توجہ مبذول کرنے کی مہلت دی ، تو وہ صرف شاعری تھی ، جس کے ذریعے وہ اپنے ماحول کی عکاسی کرتے رہے ۔ چنانچہ پشتو شاعری اپنے ہر عہد کی تاریخ معلوم ہوتی ہے ۔ خلافتِ بغداد کی فوجوں کے دوش بدوش جنگوں میں شرکت ، عہدِ عالم گیری میں مغلوں سے نبردآزمائی ، مرہٹوں سے معرکہ آرائی ، سکھوں کے خلاف صف آرائی اور پھر انگریز سامراج کے خلاف جنگِ آزادی ، ان تمام حقائق کی جھلکیاں پشتو شاعری کے ضروری عناصر ہیں اور اس پس منظر کے ساتھ ہی اس کا مطالعہ مفید رہتا ہے ۔ کیونکہ پشتو شاعری کا یہ پہلو لمحاتی اور ہنگامی تاثر رکھتے ہوئے بھی ایسی دوامی حرارت کا حامل ہے جو بیک وقت فرض اور فن دونوں ذمہ داریوں سے بطریق احسن عہدہ برآ ہوتی ہے ۔ اس میں عشق و محبت کی نرم نرم آنچ بھی ہے اور جھلاتی ہوئی زندگی کا لاوا بھی ۔ چونکہ پشتو شاعری کی ابتدا اجتماعی شعور سے ہوئی اور شاعر نے جو کچھ بھی کہا وہ جماعتی یا قومی یا مذہبی احساس اور اس کے محرکات کی بنا پر کہا ، اس لیے ایک طرف تو اس کی حیثیت افادی ہو گئی اور دوسری طرف اس میں اپنے عہد و ماحول کی سچی تصویریں محفوظ ہوتی گئیں ۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ پشتو شاعری اپنے پہلے دور میں جب کہ وہ دوسری زبانوں فارسی عربی اور انگریزی وغیرہ سے متاثر نہ ہوئی تھی، حقیقی معنوں میں تخلیقی شاعری تھی جو اگرچہ زیادہ بلند پایہ اور اعلیٰ تخیل کی حامل نہیں ، لیکن اس میں وہ حقیقت پسندی اپنے پورے عروج پر ہے ، جس پر موجودہ ترقی یافتہ دور میں زندہ زبانوں کا ادب فخر کرتا ہے ۔ دوسری نمایاں خوبی اس میں یہ ہے کہ اس میں علاقائی خد و خال پوری طرح نمایاں ہیں ۔ تیسری اور سب سے بڑی خصوصیت اس کا رجائی رجحان ہے ۔ رجائیت درحقیقت پشتو شاعری کا طرۂ امتیاز ہے جو ہر صنفِ سخن میں جاری و ساری ہے ۔ اگرچہ قنوطیت سے بھی اس دور کی شاعری یکسر عاری نہیں ، چونکہ یہ بھی زندگی کا ایک لازمی رخ ہے اس لیے اگر اس کا وجود نہ ہوتا تو زندگی کا سارا سوز و ساز مفقود ہو کر رہ جاتا ۔ قنوطیت ہمارے معاشرے ہی کی پیداوار ہے ، کیونکہ کسی فنکار کے قنوطی افکار درحقیقت

اس کے ماحول ہی کے اثرات ہوتے ہیں جو زندگی سے باہر نہیں ہوتے اور نہ ہی انہیں زندگی سے جدا کیا جا سکتا ہے ۔

پہلے دور کی شاعری میں ان تمام خصوصیات کے با وصف کچھ معائب بھی ہیں ۔ غیر مانوس الفاظ کی بھرمار ، مضمون آفرینی ، علوئے تخیئل کا فقدان اور تنوع کی کمی ، ایسی چیزیں ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان خامیوں کے مقابلہ میں خوبیوں کا پلہ بھاری نظر آتا ہے ۔ جب پشتو شاعری کا آغاز ہوا ، اس وقت اس خطے میں ایک ابھرتا ہوا معاشرہ جنم لے رہا تھا ۔ اس لیے پشتون شعرا انحطاط سے بہت حد تک محفوظ رہے اور ان کے کلام میں پست اور منفی روایات جگہ نہ پا سکیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دور کے پشتون شعرا کا کلام صحت مند اور توانا نظر آتا ہے اور جب تک بیرونی اثرات سے یہ ماحول آلودہ نہ ہوا اس وقت تک پشتو شاعری صحت مند اقدار کی حامل رہی ۔ اس دور کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شعرا کا کلام تصنّع سے پاک ہے ۔ انہوں نے محض اپنے تجربات ، مشاہدات اور احساسات ہی کو فن کا موضوع بنایا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں حقیقت پسندی اپنے معراج پر نظر آتی ہے ۔

پشتو نثر کا سنگِ بنیاد اگر ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح کے دریافت شدہ کتبے کے پشتو فقروں کو سمجھا جائے تو پشتو شاعری سے اس کی عمر ہزاروں سال بڑھ جاتی ہے اور اگر سلیمان ماکو کی ' تذکرۃ الاولیا ' سے اس کی ابتدا کی جائے تو پشتو شاعری سے پشتو نثر کی عمر چھ سو سال کم ہو جاتی ہے ۔ اس اولین دور میں پشتو نثر کے جو نمونے سامنے آئے ہیں ان میں اسلامی رنگ غالب ہے ۔ مصنفین زیادہ تر علمائے کرام ہیں جنھوں نے رشد و ہدایت کی غرض سے تبلیغی کتابیں لکھیں ۔ اس سے پشتون قوم کی دینِ اسلام سے شیفتگی اور وابستگی کا اظہار ہوتا ہے ۔ مذہبی کتب کے علاوہ جو کتابیں ملتی ہیں وہ تاریخی یا تذکرہ کی نوعیت کی تصانیف ہیں جن میں قومی اور ملّی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے جو اس دور کی پشتو شاعری کا طرۂ امتیاز رہا ہے ۔

کتابیات

۱ ۔ پختانہ شعرا — مصنفہ عبدالحئی حبیبی ناشر پختو ٹولنہ کابل پہلا ایڈیشن ۱۹۰۲ء

۲ ۔ پٹہ خزانہ — محمد ہوتک بن داؤد مطبع عمومی کابل پہلا ایڈیشن ۱۹۰۵ء

۳ ۔ تاریخ فرشتہ — مطبوعہ لکھنئو پہلا ایڈیشن ۱۹۰۳ء

۴ ۔ حیات افغانی — مطبوعہ لاہور ۱۸۶۷ء

۵ - تذکرۃ الاولیا مصنفہ سلیمان ماکو (قلمی) ۱۲۱۵ء

۶ - مخزن افغانی (قلمی) ۱۷۰۱ء

۷ - آئین اکبری مطبوعہ لکھنئو پہلا ایڈیشن ۱۸۹۲ء

۸ - کلید افغانی پادری ہیوز مطبوعہ لاہور پہلا ایڈیشن ۱۸۹۳ء

۹ - شکرستان افغانی میر احمد شاہ رضوانی مطبوعہ پشاور پہلا ایڈیشن ۱۹۰۵ء

۱۰ - بہارستان افغانی میر احمد شاہ رضوانی مطبوعہ لاہور پہلا ایڈیشن ۱۹۲۱ء

۱۱ - مخزن اسلام اخوند درویزہ (قلمی) ۱۷۵۳ء

۱۲ - تذکرہ علمائے ہند رحمان علی مطبوعہ لکھنئو تیسرا ایڈیشن ۱۹۱۳ء

۱۳ - دبستان مذاہب مطبوعہ بمبئی، مطبوعہ پشاور پہلا ایڈیشن ۱۸۷۵ء

۱۴ - تاریخ مرصع افضل خان خٹک پہلا ایڈیشن ۱۸۶۰ء

۱۵ - تذکرۃ الابرار و الاشرار اخوند درویزہ مطبوعہ پشاور پہلا ایڈیشن ۱۸۹۰ء

۱۶ - سلوک الغزوات ملا مست رفند (قلمی)

۱۷ - مجلّہ سرحد پشاور

۱۸ - مجلّہ پختون پشاور

۱۹ - مجلّہ خیبر پشاور

۲۰ - اٹک کے اس پار فارغ رضا، گوشۂ ادب لاہور دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۸ع

۲۱ - پشتو لوک گیت فارغ بخاری، گوشۂ ادب لاہور دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۱ع

۲۲ - ادبیات سرحد (پشتو) رضا ہمدانی گوشۂ ادب لاہور پہلا ایڈیشن ۱۹۵۳ع

۲۳- ادبیات سرحد (اردو) فارغ بخاری گوشۂ ادب لاہور پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ع

۲۴- باچا خان فارغ بخاری " " " " " ۱۹۵۷ع

۲۵- پشتو شاعری فارغ رضا " " ۱۹۶۷ع

۲۶- پٹھانوں کے رومان " گوشۂ ادب لاہور " " ۱۹۵۵ع

۲۷- مجلّہ سنگ میل (سرحدنمبر)

۲۸- دیوان مرزا خان انصاری مرتبہ ہمیش خلیل، دارالتصنیف پشاور پہلا ایڈیشن ۱۹۵۹ع

۲۹- گلشنِ اشعار افغانی اوریئنٹل لائبریری اسلامیہ کالج پشاور (قلمی)

۳۰- دیوانِ مخلص

۳۱- بیاض انوارالحق مرتبہ سید انوارالحق (قلمی) ۱۹۵۸ع

۳۲- دپختو ادبیاتو تاریخ — عبدالحئی حبیبی مطبوعہ پشاور — پہلا ایڈیشن ۱۹۵۱ء

۳۳- دپختو ادب تاریخ — صدیق اللہ رشتین مطبوعہ کابل — پہلا ایڈیشن

۳۴- دپختو تاریخ — قاضی عطاء اللہ ادارہ اشاعت سرحد پشاور پہلا ایڈیشن ۱۹۴۲ء

۳۵- پختانہ لیکوال — ہمیش خلیل، دارالتصنیف پشاور — پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء

۳۶- ورکہ خزانہ (پہلا حصہ) ہمیش خلیل، دارالتصنیف پشاور پہلا ایڈیشن فروری ۱۹۶۰ء

۳۷- ورکہ خزانہ (دوسرا حصہ) ہمیش خلیل، دارالتصنیف پشاور پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۶۰ء

۳۸- لوئے احمد شاہ بابا — عبدالحئی حبیبی مطبوعہ کابل

۳۹- گلشن روہ — ایچ - جی - راورٹی — ۱۸۹۲ء

۴۰- جمال الدین افغانی — رضا ہمدانی گوشۂ ادب لاہور — پہلا ایڈیشن ۱۹۵۴ء

۴۱- د آزادی جنگ — عبدالخالق خلیق ادارہ اشاعت سرحد پشاور پہلا ایڈیشن ۱۹۶۱ء

۴۲- مجلّہ قند مردان (پشتو)

۴۳- مجلّہ سروس کراچی (فارسی)

۴۴- مجلّہ سہ ماہی پشتو (پشتو) پشتو اکیڈیمی پشاور

1. Linguistic Survey of India — G. A. Grierson
2. A Grammar of Pushtu Language — H. G. Raverty 1889
3. Pukhtu Mili Sandara — Henry Waltlove
4. The Pathans — O. Caroe
5. Afghanistan — Frazar Tailor
6. Corrigendum of Historical Facts — Nawab Mohammad Akbar Khan of Hoti.
7. Selections from the Poetry of Afghans — H. G. Raverty
8. Afghan Poetry of Seventeenth Century — C. E. Biddulph
9. The Poems of Khushhal Khan Khattak — O. Caroe
10. Development of Kharoshti Script — C. C. Dass
11. Gazetteer of Peshawar District
12. The Kingdom of Kabul — Elphinstone
13. Peshawar Past & Present — S. M. Jaafer

چوتھا باب

خوشحال خان خٹک سے احمد شاہ ابدالی تک

(۱۶۱۳ع تا ۱۷۷۲ع)

تاریخی پس منظر

پشتو ادب کا یہ دور بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ان ایک سو ساٹھ سالوں میں پشتو ادب ایک نئے شعور کا حامل نظر آتا ہے۔ ۱۶۱۳ع میں خوشحال خان خٹک کی ولادت ہوئی۔ یہ جہانگیر کا عہد تھا۔ ان دنوں میں سرحد میں پیر روشن (پیر روخان) (۱۵۲۵ع-۱۵۸۰ع) کی تحریک زوروں پر تھی اور اخولد درویزہ سے ان کے فکری مقابلے رہتے تھے۔

خوشحال خان خٹک جسے بابائے پشتو بھی کہا جاتا ہے ایک مفکر ، صاحبِ سیف و قلم اور انقلابی انسان سمجھا گیا ہے۔ خوشحال خان خٹک کرلانی افغانوں کے قبیلہ خٹک سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ قبیلہ کلہم سرحد ، کوہاٹ ،کیمبل پور ، میانوالی ، پشاور (تحصیل نوشہرہ) اور مردان کی دونوں تحصیلوں (تحصیل صوابی اور مردان کےایک حصے) میں آباد ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں خوشحال خان خٹک کا پردادا ملک اکوڑی موجودہ ضلع کوہاٹ کے موضع کربوغہ سے اپنے خاندان اور قبیلے کی ایک جمعیت کے ساتھ نقلِ مکانی کر کے ضلع پشاور کی تحصیل نوشہرہ میں دریائے کابل (دریائے لنڈی) کے جنوبی کنارے جس مقام پر آباد ہوا ہے اسی کی نسبت سے اکوڑہ سرائے (اکوڑہ خٹک) کہا جاتا ہے۔ یہ مغل شہنشاہ محمد جلال الدین اکبر کا عہدِ حکومت تھا۔ خوشحال خان خٹک کی ولادت اسی اکوڑہ سرائے میں ہوئی۔

"ملک اکوڑی،، ایک بہادر ، جنگجو اور بارسوخ خان کی حیثیت سے آس پاس کے علاقوں میں جلد مشہور ہو گیا۔ اکبر کی سلطنت میں کابل ، قندھار ، ہرات اور بدخشاں تک کا علاقہ شامل تھا ، کیونکہ مغل شروع میں سلطان ظہیر الدین بابر کے ساتھ کابل ہی

آئے تھے اور بابر پہلے کابل کا بادشاہ تھا ۔ چنانچہ کابل اور ہندوستان کے درمیان شاہراہ اٹک اور پشاور سے ہو کر گزرتی تھی ۔ اکوڑہ سرائے اسی شاہراہ کے کنارے آج کل ہی کی طرح واقع تھا ۔ یہ سارا علاقہ پٹھانوں کا مسکن تھا جو اپنی سیاسی حیثیت منوانے کے لیے مغلوں سے اکثر برسرِ پیکار رہتے تھے ، اس لیے شاہراہ غیر محفوظ تھی ۔ مغل شہنشاہ کے لیے یہ ایک تشویشناک بات تھی اس لیے اکبر ایک ایسے پٹھان سردار کی خدمات حاصل کرنے کا خواہاں ہوا جو شاہراہ کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ثابت ہو ۔ چنانچہ ۱۵۸۱ع میں جب شہنشاہ اپنے باغی بھائی مرزا حکیم کو راہِ راست پر لانے کی غرض سے کابل جاتے ہوئے اٹک پہنچا تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس علاقے کا ایک طاقتور اور بارسوخ خان ملک اکوڑی ہے ۔ شہنشاہ کے درباری اور علاقائی حکام پہلے ہی سے ''اکوڑی،، کی شخصیت اور صلاحیت سے واقف تھے ۔ چنانچہ ملک اکوڑی کو اکبر کے سامنے پیش کیا گیا ۔ اکبر ملک اکوڑی سے کافی متاثر اور مسرور ہوا اور اس نے اسے شاہراہ کی حفاظت کا فرض سونپ دیا اور خیر آباد سے نوشہرہ تک کا علاقہ اسے ایک طرح سے جاگیر میں دے دیا ۔ اسے متعدد مراعات اور اختیارات بھی دیے گئے ۔ جس میں شاہراہ کا محصول وصول کرنے کا حق اور اختیار بھی شامل تھا ۔ اکوڑی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا یحییٰ خان جاگیردار بنا اور اس کے بعد خوشحال خان خٹک کا والد شہباز خان ۔ ان سب نے یکے بعد دیگرے اکبر ، جہانگیر اور شاہجہان کے عہود میں پوری وفاداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے ۔ شہباز خان ۱۶۴۱ع میں یوسف زیئوں کے ساتھ جنگ میں مارا گیا ۔ اس وقت خوشحال خان کی عمر ۲۸ سال تھی ۔ یہ شاہجہان بادشاہ کا دور تھا (اردو ادب کے اعتبار سے یہ گولکنڈہ ، بیجا پور اور احمد نگر کے ان قطب شاہیوں کا زمانہ تھا جنھیں عام طور پر اردو کے اولین شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے) ۔ خوشحال خان خٹک کے دیوان میں جو تھوڑی سی پشتو ہندی ملی جلی شاعری نظر آتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے دور کی ''اردو شاعری،، کا مطالعہ بھی کیا تھا ۔

جہانگیر بادشاہ کی وفات کے وقت (۱۶۲۷ع) خوشحال خان کی عمر ۱۴ سال تھی ۔ شاہجہان بادشاہ کے دور میں وہ اپنے والد شہباز خان کے بعد اس کا جانشین بن گیا ۔ خوشحال خان نے شاہجہان کے لیے بہت سی لڑائیاں نہ صرف اپنے علاقے میں لڑیں بلکہ ۱۶۴۵ع میں ''بلخ'' اور ''بدخشاں،، کے معرکوں میں بھی دادِ شجاعت دی ۔ اس کے علاوہ اس نے ہندوستان میں بھی اپنے لشکر کے ساتھ کئی اہم معرکے سر کیے ، جن میں علاقہ کانگڑا کے قلعہ تارا گڑھ کا معرکہ زیادہ مشہور ہے ۔ کانگڑا کے پہاڑی علاقے کے فوجدار راجہ جگت سنگھ وغیرہ شاہجہان سے باغی ہو گئے تھے ۔ اس علاقے میں تارا گڑھ

کا قلعہ بہت مضبوط تھا اور سر نہ ہوتا تھا خوشحال خان خٹک کی کمک آنے پر مغل افواج نے یہ قلعہ فتح کر لیا۔ چنانچہ شاہجہان نے خوش ہو کر لاہور کے ایک منعقدہ دربار میں خوشحال خان کو چار لاکھ روپیہ انعام دیا اور اس کے مناصب و اعزاز میں بھی اضافہ کیا۔

خوشحال خان خٹک نے اپنے اشعار میں جہانگیر کے عہد کو سراہا اور شاہجہان کی وفات کے بعد اس کی تعریف بھی کی ہے۔ وہ خوشامد سے ناآشنا تھا جیسا کہ اپنے ایک شعر میں کہتا ہے ''اگر میں درباروں میں اپنی شاعری کا اظہار کرتا تو اپنے بادشاہ (شاہجہان) کی تعریف کرتا لیکن اسے میں نے کبھی پسند نہیں کیا ہے''۔

اس نے شاہجہان کو قدردان شاہجہان کے نام سے پکارا ہے۔ اس کی وفات کے بعد جب اورنگ زیب عالمگیر تخت نشین ہوا، اس وقت بھی خوشحال خان مغل شہنشاہیت کا منصب دار تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے جس کے کچھ اور وجوہ بھی ہو سکتے ہیں، مگر اورنگ زیب اور خوشحال خان کے مابین دشمنی کا بیج بونے میں صوبۂ کابل کے گورنر سید امیر خان خوافی اور اس کے نائب پشاور مرزا عبدالرحیم کا بڑا حصہ ہے۔ مہابت خان (پشاور کی مشہور مسجد مہابت خان کا بانی) جب تک کابل کا گورنر رہا، خوشحال خان اور اورنگ زیب کے تعلقات معمول پر رہے۔ لیکن ۱۶۶۱ء میں جب مہابت خان کو حیدر آباد دکن میں تبدیل کیا گیا اور اس کی جگہ سید امیر خان خوافی کو گورنر کابل مقرر کیا گیا تو حالات نے پلٹا کھایا۔ عبدالرحیم ایک خوشامد پسند اور متکبر انسان تھا جو خوشحال خان جیسے خوددار انسان کو طبعاً پسند نہیں کرتا تھا۔ خوشحال خان کا کردار اور اندازِ فکر عام روش سے جدا تھا جیسا کہ وہ خود بھی ایک جگہ کہتا ہے:

''توکّل علی اللہ ہی میرا حرفِ آخر ہے، خوشحال خان کو زمانہ سازی نہیں آتی''

چنانچہ سید امیر خان اور مرزا عبدالرحیم نے اس کے خلاف اورنگ زیب کے کان بھرنے شروع کیے۔ یہاں تک کہ وہ بادشاہ سے اس محصول کا معافی نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جو خوشحال خان کے پیش رو شاہراہ کی حفاظت کے صلے میں وصول کرتے رہے تھے۔ بعض دیگر مراعات بھی اس سے چھین لی گئیں، مگر خوشحال خان خاموش رہا۔ گورنرِ کابل اور اس کے نائب مرزا عبدالرحیم اس کو تنگ کرنے پر تلے ہوئے تھے، اگرچہ وہ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے سے کتراتے تھے۔ چنانچہ ایک دن مرزا عبدالرحیم نے کسی ضروری مشورے کے بہانے اس کو پشاور بلایا۔ خوشحال خان کا دل صاف تھا اس لیے تن تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر پشاور روانہ ہو گیا، جہاں پہلے سے ہی اس کی گرفتاری کے انتظامات مکمل کر لیے گئے تھے۔ چنانچہ اسے گرفتار کر کے

دہلی بھیجا گیا جہاں چند سال نظر بند رہنے کے بعد اسے گوالیار اور رنتھمبور کے قلعوں میں نظر بند کر دیا گیا ۔ خوشحال خان نے اپنی گرفتاری ، پشاور سے دہلی تک کے سفر اور مختلف مقامات پر اپنی نظر بندی و اسیری کے حالات تفصیل کے ساتھ منظوم کیے ہیں ۔ اسیری کے دوران میں وہ شاعری بھی کرتا رہا جس میں اس نے اپنے اور مغلوں کے تعلقات کا بھی ذکر کیا ہے اور وطن کی ہر چیز کی یاد میں شعر کہے ہیں ۔ وہ کبھی بادِ صبا کے ذریعے اباسین (اٹک کے پاس دریائے سندھ کا پشتو نام) اور دریائے لنڈی (دریائے کابل) کو سلام بھیجتا ہے اور اس کا ایک جامِ آب نوش کرنے کی امید و آرزو رکھتا ہے اور کبھی شیشون دوشیزاؤں سے اپنی زلفیں ہوا میں لہرانے کی درخواست کرتا ہے ، تا کہ بادِ شمال ان کی خوشبو رنتھمبور تک پہنچا دے ۔ وہ اپنے وطن کے ایک ایک مقام کو یاد کرتا ہے ۔ کابل سے لے کر لاہور تک کی یاد اسے تڑپاتی ہے ۔ اس کی ملاقات اگر علاقۂ کابل کے کسی فرد یا لاہور کے کسی باشندے سے ہوتی ہے تو اس سے احوالِ وطن پوچھتا ہے ۔ وہ پنجاب کے رہنے والوں کو بھی اپنا ہم وطن سمجھتا ہے ۔

چنانچہ خوشحال خان ۱۶۶۹ء کے لگ بھگ جب قید و نظر بندی سے رہا ہو کر وطن واپس آیا تو وہ ایک بدلا ہوا انسان تھا ۔ شروع شروع میں وہ مغلوں کا علانیہ مخالف نہ تھا ۔ اس وقت سید محمد امین (میر جملہ) کابل کا گورنر تھا جو خوشحال خان کا ذاتی محسن تھا اس لیے اس کی خاطر سے خوشحال خان نے کچھ دیر تک شکستہ دلی کے ساتھ مغلوں ہی کا ساتھ دیا لیکن بالآخر وہ کھلم کھلا مغلوں کا مخالف ہو گیا اور اب وہ مغلوں کا جاگیردار یا منصب‌دار ہونے کی بجائے قوم کا آزادی خواہ سردار بن گیا تھا ۔ وہ مناصب و وظائف سے محرومی پر فخر و مسرت کا اظہار کر کے اللہ پاک کا یوں شکر ادا کرتا ہے :

اب میرے پاس کسی کا فرمان اور حکم و پروانہ نہیں ہے !
خدا کا شکر ہے کہ اب میں آزاد و خود مختار ہوں ۔
اب خاص و عام سے میرا کوئی سروکار اور نہ دیوان سے کوئی تعلق ہے
اب میں ہر کہہ و مہہ کے دروازے پر کھڑا نہ ہوں گا ۔
مجھے کسی تصدیق کی حاجت ہے اور نہ کسی یادداشت اور توجیہ و تصریح کی ،
مجھے کسی سند کا فکر ہے اور نہ کسی ا کے دروازے پر دستک دینے کی ضرورت ہے ۔

(۱) کلیات خوشحال خان

پہلے جو افسر میرا سر اپنے آگے جھکانا چاہتا تھا
اب میں خود اس کے سر پر ڈنڈا یا تلوار بن کر لٹک رہا ہوں ۔
اس وقت میری زندگی کی ایک ایک ساعت عید ِ استغنا ہے ،
گھانس پھونس کی جھونپڑی میں مجھے ایسا لطف محسوس ہوتا ہے
گویا میں پختہ محلات میں بیٹھا ہوں ۔ (ترجمہ)

اس کے بعد مغلوں اور خوشحال خان خٹک کے درمیان جو طویل جنگیں ہوئیں وہ تاریخ ِ سیاست اور تاریخ ِ حرب و ضرب کا حصہ ہیں ۔ خوشحال خان کے دیوان میں ان تمام جنگوں اور معرکوں کا ذکر موجود ہے اور تاریخ کی دیگر کتابوں میں بھی ان کے حوالے ملتے ہیں ۔ اگرچہ مغلیہ افواج کو میدان ِ جنگ میں خوشحال خان خٹک کے خلاف پوری کامیابی حاصل نہ ہو سکی ، تاہم خوشحال خان خٹک کے اپنے خاندان اور قبیلے میں نفاق پیدا ہو گیا اور اس کا ایک بیٹا بہرام خان مغل حکومت کا طرف دار بن کر اپنے باپ کے خلاف نبرد آزما ہوا ۔ اس وقت خوشحال خان بھی بوڑھا ہو چکا تھا اس لیے اس نے اپنوں ہی کی تعدّی سے تنگ آ کر آفریدیوں کے علاقہ میں پناہ لی ۔ آخر وہ ۷۸ سال کی عمر میں ۱۶۹۱ء [1] میں آفریدیوں کے ہاں اس دار ِ فانی سے کوچ کر گیا ۔ وہیں اس نے یہ وصیت کی کہ اسے ایسے مقام پر دفنایا جائے جہاں مغل سواروں کی گرد بھی اس کے مزار کو نہ پہنچ سکے ۔

خوشحال خان کی شاعری اور اس کی ادبی اور معلوماتی حیثیت

خوشحال خان خٹک سے قبل پشتو کے متعدد شعرا گزرے ہیں، جن میں سے کئی ایک صاحب ِ دیوان بھی ہیں ۔ خوشحال خان اگرچہ ان سے متاثر معلوم نہیں ہوتا ، لیکن اس نے ان سب کا بخوبی مطالعہ کر کے پشتو شاعری کے مقام اور معیار کا اندازہ کر لیا تھا ۔ اس نے یہ محسوس کیا کہ پشتو زبان وسیع دامن ہونے کے باوجود شعر و فکر کے بیش بہا موتیوں سے تہی ہے ۔ چنانچہ کہتا ہے :

کسی نے اس کے چہرے سے نقاب نہیں اٹھایا
وہ دوشیزۂ پشتو ابھی تک باکسرہ ہے (ترجمہ)

وہ فن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد اپنے کلام کے بارے میں لکھتا ہے :

---

(۱) اولف کیرو اور میکنزی دونوں ۱۶۸۹ء لکھتے ہیں ۔ دیکھیے اولف کیرو ص ۲۳۵ ۔ مکنزی ص ۱۱ ۔ غالباً ۷۸ سال عمر قمری حساب سے ہوگی اس لیے ۱۶۸۹ء قرین قیاس ہے ۔ (ادارہ)

"میں ہر بات میں لاجواب قصیدے کہتا ہوں۔ دلبروں کی آنکھ، ابرو اور زلف و خال کی تعریف میں غزلیں کہتا ہوں۔ میری رباعی، قطعہ، مثنوی سب دُر و گوہر ہیں۔ فارسی میں خواہ میرے مقابلے میں دوسرے لوگ بہتر شعر کہہ سکتے ہوں، لیکن پشتو زبان میں میری مثال اور نظیر نہیں ملے گی۔ میں نے پشتو میں شعرگوئی کا اہتمام کیا۔ مجھ سے پہلے پشتو کی شاعری عدم استعمال اور جامد ہونے کے علاوہ وزن، تقطیع اور عروض سے بھی نا آشنا تھی۔ غزل میں مطلع تھا اور نہ مقطع، صنعت تھی اور نہ تشبیہ اور نہ مثال۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے شاعر اس لیے بنایا کہ اسے پشتونوں کی تعلیم و تربیت مطلوب تھی۔ میں نے پشتو شاعری کو اتنی ترقی دی کہ میرے بعد لوگ مجھ سے بہتر شاعری کریں گے۔ اب تو میرے بعض بیٹے بھی اچھے شاعر ہیں۔ نظم و نثر اور انشاء جس باب میں بھی دیکھو گے میرا پشتو زبان کی ترقی میں بے حد و حساب حصہ ہے"۔ (ترجمہ)

خوشحال خان کی شاعری اس کے مقاصدِ عالیہ کے اظہار کا ذریعہ رہی ہے۔ وہ درباروں سے متعلق رہا ہے لیکن اس کی شاعری کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ خوشامد اور تملّق اس کی فطرت اور طبع کے خلاف تھی۔ چنانچہ وہ ان شاعروں کی سخت مذمت کرتا ہے جو اُمراء، وزراء اور بادشاہوں کے آستانوں پر محض انعام و اکرام کے لالچ میں حاضری دیتے ہیں۔ جیسا کہ کہتا ہے:

اس شاعر کا منہ کالا ہو جو طمع اور لالچ
کی غرض سے ہر دربار میں کھڑا رہتا ہے۔
میں نے اپنی طبیعت کو آزما کے یہ دیکھا
کہ میں اس میدان کا شاعر ہی نہیں ہوں۔
اگر میں اپنی شاعری کا اظہار اس طرح کرنا چاہتا
تو میں اپنے بادشاہ (شاہجہان) کی بہت مدح و ستائش کر چکا ہوتا۔
(ترجمہ)

خوشحال خان کی شاعری کے مطالعے سے بلند افکار اور اعلیٰ وجدان وایقان کی دولت ہاتھ آنے کے علاوہ بہت سی علمی، شخصیاتی، تاریخی اور جغرافیائی معلومات کا بھی ایک بیش بہا ذخیرہ دستیاب ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے تو غالباً خوشحال خان کو منفرد حیثیت حاصل ہے کہ اس کے کلام سے اس کے ذاتی اور خاندانی حالات کا بخوبی پتہ چلتا ہے اور اس نے اپنے بارے میں بہت کچھ برزبان شعر بیان کیا ہے۔ وہ اپنے عقائدِ مذہبی کا بھی وضاحت کے ساتھ اظہار کرتا ہے اور اپنے دور کی نمایاں شخصیتوں کا ذکر بھی بہت دلچسپ اور انوکھے انداز میں کرتا ہے۔ پٹھان قبائل کے عیوب و محاسن

بھی بے باکی کے ساتھ بیان کرتا ہے ، یہاں تک کہ ہر قبیلے کی عورتوں کے عیب و ہنر اور محاسن و قبائح بھی بتاتا ہے ۔

خوشحال خان نے غزل کا مقام بلند اور اس کا موضوع و سیع کرنے کے ساتھ ساتھ رباعی ، قطعہ ، مثنوی ، مخمّس ، مسدّس، الغرض فارسی شاعری کی تمام اصناف کو پشتو شاعری میں داخل کرکے درجۂ کمال کو پہنچایا ۔ مشہور مستشرق میجر راورٹی کے خیال میں خوشحال خان کے اشعار میں پشتو کے باقی تمام شاعروں کے مقابلے میں تنوّع زیادہ پایا جاتا ہے اور جس طرح مغرب کے شعرا ہر موضوع اور ہر مضمون پر قادر ہیں اسی طرح خوشحال خان بھی کسی موضوع و مضمون سے بیگانہ اور نا آشنا نہیں ہے ۔ مستشرقین نے خوشحال خان کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا ہے اور اسے پشتو کا مجاہد شاعر کہہ کر پکارا ہے ۔ پشتو کے مشہور غزل گو شاعر امیر حمزہ خان شنواری کے خیال میں خوشحال خان خٹک پشتو غزل کے میدان میں منفرد حیثیت کا مالک ہے ۔

خوشحال خان کے دیوان کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ایک بحرِ موّج ہے جس میں شعر و سخن کے ہر قسم کے گوہرِ آبدار دستیاب ہوتے ہیں ۔ دیوان کے مطالعہ سے فارسی ادب کے اثر اور اساتذہ فارسی سے خوشہ چینی کا کافی پتہ چلتا ہے مگر باوجود اس کے خوشحال خان کی قومی اور ذاتی شخصیت پوری آب و تاب سے جلوہ نما ہے ۔ دیوان طبع زاد افکار و خیالات اور اچھوتے اندازِ بیان کے بیش بہا نمونوں سے لبریز ہے ۔ علاوہ ایک ادبی شاہکار ہونے کے دیوان ایک بہت قیمتی دستاویز بھی ہے جس سے نہ صرف خوشحال خان کی زندگی کے اہم واقعات معلوم ہوتے ہیں بلکہ اس عہد کے بعض دیگر واقعات پر بھی کسی حد تک اس سے روشنی پڑتی ہے ۔

خوشحال خان کی تعلیمات

خوشحال خان کے کلام کو موضوع و مضمون کے اعتبار سے مندرجہ ذیل عنوانات میں آسانی کے ساتھ تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ حمد و نعت ، شریعت و طریقت سیادت و قیادت ، تاریخ و جغرافیہ ، حرب و ضرب ، بازو شاہین (بطور علامت بھی اور بطور مہارت بازداری بھی) حکمت و فلسفہ ، علم و ادب ، اخلاقیات ، پند و نصائح ، مردِ درویش ، عقل و عشق کا موازنہ ، عشق و رومان ، شکار و سیاحت ، منظر کشی اور طب و صحت وغیرہ ـــ خوشحال خان کے کلام سے بچوں اور نوجوانوں کی رہنمائی اور تعلیم و تربیت کے لیے بھی نہایت مفید اورکار آمد شعری ادب کا انتخاب کیا جا سکتا ہے ۔ علاوہ ازیں بہار و خزاں کے گیت بھی ہیں ، ملا و مکتب کی

باتیں بھی ہیں ، جہالت و توہمات کے خلاف جہاد بھی ہے ، جبر و اختیار اور جہد و عمل کا فلسفہ بھی ہے ۔ خودی و خود داری ، شجاعت و سخاوت ، مہمان‌نوازی اور دوسروں کی خیرخواہی کی تعلیم و تلقین تو بہت زیادہ ہے ۔

اس کی شاعری کے بعض پہلوؤں کو قریب قریب اس کے اپنے ہی بیان میں کہیں خلاصہ کے طور پر اور کہیں بالکل لفظی ترجمہ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس مختصر مضمون میں خوشحال خاں کی تعلیمات اور افکار و نظریات کا کسی حد تک احاطہ کیا جا سکے ۔

کائنات و انسان

خوشحال خاں کا تصوّرِ کائنات اور کائنات میں انسان کا مقام بہت بلند ہے ۔ وہ انسان کو زمین کا مقیّد و اسیر نہیں سمجھتا بلکہ اقبال کی طرح :

''ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں''

کی صدا بلند کرتے ہوئے کہتا ہے :

اے نادان انساں تیری نظر کمزور ہے !
ورنہ جہان تھوڑے نہیں ہیں ۔
دیکھ ایسی کتنی زمینیں اور کتنے آسماں
تیرے دل میں سمٹ کر یکجا ہیں !
اے عرش سے عظیم تر انسان
تو اپنا آئینۂ دل صیقل کر تاکہ تو دیکھ سکے !
جب تجھے یہ نصیب ہوگا تو جان لے گا
کہ تو سبحان سے جدا نہیں ہے ! (ترجمہ)

انسان کی عظمت و رفعت اور لامکانی و بیکرانی کے بارے میں یوں گویا ہے :

اگر تو میری عظمت دیکھے
تو آفتاب و ماہتاب میرے پرچم ہیں !
آسمان میرے خیام ہیں اور
یہ ستارے میرے خیموں کے نقش و نگار ہیں !
میرے بڑے بڑے باغ اس سے بھی آگے ہیں ، اور
باغ ارم تو میرا باغیچہ ہے ! (ترجمہ)

ایک جگہ انسان کی ماہیئت پر بحث کرنے کے بعد کہتا ہے کہ اگر انسان خدا کے برابر نہیں ہے تو اس سے قدرے ہی کم ہے ۔ پھر انسان کو مخاطب کرکے کہتا ہے :

اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاکہ تیرا مقام کہاں ہے
اور کائنات میں تیری کتنی شان و شوکت ہے ۔
تیرا مقام ملکوت سے بھی اونچا ہے لیکن
جب تو خود ناسوتی بن گیا تو تجھ میں خوئے گدائی پیدا ہوگئی ۔ (ترجمہ)

مردِ خوشحال

خوشحال خان کے محبوب، دل پسند اور مرعوب خاطر افراد وہ ہیں جن میں مردانگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہو ، بلند مقاصد کے علمبردار ہوں ، سخت کوش اور جفا طلب ہوں اور پُر خطر زندگی سے ہم کنار ہونے میں مسرت محسوس کرتے ہوں ۔ خوشحال خان کے تصور کے ہمہ صفت مرد کا اندازہ اس کے چند اشعار کےلفظی ترجمہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے :

مرد وہی ہے جو صاحبِ ہمت و برکت ہو اور لوگوں کے ساتھ
سلوک اور برتاؤ میں خوش خلق اور شیریں زبان ہو ۔
جس کا ظاہر و باطن ایک ہو ،
صادق القول ہو ، اپنے عہد کا پابند ہو ، جھوٹ اور فریب سے پاک ہو ۔
کم گفتار اور بسیارکردار ہو اور
اس کا دہن غنچہ کی مانند بند لیکن سینہ چاک ہو !
بلند ہونے کا موقعہ ہو تو عظمت و رفعت میں آسمان ثابت ہو
اور پستی کا محل ہو تو مانند خاک ہو !
تمکین میں مانند سرو بلند اور راست قامت ہو ، لیکن
جب عجز و انکسار کا موقع ہو تو تاک کی شاخوں کی مانند
اس کی شاخیں زمین پر ہر طرف پھیلی نظر آئیں !
وہ تازہ اور سر سبز باغ میں پھول کی مانند ایسا شگفتہ رو اور حسین ہو
کہ شیریں نوا بلبلوں کے چہچہے اور نغمے اس کے گرد بلند ہوتے رہیں (ترجمہ)

سیادت و قیادت

خوشحال خان خود ایک قائدِ قوم کی حیثیت سے سیادت و قیادت کے رموز و اسرار

اور قوم کے سردار کی صلاحیتوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس کا خیال ہے کہ :

وہ شخص خان اور سردار بن سکتا ہے
اور اپنے وطن اور قوم کی خود مختاری کو برقرار رکھ سکتا ہے
جو سر اور زر دونوں کی بازی لگانے سے احتراز نہ کرتا ہو '
بہادر، فیاض اور دانشمند و باتدبیر ہونے کے ساتھ راست باز اور باتمیز بھی ہو -

★ ★ ★

سیادت و سرداری کے لائق وہی شخص ہے
جو ننگ و ناموس پر فدا ہوتا جانتا ہے اور ذاتی سود و زیاں سے بے نیاز ہو -
شجاعت و سخاوت سیادت کی شرطیں ہیں ،
بزرگوں کے مسند پر وہی شخص بیٹھنے کے لائق ہے جس میں اس کے تمام اوصاف ہوں۔
سردار قوم کے دل میں اگر مکر و فریب ہو تو وہ اپنے آپ کو
رسوا اور قوم کو ذلیل و خوار کرتا ہے -
اگر سردار خود بہادر نہ ہو تو اس کا لشکر بھی
شجاعت و مردانگی کے مظاہرے نہیں کرسکے گا - (ترجمہ)

حرب و ضرب

خوشحال خان عدل و انصاف کے قیام ، ننگ و ناموس کے تحفظ اور عزت و غیرت کی نگہبانی کے لیے رزم و جہاد کو ضروری سمجھتا ہے - وہ ہر ظالم کو ختم کرنا فرض گردانتا ہے - اس کے لیے وہ ہر قسم کے اہتمام اور تیاری پر زور دیتا ہے - فوجی طاقت میں اضافہ کرنا ، اسلحہ سے لیس ہونا ، فنون حرب و ضرب سے واقفیت حاصل کرنا اور ملک و ملت کی خاطر جان کی بازی لگانا از بس لازمی قرار دیتا ہے -

جب وہ اپنے اطراف میں ظلم و تعدی کو دیکھتا ہے تو اس کے خلاف اپنی جد و جہد کے ساتھ ساتھ امام مہدی کو بھی مدد کے لیے پکارتا ہے :

اے مہدی غار سے نکل '
روسیاہ ظالموں کی کثرت ہوگئی
اب اٹھ اور
شمشیر عدل کو اٹھانے میں تاخیر نہ کر !

جلد جہاد کے ذریعے
ملک میں امن و سلامتی قائم کر ۔ (ترجمہ)

وہ ظلم کے خلاف لڑنے کے لیے صرف دو سہارے تلاش کرتا ہے یا خدائے واحد کا سہارا اور یا تلوار کا۔ کہتا ہے :

یا خدائے واحد کا سہارا ہے اور یا تلوار کا ۔
جرگوں اور کانفرنسوں سے معاملات طے نہیں ہوں گے ۔ (ترجمہ)

خود داری

خوشحال خان نے اپنے کلام میں غیرت و خود داری کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے ۔ وہ نہ صرف اپنی مدد آپ کرنے کی شدت سے تلقین کرتا ہے بلکہ دوسروں کی اعانت کرنے اور انہیں امداد دینے پر بھی بہت زیادہ زور دیتا ہے ۔ کہتا ہے :

اپنا بار دوسروں پر نہ ڈال !
جہاں تک ہو سکے
اپنا بوجھ خود اٹھا اور
دوسروں کا بار بھی اٹھانے کی کوشش کر۔ (ترجمہ)

جد و جہد

خوشحال خان کی تعلیمات میں جد و جہد کو خاص مقام حاصل ہے وہ عمل اور صرف عمل کو انسان کی ترقی کا زینہ قرار دیتا ہے ۔ مثلاً کہتا ہے :

عمل ہی سے انسان فرشتہ یا شیطان ہے !
ایک شخص برے عمل کی وجہ سے تحت الثریٰ میں گرتا ہے
اور دوسرا اچھے کردار کی بدولت آسمان سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔

★ ★ ★

راحت و آسائش سے وہی شخص ہمکنار ہو سکتا ہے جو
محنت و مشقت کی زحمت و کلفت گوارا کرتا ہے

★ ★ ★

اگر تو غواصی کرتا رہے تو تجھے گوہر مل سکتے ہیں ۔

یہ تجھے کس نے کہا ہے کہ دریا میں موتی نہیں ہوتے۔ (ترجمہ)

باز و شاہیں

کلامِ خوشحال خان میں شیر، غضنفر، ضیغم، باز، عقاب، شاہیں، ہما، ممولا، کبوتر و حمام کا بطورِ علامت بکثرت استعمال ملتا ہے۔ وہ ایک مجاہد اور شجاع قوم کا سردار ہونے کے ساتھ ساتھ شکار کا بھی بہت زیادہ شوقین تھا اس لیے وہ پرندوں اور درندوں کا خوب ماہر و شناسا تھا۔ اس نے کلیات کے علاوہ اپنی ایک منظوم کتاب 'باز نامہ' میں باز اور دیگر شکاری پرندوں کے اوصاف، عادات، پرورش اور علاج وغیرہ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

خوشحال خان باز یا شاہین کو اعلیٰ صفات والا پرندہ سمجھتا ہے اور یہی صفات وہ اپنے تصور کے انسان میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی شاعری میں پرندوں وغیرہ کے حوالے سے ہمیں جو پیغام ملتے ہیں ان کا اندازہ ذیل کے ترجمہ شدہ اشعار سے کیا جا سکتا ہے:

شہباز جیسی شوکت پیدا کر
اور ہمت میں مانند عنقا بن۔
ممولا پروں کی وجہ سے باز نہیں ہو سکتا
خواہ وہ پھُر پھُر کر کے اڑتا ہو! (ترجمہ)

حریت و آزادی

خوشحال خان خٹک حریت و آزادی کا علم بردار تھا۔ جذبۂ آزادی اس کے پیغام کا نمایاں حصہ ہے وہ محکومی، غلامی، ذلت اور بےعزتی کی زندگی کے خلاف مصروف جہاد رہنے کی ترغیب دیتا ہے اور اس زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے، جس میں انسان کی عزت نہ ہو اور اس کی خودی و غیرت مجروح ہوتی ہو۔

اسے ایسے مناصب اور عہدے ہرگز پسند نہیں جس میں اس کی عزتِ نفس محفوظ نہ ہو۔ وہ قومی غیرت اور ننگ و ناموس کی خاطر ہر تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے یہاں تک کہ وہ ہندوستان میں محکومی کا پان کھانے پر پہاڑوں میں آزاد رہ کر پیپل کے پتے کھانے کو ترجیح دیتا ہے۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیے:

جب میں مغلوں کا منصب دار تھا ، تو ملک (سردار) تھا لیکن جب وہ منصب جاتا
رہا ، تو اب میں ملک فرشتہ ہو گیا ہوں

★ ★

ایک اور جگہ کہتا ہے :

خوشحال خٹک منصب کی وجہ سے نوکر تھا
لیکن جب منصب نہ رہا ، تووہ بادشاہ بن گیا

(ترجمہ)

ملا و پیر

خوشحال خان جہاں عالموں کا معتقد اور قدردان ہے وہاں وہ نیم خواندہ اور جاہل ملا کا سخت مخالف ہے ۔ اس کے اشعار کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ اس طبقہ نے خوشحال خان کے زمانے میں بھی عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن جیسا کہ اس کے ذیل کے اشعار (ترجمہ) سے معلوم ہو گا، خوشحال خان فقط جاہل ، نیم خواندہ اور لاعلم ملاؤں کا مخالف تھا ۔

'' نادیدہ جب منیہ کی کتاب پڑھ لیتا ہے تو اپنے آپ کو ملا مشہور کر دیتا ہے جیسے یہ چند درہم جمع کر لیتا ہے اور خواجگان سے زیادہ مغرور ہو جاتا ہے''
'' اس مبلغ علم پر مغرور بن کر ملا ہو جاتا ہے اور دنیا کے سامنے وارث انبیاء بن جاتا ہے ۔ اسے لکھنا آتا ہے اور نہ پڑھنا بس خالی تعویذ دیتا ہے اور وہ بھی غلط سلط لکیریں کھینچ کر '' ۔

عشقیہ شاعری

لیکن ان ساری باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ خوشحال خان نے گل و بلبل کی شاعری نہیں کی ہے ۔ امر واقع یہ ہے کہ خوشحال خان کی عشقیہ اور رومانی شاعری بھی بے نظیر ہے ۔ اس قدر زیادہ متنوع شاعر کا احاطہ یہاں مشکل نظر آتا ہے ورنہ شہرِ لیلیٰ کا کوئی کوچہ ایسا نہیں جہاں خوشحال نہ گیا ہو یا محبوب کے در پر شوقِ دیدار میں نہ بیٹھا ہو ۔ تاہم خوشحال خان عشق و محبت اور دل باختگی کے میدان میں بھی یکتا اور فرد ہے ، مثلاً دیکھئے :

عشق میں خانی اور تلوار دونو بے کار ہیں
اے خوشحال اپنے محبوب کا تو غلام ہی بن کر رہ

★ ★ ★

اے محبوب ! اگر تو اس دور کی شیریں ہے
تو خوشحال بھی اپنے زمانے کا کوہ کن ہے

★ ★ ★

میں خوشحال کمزور نہیں جو ڈر جاؤں
بپانگ دہل کہتا ہوں کہ اس نے مجھے بوسہ دیا ہے

★ ★ ★

یا چمکتی ہوئی تلواروں کا مرد بن یا عاشق ہو جا
تا کہ تو نغموں اور گیتوں میں یاد ہوتا رہے

عقل و عشق

خوشحال خاں نے عقل اور عشق کے بارے میں بہت شعر کہے ہیں۔ وہ عشق کو عقل کا رہنما سمجھتا ہے اور مجرد عقل یا عقلِ محض کو خام ، گمراہ کن اور نا قابل اعتماد گردانتا ہے۔ یہاں تک کہ عقل و عشق دونوں کے قرب سے فساد کا اندیشہ محسوس کرتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے :

اے عقل تو عشق سے دور دور رہ کیونکہ جب دو مخالف
ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں تو فساد پیدا ہوتا ہے۔
اے عشق تو کہاں ہے کہ اس کا گناہ توڑ دے۔
دیکھ عقل پھر سر لے کر آئی ہے۔

★ ★ ★

مجرّد عشق ازلی ہے۔ یہ جنگ سے نصیب ہوتا ہے
اور نہ مسائل و فرہنگ سے ہاتھ آتا ہے

★ ★ ★

عاشق ہر وقت شمشیر لا سے مصروف جہاد رہتا ہے

★ ★ ★

دنیا میں رنج ، محبت ، جفا کشی و حفاطلبی کی قبیل کی ساری چیزیں
جب یکجا ہو گئیں تو اس کا نام عشق پڑ گیا۔

خوشحال خان کی تصانیف

کلیات : بعض محققین کے خیال کے مطابق خوشحال خان خٹک کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد سو کے لگ بھگ ہے۔ مشہور مستشرق میجر راورٹی کا بھی یہی خیال

ہے ۔ تاہم اس کی ایک درجن کتابیں معلوم و معروف ہیں ۔ جن میں سر فہرست اُس کا 'کلیات، ہے جو ہزاروں اشعار پر مشتمل ہے ۔

باز نامہ : دوسرے نمبر پر ' باز نامہ ، ہے ۔ یہ علمِ باز داری پر ایک نہایت ہی معلومات افزا منظوم دستاویز ہے جس میں بازوں کے امراض ، علاج ، پرورش ، خوراک اور شکار وغیرہ کے متعلق ماہرانہ و فنکارانہ مشوروں اور معلومات کے علاوہ خوشحال خان کی شاعری میں باز و شاہین کے بطور علامت و تشبیہ بکثرت استعمال کا پس منظر بھی دیکھا جا سکتا ہے ۔ ' باز نامہ ، کے تمہیدی اشعار میں سے ذیل میں چند ایک کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جس سے خوشحال خان کی جامع اوصاف شخصیت اور زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہے :

میری طبیعت بہادر باز کی طرح ہے ،
جو ہر وقت شکارِ مسرت کے لیے آمادہ رہتی ہے (ترجمہ)

★ ★ ★

میں ہر ہنر کی بہت سی کتابیں رکھتا ہوں
لیکن مجھے سرور 'باز نامہ، ہی سے حاصل ہوتا ہے (ترجمہ)

★ ★ ★

' باز نامہ ، پشتو شاعری کی ایک ایسی کتاب ہے جس سے خوشحال خان کا فنِ شاعری میں انتہائی کمال بھی ظاہر ہوتا ہے اور باز کی پیدائش اور پرورش کے متعلق بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔

فضل نامہ : ایک کتاب فضل نامہ ہے جو چھوٹی بحر کی مثنوی پر مشتمل ہے ۔ اس میں شرعی و فقہی مسائل بیان کیے گئے ہیں ۔ بہت عمدہ کتاب ہے ، دیگر مذہبی اور شرعی مسائل کے علاوہ اس میں جہاد اور شہادت کی باتیں بھی ہیں ۔ جائز و ناجائز اُمور بھی بیان کیے گئے ہیں ۔

سوات نامہ : ایک اور کتاب سوات نامہ ہے ۔ پشتو کی اس منظوم کتاب میں خوشحال خان نے اپنے سفرِ سوات کی داستان کے علاوہ وہاں کے جغرافیائی اور دیگر حالات بھی بیان کیے ہیں ۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سوات کے قدرتی مناظر نے خوشحال خان کے دل کو موہ لیا تھا ۔ وہ کہتا ہے :

میں سوات میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھرا اور اس کے ہر مقام
کو دیکھا ۔ اس کے شمال میں بلورستان کا پہاڑ ہے ، مشرق میں کشمیر
مغرب میں کابل اور بدخشاں اور سمت ہندوستان (جنوب) میں کوہ سیاہ ہے

سوات کے سب سے بڑھ کر تحفے دو ہیں گل رخسار محبوب اور باز
چاروں طرف آبسار ہیں ۔ عمدہ آبادیاں ، سرائے اور بازار ہیں
(ترجمہ)

خوشحال خان نے ' سوات نامہ ' میں اخوند درویزہ کے عقائد ، تعلیمات اور علمی و ادبی حیثیت پر بھی خوب بحث کی ہے ۔ اس کی کتاب ' مخزن ' کے بارے میں کہتا ہے " اس کا ہر بیان نا موزوں ، مجہول اور بے رنگ ہے ۔ دانش و فرہنگ سے بھی تہی ہے ۔ ایک مصرعہ اگر دس کا ہے تو دوسرا سو کا اور کہنے میں بالکل بے ربط اور ناموزوں " ۔

'سوات نامہ' میں بایزید انصاری المعروف پیر روخان کا ذکر بھی ہے ۔ اخوند درویزہ کے دور میں پیر روخان نے فساد کی بنیاد رکھی ۔ پٹھان بھی اس فساد میں اس کے ہم رکاب ہو گئے ۔ پیر روخان کی کتاب ' خیرالبیان ' کے بارے میں خوشحال خان کہتا ہے :

" اخوند درویزہ نے روخان کی خرابیاں دیکھی تھی ۔ اس کتاب میں بھی جاہلانہ اور نا پسندیدہ باتیں ہیں ۔ درویزہ نے جب میدان خالی دیکھا تو سخن گو بنا ۔ جو کچھ اس کے دل میں آیا کہا ۔ اس وقت پٹھانوں میں علم نہ تھا اس لیے درویزہ ان کے لیے مجتہد سے بڑھ کر تھا "

' سوات نامہ ' اس لحاظ سے بھی ایک دلچسپ دستاویز ہے کہ اس میں خوشحال خان نے اپنے مشن اور قومی جد و جہد کا ذکر کیا ہے ۔ کچھ تاریخی اور تمدنی حالات بھی اس میں بیان ہوئے ہیں اور اس دور کی قبائلی زندگی کی تصویر بھی کھینچی گئی ہے ۔

دستار نامہ : یہ خوشحال خان کے نثری مضامین کا مجموعہ ہے ۔ اس کتاب میں فنونِ سپہ گری ، سیاست ، کھیل ، فنونِ لطیفہ ، اخلاق اور تہذیب و تمدن کے بارے میں عالمانہ اور فاضلانہ باتیں درج ہیں ۔

ذیل میں چند ٹکڑوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے :

"علم اور خط (سواد) لازم و ملزوم ہیں ۔ علم کی مثال وحشی کی ہے ۔ خط مثل کمند ہے جس سے وحشی کو قید کیا جاتا ہے ۔ اگر تحریر نہ ہوتی تو یہ اتنی ساری کتابیں بھی نہ ہوتیں ۔ دنیا کا سارا کاروبار تحریر سے چلتا ہے ۔ یہ ایک بڑا ہنر ہے اور اس کی قدرو قیمت بھی بے حد و بے حساب ہے ۔ دولت مند کے لیے یہ زیب و زینت ہے ۔ درویش کے لیے دولت ہے ۔ قلم کا

کام پوشیدہ نہیں ، ہویدا ہے ۔ یہ فن جس کے ہاتھ آ جاتا ہے اس کا ہو جاتا ہے ۔ یہ ہر ایک کا یار ہے ،،

فرخنامہ : اس میں قلم اور تلوار کی بحث ہے ۔ خوشحال خان خود صاحبِ سیف بھی تھا اور صاحبِ قلم بھی ، جیسا کہ وہ خود بازنامہ کے ایک شعر میں کہتا ہے :

شمشیر ہو خامہ یا سخا ان تینوں چیزوں میں
میرا ہی نام دور و نزدیک مشہور ہے ۔ (ترجمہ)

فراق نامہ : یہ خوشحال خان کے ایام اسیری کے فراقیہ اشعار کا مجموعہ ہے جو اس نے وطن اور اعزا و احباب کی یاد میں کہے ہیں ۔ یہ مجموعہ کلام غزلیات اور مثنویات پر مشتمل ہے ۔

صحت البدن : حفظانِ صحت اور طب کے متعلق کتاب ہے بعض کے خیال میں یہی اس کی طب منظوم ہے ۔

ہدایہ اور آئینہ : یہ دونوں فقہ کی کتابیں ہیں جو عربی سے پشتو میں ترجمہ ہوئی ہیں ۔

بیاض : خوشحال خان کی نثری خود نوشت ہے جو ذاتی ، خاندانی اور قومی حالات پر مشتمل کتاب ہے ۔

زنجیری : اس کتاب میں مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) کے طریقے درج ہیں ۔ کہتے ہیں کہ خوشحال خان پشتو میں خود اس فن کا موجد تھا ۔

اس عہد کے پشتو کے دیگر شعراء

کریم داد (م - ۱۶۶۱ء/۱۰۷۲ھ)

کریم داد اخوند درویزہ کے فرزند تھے ۔ ان کا اصل نام عبد الکریم ہے ۔ وہ اپنے والد گرامی کی طرح پشاور ، سوات اور آس پاس کے علاقوں میں اپنے علم و عرفان اور تصوّف کی وجہ سے بہت مشہور ہیں ۔ اس وقت کے مصنفوں نے ان کو بہت یاد کیا ہے یہاں تک کہ ' خلاصتہ البحر ، نامی کتاب میں انہیں 'محقق افغانی، کہا گیا ہے اور ' معارج الولایت ، میں ان کے بہت سے مناقب درج ہیں ۔ رحمان علی 'تذکرہ علمائے ہند ، میں ان کا ذکر کرتا ہے اور سن وفات ۱۶۶۱ع/۱۰۷۲ھ لکھتا ہے ۔ آپ علاقہ سورت کے کوہستانوں میں کفار سے جہاد کے موقع پر شہید ہوئے تھے ۔ آپ کا مزار موجودہ ریاست سوات کے موضع کانجو میں ہے ۔ آپ نے اپنے والد کی مشہور تصنیف 'مخزن الاسلام،

کو مرتب کیا اور اس میں کچھ اپنی طرف سے بھی اضافے کیے ۔ آپ نے اس میں اپنا منظوم ' الف نامہ ، شامل کیا ہے ۔ آپ نظم سے زیادہ نثر میں شہرت رکھتے ہیں ۔

ذیل کے اشعار سے آپ کے علم و فکر کا اندازہ ہو سکتا ہے :

تو ہمیشہ اس کے (خدا) حضور میں رہ اور ہر طرح کی غفلت ترک کر
تیری اپنی ہی صورت تاریک ہے تو یہ تاریکی دور کرکے سراپا نور بن جا (ترجمہ)

بابو جان نعمانی

بابو جان نعمانی ایک مشہور شاعر ہے ۔ راورٹی کے بقول پہلے وہ سرخ کافر تھا اور بعد میں مسلمان ہو گیا ۔ اس کے حالاتِ زندگی نا معلوم ہیں ، البتہ میر احمد شاہ رضوانی نے اپنی کتاب ' شکرستان ، میں اس کی چند غزلیں نقل کی ہیں ۔ اس کے علاوہ بابو جان کے پشتو اسعار کے مجموعہ (دیوان) کے قلمی نسخے عام ملتے ہیں ۔ بابو حان شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں گزرا ہے ، اس نے اپنی متعدد نظموں مں اورنگ زیب عالمگیر کا ذکر کیا ہے ۔ اس کے اشعار اخولد درویزہ کے اشعار کی مانند ہیں ، جو نثرِ مرصّع اور مسجّع کے اسلوب میں کہے گئے ہیں اور بحیثیت مجموعی اس کا کلام وعظ و نصحت دنی و مذہبی مسائل خصوصاً متصوفانہ مضامین پر مشتمل ہے ۔

نمونہ کلام

حاتم کا نام قیامت تک قائم رہے گا
سخاوت کی وجہ سے وہ ازلی نیک بخت تھا
حاجت مند اس کے در سے نا اُمید نہیں جاتے تھے
وہ ان کو بغیر کسی لالچ اور منت کے دیا کرتا تھا
وہ سائل کو مرحبا کہہ کے اس کی دلجوئی کرتا تھا
اور وہ فقیروں کی خدمت سے غافل نہیں تھا
جو سائل بھی اس کے در پر حاضر ہو جاتا تھا
وہ اپنی زحمت سے فراغت پاتا تھا ۔ (ترجمہ)

★ ★ ★

سخاوت کے سبب شہر میں اس کے نام کی شہرت ہو گئی
اس کی شہرت سے بادشاہوں کو مارے غصے کے حسد آتا تھا۔ (ترجمہ)

★ ★

اے بابو جان ہمت خدائی خزانوں سے ملتی ہے
خدا کسی صاحبِ ہمت کو بے ہمت نہ کرے (ترجمہ)

عبدالقادر خان خٹک (پ - ۱۶۵۱ء/۱۰۶۲ھ)

خوشحال خان خٹک کے فرزندوں میں عبدالقادر خان خٹک کو شاعر و ادیب کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل ہے - وہ اپنے بڑے بھائی اشرف خان ہجری کی طرح اپنے والد خوشحال خان کے سبک و مکتب کا پیروکار تھا - اس کی شاعری موضوع کے اعتبار سے بھی متنوع ہے - وہ اپنے باپ کی طرح صاحبِ سیف بھی تھا - کئی معرکوں میں اپنے والد کے ہمرکاب رہا - بنگشوں کے ساتھ گمبٹ کی جنگ میں وہ زخمی بھی ہوا ، لیکن خوشحال خان کی وفات کے بعد وہ بالکل بدل گیا اور نوشہرہ میں گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے لگا[1] - اس کے سن پیدائش کے بارے میں (عبدالقادر خان رحمان بابا کا ہمعصر ہے) معمولی سا اختلاف ہے - تا ہم ایک حساب اور اندازے کے مطابق اس کا سن پیدائش ۱۶۵۱ع/۱۰۶۲ھ ہے - اس نے 'یوسف زلیخا' کو ۱۷۰۰ع/۱۱۱۲ھ میں پشتو نظم کا جامہ پہنایا - اس میں وہ اپنی عمر پچاس سال بتاتا ہے ، مثلاً :

میری عمر پچاس سال کو پہنچ گئی ہے،
لیکن ابھی تک غفلت میں مبتلا ہوں،
میرے بال سفید اور دل سیاہ ہو گیا،
اور میری بری خصلت ابھی تک نہیں گئی ہے! (ترجمہ)

تذکرہ نگاروں نے مذکورہ سنِ پیدائش کا اندازہ اس کے اسی شعر سے لگایا ہے - اس حساب سے وہ اپنے بڑے بھائی اشرف خان ہجری سے ۲۸/۲۹ سال چھوٹا ہے - ۱۷۰۶ع/۱۱۱۸ھ تک وہ یقیناً زندہ رہا -

عبدالقادر خان صاحبِ دیوان ہونے کے علاوہ مصنف ، مؤلف اور مترجم بھی تھا - میجر راورٹی کے خیال کے مطابق وہ ساٹھ کتابوں کا مصنف و مؤلف تھا - لیکن اس کی صرف چھ کتابیں معلوم و موجود ہیں - ایک دیوان ہے جو ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے - اسکے علاوہ 'گلستانِ سعدی' کا پشتو ترجمہ اور 'یوسف زلیخا' کا منظوم پشتو ترجمہ،

---

(۱) عبدالقادر خان خٹک سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت شیخ سعدی بلغاری (متوفی ۱۱۰۸ھ مرزا سعدی پارک مزنگ لاہور) کے خلیفہ اور ماذون تھے اس لیے اس کے ہم عصر شعرا اس کو بجائے عبدالقادر خان کے خلیفہ صاحب کے نام سے یاد کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں عبدالرحمان بابا کی طرح تصوف کے اسرار و رموز کو شعر کے الفاظ میں موزوں کیا گیا ہے - (اثر افغانی)

جو چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے ملتے ہیں ۔ پشتو کی ایک مثنوی 'نصیحت نامہ' بھی اس کی تصنیف ہے ۔ اس نے چہل حدیث کے بیان پر مشتمل پانچ صد اسعار کی ایک نظم بھی لکھی ۔ اس کے علاوہ مشہور رومانی اور عاشقانہ داستان 'آدم درخانی' کو بھی نظم کا جامہ پہنایا اور ' قصیدہ بردہ ' کا منظوم پشتو ترجمہ بھی کیا ۔ 'قصیدہ بردہ' میں اس نے عربی کے ایک شعر کے مقابلے میں پشتو کا ایک ایک شعر لکھا ہے ۔ ان تصنیفات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عبدالقادر خٹک ایک اچھا عالم فاضل سخص تھا ۔

اس میں کوئی شک نہیں عبدالقادر خان پشتو کا ایک بلند پایہ اور متنوع شاعر ہے ۔ شعر و ادب کے تمام پہلوؤں سے بخوبی آگاہ ہے ، صنائع بدائع بھی بیان کرتا ہے ۔ ادبی محاسن اور شعری نزاکتوں سے اپنے کلام کو شیریں اور حسین بنانے پر قادر ہے ۔ بلاغت بھی اس کے کلام میں پائی جاتی ہے ۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس کا کلام سادہ اور عام فہم ہے ۔ اس نے عاشقانہ ، اخلاق اور اجتماعی اشعار بھی کہے ہیں لیکن اس کے کلام کا زیادہ تر حصہ صوفیانہ ہے ۔ وہ اپنے اشعار کو اپنے خونِ دل کے قطرے سمجھتا ہے :

میرے رنگین اشعار کو الفاظ نہ سمجھو
یہ تو میرے دل سے رود خون جاری ہے (ترجمہ)

عبدالقادر خان وطن کی محبت ، آزادی کے ولولے اور افغانی غیرت سے سرشار ہے ۔ اس نے اپنے باپ کی طرح ہر موضوع اور ہر مضمون پر شعر کہے ہیں ۔

پشتو کے دوسرے بڑے شاعروں کی طرح وہ ایک با مقصد اور نظریاتی شاعر اور اجتماعی زندگی کا فلسفی و مفکر بھی ہے جو جدوجہد کی تلقین کرتا ہے ، مثلاً :

پن چکی چلنے ہی سے کچھ حاصل کرتی ہے ،
تو بھی طلب میں ہمہ وقت مصروف رہ !
جواں مرد وہ ہے جو مجلس میں جمع ،
لوگوں کے سامنے اپنی جان جلائے ،
دوسروں کی خاطر ہنستا رہے ،
لیکن اس کے چہرے پر اشکوں کی بارش جاری ہو ،
جنگ میں سر خروئی وہی حاصل کرتا ہے ،
جو میدان میں تلوار کو سرخ کرے !
جو میرے ساتھ برائی کرتا ہے میں اس کے ساتھ بھی اچھا ہوں

اسی سبب میں اچھے اور برے سب لوگوں کی آنکھ کا تارا ہوں

(ترجمہ)

عبدالقادر خان نے رباعیات بھی کہی ہیں جو عمر خیام کی رباعیات سے ملتی ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے عمر خیام کی رباعیات کا پشتو میں آزاد منظوم ترجمہ کیا ہے ۔ ان میں عبدالقادر خان کی اپنی فنکارانہ صلاحیت بھی نظر آتی ہے ۔ اس نے اپنے والد کی زمین میں بھی غزل گوئی کی اور اس طرح ایک تاریخی مشاعرہ کی بنیاد رکھی جس میں پشتو کے بہت سے شعرا نے حصہ لیا ہے ۔

صدر خان خٹک

صدر خان خٹک بھی خوشحال خان خٹک کا فرزند تھا ۔ ہجری اور عبدالقادر خان خٹک کے بعد خاندان خوشحال میں ادبی پایہ کے اعتبار سے تیسرے نمبر کا شاعر ہے ۔ اس کے حالات کی تفصیل نہیں ملی ۔ صاحبِ دیوان تھا اور اس کے علم و فضل کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس نے نظامی گنجوی کی کتاب 'خسروشیریں' کو پشتو میں منظوم کیا ہے[۱] ۔ اس کے علاوہ پٹھانوں کی مشہور عشقیہ داستان آدم درخانی کو نظم میں پیش کیا ہے ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رومانیت پسند اور عاشق مزاج تھا ۔ اس نے اپنے اشعار میں بھی زیادہ تر عشق کے موضوع پر خیال آرائی کی ہے ۔

صدر خان خٹک ، صدر خوشحال کے نام سے بھی مشہور ہے اور اس نام کو بھی وہ تخلص کے طور پر استعمال کرتا ہے ۔ وہ ایک پختہ کلام شاعر ہے اور خود بھی آپ کو اپنے بھائی عبدالقادر خان خٹک کی چوٹ کا شاعر سمجھتا ہے ۔ اس نے اس مشہور مشاعرے میں شرکت بھی کی ہے جس کا آغاز عبدالقادر خان خٹک نے خوشحال خان کی ایک غزل کو طرح مصرع بنا کر کیا تھا ۔

صدر کی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ۔ ان سے اندازہ ہو گا کہ وہ کاروبارِ عشق و حسن سے کتنا باخبر تھا :

تیرے لبوں کے سامنے لعل و گہر ہیچ ،
اور تیری زلفوں کے سامنے مشک و عنبر ہیچ ،
اپنے رخ پر سے حجاب اٹھا لے ۔

---

(۱) قاضی عبدالحلیم اثر افغانی کی تالیف پشتانہ شاعران (غیر مطبوعہ) کی روایت کے مطابق صدر خان خٹک نے تاریخ اعثم کوفی کا پشتو ترجمہ بھی کیا ہے، جس کا قلمی نسخہ پشاور سنٹرل ریکارڈ آفس میں موجود ہے ۔ اس کے علاوہ صدر خان کی ایک تالیف پشتو زبان میں منظوم معجزات بھی ہے جس کا قلمی نسخہ مولانا محمد اعظم فتح خان خیل مرحوم باشندہ شہر کوہاٹ کے خاندان کے پاس ہے۔

آفتاب کو غائب کر دے اور قمر کو ہیچ بنا دے۔
جب بدرقۂ عشق ساتھ نہ ہو تو خونخوار راستے پر سفر کرنا خطرناک ہے۔
جب خریدار بے نیاز ہو تو آنکھوں کے در و گوہر ہیچ ہیں!
(ترجمہ)

سکندر خان خٹک

خوسحال حان خٹک کے ساعر فرزندوں میں اشرف خان ہجری اور عبدالقادر خان خٹک کے بعد سکندر خان خٹک خاص سہرت کا مالک ہے۔ وہ اپنے ان دونوں بھائیوں سے عمر میں چھوٹا ہے۔ اس کا کلام عام نہیں ہے کیونکہ اس کا دیوان کافی مدت تک گم رہا۔ صرف پادری ہیوز نے اس کی ایک غزل 'کلید افغانی' میں دی تھی اور یہی ایک غزل اس کے اکمر تدکرہ نگاروں کے پیس نظر رہی۔ یہ غزل فصاحت و بلاغت، رنگینی اور رومانیت، روانی اور نادر الخیالی اور الفاظ کے موزوں استعمال کے سبب اتنی دلکش اور رنگین ہے کہ اس سے نہ صرف اس کے ایک قادرالکلام ساعر ہونے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے بلکہ آسانی کے سانھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ، وہ اپنے والد خوشحال خان خٹک کے مکتب سے تعلق رکھتا ہے۔ ویسے وہ صاحبِ دیوان شاعر ہے اور حال ہی میں اس کے دیوان کا ایک نسخہ پشتو اکیڈمی کو سصری خان گگیانی کے دیوان کے ساتھ پیوستہ اور وابستہ صورت میں ملا ہے۔

سکندر خان خٹک نے محمد بن احمد العطار تبریزی کی ایک کتاب کا منظوم پشتو ترجمہ بھی کیا تھا۔ یہ کتاب 'مہر و مشتری' کے نام سے موسوم ہے جو ایک لمبی رومانی نظم پر مسںمل ہے۔ اس سے سکندر خان کی قادرالکلامی اور رومان پسندی کا مزید پتہ چلتا ہے۔

سکندر خان کے کلام میں کافی زور اور توانائی ہے اور اس کے کلام ہی سے اس کے فاضل و عالم ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

کامگار خان خٹک

کامگار خان خٹک خوشحال خان کا پڑپوتا اور صاحبِ دیوان شاعر ہے جس کے کلام میں اعلیٰ ادب کے تمام اوصاف موجود ہیں۔ وہ ویسے عبدالحمید مہمند کا پیرو کار نظر آتا ہے۔ بہت عمدہ اور دلنشین تشبیہات، استعارات اور کنایات استعمال کرتا ہے اس کا شمار اپنے وقت کے چوٹی کے پشتو شعراء میں ہوتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے

اس کا زیادہ تر کلام عشقیہ ہے لیکن سماجی اور اخلاقی مضامین پر بھی شستہ زبان میں شعر کہتا ہے۔ اس کے اشعار میں اثر اور زور موجود ہے۔ وہ خوشحال خان خٹک کے ایک دوسرے پڑپوتے اور نامور شاعر کاظم خان شیدا کا ہمعصر ہے۔ اس کے کلام کا نمونہ پادری ہیوز (۱۸۷۲ع) نے 'کلید افغانی' میں دیا ہے۔ کامگار خان کا دیوان پہلے نایاب تھا لیکن اب چھپ چکا ہے۔ یہ دیوان سب سے پہلے کابل کے پشتو ٹولنے نے شائع کیا۔

نمونہ کلام

ساقی! ذرا جلدی سے اٹھ کر مجھے آبِ حیات دے دو
اور پھر اس کے ساتھ ہی اپنے سرخ ہونٹوں کا نقل بھی دے دو۔
(ترجمہ)

بی‌بی حلیمہ

خوشحال خان خٹک کی اولاد میں اس کے بیٹوں، پوتوں اور پڑپوتوں کے علاوہ ایک بیٹی بھی شاعرہ تھیں جن کا نام 'حلیمہ بی‌بی' تھا۔ بی‌بی[۱] موصوفہ عبدالقادر خان خٹک کی حقیقی ہمشیرہ تھیں۔ حافظۂ قرآن اور ایک عارفہ متصوفہ صالح خاتون تھیں اور اپنے برادرِ حقیقی عبدالقادر خان خٹک ہی کے گھر میں دیگر خواتین کو درس دیا کرتی تھیں۔ شیخ سعدی لاہوری کی بیعت کی تھی۔ ان کے کلام میں تصوّف اور عشق کی چاشنی ہے، مثلاً:

میں اپنے محبوب کو ایسی پسند آ گئی ہوں
کہ معلوم نہیں میں ممتاز ہوں یا نورجہاں

★ ★ ★

جب ایاز کا عشق مجازی میرے دل سے نکل گیا
تو میں محمود جیسے سلطان سے بھی سر بلند ہو گئی

★ ★ ★

میں جس کی طرف بھی دیکھتی ہوں مجھے سب میں وہی ایک
نظر آتا ہے میں اس کے نظارہ جمال سے شادمانی محسوس کرتی ہوں

★ ★ ★

فکرِ غیر میرے دل سے نکل گیا ہے
میں دوست و دشمن کے لیے یکساں ہوں

★ ★ ★ (ترجمہ)

---

۱ - بی‌بی حلیمہ کا مزار اپنے والد خوشحال خان خٹک کے مزار کے احاطہ میں ہے (اثر افغانی)

خواجہ محمد بنگش

خواجہ محمد بنگس خوشحال خان خٹک کا ہم عصر اور پشتو کا ایک ممتاز شاعر ہے ۔ اس کے حالات بھی تاریکی میں ہیں ۔ دیوان مرتب و یکجا تو ہوا ہے لیکن ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوا ۔ اس کے دیوان کا ایک حصہ میجر راورٹی نے 'گلشن روہ' میں درج کیا ہے ۔ بنگش لوگ صرف وادیٔ کوہاٹ کے باشندے ہیں ، اس لیے خواجہ محمد کا تعلق بھی وادیٔ کوہاٹ سے ہی ہو گا ۔ اس کے ایک شعر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے دورِ حکومت سے وہ بھی نالاں تھا ۔ مثلاً وہ کہتا ہے :

اورنگ زیب کی بادشاہی میں مجھے اطمینان حاصل نہیں
اس لیے میں خواجہ محمد کسی اور طرف رخ کروں گا

(ترجمہ)

یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ بنگش اورنگ زیب کے حامی تھے اور خوشحال خان خٹک اور بنگشوں کے مابین متعدد جنگیں ہوئی تھیں ۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ خوشحال خان کو اس بات کا علم تھا یا نہیں کہ اس کے اپنے ہی عہد میں ایک بنگس ساعر اورنگ زیب کی بادشاہی سے نالاں ہو کر کہیں دوسرے ملک کو ہجرت کرنے کی خواہش کرتا ہے ۔

خواجہ محمد بنگش کے حالات زندگی تو معلوم نہیں لیکن وہ پشتو کا ایک بلند پایہ شاعر مانا گیا ہے ۔ کلام میں پختگی، سیرینی اور متانت ہے ۔ اپنی طبیعت کے اعتبار سے وہ صوفی عاشق مزاج معلوم ہوتا ہے ۔ اس کے کلام میں معرفت ، روحانیت اور اخلاق کا درس پایا جاتا ہے ۔ اس کے اشعار سادہ اور عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی اعتبار سے بھی بلند پایہ ہیں ۔ اس کے نغمے اور گیت لطیف و شیریں ہیں ۔ فصاحت و بلاغت بھی اس کے کلام میں پائی جاتی ہے ۔ ذیل کے اشعار سے اس کی قادرالکلامی اور فصاحت و بلاغت کا اندازہ ہو سکے گا :

دلوں کو نہ توڑ یہ تو لعل بدخشاں ہیں !
شکستہ چیزوں کو پھر جوڑنا مشکل ہوتا ہے ۔
میں نے اپنا دل تیری محبت سے وابستہ کیا ہے،
اپنے دل بستہ لوگوں پر نظر کیا کر،
تیری زلفوں کے باد شمال سے،
چمن کے سارے پھول تر و تازہ ہو گئے ۔

تیری قد و قامت کو دیکھنے کے بعد
تمام آراستہ و پیراستہ لوگوں کی کمر جھک گئی!

(ترجمہ)

رحمان بابا (م - ١٧٠٦ء/١١١٨ھ)

ان کا نام عبدالرحمٰن سڑبنی ہے مگر رحمان بابا کے نام سے مشہور ہیں۔ شاہ جہان کے عہد میں پیدا ہوئے۔ اورنگ زیب کا پورا دور انہوں نے دیکھا اور شاہ عالم اول کے زمانے تک بھی زندہ رہے۔ اگرچہ وہ خوشحال خان کی طرح سیاسی آدمی نہ تھے اور نہ ان کے کلام میں سیاست نمایاں ہے ، لیکن انہوں نے اپنے دور سے آنکھیں بند بھی نہیں کی تھیں ۔ انہوں نے اپنے زمانے کے مسلمانوں کی اخلاق اور معاشرتی زبوں حالی کا پورا نقشہ ہی نہیں کھینچا ہے، رونا بھی رویا ہے ۔ زمانے پر تنقید بھی کی ہے اور فکر و عمل میں اصلاح و انقلاب کی کوشش بھی کی ہے ۔ اگر کوئی شاعر اپنے دور کا شاہد، مؤرخ اور ترجمان ہو سکتا ہے (پشتو کے اکثر شعرا اپنے دور کے مورخ بھی ہیں) اور وہ شاعر غیر جانبدار، بے نیاز اور خدا ترس بھی ہو تو پھر رحمان بابا سے بڑھ کر کوئی اور نہ ہوگا ۔ رحمان بابا نے اورنگ زیب کی خامیوں کا ذکر بھی کیا ہے، انتقال کے بعد اسے خراج تحسین بھی پیش کیا ہے اور اس کے لیے دعائے مغفرت بھی کی ہے ۔ اورنگ زیب ان کے کلام میں بے ثباتیٔ عالم کے لیے علامت کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ رحمان بابا کو فکر ہے کہ جب اورنگ زیب کے بعد شاہ عالم کے طور ٹھیک نہیں تو مسلمانوں کا کیا بنے گا ۔

خوشحال خان اور رحمان بابا اگرچہ دونوں بلند پایہ شاعر اورمفکر تھے لیکن دونوں کی شخصیتیں اور مزاج ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ خوشحال خان ایک سردارِ قوم، صاحبِ جاہ ،افسر لشکر و سپاہ ، دنیادار اور ایک مہم جو اور خطر پسند شخص تھے ۔ قید و بند اور جلاوطنی کی صعوبتوں سے بھی آشنا تھے اور سیاحت و شکار کے بھی دلدادہ تھے جب کہ رحمان بابا دنیاوی اعتبار سے ایک عام پٹھان گھرانے کے فرد تھے ۔ وہ عمر بھر دنیاوی الجھنوں سے دور رہے اور ان کی زندگی صرف علم کے حصول، فکرِ سخن اور ذکرِ الٰہی میں صرف ہوئی ۔ رحمان بابا کے حالات زندگی تاریکی میں ہیں یہاں تک کہ انہوں نے اپنے کلام میں بھی اپنے ذاتی اور خاندانی حالات کا تذکرہ نہیں کیا ۔ بعض اشعار میں اشارے کنائے ضرور ہیں لیکن واضح طور پر کچھ نہیں ملتا ۔ تذکرہ نگاروں نے ان کے جو تھوڑے بہت حالات قلم بند کیے ہیں وہ روایتوں اور سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں ۔ پٹہ خزانہ ، میجر راورٹی اور پادری ہیوز ان کے بارے میں سند اور حوالے کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ بعد میں بعض اور محققین نے بھی ان کے حالاتِ زندگی

کے بارے میں کچھ کرید کی ہے ، جن میں مولانا عبدالمجید افغانی (مرحوم) ، دوست محمد خان کامل مہمند (ایڈووکیٹ پشاور) اور قاضی عبدالحلیم اثر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان میں مطابقت نہیں ہے۔ مثلاً سن ولادت و سن وفات تک میں اختلاف ہے۔ اس پر بھی مکمل اتفاق نہیں ہے کہ انہوں نے تعلیم کہاں کہاں اور کتنے عرصہ تک حاصل کی۔ پادری ہیوز کے خیال میں رحمان بابا شادی شدہ تھے اور ان کی ایک صاحب رادی کی نسل اب بھی موجود ہے ، جب کہ بعض دوسرے حضرات ان کے شادی شدہ ہونے میں شک کا اظہار کرتے ہیں۔

بہر حال جو کچھ ان کے بارے میں معلوم ہے وہ یہ ہے کہ رحمان بابا شاہجہان کے عہد میں ۱۶۳۲ء/۱۰۴۲ھ یا اس سے کچھ آگے پیچھے پشاور سے تین چار میل جانب جنوب ایک گاؤں موضع بہادر کلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالستار تھا اور وہ پٹھانوں کے قبیلہ مہمند سے تعلق رکھتے تھے۔ پادری ہیوز کے خیال کے مطابق وہ اس قبیلے کی شاخ ابراہیم خیل ، مگر راورٹی اور دوسروں کے خیال میں غوریہ خیل شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مؤخرالذکر بات اس لیے ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ خوشحال خان خٹک کے فرزند عبدالقادر خان خٹک (رحمان بابا کے ہم عصر) نے اپنے ایک شعر میں ان کو غوریہ خیل کہا ہے۔ رحمان بابا نے خود کو صرف مہمند کہا ہے ، لیکن وہ پٹھان ہونے پر فخر کرنے کے باوجود قبائلی امتیازات سے بالا تر تھے۔

رحمان بابا کے سال وفات میں بھی اختلاف ہے۔ تاہم اگر ۱۷۰۶ء/۱۱۱۸ھ کو سن وفات تسلیم کر لیا جائے تو انہوں نے چھہتر (۷۶) سال کی عمر میں وفات پائی۔

اگرچہ پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ، لیکن تذکرہ نگاروں کے مطابق عزیز خان نامی ایک آسودہ زمیندار رحمان بابا کا چچا زاد بھائی تھا جس کا سلوک رحمان بابا سے اچھا نہ تھا اس لیے انہوں نے اپنے پیدائشی گاؤں سے ہجرت کر کے پشاور کے قریب ایک دوسرے گاؤں ہزار خوانی میں رہائش اختیار کی۔ عزیز خان کا ذکر رحمان بابا کے ایک شعر میں ملتا ہے۔

رحمان بابا کے دیوان کی تدوین کے بارے میں بھی دو آراء ہیں۔ ایک طبقہ کے خیال کے مطابق موجودہ دیوان ان کی وفات کے بعد مرتب ہوا جبکہ بعض حضرات کے خیال میں دیوان ان کے دوران حیات ہی میں مرتب ہوا تھا۔ وہ اس کے ثبوت میں رحمان بابا کا وہ شعر پیش کرتے ہیں جس میں انہوں نے کہا ہے ”کہ سٹربن (رحمان بابا کا علاقہ) کے سارے علاقے میں رحمان کے سوا کوئی بھی صاحب دیوان نہیں ہو سکا“۔ عام خیال یہی ہے کہ رحمان بابا کا دیوان ان کی زندگی میں بھی مرتب ہوا تھا ، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ موجودہ دیوان سے زیادہ یا کم غزلیات وغیرہ پر مشتمل تھا۔ ایک خیال ہے

کہ رحمان بابا کے اشعار و غزلیات کی تعداد زیادہ تھی لیکن وہ کم ہو چکی ہے۔ پادری ہیوز وغیرہ نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ رحمان بابا ایام جوانی میں خوشحال خان خٹک سے ان کے گاؤں ” اکوڑہ خٹک ،، میں ملے تھے اور انہوں نے ایک دوسرے کو اپنے شعر بھی سنائے تھے۔ رحمان بابا کے دیوان میں ایک دو شعر ایسے ملتے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رحمان بابا اپنے آپ کو خوشحال خان سے بہتر شاعر خیال کرتے تھے۔ یہ شاعرانہ تعلی ہو سکتی ہے لیکن بعض ناقدین کا خیال ہے کہ ممکن ہے یہ شعر رحمان بابا کے اپنے نہ ہوں ، کیونکہ وہ ان کے عام مزاج کے مطابق دکھائی نہیں دیتے ۔

رحمان بابا اپنے شعر و فکر کے اعتبار سے منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کا اپنا ایک سبک بھی ہے جو سادگی اور شیرینی میں اپنی مثال آپ ہے ۔ ان کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے استعارات و تشبیہات سادہ و سہل ہیں ۔ بعد میں متعدد دوسرے شعراء نے بھی ان کے سبک کی پیروی کی ہے ۔ ان کے مکتب و سبک کے پیروکاروں میں حافظ الپوری قاسم ، علی خان آفریدی، یونس، شیر محمد ہوتک ، عبدالرحیم ہوتک ، احمد شاہ بابا ، اخوند گدا ، غفور اور صدیق خاص شہرت رکھتے ہیں ۔ رحمان بابا کو اپنے سبک اور مکتب کی جدت و ندرت پر خود بھی فخر تھا وہ کہتے ہیں :

”رحمان دوسرے شاعروں کی طرح کسی کی پیروی نہیں کرتا ۔ اس نے لئے لئے اجتہاد اور جدتیں کی ہیں ،،

رحمان بابا ایک طرف تو بحیثیت شاعر و ادیب اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور دوسری طرف عوام میں ایک ولی اللہ کی حیثیت سے مقبول و مشہور ہیں ۔ یہاں تک کہ ان کا کلام بطور تبرک اورثواب پڑھا اور سنا جاتا ہے اور عام دیہاتی ان کے دیوان کو مذہبی کتب کے ساتھ رکھتے ہیں۔ بقول مولانا عبدالمجید افغانی سعدی (مرحوم) سوات کے عبدالغفور بابا جی رحمۃاللہ علیہ فرماتے تھے کہ ” اگر نماز قرآن مجید کے سوا کسی اور کلام سے بھی جائز ہوتی تو وہ اشعار رحمان سے نماز ادا کرتے “

تعلیمات

رحمان بابا نے وہ سب کچھ کہا ہے جو ایک بلند پایہ اور عالی مقام معلّم ِ اخلاق کو کہنا چاہیے ۔ عشق و محبت کی طرح فلسفہء اخلاق بھی ان کے کلام میں نمایاں ہے ۔ انداز ِ بیان سادہ ، واضح اور دلنشین ہے ۔ وہ دنیا کو کارگاہ ِ مکافات ِ عمل سمجھتے ہیں ۔ ” چاہ کن را چاہ درپیش ،، ” جو بوؤ گے وہی کاٹو گے ،، اور ” جو کرو گے وہی بھرو گے ،، ان کی اخلاقی تعلیمات کا خاص فلسفہ ہے ۔ وہ دنیا سے ایک حد تک کنارا کش رہنے کے باوجود اسے امن و سکون اور خوشی و مسرت کا گہوارہ بنانا چاہتے ہیں ۔ ہر قسم کے ظلم و تعدی کے خلاف ہیں اور دیانت و اجتماعی بھلائی

کی تعلیم دیتے ہیں - ان کے نزدیک انفرادی و اجتماعی خوشحالی اور مسرت کا راز اس میں ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد ہوں - ان میں باہمی تعاون ہو اور ہر شخص دوسرے کے لیے ہمت و راحت کا باعث ہو - ان کے چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو :

کوئی بے سبب کسی پر تلوار نہیں اٹھاتا ، لوگوں کو تو
ان کے اپنے شامت اعمال نے ہلاک کر دیا ہے !

* * *

اگر تو رحم و کرم کا امید وار ہے تو
تجھے بھی دوسروں پر کرم کرنا چاہئیے -

* * *

جو کچھ تو دوسروں کے ساتھ کرے گا تو بھی وہی پائے گا

* * *

کسی بیج کا پھل رائیگاں نہیں جاتا -
اجر عمل کے اندازے ہی سے ملتا ہے ، اجر اور عمل
دونوں لازم و ملزوم ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں -

* * *

ناتوان کی ناتوانی سے خائف رہ خواہ تو ہزار گنا توانا ہے،
مجھے اپنے عمل کا ٹھیک ٹھیک صلہ ملا ، یہ ایک دستور ہے
کہ جو کاشت کرو گے وہی حاصل کرو گے -

* * *

آدمی کا دوست یا دشمن اس کا اپنا عمل ہے ،
نیکی اور بدی کے ذرے ذرے کا بدلہ ملتا ہے -

رحمان بابا کا تصوف گوسفندانہ نہیں - ان کی تعلیمات میں انفعالیت کی جگہ فعالیت پائی جاتی ہے اور ان کا ہر فکر اور ہر ارشاد اسلام اور افغانیت کے حسین امتزاج پر مبنی ہے - وہ جمال اور جلال دونوں کو زندگی کی بنیاد سمجھتے ہیں - جہد و عمل کی

پر زور تاکید کرتے ہیں اور ہنر مندی و صلاحیت کو بھی لازم گردانتے ہیں ۔ وہ ننگ و ناموس کی حفاظت پر بھی بہت زور دیتے ہیں مثلاً :

پہلے زرہ پہن اور جنگ کے لیے کمر بستہ ہو جا ،
اس کے بعد ننگ و ناموس کے معرکوں میں شریک ہو !
بے ننگ لوگوں کو ننگ و ناموس کی باتیں نہ سنا ،
یا اپنے آپ کو اپنے ہی خون سے رنگا ہوا سمجھ !

جد و جہد اور عمل کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں :

پہلے دریائے باڑہ (پشاور میں رحمان بابا کے علاقے کا ایک دریا) پر بند باندھ
پھر کشت و زراعت کر !

پہلے تقویٰ اختیار کر پھر جنت کی طمع رکھ

★ ★

غفلت کسی رنگ میں مناسب نہیں ہے ،
دنیا کی ساری ساکن اشیاء خراب ہوتی ہیں ۔

★ ★ ★

مجھے روشنی طلب ہی میں حاصل ہوئی
آفتاب کی طرح دن رات محو خرام ہوں

★ ★

جنت کسی کو ریاضت سے نہیں ملتی لیکن
ہر شخص کو اپنا فرض انجام دینا چاہیے

★ ★ ★

جب تک تجھے حق حاصل نہ ہو ، دم نہ لے
حق کی خاطر سارا جہاں الٹ پلٹ کر!

★ ★ ★

تھوڑی سی راحت بہت زحمت کے ساتھ ملتی ہے،
اس دنیا کا ایک تنکا بھی حرام ہے اگر مفت ہو ۔ (ترجمہ)

رحمان بابا جہاں عمل کو شرطِ زندگی سمجھتے ہیں ، وہاں علم سے خالی عمل کو بھی

بے سود اور رائیگاں تصور کرتے ہیں مثلاً :

جاہل کا زہد میں سمار نہیں ہوتا، یہ تو ایسا ہی ہے،
جیسے پانی سے خالی بادل محض غبار ہوتے ہیں -

★ ★ ★

جو شخص علم سے محبت نہیں رکھتا وہ آدمی نہیں
بلکہ ایک بے جان نقش و تصویر ہے !
(ترجمہ)

وہ بے عمل عالموں کو بھی بیکار محض کہتے ہیں - رحمان بابا ریاکاری ، منافقت اور ظاہر و باطن کے تضاد کے سدید مخالف ہیں اور ساتھ ہی لوگوں کو ریاکاری اور منافق افراد سے خبردار رہنے کی تلقین بھی کرتے ہیں - مثلاً:

آدمی کے ظاہر لباس سے دھوکہ نہ کھا
اخروٹ کی طرح اس کا باطن دیکھ کہ گری دار ہے یا کاٹھا -
میں ریا کے زہد سے امان چاہتا ہوں
ریاکاری کا زہد تو عذاب بھی ہے اور عتاب بھی !
(ترجمہ)

وہ عام لوگوں کی فلاح و بہبود اور حاجت روائی کی تلقین کرتے ہیں اور در اصل باہمی تعاون اور ہمدردی کی بنیاد پر ایک ایسا معاشرہ تخلیق کرنا چاہتے ہیں جس میں لوٹ کھسوٹ نہ ہو اور نہ یہ ہوکہ کچھ لوگوں کے پاس تو حد سے سوا مال و دولت ہو اور دوسرے نان شبینہ کے بھی محتاج ہوں - ان کے نزدیک دنیا میں امن و سکون اور خوشحالی اور مسرت کے لیے یہ ضروری ہے کہ لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ ہو اور لوگ آپس میں خیر خواہ ہیں ، ایک دوسرے کی دستگیری کریں اور ایک دوسرے کےکام آئیں - مثلاً :

وہ دل طوفان کی بلا خیزیوں سے محفوظ ہوگا
جو کشتی کی طرح لوگوں کا بار اٹھائے

★ ★ ★

اپنی طرح دوسروں کو بھی عزیز رکھ ،
تیری ہی طرح ہر ایک کی جان ہے
اگر تجھے اپنی درماندگی کا خوف اور احساس ہو جائے
تو فوراً اٹھ اور کسی درماندہ کی مدد کر ۔
(ترجمہ)

عشق و محبت

عشق و محبت رحمان بابا کی شاعری کا خاص موضوع ہے ۔ انہوں نے مجاز اور حقیقت کو ایسا مربوط اور یکجا کیا ہے کہ ان کی شاعری میں عاشقانِ مجازی بھی اپنے درد کی دوا پاتے ہیں اور عاشقانِ حقیقت بھی اپنے قلب کی تسکین حاصل کرتے ہیں ۔ رحمان بابا حسن کو ناقابلِ تقسیم وحدت سمجھتے ہیں ۔ وہ عشق کو اصلِ زندگی اور مقصدِ حیات ہی نہیں سمجھتے بلکہ موجودات و مخلوقات کی تخلیق کا سبب بھی خیال کرتے ہیں ۔ کہتے ہیں :

اس جہاں کو خدا نے عشق سے تخلیق کیا ہے
عشق ہی جملہ مخلوقات کا والد و خالق ہے! (ترجمہ)

رحمان بابا کا عشق فعّال اور حیات آفرین ہے ، وہ عقل کو کوتاہ اور عشق کو عرش و کرسی تک رسا سمجھتے ہیں ۔ ان کے تصور کا عاشق صاحبِ کردار ، باہمت اور اولوالعزم ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ عشق گھر میں بیٹھ کر نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے تلاش و جستجو اور جد و جہد شرط ہے اور طالب کو اپنے مطلوب تک پہنچنے کے لیے سر اور زر دونوں کی بازی لگانا پڑتی ہے ۔ راہِ عشق میں سر اور زر کو قربان کرنے سے احتراز کرنے والا نادان اور احمق ہے ۔ عاشق تو وہ بلا ہے کہ جب وہ میدان میں آتا ہے تو ہر آفت اور ہر آسیب اور ہر مصیبت راہ فرار اختیار کرتی ہے ۔ رحمان بابا کے نزدیک سر بلندی ، عشق اور صرف عشق سے حاصل ہوتی ہے ۔ عشق کے سوا باقی سارے کام ادنےٰ ہیں اور وہ اعلی مرتبہ کی خواہش رکھنے والوں کو عاشق ہونے کا مشورہ دیتے ہیں ، مثلاً :

رحمان کو بصارت و بصیرت عاشقی میں حاصل ہوئی

عاشق کو اندھا کہنے والا ذلیل و خوار ہو !

* * *

اگر تو گھپ اندھیرے میں روشنی کا طلب گار ہے
تو محبوب کی زلفوں اور رخسار کا نظارہ ہی رہ !

★ ★ ★

میں تیرے حسن کا اندازہ نہیں کر سکتا کیونکہ
تیرا حسن و جمال غیر محدود و بیکران ہے ! (ترجمہ)

عبدالحمید مہمند

پشتو ادب کے اس زرین دور میں خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کے بعد دوسرے بہت سے شاعروں میں سے عبدالحمید مہمند کو نمایاں مقام حاصل ہے ۔ اسے اپنے پیدائشی گاؤں اور اپنے قبیلے کی ایک ذیلی ساخ کے تعلق سے عبدالحمید ماشو خیل بھی کہتے ہیں اور اسے حمید بابا کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں ۔ حمید بابا پشاور شہر سے آٹھ (۸) میل جنوب مغرب میں ماشو گگر (ماشونکرہ) علاقہ سٹربن میں رحمان بابا کے دوران حیات ہی میں ان کے اپنے قبیلہ مہمند میں پیدا ہوا ۔ رحمان بابا کی طرح عبدالحمید مہمند کے حالات زندگی بھی تاریکی میں ہیں ۔ تھوڑی بہت معلومات یا تو اس کے کلام سے حاصل ہوئی ہیں یا بڑے بوڑھوں کی زبانی سنی گئی ہیں ۔

حمید بارھویں صدی ہجری یعنی اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف اول کا شاعر ہے ۔ یہ عہد شاہ بادشاہ کا زمانہ اور مغلوں کے زوال کا دور تھا جس میں ابتری اور طوائف الملوکی کے عنصر بھی موجود تھے اور یہاں جگہ جگہ ظلم اور چیرہ دستیاں بھی ہوتی تھیں۔ مقامی سردار اور خوانین من مانی کرتے تھے۔ حمید اس روز بروز بگڑتی ہوئی صورت حال کا عینی شاہد ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے دور کی تنقید و مذمت کی ہے۔ وہ مغلوں کا ذکر اچھے الفاظ میں نہیں کرتا، مثلاً:

"اگر میں اصل اور واقعی پٹھان ہوں تو رقیب کا ظلم برداشت نہیں کروں گا"

"سارے جہان میں امن و قرار ہے لیکن حمید پر مغل کا غم چڑھ دوڑا ہے"

اس نے اپنے علاقے کے ظالم خوانین کا بھی ذکر کیا ہے ۔ جمال خان اور اس کا بیٹا جلال خان مہمندوں کے ایک علاقے کے طاقتور خان تھے جو بے حد ظالم تھے ۔ انہوں نے اپنے عوام پر ناقابل برداشت ظلم کیے ۔ آخر میں لوگوں نے متحد ہو کر ان پر زور دار حملہ کیا ۔ ان کے گھروں کو نذر آتش کیا اور یہ خوانین مع اپنے تمام اہل و عیال اس آگ میں جل گئے ۔ اس واقعے کا ذکر رحمان بابا نے بھی نہایت دل سوزی کے ساتھ کیا ہے ۔ عبدالحمید مہمند اس واقعے کے بارے میں کہتا ہے :

اپنی قوم کا ہر بدخواہ اور ظالم سردار اپنا حال
جمال (جمال خان) کے آئینہ میں دیکھے۔
جمال اور جلال کی قبروں سے یہ صدا بلند ہو رہی ہے
کہ اپنے ہی کام آتے ہیں۔

بیگانوں سے اپنے حق شجاعت و حمایت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔
یوں تو جمال و جلال اور ان کے اہل عمال کو جلا کر مارنے میں
خدر ریزی (مہمند قبیلے کی ایک شاخ) بدنام ہیں لیکن
حقیقت یہ ہے کہ ظالم کو اپنے ظلم نے جلایا ہے! (ترجمہ)

عبدالحمید مہمند کے کلام سے یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ وہ ایک عالم شخص تھا۔ عربی اور فارسی سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے 'قصہ شاہ و گدا، (فارسی مثنوی) کا پشتو مثنوی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ 'نیرنگ عشق، (فارسی مثنوی)[1] کو بھی پشتو مثنوی کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔

عبدالحمید مہمند صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ اس کے دیوان کا نام 'درُ و مرجان' ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دیوان شعر و سخن، لطیف استعارات و تشبیہات اور عاشقانہ رموز و کنایات کے درہائے بے بہا سے پر ہے۔

عبدالحمید مہمند کو پشتو کے چوٹی کے شعرا اور اساتذہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی شاعری، تخیل، صنائع بدائع، استعارات، تشبیہات اور ادب و شعر کے دیگر لوازم کے اعتبار سے بلند پایہ ہے اور کلام میں جو رفعتِ تخیل اور نازک خیالی پائی جاتی ہے اس کے پیش نظر اسے پشتو کا بیدل اور عبدالحمید موشگاف بجا طور پر کہا گیا ہے۔ اس کی طبع آزمائی کا میدان غزل ہے۔ عبدالحمید کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے پشتو محاوروں کو اپنے اشعار میں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ بکثرت استعمال کیا ہے۔ وہ پشتو شاعری میں ایک نئے سبک اور مکتب کا موسس ہے جس کی پیروی بعد کے شاعروں نے بھی کی ہے۔ فنِ شعر کے ماہرین کا خیال ہے کہ حمید نے ہندوستان میں اس وقت کی مروجہ فارسی شاعری کا سبک اپنایا لیکن اس میں زیادہ جان اور زور پیدا کر کے اسے پشتو زبان اور پشتونوں کے مزاج کے ہم آہنگ کر

---

(۱) یہ فارسی مثنوی غنیمت کنجاہی کی تالیف ہے۔ اس پشتو مثنوی کا نام بھی نیرنگ عشق ہی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۶۷ء ۱۲۸۴ھ میں مطبع مصطفائی پشاور میں چھپی تھی لیکن اب نایاب ہے۔

دیا ۔ حمید مہمند کو بھی خوشحال خان اور رحمان بابا کی طرح اپنی سخنوری پر فخر و ناز ہے اور وہ اپنی شاعری کے مقابلے میں فارسی شاعری کو چیلنج کرتا ہے ۔ یہاں حمید بابا کے ایسے دو اشعار کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو حسن و عشق سے متعلق ہیں :

نرگس کی نظر جب ساقی کارخ کے چہرے پر پڑ گئی
تو اس کے ہاتھ سے جام گر کر اولدھا ہو گیا ۔

★ ★ ★

سفید ریشی نے میرے عشق کو کھوٹا روپیہ بنا دیا
جیسے حسین لوگ سودا بازی میں بالکل قبول نہیں کرتے (ترجمہ)

اب ان کے ایسے اشعار کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جن میں خود داری ، استغنا ، قناعت اور خود اعتمادی کا ذکر ہے ۔ ملاحظہ ہوں :

اے خدا تو مجھے دولت عشق کا وہ کبرو ناز بخش
کہ میرا سر حسینوں کے سوا کسی کے آگے نہ جھکے!
میرے دل سے اضطراب ہوس دور فرما اور
میرے جہاز کو قناعت کے قوی لنگر سے بہرہ ور کر ۔
اگر تو چاہے کہ میرا سر زید و عمر کے لیے نہ اٹھے
تو مجھے نرگس کی طرح محرم راز زانو عطا کر ۔

★ ★ ★

اطلس پوش میرے کمبل پر استہزا نہ کرے ، اس کمبل نے تو
میرے بستر کو آئینے کی طرح صاف ستھرا بنا دیا ہے ۔ (ترجمہ)

قلندر آفریدی

قلندر آفریدی کو پشتو ادب میں ہجر و وصال کے پر سوز اشعار کہنے کی وجہ سے نمایاں مقام حاصل ہے ۔ اس کی طبیعت قلندرانہ و عاشقانہ تھی ۔ وہ عشق و محبت کے لیے زندہ رہا اور اسی کی خاطر موت سے ہم آغوش ہو کر حیات جاوداں پا گیا ۔ قلندر پٹھانوں کے مشہور قبیلہ آفریدی سے تعلق رکھتا ہے ۔ وہ باڑے اور جمروذ کے کنارے کہیں آباد تھا ۔ ان دونوں مقامات کا ذکر وہ خود کرتا ہے :

تیرے حسن کے چمن میں میری آنکھوں
سے باڑہ اور جمرود کی دو نہریں جاری ہیں (ترجمہ)

قلندر بارھویں صدی ہجری یعنی اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر کا شاعر ہے ۔ حمید بابا کا ہم عصر تو نہیں لیکن اس کے سبک اور اندازِ بیان کا پیروکار ضرور ہے اور اس نے اپنے اشعار میں حتی الوسعیٰ حمید بابا ہی کی طرح استعارے ، تشبیہات ، تلمیحات اور صنائع و بدائع استعمال کیے ہیں ۔ وہ اس سے متاثر ہونے کا اقرار و اظہار کرتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حمید بابا کا شاگرد بھی تھا ۔

قلندر کی شاعری سر تا پا عشقیہ ہے اور اس کے عشق میں ڈوبے ہوئے اشعار روایتی یا تقلیدی نہیں ۔ وہ ایک جوان رعنا 'میرا جان' کا شیدائی تھا ۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ اس کا مرشد تھا ۔ بہر حال ہم ''قلندر'' اور ''میرا'' کو پنجابی ادب کے مادھو لعل اور شاہ حسین سے نسبت دے سکتے ہیں ۔ شاہ حسین اپنے معشوق اور مرید کی وجہ سے مادھو لال حسین ہو گیا تھا اور قلندر بھی اشعار میں اپنے نام کے ساتھ ''میرا'' کا نام استعمال کرتا ہے ۔ قلندر اور ''میرا'' کی داستانِ عشق سے متعدد باتیں اور کرامتیں وابستہ کی گئی ہیں جن کا یہاں اعادہ بے سود ہے ۔ خلاصہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے عشق میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اب یہ دونوں عاشقان صادق پہلو بہ پہلو سوات کے ایک ٹیلے پر مدفون ہیں ۔

قلندر کی شاعری کا بیشتر حصہ ''میرا جان'' کی یاد اور محبت میں ہے اور اس لیے اس کے کلام پر اسی نام کا تسلط و غلبہ ہے ۔ اس کی غزلوں میں سوز و گداز اور شوخی کے ساتھ ساتھ صنائع و بدائع کا استعمال بھی ہے اور تنوع بھی ہے ۔

وہ رات کے وقت اپنے محبوب کی یاد میں چاند کو مخاطب کر کے کہتا ہے :

اے سفید چاند تو دیار یار میں میرے احوال پہنچا،
''میرا جان'' کو میرے بہت سے سلام کہنا اور اسے یہ بتانا
کہ تیرا عاشق تیری جدائی میں خونِ جگر پی کر جی رہا ہے (ترجمہ)

اسی طرح وہ باد کی زبانی بھی اپنا حالِ زار ''میرا جان'' تک پہنچاتا ہے ۔ اس کے مزید اشعار کا ترجمہ نمونے کے طور پر ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

عاشق ایک ہی وقت میں ہنستا بھی ہے اور روتا بھی
دیکھو تو وہ شمع کی طرح کیسا سوز و گداز رکھتا ہے

★ ★ ★

کہتے ہیں دیدارِ محبوب حجِ اکبر ہوتا ہے

★ ★ ★

جب نسیم نے اس کے کاکل کا لفافہ میرے حوالے کیا تو میں ویرانہ میں
مانند کنج اباد ہوگیا۔ عاشقی نے مجھے خرابہ میں آباد کر دیا

★ ★ ★

کسی نے صبح و شام کو یکجا نہیں دیکھا ہے،
مجھے تیری زلفوں کے شبستاں میں آفتاب نظر آیا۔

★ ★ ★

آنسو جب پلکوں پر آجاتے ہیں تو تھمتے نہیں
بھلا کوئی گھاس کے بند باندھ کر بھی دریاؤں کو روک سکتا ہے؟ (ترجمہ)

قلندر کے دیوان میں غزلیات سے علاوہ رباعیات بھی ملتی ہیں جو اس کی غزلوں کی طرح سوز عشق سے پُر ہیں[۱]۔

میرا (۲)

چیسا کہ ہم قلندر آفریدی کے حال میں بتا چکے ہیں میرا ''میرا جان'' اس کا محبوب یا مرشد تھا۔ اگرچہ دونوں کا نام اور کلام الگ الگ ہے، لیکن یہ دونوں مادھو لال حسین سے ضرور مشابہت و مماثلت رکھتے ہیں۔ میرا کے کچھ اپنے اشعار بھی دنیا کو معلوم ہیں اور پشتو کی ادبی تاریخوں اور تذکروں میں اس کے نمونے درج ہیں۔ روایت ہے کہ جب ''میرا'' کو قلندر کی حسرتناک موت کا علم ہو گیا تو اس نے سوات آ کر اپنے عاشقِ صادق ''قلندر آفریدی'' کے مزار کا پتہ پوچھا اسے بتایا گیا کہ وہ ٹیلے پر اس جگہ مدفون ہے جہاں وہ اس کے نقش پا سے دل بہلاتا تھا، تو ''میرا'' وہاں گیا اور اپنے دل شکستہ عاشق کے مزار پر کھڑے ہو کر یہ اشعار پڑھے:

میرا دلبر سوات کی چوٹی پر دفن پڑا ہے
لوگوں کے خیال میں یہ حسن میں آفتاب و ماہتاب کی مانند ہے

---

(۱) قلندر کے نام سے دو پشتون شاعر گذرے ہیں۔ ایک قلندر یوسف زئی اور دوسرا قلندر خان آفریدی۔

(۲)۔ یہ دراصل میر فیض اللہ ہیں جو قلندر یوسف زئی کے پیر طریقت تھے۔ قلندر انہی کی یاد میں درد بھرے شعر کہتے تھے۔ قلندر کی وفات کے بعد میر فیض اللہ اس کی فاتحہ خوانی کے لیے سوات گئے اور وہیں وفات پا گئے۔ اسی لیے دونوں کی قبریں ساتھ ساتھ ہیں۔ ان دونوں کی محبت اور وفاداری ضرب المثل بن چکی ہے (اختلافی نوٹ: (عبدالحلیم اثر)

دوستو آ جاؤ اس کا دیدار کرو
اے دلبر ! میرے خاص دلبر
تم نے اپنا خیمہ تو اونچے مقام پر بنایا تھا
جب تیری اجل کے سپاہی آ گئے .
تو انہوں نے اس خیمے کو یکدم اکھاڑ پھینکا (ترجمہ)

مصری خان گگیانی

مصری خان گگیانی اگرچہ عبدالحمید مہمند کا ہم عصر اور پشتو کا ایک بلند پایہ صاحب دیوان شاعر ہے لیکن وہ اور اس کا دیوان بالکل نو دریافت شدہ ہیں ۔ قیام پاکستان کے بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے جو مسلمان یہاں جگہ جگہ آباد ہوئے ان میں ہندوستانی یا روہیلکھنڈی پٹھان بھی خاصی تعداد میں آئے۔ ان میں سے بعض اپنے ساتھ پشتو اور فارسی کی کچھ قلمی کتابیں بھی لائے۔ مصری خان گگیانی کا دیوان بھی کراچی میں آباد ایک ایسے ہی صاحب سے پشتو اکاڈیمی کے سابق ڈائریکٹر مولانا عبدالقادر خان کو ملا ، جسے انہوں نے اکاڈیمی میں اپنے رفقائے کار کی مدد سے ترتیب دے کر شائع کیا ۔

مصری خان گگیانی کے اسی دیوان میں اس کی فارسی منظومات کا بھی خاصہ حصہ ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس کی فارسی شاعری پشتو شاعری سے کم پایہ کی نہیں ۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مصری خان کی فارسی شاعری پشتو کے کئی دوسرے شاعروں کی فارسی شاعری سے بہتر ہے اور وہ ہندوستان ، ایران اور افغانستان کے بلند پایہ فارسی شعرا کی صف میں کھڑا ہونے کا مستحق ہے ۔

مصری خان کے حالات زندگی صرف اس کے اشعار سے معلوم ہو سکتے ہیں ، جو مختصراً یہ ہیں ، کہ وہ ضلع پشاور کی تحصیل چارسدہ علاقہ دوآبہ کے موضع کانگڑہ کا باشندہ اور قبیلہ گگیانی سے متعلق تھا ۔ اپنے علاقے یا گاؤں کے کسی ارباب صاحب (بڑے پٹھان زمیندار اور تعلقہ دار) کا منشی تھا ۔ ویسے وہ عبدالحمید مہمند کا ہم عصر ہے لیکن اس نے خوشحال خان اور رحمان بابا کا زمانہ بھی دیکھا ہے ۔ خوشحال خان خٹک ۱۶۸۹ع/۱۱۰۰ھ میں وفات پا گیا تھا اور رحمان بابا کا انتقال ۱۷۰۶ع/۱۱۱۸ھ میں ہوا ۔ مصری خان کا جو کلام ۱۷۰۱ع/۱۱۱۳ھ سے تعلق رکھتا ہے وہ خاصہ بلند پایہ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوشحال خان خٹک کی زندگی کے آخری ایام اور رحمان بابا کے ایام جوانی میں ان سے عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود خوب شعر کہتا تھا ۔ اس نے خوشحال خان ، رحمان بابا اور عبدالحمید مہمند

تینوں کا ذکر کیا ہے ۔ عبدالقادر خاں خٹک ، سکندر خاں خٹک ، صدر خاں خٹک ، قلندر اور میرا وغیرہ بھی مصری خاں کے ہم عصر ہیں لیکن ان میں سے میرا کے سوا اس نے کسی اور کا ذکر اپنے اشعار میں نہیں کیا ہے ۔

اس کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے حالات سے رحمان بابا اور عبدالحمید سہمند کے مقابلے میں زیادہ آگاہ تھا ، کیونکہ رحمان بابا اور عبد الحمید ایک قسم کے گوشہ نشین اور لاتعلق بزرگ تھے ، جبکہ مصری خاں بہت سے واقعات کا عینی شاہد ہے ۔ بلکہ خود ان حالات کا شکار بھی رہا ہے ۔ یہ وہی دور ہے جس کا رونا رحمان و حمید دونوں نے رویا ہے ۔ لیکن مصری خاں کے کلام میں یہ حالات تفصیل کے ساتھ پائے جاتے ہیں ۔ اگر کوئی مؤرخ چاہے تو مصری خاں کے پشتو اور فارسی کلام سے اس زمانے کی تاریخ مرتب کرنے میں کافی مدد لے سکتا ہے ۔ مصری خاں کے کلام کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں استحکام کم ہو رہا تھا ۔ مصری خاں نے اورنگ زیب عالمگیر کا آخری دور اور بہادر شاہ اور فرخ سیر کا زمانہ بھی دیکھا تھا ۔ وہ بہادر شاہ اور فرخ سیر کا ذکر اپنے کلام میں کرتا ہے ۔

اس کا دیوان پشتو اور فارسی شاعری پر مشتمل ہے ، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک عالم فاضل شخص تھا ۔ پشتو تو اس کی مادری زبان تھی لیکن فارسی کی شاعری بھی اس کی اتنی بلند پایہ ہے کہ ہم اسے فارسی کا ایک اچھا استاد تسلیم کر سکتے ہیں ۔ پشتو اور فارسی کی شاعری کے لیے عربی کا جاننا بھی ضروری تھا ، خصوصاً مصری خاں کے زمانے میں، جب عربی اور فارسی دونوں کی تدریس و تعلیم کا رواج عام تھا اور ہر دو زبانوں کی کتب کے مطالعے کے بغیر کوئی شخص اعلیٰ پایہ کا شاعر یا ادیب نہیں بن سکتا تھا ۔ اس دور کے سارے بلند پایہ پشتو شاعروں کی طرح مصری خاں نے بھی علوم متداولہ سے بہرہ وافر پایا تھا ۔ اس کے کلام کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ تاریخ، تصوف ، اسلامیات اور ادبیات وغیرہ سے بخوبی واقف تھا ۔ اس کا دیوان (پشتو) حمد باری تعالیٰ سے شروع ہوتا ہے ۔ ذیل میں اس کے چند اشعار کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو گا کہ مصری خاں کا نظریۂ الوہیت کتنا بلند اور اس کا انداز بیان کتنا اچھوتا ہے :

اے اول! اول تجھ سے ہی پیدا ہے ۔ اے آخر! آخر بھی تجھی سے پیدا ہے ۔
تو اول بھی ہے اور آخر بھی ، لیکن تو ایسا آخر نہیں ہے ،
جس کا آخر ہونا منتہا ہو ۔ تو اول بغیر اول کے اور آخر بغیر آخر کے ہے ۔

اے خدا تو بے اول و بے آخر (ازلی و ابدی) ہے ۔
اے خدا تو خود خدا ہے اور اے خدا تیرے بغیر
ہست و نیست دونوں کہاں ظاہر ہو سکتے تھے ۔ بس تو ہی تھا ۔
ہست و نیست دونوں کچھ نہ تھے اور نہ کسی مسما کا اسم و اثر تھا ۔
تیری ہستی ہی تھی جو بے اول و بے آخر ہے ۔
تیری ہستی بے ابتدا اور بے انتہا ہے ۔
اے قدیم ! تو ہمیشہ رہے گا ، تو بے زوال ہے ۔
تیری ہستی لم یزل و لا یزال ہے ۔
تیری ذات اور ہستی واجب ہے ، ممکن نہیں ۔
تیری ذات عدم اور فنا سے مبّرا ہے، تیری حیات تیری اپنی
ذات کے ساتھ قائم ہے اور اسی ذات سے بقا قائم ہے ۔
تیری یہ حیات نہ سانس کی محتاج ہے اور نہ ارواح کی ۔
اے مولا ! روح تو تیری قدرت کا امر ہے ۔
تو اپنی قدرت میں ظاہر بھی ہے اور باطن بھی،
جب یہ دوسرے ظاہر و باطن مخفی و معدوم تھے ،
ابھی کوئی ممکن معرض وجود میں نہیں آیا تھا اور نہ کسی کے روح و جسد تھے ،
ابھی کون تھے نہ مکان اور نہ زمان، کوئی جہت تھی نہ تاریکی اور نہ نور،
مگر تو اس وقت بھی موجود تھا ! (ترجمہ)

مصری خاں کی شاعری موضوع کے اعتبار سے اپنے دیگر ہم عصر شعرا سے الگ نہیں۔ اُس نے اپنے دور کے حالات کی تصویر کشی خوب کی ہے ۔ اس طرح وہ اپنے دور کا عکاس بھی ہے اور مؤرخ بھی ۔ غزلیات میں کہیں وہ رحمان بابا کا پیروکار نظر آتا ہے اور کہیں حمید بابا کا ۔ وہ خوشحال خاں کے کلام سے بھی متاثر معلوم ہوتا ہے ۔ وہ صبر و قناعت اور خود داری و بے نفسی کی تلقین بھی کرتا ہے اور دوسرں کے ساتھ بھلائی کرنے کو بھی شرطِ انسانیت سمجھتا ہے ۔ اس نے نیک عمل اور اچھے کردار پر خاصا زور دیا ہے ۔ اسے دنیا کی آسائشوں کے مقابلہ میں مطالعۂ کتب ، گوشۂ خلوت اور چند ہمراز دوستوں کا ہونا زیادہ پسند ہے ۔ وہ عشق و محبت کے رموز سے بھی بخوبی واقف ہے اور اس کے کلام میں عشقِ حقیقی اور مجازی دونوں ہمدوش نظر آتے ہیں ۔ مثلاً :

اگر تجھے سچے عشق کی خبر ہو جائے،
تو یہ فانی اور بے ہنگم دنیا ترک کر دے گا!

* * *

اے مصری خاں! عشق جیسا دوسرا ادیب کوئی بھی نہیں ہے!
یہ تو کانٹوں کو پھولوں میں اور پتھروں کو پانی میں تبدیل کر دیتا ہے۔

* * *

ہر طرف تیرا جمال ہی جمال ہے اور کچھ نہیں ہے،
اور یا پھر میرے ساتھ تیرا خیال ہی خیال ہے اور کچھ نہیں ہے!

* * *

عاشق کی نشانی بس یہی ہے کہ وہ ہمیشہ
ایک گمشدہ چیز کی طلب و تلاش جاری رکھتا ہے اور بس۔

مصری خاں کا تصور عشق رحمان بابا اور دوسرے بلند پایہ شاعروں سے کم نہیں ہے۔
ذیل کے اشعار (ترجمہ) سے اس کا اندازہ ہوگا:

موجودات میں عالم ہو کہ آدم،
بس محبت ہی ان تمام اشیا کی مظہر ہے!

* * *

مصری! تمام پیدائش عشق سے ہوئی،
عشق تمام عالم کا معنوی باپ ہے!

وہ عقل کو روباہ سمجھتا ہے اور عشق کو ایک شیرِ شجاع چنانچہ کہتا ہے:

شیر جس علاقے میں ہو وہاں سب کچھ اس کا ہوجاتا ہے اس کے قرب
جوار روباہ کب قدم رکھتا ہے۔

* * *

عشق و عقل میں بہت زیادہ فرق و تفاوت ہے،
خس آگ کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے؟

مصری خاں اچھے عمل اور کردار کا مبلغ ہے۔ اخلاقیات کے ضمن میں اس کے اشعار
نہایت پرمعنی اور بصیرت افروز ہیں چند شعروں کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

ذمیمہ اور حمیدہ اعمال انسان کے اپنے اندر ہی ہوتے ہیں،
نیک خوئی جنت ہے اور بد خوئی جہنم!

* * *

اے مصری خاں! تمام معاملات کا مدار نیک عمل پر ہے،
نہ کہ مسائل فقہ اور نکات بیان کرنے پر۔

* * *

مردان گفتار تو ہر جگہ ہزاروں ہیں،
لیکن مرد تو وہی ہے جو صاحب کردار ہو!
اے ہوشیار! ہر شخص کاروبار کے ذریعے پہچانا جاتا ہے،
آدم زاد کی پہچان کا معیار یہی ہے۔

مصری خاں پشتو کا قادرالکلام شاعر ہے اور اس نے مختلف اصنافِ سخن، مثلاً غزلیات، قصائد، قطعات، رباعیات کو اپنایا ہے، حتیٰ کہ اس کے دیوان میں منظوم خطوط تک موجود ہیں۔ وہ عمدہ تشبیہات و استعارات کے استعمال میں بھی فن کارانہ مہارت رکھتا ہے۔ اس کی بعض منظومات بہت طویل ہیں۔ قصائد کے ساتھ رزمیہ شاعری اور مرثیے بھی ہیں۔ وہ ہر لحاظ سے ایک بڑا شاعر ہے اور اسے پشتو کے چوٹی کے شعرا کی صف میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس کا فارسی کلام بھی بلند پایہ ہے اور موضوع و مضمون کے اعتبار سے بھی قابل ستائش ہے۔ اس کے دیوان میں تھوڑا سا جو اُردو کلام موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بیدار مغز اور وسیع المطالعہ شخص تھا۔

معزاللہ خاں مہمند

خوشحال خاں خٹک اور اس کے بعد کا دور پشتو ادب کے اعتبار سے زرخیز اور مردم خیز دور تھا، جس نے نہ صرف پشتو کے بہت سے شاعر پیدا کیے بلکہ اس دور کا ہر شاعر اپنا ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ بیشتر مشہور اور صاحبِ دیوان شعرا موجودہ ضلع پشاور اور اس کے ملحقہ علاقوں میں پیدا ہوئے۔

عبدالحمید مہمند اور عبدالقادر خاں خٹک کے مکتبۂ فکر کی پیروی کرنے والے شعرا میں معزاللہ خاں مہمند کو نہ صرف اس لیے ایک خاص مقام حاصل ہے کہ وہ پشتو کا ایک بلند پایہ شاعر ہے بلکہ اس لیے بھی کہ وہ اُردو کا بھی ایک قادرالکلام سخن گو ہے۔ جہاں اس کی فارسی شاعری کے بلند پایہ ہونے میں کوئی کلام نہیں، وہاں اُردو شاعری میں بھی وہ گنگا و جمنا کے درمیانی علاقوں کے اس وقت کے اساتذۂ اُردو کی اولین صف میں کھڑا ہونے کے قابل ہے۔

معزاللہ خاں مہمند جیسا کہ لفظ مہمند سے ظاہر ہے، رحمان بابا اور عبدالحمید مہمند

ہی کا ہم قبیلہ اور ہم علاقہ ہے۔ اس کا صحیح سن پیدائش تو معلوم نہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ ۱۷۵۳ء/۱۱۶۷ھ میں زندہ تھا۔ معزاللہ خان مہمند کا اسلوب عبدالرحمان بابا سے کافی متاثر ہے۔ چنانچہ اس کے کلام میں رحمان بابا کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔

رحمان بابا اور عبدالحمید مہمند کے برعکس معزاللہ خان مہمند ایک متموّل اور رئیس ارباب گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ لیکن اپنے کلام سے وہ طبیعت کا درویش اور بے نیاز آدمی نظر آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خانی و اربابی کا درد سر نہیں پالتا تھا۔

معزاللہ خان مہمند کے دوسرے بھائی اور عزیز مغل حکومت ہی کے خیرخواہ جاگیردار و منصب یافتہ تھے۔ اس کے خاندان کے اخلاف نے سکھوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ بھی دیا تھا۔ لیکن معزاللہ خان کسی حکومت کا طرف دار اور دوست نہیں معلوم ہوتا۔ وہ آزاد و بے نیاز زندگی گزارتا رہا۔ البتہ اُسے اپنے افغان ہونے پر کافی فخر تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی فارسی اور اُردو شاعری میں اپنا تخلص افغان رکھا ہے، جبکہ پشتو شاعری میں اپنے نام کو ہی بطور تخلص استعمال کرتا ہے۔

معزاللہ خان کی پشتو شاعری خاصی بلند پایہ ہے اور اس میں اپنے ہم عصر شاعروں کے کلام کی تمام خوبیاں اور لوازم موجود ہیں۔ اس کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ دیگر اصناف مثلاً مربع، مخمس، مسدس اور معشر بھی موجود ہیں اور اس کے اشعار، تخیل، روانی، رنگینی، سنجیدگی اور طرزِ بیان کے اعتبار سے اپنے ہم عصر شعرا کے ہم پلہ ہیں۔ ان میں شعری رعایات و تلازمات، صنائع بدائع، تشبیہات اور استعارات بھی اپنی پوری شان کے ساتھ موجود ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کا کلام سہل اور سادہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موضوع کے اعتبار سے اس کی شاعری تقلیدی اور روایتی ہے لیکن اس نے حسن و عشق کے لطیف وجدانی تاثرات بے ساختگی کے ساتھ صاف ستھرے انداز میں بیان کیے ہیں جو پڑھنے والے کے دل کو متاثر کرتے ہیں۔

اس کے کلام میں حسن و عشق کے علاوہ اخلاقیات والٰہیات وغیرہ کی جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں جوش، درد اور سوز موجود ہے اور اس میں ایسے پاکیزہ احساسات بھی پائے جاتے ہیں جو پشتون ماحول اور پشتون مزاج کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ اپنے دور کے ابتر اخلاقی حالات سے آزردہ خاطر تھا اور اس کی اصلاح چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ جہاں ایک طرف دنیا سے کنارہ کشی اور لاتعلقی کی باتیں کرتا ہے، وہاں نیک اعمال پر مبنی زندگی کو اپنانے پر بھی انتہائی زور دیتا ہے۔ اس میدان میں وہ پشتو کے دوسرے شاعروں کی مانند ہے۔ ان کی تعلیمات زندگی بخش اور حیات افزا ہیں اور ان میں انفعالیت یا رہبانیت

قطعاً نہیں ۔ معزاللہ خاں بھی دوسرے شاعروں کی طرح سب سے پہلے دلوں میں آتشِ عشق روشن کرتا ہے اور عشق ہی کو سب سے پسندیدہ ہنر سمجھتا ہے ۔ وہ محنت و مشقت کو راحت کا ذریعہ جانتا ہے ۔ طمع ، حرص اور دنیا پرستی کی مخالفت میں بھی وہ پیش پیش ہے اور کہتا ہے :

مانگنے سے آدمی کی آبرو جاتی رہتی ہے ،
کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا ،
اس دنیا پر پل باندھنے کے متراوف ہے !

★ ★

تنگ نظر نعمت سے کب سیر ہوگا ،
دریا میں حباب کا آبخورہ خالی ہی ہوتا ہے ۔

★ ★

جو شخص دل سے غنی و توانگر ہو جائے ،
اسے زوالِ دولت کا خوف و اندیشہ نہیں ہونا چاہیے ! (ترجمہ)

معزاللہ خان نے اس طرحی تاریخی مشاعرے کے سلسلے میں بھی طبع آزمائی کی ہے جس کا خوشحال خان خٹک کی ایک غزل کے مصرع طرح سے عبدالقادر خان خٹک نے آغاز کیا تھا ۔ اس ضمن میں عبدالقادر خان خٹک کی غزل کا مقطع یہ ہے :

عبدالقادر نے پشتو زبان میں یہ جو غزل کہی ہے ،
سچ کہتا ہوں کہ ،
خوشحال خان کے سوا دوسرا پشتون ایسی غزل نہیں کہہ سکے گا !

عبد القادر کے اس چیلنج کو پشو کے متعدد شاعروں نے قبول کیا اور صدر خان خٹک، غفور ، عبدل ، اشرف خان اور صاحب زادہ مہدی کے علاوہ معز اللہ خان نے بھی اس دلچسپ طرحی مشاعرے میں حصہ لیا اور بہت عمدہ غزل کہی ۔ مقطع ملاحظہ فرمائیے :

اے عبد القادر ! معز اللہ نے تجھے پشتو میں جواب دے دیا ،
اس دور میں اب تیرا ایک پشتون ثانی پیدا ہو گیا ! (ترجمہ)

کاظم خان شیدا (ز-۱۷۷۷ع/۱۱۹۱ھ)

افضل خان خٹک کے بیٹے اور خوشحال خان کے پڑپوتے کاظم خان شیدا کو کہکشاں خٹک کے ایک نمایاں ستارے کی حیثیت حاصل ہے ۔ شیدا ۱۷۲۲ع/۱۱۳۵ھ میں اپنے جدی گاؤں اکوڑہ خٹک (تحصیل نوشہرہ ۔ ضلع پشاور) میں پیدا ہوا ۔ اگرچہ اس

کی سن وفات کا صحیح علم نہیں ہے لیکن ۱۷۷۷ع/۱۱۹۱ھ تک اس کے زندہ رہنے کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اس نے اپنا دیوان ۱۷۷۷ع/۱۱۹۱ھ میں مرتب کیا تھا۔

کاظم خاں سدا کی موت غربت میں واقع ہوئی۔ وہ اپنے بڑے بھائی اسد اللہ خان کی زیادتیوں سے دل برداشتہ ہو کر وطن سے باہر چلا گیا۔ کچھ عرصہ کشمیر میں رہا۔ پھر کشمیر سے نکل کر لاہور آیا، جہاں، وہ ذکر کرتا ہے، کہ میں نے سر ہند کے مجددیہ خاندان کے صاحبزادہ صاحب کو اپنی منظومات پیش کیں۔ پھر سندھ گیا اور آخر میں رام پور چلا گیا۔ اس وقت رام پور میں آخری پٹھان نواب علی محمد خان کا دورِ اقتدار تھا۔ نواب موصوف ایک تنک نام سردار تھا۔ سیدا کی وفات وہیں ہوئی اور اس کی آخری آرام گاہ بھی وہیں ہے لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ جہاں رام پور میں اردو کے بہت سے پٹھان شعرا کے تذکرے اور حالات ملتے ہیں، وہاں سیدا کا کسی کو علم نہیں، حالانکہ اس زمانے میں رام پور کے پٹھان پشتو سے بخوبی آشنا تھے اور اس کے علاوہ روہ کے پٹھانوں سے ان کے رشتے ناطے بھی ہوتے تھے۔

سدا کا دیوان ابھی طبع نہیں ہوا ہے لیکن اس کے چند قلمی نسخے موجود ہیں جس کی ترتیب یوں ہے:

مقدمہ، مثنویات، غزلیات، قصائد، مخمس، رباعیات، قطعات، مسدس۔

اس نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں اپنی مسافری اور زمانے کے نامساعد حالات کا گلہ و شکوہ کیا ہے۔ اس نے اپنے سے قبل کے دور کی پشتو شاعری پر منظوم تبصرہ بھی کیا ہے۔ وہ صرف چند شعرا کا قائل ہے جن میں اپنے خاندان کے شاعروں کو خاص مقام دیتا ہے اور پھر مرزا خان انصاری اور دولت خان لوہانی واصل (میاں واصل) کو اچھے شعرا میں شمار کرتا ہے۔ ویسے وہ پشتو کے بعد کے تمام شعرا کو خوشحال خان خٹک کے دسترخوانِ شعرو سخن کے ریزہ چین سمجھتا ہے۔ وہ اپنے پردادا کو تمام علاقہ روہ کا استاد قرار دیتا ہے کہ خان نے جب قلم ہاتھ میں لیا تو اس کا ایک بہت بڑا دیوان مرتب ہو گیا۔ بہت سی دوسری تصنیفات کے لکھنے اور کہنے کا ڈھنگ سکھایا اور وہ تمام افغان قوم میں سند مانا جانے لگا۔ ان اشعار میں اپنے گاؤں اکوڑہ سرائے کو قیامت تک آباد رہنے اور اپنے خاندان کی سلامتی کی دعا کرنے کے ساتھ ناگرام (پشاور) کی شہرت کی برقراری کے لیے بھی دست بہ دعا ہے۔

---

(۱) تذکرہ کاملان رام پور میں آپ کا ذکر کیا گیا ہے اور اسی طرح آپ کے بھائی علی خان کا تذکرہ بھی محسن بدایونی نے اپنی کتاب میں کیا ہے (اثر افغانی)

بعض تنقید نگاروں کے خیال میں شیدا حمید بابا سے متاثر ہوا اور اسی کا پیروکار ہے ۔ لیکن اس سلسلے میں زیادہ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نازک خیالی میں حمید بابا کے زیادہ قریب ہے ۔ اگر وہ حمید بابا کا پیروکار ہوتا تو وہ محولہ بالا اشعار میں اس کا ذکر ضرور کرتا ۔ متاثر تو وہ اپنے پردادا خوشحال خاں سے ہی معلوم ہوتا ہے ۔ وہ ایک شعر میں اپنے آپ کو نازک خیال کہتا ہے ۔ حقیقت یہی ہے کہ شیدا نازک خیالی کی طرف بہت مائل ہے اور اس نے پشتو کے شعرا اور سبک کی خصوصیات سے روگردانی نہیں کی ہے ۔ فکر کی بلندی و رفعت تخیل میں وہ اپنے پیشروں سے کم نہیں ہے ۔ شعری تلازمات اور صنائع بدائع کا اس نے خاص خیال رکھا ہے ۔ قصائد میں فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے شیدا نے جو جولانیٔ طبع دکھائی ہے اس میں اس کا کوئی ہمسر معلوم نہیں ہوتا ۔

احمد شاہ بابا (م-۱۷۷۲ع/۱۱۸۶ھ)

خوشحال خان خٹک نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں کہا تھا :

''میرے جیسا مرد غیور و جمبور پھر نہیں آیا ،
اور نہ میری طرح کوئی مرد میدان اور صاحب رزم و جہاد آئے گا ۔
خٹک تو چھوڑ تمام افغانوں میں شاید ہی میری طرح ،
کوئی صاحب فرہنگ اور مرد دانا و بینا آئے ۔''

ایسی شخصیت اتفاق سے پیدا ہوتی ہے جو خوشحال خان کی طرح صاحب سیف اور صاحب قلم بھی ہو ، خان و سردار بھی اور صوفی و فلسفی بھی ، غیور جمہور بھی ، علم و حکمت کا مالک بھی ، دانا و بینا اور نکتہ دان بھی ۔ روحانی طبیب بھی اور جسمانی ڈاکٹر بھی ۔ الغرض ان تمام اوصاف سے متصف ہو جو خوشحال خاں میں بیک وقت موجود تھیں ۔

پٹھانوں میں خوشحال خان کے بعد بھی متعدد سخصیتیں پیدا ہوئیں ۔ ان میں صاحبانِ علم و فضل بھی تھے اور اصحاب سیف و قلم بھی ۔ لیکن اگر کوئی پٹھانی شخصیت خوشحال خاں خٹک کی جانشین ہو سکتی ہے تو وہ ''احمد خاں سدوزئی'' ہے جسے دنیا احمد شاہ درانی ، احمد شاہ ابدالی اور احمد شاہ بابا کے نام سے جانتی ہے ، جو میدان پانی پت کی تیسری جنگ کا فاتح و ہیرو ہے ۔ اس لیے اگر ایک طرف موجودہ مغربی پاکستان کو مرہٹوں کی یلغار اور تسلط سے محفوظ رکھا تو دوسری طرف اس نے ملّتِ افاغنہ کے اتحاد کا سہرا بھی اپنے سر لیا جو موجودہ افغانستان کا خالق و بانی اور پہلا افغان بادشاہ تھا ۔

احمد شاہ ابدالی کی جنگی کامیابیوں اور کامرانیوں کی داستان اس قدر معلوم و معروف ہے کہ یہاں نہ اس کے اعادے کی ضرورت ہے اور نہ یہ اس کا مقام ہے۔ یہاں اسے صرف عامی و ادبی اور پستو کے ایک صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے پیش کیا جائے گا۔

احمد شاہ ۲۳-۱۷۲۲ع/۱۱۳۶-۱۱۳۵ھ کے درمیان ہرات میں پیدا ہوا (بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس کی جائے پیدائش ملتان ہے)۔ اس کے والد کا نام زمان خان تھا اور وہ پٹھانوں کے سلسلہ درانی کی سدوزئی شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ احمد شاہ کے بزرگ ہرات میں حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ احمد شاہ ایران کے بادشاہ نادر شاہ افشار کا جرنیل تھا۔ جب نادر شاہ افشار کا ۱۷۴۷ع/۱۱۶۰ھ میں انتقال ہوا اور اس کی اولاد کی نالائقی کے سبب ایران افراتفری کا شکار ہو گیا تو موجودہ افغانستان کے تابع ایرانی حصے کے لوگوں نے اپنی خود مختاری کا مظاہرہ کیا۔ افغانوں کو ایک قائد کی ضرورت تھی۔ احمد شاہ کی ذات میں شجاعت، تدبر اور قیادت کی ساری خوبیاں موجود تھیں۔ چنانچہ پٹھان قبائل کے نمائندوں نے ایک جرگہ منعقد کر کے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔

احمد شاہ نے افغانستان کے مقبوضہ علاقوں کو آزاد کرانے کے علاوہ بدخشاں اور خراساں کو بھی فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کیا اور پھر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور پنجاب کے مسلمانوں کی دعوت پر ہندوستان کی طرف رخ کر کے ۱۷۶۱ع/۱۱۷۴ھ میں پانی پت کے میدان میں دس لاکھ مرہٹوں کو شکست فاش دی۔ دہلی سے مرہٹوں کو خارج کر کے اسے شاہ عالم کے حوالے کر کے اپنے وطن کو واپس لوٹ آیا۔ پانی پت کی جنگ میں اس کے ساتھ صرف اسی ہزار پٹھان اور کچھ بلوچ تھے۔ ان میں موجودہ افغانستان، قبائل اور سابق صوبہ سرحد کے پٹھانوں کے علاوہ قصور ضلع لاہور کے خویشگی اور زمند پٹھان بھی شامل تھے۔ پنجاب کے علاقوں میں آباد پٹھانوں کے علاوہ نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں کی افواج احمد شاہ کی قیادت میں پانی پت کے میدان

یہ امر بھی تاریخی حقیقت ہے کہ احمد شاہ درانی نے چار دفعہ دہلی کو لوٹا اور ۱۷۵۷ء میں ۔۔ لاکھ تاوان بھی دہلی والوں سے وصول کیا اور اس لوٹ مار میں کئی بار قتل عام بھی ہوا۔ چنانچہ شہر کی وہ خواری ہوئی کہ بعض شرفا نے خود کشی کر لی اس سے پہلے ۱۷۴۷ء میں لاہور کا بھی یہی حشر ہوا تھا۔ احمد شاہ درانی نے شہر والوں سے تاوان وصول کیا اور مغلپورہ کو خوب لوٹا جو ان ایام میں لاہور کا خوشحال ترین محلہ تھا۔ دیکھئے:

ہاشمی فرید آبادی.... تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت۔ جلد دوم۔ ص۔ ۳۶، ۳۷

سمتھ ..... آکسفورڈ کی تاریخ ہند (انگریزی) ۔ ص۔ ۴۳۷

سید محمد لطیف ...... تاریخ پنجاب (انگریزی) ۔ ص۔ ۲۱۷

(ادارہ)

میں مرہٹوں کے خلاف لڑیں ۔ احمد شاہ بابا کا انتقال ۱۷۷۲ء/۱۱۸۶ھ میں ہوا ۔ ان کا مزار قندھار میں ہے ۔

نا مناسب نہ ہوگا اگر یہاں احمد ساہ ابدالی کے چند پشتو شعروں کا ترجمہ پیش دیا جائے جن میں اس امیر صف سکن نے سلطنتوں کو پیدا کرنے کے بعد ان سے اپنی بے نیازیوں کا خود بھی ذکر کیا ہے :

آج میں اپنے یار سے ہم آغوش ہو کر سرِ گلزار کو جا رہا ہوں ۔
تیری سیاہ آنکھوں ، سرخ ہونٹ اور سبز خال ،
میں تیرے لب کی شراب میں مخمور اور مستانہ جا رہا ہوں ۔
جب خدا نے میرا رقیب فنا کر دیا ہے تو میں
مخلص دوستوں کی جمعیت کے ساتھ بغیر روک ٹوک کے آگے جا رہا ہوں ۔
جب خدا نے مجھے رقیبوں پر غلبہ حاصل کرنے کی توفیق دے دی ،
تو اب میں ہندوستان کی طرف بطور سیر و تماشہ جا رہا ہوں ۔ .
جب ہندوستان کے علاقوں کی فتح مجھے نصیب ہوئی تو میں،
ایران کی طرف نقاروں اور باجوں کے ساتھ جا رہا ہوں ۔
میں خدا کی اس داد کا سکرگزار ہوں ! ایران میرے زیر نگیں ہے ۔
اور میں ساہانہ کرو فر کے ساتھ جارہا ہوں ۔
میں ملکوں کو خدا کی تائید و حمایت سے فتح کرتا ہوں ، اور
حبیب پاک کی مدد سے میں ہر طرف سرخرو جا رہا ہوں ۔
میں احمد ساہ ! دنیا کو فانی اور نابود سمجھتا ہوں، اس لیے ،
دنیا کو چھوڑ ، میں ایمان کے ساتھ جا رہا ہوں ۔ (ترجمہ)

★ ★ ★

احمد شاہ اپنے وطن کی یاد کو دل سے فراموش نہیں کر سکتا ،
خواہ دہلی کے تخت پر بھی متمکن کیوں نہ ہو ۔
جب مجھے اپنے حسین پختون خواہ کے
پہاڑوں کی چوٹیاں یاد آ جاتی ہیں، تو دہلی کا تخت بھول جاتا ہوں،
جب میں تیری سر زمین پر واپس اگر قدم رکھتا ہوں ،
تو میرے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے ۔
دنیا میں ، میں کتنے ہی ملکوں کا مالک کیوں نہ ہوں ،
مجھے تیرے خوبصورت باغ نہیں بھولتے ! (ترجمہ)

وہ خوشحال خان ہی کی طرح اپنے کوہستان کی نسیم کو حیات بخش سمجھتا ہے ، مثلاً کہتا ہے :

اگر نسیم کوہستان چلے تو میرے دل کا پھول ،
مٹی کے اندر سے بھی سر نکال لے تا ۔ (ترجمہ)

احمد شاہ کا پشتہ دیوان جو "کابل پشتو ٹولنے" نے 'لوئے احمد شاہ بابا ، (عظیم احمد شاہ بابا) کے نام سے شائع کیا ہے ، دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے ۔ اس میں غزلیات ، رباعیات ، قطعات اور دیگر اصناف و اقسام کے شعر موجود ہیں ۔ اس میں فارسی کی بھی پانچ غزلیں ہیں ۔ احمد شاہ کا کلام ادبی اعتبار سے بلند پایہ ہے ۔ اس میں سادگی اور سلاست بھی ہے اور وہ شعری تلازمات سے بھی خالی نہیں ۔ عشق و محبت اور تصوف و رومانیت کے مضامین اس کے کلام میں بہت غالب ہیں ۔ اسے رحمان بابا کا پیرو کار بتایا جاتا ہے ۔ تصوف میں اس نے حضرت میاں فقیراللہ آبادی[1] کے ہاتھ پر بیعت کی تھی ۔ وہ ایک بزرگ سید صابر شاہ[2] کا بھی بہت معتقد اور مداح تھا ۔ اس کے علاوہ وہ حضرت میاں محمد عمر چمکنی (ضلع پشاور) کا بھی معتقد تھا ۔ پانی پت پر حملہ کرنے سے پہلے وہ میاں محمد عمر رحمۃاللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا ۔ انہوں نے اس کی فتحیابی کے لیے دعا بھی کی تھی ۔

ذیل کے اشعار (ترجمہ) سے اس کے تصوف کا اندازہ ہو سکتا ہے :

میری صورت کی یہ مٹی چار عناصر پر مشتمل ہے ،
اگر چار عناصر اٹھا کر دیکھو تو بالکل یہی شکل نظر آئے گی ۔
روح کی روشنی میں کھو کر ہی میں نے اپنے محبوب کو پا لیا تھا ،
میں احمد ! دنیا کو فانی اور بے بقا سمجھتا ہوں ، دنیا رہ جائے گی ،
اور میں ایمان کے ساتھ اس سے چلا جاؤں گا ۔ (ترجمہ)

وہ جنگ کی بجائے دربار (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدح میں بخشش کا
امیدوار ہے اور یقین محکم کی تاکید و تلقین کرتا ہے جیسے :
راہِ عشق چراغ یقین سے پیدا کر کیونکہ گھپ اندھیرے میں ،

---

(۱) حضرت میاں فقیراللہ افغانستان کی سمت مشرق (صوبہ ننگرہار) کے مرکزی شہر جلال آباد کے اصل باشندہ تھے ۔ اس لیے جلال آبادی کہلاتے ہیں ۔ آپ ۱۱۹۵ء میں فوت ہوئے ہیں ۔ آپ کا مزار شکار پور سندھ میں ہے ۔

(۲) سید صابر شاہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے اعیان مملکت کے جرگہ میں احمد شاہ کو اپنا بادشاہ منتخب کرنے کا مشورہ دیا تھا ۔ حضرت صابر شاہ لاہور کے مقام پر شہید ہوئے تھے ۔ ان کا مزار شاہی مسجد لاہور کے عقب میں ہے ۔

یقین ہی دل کی فلاح کا باعث ہو سکتا ہے۔
باقی دنیا اگر جنت کی مدح میں مصروف ہے،
تو احمد شاہ درِ یار کا مداح و ثنا خوان ہے۔ (ترجمہ)

وہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ستائش میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ اس کے نعتیہ اشعار حبِّ رسول اللہ کی انتہا کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ رسول کے یاروں (چہار یار، خلفائے اربعہ) اور اصحاب کو بہار کے پھول بتاتا ہے اور رسول پاک سے خستہ و آلودہ دلوں کی طرف نظر کرم کرنے کی التجا کرتا ہے۔

احمد شاہ نے اپنی جنگوں اور فتحیابیوں کا ذکر نہایت خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ ملّی وحدت پر بھی زور دیا ہے اور اس نے ننگ و غیرت کے نعرے بھی بلند کیے ہیں۔ مثلاً:

پٹھان اگر تلوار کی ضربیں لگاتے ہیں تو وہ،
رقیب کی ساعِ حیات کو تار تار کر دیں گے۔

* * *

جب میں ہر طرف حملہ آور اور کامران ہوں گا،
توحمید[1] اور فرید[2] کا دور پھر آئے گا۔

★ ★ ★

خلجی ہوں کہ ابدالی سب ایک ہیں! لیکن
اچھا وہی ہے جس کا آئینہ دل صاف و شفاف ہو۔ (ترجمہ)

احمد شاہ بابا نے پشتو میں پٹھانوں کی رہنمائی کے لیے ایک کتاب 'آئینہ' بھی لکھی تھی یہ 'آئینہ' قوانین شریعت اسلامیہ پر مبنی تھا۔

علی خان

علی خان خٹک اپنے کوائف کے اعتبار سے متنازعہ فیہ شاعر ہے۔ مصنف 'حیات افغانی' کے مطابق وہ خوشحال خان کے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ افضل خان خٹک پسر اشرف خان ہجری کا بیٹا اور کاظم خان شیدا کا بھائی اور خوشحال خان کا پڑپوتا تھا اور اپنے والد افضل خان خٹک کی وفات کے بعد وہ اپنے قبیلے کا سربراہ بنا۔ اس کا ایک

---

(۱) حمید لودھی محمود غزنوی کے زمانے میں ملتان کا پٹھان حکمران تھا۔
(۲) فرید خان شیر شاہ سوری ہندوستان کا مشہور پٹھان بادشاہ۔

دوسرا بھائی سعداللہ خان نامی تھا جو ضلع کوہاٹ میں علاقہ ٹری کا نواب تھا ۔ بہرحال بعد میں علی خان اقتدار سے محروم ہو گیا اور اکوڑہ خٹک سے باہر چلا گیا ۔

لیکن علی خان اپنے اشعار میں پشاور ، تیراہ اور ہشت نگر (علاقہ چارسدہ ، ضلع پشاور) کو یاد کرتا ہے اور اسی بنا پر کچھ تذکرہ نگار علی خان کو علاقہ ہشت نگر کا باشندہ خیال کرتے ہیں ۔ ان کے خیال میں علی خان علاقہ ہشت نگر کے موضع امانزائی کا رہنے والا تھا اور اس کا مزار بھی اسی موضع کے بجانب مشرق قبرستان میں واقع اور معروف ہے ۔ گزشتہ سال علاقہ ہشت نگر کے پشتون ادیبوں نے اس کی برسی بھی منائی تھی ۔ اس موقع پر قاضی عبدالحلیم اثر نے علی خان پر جو مقالہ پڑھا تھا ، اس سے معلوم ہوا کہ علی خان تخلص کرنے والے دو شاعر گزرے ہیں ۔ ایک محمد علی خان جو خوشحال خان خٹک کا پڑپوتا ہے اور ایک علی احمد خان جس کی یادگار یہ دیوان باقی ہے اور یہ صاحبِ دیوان علی خان قوم کے لحاظ سے مامون زائی ہے ، خٹک نہیں ہے ۔

علی خان کے پشتو اشعار اپنے سبک اور اسلوب کے لحاظ سے پشتو کے مشہور شاعر محمدی صاحبزادہ کے انداز کا رنگ لیے ہوئے ہیں ۔ محمدی صاحبزادہ حضرت میاں محمد عمر چمکنی کا فرزند اور نقشبندیہ طریقہ کا سجادہ نشین بزرگ بھی تھا اور اپنے وقت میں پشتو زبان و ادب اور پشتون شاعروں کا محسن اور مربی بھی ۔ کاظم خان شیدا نے تو اپنا پشتو دیوان ہی محمدی صاحبزادہ کی فرمائش پر ترتیب دیا تھا ۔ علی خان بھی ان ہی محمدی صاحبزادہ کا مرید اور ان کے ادبی مسلک کا پیروکار ہے ۔ پشتو کا یہ مخصوص سبک جس میں عبدالحمید مہمند ، محمدی صاحبزادہ ، ترکلانی ، کاظم خان شیدا خٹک اور علی خان مامون زائی نے شاعری کی ہے تخیّل، نازک آفرینی ، ندرتِ الفاظ اور استعارات و تشبیہات کے حسن سے عبارت ہے ۔ اس اعتبار سے علی خان کا کلام لفظی اور معنوی خوبیوں کا ایک شاہکار ہے اور پشتون خواص اور عوام میں اسے مقبولیت کا درجہ حاصل ہے ۔

علی خان کی شاعری کے آغاز کا زمانہ ۱۷۶۷ع/۱۱۸۱ھ سے قبل کا ہے اور وہ تیمور شاہ درّانی پسر احمد شاہ درانی کے آخیر عہد حکومت تک زندہ تھا ۔

پشتو اکیڈمی پشاور نے علی خان کا دیوان شائع کیا ہے ۔

پانچواں باب

تیسرا دور ، ۱۷۷۲ - ۱۹۰۰ء

تاریخی پس منظر

یہ دور احمد شاہ ابدالی کی زندگی کے آخری ایام سے شروع ہوتا ہے - اس وقت ستلج کے اس پار سے لیکر صوبہ سرحد اور افغانستان پر درانیوں کی حکومت تھی - دہلی میں شہنشائیت اب سمٹ کر مملکت دہلی بن چکی تھی - انگریز ابھی دور تھے مگر سکھوں کے خطرہ کو شاہ ولی اللہ کی نگاہ دور رس نے اس وقت بھی بھانپ لیا تھا - چنانچہ جو خط انہوں نے نجیب الدولہ کو لکھا تھا اس میں مرہٹوں کے بعد سکھوں کی طاقت کو بھی ختم کرنے کی ہدایت فرمائی تھی - گو مرہٹوں کو پانی پت کی تیسری لڑائی میں شکست ہو گئی تھی مگر انہوں نے دس پندرہ برس کے بعد پھر سر اٹھانا شروع کر دیا تھا - ابدالی کے بعد سکھوں نے آہستہ آہستہ اپنی طاقت بڑھا لی اور جگہ جگہ اپنی مثلیں قائم کر لیں تاآنکہ تیمور شاہ اور زمان شاہ کے زمانے میں سکھوں نے اپنی طاقت اور بھی بڑھا لی - زمان شاہ کو ۱۷۹۸ء میں لاہور چھوڑنا پڑا - اس کے بعد رنجیت سنگھ نے پنجاب اور پھر کشمیر و سرحد میں اپنی طاقت بڑھا لی - زمان شاہ کے بعد افغانستان میں تخت کے لیے رسہ کشی شروع ہو گئی - اس بے اتفاقی اور خانہ جنگی سے رنجیت سنگھ نے فائدہ اٹھایا اور مشرق میں انگریزوں سے معاہدہ کر کے ان کی طرف سے مطمئن ہو گیا - پھر مغرب کی طرف قدم بڑھا کر پشاور کے علاقہ میں اپنے قدم جمالیے - عین اس وقت سید احمد بریلوی نے سکھوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا اور پٹھانوں سے مراسم قائم کیے - ان کی دعوت پر چند پٹھان گروہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے ، مگر بعد میں ان میں سے کچھ گروہ سید موصوف سے منحرف ہو گئے ، اور انہیں بالاکوٹ کی طرف مراجعت کرنی پڑی ، جہاں وہ شہید ہو گئے - مگر ان کی کوششیں بالکل ناکام نہ ہوئیں کیونکہ آزادی کی ہلکی ہلکی لو سارے برصغیر میں جلتی رہی اور بالآخر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ پرمنتج ہوئی ، بلکہ اس کے بعد بھی زندہ رہ کر مسلمانان پاکستان و ہند کی نشاۃ ثانیہ کا باعث بنی -

اس دور کے سیاسی حالات کے بیان کرنے سے یہ بتانا منظور ہے کہ یہ دور جنگ و جدال ، قتل و غارت اور بے چینی و بے اطمینانی کا دور تھا ۔ اس کا اثر اس وقت کے ادب و شعر پر بھی پڑا ۔ کلاسیکی شاعری ماند پڑ گئی اور اس کی جگہ عوامی گیتوں (چار بیتوں ، بدلوں ، سندروں) نے لے لی ، جن میں زیادہ تر اسلام اور آزادی وطن کے لیے جہاد اور بہادری و شجاعت کے کارناموں کا اظہار ہے ۔ یا پھر مثنویوں اور بدلوں کی شکل میں قصے کہانیاں ہیں جن سے اس پر آشوب وقت میں راتوں کو کچھ وقت کے لیے دل بہلایا جاتا تھا ۔ دوسری طرف ایسے حالات میں گوشۂ نشین علما کے قلم مذہبی کتابیں لکھنے کے لیے زیادہ تیزی سے چلنے لگے اور اہلِ قلم نے پٹھانوں کی تاریخ پر مواد اکٹھا کرنا شروع کر دیا ۔

مذکورہ حالات کی وجہ سے اس دور کے ادب کی تاریخ بھی ایک خاص اہمیت کی حامل ہے ۔ ہم مختلف فصلوں میں اس کا ذکر کرتے ہیں ۔

غزل گو شعرا

تیمور شاہ (م-۱۷۹۳ء/۱۲۰۷ھ)

احمد شاہ ابدالی کے بڑے بیٹے تھے ۔ ۱۷۷۲ء/۱۱۸۶ھ میں تخت پر بیٹھے ۔ ۲۲ سال حکومت کے بعد ۱۷۹۳ء/۱۲۰۷ھ میں فوت ہوئے ۔

تیمور شاہ بھی اپنے والد کی طرح ایک عالم ، ادیب اور شاعر تھے ۔ پشتو اور فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے ۔ فارسی زبان میں ایک دیوان چھوڑا ہے ۔ مگر ان کا پشتو کا دیوان ابھی تک نہیں ملا ۔ متفرقات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا کلام بھی احمد شاہ ابدالی ہی کے رنگ میں ہے ۔ ان کی غزل کے دو اشعار کا ترجمہ دیا جاتا ہے :

اہا ! محبوب کی صورت کیا ہے بس بھول ہیں !\
جس نے اپنے چہرے پر نیلے خال کھدوائے ہیں\
اس نے اپنے رخساروں پر زلفوں کو بکھیر دیا ،\
جس کے ہر تار میں عاشقوں کے دل آویزاں ہیں ۔

پیر محمد کاکڑ (ز-۱۷۸۱ء/۱۱۹۵ھ)

بلوچستان کے علاقہ ژوب میں کاکڑ قبیلہ میں پیدا ہوا ۔ بعد میں قندھار چلا گیا ۔ اپنے علم اور شاعری کی وجہ سے وہاں بڑی شہرت پائی ۔ احمد شاہ ابدالی نے اسے اپنے بیٹے

شہزادہ سلیمان کا استاد مقرر کیا ۔ سلیمان کے دور حکومت میں "معرفتہ الافغانی" کے نام سے پشتو زبان کی گرامر لکھ کر اس کی خدمت میں پیش کی [۱] ۔ اس نے اپنا دیوان ۱۷۸۱ء/۱۱۹۵ھ میں مرتب کیا ۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ اس سال تک یقیناً زندہ تھا ۔

پیر محمد ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر تھا ۔ رحمان بابا کا مداح اور اس کے مکتب کا پیرو تھا ۔ کہیں کہیں ادیبانہ تلازمات اور نازک خیالی کے لحاظ سے اس میں حمید کا رنگ بھی جھلکتا ہے ۔ اس کے ایک شاگرد ابراہیم خاں نے اس کا دیوان اپنے قلم سے ۱۷۸۸ء/۱۲۰۳ھ میں لکھا[۲] ۔ اس کے خاتمہ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اس کا استاد (پیر محمد) فوت ہو چکا ہے ۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس نے ۱۱۹۶ء اور ۱۲۰۳ء کے درمیان کسی سال وفات پائی ہو گی ۔ اس کا دیوان شاید پہلی دفعہ ۱۸۸۵ء/۱۳۰۳ھ میں دہلی میں چھپا ۔ اس کے دیوان میں غزلیات ، رباعیات ، مخمس ، مسدس ، ترجیع بند وغیرہ اصناف موجود ہیں ۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :

میں ان چند ترکوں کے ناز اپنی آنکھوں کی پتلیوں پر اٹھاتا ہوں ،
لیکن پھر بھی اپنی آنکھیں اپنے دل کے خون سے آلودہ لیے جاتا ہوں ۔
مجھے مرہم تو ایک داغ (زخم) کی بھی میسر نہیں، لیکن
اپنے دل پر فراق کے سو سو داغ لیے پھرتا ہوں ۔
وصل کی ہوا میں تو میں ایک پھول کی طرح کھلا ہوا تھا ، لیکن
فراق کے وقت ایک تنکے کی طرح سیلاب کی رو میں بہے جا رہا ہوں ۔ (ترجمہ)

حضرت مہدی صاحبزادہ ۔ (ز۔ ۱۷۳۷ء - ۱۷۶۲ء/۱۱۵۰ھ - ۱۱۷۶ھ)

حضرت مہدی صاحبزادہ موضع چمکنی (ضلع پشاور) کے مشہور ولی اللہ حضرت میاں عمر کے بڑے صاحبزادے تھے ۔ اپنے والد بزرگوار کی وفات (۱۷۷۶ء/۱۱۹۰ھ) پر ان کے جانشین ہوئے ۔ ہزارہا عقیدت مندوں اور مریدوں کے روحانی پیشوا ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ پایہ کے عالم ادیب اور شاعر تھے۔ علما اور شعرا کے بڑے قدردان تھے ۔ والد کی وفات پر آپ نے ایک مسجد تعمیر کرائی اور اس کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا ۔ ملک کے بہترین کاتب اور نقاش آپ کے گرد جمع رہتے اور مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی کتابت کرتے رہتے ۔ آپ نے دوسری علمی کتابوں کے علاوہ پشتو کے تمام گذشتہ اور ہم عصر

---

(۱) د پشتو ادب تاریخ
(۲) جناب بینوا ۔ دیباچہ دیوان مطبوعہ کابل

شعرا کے دیوان بھی جمع کیے اور ان کو ان خوش نویسوں سے لکھوایا ۔ ان میں سے کچھ نسخے پشتو اکیڈیمی کے کتب خانہ میں موجود ہیں ۔ خطاطی اور نقاشی و گل کاری کے بہترین نمونے ہونے کے وجہ سے یہ مخطوطے اپنے ملک کے علاوہ بیرونی ممالک (مثلاً جرمنی) میں بھی نمائش کے لیے بھجوائے جا چکے ہیں ۔ اس سے محمدی صاحبزادہ کے اعلیٰ ذوق اور علم و ادب کی قدردانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ آپ خود بھی تصنیف و تالیفِ کتب میں مصروف رہتے ۔ پشتو شاعری میں صفِ اول کے شعرا میں شمار ہوتے ہیں ۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا دیوان اب تک نہیں ملا ۔ صرف چند ایک غزلیں ہاتھ آئی ہیں ۔ یہی حال دوسری تصنیفات کا بھی ہے ۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو :

قسمت ، عقل و تدبیر کے بس کی بات نہیں !
کوئی بھی نصیب کو زنجیر سے نہیں باندھ سکتا ۔
ستارے چاہے کتنا بھی اڑیں ، سورج نہیں بن سکتے ۔
جو قسمت بادشاہ کی ہے وہ فقیر کو نہیں مل سکتی ۔
تیری زلفوں کے ڈورے نے بڑے بڑے کج رووں کے بل نکال دیے ،
لیکن ابھی غماز کتے کی سزا کا وقت نہیں آیا ۔ (ترجمہ)

قاسم علی آفریدی (پ ۔ ۱۷۶۹ء/۱۱۸۳ھ)

اصلاً آدم خیل آفریدی[1] تھا ۔ اس کے دادا اپنے گاؤں ''اخور'' سے اورنگ زیب عالمگیر کے وقت ترکِ وطن کرکے ہندوستان چلے گئے اور فرخ آباد میں سکونت اختیار کرلی ۔ قاسم علی وہیں پیدا ہوا ۔ والد کا نام برہان خاں تھا ۔ خود کہتا ہے کہ والد کی وفات (۱۷۷۸ع/۱۱۹۰ھ) کے وقت وہ نو سال کا تھا ۔ اس لحاظ سےاس کا سنِ پیدائش ۱۷۶۹ع/۱۱۸۳ھ ہوگا ۔ قاسم علی پشتو، فارسی، اور عربی کے علاوہ کشمیری اور ترکی اور کچھ انگریزی بھی جانتا تھا ۔ فرخ آباد کے ایک صوفی بزرگ غلام محمد کا بڑا معتقد تھا ۔ اس نے اپنے کلام میں ان کی بہت مدح کی ہے ۔ اور ان کی وفات ۱۷۹۴ع/۱۲۰۹ھ پر مرثیہ بھی کہا ہے ۔ دیوان ۱۷۹۱ع/۱۲۰۶ھ میں مکمل کیا ۔ اندرونی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے (۱۷۹۴ء/۱۲۰۹ھ) اور (۱۸۱۵ء/۱۲۳۱ھ) کے درمیان وفات پائی ہو گی ۔ اپنے دیوان کے متعلق وہ خود کہتا ہے کہ اس نے چوبیس سال کی عمر میں شروع کیا ۔ بالفاظِ دیگر اس نے اپنا دیوان دو ایک سال میں ختم کیا ۔

---

(۱) یہ حالات اس کے دیوان سے مرتب کیے گئے جس کا ایک نسخہ اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانہ میں موجود ہے ۔

اپنی زبان (پشتو) کے متعلق کہتا ہے:

میں ہندوستان میں پیدا ہوا، میں پشتو کیا جانوں!
میں تو صرف اچھے شاعروں کا بس نام لیوا ہوں۔ (ترجمہ)

مگر اس کے دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو اپنی زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔ اس نے اپنے دیوان میں پشتو کے بڑے بڑے شعرا کا ذکر کیا ہے۔ اس نے دولت لوہانی، میرزا خان انصاری اور الہ داد کے ساتھ کریم‌داد خان (۱) اور اخوند درویزہ کا نام بھی لیا ہے۔ اس لیے کہ دو گروہوں (بایزید انصاری اور اخوند درویزہ) کی مخالفت کے اثرات وہاں تک نہیں پہنچے تھے۔ بلکہ خود آفریدی ایک 'پیر کامل' کی ضرورت کا قائل ہے۔ ہو سکتاتھا کہ یہ روشانی تحریک کا اثر ہو۔ ساید اسی وجہ سے فرخ آباد کے ایک صوفی بزرگ کا معتقد و مرید ہے۔ کہتا تھا:

اگر خدا چاہے تو پیر کامل کی خدمت اور توجہات سے
میں عرفان کے مقام تک پہنچ جاؤں گا!
اب خدا سے لاخوف کا مقام چاہتا ہوں
اگر قسمت میں لکھا ہو تو یہ بھی پالوں گا! (ترجمہ)

اس کے کلام میں غزلیات، رباعیات، مخمس اور چار بتیہ وغیرہ اصنافِ سخن موجود ہیں۔ عربی الفاظ (خصوصاً قوافی میں) بہت زیادہ ہیں۔ ویسے اسعار عام فہم ہیں۔ ان میں شاعرانہ باریکیاں اور پیچیدگیاں کم ہیں۔ اب کچھ اسعار کا ترجمہ بطور نمونہ کلام دیا جاتا ہے:

تونے پہاڑ کھودا اور میں نے اپنی صورت
کاٹ کاٹ کر رکھ دی، جو مشکل کام ہے۔
اس لیے اے کوہ‌کن! تو اپنے جھوٹے جنوں کا مقابلہ میرے ساتھ نہ کر!
تیری غرض جنت کے ساتھ وابستہ ہے، میری نہیں۔
اس لیے اے زاہد!
اپنی یہ نصیحت اہلہ فریبی کے لیے رکھ چھوڑ!
لکڑی کی تلوار کی قسمت میں چاندی کا دستہ نہیں ہوتا (اسی طرح)

---

(۱) کریم داد ایک تو اخوند درویزہ کے بیٹے کا نام ہے دوسرے بایزید انصاری کی تحریک سے متاثر روہ لامہ کے شاعر کا بھی نام ہے۔ غالباً اس نے دوسرے شاعر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایک بہادر مرد کبھی بھی بزدل (نامرد) شخص کے ساتھ اکٹھا نہیں رہتا ۔
میں اگر کعبے سے چلا گیا اور بت خانے میں بیٹھ گیا ، تو اے زاہد !
مجھے طعنہ نہ دے ۔ دیکھ کیا مردانہ وار بیٹھ گیا ہوں ! (ترجمہ)

نواب محبت خان (م ۱۸۰۸ء/۱۲۲۳ھ)

یہ حافظ رحمت خان (ذکر آگے آئے گا) کے بڑے بیٹے تھے ۔ بڑے عالم فاضل شخص تھے ۔ پشتو کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی اسعار کہے ہیں ۔ انہوں نے پشتو کا ایک دیوان چھوڑا ہے جس کا ایک نسخہ برٹش سوزیم میں موجود ہے ۔ یہ دیوان اس نے ۱۸۰۱ء میں سر گور اوسلے کو لکھنؤ میں پیش کیا تھا ۔ غزلیات کے علاوہ آخر میں دو چاربیتے بھی ہیں[۱] ۔ اسعار سیدھے سادے ہیں ۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمایے :

اے خدا مجھے محبت کا آہ و نالہ عطا کر !
محبت کے گھر میں عشق کی آگ دے ،
پھول کی طرح عشق میں میرا جگر خون کر دے ،
اور محبت میں لالہ کی طرح میرا دل داغدار کردے ۔

ان کے چھوٹے بھائی الہ یار خان نے اپنی کتاب ' عجائب اللغات ' میں ان کا سال وفات ۱۸۰۸ء/۱۲۲۳ھ لکھا ہے ۔

بیدل

اس کا دیوان حال ہی میں جناب ہمیش خلیل نے شائع کیا ہے ۔ حالاتِ زندگی اس کے دیوان سے مرتب کیے جاتے ہیں ۔ بیدل نے اپنے گاؤں کا نام تمان بتایا ہے ۔ غالباً علاقہ ہشتنگر کے قصبہ انمانزئی کا رہنے والا تھا ۔ علی خان اور صاحبزادہ مهدی کا ہم عصر کہا جاتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ عہد تیمور شاہ (۱۱۸۶ - ۱۲۰۷ء) میں زندہ تھا ۔ غالباً پچاس ساٹھ سال کی عمر پائی ۔ کچھ وقت کشمیر میں بھی گزارا ۔ ایک شعر میں کشمیر کے شہر پٹن کا ذکر کیا ہے ۔

بیدل نے اشعار میں حمید اور علی خان کی پیروی کی ہے ۔ بلکہ ان کی زمینوں میں اپنی غزلیں کہی ہیں ۔ اس کے اسعار میں صنائع و بدائع بھی ملتے ہیں جو اس وقت کی شاعری کا ایک لازمہ تھا ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ کیجئے :

میں بدنصیب اپنی قسمت ہی کی وجہ سے محروم ہوں ۔
ورنہ تیری محبت اور مہربانی کی کوئی حد نہیں ۔

(۱) فہرست بلومہارٹ (کتب خانہ برٹش میوزیم)

میری بدحالی پر اب دوست دشمن سبھی روتے ہیں ۔
اگر پہلے میرا کوئی دشمن تھا تو ہو گا مگر (اتنا بدحال ہوں کہ)
اب کوئی بھی دشمن نہیں رہا ! (ترجمہ)

نواز خٹک (ز - ۱۷۸۲ع/۱۱۹۷ھ)

اس کا کلام اشرف خان صبوحی کے دیوان کے ایک قلمی نسخہ کے حاشیہ پر ملا ہے۔ اس نے ایک غزل کے خاتمہ پر ۱۷۷۹ع/۱۱۹۳ھ کا سال دیا ہے۔ ایک جگہ خوشحال شہید کے ساتھ عموی کا لفظ استعمال کیا ۔ گویا یہ اس کا بھتیجا ہے ۔ ایک اور شعر سے معلوم ہوتا ہے وہ ٹیری کا خان بھی رہا ہے ۔ اس بنا پر بعض کا خیال ہے کہ وہ خوشحال خان کے کُف سے ہے۔

نواز خان خٹک۱ بھی پشتو زبان کا ایک اچھا شا عر تھا ۔ وہ سعداللہ خان کا بیٹا اور افضل خان خٹک کا پوتا تھا ۔ احمد شاہ ابدالی نے اسے ٹیری کا حاکم مقرر کیا تھا ۔ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ جہادوں میں شریک رہا اور آخر ۱۷۵۲ع/۱۱۶۶ھ میں حسن ابدال کے مقام پر شہید ہوا ۔ اس کے ایک شعر کا ترجمہ بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے :

میرا تمام بدن خشک لکڑی بن گیا ہے ،
اور رگوں کے تار اس پر تن گئے ہیں ۔
(اب) اس سے زیروبم کی آواز پیدا ہوتی ہے ،
اس لیے مجھے رباب کی حاجت نہیں رہی ! (ترجمہ)

بہرکیف نواز ایک اچھے پایہ کا شاعر تھا ۔ اس نے تقریباً ہر غزل کے نیچے مقام اور تاریخ دی ہے ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پشاور اور کابل تک کے متفرق مقامات پر رہا ۔ آخری تاریخ ستمبر ۱۷۸۲ع/۱۱۹۷ھ ہے اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ اس سال تک زندہ تھا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو :

نیند تو اس وقت سے نواز پر حرام ہو گئی ہے
جب تونے اسے پائے زیب کی جھنکار سے جگایا تھا ۔
میں اس سے اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا،
یہ معلوم نہ تھا ، کہ عشق میرے گریبان کو پکڑ لے گا !
آگ اور پانی اکھٹے نہیں ہوتے ، اس لیے میں اپنے دل کی آگ

(۱) ہمیش خلیل : ورکہ خزانہ۔

اور آنکھوں کی بارش کو یک جا دیکھ کر حیران ہوتا ہوں !
تیری زلفوں کا ہندو تیری آنکھوں کے ترک کے کان میں
ہمیشہ چپکے چپکے کہتا ہے کہ مار ! مار ! (ذومعنی) (ترجمہ)

حضرت عبداللہ میاںگل (۱۷۰۴ء - ۱۸۰۸ء/۱۱۱۶ھ - ۱۲۲۳ھ)

حضرت مہدی صاحبزادہ کے چھوٹے بھائی تھے ۔ ان کی وفات ۱۸۰۵ء/۱۲۲۰ھ پر ان کی جگہ سجادہ نشین ہوئے۔ بڑے بھائی کی طرح شریعت و طریقت کے پیشوا ہونے کے علاوہ ایک اچھے شاعر اور ادیب بھی تھے ۔ اپنی ایک تصنیف میں اپنے لقب میاںگل کے علاوہ احمدی اور غریب بھی تخلص کیا ہے ۔ راقم کو ایک قلمی نسخہ میں احمدی تخلص کی چند غزلیں ملی ہیں جو غالباً انہی کی ہیں ۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی میں بھی اچھی دسترس رکھتے تھے 'پند نامہ عطار، کی تضمین تقریباً تین ہزار اشعار میں کی ہے[1] - فارسی کی 'ہفت پیکر، کی طرز پر آپ نے بھی سات قصوں کا ایک مجموعہ (تقریباً سات ہزار اشعار میں) لکھا ہے ، جس کا نسخہ پشاور کے مرکزی ریکارڈ آفس میں موجود ہے ۔ ان کے علاوہ اور تصانیف بلکہ دیوان بھی اب تک نہیں ملا ۔

انہوں نے اپنے کلام میں کچھ پچھلے شعرا کا ذکر کیا ہے ۔ ان میں سے اکثر کے حالات اب تک معلوم نہیں ہو سکے ۔ یہ شعرا صدیق ، قلندر ، خیرالدین ، حاجی محسن صدرالدین ، یونس اور فاضل ہیں ۔ گو یہ سب صاحب دیوان ہوں گے ، مگر ان کے دیوان اب تک نہیں ملے ۔ صرف صدیق ، قلندر ، یونس اور فاضل کی کچھ غزلیات ملی ہیں ۔ ایک غزل کے دو شعر بطور نمونہ کلام ملاحظہ ہوں :

تیرے غم کے لشکر اچانک آگئے ہیں ،
میرے دل کے تنگ صحن میں ان کی جگہ نہ ہو سکے گی !
موت ہر ایک پر ایک بار آتی ہے اور گزر جاتی ہے ،
(لیکن) جدائی میں میرے لیے ہر گھڑی موت کی طرح ہے ۔ (ترجمہ)

حافظ الپوری (پ ۱۷۱۵ء/۱۱۲۸ھ)

پٹھانوں میں ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں ، لیکن کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ روحانی مراتب رکھتے تھے ۔ قاضی عبدالحلیم اثر نے آپ کا نام عبدالمقتدر بتایا ہے[2] ۔ ویسے عوام میں الپوری کے حافظ صاحب کے نام سے مشہور ہیں اور اکثر

---

(۱) تمہید شاعران
(۲) اولیائے پاکستان صفحہ ۸۰۹

کا یہ خیال ہے کہ بینائی سے محروم تھے ۔ مگر بعض کا خیال ہے کہ حافظِ قرآن ہونے کی وجہ سے حافظ تخلص کرتے تھے ۔ آپ سوات ''الپوری ،، گاؤں میں ۱۷۱۵ء/۱۱۲۸ھ میں پیدا ہوئے ۔ آپ کا دیوان کئی بار چھپ چکا ہے اور مقبول عوام ہے ۔ اس میں زیادہ تر توحید و تصوف اور پند و نصائح کے اشعار ہیں ۔ فارسی عربی الفاظ کی کثرت کے باوجود کلام میں روانی ہے ، ثقل نہیں ۔ قرآن و حدیث اور تاریخ انبیاء و اولیاء کی تلمیحات اتنی زیادہ ہیں کہ ان کے علم کے بغیر اس کے کلام سے لطف اندوز ہونا مشکل ہے ۔ نمونہ کے طور پر ایک غزل کے کچھ اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو :

میں طوطے کی طرح شیرینی کھانے کا عادی تھا ،
(اب) کبک کی طرح تنگدستی میں میری خوراک ریت رہ گئی ہے ۔
اگر میں شہد کے چھتے کی جگہ میں ہاتھ ڈالوں (تو بھی)
سوائے ڈنکوں کے کچھ حاصل نہیں کر سکتا !
اگر آدمی تندرست ہو تو دنیا کھلی پڑی ہے (مگر) جو شخص
معذور ہو وہ پردیس اور مسافری میں کیا کرے گا !
باز اپنے آشیانہ میں نہیں پہچانا جاتا ،
(اس لیے) حافظ کی بھی الپوری میں قدر نہیں !

عبدالعظیم رانڑی زئی[۱]

سوات میں پیدا ہوئے۔ ۱۷۵۳ع/۱۱٦۷ھ میں دشمنوں نے ان کے والد کو قتل کر دیا اس لیے ان کی والدہ ان کو لے کر پشاور آ گئیں اور تہکال میں رہنے لگیں ۔ عبدالعظیم نے مذہبی تعلیم یہیں حاصل کی ۔ اور پھر تہکال بالا کے ایک عالم کی بیٹی سے شادی کر کے اسی کی مسجد میں پیش امام کے فرائض انجام دینے لگے ۔ خود کہتے ہیں کہ صحیح معنوں میں ان کی شاعری کا آغاز ان کے دو جوان بیٹوں کی وفات کے بعد ہوا ۔ اصل میں ایک تو جوان بیٹوں کی بے وقت موت نے ان کو زندگی سے بیزار کر دیا اور پھر ان کی جوان بیواؤں کو دیکھ کر ان کا دل کڑھتا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں درد و سوز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ۔ جگہ جگہ اپنے جوان بیٹوں کی موت پر خون کے آنسو بہاتے ہیں ۔

اس وقت سکھوں کے عہد میں ملک میں بدامنی اور بے اطمینانی تھی ۔ اس کا اثر بھی ان کی شاعری پر پڑا ایک جگہ کہتے ہیں :

---

(۱) دیوان و یادداشت ها ۔

اے عظیم بہتر یہ ہے کہ عزت کے ساتھ یہاں سے نکل جا !
(کیونکہ) آخرکار یہ سکھ پشاور (کے علاقہ) کو تہ و بالا کر دیں گے۔ (ترجمہ)

ایک اور جگہ بارکزئیوں کے حکمران کے متعلق کہتا ہے :

خدا نے پشاور (کے علاقہ) میں سکھوں کو اس لیے لا بسایا
کہ بارکزئیوں میں انصاف اور عدل نہیں رہا -

انقلاب زمانہ کے متعلق کہتے ہیں :-

عجب وقت آیا ہے اور عجب انقلابات ہیں !
عجب آسمان ہے اور عجیب اس کے دور ہیں !
چیلیں تو ادہر سرو کے درخت کی چوٹی پر بیٹھی ہیں
اور طوطے اس کے نیچے اپنی جان کو رو رہے ہیں -
اعلیٰ خاندان کی بیگمات تو گرد اور راکھ میں پڑی ہیں
اور لونڈیاں پشمینوں کے بستروں میں محو استراحت ہیں !

اپنے ایک شعر میں اپنے دیوان کا ذکر کیا ہے کہ ۱۸۳۷ع/۱۲۵۳ھ میں مکمل کیا ، کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طویل زندگی پائی تھی - دو اور شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہوں :

فلک نے فراق کی چھریاں تیار کیں
اور پھر ایکبارگی میرے دل و جگر میں بھونک دیں !
دو محبت والوں میں اب (وہ پہلی سی) محبت نہیں رہی ،
(نفسانفسی کا یہ عالم ہے کہ) دوست بھی ایک دوسرے کی طرف
پشت کیے چپ چاپ گزر جاتے ہیں ! (ترجمہ)

میاں نعیم؛

نام محمد نعیم گل ہے - عموماً "نعیم" بعض اوقات محمد نعیم اور کبھی کبھی "نعیمہ گل" ، تخلص کیا ہے - میاں محمد شعیب کے بیٹے تھے ، ان کے جد اعلیٰ شیخ متی غوزنی کے قریب ایک ڈھیری پر مدفون ہیں - اور "قلات بابا" کہلاتے ہیں - انہی کی نسبت سے ان کا خاندان متی زئی کہلاتا ہے - میاں نعیم کا سلسلہ نسب ساتویں پشت میں شیخ کبیر تک پہنچتا ہے جو قنوج میں مدفون ہیں - شیخ کبیر کے ایک بیٹے پشاور کے

(۱) تلخیص مقدمہ دیوان میاں نعیم از خیال بخاری (مطبوعہ پشتو اکیڈمی)

قریب ایک گاؤں ''پلوسی،، میں رہتے تھے - میاں نعیم یہیں پیدا ہوئے، عمر کا بیشتر حصہ یہیں گذارا ، آخر میں کسی عداوت کی بنا پر کابل اور پھر قندھار چلے گئے اور وہاں فوت ہوئے - قندھار کے قریب ''ناکورک،، نام گاؤں میں مدفون ہیں جہاں ان کے خاندان کے اور لوگ بھی آباد تھے -

ان کے ایک شعر سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنا دیوان ۱۸۱۴ع/۱۲۳۰ھ میں ختم کیا - نیز یہ کہ ان کی عمر اس وقت پچاس سال کی ہو گی - اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سال پیدائش ۱۷۶۶ع/۱۱۸۰ھ ہوگا - میاں نعیم اس دور کے بہترین شعرا میں سے ہیں - رحمان بابا کا رنگ ان کے کلام میں نمایاں ہے - انہوں نے آس پاس کی چیزوں اور حالات سے نئی نئی تشبیہیں پیدا کی ہیں - جیسے :

نعیم کے سادہ شعروں میں بھی رنگینی ہے ،
جیسے کھدر میں زربفت کا تھان لپٹا پڑا ہو !
نشیب سے پانی بلندی کی طرف کب بہہ سکتا ہے !
مگر فراق کے بند (ٹھہراؤ) کو میرے جگر نے
خون (کی سطح بلند کر کے)
اسے آنکھوں کے رستے بہا دیا !
نعیم کے دل کی مملکت کو
ترک محبوبوں نے خراب کر دیا ہے !
یا قزلباشوں کے دستے نے روہتاس کا قلعہ فتح کر لیا ہے - (ترجمہ)

آخر میں ایک شعر سے ہم اس کی خود داری کا اندازہ لگا سکتے ہیں :

میں عشق میں، بس اپنے محبوب،
ہی کی چاکری کرتا ہوں !
میں کسی سدوزئی شاہ زمان کا زیر بار نہیں ! (ترجمہ)

بیاض

علاقہ صوابی (ضلع مردان) کی گھدون (جدون) قوم سے تعلق رکھتا ہے - اس کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت عرصہ تک زیدہ (تحصیل صوابی) میں رہا - پھر وہاں کے خان اشرف خاں سے ناراض ہو کر کہیں دور (شاید دکن) چلا گیا - معلوم ہوتا

ہے کہ اس نے ترک وطن کسی الزام کی بنا پر کیا تھا - پردیس میں اپنے وطن کی یاد میں درد بھرے اشعار کہے ہیں - جیسے :

اپنے گھر کی قدر اس وقت معلوم ہوگی
جب کوئی اور بھی بیاض کی طرح پردیسی ہو جائے !
اے بیاض ! فراق نے بڑے بڑے پہاڑ
بیچ میں کھڑے کر لیے ہیں !
اب نہ دیکھنا تکنا نصیب میں ہے
اور نہ ہی ادھر جانا ہو سکتا ہے ! (ترجمہ)

بیاض چمکنی کے میاں عمرام کا بڑا معتقد ہے - اس نے اپنے اشعار میں اس عقیدت کا اظہار کیا ہے - ایک سعر ہے :

جونہی کوئی میاں عمر کا نام لیتا ہے ،
تو میں بیاض ، فوراً اس کی طرف رخ کرکے ،
سلام کے لیے ہاتھ ،
ماتھے پر رکھ دیتا ہوں ! (ترجمہ)

اس نے ایک مرثیہ میں ۱۷۸۵ء/۱۲۰۰ھ کا سال دیا ہے، اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ۱۷۸۵ء تک یقیناً زندہ تھا - معلوم نہیں اس وقت اس کی عمر کیا ہوگی مگر اپنے دوسرے اشعار میں اپنے بڑھاپے کی طرف اشارہ کیا ہے - بڑھاپے کی اسعار میں بھی زندہ دلی و رنگینی نمایاں ہے :

دانت گر گئے ہیں ، کمر خم ہے،
اور آنکھیں تاریک ہیں !
لیکن بیاض کو دیکھو کہ اب بھی
حسینوں کے پیچھے پھرتا ہے اور بوسہ کا سوال کرتا ہے !

راقم نے کسی قلمی نسخہ سے بیاض کی ایک غزل نقل کی تھی - یہ غزل یقیناً اس بیاض کی ہے - اس غزل کا ایک سعر دیکھئے :

میں نے دنیا کا بازار دیکھ لیا !
مجھے پسند نہ آیا !

(کیونکہ) میں نے جس کو بھی دیکھا
اسے غم ہی خریدتا ہوا پایا ! (ترجمہ)

احمد کلاچوی

ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے قصبہ کلاچی کے ایک عالم فاضل خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس علاقے کے بہترین شعرا میں سے ہے۔ دیوان چھپ چکا ہے ۔ جس میں اس نے سکھوں کے خلاف جنگوں اور شہدائے جنگ کے متعلق بڑی جوش بھری نظمیں لکھی ہیں۔ رزمیہ اور حماسی اشعار کے علاوہ عشقیہ چار بیتے اور کلاسیکی غزلیں بھی کہی ہیں ۔ وہ جب رنجیت سنگھ، دوست محمد خاں اور دوسرے مجاہدین کے ناموں کا ذکر کرتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تیرھویں صدی ہجری یعنی انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں اس کی شاعری اوجِ کمال پر تھی ۔ ایک غزل کے دو شعر بطور نمونۂ کلام ملاحظہ ہوں :

اس دنیا کے گلشن سے کبھی دل نہ لگاؤ !
دیکھو !
سب بلبل اس سے خالی ہاتھ ہی نکلے ہیں !
محبوبہ رزد یزدان ناک میں ڈالے سامنے آگئی ،
سونے کے تار اس نے
اس کے آر پار نکالے ہوئے ہیں ! (ترجمہ)

نجیب (ز = ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء)

اس شاعر کی زندگی کے حالات معلوم نہیں ۔ اس کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ راورٹی کو سوات میں ملا تھا ۔ جو اب برٹش میوزیم کے کتب خانہ کی زینت ہے۔ اس لیے اس نے اس کو یوسف زئی پٹھان بتایا ہے ۔ مگر اس کے دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پشاور کے قریب ایک قصبہ سربند کا رہنے والا تھا اور قبیلہ خلیل سے تعلق رکھتا تھا ۔ سربند کو اس نے جنتِ فردوس، فردوسِ خلد وغیرہ کے دلکش ناموں سے یاد کیا ہے ۔ پشاور کے متعلق اس کا ایک شعر ہے :

اے نجیب ! پشاور کی ہمسری کوئی شہر بھی نہیں کر سکتا ،
خواہ وہ شہر بیجاپور ہو ،
باگ نگر ہو یا قنوج ! (ترجمہ)

باایں ہمہ نجیب وقت کی پرآشوبی کا گلہ کیے بغیر نہ رہ سکا :

میں جو اس میں ہمیشہ غمگین رہتا ہوں ، تو
میرے لیے پشاور دشتِ کربلا بن گیا ہے ! (ترجمہ)

نجیب رحمان بابا کا بے حد معتقد ہے ۔ ان کے متعلق ایک شعر بھی کہا ہے :

تمام شاعروں کا سرِ حلقہ عبدالرحمٰن ہے !
اور میں (نجیب) تو اس کے شعر کا دامن پکڑے ہوئے ہوں ! (ترجمہ)

اس نے خٹک شعرا کامگار اور سکندر وغیرہ کے جواب میں غزلیں کہی ہیں ۔ کامگار کی شاعرانہ تعلی کے جواب میں کہی ہوئی ایک غزل میں ۱۷۶۳ع/۱۱۷۷ھ کا سال بھی دیا ہے ۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس سال تک یقیناً زندہ تھا ۔ اس نے اپنے ایک شعر میں دعویٰ کیا ہے کہ شعری نزاکت کے لحاظ سے پشاور (کے علاقہ) میں اس کی ہمسری کوئی نہیں کر سکتا ۔ اس کا یہ دعویٰ حقیقت سے کچھ زیادہ دور نہیں ۔ اس کے کلام میں پچھلے دور کے اساتذہ کا رنگ جھلکتا ہے ۔ اس کی جدتِ طبع کے اظہار کے لیے دو ایک شعر دیے جاتے ہیں :

یہ احمد شاہ ہے جو دہلی کے تخت پر بیٹھا ہوا ہے،
یا نجیب ہے ،
جو اپنے محبوب سے ہم کنار ہے !
اگر کوئی اپنے آپ کو عشق میں،
وہ (عاشق) کی طرح خوار و زار بھی بنا دے ،
تو بھی چنوڑ کی پدمنی اس کے ہاتھ نہیں آئے گی ! (ترجمہ)

نجیب کے دیوان کا مذکورہ نسخہ بھی ان نسخوں میں سے ہے جو صاحبزادہ محمدی کے لیے پشاور کے مشہور خطاط اور نقش‌کار گل محمد پشاوری نے لکھا تھا ۔

محمد رفیق(ز - ۱۸۸۵)

پشاور کے ایک مشہور قصبہ اکبر پورہ میں پیدا ہوئے ۔ آپ کا خاندان اپنے علم و فضل کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتا ہے ۔ اس میں بڑے بڑے علما و فضلا پیدا ہوئے ' جیسے مولانا عبدالغفران (اوائل تیرھویں صدی ہجری یعنی انیسویں صدی عیسوی) جو عربی اور فارسی کے علاوہ پشتو کے بھی بڑے ادیب و عالم تھے اور مولانا عبدالمستعان جو دوسرے علوم دینیہ کے علاوہ علمِ قرأت اور تجوید کے بڑے استاد تھے ۔

مولانا محمد رفیق بھی ایک بڑے عالم اور اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے ۔ ان کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کو عالمانہ لبادہ اتار کر ایک عاشق و شاعر بننا پڑا۔ کچھ عرصہ والئی کابل امیر عبدالرحمٰن کے دربار میں بھی رہے ۔ وہ ان کی علمی استعداد اور موزونیٔ طبع کی بڑی قدر کرتے تھے ۔ مگر مولانا گرد و پیش کے حالات کو نامساعد پاکر واپس وطن چلے آئے ۔ مردان کے خوانین (بیگم زری سرفراز، سابق ایم ۔ این ۔ اے کے دادا) نے ان کو اپنے بیٹے کا استاد مقرر کیا اور پھر وہیں سکونت پذیر ہو گئے ۔

عوام ان کو عیدین کے منظوم خطبوں کی وجہ سے جانتے ہیں ۔ ان کے دیوان الموسوم بہ 'دیوان شمس‌الفلک' کا ایک قلمی نسخہ اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانہ میں موجود ہے ۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصہ میں اخلاقِ حسنہ اور پند و موعظت کے اشعار ہیں اور 'پند نامۂ عطار' کا عطر و خلاصہ ہے ۔ دوسرا حصہ 'قصیدہ امالی' کی پشتو شرح ہے ۔ تیسرا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے ۔

ان کا ایک قابل قدر اور اہم ترین کارنامہ 'شاہنامہ فردوسی' کا پشتو منظوم ترجمہ ہے ۔ جو انہوں نے نواب دیر کی فرمائش پر کیا ہے ۔ عجیب اتفاق ہے کہ شاہنامہ کے اس مترجم کا انجام بھی کچھ ایسا ہی ہوا جو فردوسی کا ہوا تھا ۔ کہتے ہیں نواب دیر نے اپنی فرمائش کے ساتھ اسے ایک روپیہ فی شعر انعام دینے کا وعدہ کیا تھا جب ترجمہ مکمل ہو گیا اور انعام لینے کا وقت آیا تو آپ فوت ہو گئے ۔ مولانا رفیق کے اس گرانقدر ترجمہ کی صرف ایک ادھوری سی جلد پشتو اکیڈیمی نے پیدا کی ہے ۔ انہوں نے علم تجوید کے بیان میں بھی کسی عربی کی کتاب کا پشتو مثنوی میں ترجمہ کیا ہے ۔ ۱۸۸۵ء تک یقیناً زندہ تھے ۔

نمونۂ کلام :

اے گلاب تیرے سبز دوشالے پر واری جاؤں !
اور تیرے دیدار پر سو آفتاب قربان کر دوں !
اے محمد رفیق ! اگر محبوب کو بے حجاب دیکھنا چاہتا ہے!
تو صبح کی شکر خوابی سے بے نیاز ہو جا ! (ترجمہ)

عبد الحلی اخولزادہ (م ۔ ۱۹۴۴ء)

علاقہ پشین کے ایک گاؤں ''خانوزئی،، میں پیدا ہوئے ۔ سال پیدائش جعفر

اچکزئی[1] نے ۱۸۸۱ع/۱۲۹۹ھ اور ہمیش خلیل[2] نے ۱۸۷۲ع/۱۲۸۹ھ بتایا ہے - تحصیل علم اپنے علاقہ میں کی - پشتو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع رواں رکھتے تھے - آپ کے کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ 'شاخ گل' کے نام سے کوئٹہ سے شائع ہو چکا ہے - جوانی کے دن قندھار میں گذارے - اپنی خوش الحانی اور عشقیہ شاعری کی وجہ سے وہاں بڑی شہرت و مقبولیت حاصل کی - عبدالصمد خاں اچکزئی[3] کا کہنا ہے کہ انہوں نے میرزا صاحب کے دیوان کا پشتو میں ترجمہ بھی شروع کیا تھا - عبدالعلی کاکڑ قبیلے کا بہترین شاعر ہے اس کے متعلق مولانا عبدالسلام اچکزئی نے کہا ہے[4] :

خوشحال تول میں سارے خٹکوں پر بھاری ہے ،
اسی طرح عبدالعلی کاکڑ قبیلے کے لیے کافی ہے ! (ترجمہ)

ایک اعلیٰ پایہ کے ساعر ہونے کے علاوہ ایک اچھے عالم بھی تھے - ۱۹۳۰ع/۱۳۴۹ھ میں قلات میں وزیر تعلیمات مقرر کیے گئے - مگر بعد میں اس عہدہ کو چھوڑ کر کوئٹہ میں طبابت کا کام شروع کر دیا - زندگی کے آخری ایام میں اپنے گاؤں چلے گئے اور وہیں ۱۹۴۴ع/۱۳۶۴ھ میں وفات پائی -

آپ کے کلام کی بڑی خوبی غنائیت ہے - اس وجہ سے آپ کے کلام کو اپنے علاقہ میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی - نمونہ کلام :

جو ذرا سی بات پر بھی من جاتا ہے ،
وہ میں ہوں !
اور جو بغیر کسی وجہ سے بھی ناراض ہے ،
وہ نہ محبوب ہے '
جس کا دل دانی سے بھی نرم ہے ،
وہ میں ہوں !
اور جن کا دل سنگ مرمر ہے ،
وہ میرا محبوب ہے !
جو اس کی دید کے سہارے زندہ ہے ،

---

(۱) عبدالروف بینوا' اوسنی لیکوال' جلد دوم' مطبوعہ کابل -
(۲) ہمیش خلیل' پستانہ لیکوال -
(۳) دیباچہ شاخ گل -
(۴) عبدالرؤف بینوا ' اوسنی لیکوال جلد دوم' مطبوعہ کابل -

وہ میں ہوں !
جو میری موت سے خوش ہوتا ہے ،
وہ یہ محبوب ہے ! (ترجمہ)

اس کتاب کی تنگئی دامن کے پیش نظر ہم غزل گو صاحب دیوان شعرا کا ذکر یہاں ختم کرتے ہیں - قارئین کرام اشعار مذکورہ بالا سے بھی اس وقت کی غزل کے متعلق کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں - ویسے اس فہرست میں بہت سے دوسرے صاحب دیوان شعرا کے نام بڑھائے جا سکتے ہیں جن کے دواوین اور قلمی مجموعے متفرق کتب خانوں وغیرہ میں موجود ہیں - یا ان کی کچھ غزلیں دوسرے قلمی نسخوں کے حواشی وغیرہ پر دی گئی ہیں - جیسے مساخی' اکبر ، عمر دین عمر ، مجیب ، امیر ، رحمت داوی ، حضرت شاہ ، کاظم ، جمال ، رشید ، منصور ، کامیر ، مطیع اللہ ، حافظ محمد ، ملا امیر ، احمد جی ، میر عبداللہ وغیرہ - کچھ شعرا ایسے بھی ہیں جن کا ذکر دوسرے مشہور شعرا نے اپنے کلام میں کیا ہے - مگر ان کا کلام اب تک نہیں مل سکا -

۲ - حافظ رحمت خان اور ان کا گھرانہ

حافظ رحمت خان قبیلہ بھڑویچ سے تعلق رکھتے ہیں اور حضرت شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین معروف "کوٹہ بابا" کی اولاد سے ہیں - ان کے اجداد پہلے قبیلہ بھڑویچ کے وسط شوراوک اور پشین کے علاقہ میں رہتے تھے - کوٹہ بابا بہت سے بھڑویچ لوگوں کے ساتھ علاقہ یوسف زئی کی طرف چلے آئے اور چھچھ ہزارہ اور مسمہ (علاقہ مندنڑ یوسف زئی) میں رہنے لگے - قبیلہ مندنڑ کے ساتھ رشتے ناطے قائم ہوئے - اس لیے بعض لوگ حافظ رحمت خاں کو مندنڑ یوسف زئی خیال کرتے ہیں - آپ روہیلکھنڈ گئے' جہاں یوسف زئیوں نے اپنی ریاست قائم کر رکھی تھی - بعد میں یہ ریاست حافظ رحمت خاں کے قبضہ میں آ گئی - آپ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ مرہٹوں کے خلاف جہاد میں شریک رہے اور ۱۷۷۴ء میں انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے -

حافظ رحمت خاں کو علم و ادب سے خاص لگاؤ تھا - خود بھی ایک بڑے عالم اور فارسی اور پشتو دونوں زبانوں کے شاعر و ادیب تھے - ان کے دیوان تو نہیں ملے مگر ڈاکٹر میسٹر کا کہنا ہے کہ ان کو رامپور میں ایک قلمی نسخہ دیا گیا جس میں حافظ رحمت خاں اور کچھ دوسرے شعرا کا کلام تھا - برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں عبدالقادر خان خٹک کے دیوان میں ان کی ایک مخمس بھی موجود ہے' - انہوں

---

(۱) بلو مہارٹ (فہرست و میکنزی) کتب زبان پشتو در کتب خانہ ہا برطانیہ)

نے خود 'خلاصہ الانساب' نام کتاب لکھی - اور یوسفزئی پٹھانوں کی ایک تاریخ لکھوائی جو ان کے نام سے 'تواریخ رحمت خانی' کہلاتی ہے - یہ تاریخ پسر معظم شاہ ساکن پسر سباک (ضلع پشاور) نے لکھی - یہ کتاب ہے تو پشتو میں لیکن پشتو عبارت کے بیچ میں فارسی کے جملے بھی آ جاتے ہیں - اگر اس میں فارسی کی یہ آمیزش نہ ہوتی تو پشتو نثر کا ایک قابل قدر نمونہ قرار دی جا سکتی تھی -

حافظ رحمت خاں کی شعر و ادب اور تاریخ سے دلچسپی کا اثر ان کی اولاد پر بھی رہا - چنانچہ ان کے بیٹے اللہ یار خاں نے وہ نسخہ تلاش کیا جو 'تواریخ رحمت خانی' کا ماخذ تھا - جسے وہ شیخ میر داد متی زئی سے منسوب کرتا ہے' اس نے اس کا ترجمہ فارسی میں 'خلاصۃ الا عجاب' کے نام سے کیا -

نواب محبت خاں نے (جن کا ذکر گذر چکا ہے) جو صاحب دیوان شاعر بھی تھے' پشتو گرامر کی کتاب ۱۸۱۴ع/۱۲۶۹ھ میں لکھی اور ایک لغت فارسی میں مرتب کی - یہ کتاب انہوں نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لکھنؤ میں سر جارج بارلو ایکٹنگ گورنر جنرل کے لیے لکھی تھی - اس کا نام 'ریاض المحبت' ہے - ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں موجود ہے - نواب محبت خاں کے چھوٹے بھائی اللہ یار خاں نے 'عجائب اللغات' کے نام سے ایک اور کتاب لکھی - اس میں وہ لکھتا ہے کہ نواب محبت خاں نے فارسی' ہندوستانی اور پشتو میں تین دیوان چھوڑے ہیں' - اس کے علاوہ اس نے ایک مثنوی 'اسرار و محبت' بھی لکھی تھی - اللہ یار خاں کی 'عجائب اللغات' راورٹی کو ملی تھی جو اس نے برٹش میوزیم کو دیدی - اس نے ۱۸۳۲ع/۱۲۴۸ع میں وفات پائی - حافظ رحمت خاں کا ایک اور بیٹا نواب مستجاب خاں بھی پشتو کا شاعر تھا - یہ بھی اپنے والد اور بھائیوں کی طرح ایک عالم اور بیدار مغز شخص تھا - عربی اور فارسی زبانوں میں بھی کافی عبور رکھتا تھا - اس نے 'گلستان رحمت' کے نام سے رحمت خاں اور ہند کے دوسرے پٹھانوں کی تاریخ لکھی ہے - سعادت یار خاں بھی ، جو حافظ رحمت خاں کا پوتا اور محمد یار خاں کا بیٹا تھا ، ایک اچھا ادیب اور شاعر تھا - اس نے 'گل رحمت' کے نام سے تاریخ کی ایک کتاب لکھی - حافظ رحمت خاں کے ایک اور

---

(۱) پشاور کے قریب ایک گاؤں ہلوسٹی میں میاں نعیم کے خاندان میں تاریخ کا ایک قدیم قلمی نسخہ موجود ہے - غالباً اللہ یار خاں نے اسی نسخہ سے استفادہ کیا ہے -

(۲) فہرست پلو مہارٹ

ہوتے نیاز احمد ہوش (جو ۱۸۳۴ء/۱۲۵۰ھ کے لگ بھگ زندہ تھا) نے روہیلکھنڈ کے پٹھانوں کی تاریخ لکھی ہے۔

مذکورہ تمام کتابیں برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ان کی نقلیں پشتو اکیڈیمی پشاور نے حاصل کی ہیں۔ بلومہارٹ اور ڈاکٹر مکنزی کی فہرست سے ان کتابوں کے علاوہ کچھ اور کتابوں کا پتہ بھی چلتا ہے۔ جیسے 'آمد نامہ افغانی' (پشتو گرامر اور فرہنگ) کتاب 'خیالاتِ زمانی درلفاب افغانی' وغیرہ۔

۳۔ عوامی شاعری

پٹھانوں کی آج کی زندگی اور پچاس ساٹھ سال پہلے کی زندگی میں اب نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ دوسری باتوں کے علاوہ اب ان کا حجرہ بھی وہ نہیں رہا جو نصف صدی پہلے ہوا کرتا تھا۔ اس وقت چھوٹے گاؤں میں کم از کم ایک اور بڑے قصبوں کے ہر محلہ میں ایک حجرہ ہوا کرتا تھا۔ جو اس محلے یا گاؤں والوں کے لیے ایک قسم کا کلب ہوتا اور مہمان خانہ کا کام بھی دیتا تھا۔ یہ حجرہ عموماً ایک (یا زیادہ) بڑے کمرہ اور ایک وسیع کھلے صحن پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ شام کے بعد دن بھر کی محنت اور کام سے تھکے ہارے کسان اور لوگ یہاں جمع ہوتے۔ مختلف اُمور پر تبادلہ خیال ہوتا۔ باہر سے آنے والے نئی تازی خبریں سناتے۔ عام طور پر ہر حجرہ میں ایک آدھ ایسا شخص ضرور ہوتا جسے بہت سی دلچسپ کہانیاں یاد ہوتیں۔ اس لیے جب کہانیوں کا دور چلتا تو وہ اپنے مخصوص انداز میں 'بہرام گل اندامہ' 'سیف‌الملک' اور 'بدری جمالہ' (بدیع الجمال) 'آدم درخانی' 'رابیافتح خان' 'موسیٰ خان کلمکئی' وغیرہ مقبول قصوں میں سے کوئی قصہ سنانے لگتا۔

ابتدا میں حجروں اور محفلوں میں کہے جانے والے یہ قصے نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہوتے۔ عام قصہ تو نثر میں سنایا جاتا، لیکن بعض اہم موقعوں پر ڈرامائی انداز میں قصے کے افراد کے مکالمے پشتو شاعری کی ایک مخصوص صنف کی سکل میں پیش کیے جاتے۔ پشتو شاعری کی اس صنف کو "غر" یا ناره، (نعرہ) کہتے ہیں۔ یہ غر یا نارے عموماً ساز کے ساتھ گائے جاتے۔ ایک خاص قسم کا بنا ہوا بڑا گھڑا (جو طبلے کا کام دیتا تھا) تقریباً ہر حجرے میں موجود ہوتا اس کے ساتھ رباب (یا ستار) بھی اکثر حجرے میں کسی نہ کسی کے پاس ہوتا۔ کبھی کبھی تنبل (دف) بھی ہوتا۔ جس وقت کہانی کے دوران میں اس غر یا نارہ کا موقع آتا تو طبلے کی بجائے اس گھڑے پر تھاپ پڑتی اور رباب (یا ستار) والے کی انگلیاں رباب یا ستار کے تاروں پر رقص کرنے لگتیں اور کہانی

سنانے والا کان پر ہاتھ دھر کر اونچی تان میں اس مکالمہ کو ادا کرتا ۔ اس طرح کہانی میں ایک خاص قسم کا لطف ـــ ایک خاص اثر بلکہ جادو سا پیدا ہو جاتا ۔

کہانوں کا دور تو کبھی کبھی ہوتا مگر اکثر ساز و آواز کی محفلیں جمتیں ۔ اس میں گمڑے ، رباب (اور کبھی کبھی دف) کے ماہر اور پکی عمر کے خوش آواز شوقیہ گانے والے حصہ لیے ۔ بچے بالے اور غیر شادی سدہ نوجوان صرف ایک طرف بیٹھے سن ہی سکتے تھے ۔ ان شوقیہ گانے والوں کو بے شمار ٹپے[1] ، چاربیتے ، بدلے اور رباعیاں[2] یاد ہوتیں ۔ انیسویں صدی کے آخری نصف اور بیسویں صدی کے آغاز میں پشتو شاعری کی یہ اصناف یعنی ٹپے ، چار بیتے اور بدلے اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئے ۔ کیونکہ ایک طرف تو ملک میں سیاسی انتشار ، بدامنی اور حالات کی ابتری کی وجہ سے دل کے لیے وقتی اطمینان کا سہارا لے دے کر یہی شب کی محفلیں رہ گئی تھیں ، جہاں بادشاہ گردی کے اس دور کے حکام کی نت نئی زیادتیوں اور مظالم کے ذکر اذکار کے بعد کچھ دیر کے لیے ان تفکرات کو ساز و آواز میں فراموش کرنے یا پشتو کے محاورہ کے مطابق " غم غلط کرنے ،، کی کوشش کی جاتی ! دوسری طرف سکھوں اور بعد میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے دنوں میں عوام میں جہاد اور قربانی کے جذبات پورے جوش پر آجاتے ۔ اس وقت عوامی شعرا ان لڑنے والے جیالوں کی بہادری اور شجاعت کے کارناموں کی تعریف ، مسلّی غداروں کی مذمت یا عوام کے جذبۂ جہاد کو ابھارنے کے لیے چار بیتے اور بدلے وغیرہ کہتے اور ان گانے والوں کے سپرد کر دیتے ۔ پھر یہ چار بیتے وغیرہ گاؤں گاؤں قریہ قریہ حجروں میں گائے جاتے ۔ یہی شعرا پٹھان عورتوں کے لیے بھی اس قسم کے سندرے ، اور لوبھے (گیت) لکھتے ۔ جب ان کو سادی بیاہ وغیرہ کے موقعوں پر گانے کی فرصت و اجازت ملتی تو وہ مل کر ان کو تنبل (دف) کے ساتھ گاتیں !

مگر جب حالات کچھ پرسکون ہوتے تو جنگی اور حماسی بدلے اور چاربیتے اور گیت ، بزمی ، عشقیہ یا داستانی رنگ اختیار کر لیتے ۔ جس طرح ہر حجرہ میں چند ایک خوش گلو شوقیہ گانے والے ضرور ہوتے اسی طرح تقریباً ہر بڑے گاؤں میں دو ایک عوامی شاعر بھی ضرور ہوتے ۔ جو نت نئے بدلے چار بیتے کہتے ۔ عوامی شعرا میں (جن کو پٹھان اخون یا اخوند کہتے تھے) بعض تو ہوتے ہی ان پڑھ ۔ مگر ویسے بھی یہ سارا معاملہ زبانی یادداشت پر چلتا ۔ شاعر بھی اپنا کلام یاد رکھتے اورگانے والے بھی ۔ گانے والوں میں خصوصیت کے ساتھ پیشہ ور گوئیوں جن کو پٹھان "مجلسی" کہتے ہیں، کی یہ کوشش

---

(۱) پشتو شاعری کی ایک مخصوص اور مقبول ترین صنف ۔ اسے لنڈی اور مصرع بھی کہتے ہیں
(۲) عوام کے محاورہ میں ایک خاص وزن کی پشتو غزل کو کہتے ہیں ۔

رہتی کہ ان کو زیادہ سے زیادہ اور اچھی سے اچھی چیزیں یاد ہوں - کیونکہ ان کی شہرت اور بڑائی کی ایک وجہ یہ بھی ہوا کرتی تھی کہ ان کو کتنے استادوں کا اور کتنا کلام ازبر ہے - پھر ان کی یہ کوشش بھی رہتی کہ جو چیزیں انہوں نے حاصل کی ہیں دوسروں کے پاس نہ پہنچنے پائیں - اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان شاعروں اور گانے والوں کی موت کے بعد اکثر و بیشتر چار بتیے اور بدلے بھی فراموش ہو جاتے - یہی وجہ ہے کہ ان سینکڑوں شعرا میں سے بہت کم کے نام اور ان کا کلام باقی رہا ہے -

اصل میں ان بدلوں چار بتیوں وغیرہ کا بھی ایک خاص دور ہوتا ہے - جب تک کسی واقعہ یا حادثہ کی یاد دلوں کو بھاتی رہتی ہے ، اس واقعہ یا حادثہ کے متعلق کہے ہوئے بدلے اور چاربتیے سے بھی دلچسپی قائم رہتی ہے - نئے نئے واقعات اور المناک حادثات پیش آنے پر نئے نئے بدلے چاربتیے کہے جاتے ہیں - جو پرانے بدلوں چاربتیوں وغیرہ کو ماضی کی تاریکیوں میں دھکیل دیتے ہیں - بیسویں صدی کے ربع اول کے بعد پشتو شاعری کا رخ بھی جدید اصناف کی طرف پھر جانے کی وجہ سے عوامی شاعروں کا کلام سینوں میں محفوظ رکھنے کا سلسلہ تقریباً ختم ہو کر رہ گیا - اگر یہ چار بتیے بدلے اور گیت اپنے اپنے وقت میں قلم بند کیے گئے ہوتے ، تو آج ان کے صرف انتخابات ہی کی کئی کئی جلدیں موجود ہوتیں - پشتو اکیڈیمی نے اس قسم کے چاربتیوں کی جمع کرنے کی کوشش شروع کی ہے - اور ان مختلف موضوعات پر بیسیوں عوامی شعرا کے چھ سو سے زیادہ چار بتیے جمع کیے جا چکے ہیں -

ہم ذیل میں صرف چند استادوں کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے عوامی شاعری میں کمال حاصل کیا اور ملک بھر میں مشہور و مقبول رہے -

نورالدین

عوام اس کو "نور دین استاد" کے نام سے جانتے ہیں - بڑا قادرالکلام شاعر تھا - ڈار مسٹیٹر کے بیان کے مطابق پیر پیائی (ضلع پشاور) کا رہنے والا تھا - دوسرے نامور شعرا سے فی البدیہہ اشعار کا مقابلہ کرکے اس نے اپنی استادی کا سکہ منوا لیا تھا - اس کے بہت سے شاگرد تھے - زمانۂ حیات ۱۸۲۴ع/۱۲۴۰ھ کے بعد خیال کیا جاتا ہے -

نوروز

یہ بھی نور دین استاد کی طرح قادرالکلام شاعر تھا - 'بہار نوروزی' نام کتاب

میں اس کے چار بیتے وغیرہ چھپ چکے ہیں - اس مجموعہ میں نورالدین استاد اور کچھ اور سعرا کا کلام بھی موجود ہے - نوروز کالو خاں (ضلع مردان) کا رہنے والا تھا - گویا بھی تھا اور سازندہ بھی اور فنِ موسیقی کا ماہر بھی - اس نے پشتو کے عوامی گیتوں میں ہندی موسیقی کے اوزان بھی شامل کیے - کچھ غزلیں بھی اس کتاب میں دی گئی ہیں -

محمد دین

نوسہرہ (ضلع پشاور) کا رہنے والا تھا - یہ بھی چاربیتوں کا استاد مانا گیا ہے - نمونۂ کلام 'بہار نوروزی' میں موجود ہے - عموماً عشقیہ اشعار اور چار بیتے لکھے ہیں نورالدین اور نورور کی طرح اس کے شاگردوں کا بھی ایک خاص حلقہ تھا -

ملا مقصود

پشاور کے قریب ایک گاؤں ''ککہ ولہ'' کا رہنے والا تھا - خلیل قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا ایک عالم شخص تھا - صرف شعر و شاعری میں مصروف رہا - اس کے بھی شاگردوں کا ایک حلقہ تھا - امیر عبدالرحمٰن کا معاصر تھا - ڈارمسٹیٹر نے اسے ''مقصود جان'' لکھا ہے -

لیونے محمد جی

یعنی دیوانہ محمد جی - پکھلی ضلع ہزارہ کا رہنے والا تھا - اس کا کلام سادہ مگر بڑا پرجوش ہے - کبھی کبھی دیوانگی کا اثر زیادہ ہو جاتا - اس وجہ سے کئی دفعہ ایبٹ آباد کی جیل میں بند رکھا گیا - ڈار مسٹیٹر نے اسے ایبٹ آباد میں دیکھا تھا(۱) -

حافظ عبدالعظیم (م - ۱۹۰۳ع/۱۳۲۱ھ)

محمد روزی کا بیٹا اور بھمبر قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا - ڈیرہ اسمعیل خاں کے شہر کلاچی میں پیدا ہوا - ایک اچھا عالم تھا - پچیس سال کی عمر میں دونوں آنکھوں سے معذور ہو گیا - ستر سال کی عمر میں ۱۹۰۳ع/۱۳۲۱ھ میں وفات پائی(۲) -

حافظ عظیم کی شہرت کا باعث اس کے چار بتیے تھے - یہ اس کی زندگی ہی میں بڑے مقبول ہوئے - اس کلام میں حمد و نعت ، پند و موعظت ، عشقیہ ، مدحیہ اور ہزلیہ سبھی کچھ ہے - قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس نے پشتو کے مقبول قصوں جیسے 'آدم در خانئی'، 'جلوت محبوبا'، وغیرہ کو مختصر چار بتیوں میں بیان کیا ہے - اس نے ڈیرہ جاتی زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہے -

---

(۱) دپښتخواہ شعر ہار و بہار

(۲) قلمی دیوان (کتب خانہ پستو اکیڈیمی)

اس کے شاگردوں اور پیروؤں میں محمد امین شاعر ، ملا عبدالکریم ، کنڈی شاعر حافظ شیر محمد اور کریم داد خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

۴ ۔ قصہ گو شعرا

ہم نے اوپر عوامی شاعری کے بیان میں اشارہ کیا تھا کہ یہ دور عوامی گیتوں (چار بتیوں بدلوں اور سندروں وغیرہ) اور قصے کہانیوں کا دور ہے ۔ ابتدا میں جیسا کہ بیان ہوا کہانیاں عموماً نثر میں کہی جاتی تھیں اور ان کی دلچسپی کو چار چاند لگانے کے لیے پشتو شاعری کی مخصوص صنفِ غر یا ناره سے کام لیا جاتا تھا ۔ مگر اس دور میں (خصوصاً اس کے آخری حصہ میں) منظوم کہانیاں لکھی جانے لگیں ۔ کچھ منظوم قصے صدر خان خٹک ، حمید مہمند اور کچھ دوسرے شعرا نے بھی لکھے تھے ۔مگر ان کے دواوین کی طرح ان کے قصوں میں دلچسپی لینے والوں کی تعداد بہت کم تھی ۔ البتہ فیاض (مغل دور کا شاعر) کا قصہ 'بہرام و گل اندامہ' عوام میں بہت مقبول تھا اس کی وجہ بھی شاید فیاض خود ہی تھا ۔ جو ایک اچھا گویا ، سازندہ اور سیلانی شخص تھا ۔ مختلف شہروں اور قصبوں میں پھر کر اپنی اس کہانی سے محفلوں کو گرماتا پھرتا تھا ۔ بہر کیف اس دور میں بے شمار (منظوم) قصے لکھے گئے ۔ ان کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔ ایک وہ قصے اور داستانیں جو فارسی مثنوی کی طرز پر کہے گئے ۔ یہ عموماً پڑھے جاتے تھے ۔ گائے کم جاتے تھے ۔ دوسرے پشتو کی عوامی شاعری کی مشہور و مقبول صنف ''بدلہ'' کی طرز پر ہیں۔ بدلہ میں قصہ کے جدا جدا واقعات (ابواب) کو جدا جدا حصوں (بندوں) میں بیان کیا جاتا ہے ۔ ہر بند کا اپنا قافیہ و ردیف ہوتا ہے ۔ بند کے آخر میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے اور پھر دوسرا بند شروع ہوتا ہے جس میں کہانی کا دوسرا واقعہ بیان کیا جاتا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی قافیہ و ردیف بھی بدل جاتے ہیں ۔ میرے نزدیک اسی وجہ سے اس کو ''بدلہ'' کہتے ہیں[1] ۔

قصہ نویسی کا چرچا خصوصیت کے ساتھ اس وقت ہوا جب ملک میں چھاپہ خانے قائم ہو گئے ۔ حنائی کاغذ پر چھپے ہوئے سستے قصے بہت جلد فروخت ہو جاتے ۔ اس لیے کتب فروشوں اور پبلشروں نے بھی اس کی طرف خاص توجہ دی ۔ مذہبی کتابوں کی مانگ نے ان کا تعلق پہلے ہی اہلِ قلم علماء سے قائم کر دیا تھا ۔ چنانچہ انہوں نے ان ہی میں سے شاعر اصحاب سے فرمائش کر کے قصے لکھوائے ۔ ان میں مولوی احمد (ساکن تنگی) ملا نعمت اللہ ، سید بو علی شاہ ، ملا احمد جان اور گل احمد کے نام خاص طور سے

---

(۱) پشتو کی بعض عوامی اصناف شعر جیسے لوبہ، سندرہ، نیمہ کہی وغیرہ کی طرح ''بدلہ'' کا مفہوم بھی مختلف علاقوں میں مختلف ہے ۔ جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ۔

قابل ذکر ہیں ۔ ان میں مولوی احمد کا نام ہم نثر نگاروں کے سلسلہ میں بیان کریں گے ۔ باقی کا مختصر ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے ۔

ملا نعمت اللہ

مولوی عطاء اللہ کے بیٹے اور نوسہرہ (ضلع پشاور) کے رہنے والے تھے ۔ ایک بڑے عالم فاضل شخص تھے ۔ مذہبی اور اخلاق (منظوم) کتابیں لکھنے لکھانے کے سلسلے میں پشاور کے کتب فروشوں سے بڑا تعلق تھا اور غالباً انہی کی فرمائش پر قصے لکھنا شروع کیے ۔ بعد میں ان کو قصہ نویسی کے فن میں ایسا ید طولیٰ حاصل ہو گیا کہ بقول صدیق اللہ رستین' (پښتو ټولنه کابل) اگر ان کو پشتو کا فردوسی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا ۔ حقیقت یہ ہے کہ گو پشتو زبان میں بہت اچھے اچھے شعرا نے قصے لکھے ، مگر مولانا نعمت اللہ نے اس فن کو بہت بلند مقام پر پہنچا دیا ۔ زبان میں بلا کی سلاست اور روانی ہے ۔ طرزِ بیان بہت شیریں اور دلکش ہے ۔

ان کے قصوں میں 'لیلیٰ مجنوں' 'نیمبولا تیمبولا' 'فتح خان رابعہ' 'موسیٰ خان گلمکئی' ، 'حاتم طائی' 'جنگنامہ حضرت علی' 'شاہنامہ'[2] اور 'الف لیلیٰ' خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

'الف لیلیٰ' کا منظوم ترجمہ 'خزائن القصص' کے نام سے عمر زئی (ضلع پشاور) کے ایک اور عالم فاضل شخص سید حسنی اللہ نے ۱۸۸۷ء میں کیا تھا ۔ یہ ایک ضخیم اور قیمتی قلمی نسخہ ہے ۔ جو پشتو اکیڈمی میں محفوظ ہے ۔ یہ ترجمہ ادبی لحاظ سے بہت بلند معیار کا ہے اور نعمت اللہ کے قصہ کے مقابلہ میں زیادہ مکمل ہے ۔ مگر بحر نسبتاً طویل ہے ۔ گا کر یا زیادہ ترنم سے سنانے کے لیے زیادہ موزوں نہیں ۔

سید بوعلی شاہ (۱۸۳۴ء ۔ ۱۹۳۰ء)

ایک عالمانہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ والد کا نام سید امیرالدین تھا ۔ ضلع پشاور کے ایک چھوٹے سے گاؤں سوٹ مارہ (جو اب اسلام آباد کہلاتا ہے) میں ۱۸۳۴ءمیں پیدا ہوئے ۔ ان کے علوم دین کے استاد قاضی شاہ فاضل بھی شاعر تھے ۔ آپ کے چھپے ہوئے دیوان میں ان کا کچھ کلام بھی دیا گیا ہے ۔ علاقہ کے خوانین آپ کی بڑی قدر کیا کرتے تھے ۔ آپ کے شاگردوں میں ملا احمد جان نے پشتو قصہ نویسی میں بڑی شہرت پائی ۔

---

(۱) تاریخ ادب

(۲) یہ شاہنامہ کی تلخیص سی ہے ۔ شاہنامہ کا بہترین ترجمہ مولانا محمد رفیق نے کیا ہے جس کا ذکر گزر چکا ہے ۔

سید صاحب صاحبِ دیوان شاعر ہیں ۔ مگر آپ کی شہرت و مقبولیت کی وجہ آپ کی منظوم مذہبی کتابیں اور قصے ہیں ۔ مذہبی کتابوں میں 'جنگنامہ حسنین' 'در محفل' 'وفات نامہ' 'مناقبِ غوث الاعظم' ' جنگنامہ شیرعلیؓ' وغیرہ اور قصوں میں 'آدم در خانئی' 'قصہ میر حاتم' 'قصہ دل افروزہ' بہت مشہور ہیں ۔ یہ سب کتابیں آپ کی زندگی میں ہی چھپ کر مقبول عوام ہو چکی تھیں ۔ آپ نے ۱۹۳۰ء میں وفات پائی ۔ آپ کا ایک بیٹا فضل باقی بھی شاعر تھا ۔ جس کی دو ایک غزلیں آپ کے دیوان میں شامل ہیں ۔

ملا احمد جان (ز ۔ ۱۹۱۳)

ایک پر گو شاعر تھا ۔ بہت سی کتابوں کا مصنف و مترجم تھا ، جن میں زیادہ تر قصے ہیں ۔ ایک اچھا شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھا عالم بھی تھا ۔ مٹہ (ضلع پشاور) کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں '' مردانہ '' کا رہنے والا تھا ۔ اس کے قصوں میں 'یوسف زلیخا' 'ورقہ گل شاہ' 'شیرویہ' 'شہزادہ ممتاز' 'فلک ناز' 'بہرام گور' 'چترے' 'رستم داستان' 'سکندر نامہ' 'بہی دانش' 'وفادار معشوقہ' اور 'طوطی نامہ' وغیرہ چھپ چکے ہیں ۔ رشتین نے اسے ملا نعمت اللہ کے مکتب کا پیرو بتایا ہے[1] ۔ مگر سید بو علی شاہ کے دیوان میں اسے سید صاحب کا شاگرد خاص بتایا گیا ہے ۔ ۱۹۱۳ء/۱۳۳۲ھ تک یقیناً زندہ تھا[2] ۔

گل احمد

پشاور کے قریب تیراہی نام ایک گاؤں میں پیدا ہوا ۔ خلیل قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے ۔ اپنی عمر کا بیشتر حصہ پجگی میں گزارا ۔ اس لیے اس کو پجگی کا احمد اور احمد تیراہی بھی کہتے ہیں ۔ قصہ گو شعرا میں اس کا نام مذکورہ استادوں کے بعد آتا ہے ۔ اس کے مشہور قصوں میں 'رتہدم' 'قصہ طوطا مینا' اور 'قصہ جمجمہ' قابل ذکر ہیں ۔ وہ ایک اچھا عالم بھی تھا ۔ اس کی مذہبی کتابوں میں 'الیس الواعظین' اور 'قصص الانبیا ' کا ترجمہ بہت مشہور ہیں ۔ خصوصاً مؤخرالذکر خواتین میں بہت مقبول ہے ۔

۵۔ نثر نگار

پشتو نثر میں سب سے پہلے جو کتاب چھپی وہ غالباً راورٹی کی ' قصی دا لیپ

---

(۱) تاریخ ادب

(۲) '' شیرویہ '' کا سال تحریر ۔

الحکیم، تھی'۔ یہ ایسوز فیلز کا پشتو ترجمہ ہے۔ اگرچہ راورٹی نے نثر کے انداز میں اسے بھی (کسی اہل زبان کی مدد سے) آسان سلیس اور بامحاورہ زبان میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر پہلی کاوش جس کو ہم پشتو نثر کی ترقی کی راہ میں بجاطور پر سنگ میل کہہ سکتے ہیں وہ مولوی احمد کی 'گنج پښتو' ہے۔ اس سے پہلے پشتو نثر عموماً فارسی انشا کی طرز پر مقفیٰ اور مسجع طرز میں لکھی جاتی تھی۔ گو کچھ کتابیں متقدمین نے بھی اچھی نثر میں لکھیں۔ مگر وہ اس دور میں ناپید تھیں اور اب تک عوام کی دسترس سے بالکل باہر ہیں۔

مولوی احمد نے یہ کتاب افغان مشن کے پادری ہیوز (دونوں کا ذکر آگے آتا ہے) کے لیے لکھی۔ جو اس کی ضخیم کتاب 'کلید افغانی' میں ایک حصہ کے طور پر شامل کی گئی۔ اس 'کلید افغانی' کا ایک اور حصہ 'تاریخ و سلطان محمود غزنوی' بھی مولوی احمد کی کاوش ہے۔ یہ دراصل 'تاریخ فرشتہ' کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے۔ 'گنج پښتو' دلچسپ اور سبق آموز کہانیوں کا مجموعہ ہے، جسے پشتو کے روزمرہ کے محاورہ کے مطابق سلیس، شستہ اور آسان زبان میں لکھا گیا ہے۔ غالباً یہ روش مولوی احمد نے پادری ہیوز یا اپنے دوسرے یورپین شاگردوں کی وساطت سے انگریزی ادب سے روشناس ہونے کے بعد اختیار کی ہو گی۔ یہ کتاب یورپین افسروں کے پشتو کے امتحان کے نصاب میں شامل تھی۔ پلوڈن نے ۱۸۷۵ء میں اس کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا اور پھر ۱۹۱۲ء میں گوڈن نے کھووار یا چترالی زبان میں اس کا ترجمہ کلکتہ سے شائع کیا۔

مولوی احمد کے بعد منشی احمد جان نے اس طرز کی نثر کو اور بھی چار چاند لگا دیے۔ اس نے 'ھغہ دغہ' اور 'دقصہ خوانئی گپ' لکھ کر پشتو نثر کو جدید سے جدید تر بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مزاح نگاری کے لیے راہ کھول دی'۔ جدید نثر کے پیشروؤں میں ان کے ساتھ میر احمد شاہ رضوانی کا نام بھی آتا ہے (ذکر گذر چکا ہے)۔ شمس العلماء رضوانی نے 'شکرستان' اور 'بہارستان' میں جہاں قدیم نظم و نثر کے نمونے دیے ہیں وہاں خود بھی کچھ مضامین جدید، سادہ اور بامحاورہ نثر میں لکھ کر شامل کیے ہیں۔ ان میں کچھ مزاحیہ رنگ میں بھی ہیں۔

---

(۱) لندن میں ۱۸۷۱ء میں چھپی اب ناپید ہے۔

(۲) خان بہادر منشی احمد جان بھی مولوی احمد کی طرح یورپین حکام کے پشتو کے استاد تھے۔ ان کا تعلق زیادہ تر بیسویں صدی سے ہے۔ ھغہ دغہ اور قصہ خوانئی گپ ان کے نثر نگاری کے شاہکار ہیں۔ جو یورپین حکام کے امتحان کے نصاب میں شامل تھے۔ انھوں نے کرنل میلیسن کی تاریخ افغانستان (انگریزی) کا پشتو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ بھی نثر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ زبان کی روانی اور سلاست کی وجہ سے ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔

اس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ رضوانی نے منشی احمد جان سے بھی پہلے مزاحیہ مضامین اور کہانیاں لکھنے کی ابتدا کی۔

مختصر طور پر جدید پشتو نثر کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ مولوی احمد نے پشتو نثر کو قافیہ و سجع وغیرہ کے تکلفات اور فارسی عربی کے مشکل الفاظ کی بھرمار سے آزاد کر کے ایک نئی ڈگر پر ڈال دیا ، اور فطری انداز میں روزمرہ کے محاورہ کے مطابق سادہ آسان اور سلیس زبان میں لکھنے کی داغ بیل ڈالی ۔ رضوانی نے اس میں مزاح کا رنگ بھرا اور پھر منشی احمد جان نے اسے اوجِ کمال پر پہنچا دیا ۔

پشتو نثر نگاری کے ضمن میں میاں نعمان الدین احمد اور اس کے خاندان کا ذکر بھی ناگزیر ہے[1] ۔ میاں نعمان الدین احمد جنہیں عام طور پر احمد میاں کہتے ہیں مردان کے قریب سرخ ڈھیری کے رہنے والے تھے ۔ والد کا نام امیرالدین تھا۔ آپ پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے ۔ پشتو زبان کی ترقی و ترویج کے بڑے خواہاں تھے ۔ خود بھی ایک اچھے ادیب اور شاعر تھے اور دوسرے لکھنے والوں کی بھی بڑی ہمت افزائی کرتے تھے ۔ بلکہ انعام و اکرام کے علاوہ ان کی کتابوں کی طباعت میں بھی امداد کرتے تھے ۔ خود 'ظفرالنساء' کتاب لکھی ۔ جس میں علم کی ضرورت پر بڑا زور دیا گیا ہے ۔ آپ کی اہلیہ زینت جہاں بیگم جو علاقہ کولڈ کے ایک بڑے عالم گھرانہ سے تعلق رکھتی تھی ، ایک اچھی صاحبہ قلم اور درد مند خاتون تھی ۔ انہوں نے پٹھان خواتین کے لیے اردو کی ایک کتاب 'رفیق عروس' کا ترجمہ 'زینت‌النسا' کے نام کیا ۔ اس کی زبان بہت سادہ اور عام بول چال کے مطابق ہے ۔ اس نے اس کتاب میں پٹھان خواتین کی ضرورت کے مطابق کافی ترمیم اور کمی بیشی بھی کی ہے ۔ یہ کتاب ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ میں چھپی ۔ احمد میاں کے چچا زاد بھائی میاں بشیر الدین نے فارسی کی اخلاقی کتاب 'خجستہ بہار' کا پشتو میں 'مشیرالاخلاق' کے نام سے ترجمہ کیا جو ۱۹۱۹ء/۱۳۳۸ھ میں شائع ہوا ۔ احمد میاں کے بھانجے محمد یوسف نے ڈپٹی نذیر احمد کی مشہور کتاب 'توبۃ النصوح' کا ترجمہ اسی نام سے کیا جو ۱۹۰۴ء/۱۳۲۲ھ میں چھپا ۔ احمد میاں نے 'تاریخ برامکہ' اور 'اخلاق جلالی' کا ترجمہ شائع کرنے کا اعلان بھی کیا تھا مگر جہاں تک راقم کو معلوم ہے یہ کتابیں شائع نہیں ہوئیں ۔ البتہ میاں غفران الدین نے 'اخلاق محسنی' کا پشتو ترجمہ 'عنوان النصائح' کے نام سے ۱۹۰۸ء/۱۳۲۶ھ میں شائع کیا ۔ نعمان الدین کے بیٹے نذیر احمد نے اپنے والد کے کہنے پر شیخ فرید الدین عطار اور دوسرے بزرگوں کے اقوال

---

(۱) یادداشتہا

اور نصائح کا ایک مجموعہ لکھ کر ۱۹۰۷ء/۱۳۲۵ھ میں شائع کیا -

احمد میاں اور ان کے خاندان کے دوسرے اہلِ قلم کی لکھی ہوئی ان کتابوں کی[1] نثر بہت آسان، سلیس اور بالکل روزمرہ کی بول چال کے مطابق ہے - جگہ جگہ رباعیات، قطعات و ابجد سے ان کے مضامین کو اور بھی دلچسپ بنایا گیا ہے - ان کتابوں کی نثر کو ادبی حیثیت سے مولوی احمد رضوانی اور منشی احمد جان کے پایہ کی نہیں، مگر احمد میاں کا فروغ علم کے لیے اپنی زبان میں کتابیں لکھنے اور شائع کرنے کا جذبہ قابل قدر ہے -

اس سلسلہ میں غلام محمد خان پوپلزئی[2] کے مسدس کے ترجمہ کا ذکر بیجا نہ ہو گا - یہ ترجمہ تو پشتو میں ہے - مگر اس ترجمہ کا مقدمہ جو بڑے ہی مؤثر اور دردمندانہ انداز سے لکھا گیا ہے مولوی احمد کی طرز کا ایک اچھا نمونہ ہے - یہ ترجمہ ۱۸۹۲ع/۱۳۱۰ھ میں شائع ہوا -

دوسرے نثر نگاروں میں امیر محمد انصاری کا ترجمہ 'گلستان' خاص طور پر قابل ذکر ہے - یہ ترجمہ ۱۸۱۲ء/۱۲۲۷ھ میں کیا گیا - یہ بھی پشتو نثر کا ایک اچھا نمونہ ہے - اس ترجمہ کا اصل نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں موجود ہے -

قاضی رحیم اللہ خاں (۱۹۴۲ع/۱۸۸۷ھ) مرحوم جو پشاور کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں آبدرہ کے رہنے والے تھے، ایک اچھے عالم اور ادیب تھے - یورپین حکام کے پشتو استاد تھے - انہوں نے 'پشتو انسٹرکٹر' کے نام سے ایک کتاب انگریزی میں لکھی - ان کا ایک ڈرامہ 'نوے روشن' ان کی نثر نگاری کا عمدہ نمونہ ہے جو چھپ چکا ہے - فارسی میں پشتو کی گرامر 'گنجینہ افغانی' کے نام سے افغانستان کے لیے لکھی تھی -

آخر میں ہم پشتو کی نثر جدید کے موسسین مولوی احمد اور میر احمد شاہ رضوانی کے مختصر حالات لکھتے ہیں -

---

(۱) یہ کتابیں اب ناپیدا ہیں۔

(۲) غلام محمد خان قبیلہ پوپلزئی سے تعلق رکھتے تھے - چارسدہ (ضلع پشاور) کے رہنے والے تھے مسدس حالی کے ترجمہ کے علاوہ انہوں نے تربیت کے موضوع پر مولانا حالی کی ایک اور کتاب کا ترجمہ بھی کیا ہے - علاوہ ازیں ایک گرامر بھی لکھی ہے - جس کا قلمی نسخہ اسلامیہ کالج کے کتب خانہ میں موجود ہے -

مولوی احمد[1] (۱۸۴۵ء — ۱۸۸۳ء)

ضلع پشاور کے مشہور قصبہ "تنگی" میں ۱۸۴۵ع/۱۲۶۱ھ میں ایک عالم فاضل گھرانہ میں پیدا ہوئے - محمد زئی قبیلہ کی شاخ ابراہیم خیل سے تعلق رکھتے ہیں - اٹھارہ سال کی عمر کے بعد دینی علوم حاصل کرنے کے لیے کمرہمت باندھی، اور مختلف مقامات کے علما سے علوم متداولہ جیسے صرف نحو، فقہ، حدیث اور تفسیر کی تعلیم حاصل کی - آپ ایک روشن خیال عالم اور غیر اسلامی رسوم و رواج اور بدعتوں کے مخالف تھے - اس لیے کچھ علما آپ کے مخالف ہوگئے اور آپ کا اپنے گاؤں میں رہنا دشوار ہو گیا - اس لیے آپ پہلے تورو اور پھر تہکال چلے آئے - آپ یورپین لوگوں کے پشتو کے استاد مقرر ہوئے - افغان مشن کے پادری ہیوز سے آپ کے خاص تعلقات تھے جو پشتو شعر سے خاص دلچسپی رکھتے تھے - دوسرے علما کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آپ انگریزوں کو پشتو پڑھاتے تھے - ۱۸۸۳ع/۱۳۰۱ھ میں مخالفین نے آپ کو زہر دے دیا جس سے جاں بحق ہوئے - موت سے پہلے حکام نے آپ سے قاتلوں کے متعلق دریافت کیا مگر آپ نے نام نہ بتائے - آخری لمحات میں قرآن اور بخاری شریف منگوا کر کہا کہ میرا ان پر عمل تھا اور مجھے اس پر فخر ہے -

پشتو ادب میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ 'گنج پشتو' ہے جس کا ذکر گزر چکا ہے - 'تاریخ سلطان محمود غزنوی' کے ترجموں کے علاوہ آپ نے 'آدم درخانئی' کا قصہ بھی لکھا تھا - جو ۱۸۷۲ع میں لاہور سے شائع ہوا - اس قصہ کی مختلف روایتوں میں بہترین روایت قرار دی گئی ہے - آپ نے قرآن شریف کا ترجمہ بھی شروع کیا تھا - پارہ الم کا ترجمہ راقم نے دیکھا ہے جو شاید پہلا مطبوعہ ترجمہ ہے - یہ ترجمہ آج بھی بہترین ترجموں میں شمار کیا جا سکتا ہے - آپ نے دوسرے علماء کی طرح کچھ قصے بھی لکھے - جیسے 'غل و قاضی' اور 'قصہ جمجمہ' آپ کی بہت سی تصنیفات اور تالیفات بتائی جاتی ہیں - مگر آج چند ایک (جیسے طوطی نامہ - معجزات) کے علاوہ باقی سب ناپید ہیں - آپ ایک اچھے شاعر تھے مگر غزلیہ شاعری نہیں کی - صرف قصے اور مذہبی کتابیں نظم کیں -

میر احمد شاہ رضوانی[2] (پ - ۱۸۶۲ع/۱۲۷۹ھ)

ضلع پشاور کے مشہور قصبہ اکبر پور میں ۱۸۶۲ع/۱۲۷۹ھ میں پیدا ہوئے - والد کا نام قاضی میر صاحبزادہ تھا - آپ کے اجداد درانیوں کے دور میں قضاۃ

(۱) تلخیص مقالہ خیال بخاری - مجلہ کابل (۱۳۲۳ شمسی)
(۲) ایضاً

عہدہ پر فائز تھے ۔ رضوانی نے حصول علم کے لیے دور و دراز ملکوں کے سفر کیے ۔ ۱۸۸۸ع میں محکمۂ تعلیم میں ملازمت اختیار کی ۔ پہلے راولپنڈی میں پھر لاہور کے سنٹرل ٹریننگ کالج میں علوم مشرق کے استاد مقرر ہوئے ۔ آپ کی کوششوں سے پشتو کو پنجاب یونیورسٹی کے میٹرک کے امتحان اور اساتذہ کی جے ۔ وی اور ایس ۔ وی کلاسوں کے نصاب میں بطور ایک زبان کے جگہ ملی ۔ جو پشتو زبان پر ایک بڑا احسان ہے ۔ ان جاعتوں کے لیے 'شکرستان' اور 'بہارستان' کے نام سے کورس کی کتابیں بھی خود ہی لکھیں ۔

۱۹۰۱ع میں حکومت برطانیہ نے آپ کی علمی فضیلت اور قابلیت کے اعتراف کے طور پر شمس العلماء کا خطاب دیا ۔ آپ پشتو کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے ۔ خود ہی ایک جگہ اپنے دیوان کا ذکر کیا ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ ان تینوں زبانوں میں کلام کے چند ایک نمونوں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آ سکا ۔ راقم نے کچھ تین سال ادھر ان کی تصنیفات اور تالیفات کی ایک طویل فہرست مرتب کی تھی ۔ مگر اب ان کتابوں کے صرف نام ہی باقی ہیں ۔ ان کے بیٹے (میر اعظم شاہ صاحب) کا کہنا ہے کہ انہوں نے عمر کے آخری ایام میں اپنی بہت سی کتابیں اور مسودات وغیرہ جلا دیے تھے ۔

۹ ۔ سید احمد بریلوی کی تحریک کا اثر پشتو ادب پر

سید احمد بریلوی کی تحریک نے پشتو ادب پر ایک خاص اثر ڈالا ۔ ایک طرف پٹھان مجاہدین سید صاحب کے رفیق کار بن گئے دوسری طرف پشتو شاعری کو ایک نیا موضوع مل گیا ۔ عشقیہ اور بزمیہ شاعری کی جگہ جنگی اور حماسی شاعری نے لے لی ۔ ایسے حالات میں عوامی شاعری ہی جنگ و جہاد کے جذبہ کو برانگیختہ کرنے کے لیے موزوں ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں عوامی شاعری اپنے اوج کمال کو پہنچ گئی ۔

پہلا پٹھان شاعر جس نے ملک کے بدلتے ہوئے حالات کو دیکھا اور اسے آزادی کے چھن جانے اور غلامی کا احساس ہوا ، وہ دور مشرق میں فرخ آباد کا نوجوان شاعر قاسم علی آفریدی ہے ۔ ایک طویل نظم میں اپنے لئے عزیز و ' جنت نظیر ' وطن فرخ آباد کی تعریف کرنے کے بعد کہتا ہے :

اب یہاں انگریز کا طنبورہ اور بگل بجتا ہے !
(افسوس) اب یہاں نصاریٰ فرخ آباد کے حاکم ہو گئے ، اور

پٹھانوں سے حکومت یکبارگی چلی گئی !
اب فرخ آباد میں انگریز کرسی عدالت پر بیٹھا ہے ،
اب غیرتمند لوگ غیرت و حمیت کی باتیں کیا کریں !
(کیونکہ) فرخ آباد کے نوابوں کے اوسان بھی خطا ہو گئے ہیں ۔
انہوں نے بغیر کسی لڑائی کے
ملک (غیروں) کے حوالہ کر دیا !
میں فرخ آباد میں سرداروں کے متعلق کیا کہوں ؟
اس سے زیادہ بے غیرتی اور کیا ہو گی'
کہ فرخ آباد کے جو حاکم تھے ،
اب محکوم ہو گئے ! (ترجمہ)

ادھر پٹھانوں کی اپنی سرزمین میں چار بتیوں ، بدلوں کے علاوہ جنگ نامے لکھے جانے لگے ۔ اور اپنے اپنے مرشدوں کے مناقب میں ان کے مجاہدانہ کارناموں کو پر جوش الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا گیا ۔ اسی قسم کے ایک جنگنامہ[1] میں جو سید احمد شہید کے وقت میں لکھا گیا' ان کے متعلق کہا ہے :

سید احمد غازی پیدا ہوا ،
جو یوسف زئیوں کے علاقہ میں ظاہر ہوا ،
اس نے دین کی خاطر کمر ہمت باندھی !
اس کی شریعت کی پابندی ظاہر تھی ۔
وہ سید بھی تھا اور حاجی بھی '
وہ سخی بھی تھا اور غازی بھی !
سید پنجتار کے علاقہ میں بادشاہ تھا !
اس نے سکھوں کو انگاروں پر جلا دیا ۔ (ترجمہ)

ان تذکرہ نگاروں یعنی جنگنامے اور چاربیتے وغیرہ لکھنے والوں نے اس وقت کے غداروں کو بھی معاف نہیں کیا ۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ۔ مثال کے طور پر نوردین اخوند

---

(۱) قلمی نسخہ مع کتب خانہ راقم

کے ایک چار بیتہ کے ٹیپ کا شعر ہے :

یار محمد سید بریلوی کو پنجتار سے نکالنے ،
کے لیے روانہ ہو گیا ہے !
اے پروردگار !
(اس جنگ میں) سد کو فتح نصیب ہو ! (ترجمہ)

یہاں اس قسم کے سینکڑوں چاربیتوں اور بدلوں وغیرہ کے ذکر کی گنجائش نہیں ۔ مختصر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ شعرا اپنی آتش بیانی سے ملک کے گوشہ گوشہ میں جنگ و جہاد کے جذبات ابھار رہے تھے ۔ ان بدلوں میں احمد شاہ ابدالی ، دوست محمد خاں ، اکبر خاں ، سید احمد شہید ، سید امیر ، حضرت اخوند صاحب سوات اور شمع آزادی کے دوسرے پروانوں کے کارناموں کا بیان کیا گیا ہے ۔ ہم یہاں چند ایک چار بیتوں کے ٹیپ کے اشعار کا ترجمہ بطور نمونہ درج کرتے ہیں :

(الف)

جنگ بالا کوٹ ۔ (گل محمد شاعر)[1]

اے مولوی ! اے بہرام خان !
تمہیں سید احمد بادشاہ بلاتے ہیں !
کنہار پر جنگ ہو رہی ہے
اے مولوی !
کنہار تجھ پر گلستان ہو جائے ! (ترجمہ)

(ب)

امیر دوست محمد خاں کی جنگ (احمد گل شاعر)[2]

کس نے خبر دی
کہ غازی دوست محمد کابل میں جنگ کے لیے
تیار ہو گیا !
بادشاہ قندھار میں ہے ، اور
اس کے لشکر کا شور سنائی دے رہا ہے ! (ترجمہ)

---

(۱) ڈلو سٹیٹر ھار و بہار
(۲) " " " "

(ج)

بنیر کی جنگ (نواب جان اخون)[1]

قتل گڑھ کی چوٹی پر
انگریز نے بہت افسوس کیا !
خطرے کا شور اس کا پیچھا کر رہا تھا ۔
جب اس نے غازیوں کو دیکھا ، تو
اسکی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا !
غم پوری طرح اس کا پیچھا کر رہا تھا ! (ترجمہ)

(د)

بنیر کی جنگ (لور شالے)[2]

یہ ہند سے آئے ہیں !
ان کا وطن بریلی ہے !
اب ملکا میں بیٹھے بارود اور گولیاں بنا رہے ہیں
(مخالفین سے بے خوف ہو کر) صاف میدان میں بیٹھے ہیں ،
یہ ہند سے آئے ہیں ! (ترجمہ)

بنیر کی جنگ کا ایک اور چار بیتہ (طالب گل) کا ترجمہ ملاحظہ ہو[3] :

کفر اور اسلام کی جنگ چھڑ گئی ہے !
اس میں آنحضرت کے باغ کے پھول گر گئے (شہید ہو گئے) ۔

کاتل کی جنگ کا چار بیتہ (احمد کلاچی)[4]

میرا دل آج بہت اچھا (خوش) ہے ! کہ
میں نے اسلام کی خبر سنی ہے !
(وہ یہ) کہ اکبر خان کابل سے اسلام کا لشکر لے آیا ہے ! (ترجمہ)

اس قسم کے سینکڑوں چار بیتے اور بدلے لکھے گئے جو مردانہ محفلوں اور حجروں وغیرہ میں گائے جاتے۔ ان کے ساتھ ہی گھروں میں گائے جانے والے گیتوں (بولوں ، سندروں

---

(۱) ڈار میسٹیٹر (ہار و بہار)
(۲) " " " " (۳) ڈار میسٹیٹر (ہار و بہار) (۴) دیوان

وغیرہ) کا رخ بھی اس طرف پھر گیا ۔ جن میں کچھ تو اب تک گائے جاتے ہیں ۔ ان میں سے چند ایک کے ٹیپ کے شعروں کے ترجمے بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں :

میرے کان میں سات فیر کرنے والی
بندوقوں کی آواز آتی ہے
جوانوں کی لڑائی شروع ہو گئی ہے !
اے پیاری ماں ! آ منڈھیر پر آ کر دیکھ ! (ترجمہ)

★ ★ ★

مشین گنوں نے توڑے اور پتھر اڑا دیے ہیں !
غزا اب شکئی کی طرف بڑھ رہی ہے ! (ترجمہ)

✶ ✶ ✶

فرنگیوں کی فوجیں جنگ کرنے کے لیے
خیبر پر چڑھ آئی ہیں !
اے غازی محمد جان !
دیکھو پیٹھ مت دکھانا ! (ترجمہ)

۷۔ مستشرقین

زیادہ تر سیاسی اور بعض اوقات علمی اغراض کی بنا پر مستشرقین نے پشتو ادب کے سلسلہ میں بڑا قابل قدر کام کیا ہے ۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ کام پروفیسر ڈورن (۱۸۰۵ء-۱۸۸۸ء) نے کیا جو جرمن نژاد تھے اور پٹھانوں کی تاریخ ، پشتو روسی لغت ، پشتو کے منتخبات اور پشتو گرامر اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں ۔ گولڈن شٹٹ بھی جرمن نژاد تھے ۔ انہوں نے پشتو لغت تصنیف کی جو ۱۹۷۰ء میں پیٹرز برگ میں چھپی ۔ پروفیسر ڈورن ایک صاحب کلاب راٹ کا بھی ذکر کرتے ہیں ۔ جنھوں نے پشتو کی گرامر کی ساخت پر ایک کتاب لکھی تھی ۔ راورٹی ایک انگریز مستشرق ہیں جنھوں نے پشتو زبان کی گرامر ، لغت اور ادب کے سلسلہ میں بڑا گرانقدر کام کیا ہے ۔ انہوں نے 'گلشن روہ' کے نام سے پشتو کے بڑے بڑے شعرا کا انتخاب مرتب کیا اور ان اشعار کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا ۔ ان کا ایک اور کارنامہ ہمیشہ یاد رہے گا ۔ انہوں نے پشتو گرامر بھی تحریر کی اور اس کے لیے ایک مقالہ دیباچہ لکھا ۔ انہوں نے 'قصئی دالیسپ الحکیم' کے نام سے پادری جیمز کی مشہور کتاب کا پشتو نثر میں ترجمہ بھی شائع کیا ۔

ڈاکٹر بیلیو انگریز نے پشتو زبان کی ایک گرامر اور پشتو سے انگریزی اور انگریزی سے پشتو لغت تصنیف کی ۔ علاوہ بریں ۱۸۷۰ء میں خوشحال خان خٹک کا دیوان بھی طبع کرایا ۔ ڈارمیسٹٹر (۱۸۴۹ء-۱۸۹۴ء) فرانسیسی مصنف اور محقق تھے ۔ انہوں نے ۱۸۸۸ء میں پشتو کے عوامی گیتوں کا مجموعہ دو جلدوں میں پیرس سے شائع کرایا ۔ اس کے پہلے حصے میں انہوں نے پشتو زبان کے لغوی استقاقات اور اس کے علم الاصوات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ۔ اس سلسلہ میں پادری ہسوز کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔ انہوں نے پشتو نظم و نثر کے انتخابات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب 'کلید افغانی' ۱۸۷۲ء میں لاہور سے طبع کرائی جس کے کئی حصے ہیں ۔ علاوہ بریں ان کی وجہ سے برٹش میوزیم لنڈن میں پشتو شعرا کے متعدد دواوین کے ساتھ پشتو کی کئی دیگر تصنیفات بھی پہنچ کر محفوظ ہو گئیں ۔

گرائیکر ، واگن ، بیڈولف ، روس کیپل ، لاریمر ، ٹوما نووچ ، میجر کاکس وغیرہ اور بھی بہت سے مستشرقین ہیں جن کا پشتو ادب پر احسان ہے ۔ لیکن ہم صرف ڈاکٹر ٹرمپ اور سر جارج گریئرسن کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کریں گے ۔ ڈاکٹر ٹرمپ نے لندن سے ۱۸۷۳ء میں پشتو گرامر کی ایک کتاب شائع کی اور غالباً انہی کی وجہ سے ٹیوبنگن کے کتب خانے میں پشتو کی بہت سی تصنیفات پہنچیں ۔ سر جارج گریئرسن نے پاک و ہند کی زبانوں کا جائزہ ۱۹ ضخیم جلدوں میں لیا اور دسویں جلد میں پشتو زبان اور اس کی مختلف بولیوں پر بھی بحث کی ۔ ان کی وفات ۱۹۴۱ء میں ہوئی، لیکن وہ اپنا کام ۱۹۲۷ء میں مکمل کر چکے تھے ۔

۸ ۔ صوفیائے کرام

ہم ان صوفیائے کرام کا ذکر ان کی پاک نفسی یا عبادات و ریاضت کی وجہ سے نہیں کر رہے ۔ بلکہ اس وجہ سے کہ ان بزرگان دین نے اس سخت اور امتحان کے وقت اس وقت کی سیاسیات سے آنکھیں بند نہیں کیں ۔ بلکہ ملک و قوم کی رہنمائی کرتے رہے ، اور خود بھی اپنے ہزار ہا مریدوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ دشمنان دین کے خلاف جہاد میں عملاً حصہ لینے کے لیے آگے بڑھے ۔ یہ خود بھی بہت بڑے عالم اور فاضل تھے ۔ فروغ دین کے لیے دینی علوم میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا ۔ مگر علم کے ساتھ ساتھ ادب کی سرپرستی بھی کی ۔ ان بزرگان دین میں حضرت میاں عمر ، حضرت اخوند صاحب سوات اور کوٹھہ کے صاحبزادہ صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ذیل میں ان کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے ۔

حضرت میاں محمد عمر (۱۶۷۳ء - ۱۷۷۶ء)

آپ ۱۶۷۳ع/۱۰۸۴ھ میں فرید آباد (ہند) میں پیدا ہوئے ، شاہ جہان چونکہ ان کا معتقد تھا اس لیے ان کے دادا کو فرید آباد میں جاگیر عطا کی تھی' ان کے والد محمد ابراہیم وہیں رہتے تھے۔ میاں محمد عمر بعد میں موضع چمکنی (ضلع پشاور) آ رہے۔ ایک بہت بڑے عالم فاضل شخص تھے۔ ان کی خانقاہ میں سینکڑوں طالب علم ان سے علم شریعت و طریقت کا درس لیتے ' اور ان کے روحانی انوار سے فیضیاب ہوتے۔ آپ نے پشتو کے علاوہ فارسی و عربی زبانوں میں بھی مختلف کتابیں لکھی ہیں ۔ جیسا کہ خود ہی فرماتے ہیں :

"اس فقیر کی تصالیف جو سب کو معلوم ہیں وہ فارسی اور عربی میں نمایاں ہیں ۔ میں نے پشتو زبان میں بھی بہت سی تصانیف کی ہیں - جن میں سے بعض تو ہر ملک میں بہت مشہور ہیں "۔

افسوس ہے کہ ان میں سے صرف چند ایک کے نام معلوم ہو سکے ہیں - جو یہ ہیں -

توضیح المعانی : ' خلاصہ کیدانی ' کا منظوم پشتو ترجمہ ہے . ' نسب نامہ ، پٹھانوں کا نسب نامہ بڑی اہم کتاب ہے۔ ' المعالی ، یعنی المعالی شرح امالی (پشتو)۔ یہ کتاب آپ نے ۱۷۴۵ع/۱۱۵۸ھ میں لکھی ۔ اس کتاب میں فقہ کے مسائل کے علاوہ بہت سی اہم تاریخی معلومات بھی ہیں۔ ' خزینۃ الاسرار ' بزرگان دین کا تذکرہ ہے ۔ تاریخی لحاظ سے یہ بہت اہم کتاب ہے ۔ آپ نے ۱۷۷۶ع/۱۱۹۰ھ میں وفات پائی اور موضع چمکنی میں مدفون ہیں ۔ آپ کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ حضرت میاں عمر صاحب ایک بڑے عالم ، شاعر اور صاحبِ تصنیف تھے۔ آپ نے اپنے بیٹوں کی تربیت بھی اسی انداز سے کی ۔ بلکہ بعض کتابیں انہی کے لیے تصنیف کیں۔ جب وہ آپ کی جگہ سجادہ نشین ہوئے تو انہوں روحانی پیشوائی کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی سرپرستی بھی کی۔ (حضرت محمدی صاحبزادہ اور حضرت عبیداللہ صاحبزادہ کا ذکر گزر چکا ہے) ۔

احمد شاہ ابدالی آپ کے بڑے معتقد تھے۔ آپ کے چار خلفا جن میں آپ کے چھوٹے بیٹے (عبیداللہ صاحبزادہ) بھی شامل تھے اکثر جہاد میں اپنے ہزاروں مریدوں سمیت شریک رہے'۔ آپ کے مریدوں میں نور محمد نے ۱۷۸۵ع/۱۲۰۰ھ ، کے لگ بھگ ' قصیدہ بردہ ' کا ترجمہ کیا ۔ محمدی صاحبزادہ کی مدح میں ایک نظم بھی لکھی ہے ۔

---

(۱) تذکرہ اولیائے پاکستان بحوالہ مخزن پنجاب (قاضی اثر)

محمد یوسف نے منظوم مناجات لکھیں ۔ جان محمد کاکڑ (جو بلوچستان کا رہنے والا تھا اور جس نے تعلیم بنوں میں حاصل کی) ان کا مرید تھا ۔ دادین نے آپ نے مناقب لکھے ۔

اخوند صاحب سوات (۱۷۹۲ء–۱۸۷۷ء)

ان کو سوات میں بابا جی اور سیدو بابا بھی کہتے ہیں ۔ نام عبدالغفور تھا ۔ والد کا نام عبدالواحد تھا ۔ سوات کے موضع جبڑی میں ۱۷۹۲ء/۱۲۰۷ھ میں پیدا ہوئے ۔ تحصیل علم و ریاضت و عبادت کے لیے مختلف اولیائے کرام سے استفادہ کرنے کے لیے ان کے گاؤں میں رہے ۔ جب سید احمد شہید نے سکھوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور ان سے شمولیت کے لیے کہا ، تو آپ اپنے ہزاروں مریدوں سمیت ان کی امداد کو پہنچے ۔ ۱۸۴۱ء/۱۲۶۱ھ میں سیدو (سوات) آ رہے ۔ ۱۸۴۹ء میں جب پشاور پر انگریزوں نے قبضہ کیا اور ان کے خلاف لڑائیوں کا آغاز ہوا اور سرکاری اور امبیلہ کی جنگیں ہوئیں تو آپ پھر میدان جہاد میں کود پڑے ۔ اس وقت مجاہدین کے سرگروہ مولوی محمد عبداللہ تھے ۔

آپ کے عقیدتمندوں میں بھی بہت سے اعلیٰ پایہ کے اہل قلم اور شعرا گزرے ہیں ۔ ان میں ارباب عبدالرحیم خلیل ، رضوان اور احمد تیراہی بہت مشہور ہیں ۔ اخوند صاحب سوات نے ۱۸۷۷ء میں وفات پائی اور سیدو شریف میں مدفون ہیں ۔ آپ موجودہ والئی سوات کے جد امجد تھے ۔

کوٹھہ کے حضرت سید امیر (۱۷۹۵ء–۱۹۱۸ء)

حضرت سید امیر المعروف بہ حضرت جی صاحب آپ مولانا محمد سعید صاحب کے بیٹے تھے ۔ کوٹھہ (تحصیل صوابی ضلع مردان) میں ۱۷۹۵ء/۱۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے ۔ آپ بھی دوسرے بزرگان دین کی طرح ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو علم و عرفان کا مرکز تھا ۔ ابتدائی علوم اپنے گھرانے کے علماء سے حاصل کرنے کے بعد علاقہ کے دوسرے نامور علماء سے استفادہ کیا' اور ۲۸ سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ میں عبور حاصل کیا ۔ اور بہت جلد آپ کا شمار اس علاقہ کے سب سے بڑے جیّد علماء میں ہونے لگا ۔ شریعت و طریقت میں رہنمائی و پیشوائی کے ساتھ ساتھ آپ نے وقت کی سیاسیات کی طرف سے بھی آنکھیں بند نہیں کیں ۔ آپ بڑی فہم و فراست کے مالک اور عالم باعمل تھے ۔ سید احمد بریلوی کی تحریک سے آپ کو خاص لگاؤ تھا ۔ بلکہ اس تحریک کی تقویت کا ایک بڑا باعث آپ ہی کی ذات تھی ۔ آپ اپنے ہزاروں عقیدتمندوں اور مریدوں

کی جمیعت کے ساتھ ان جہادوں میں شریک ہوئے اور اخوند صاحب سوات کے دوش بدوش رہے ۔ مگر بعد میں مخالفین کی ریشہ دوالیوں نے آپ کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دیں ۔ صوابی مردان اور پشاور کے علاقہ میں ان کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا ۔ اس طاقت کو کم کرنے کے لیے ان کے خلاف ' وہابی ' اور بایزید انصاری (روشان) کا پیرو وغیرہ ہونے کا پروپیگنڈہ سروع کرایا گیا ۔ مگر تا دم آخر وہ ان طاغوتی طاقتوں سے بر سرپیکار رہے ۔ سر سید سرحد صاحبزادہ نواب عبدالقیوم کی تربیت انہوں نے ہی کی تھی ۔

آپ کے بعض عقیدتمندوں نے اپنی تحریروں میں بڑی مذہبی اور ادبی خدمات انجام دیں ۔ جیسے :

ملا محمود اخونزادہ ، محمد علی غریب ، فیضی ، بی بی تاج (کرم النسا المتخلص بہ تاج) خان زمان ، دوستم ، قاضی عبدالرحمٰن ، محمد جی ، فیض اللہ قریشی ، صفی اللہ خٹک ، سید محمد عمر بیسویں صدی کے اوائل تک زندہ تھے (غالباً ۱۹۱۸ع تک) ان تمام کی تصنیفات کی فہرست خاصی لمبی ہے ۔

پشتو ادب

چھٹا باب

(۱۹۰۰ع سے ۱۹۷۰ع تک کی نظم و نثر)

تاریخی اور سیاسی پس منظر

اس زمانے تک پشتو زبان و ادب کا قافلہ اپنے ارتقائی سفر کی کئی منازل طے کر چکا تھا اور علمی ، ادبی ، مذہبی اور ثقافتی شاہراہ کے ایک ایسے موڑ پر آپہنچا تھا جہاں سے اسے اور وسعتوں سے روشناس ہونا تھا ۔

جدال و قتال کے لا متناہی سلسلوں کی وجہ سے فرنگی یا تو پشتونوں کے علمی ورثہ کو سمیٹ کر اپنے ساتھ لے گئے یا یہ ضائع ہوگیا ۔ انگریز ہم کو اپنے مذہب و ثقافت سے بیگانہ کرنے میں ایک حد تک کامیاب بھی رہے ۔ انہوں نے یہاں کے باشندوں کو قدیمی علوم و روایات کے بدلے انگریزی زبان اور مغربی ثقافت سے لوازا ۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ۔ یہ عمل پورے برِصغیر میں ہوتا رہا اور مسلمانوں کی تاریخ و تمدن کے بارے میں ایسے ایسے نظریات قائم کیے گئے جو سیاسی لحاظ سے بھی درست نہیں تھے ۔ مثلاً حاکم و محکوم کے نظریے ایک جیسے نہیں ہوسکتے ۔ سکھوں نے مغلوں کے خلاف لگا تار بغاوت کی ، جگہ جگہ فساد برپا کیا ، مار دھاڑ کی رسم کو عام کر دیا ۔ اس لیے مغل بادشاہوں نے ان کی سرکوبی کی ۔ سکھوں کے اکثر گورو مارے گئے ۔ سکھوں کے لیے یہ گورو شہید متصور ہوئے مگر مغلوں کی نظر میں وہ باغی تھے ۔ چنانچہ مغل انہیں فتنہ پرداز تصور کرتے تھے اور سکھ اپنے لیڈروں (گوروؤں) کو مجاہدِ اعظم مانتے تھے ۔ اب وہی تواریخ جو تقسیم ہند سے پہلے مُسلم مانی جاتی تھیں ، پھر سے لکھی جا رہی ہیں اور انگریز مؤرخ مانتے ہیں کہ موجودہ دور میں سامراجی نقطۂ نگاہ صحیح تسلیم نہیں کیا جاسکتا ۔ پشتو ادیب اور شعرا آزادی کی جدوجہد اور تحفظِ ملّی کی کوششوں سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنے جذبات کا گیتوں ، چاربیتوں اور عوامی شاعری کی دیگر اصناف میں پرجوش اظہار کیا ۔

یہ بات سب پر روشن ہے کہ شعر و سخن کی ہر ایک صنف میں بالعموم اور لوک گیتوں میں بالخصوص اس قسم کے جذبات پورے شد و مد سے موجود رہے ہیں - کیونکہ اس عبوری دور کی شاعری کا اہم ترین جزو عوامی گیت تھے - سرحد ، بلوچستان اور دیگر علاقوں میں جہاں کہیں پشتو زبان بولی جاتی ہے آزادی کے ان متوالوں کے گیت ، ٹپے ، چار بیتے ، غاڑے اور بدلے سب انہی جذبات کے زیر اثر رہے -

یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں کچھ عرصہ کے لیے ایک حد تک مغربی ادب و فلسفہ کا اثر کار فرما رہا اور اعلیٰ درجے کے علمی اور ادبی کام کا جذبہ سرد پڑ گیا ، لیکن اگرغور سے دیکھا جائے تو باوجود مذکورہ رکاوٹوں کے یہاں کے ادیب ، شاعر اور علمائے دین ہر منزل پر اپنی قوم کے ان جیالے فرزندوں ، غازیوں اور مجاہدوں کی راہنمائی کرتے رہے جو استبدادِ فرنگ کی مخالفت میں برسرپیکار تھے -

اس عبوری دور کے ابتدائی حصے کی شعر و شاعری کا ایک اچھا ذخیرہ عوامی گیتوں کی صورت میں مشہور فرانسیسی مستشرق ڈارمسٹیٹر نے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ محفوظ کیا ہے - مذکورہ مجموعہ اگر ایک طرف علمی اور ادبی لحاظ سے ایک قابل تحسین مجموعہ ہے ، تو دوسری طرف اس دور کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کے لحاظ سے بھی اہم دستاویزی حیثیت کا حامل ہے - اس دور کے عوامی گیتوں کا ایک اور مجموعہ سید عمر نامی ایک شخص نے نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خاں کے لیے جمع کیا تھا - اس مجموعے کا نام 'گلشنِ اشعارِ افغانی[۱]' ہے - آج بھی پشتو زبان کے پورے دائرے میں ان لوک گیتوں کو قبول عام حاصل ہے جو انگریز کے خلاف کسی معرکہ یا لڑائی کے ضمن میں کہے گئے ہیں -

لوک گیت پشتو ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں - ان گیتوں میں خلوص ، سادگی اور جذبات کی فراوانی بدرجہ اتم موجود ہے - ان گیتوں کو بجا طور پر پشتو زبان کا مِلّی اثاثہ کہنا چاہئیے - اس دور کے ان لوک گیتوں میں سے دو ایک کا ترجمہ بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے :

امبیلہ کی جھاڑیوں میں گوروں کی کلیجی کھا کھا کر ،
گیدڑوں کے پیٹ بھر گئے ہیں -
اگر تم نے میولد کے میدان میں
جامِ شہادت نوش نہ کیا ،

---

(۱) گلشن اشعار افغانی قلمی اورینٹل لائبریری اسلامیہ کالج پشاور -

تو اے میرے محبوبہ! جان لو کہ'
لوگ تمہیں بے حمیّت کہہ کر پکاریں گے! (ترجمہ)

آدم درخانئی کے مشہور رومان کی ایک مثنوی میں سید بوعلی شاہ نے بھی ۱۸۹۷ء کے چترال ریلیف فورس کے خلاف الہی جذبات کا اظہار کیا ہے:

اچانک چھاؤنی میں شور و غوغا مچا'
میں حیران تھا کہ یہ کیا قیامت برپا ہو گی!
سب یہی کہتے تھے کہ عمرا خاں کے خلاف لام بندی ہے،
اس نے چترال میں انگریز کا سر قلم کیا ہے!
کہاں لندن اور کہاں چترال!
لوگوں میں ننگ و حمیت نہیں رہی'
اس لیے تو فرنگی بھی چترال جانے کی جرأت کر رہا ہے!
ملکنڈ پر بھی (غلامی کے) سیاہ بادل منڈلا رہے ہیں،
اے ہارون تو بھی اپنی تلوار چمکا
تاکہ روشنی ہو جائے!
کلکتہ سے فرنگی آئے ہیں۔
ان کے خلاف جہاد کا اعلان ہو چکا ہے!
جیالے جوان اس میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ (ترجمہ)

اسی طرح بلوچستان کے علاقہ میں بھی بے شمار "غاڑے" اس دور کے پشتونوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب انگریز زوب کے علاقہ میں ٹرین کی پٹڑی بچھا رہا تھا تو پشتون ماؤں، بہوؤں اور بہنوں نے اپنے مخصوص انداز میں اس پر احتجاج کیا:

ہمارے عزیزوں کی ننگ و حمیّت کہاں کھو گئی!
کہ زوب کی سر زمین پر'
فرنگی ریل گاڑی چلانے کی جرأت کرنے لگا۔
اے میری جان! کیا تو اپنے سسر اور دادا کی سر زمین پر
ریل گذرتے ہوئے نہیں دیکھ رہا ہے![1]۔ (ترجمہ)

---

(۱) ثقافت و ادب، وادی بولان میں۔

یہ صحیح ہے کہ ریل کی پٹڑی بچھ جانے سے ذرائع نقل و حمل میں آسانی پیدا ہوئی ہوگی ۔ لیکن ریل دراصل شمال مغربی صوبے میں فوجی مقاصد کے پیش نظر چلائی گئی تھی ۔ اس زمانہ میں روس شمال مغربی سرحدات پر برطانوی ہندوستان کے لیے ایک مستقل خطرہ بنا ہوا تھا ۔ اس نے وسط ایشیا کی اکثر ریاستوں اور سلطنتوں پر قبضہ جما رکھا تھا ۔ سمرقند اور بخارا پر قابض ہونے کے بعد روس نے آمو دریا کی حدود تک قدم بڑھائے لیے تھے ۔ انتہائی شمال میں واخان اور چترال اس کی زد میں تھے اور شمال مغرب میں روسی افغانستان کے شہر ہرات کے قریب پہنچ گئے تھے ۔ یہ شہر اس زمانہ میں برصغیر کا دروازہ کہلاتا تھا ۔

ان خطرات کے پیش نظر برطانوی حکومت کے لیے مضبوط چھاؤنیاں تعمیر کرنا اور فوجی نقل و حمل کے ذرائع کو ترقی دینا لازمی تھا ۔ سرحدات برصغیر پر رہنے والے پشتون انگریزوں کی اس دکھتی رگ سے پوری طرح واقف تھے ۔ اس لیے انہوں نے ہمیشہ اس قسم کی تعمیرات کی مخالفت کی ۔ انگریزوں کو بھی بارہا اپنی منشاء و مقاصد کی تکمیل کے لیے قبائل سے کیے گئے معاہدوں سے منحرف ہونا پڑا ۔ اسی کشمکش میں چترال سے لے کر بلوچستان کے انتہائی مغربی سرے تک کے تمام قبائل انگریزوں کے خلاف اعلان جہاد کرنے لگے ۔ حریت پسند مجاہدوں کی یہ کشمکش اس وقت تک جاری رہی جب تک انگریز برصغیر کو خیر باد کہنے پر مجبور نہیں ہوئے ۔

قبائل کے ساتھ عہد شکنی انگریزی استعمار کا طرۂ امتیاز بن چکا تھا ۔ اگرچہ فارورڈ پالیسی بظاہر ختم ہو چکی تھی اور روس کے ساتھ سرحدات کا تعین بھی ہوچکا تھا، لیکن دونوں عملداریوں کے درمیان واقع، پشتونوں کی سر زمین ان کی سیاسی ریشہ دوانیوں کا مرکز بن گئی تھی اور فریقین کسی صورت میں اس علاقہ کی سیاسی اہمیت سے غافل نہیں رہ سکتے تھے ۔ یہاں کے باشندے بھی پورے عزم و استقلال کے ساتھ ان کی شاطرانہ چالوں سے اس سر زمین کو بچانے کی کوشش کرتے رہے ۔

انگریز کی خواہش تھی کہ ڈیورنڈ لائن کے اس طرف کے قبائل یا تو مکمل طور پر مطیع ہو جائیں یا کم از کم ان کو اس قدر کمزور کیا جائے کہ برطانوی حکومت کے اقتدار اعلیٰ سے آزاد ہونے کی کوشش نہ کر سکیں ۔ اس عرصہ میں سرحد کے میدانی علاقہ پر انگریز قابض ہو چکا تھا اور ڈیورنڈ لائن کو برصغیر کی شمالی مغربی سرحد قرار دیا جا چکا تھا ، لیکن یہاں کے لوگ ذہنی غلامی کے بندھن سے آزاد تھے اور اپنی قدیمی روایات سے بیگانہ بھی نہ تھے ۔ روہ کے پہاڑوں میں بود و باش رکھنے والے پشتون انگریز سے برسرپیکار تھے ۔ سڑکوں اور چھاونیوں کی تعمیر کی مخالفت جاری تھی ۔ قبائل اپنے علاقہ

کی "پردہ دری،، کے مخالف تھے ۔ لیکن انگریز اس کے سینہ پر سڑک اور ریل کی پٹڑی بچھانا ضروری سمجھتا تھا ۔ انگریز روس کی پیش قدمی سے خائف تھا اور سرحدی قبائل انگریز کی مداخلت کے مخالف تھے ۔ ان کو استعماری طاقتوں کی دلچسپی سے کوئی سروکار نہیں تھا ۔ یہاں کا عوامی شاعر بھی کہتا ہے[1] :

آہ ! زمانے کی گردش بھی تو دیکھئے
اسلام کی طاقت گھٹ گئی اور کفر زوروں پر ہے
ملکنڈ کی جانب فرنگی پیش قدمی کر رہے ہیں !
بہت سے مخبر ان کے آگے آگے جا رہے ہیں ۔
ملکنڈ[2] میں جنگ چھڑ گئی ۔
غازیوں نے دشمن پر ہلہ بول دیا ۔
اب پیچھے نہیں ہٹیں گے ۔
وہ محمدؐ کے دین کی خاطر لڑ رہے ہیں !
فرنگیوں کا قتل عام جاری ہے ،
'قلعہ' چکدرہ کے آہین کوت کے '
بند پنجرہ سے بندوقیں چوری ہو گئیں
ملکنڈ کے انگریز افسر موقع دیکھنے آئے ' اور
جب یہ تماشا دیکھا ' تو حیران و ششدر رہ گئے ! (ترجمہ)

پٹھانوں کے عوامی ادب خصوصاً لوک گیتوں میں اس قسم کے بے شمار نمونے موجود ہیں ۔ حرّیت و آزادی کی تڑپ کے ساتھ ساتھ اس دور کی عوامی شاعری اپنی تمام دیرینہ اقدار کے ساتھ پشتون مردوں اور عورتوں میں مقبول رہی ۔ ضرب و حرب اور عشق و رومان کے تذکروں کے علاوہ زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں بڑے بے تکلف اور سلیس پیرایہ میں بہت کچھ کہا گیا ہے ، لیکن عوامی گیت چونکہ بہت کم ضبط تحریر میں لائے جاتے ہیں ، اس لیے اس دور کے عوامی گیتوں کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا ہے اور جو تھوڑا بہت باقی بچا ہے وہ بھی زیادہ تر زبانی یادداشت تک محدود رہا ہے ۔ آج بھی شادی بیاہ کے علاوہ مکانوں ، حجروں ، کھلیانوں اور پنگھٹ پر یہ گیت گائے اور سنے جاتے

---

(۱) گلشن اشعار افغانی (قلمی)
نوٹ ۔ یہ تین مختلف چار بیتوں کے ٹیپ کے بند ہیں جن میں سے ایک سعادت ، دوسرا یاسین اور تیسرا کسی غیر معروف شاعر کا لکھا ہوا ہے ۔

ہیں - یہی ان کے اوقات فرصت کا بہترین مشغلہ ہے - اور انہی کے ذریعے سرحد کے باشندے اپنے ماضی سے منسلک رہے ہیں -

نظم و نثر کا دور جدید

برصغیر میں سیاسی تحریکوں کے شروع ہونے کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی میدان میں بھی طرح نو کی بنا ڈالی گئی - فکر و نظر کے زاویے آہستہ آہستہ بدلنے لگے - لکھے پڑھے شعرا اور ادبا کو غم دوش کے ساتھ فکر فردا بھی دامن گیر ہونے لگا - لب معشوق اور بادہ مبگوں کے طلسمات سے نکل کر یہ لوگ زندگی کے تلخ حقائق کو سمجھنے اور پرکھنے لگے، اور ان کے افکار و تحریرات نے آہستہ آہستہ ساری قوم کو جھنجوڑا - برصغیر کے مسلمانوں میں سرحد کے مسلمان بھی شامل ہیں - سرسید احمد خاں کی مسلمانوں کو علم جدیدہ کی طرف راغب کرنے کی کوششیں اور علی گڑھ تحریک نے مسلمانان برصغیر کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا - حالی کے مدّوجزر اسلام اور ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی ناولوں، مولانا شبلی کی سوانح اور اس قسم کی دوسری کتابوں کو چھپے ہوئے زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ غلام محمد خاں پوپلزئی ، میاں حسیب گل کاکا خیل ، میاں محمد یوسف سرخ ڈھیری اور چند دیگر علماء و ادبا نے اپنے مخصوص انداز میں پشتو زبان میں ان کا ترجمہ کیا - اس قسم کے تراجم سے مسلمانان ہند کے افکار و خیالات میں ہم آہنگی اور یگانگت کی راہ نکل آئی - اس زمانہ میں سرحد کے نوجوان حصول علم کی خاطر برصغیر پاک و ہند کی بڑی بڑی درسگاہوں اور تعلیمی اداروں میں داخل ہونے لگے اور جدید علوم کی روشنی میں نئے افکار و خیالات نے جنم لینا شروع کیا - پروفیسر صاحبزادہ محمد ادریس فرماتے ہیں کہ "بیسویں صدی کے اوائل میں قومی تحریکات کے آغاز اور پشتو زبان کے بہترین کلاسیکی ادب کے از سر نو مطالعہ کے ساتھ ساتھ جدید اُردو شاعری اور مغربی علوم سے روشناسی کی بدولت شعر و ادب میں ایک ایسا عظیم انقلاب رونما ہونے لگا جو بیک وقت قدما کے کلام و تحریرات کی حسن و خوبی اور عظمت و جلال کا حامل بھی تھا اور دور جدید کے فکر و نظر کا ترجمان بھی" ۔ ماضی و حال کی اس آمیزش نے شعر و سخن میں رنگینی اور تنوع بھی پیدا کیا اور فکر و نظر کو جلا بھی بخشی -

دور جدید کے پشتو شعرا میں غلام محمد پوپلزئی کے بعد سید راحت زلخیلی متفقہ طور پر پشتو ادب کی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار مانے گئے ہیں - راحت پہلے شخص ہیں جنہوں

---

(۱) "Pashto Poetry Through Twelve Centuries". Journal of The University of Peshawar. V. No. III.

نے علامہ اقبال کے کلام کے پشتو تراجم کے ذریعے مرحوم کے خیالات و افکار سے پشتو بولنے والوں کو روشناس کیا۔ مولانا عبدالقادر اپنے ایک مقالہ میں رقمطراز ہیں[1] - ''گرو مجھ سے پشتو شعر و سخن کے دور جدید کے علمبردار کی نشاندہی مطلوب ہو تو میں سب سے پہلے راحت زاخیلی کا نام پیش کروں گا ''۔ دور جدید کے شعر و ادب کے اکثر ناقدین اس رائے سے متفق نظر آتے ہیں - پروفیسر صاحبزادہ محمد ادریس کی رائے میں[2] '' راحت اپنے دور کے صاحب طرز ادیب اور شاعر ہیں - پشتو ادب کی نشاۃ ثانیہ آپ کی مرہون منت ہے ''۔ محمد اجمل خٹک لکھتے ہیں : ''راحت اپنے ہمعصر شعرا میں ایک بلند مرتبے کا مالکہ ہے - اس کے رواں اور عام فہم اشعار کا ایک حسین دیوان بھی ہے[3] '' - راحت موصوف ۱۹۶۳ع کے ابتدائی حصہ میں بیمار ہوئے اور کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے - مرحوم کی وفات کے بعد چند روز مولانا عبدالقادر مرحوم نے ان کی زندگی پر پشتو میں ایک مقالہ تحریر کیا ، جس میں ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ان کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے : ''وہ شعر و ادب کے ہر میدان کے شہسوار تھے - نظم ، غزل ، مثنوی ، رباعی ، غرضیکہ کوئی بھی صنف ایسی نہیں تھی جس سے راحت مانوس نہ ہو - راحت کے کلام میں عشق و محبت کے پر سوز ترانے بھی ہیں اور خار زار حیات کے تلخ حقائق کی ترجمانی بھی''[4]۔ داستان گوئی اور قصہ نویسی کے لیے راحت نے مثنوی کو پسند کیا - اس صنف میں آپ نے اپنا شاہکار 'قصہ سیف الملوک' لکھا - وہ فن کتابت کے ماہر تھے، جو کچھ لکھتے اس کی کتابت بھی خود فرماتے -

راحت ، اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال کے کلام سے بہت متأثر تھے - بیسویں صدی کے اوائل میں ان کے کلام کا جو بھی حصہ راحت کی نظر سے گذرتا ، یہ فوراً اس کا پشتو ترجمہ کر کے اس کو کسی اخبار یا جریدہ میں شائع کر دیتے - اسی طریقہ سے انہوں نے علامہ اقبال کی کتاب 'بانگ درا' کا ترجمہ مکمل کیا - یہی کتاب ان کی وفات سے چند روز قبل اقبال اکیڈیمی نے پشتو اکیڈیمی کی وساطت سے چھپوائی -

پشتو زبان کی جدید شاعری کے بارے میں محمد اجمل خٹک اپنے تبصرے میں لکھتے ہیں کہ : ''علمی ، سیاسی اور نظریاتی انقلابات کے زیر اثر پشتو ادب نے بھی آگے قدم بڑھانا شروع کیا - یہاں سے ادب میں جدت اور ارتقا کا ایک لیا اور عظیم انقلاب شروع ہوتا ہے - اس دور کو ہم دور جدید کہتے ہیں - (ان کے خیال میں) یہ دور

---

(۱) If I were to Point The Pioneer in the field of modern Pashto Poetry I would give Rahat Zakhili the pride of place".

(۲) "Pashto Poetry Through Twelve Centuries".

۳ - اجمل خٹک - مقالہ' الک کے اس پار ، ص ۱۳۸

۴ - مولانا عبدالقادر - مقالہ' راحت زاخیلی - پشتو اکیڈیمی

۱۳۰۰ ہجری مطابق ۱۸۸۲ع سے شروع ہوتا ہے ۔ اس دور نے پشتو ادب میں مختلف مدرسہ ہائے فکر کو جنم دیا ۔ اور ہر سکول نے اپنے مخصوص فکری اور ادبی طرز کے شعرا پیدا کیے ۱ "۔ موصوف نے اس دور کو جدید تعلیم یافتہ طبقہ ، عروضی مکتب ، صوفیانہ مدرسہ' فکر اور سیاسی مدرسہ' فکر کے چار بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اگرچہ مکاتیب فکر کی یہ تقسیم بہت حد تک صحیح ہے' لیکن شعرا کے کسی مخصوص دائرہ کو کلی طور پر کسی خاص مکتب فکر تک محدود نہیں کیا جا سکتا ۔ اپنے اپنے انداز میں ہر ایک نے بدلتی دنیا کے کوائف و حالات کا اثر بھی قبول کیا ، وقت کی پکار کی ترجمانی بھی کی اور اپنے مبلغ علم اور میلان طبع کے مطابق اپنے نظریات کی تلقین و تبلیغ بھی ۔ پھر بھی اگر ایک طرف نیم عروضی اشعار کے ارتقائی تسلسل کی صورت میں علامہ عبدالعلی مرحو اور امیر حمزہ سنواری کے صوفیانہ ، فلسفیانہ اور حکیمانہ اسعار اور سمندر خان سمندر کا متنوع عروضی کلام پیش کیا جا سکتا ہے ، تو دوسری طرف سید رسول رسا ، فضل حق شیدا ، عظیم شاہ خیال بخاری ، اشرف مفتون ، فضل احمد غر ، سید محمد مینوس ، صاحبزادہ محمد ادریس ، محمد یونس خلیل ، طاہر کلاچوی آتے ہیں ۔ بلوچستان کے خطہ میں ملا عبدالسلام ، مولوی عبدالخالق ، سید محمد رسول فریدی ، سلطان محمد صابر، سلطان محمد بابی ، فاروق سائیلزی ، نظیر درانی ، عبدالغفور درانی ، محمد زمان خان اچکزئی ، عبداللہ خان مدو خیل ، عبدالحی بوستانی ، عبدالطیف شارانی اور ملک محمد عثمان ہیں ۔

نوجوان شعرا میں ایاز داؤد زئے ، اجمل خٹک ، ولی محمد طوفان ، قلندر مومند ، مراد شنواری ، پیر گوہر ، عبدالحق نسیم ، غفران اللہ جاوید ، عبدالرحیم مجذوب ، محمد اعظم اعظم ، محمد ہاشم بابو ، شفقت سہاب کاکا خیل، مطیع اللہ ناشاد ، عبدالرحمٰن شہاب اور ظفراللہ خان ظفر قابل ذکر ہیں۔

خطۂ پشاور کے جن سعرا نے خاص طور پر اپنے آپ کو جنگ آزادی کے لیے وقف کیا تھا اور جن کا کلام بیداری اور خود مختاری کے حق میں اور دور محکومی کے جبر و استبداد کے خلاف صور اسرافیل ثابت ہوا ، ان میں محمد اکبر خادم ، فضل محمود مخفی ، عبد الاکبر خان اکبر ، فضل رحیم ساقی ، محمد اسلم خان شرر ، عبدالحکیم خان ستی . میاں احمد شاہ بیرسٹر ، عبدالغنی خان غنی ، امیر نواز جلیا ، عبدالخالق خلیق ، دوست محمد خان کامل ، محمد نواز خٹک ، عبدالمالک فدا کے نام قابل ذکر ہیں ۔

دوسری جنگ عظیم میں جنگ کی تباہ کاریوں کے روز افزوں احساس نے عوامی

---

۱ ۔ اجمل خٹک ۔ مقالہ' پشتو ادب اٹک کے اس پار ص ۱۳۹ ۔

شاعری میں فکر مندی اور تنفر کے جذبات کو اجاگر کیا ۔ جیسے :

میں اگر غمگین ہوں تو
اس وجہ سے کہ میرا محبوب
چوری چھپے جاپان کے خلاف
جنگ میں شریک ہونے جا رہا ہے ۔
کیونکہ فوجی بھرتی شروع ہو گئی ہے ۔
جاپانی بے وجہ چین سے لڑ رہے ہیں
ایک طرف ظالم ہے دوسری طرف مظلوم
آج کل دنیا میں
ہر طرف ایک نیا ستم برپا ہے ۔
ہر ایک اپنی ہی بدنیتی کی آگ میں جل بھن کر تباہ ہوگا !
سرزمین یورپ سے یہی فریاد سنائی دے رہی ہے !
پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریاں
بھی تو بھلائی نہیں جا سکتیں ، مگر
دیکھئے یہ ایک پر خطر انقلاب رونما ہو رہا ہے[1] ۔ (ترجمہ)

یہ اور اس قسم کی بے شمار نظمیں زبان زد عوام نہیں ۔ ساتھ ہی ساتھ آزادی کی تحریکات بھی زور پکڑ رہی تھیں اور جنگ عظیم بیداری اور غیرت کا تازیانہ ثابت ہو رہی تھی :

آزادی اور غلامی آج کل
ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں
کوئی سرافراز ہو گا تو کوئی سرنگوں ہو کر رہے گا !
اے پشتون ! اب تو خواب غفلت میں پڑا نہیں رہ سکتا
بیدار ہو ! کہ اب
تمہارے امتحان کے دن بھی قریب آگئے[2] ۔ (ترجمہ)

---

(۱) فردوس خان ۔ مسلسل غزل مجلہ لن پرون جون ۱۹۴۱ع
(۲) میر رحمان غازی ۔ مجلہ لن پرون ، غزل ۔

اس قسم کے بے شمار تحقیقی شہ پارے پشتو زبان کے ادب عالیہ کا حصہ نہ بن سکے اس لیے کہ یا تو ان کو چھپنے کا موقع ہی نہ مل سکا اور یا اگر چھپ بھی گئے تو اخبارات و جرائد کی فائلوں کی ندر ہو گئے ۔

دور جدید کے شعر و ادب کے سلسلہ میں مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ تحریک آزادی کے زمانہ کے شعرا اور قیام پاکستان کے بعد کے شعرا کو دو حصوں میں بانٹا نہیں جا سکتا۔ بیسویں صدی کے نصف اول کے تمام بلند پایہ شاعر سوائے فضل محمود مخفی مرحوم کے قیام پاکستان کے بعد بھی زندہ تھے ۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ آزمودہ کار اور نوجوان طبقے کے دو حصے کیے جائیں ۔ پہلے حصہ کے اکثر شاعر جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاسی کشمکش کے تجربات سے بھی بہرہ یاب ہوئے ہیں اور نوجوان طبقے کے سامنے جو اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہے آزاد زندگی کا وسیع میدان ہے ۔ جس میں فکر و نظر کی جولانی کے لیے بے شمار مواقع ہیں ۔ اگر اول الذکر قیام پاکستان کے علمبردار تھے ، تو مؤخرالذکر اس کے استحکام کے ضامن اور ذمہ دار ہیں ۔

قیام پاکستان کے سلسلہ میں پشتو اہل قلم ادبا اور شعرا نے جو کام کیا اس کا تفصیلی ذکر بہت طویل ہے ۔ البتہ اتنا کہنا مناسب ہو گا کہ آزادی کے ان متوالوں نے زبان و قلم کے ذریعے ملک و قوم کی زبردست خدمت کی ۔ انہوں نے قریہ قریہ ، گاؤں گاؤں آزادی و حریت کے ترانے گائے اور ۱۹۳۰ء میں رائے عامہ کو اس حد تک بیدار کیا کہ برطانوی حکمران اور ہندوستانی لیڈر دونوں انگشت بدندان رہ گئے ۔ پنڈت نہرو نے اس بیداری کو وقت کے تین عظیم حقائق میں سر فہرست رکھا ہے ۔ وہ اپنی بیٹی مسز اندرا گاندھی کو ایک خط میں لکھتے ہیں ' کہ !

" تین حقیقتیں جو میں تمہارے علم میں لانا چاہتا ہوں' ان میں سب سے پہلے شمال مغربی سرحدی صوبے کے باشندوں کی غیر معمولی سیاسی بیداری ہے!۔

اور متقدمین میں سے شیخ بٹن علیہ الرحمۃ کی مانگی ہوئی یہ دعا !

اے عظیم و برتر خدا ! اس قوم کو بڑھا

جس میں اس نے اپنی اولاد اور قوم کے پھلنے پھولنے کی تمنا ظاہر کی تھی ۔

اس کے نو سو سال بعد فضل محمود مخفی مرحوم اس قوم کے متفق اور متحد ہونے کے لیے دست بہ دعا نظر آتا ہے ۔ اس نے اپنی تمنا کا اظہار یوں کیا ہے[۲] :

(۱) مہر رحمان غازی مجلہ فن پروں ۔

(۲) مجلہ پشتون ۱۹۳۷ء ۔

اے مالک تو ہمارے اتفاق و اتحاد کا حجرہ
آباد کر! اور
خود بخود پشتون قبائل کے اس منتشر گروہ کو
یکجا کر دے

پاکستان کا قیام چند افراد کی نہیں بلکہ ساری ملّتِ اسلامیہ ہند و پاک کی فتح تھی اور اس کشمکش میں پشتون مجاہد ، ادیب ، شاعر اور اہلِ قلم اول سے آخر تک کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ امبیلہ ، ملاکنڈ ، باجوڑ ، چترال ، مہمند ، تیراہ اور وزیرستان میں یہی مجاہد انگریز کے خلاف برسرپیکار رہے ۔ انہوں نے حلفیہ کہا تھا [۱] :

اے میرے وطن ! یا تو تجھے آزاد دنیا کا ہمسر بناؤں گا
یا تیری خاطر اپنے آپ کو قربان کروں گا !
میں غیور پشتون ہوں، تجھے میرے افسانے یاد ہیں
اے میرے وطن اے میرے لعل و جواہر کے خزانے !

انہی ارادوں کے ساتھ بے شمار سرفروشوں نے سر کی بازی لگائی ۔ بہت سارے جیلوں میں ٹھونسے گئے اور بہتوں کو ملک بدر کیا گیا ۔ ان کے مال و اسباب لوٹ لیے گئے اور جائیدادیں ضبط کر لی گئیں ۔ لیکن اپنی ہٹ کے یہ پکے مجاہد کاروانِ آزادی کے ہراول میں اپنی منزل کی جانب بڑھتے گئے ۔

جدید تعلیم یافتہ حلقہ کے سلسلہ میں سر صاحبزادہ عبدالقیوم اور آپ کے قائم کردہ اسلامیہ کالج کا ذکر بھی لازم ہے ۔

نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم اور اسلامیہ کالج پشاور

نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان بیسویں صدی عیسوی میں ملّتِ اسلامیہ کے ان نامی گرامی فرزندوں میں سے ایک ہیں جن پر ہندی مسلمانوں کو بالعموم اور سرحد کے باشندوں کو بالخصوص ناز ہے ۔ نواب صاحب ضلع مردان کے موضع ٹوپی میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد مرحوم مولوی عبدالرؤف ایک جیّد عالم تھے ۔ علمی ، عملی ، سیاسی، مذہبی اور انتظامی امور میں نواب صاحب یگانۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے ۔ سیاسی لحاظ سے آپ طرزِ جمہوریت کے قائل تھے ۔ ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرس منعقدہ لندن میں آپ نے اپنے صوبہ کی نمائندگی کی اور صوبہ سرحد کے لیے اصلاحات کی پہلی قسط حاصل کرنے

---

(۱) عبدالغنی خان (لیونے فلسفی)

میں کامیاب ہوئے ۔ آپ کی مساعی سے صوبہ سرحد کی پہلی قانون ساز اسمبلی کی تشکیل ہوئی چنانچہ آپ صوبہ سرحد کے پہلے وزیر اعظم بنائے گئے ۔

مرحوم نواب صاحب نے سرحد میں علم و ادب کے سرچشمہ دارالعلوم اسلامیہ کالج پشاور کی ۱۹۱۳ء میں بنا ڈالی ۔ گذشتہ آدھی صدی میں اس دارالعلوم نے عظیم الشان ترقی کی اور قیام پاکستان کے کوئی تین سال بعد یہاں پر یونیورسٹی قائم کی گئی ۔ آج کل اگر ایک طرف اس مرکزِ علم و ادب میں اسلامی تعلیات کا چرچا ہے تو دوسری طرف پہلی جماعت سے لے کر ایم ۔ اے ، ایم ایس سی ، ایم ۔ ای ڈی ، قانون ، طب ، انجینئرنگ ، زراعت وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم بھی دی جاتی ہے ۔ مشرق اور مغربی زبانوں یعنی اُردو ، عربی ، فارسی ، پشتو ، چینی ، ترکی ، انگریزی ، جرمن اور فرانسیسی کی تعلیم و تدریس کے علاوہ پشتو زبان و ادب کی ترقی و ترویج اور علاقائی ادب ، تاریخ وثقافت کی تخلیق اور مطالعہ کے لیے ایک اکیڈیمی بھی حکومتِ پاکستان نے قائم کی ہے ۔

صاحبزادۂ مرحوم کی قائم کردہ اس عظیم درسگاہ نے ملک کی انتظامیہ ، عدلیہ اور دفاع کے علاوہ سائینسی ، فنی اور سیاسی اداروں کو قابل فخر عملہ فراہم کیا ۔ ساتھ ہی زبان و ادب کی خدمت اور علوم و فنون کی ترقی کے لیے اعلیٰ پایہ کے اہلِ قلم ، محقق اور مفکّر بھی پیدا کیے ۔ ان حضرات میں بےشمار نوجوانوں کے علاوہ مولانا عبدالقادر مرحوم، میاں سید رسول رسا ، فضل حق شیدا ، امیر حمزہ شنواری ، عظیم شاہ خیال بخاری ، محمد اشرف مفتون ، نصر اللہ خان بیرسٹر جیسے اکابر بھی شامل ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ پشتو زبان و ادب کی نشاۃ ثانیہ کے ضمن میں نواب صاحب مرحوم اور ان کے کالج کا ذکر لازماً کرنا پڑتا ہے ۔ یہی کالج سرحد کے پشتونوں کا مقدس ورثہ بن چکا ہے ۔ کیونکہ بقول سراولف کیرو ”اسلامیہ کالج کے وجود سے پٹھان قومیت کا جو احساس بیدار ہوا ، اسے اس وسیع النظری نے متوازن کر دیا ، جو ان کلاسوں میں سکھائی جاتی تھی،،۔

سر عبدالقیوم نے اسلامیہ کالج میں مشہور اورینٹل لائبریری قائم کی جس میں ہزاروں کی تعداد میں علمی نوادرات کو محفوظ کرایا ۔ قلمی کتابوں اور دستاویزات کے اس بیش بہا ذخیرہ میں پشتو کلاسیکی ادب کے کئی مجموعے بھی موجود ہیں ۔ ’گلشنِ اشعارِ افغانی‘ کے نام سے دو جلدوں پر مشتمل پشتو لوک گیتوں کی ایک ضخیم کتاب بھی اس کتب خانہ میں محفوظ ہے ۔ یہ مجموعہ ان کی خواہش پر ۱۹۰۱ء میں موضع ٹوپی (تحصیل صوابی) کے سید عمر نامی ایک شخص نے جمع کیا تھا ۔ یہ کتاب انیسویں صدی کے عوامی جذبات و افکار کا مرقع ہے ۔

۴ دسمبر ۱۹۳۷ء کو سر عبدالقیوم اسلامیہ کالج کی سلور جوبلی کے انتظامات کی تکمیل کے بارے میں کالج کے ایک پروفیسر سے مصروفِ گفتگو تھے کہ دماغ کی ایک شریان کے پھٹ جانے سے اچانک انتقال فرما گئے۔

جدید نثر

تحریر و ترجمہ کا کارواں مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ میاں عنوان الدین ، میاں نعمان الدین ، میاں محمد یوسف اور میاں حسیب گل کاکا خیل نے علے الترتیب 'عنوان النصائح' ' سفرنامہ' ابن بطوطہ' ' 'توبۃ النصوح' اور 'مراۃالعروس' کے تراجم سے پشتو ادب میں نثر جدید کا آغاز کیا اور اس طرح چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں پشتو زبان کا نثری ادب بھی اپنے نئے دور میں داخل ہوگیا۔ جدید نثری دور کے ابتدائی حصہ کی چند اہم شخصیتوں میں میاں محمد یوسف کاکا خیل موضع سرخ ڈھیری اور میاں عنوان الدین کاکا خیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ میاں محمد یوسف نے مشہور کتاب 'توبۃ النصوح' کا پشتو ترجمہ کیا۔ جو بقول محمد اجمل خٹک "روانی' عام بول چال کے ساتھ مطابقت ، روزمرہ محاوروں اور ضرب الامثال کے استعمال کے لحاظ سے نثرِ جدید کے ابتدائی دور کی ایک کامیاب کوشش ہے"۔ یہ کتاب ۱۹۰۴ء/۱۳۲۲ھ میں چھپی۔ میاں عنوان الدین نے 'عنوان النصائح' کے نام سے 'اخلاق محسنیٰ' کا پشتو میں ترجمہ کیا۔ مولانا عبدالقادر مرحوم اپنے ایک مقالہ "جدید پشتو نثر" میں لکھتے ہیں کہ "جدید اور زور دار نثری ادب کی ابتدا انہی دنوں میں ہوئی"[1] اس دور میں ماضی کے ان تمام بندھنوں کو توڑا گیا جو قدیم نثری ادب کی عظمت و جلال کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ مسجع اور مرصّع نثری تحریروں کی جگہ سادہ اور سلیس نثر کا رواج عام ہو گیا۔ اس دور کے نثر نگاروں نے اس میدان میں بے حد محنت کی۔ اگرچہ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ اس دور میں بھی شعری ادب کو نثری ادب پر فوقیت حاصل رہی۔ پھر بھی نثری ادب اپنا جائز مقام پانے میں ایک حد تک کامیاب رہا۔ علوم جدیدہ کی ترویج کے ساتھ ساتھ دنیا کے اس خطہ میں بھی پشتون عالم ، شاعر اور ادیب پشتو نثر کو ترقی دینے میں ہمہ تن کوشاں نظر آئے۔ علمی ، ادبی ، سائینسی ، معاشرتی سیاسی غرضیکہ ہر میدان میں پڑھنے والوں کے لیے پشتو نثر میں مواد فراہم کیا جانے لگا۔

لغت سازی

پشتو زبان میں لغت سازی کا کام ایک عرصہ سے جاری ہے۔ نواب محبت خاں روہیلہ اور نواب اللہ یار خاں روہیلہ نے 'ریاض المحبت' اور 'عجائب اللغات'

---

۱ ۔ مولانا عبدالقادر : مقالہ ، پشتو کی نثر جدید

کے نام سے پشتو فارسی لغت اور گرائمر کے دو مجموعے بہت پہلے مرتب کیے تھے ۔ اس کے علاوہ دو مستشرقین مسٹر بلیو اور میجر راورٹی نے بھی پشتو انگریزی لغت کے دو مجموعے شائع کیے ۔ قاضی حمر اللہ نے 'خیر اللہ لغات' کے نام سے پشتو زبان کی ایک لغت لکھی ۔ اس کے بعد راحت زاخیلی نے 'لغاتِ افغانی' مرتب کی ۔ ایچ ۔ ایس انوار الحق صاحب نے بھی لغت کی ایک کتاب 'انوار اللغات' کے نام سے مدون کرنا چاہی' جس پر موصوف کوئی تیس سال تک کام کرتے رہے ۔ لیکن یہ لغت شائع نہ ہو سکی ۔ البتہ آپ کا تیار کردہ مسودہ پشتو اکیڈیمی کی مجوزہ سہ لسانی لغت 'پستوژبہ' میں ضم کر لیا گیا اور آپ خود بھی پشتو اکیڈیمی کے لغت سازی کے شعبہ سے منسلک ہو گئے ۔ پردل خاں خٹک اس میدان میں آپ کے دست راست ہیں اسی عرصہ میں میاں بہادر شاہ ظفر کا کاخیل نے 'ظفر اللغات' کے نام سے اپنی کتاب شائع کی اور مرکزی اردو بورڈ کی جانب سے بھی ایک پشتو اردو لغت منضبط کرائی گئی ۔ افغانستان میں بھی پشتو لغت سازی کا کام کچھ مدت سے جاری ہے۔ 'پشتو سینہ' اور 'پشتو قاموس' کے نام سے پشتو کتابیں پشتو ٹولنہ کابل نے شائع کی ہیں ۔ وہاں کی وزارت معارف کی طرف سے ایک پشتو دائرۃ المعارف ، آریانا ، کے نام زیر تدوین ہے ۔

کچھ ترقی یافتہ بیرونی ممالک مثلاً روس اور امریکہ میں بھی پشتو لغت سازی پر کام جاری ہے - ۱۹۶۵ء میں روس کی ادبیات شرقیہ کے مرکز کی جانب سے ایک ضخیم پشتو روسی قاموس چھپ چکی ہے ۔ یہ قاموس پشتو زبان کے پچاس ہزار الفاظ ، محاورات اور ضرب الامثال پر مشتمل ہے ۔ با این ہمہ پشتو زبان کی ایک جامع لغت کی تیاری میں اب بھی مادی وسائل و ذرائع کی کمی حائل ہے اور وقت کی ایک یہ اہم ضرورت پورا ہونے کے لیے کچھ عرصہ اور بھی منتظر رہنا ہے ۔

افسانہ ، ناول اور ڈرامہ

نثری ادب کی دیگر اصناف کے برعکس افسانہ ، ناول اور ڈرامہ تینوں بیسویں صدی کی پیداوار ہیں ۔ ظاہر ہے کہ دیگر اقوام کی طرح داستانیں اور رومان پشتو ادب میں بہت پہلے سے رائج رہے ہیں ۔ جن کو یا تو منظوم پیرایہ میں کتابوں کی زینت بنایا گیا اور یا یہ سینہ بہ سینہ یاد کیے جاتے رہے ۔ قصوں ، کہانیوں اور داستانوں کی اس روایتی شکل کو افسانہ ، ناول یا ڈرامہ سے تکنیکی لحاظ سے کوئی میل یا رابطہ نہیں ۔ البتہ ان نئے ادبی اصناف کے لیے کلاسیکی ادب کے اس بڑے ذخیرہ کو بطور خام مال کے استعمال کیا جا سکتا ہے ۔

جدید تحقیق کی رو سے راحت زاخیلی کا لکھا ہوا افسانہ 'کنڈہ جینئی'

(بیوہ لڑکی) پشتو کا اولین افسانہ ہے' جو مرحوم نے ۱۹۱۷ع میں لکھا۔ اس کے بعد انہوں نے 'شلیدلے پنڑہ' (پھٹاجوتا) ۱۹۱۸ع میں لکھا۔ مؤخر الذکر افسانہ پہلے 'افغان' اور پھر 'سرحد' نامی اخبار میں شائع ہوا۔

مذکورہ بالا دونوں افسانے پشتو زبان کے اولین افسانے مانے جاتے ہیں۔ پشتو افسانہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی کے مختلف مدارج طے کرتا ہوا تمام جدید ترین اقدار کا حامل ہو گیا۔ دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق شہری اور دیہاتی زندگی کے علاوہ روز افزوں معاشی، اقتصادی اور صنعتی مسائل کو بھی اپنے موضوعات میں سمونے کے قابل ہو گیا۔

اس وقت تک کثیر التعداد پشتو افسانے مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس عام پسند اور دلچسپ صنف کی جانب پشتون اہلِ قلم، خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ متوجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنف میں لکھنے والوں کی تعداد روز افزوں ہے۔

ابتدائی دور کے پشتو افسانہ سے لے کر موجودہ دور کے افسانوں کے بتدریج مطالعہ سے اس صنف کے آغاز اور آج کل کے افسانہ کی جامعیت اور فنی لحاظ سے اس کی تکمیل کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور میں میر مہدی شاہ، قلندر مومند اور گل افضل خان کے افسانوں کو اوّلیت حاصل ہے۔ تینوں کا رحجان ترقی پسند اثرات کا تابع معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً قلندر مومند کی کتاب 'گجرے' تو خالصتاً اسی قسم کے موضوعات کی حامل ہے۔ ویسے سیف الرحمان سید اور ڈاکٹر شاہ افضل نے بھی بلند پایہ افسانے لکھے ہیں۔ جن افسانہ نویس حضرات کے افسانے کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں ان میں میر مہدی شاہ کے 'پت' 'نشان' اور 'دبوڑی ٹال' (دھنک) نادر خان بزمی کا 'پلوشے' (کرنیں) ماسٹر عبدالکریم کا 'جولئی گاونڈ' (جھولی بھر پھول) عبدالرؤف نوشہروی اور محمد یوسف کاکا خیل کے افسانے 'درشہوار' اشرف حسین احمد کے 'مورے نشتے' 'شندی گل' قلندر مومند کا 'گجرے' گل افضل خان کا 'کگے لارے' (ٹیڑھے راستے) مبارک سلطانہ کا 'نوے سحر' (نیا سویرا) زیتون بانو کا 'هنداره' (آئینہ) افسانوں کے مجموعے قابل ذکر ہیں۔

پشتو افسانہ کی تاریخ و تنقید پر بھی کچھ نہ کچھ کام ہو رہا ہے اور اس کی خصوصیات و ارتقاء پر تنقید وتبصرے کیے جا رہے ہیں۔ مجلہ 'قند' کے افسانہ نمبر میں پشتو افسانہ کے بارے میں رضا ہمدانی، قلندر مومند، تکریم الحق، روغ لیونے اور قاضی

عبدالحلیم اثر افغانی کے تنقیدی مقالے چھپ چکے ہیں - ان میں روغ لیونے کی تنقید بہت کڑی اور قابل غور ہے - اس موضوع پر مختلف ادبی مجالس میں بھی تنقیدی مقالے پڑھے جاتے ہیں - ان میں محمد اجمل خٹک کا اردو مقالہ 'پشتو ادب'، محمد یوسف کاکاخیل کا لکھا ہوا 'در شہوار' نامی کتاب کا پیش لفظ ' دافسانے حقیقت' محمد اعظم اعظم کا مقالہ بعنوان 'پشتو افسانہ'، اور محمد موسیٰ خان کا لکھا ہوا پشتو افسانے کی سرگذشت ' پشتو افسانہ حنگہ راورسیدہ ' - 'مشیقی ادب' کے عنوان سے پشتو افسانہ پر سیف الرحمان سید 'رشید علی دہقان' مراد علی شنواری اور محمد نواز طائر کے لکھے ہوئے مسلسل مضامین بھی چھپ چکے ہیں -

ان کے علاوہ شریف حسین ساحر نے اپنی کتاب 'پشتو ادب کی مختصر تاریخ' اور حبیب الرحمان سحر یوسفزئی کی کتاب 'تنقید خہ دے' (تنقید کیا ہے) میں پشتو افسانہ کی مختصر تاریخ کے ساتھ تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے -

ناول کی شکل کی جو کتاب آزاد ترجمہ کی صورت میں سب سے پہلے پشتو ادب کا حصہ بنی وہ ڈپٹی نذیر احمد کی مشہور کتاب 'مراۃ العروس' ہے جسے 'نقش نگین' کے نام سے پیش کیا گیا - اس وقت تک پشتو ادب اس میدان میں قطعی طور پر نا آشنا تھا - اس کے بعد مرحوم قاضی رحیم اللہ کی کتاب 'نوی روشنی' (نئی روشنی) جو بیسویں صدی کے ربع اول میں لکھی گئی، خاص اہمیت کی حامل ہے - اس کتاب میں ناول اور ڈرامہ کی مشترک خصوصیات پائی جاتی ہیں اس لیے اسے ان ہر دو اصناف کو 'سنگ میل' کا رتبہ دیا جاتا ہے - اگرچہ بعض ناقدین کے خیال میں پشتو زبان کا پہلا حقیقی ناول راحت زاخیلی کا لکھا ہوا ' نتیجۂ عشق ' ہے - لیکن پلاٹ اور اندازِ بیان کی خامیوں کے پیش نظر ' نتیجۂ عشق ' کو پشتو ادب کے ناقدین اگلے وقتوں کی رومانی داستانوں کی ایک منثور کڑی سمجھتے ہیں - پھر بھی اسے اس نئی صنفِ ادب کی جانب ایک قدم کہا جا سکتا ہے - اس کے بعد کچھ عرصہ تک پشتو زبان میں ناول نویسی کے فن پر جمود طاری ہو گیا اور پاکستان بننے کے کچھ ہی عرصہ بعد یہ جمود یک لخت ٹوٹا اور تھوڑے عرصہ میں 'پیغلہ' (دوشیزہ) مصنفہ صاحبزادہ محمد ادریس، ' نوی چپے ' (نئی لہریں) از امیر حمزہ شنواری، ' دوسرو تعویز ' (سونے کا تعویز) از رشید علی دہقان، 'زرکے سترگے' (کرنجی آنکھیں) از اشرف درّانی 'چاوئی شیشہ' (شیشے میں بال) از ماثو خان اور ان کے بعد میاں سید رسول رسا کے چار ناول ' شمتی ' ، ' ماموئنی ' ، ' مغرور ' اور ' خودکشی ' چھپ کر بازار میں آگئے - ان کے علاوہ غیر مطبوعہ مسودات کی صورت میں کئی ایک اچھے ناول موجود ہیں - جن کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے -

بعینہ مذکورہ بالا کیفیت ڈرامہ کی رہی ہے - ہندی تھیٹریکل کمپنیوں کی

سرحد میں آمد سے یہ صنف ادب مقبول ہو گئی ۔ پشتو زبان کے اہلِ قلم حضرات نے محسوس کیا کہ پشتو میں ڈرامہ اصلاح و بیداری کا اچھا ، دلچسپ اور موثر ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے ۔ تحریکِ آزادی کے چلانے میں بھی پشتو ڈرامہ بہت کارگر ثابت ہوا ۔ پہلا ڈرامہ جو اس غرض کے لیے سٹیج کیا گیا وہ عبدالاکبر خان اکبر کا لکھا ہوا تھا ۔ عبدالاکبر خان اکبر متفقہ طور پر پشتو ڈرامہ کے باوا آدم مانے جاتے ہیں ۔ امیر نواز جلیا کا لکھا ہوا ڈرامہ 'درد' اپریل ۱۹۳۰ع کو سٹیج کیا گیا ۔ اس نے سیاسی بیداری کے میدان میں پہلے دھاکے کا کام کیا ۔ اس کے فوراً بعد ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ع کو پشاور میں قصہ خوانی بازار میں گولی چلنے کا تاریخی سانحہ پیش آیا ۔ اس فائرنگ میں سینکڑوں نہتے مظاہرین اور راہ چلتے مسافروں کو استعماری گولیوں کا نشانہ بنایا گیا ۔ لیکن اس واقعے نے آزادی کی تڑپ اور بھی تیز کر دی اور مکمل آزادی کا کارواں آگے ہی آگے بڑھتا گیا ۔ اسی سال جولائی کے مہینے میں عبدالخالق خلیق کا ڈرامہ 'خدائی خدمتگار' زارت کاکا صاحب میں سٹیج کیا گیا[1] ۔ اس کے بعد 'دجنت مانڑی' (قصر جنت) نامی ایک تمثیل جو میاں عبدالرزاق کی لکھی ہوئی تھی ، اسلامیہ کالج کے سٹیج ہر پیش کی گئی ۔ محمد اسلم خان خٹک کا ڈرامہ 'دوینو جام' (خون کا پیالہ) ۱۹۳۵ع میں شائع کیا گیا ۔ یہ ڈرامہ کئی بار سٹیج بھی ہوا ۔ 'دوینو جام' یعنی 'خون کا پیالہ' ایک اچھے ڈرامہ کے اقدار و لوازمات کے لحاظ سے اس میدان کی ایک کامیاب کوشش مانی گئی ہے ۔ اس کے بعد ہفتہ وار ریڈیائی ڈراموں کے علاوہ بہت سے مختصر ڈرامے مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں[2] ۔

اسلم خان خٹک کے مذکورہ بالا ڈرامہ کے ساتھ ہی عبداللہ جان اسیر کا مشہور ڈرامہ 'درس عبرت' بھی کتابی شکل میں شائع ہوا ۔ اسی سال ایک اور ڈرامہ 'شہیدہ سکینہ' مصنفہ عبدالخالق خلیق منظر عام پر آیا اور موضع پبی ضلع پشاور میں سٹیج بھی کیا گیا ۔

محمد افضل رضا نے اپنے تنقیدی مقالہ میں ۱۹۳۵ع کو پشتو ڈرامہ کی 'خوش بختی' کا سال کہا ہے[3] ۔ یہیں سے ادب کی اس صنف میں نمایاں ترقی ہونے لگی ۔ ۱۹۳۵ع میں عبدالاکبر خان اکبر نے 'جونگڑہ' نامی ایک اور ڈرامہ لکھا ۔ میاں سید رسول رسا کا ڈرامہ 'مسافر' بھی انہی ایام میں ماہنامہ 'نن پرون' میں شائع ہوا ۔

---

(۱) پروفیسر افضل رضا ڈرامہ (تاریخ ، تنقید اور فن) ص ۴۰ ۔
(۲) اجمل خٹک (مقالہ) اٹک کے اس پار ، ص ۱۸۴ ۔
(۳) محمد افضل رضا ڈرامہ (تاریخ ، تنقید اور فن) ص ۵۵ ۔

عبدالاکبر خان اکبر کو عام طور پر پشتو ڈرامہ میں سیاسی افکار کو روشناس کرنے والا بھی کہا گیا ہے۔ ماسٹر عبدالکریم ایک جگہ لکھتے ہیں کہ نہ پشتو زبان و ادب کی خوش نصیبی تھی کہ اکبر جیسا اچھے پائے کا تمثیل نگار اس کو ملا۔ اسی دور کا ان کا آخری ڈرامہ 'کاروان رواں دے' کے نام سے موسوم ہے۔

ریڈیائی ڈراموں میں سب سے نامور ادیبوں اور تمثیل نگاروں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ان میں عبدالکریم مظلوم، امیر حمزہ خان سنواری اور سمندر خان سمندر (نعمہ ممدر) نے خوب نام پیدا کیا۔ مظلوم کے گیارہ ریڈیائی ڈراموں کا ایک مجموعہ 'حھرے' یعنی 'چہرے' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ان کے علاوہ میجر ایس۔ اے رحمان، معظم شاہ خمال بخاری، میاں سید رسول رسا، محمد اجمل خٹک، یوسف خان اور کرٹی، عبداللہ جان مغموم، رضا مہمندی، داؤدزے، مراد شنواری، رشید علی دہقان، اشرف درانی اور عبداللہ جان اسیر اور کئی ایک اور اہل قلم نے بھی قابل ذکر کام کیا ہے۔ 'دودنو جام' 'جونگڑہ' (جھونپڑی)' 'نیمگڑے حوب' (ادہورا خواب)، 'درس عبرت'، 'سہیدہ سکینہ'، 'تربور' 'اور او اوبہ' (آگ اور پانی)، 'دوبس سوداگر'، 'لشے' (ڈنک)، 'نورہ چہ تیریری' (تلوار جو تیز کی جاتی ہے)، 'عبرت'، 'انصاف' اور 'ومل' نامی ڈراموں کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔

افسانہ، ناول اور ڈرامہ تینوں پشتو ادب کی نشاۃ ثانیہ میں ایک ہی دور کی پیداوار ہیں۔ یہ ایک ساتھ ہی پیدا ہوئے اور پھولے پھلے۔ ان کے موضوعات مشترک ہیں اور تینوں ایک ہی منزل کی طرف گامزن ہیں۔ پشتو ادب کی ان اصناف کا قومی اصلاح، بیداری اور ترقی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پشتون اہلِ قلم نے انہی کے ذریعے پشتون معاشرہ کے خد و خال اجاگر کیے اور غلط رسم و رواج اور افکار و عقائد کے ناسوروں پر نشتر زنی کی۔

مقالہ نگاری

پشتو ادب میں مقالہ نگاری بیسویں صدی کے اوائل تک مفقود معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کم عمری کے باوجود یہ صنفِ ادب جس قدر کامیاب اور خوش آیند مستقبل کی حامل ثابت ہوئی وہ زبان و ادب کی تاریخ میں بے مثال ہے۔ 'مقالہ نگاری اور صحافت پشتو ادب میں توام ہیں'۔ 'اخبار افغان' کی ابتدائی اشاعتوں سے لے کر سرحد، سیلاب، انگار، آزاد پشتون، پشتون، نن پرون، زوند، (دہلی) خیبر

اسلم پشتو (کوئٹہ) گلستان ، غنچہ ، اباسین ، دوران ، جمہور اسلام ، زوند (پشاور) قند ، لار ، ننگیالے ، خپلواک ، رنڑا ، لیکوال' چنار ، ایلم ہدایت ، رہبر سرحد ، سینا میومن ، شوریٰ ، پشتو ، اولس ، ظفر اسلام ، ہیواد ، عدل ، جمہوریت ، انصاف ، الفلاح شہباز ، انجام ، بانگ ِ حرم وغیرہ جرائد و اخبارات کی فائلوں میں پشتو مقالہ نگاری کے بے شمار نمونے موجود ہیں ۔ ان میں سیاسی ، مذہبی ، علمی ، اخلاق ، معاشرتی ، تنقیدی اور ادبی موضوعات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ فن اور موضوعات کے لحاظ سے مقالہ نگاری کا میدان بہت تیزی سے وسعت پذیر ہے ۔ اخبارات و جرائد کے علاوہ اس فن کے ارتقا میں ریڈیو کے نشریاتی پروگراموں اور سکولوں اور کالجوں کے مباحثوں اور مقالہ نگاری کے مقابلوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے ۔ ان کے ذریعے لئے لئے موضوعات پر لکھنے کے مواقع فراہم ہوئے ۔

پشتو زبان کی ادبی شخصیات کے بارے میں اگر فرداً فرداً ذکر کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے گی ۔ فی الحقیقت ان حضرات میں ہر ایک کی شخصیت اپنے طور پر ایک ادبی موضوع کی حامل ہے ۔ یہ سب کے سب سرحد کی سنگلاخ اور ایک دور کی 'سر زمین بے آئین' میں پلے بڑھے ہیں ۔ اس لیے ان کے کردار کا تانا بانا اسی ماحول سے تعلق رکھتا ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی ان میں سے اکثر دورِ جدید کی اعلیٰ پایہ کی درسگاہوں کے فارغ التحصیل بھی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افکار و خیالات میں ماحول کی پختگی ، احساسات و جذبات کی فراوانی اور دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق روشن ضمیری کافی حد تک موجود ہے ۔ نہ تو یہ لوگ وقت کی پکار سے غافل اور بیگانہ رہتے ہیں اور نہ ہی اپنے ماحول سے ان کا رشتہ ٹوٹتا ہے ۔ اپنی سعی و کوشش کے مطابق ان میں سے ہر کوئی 'سوئے قطار می کشد ناقۂ بے زمام را' پر گامزن ہے ۔

فن مقالہ نگاری کو جن حضرات نے بامِ عروج تک پہنچانے کی کوشش کی ان میں سے چند کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں :

پروفیسر عبدالرحیم نیازی ، ڈاکٹر احسان اللہ خاں ، پروفیسر مولانا عبدالقادر مرحوم ڈائرکٹر پشتو اکیڈیمی ، دوست محمد خان کامل ، پروفیسر صاحبزادہ محمد ادریس ، حافظ محمد ادریس (مرحوم) چیئرمین شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی، عبدالرؤف نوشہروی ریڈر کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ پشاور یونیورسٹی ، ماسٹر عبدالکریم' سید عظیم شاہ خیال بخاری ' قاضی عبدالحلیم اثر ، ایچ ۔ ایس ، انوارالحق ، امیر حمزہ شنواری ، سید نصراللہ جان میاں سید رسول رسا ' فضل حق شیدا عبدالخالق خلیق ، عبدالاکبر، خادم خان محمد اکبر، خانمیر ہلالی، غلام قادر (مدیر اباسین کراچی) ، عبدالغنی

خان غنی ، سمیع الحق کاکاخیل ، محمد ایوب صابر ، محمد اجمل خٹک ، میر مہدی شاہ ، خان عبدالغفار خان ، تقویم الحق کاکاخیل ، قاضی عطاء اللہ خان مرحوم ، سلطان محمد صابر ، سلطان محمد بابی ، فضل احمد غازی ، قاضی ہدایت اللہ ، پروفیسر مولوی عبدالقدوس ، مولوی فضل ودود ، مولوی محمد اسرائیل ، الحاج سمندر خان سمندر (صمد خدمت) ، پروفیسر عمی خان پریشان ، محمد افضل رضا ، ارباب سکندر خان ، خلیل حبیب الرحمان سحر یوسف زئی ، کوثر غوریا خیل ، مراد خان شنواری ، ایاز داؤد زئی ، اور کریم الحق کاکاخیل ۔

مذکورہ بالا حضرات میں سے اکثر یا تو فلسفہ ، مذہب ، تاریخ ، ادب ، سائینس یا دیگر علوم جدیدہ کے اساد ہیں اور یا سیاست و صحافت کے میدان کے شہسوار ۔ کئی ایک ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی زندگی علمی تحقیق و تدقیق کے لیے وقف کی ہے ۔ ان نابغۂ نظر اسادوں ، ادیبوں ، صحافیوں اور محققین کے رشحات قلم نے بیسویں صدی کے پشتو بولنے والوں کو زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار سے روشناس کیا ۔ ان کے احساسات کی ترجمانی کی ۔ انہوں نے پشتو ادب کو ہمہ گیر معنوی سرمایہ بخشا اور اس کے دامن کو افادات اور آفاقیت کے پھولوں سے بھر دیا ۔ مقالات اور مضامین کی جو کتابیں چھپی ہیں ان میں مولانا عبدالقادر کی کتاب 'دفکرپوں' خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔

صحافت

پشتو ادب میں صحافت کی ابتدا ۱۹۰۵ء کے لگ بھگ ہوئی ۔ سب سے پہلا ہفتہ وار اخبار ' افغان ' کے نام سے پشاور سے سید مہدی علی شاہ نے جاری کیا ۔ بعد میں اسے سید عبداللہ شاہ نے خرید کر اپنے نام سے پانچ سال تک جاری رکھا ۔ دوسرے دور میں یہ اخبار اردو اور پشتو دو زبانوں میں شائع ہوتا رہا ۔ ۱۹۱۴ء میں اس کا نام بدل کر روزنامہ 'سرحد' رکھا گیا ۔ اس کے بعد پشاور ، دہلی ، کوئٹہ ، کراچی ، مردان اور کوہاٹ سے وقتاً فوقتاً اور جرائد و اخبارات شائع ہوتے رہے ۔ سید راحت زاخیلی پشتو زبان کے سب سے پہلے صحافی بتائے گئے ہیں[1] لیکن اصل میں ان کا تعلق اخبار 'افغان' سے بحیثیت ایک کاتب کے تھا ۔ بعد میں آپ نے اپنا ایک ہفتہ وار اخبار 'افغان' ہی کے نام سے جاری کیا ۔ آپ زندگی بھر اس پیشہ سے منسلک رہے اور زندگی کے آخری ایام میں روزنامہ 'انجام' سے وابستہ ہوئے ۔ سطور گذشتہ میں اکثر قابل ذکر اخبارات و جرائد اور صحافیوں کے نام آچکے ہیں ۔

---

(۱) اجمل خان خٹک : رمقالہ)اٹک کے اس پار ص ۱۹۰ ۔

نشر و اشاعت

پشتو براعظم ایشیا کے تقریباً وسطی خطہ کی زبان ہے۔ جس کو مفکرین سیاست نے ایشیا کے محور کا نام دیا ہے[1] اور علامہ اقبال نے اسے ' ایشیا کے دل ' سے تعبیر کیا ہے :

از فساد او فساد آسیا در کشاد او کشاد آسیا[2]

یہی وجہ ہے کہ نشر و اشاعت کے سلسلہ میں پشتو زبان کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے ۔ حکومت پاکستان کی اطلاعات و نشریات کی وزارت کے زیر سایہ کئی ادارے اس کام پر مامور ہیں ۔ ان اداروں میں سنٹرل پبلیکیشنز ، ٹرائیبل پبلسٹی آرگنائزیشن اور اطلاعاتِ سرحد کے علاوہ ریڈیو پاکستان پشاور اور کوئٹہ کے اسٹیشن بھی شامل ہیں ۔

پاک بھارت جنگ

چھ ستمبر ۱۹۶۵ع کو ہندوستان نے اچانک اور عجیب عیارانہ طریقے سے پاکستان پر حملہ کیا ۔ اسی دن صدرمملکت نے ملک بھر میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا ۔ یہ ملک کے ہر شہری کے لیے اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کا وقت تھا اور بحمد اللہ کہ یکجہتی اور اتحاد کے ساتھ ساری قوم میں بے پناہ جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا ۔ ملک کے دیگر زبانوں کے شعرا اور ادبا کی طرح پشتون اہلِ قلم نے بھی مادرِ وطن کی دفاع میں ہر قسم کی بے دریغ قربانی کے ساتھ ساتھ اس کی محبت کے گیت اور ترانے گائے ۔ پشتو شعر و ادب کی ہر صنف میں لکھنے والوں نے فکر و نظر کے جوہر دکھائے ۔ دشمن کے خلاف اور ملک کی دفاع میں لڑنے والے مجاہدین کو اپنے اپنے انداز میں خراج تحسین پیش کیا ۔ انہوں نے نشر و اشاعت کے تمام اداروں سے دل کھول کر تعاون کیا ۔ راقم‌الحروف نے چھ ستمبر کو ہی صدر مملکت کی تاریخی تقریر کے رجزیہ انداز میں منظوم پشتو ترجمہ کے ساتھ کوئی پندرہ جنگی ترانے ریڈیو پاکستان پشاور کو ارسال کیے ۔ ۹ ستمبر کو ادارے کے ریجنل ڈائرکٹر صاحب نے ایک خط میں لکھا :

" قومی خدمت کے اس موقع پر ملی ترانوں کی صورت میں
آپ کی ہر وقت اور قیمتی پیشکش کے لیے ہم بے حد ممنون ہیں " ۔

صدر مملکت کی تقریر کے ترجمہ کا انداز کچھ اس طرح تھا :

---

(۱) Afghanistan, Land in Transition (Page 235) By Mary Bradley Watkins.

(۲) علامہ اقبال : جاوید نامہ ۔

ہم اس وقت تک لڑتے رہیں گے ،
میدانوں اور کہساروں میں ، جب تک
کہ دشمن کی آخری توپ کو خاموش نہ کردیں ۔ (ترجمہ)

جوش و جذبے کا یہ عالم چند افراد یا گنتی کے شعرا و ادبا تک محدود نہیں تھا ۔ یونیورسٹی کے سنجیدہ مزاج پروفیسروں سے لےکر دیہات کے عوامی شاعر تک سب اس میں برابر کے شریک تھے ۔ ان میں مولانا عبدالقادر مرحوم ، سمندر خان سمندر ، محمد اجمل خٹک ، عبداللہ جان معصوم ، محمد نواز خٹک ، بردل خان خٹک ، سیف الرحمان سید ، محمد ہاشم بابر ، عبدالرحمان بسمل اور ہمیش خلیل جیسے فاضل بھی تھے اور عبدالواحد ٹھیکیدار ، فدا مطہر ، جمشید خان جمشید ، حاجی گل صوفی ، علی حیدر جوش اور میر احمد صوفی کی قسم کے عوامی شاعر بھی ۔ 'بارود' ، 'ڈالونہ' ، 'مترانہ' ، 'وطن' ، 'میدان جنگ' ، 'پاکستان غزا' اور کئی ایک اور کتابیں چند ہی دن میں شائع ہوئیں ۔ اخبارات و جرائد میں بہت سی نظمیں مقالے اور افسانے لکھے گئے ۔ پاک و بھارت جنگ جدید پشتو ادب میں ملی رجحانات کے سلسلے کا ایک انقلابی موڑ ہے ۔

نصاب تعلیم میں پشتو زبان کا اجراء

پشتو ادب میں جدید مقتضیات کے مطابق کتابوں کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا ۔ جب یہ زبان صوبہ سرحد کے نصاب تعلیم میں شامل کی گئی ۔ ابتدا سے لے کر چھٹی جماعت تک پشتو کی درسی کتابیں سب سے پہلے ۱۹۴۲ء میں نصاب میں داخل کی گئیں اور تقریباً دس سال تک مسلسل چلتی رہیں ۔ اس کے بعد ان کو بدل کر دوسرے سلسلے بھی وقتاً فوقتاً لکھے جاتے رہے اور سکولوں میں پڑھائے جاتے رہے ۔ سابق صدر محمد ایوب خان کے مقرر کردہ تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے مطابق نئے سرے سے کتابیں پہلی بار لکھی گئیں ۔ درسی کتابوں کا یہ سلسلہ کامیابی کے ساتھ جاری رہا ۔ ۱۹۶۲ء میں پھر سے ابتدائی جماعتوں سے لے کر بارھویں جماعت تک پشتو کی درسی کتابوں کو نئے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق مرتب کیا گیا ۔ اس نصاب کے ذریعے نئی نسل کو پشتو زبان و ادب سے واقفیت اور اس کی بدولت اپنے افکار اور صلاحیتوں کو اجاگر کرنا مقصود تھا ۔ ساتھ ہی ساتھ بچوں میں حب الوطنی ، قومی وحدت ، بنیادی حقوق ، جمہوری اخلاق و اقدار کی مضبوطی اور قوم و ملک کی خدمت کے ساتھ اچھے مسلمان اور بہتر شہری کے اوصاف پیدا کرنا بھی مدنظر تھا ۔ بی ۔ اے کی سطح پر پشتو کی تدریس پشاور یونیورسٹی کے کالجوں میں ایک عرصہ سے جاری ہے ۔ اس سلسلہ میں پہل اسلامیہ کالج پشاور سے ہوئی تھی ۔

درسی اور معلوماتی کتابیں

نصاب کی منظور شدہ کتابوں کے علاوہ بہت سی ایسی کتابیں لکھی گئیں جو اپنی جگہ درسی اور معلوماتی موضوعات کی حامل تھیں ۔ ان میں سے کئی ایک کتابیں پنجاب اور پشاور کے ثانوی تعلیم کے بورڈوں کی جانب سے ادیب ، ادیب عالم اور ادیب فاضل کے نصابوں میں شامل کی گئیں ۔ تاریخ ، سیرۃ و سوانح ، تفسیر و حدیث ، اسلامیات و تصوف ، مذہبیات ، سیر و سیاحت ، سفر نامہ و رپورتاژ ، گرائمر ، صرف و نحو ، صنائع و بدائع (فیلالوجی ، لسانیات) تنقید و تبصرہ اور سائینسی معلومات پر مبنی کتابیں کافی تعداد میں لکھی گئیں ۔ پاکستان بننے کے بعد پشاور اور کوئٹہ میں شائع شدہ کتابوں کی تعداد ۲۳۰ سے کچھ زیادہ ہے ۔ پشتو اکیڈیمی اور نشر و اشاعت کے دیگر سرکاری اداروں کی کتابیں ان کے علاوہ ہیں ۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ پشتو ادب دیہاتی عوام اور خصوصاً طبقۂ اناث میں زیادہ مقبول رہا ہے ۔ عورتوں کو گھریلو اور مذہبی تعلیمات پشتو ہی میں دی جاتی رہی ہیں ۔ دورِ فرنگ میں اگرچہ آہستہ آہستہ اپنی زبان و ادب اور عقائد و روایات سے بیگانگی ایک عام شعار بن گیا تھا لیکن خوش قسمتی سے یہ اثر دیہاتی زندگی میں سرایت نہ کر سکا اور اور جب نئے تقاضوں کی روشنی میں مملکتِ خدا داد پاکستان کی جانب سے اس زبان کو بھی سکولوں میں رائج کیا گیا ، تو عام لوگوں میں خود اعتمادی کا احساس ایک دفعہ پھر عود کر آیا ۔

پشتو اکیڈیمی

ویسے تو پشتو اکیڈیمی کا مسئلہ ۱۹۴۸ء میں بھی زیر بحث آیا تھا ، جب حضرت باچا گل صاحب کے زیر صدارت پشتو زبان اور پشتون تمدن کی ترقی اور پیش رفت کے لیے پشاور میں اجلاس منعقد ہوا ، جس میں سردار عبدالرب نشتر جیسے عمائدین نے شرکت کی تھی ، لیکن اس کا باقاعدہ قیام ۱۹۵۵ء میں ہوا ۔ صوبائی حکومت نے اس کی امداد و اعانت کا بیڑا اٹھایا ، اور مولانا عبدالقادر مرحوم اس کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے ۔ بائیس نکات پر مشتمل ایک لائحہ عمل طے پایا جس میں ایک جامع لغت کی تیاری ، نئے وضع شدہ الفاظ و اصطلاحات کی توثیق و اجرا ، رسم الخط کی یکسانیت ، پشتو زبان کے مخصوص ٹائپ رائیٹر کی وضع و ترویج ، پشتو زبان کی تمام اصنافِ ادب کی حفاظت اور ترقی ، ضرب الامثال اور محاورات کی فراہمی اور اشاعت ، دوسری زبانوں کی علمی کتابوں کا پشتو میں ترجمہ اور پشتو زبان کی معیاری کتابوں اور کلاسیکی ادب کا دوسری زبانوں میں ترجمہ وغیرہ امور شامل تھے ۔ آج کل یہ ادارہ تحقیق ، ترجمہ ، مطبوعات اور کتب خانہ

کے چار بڑے شعبوں میں منقسم ہے اور کئی اعلیٰ پایہ کی کتابیں شائع کر چکا ہے۔ کئی قلمی کتابیں، دستاویز اور علمی نوادارات فراہم کی جا چکی ہیں اور پشتو زبان کی نایاب کتابوں کی مائیکروفلمیں اور فوٹو سٹیٹ کاپیاں حاصل کی گئی ہیں۔ ایک سہ ماہی رسالہ 'پشتو' طبع کرنے کے علاوہ تحقیق، تصنیف، تالیف اور طباعت کا کام بڑے انہاک سے جاری ہے۔ علامہ اقبال کی بہت سی کتابوں کا منظوم ترجمہ بھی پشتو میں شائع کیا گیا ہے۔

فلسفہ پشتو

پشتون لوگ اپنے ضابطہ اخلاق کو 'پشتو' کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو مطرناً ہر طرح اسلامی ہے۔ خوشحال خاں خٹک اور پشتو کے دیگر شعرا ان قواعد و ضوابط کی ترجمانی کرتے رہے۔ لیکن ایک محکم فلسفۂ حیات کے طور پر اس کی تشریح ۱۹۶۲ء میں مولانا عبدالقادر مرحوم نے اپنی ایک مشہور تقریر میں کی۔ میر عبدالصمد، امیر حمزہ شنواری، سید انوارالحق اور قاضی عبدالحلیم اثر نے بھی اپنی نگارشات کے ذریعے اس فلسفہ کی مزید تفسیر کی ہے۔ یہ فلسفہ راست بازی، عزت نفس، آزادی فطرت اور مردانہ اوصاف کو بنیادی حیثیت دیتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے شعرو سخن ذہنی عیاشی کا وسیلہ بننے کی بجائے ایک دائمی حرکت، کوشش پیہم اور ادب برائے زندگی کی اقدار کا حامل بن جاتا ہے۔

ادبی مجالس

بیسویں صدی کا ثلث ثانی شروع ہوا تو مختلف شہروں میں پشتو ادب کی ترقی کے لیے ادبی مجالس بھی شروع ہوگئیں۔ مختلف سکولوں اور کالجوں میں بھی اس قسم کی مجالس موجود ہیں جن میں طلبا اور اساتذہ حصہ لیتے ہیں۔ علاوہ بریں ۱۹۵۶ء میں پشتو اکیڈیمی نے پشتو رسم الخط کے بارے میں ایک مجلسِ مذاکرہ منعقد کرائی تھی اور پشاور یونیورسٹی نے ۱۹۶۵ء میں پشتو زبان و ادب کے متعلق دو ہفتوں کے لیے ایک سیمینار کا انتظام کیا تھا۔

اعلیٰ تعلیم

۱۹۶۲ء میں پشاور یونیورسٹی نے ایم۔ اے پشتو کی کلاسیں کھولنے کا تاریخی اقدام کیا اور اس کے لیے ایک علیحدہ شعبہ قائم ہوا۔ اس طرح پشتو زبان و ادب میں اعلیٰ تعلیم اور وسیع پیمانے پر تحقیق اور تصنیف و تالیف کے دروازے کھل گئے۔

ظاہر ہے پشتو ادب کا کارواں روز بروز آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے ۔ شاہراہ ادب پر ان کی ترقی پشتون لوگوں کی بہتری کی ضامن ہے ۔ یہ لوگ جب اپنی ہی زبان میں زیور علم سے آراستہ ہوں گے تو ان کی فطری خوبیاں خوب چمکیں گی ۔ اور وحدتِ اسلامی کے یہ علمبردار ایک روشن مستقبل کے نقیب بنیں گے ۔ حصول آزادی کے بعد ان کے احساسات میں بڑی خوش آئندہ تبدیلی واقع ہوئی ہے وہ پہلے سے زیادہ بیدار ہوچکے ہیں اور اپنے دلوں میں باقی علاقوں کے پاکستانی بھائیوں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ ملّت کا نام بلند کرنے کا عزم صمیم رکھتے ہیں ۔

کے ؛
کئی
نایاب
وسائل
جاری
گیا سے

مطرباً
قواعد
تشریح
امیر حم
اس فلسـ
مردانہ
کا وسیلہ
حاصل ہو

لیہ
کے لیے
قسم کی :
میں پشتو
اور پشا
ایک میمو

۹۲
اقدام کیا
اعلیٰ تعلیم

پنجابی ادب

باب اول

سیاسی ، معاشرتی ، فکری اور تہذیبی پس منظر*

قیاس کی اور بات ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہند و پاکستان کا جو علاقہ شرقاً غرباً انبالہ سے اٹک تک اور شمالاً جنوباً راولپنڈی سے بہاولپور تک پھیلا ہوا ہے اور جسے تاسیس پاکستان سے پہلے تک پنجاب کے نام سے پکارا جاتا تھا[1] اپنے اس نام سے بہت دیر سے معروف نہیں - مثلاً راقم کی اطلاع یہ ہے[1] کہ جہانگیر سے پہلے (۱۶۰۵ع/۱۰۱۴ھ) اس علاقے کو اس نام سے کبھی یاد نہیں کیا گیا - جہانگیر غالباً پہلا شخص ہے[2] جو اپنی توزک میں اس علاقے کو اس نام سے یاد کرتا ہے - یہ نام پنج اور آب (یعنی پانچ پانی ، جس سے مراد پانچ دریا لی جاتی ہے) فارسی کے کلمات سے مرکب ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا یہ نام کسی فارسی دان نے ہی رکھا

---

* (اس مقالہ میں فاضل مقالہ نگار نے پنجابی ادب کا پس منظر نہایت عالمانہ انداز میں پیش کر دیا ہے مگر اس میں چند ایک تفصیلی صفحات ادارہ کی طرف سے بھی شامل کر دیے گئے ہیں - مثلاً ان میں معاشرتی پس منظر (شہری اور دیہاتی زندگی) ادارہ کی ایزاد ہے - اسی طرح سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے سے لے کر محمد تغلق تک یعنی ایک سو سال میں پنجاب نے منگولوں کی یورش کو کامیابی سے روکنے میں جو کردار ادا کیا تھا وہ بھی ادارہ کی طرف سے ہے - - - - مدیر عمومی)

(۱) یہ رائے محل نظر معلوم ہوتی ہے کیونکہ عباس خان سروانی کی تاریخ شیر شاہ (تحریر شدہ غالباً ۸۱ - ۱۵۸۰ع) مترجمہ مظہر علی ولا (اول مطبوعہ آغاز انیسویں صدی ، حال طبع شدہ کراچی ۱۹۶۳ع) کے صفحہ ۱۴۰ پر یہ عبارت ملتی ہے : اور مسافران پیادہ اور راہ کی امن کے واسطے سر راہ چار ستون پر سرائیں بنائیں تھیں - ایک راستہ قلعے سے پنجاب کے شیر خان نے بنایا تھا . . . - اسی طرح ابوالفضل کی آئین اکبری جلد اول (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۲ع) میں اس علاقے کو دو صوبوں میں منقسم بتایا گیا ہے - ایک صوبہ لاہور (ص ۵۳۷) اور دوسرا صوبہ ملتان (ص ۵۴۹) مگر آئین اکبری کی جلد دوم کے ص ۱۶۱ پر ایک فصل کا یہ عنوان ملتا ہے : نہضت موکب اقبال شاہنشاہی از حدود پنجاب بدارالخلافۂ آگرہ ظل اقبال بدہلی الداختن . . . . ،، ان حوالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ اکبر کے عہد میں یہ سرزمین تقریباً تقریباً متوازی طور پر دو صوبوں میں منقسم تھی مگر بحیثیتِ مجموعی اسے پنجاب ہی کہا جاتا تھا - - - - مدیر عمومی -

(۲) توزک جہانگیری ، جلد دوم ، ص ۱۸۳ -

ہو گا ۔ ورنہ عہد قدیم میں یہ نام کہیں دستیاب نہیں ہوتا ۔ یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ جب اس علاقے کا نام پنجاب رکھا گیا تو اس کی حدود کیا تھیں ۔ یہ بات بھی تنقیح طلب ہے کہ جب اس سر زمین میں دریائے سندھ اور اس کے پانچ معاون دریا جہلم ، چناب ، راوی ، ستلج اور بیاس بہتے تھے تو اسے پانچ دریاؤں کی سر زمین کیوں کہا گیا ۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا موجودہ معتبر وسائل و اسناد کے سہارے جواب دینا ممکن نہیں ۔

البتہ زمانۂ قدیم میں یہ پتہ چلتا ہے کہ غالباً اسی علاقے کی حدود کو "ہپتہ ہندو" (سات دریاؤں کی سر زمین) کہا جاتا رہا ہے ۔ یہ تقریباً اڑھائی ہزار سال کی بات ہے ، جب زرتشتیوں کی مقدس کتاب 'اوستا' کے جزو وندیداد میں "اہورا مزدا" کا ایک قول ملتا ہے ، جس کا مطلب یہ ہے :

"میں ، اہورا مزدا ، نے جو سولہ جگہیں اور آبادیاں بنائیں ان میں سے بہترین 'ہپتہ ہندو' ہے ۔ اس میں آزاد منش اہرمن نے عداوت سے غیر معمولی دشت اور گرما پیدا کیا ۱" ۔

یہ کتاب تقریباً سنہ ۵۶۰ ق ۔ م اور ۳۳۰ ق ۔ م کے درمیان لکھی گئی اور غالباً یہ قدیم ترین حوالہ ہے جس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اس علاقے سمیت اور اس علاقے سے ذرا بڑے علاقے کا نام سات دریاؤں (کابل ، سندھ ، جہلم ، چناب ، راوی ، ستلج ، بیاس) کی نسبت سے 'ہپتہ ہندو' رکھا گیا ۔ بعد میں اس علاقے کو محدود کرکے اور کابل اور سندھ کے حصے چھوڑ کر باقی خطے کا نام پانچ دریاؤں کی نسبت سے پنجاب رکھ دیا گیا ۔

اس وقت قطعی طور پر یہ معلوم کرنا بھی ناممکن ہے کہ پانچ دریاؤں کی اس سر زمین میں کون لوگ رہتے تھے جن کی زبان ، اس زبان کی دراصل قدیم شکل تھی جسے ہم آج پنجابی کہہ رہے ہیں ۔ لیکن اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ یہاں ایسے سانولی رنگت کے جنگجو اور چھوٹے قد کے لوگ آباد تھے ، جن سے حملہ آور اور ان فاتح آریاؤں کو واسطہ پڑا جو پہلے پہل اس وادی میں تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح میں شمال مغربی دروں سے وارد ہوئے ۔ گمان غالب ہے کہ آریا اس علاقے میں پانچ سو سال رہے اور یہیں انہوں نے وہ وید مرتب کیے جن میں یہاں کی اصل آبادی کی طرف

---

(۱) "پانزدہ بہیں جاہا و روستاہا کہ من اہورا مزدا بہترین آفریدم ہفت ہند (ہپتہ ہندو) است در آنجا اہرمن بر گردد ستیزہ دشتان نابہنگام و گرمائی ، ہنگام پدید آورد" (اناہیتا از پور داؤد ص ۲۰ - ۱۱۹ و وندیداد ، فرگرد ۱ ، ۱۹ ، سطور ۷۵-۷۲) ۔

اشارے ملتے ہیں[1] -

ویسے اس علاقے میں آبادی کی نشاندہی تین لاکھ سال سے زائد عرصہ تک کی جا چکی ہے - راولپنڈی کے قریب بہنے والے دریا یا نالہ سوان سے پتھر کے زمانے کے ایسے آلات دستیاب ہوئے ہیں جو یہاں کے رہنے والے استعمال کرتے تھے اور جن کی عمر یہی معیّن کی گئی ہے[2] - لیکن ابھی تک اس تین سے پانچ لاکھ سال قبل کے انسانوں کے متعلق ہمارے پاس کافی معلومات نہیں - جو چیز یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے اور جس کے شواہد ہمیں بکثرت دستیاب ہوئے ہیں وہ پانچ ہزار سال پہلے کی وادیٔ سندھ کی تہذیب ہے - اب تک کی تحقیقات کے مطابق اس کے دو بڑے مرکز تھے - ایک پنجاب میں جس کا نام ہڑپا ہے اور دوسرا شمال مغربی سندھ میں جسے موہن‌جو ڈرو کہتے ہیں - یہ تمدن انبالہ سے بلوچستان تک پھیلا ہوا تھا اور اب تک اس کی ایک سو دو آبادیاں اور ان کے آثار دریافت ہو چکے ہیں[3] -

ہڑپا ضلع ساہیوال (منٹگمری) میں شہر ساہیوال سے جنوب مغرب میں پندرہ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے - حتمی طور پر یہ کہنا ممکن نہیں کہ اس گاؤں کے قدیم حصے کی آبادی اور بربادی کی تاریخ کیا تھی - لیکن یہاں سے برآمد ہونے والے آثار سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ یہاں ایک اچھی خاصی مدنیّت کا دور دورہ تھا اور قدیم شہر ۲۵۰۰ سے ۱۵۰۰ سال قبل مسیح میں آباد تھا[4] - ہڑپا کا موجودہ گاؤں قدیم شہر کے بالکل متّصل ہے جس کے کھنڈرات کا گھیر تقریباً تین میل ہے - قیاس کیا جاتا ہے کہ رگ وید (۶، ۲۷، ۵) میں جس گاؤں 'ہری یوپویا' کا ذکر ہے وہ غالباً یہی گاؤں ہے - لیکن یہ صرف قیاس ہی قیاس ہے یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے -

قدیم مؤرخوں کا یہ گمان تھا کہ قدیم پنجاب میں سب سے پہلے تہذیب کی بنیادیں آریاؤں نے رکھیں ، جو خانہ بدوش گروہوں کی شکل میں اس علاقے میں وارد ہوئے اور ہندو تہذیب اپنے ساتھ لائے - لیکن وادیٔ سندھ اور ہڑپا سے ایسے آثار دریافت ہوئے ہیں ، جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آریاؤں سے قبل پنجاب کے باسی بہت تہذیب یافتہ انسان تھے - ان کے مکان نہایت آرام دہ اور پختہ اینٹوں کے بنے ہوئے تھے - ان کے پاس حمام بھی تھے اور ان کے آب رسانی کے ذرائع اور پانی کے اخراج کے لیے زیر زمین

---

(۱) رگ وید

(2) Piggo', S., *Prehistoric India*, pp. 30 - 32 : سوان کے متعلق دیکھئے

(3) Piggot, S., *Prehistoric India*, PP. 138-9.

(4) do do do pp. 142, 212-3.

نالیوں کا نظام اتنا عمدہ تھا جو آج بھی ہند و پاکستان کے اکثر شہروں کو نصیب نہیں ۔ یہ لوگ گوشت اور مچھلی کھاتے تھے اور گندم اور جو بوتے تھے ۔ ان کے پاس بھینسیں ، اونٹ ، ہاتھی اور ہرن تھے ۔ یہ لوگ گاڑیاں استعمال کرتے تھے جن کو غالباً بیلوں سے چلاتے تھے ۔ کیونکہ جس طرح ان کے ہاں کتوں کے وجود کا نشان نہیں ملتا اسی طرح گھوڑے کے استعمال کا پتہ بھی نہیں چلتا ۔ یہ سونا اور چاندی بھی استعمال کرتے تھے ۔ ان کے زیور قیمتی پتھروں ، ہاتھی دانت اور کوڑیوں کے بنے ہوئے ہوتے تھے ۔ ان کے بچے مختلف النوع کھلونوں سے بھی کھیلتے تھے ۔ ان کے ملبوسات روئی اور اون کے بنےہوئے ہوتے تھے اور ان کے استعمال کے برتن چاک پر بنتے تھے ۔ ان کے مذہب کے متعلق پوری معلومات دستیاب نہیں ہو سکیں ۔ تجارت ان کا محبوب مشغلہ تھا اور ان کی تجارت کا دائرہ میسو پوٹیمیا اور دور دور کے ملکوں تک پھیلا ہوا تھا ۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ سندھ وادی کے یہ باشندے صفحۂ ارض سے کیسے نیست و نابود ہو گئے ۔ ان کی تہذیب اور مدنیت کے آثار اگر معدوم نہیں ہوئے تو وہ اب آثار قدیمہ کے ماہرین کی تحقیق کے محتاج ہیں ۔ ان لوگوں کے نابود ہونے کے کئی سبب بتائے جاتے ہیں ۔ بعض محققین کی رائے ہے کہ یہ لوگ کسی وبا کا شکار ہوگئے ۔ سندھ کے سیلاب سے بھی ان کی تباہی کو منسوب کیا جاتا ہے ۔ بہر حال جب آریا لوگ یہاں وارد ہوئے تو ان کی طاقت کمزور ہو چکی تھی اور ان کی جگہ کہیں کہیں جانگو قسم کے دیہاتیوں نے لینا شروع کر دی تھی ۔ جب رگ وید کی تدوین کا وقت آیا (غالباً چھٹی صدی قبل مسیح) اس وقت یہ قدیم تہذیب تقریباً تقریبا مٹ چکی تھی ۔ یوں بھی مفتوحین چونکہ مقابلتاً سانولی رنگت کے لوگ تھے اور قد میں اور ناک نقشے کے لحاظ سے آریاؤں کی طرح خوش قامت ، خوش قطع اور خوش وضع نہ تھے اس لیے رگ وید میں انہیں حقارت آمیز الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے ۔

بہر صورت سات یا پانچ دریاؤں کی اس وادی 'ہپت ہندو' میں ۱۵۰۰ قبل مسیح میں آریا قوم اس کی تہذیب کو برباد کر کے یہیں بس گئی ۔ مقامی بچے کھچے لوگوں نے فاتحین سے مذہب کے اکثر تصورات اور زبان کا اکتساب کیا اور فاتحین نے تجارت ، ہنر اور مدنیت اس وادی کے لوگوں سے اخذ کی ۔ موجودہ زمانہ کی تحقیق کے مطابق آریاؤں نے شو دیوتا کی پرستش سندھ وادی کے باسیوں سے لی ، بلکہ بیل کی پوجا اور غالباً گئو ماتا کی پرستش بھی یہیں سے لگی ۔ اس میل جول پر کتنا وقت لگا ، اس کے متعلق اس وقت کوئی بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی ۔

بظاہر آریا تقریباً ایک ہزار سال تک کسی خرخشے کے بغیر اس سر زمین پر قابض رہے اور پھر ۵۱۶ قبل مسیح سے کچھ دیر بعد ایران کے ہخامنشی حکمران داریوس کبیر

نے اٹک کے مغربی علاقے کو اپنی ملکیت میں شامل کر لیا ۔ اس سے پہلے شمالی علاقہ یعنی گندھارا اس میں شامل ہو چکا تھا ۔ اسی گندھار کا دارالخلافہ ٹیکسلا کا معروف شہر تھا جو اپنی آبادانی کے زمانے میں تہذیب و تمدن اور علم و فضل کا مرکز تھا ۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ علاقہ کتنی دیر تک مملکتِ ایران کا حصہ بنا رہا لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ سکندر کے حملے کے وقت یہ کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہو چکا تھا ۔ جن میں سے دو بہت مشہور تھیں ۔ ایک ٹیکسلا جس کا راجہ امبھی سکندر اعظم سے بن لڑے اس کا مطیع ہو گیا ۔ دوسری جہلم (ہائی داسپیز) اور چناب (آکی سائنیز) کے درمیان کی زمین جس کے حاکم کا نام یونانیوں نے پورس بتایا ہے جو غالباً آریائی خاندان کی ایک شاخ پاؤرو (پوروا) کی بگڑی ہوئی شکل ہے ۔ اس پورس نے سکندر سے زبردست جنگ لڑی تھی ۔

سکندر نے ایرانی مملکت پر ۳۳۴ قبل مسیح میں حملہ شروع کیا اور پھر غزنی کابل ، سوات اور باجوڑ کی طرف سے ہوتا ہوا ۳۲۹ قبل مسیح میں پنجاب میں آ پہنچا ۔ سکندر نے برسات کے آغاز میں حملہ کی ابتدا کی ۔ اس وقت جہلم طغیانی پر تھا اور سکندر کو اسے عبور کرنے میں کافی دقت پیش آئی ۔ جہلم کے مشرقی کنارے پر پورس نے اپنی افواج جمع کر رکھی تھیں ۔ جنگ کے آغاز میں یونانی گھوڑوں کو پورس کے ہاتھیوں کے ساتھ مقابلہ کرنے اور دلدل سے گذرنے میں کافی پریشانی ہوئی ۔ لیکن یونانی فوج کی اعلیٰ جنگی کارکردگی کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ یونانی جیت گئے ۔ اس جنگ میں ایک ہزار یونانی ہلاک ہوئے اور پنجابی فوج کے کوئی پندرہ ہزار آدمی مارے گئے اور نو ہزار قیدی بنا لیے گئے ۔

پورس کو شکست دینے کے بعد سکندر جنگ کرتا ہوا اور آگے بڑھا اور راوی تک کے علاقے پر قابض ہو گیا ۔ آخر وہ بیاس تک بھی پہنچا ، لیکن یہاں آ کر اس کے جرنیلوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا ۔ وہ گذشتہ آٹھ سال سے مصروفِ جنگ تھے اور اب تھک چکے تھے ۔ لہٰذا سکندر کو پنجاب آریائی حلیفوں کے سپرد کرکے واپس لوٹنا پڑا ۔ مگر مراجعت چونکہ باری دوآب کے راستے سے ہوئی اس لیے سکندر اعظم کو اس دوآب میں مَلّی یا ملوی قوم سے نبرد آزما ہونا پڑا ۔ ان کا دارالسلطنت غالباً مولستھان یا شاید ملتانہ تھا ۔ ملتان یا ایسے ہی کسی بڑے شہر کے مضبوط قلعہ کو فتح کرنے کے لیے سکندر رومی کو بڑی دقت اٹھانی پڑی اور یہیں اسے وہ کاری زخم لگا جو آخر وقت تک پوری طرح مندمل نہ ہو سکا ۔ اس طرح سکندر اور یونانیوں کا قبضہ اس علاقے پر تقریباً دو سال (۳۲۶ - ۳۲۴ ق ۔ م) تک رہا ۔

اس کی مفصّل وضاحت نہیں ہو سکی کہ مراجعت کے بعد حالات نے کیا صورت اختیار

کی ۔ البتہ یہ پتہ چلتا ہے کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد موریہ خاندان کے حاکم چندر گپت نے وادیٔ سندھ ، افغانستان اور بلوچستان پر قبضہ کر لیا ۔ یہ تقریباً ۳۲۲ قبل مسیح کی بات ہے ۔ چندر گپت کے بعد اس خاندان کے ایک اور فرد اور معروف ترین اور مقبول راجہ اشوک (جو بدھ مذہب کا پیرو تھا) کی سلطنت افغانستان سے خلیج بنگال تک پھیل گئی ۔ اس خاندان کی حکومت تقریباً ۱۸۵ ق ۔ م میں اختتام کو پہنچی ۔ پشاور کے علاقہ اور شہباز گڑھی میں راجہ اسوک کے کتباب دریافت ہوئے ہیں جن سے اس کے اعتقادات اور تنظیمِ سلطنت کا پتہ چلتا ہے ۔

موریہ خاندان کی حکومت کے ختم ہونے کے تھوڑے ہی عرصے بعد یعنی تقریباً ۱۸۲ ق ۔ م میں باختر کے یونانی حکمران ڈیمٹری یوس نے اس علاقے پر حملہ کیا ۔ اس کے ساتھ اس کا جرنیل می نانڈر بھی تھا ۔ یہ حملہ ایک وسیع پیمانے پر ہوا جس کی لپیٹ میں پورا پنجاب آ گیا ۔ ڈیمٹری یوس ۱۶۷ ق ۔ م کے قریب باختر واپس چلا گیا اور می نانڈر اس علاقے پر قابض ہوگیا ۔ وہ سیالکوٹ کو دارالخلافہ بنا کر تقریباً ۱۴۵ ق ۔ م تک حکومت کرتا رہا ۔ جس کے بعد وہ طبعی موت مرا ۔ اس کا وارث اس کا نو عمر لڑکا سٹراٹو ہوا ۔ پنجاب میں یونانیوں کی حکومت کی تاریخ اس کے بعد کچھ ایسی واضح نہیں ۔ البتہ یہ پتہ چلتا ہے کہ ان یونانیوں کے حاکم کو ساکا قوم کے ایک حکمران نے شکست دے کر ٹیکسلا پر ۷۷ ق ۔ م اور پورے گندھارا پر ۷۰ ق ۔ م میں قبضہ کر لیا ۔

چینی مؤرخوں نے ایک خانہ بدوش قوم یوچی کا ذکر کیا ہے جو منگول نہیں تھے ، لیکن جو وسطی ایشیا سے اٹھ کر آہستہ آہستہ ساکاؤں کے علاقے کی طرف بڑھتے چلے گئے ۔ سنہ ۲۵ عیسوی تک اس قوم کے ایک قبیلہ کشان کے سردار نے اپنے گروہ کو بہت مضبوط بنا لیا تھا ۔ اس کے ایک سردار نے ۴۸ عیسوی میں پنجاب پر قبضہ کر لیا ، لیکن کشان قبیلہ کا سب سے اہم حاکم کنشک ہے جو سنہ ۷۸ء میں تخت نشین ہوا ۔ یہ پہلے حکمرانوں کی اولاد میں سے نہیں تھا ۔ اس نے اپنا دارالخلافہ پرشاپور (پشاور) کو بنایا ۔ اس نے کشمیر بھی فتح کر لیا اور ختن اور کاشغر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ۔ اس نے بدھ مذہب بھی اختیار کیا ۔ اس کے عہد میں فنِ گندھارا کو بہت ترقی ملی اور یونانی طرز کے زیر اثر بدھ کے بہت سے مجسّمے بنائے گئے ۔

کشانوں کی حکومت دوسری صدی عیسوی کے وسط میں اختتام کو پہنچی ۔ یہاں سے لے کر چوتھی صدی عیسوی کے آغاز تک تاریخ کے رشتے کا صحیح سراغ نہیں ملتا ۔ البتہ کشانوں کے زوال کی نشاندہی ہوتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مقامی سرداروں نے سر اٹھانا شروع کیا تھا لیکن واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس عرصے میں پنجاب کی حکومت کس کے پاس رہی ۔ تیسری صدی میں مغربی پاکستان میں ایران کے ساسانی

بادشاہوں کی آمد اور غلبہ کی اطلاع بھی ملتی ہے ۔

پھر مقامی حکمرانوں میں سے ۲۶ فروری ۳۲۰ء کو شاہی گپتوں (یہ موریہ سے الگ خاندان تھا) کے ایک فرد چندر گپت نے تخت نشین ہو کر ہندوستان میں گپت خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس وقت پنجاب میں مدرک حاکم تھے۔ انہوں نے بھی گپتوں کی حکومت کو تسلیم کر کے انہیں خراج دینا قبول کیا ۔ گپت خاندان کے عہد میں سنسکرت اور ہندو مذہب کو بہت فروغ حاصل ہوا ۔

چھٹی صدی عیسوی کے آغاز (۵۰۰ء) میں ہن قوم نے گپتوں کی سلطنت کو تہ و بالا کر دیا ۔ انہوں نے سارے ملک میں تباہی اور بربادی پھیلا دی ، اور ان کے سردار تورامن کے لڑکے مہر گل نے سیالکوٹ پر قبضہ کر کے اسے اپنا دارالخلافہ بنا لیا ۔ پھر ہر طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا ۔ لیکن اس زمانے میں ہی وسطی ہند میں ایک پر اسرار بادشاہ یشودھرمن کا ظہور ہوا ۔ جس نے پہلے تورامن کو شکست دی ، پھر مہر گل کو شکست دے کر اسے قید کر لیا ۔ جب اسے رہا کیا تو وہ بھاگ کر کشمیر چلا گیا اور وہاں بادشاہ بن گیا ۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ مہر گل کا عہدِ حکومت ۵۱۰ء سے ۵۳۴ء تک تھا ۔

اس کے بعد پنجاب میں پھر ابتری کے حالات پیدا ہو گئے اور معیّن طور پر پتہ نہیں چلتا کہ یہاں کن لوگوں کی حکومت رہی ۔ قیاس کہتا ہے کہ سارا ہندوستان تقسیم ہو کر چھوٹے چھوٹے راجاؤں کی ملکیت بن گیا تھا ۔ البتہ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز (۶۰۵ء) میں راجہ ہرش نے پھر ایک مرکزی اور عظیم سلطنت کی بنیاد رکھی ۔ لیکن اس کا عہدِ حکومت اور نظام ۶۴۷ء میں اس کی موت کے ساتھ ختم ہو گیا ۔ ہرش بدھ مذہب کا پیرو تھا اور اس کے عہد میں مشہور چینی سیاح اور بدھ زاریوان چوانگ (ہیون سانگ) ہندوستان کی سیاحت کے لیے آیا اور چودہ سال یہاں گھومتا رہا ۔ ہرش نے اپنے عہد میں مقامی حکمرانوں کو اپنا مطیع اور باجگزار بنا کر حکومت ان کے حوالہ کر دی تھی ۔ پنجاب کے متعلق صحیح طور پر پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس کے زیر نگین تھا ، زاریوان چوانگ اس زمانے میں اس علاقے سے گذر کر کشمیر گیا تھا ۔

ہرش کی موت اور پنجاب پر جج (چچ) خاندان کی حکومت کے اختتام ۹۹۹ء/۳۸۹ھ کے درمیانی عرصے میں پنجاب کے حاکموں کے متعلق معلومات اس وقت تک دستیاب نہیں ہو سکیں ۔ البتہ اسی عرصے میں جب دمشق کے مسلمان اُموی خلیفہ ولید کے نائب الحجاج کا نوجوان عرب داماد امام الدین محمد بن قاسم ۷۱۱ء میں شیراز سے ہندوستان پر فوج کشی کرنے نکلتا ہے تو سندھ کے ہندو حاکم راجہ داہر کو شکست دے کر اس علاقے کو اُموی حدودِ سلطنت میں شامل کر لیتا ہے ۔ پھر شمال کی طرف بڑھ کر پنجاب

میں ملتان کا علاقہ بھی فتح کرلیتا ہے ۔ اس اعتبار سے اس علاقے میں اسلام کی آمد کا زمانہ یعنی آٹھویں صدیٔ عیسوی کا آغاز قرار پاتا ہے ۔ لیکن حالات یہ ہیں کہ نہ صرف محمد بن قاسم کے مختصر زمانے میں بلکہ ۷۵۰ء کے بعد تک جب عباسی خلفاء اُمویوں سے عنانِ حکومت چھین کر اپنے نمائندے حاکم سندھ میں بھیجنے لگتے ہیں ، اس سارے علاقے میں ہندوؤں سے جزیہ وصول کرکے انھیں اپنے مذہب پر بحال چھوڑ دیا جاتا ہے ۔ عرب مسلمانوں کی حکومت ملتان اور سندھ میں تین سو سالوں تک مستحکم رہتی ہے ، مگر ہندو ابھی زیادہ تعداد میں اسلام قبول نہیں کرتے ۔ بلکہ ملتان میں سورج دیوتا کا مندر خلیفہ کی اجازت سے کھلا رہتا ہے اور فقط قرماطیوں (قرامطہ) کے قلیل دورِ حکومت میں اسے مسمار کیا جاتا ہے ۔

فتح سندھ اور ملتان کے ایک سو ساٹھ سال بعد سندھ اور ملتان کا یہ علاقہ عباسیوں کی سلطنت کا حصہ نہیں رہتا بلکہ دو ریاستوں میں تقسیم ہو جاتا ہے ، جن میں سے شمالی حصے کا دارالخلافہ ملتان قرار پاتا ہے اور جنوبی ریاست یعنی موجودہ سندھ کا دارالخلافہ منصورہ مقرر ہوتا ہے ۔

لاہور یعنی مرکزی پنجاب پر اس وقت غالباً جج (چچ) خاندان کی حکومت قائم ہوتی ہے ۔ بعض بیانات کے مطابق یہی خاندان لاہور کا بانی تھا ۔ اس خاندان کے مختلف افراد بترت ، بھنرت اور چندرت ۹۹۹ عیسوی تک یہاں حکومت کرتے ہیں ۔ اور ۹۹۹ء/۳۸۹ھ میں ہندو شاہی خاندان کے (راجہ) جےپال کا بیٹا انند پال اپنے باپ کی ہدایت پر چندرت سے جنگ کر کے لاہور پر قبضہ کر لیتا ہے ۔ چندرت گرفتار ہو جاتا ہے اور اس کے بیٹے بھاگ کر جالندھر کے حاکم رائے شام کور کے ہاں پناہ لیتے ہیں[1] ۔

ہندو شاہی خاندان ویہند (راج ترنگنی کا اداہند اور آج کل کا ہنڈ) کا بھٹی راجپوت خاندان تھا اور ان کی حکومت مسلمان مؤرخوں کے بقول سرہند سے لمغان تک اور کشمیر سے ملتان تک پھیلی ہوئی تھی[2] لیکن پنجاب میں ان کی حکومت کا زمانہ مختصر سا اور کل ۲۷ سال (۹۹۹ء-۱۰۲۶ء/۳۸۹ھ-۴۱۷ھ) کا ہے ۔ اس وقت تک چینیوں کے ترکی بولنے والے کئی قبائل مسلمان ہو چکے تھے اور ان میں سے الپتگین نامی ایک ترک جرنیل نے جو سامانیوں کی طرف سے خراسان کا فوجدار رہ چکا تھا ، سامانی سلطان

---

(۱) آداب الحرب و الشجاعہ (برگ ۲۳ - ۱۲۲ ، نسخہ خطی مملوکہ کتابخانہ موزۂ بریتانیہ ، برگ ۹۰ ب - ۸۹ ب - نسخہ خطی کتابخانہ دیوان ہند ' لندن و برگ ۳۵ - ۱۳۳ نسخہ خطی کتابخانہ مجلس ایشیای بنگال) از شریف ھد ۔

(۲) تاریخ فرشتہ ' جلد اول ' ص ۱۹ کا بیان ہے کہ مشرق میں ان کی حکومت دریائے ہکڑہ تک تھی ۔ اس نے اور کئی معزز مصنفین نے ویہند کو بھٹنڈہ سمجھ کر یہ اشتباہ کیا ہے ۔

عبدالملک کی وفات پر (۹۶۱ء) غزنی کی طرف مراجعت کی اور اس علاقہ میں نیم خود مختار حکومت قائم کرلی ۔ الپتگین کی وفات کے بعد کچھ اور گورنر سامانیوں کی طرف سے غزنی میں تعینات ہوئے مگر ۹۷۷ء میں سبکتگین یہاں گورنر مقرر ہوا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنے آپ کو غزنی کا بادشاہ بنا لیا ۔ ہندو شاہیوں کا پہلا حاکم جے پال تھا جس نے سبکتگین کے علاقے پر ۹۸۶ء-۹۸۷ء/۳۸۶ھ میں فوج کشی کی ۔ سبکتگین نے غزنہ اور لمغان کے درمیان ایک پہاڑی غورک کے پاس اس کا مقابلہ کیا اور اسے شکست دی ۔ جے پال تاوان ادا کرنے کا وعدہ کر کے وطن واپس لوٹ آیا لیکن جب اس نے وعدہ پورا نہ کیا تو سبکتگین نے اس پر پھرحملہ کر کے اسے دوبارہ شکست دی اور لمغان سے پشاور تک کے علاقے کا الحاق اپنی سلطنت سے کر لیا[1] ۔ سبکتگین کی وفات (۹۹۷ء/۳۸۷ھ) کے بعد اس کے بیٹے محمود نے پہلی دفعہ ۱۰۰۰ء/۳۹۰ھ میں جے پال کے علاقے پر حملہ کیا اور اسے شکست فاش دی ۔ جے پال نے دوسری دفعہ محمود سے ۱۰۰۱ء میں شکست کھا کر اگلے سال اپنے آپ کو جلا کر ہلاک کر دیا اور ۱۰۰۲ء میں اس کا لڑکا انند پال[2] تخت نشین ہوا ۔ محمود نے اس کے عہد اور پھر اس کے بیٹے ترلوچن پال کے زمانے میں ہندوستان پر متعدد حملے کیے اور بالآخر ۱۰۱۴ء/۴۰۵ھ میں ہندو شاہیوں کو مشرق پنجاب میں شوالک کے پہاڑوں کی طرف بھگا کر سارا علاقہ اپنے قبضے میں کر لیا[3] ۔

غزنویوں نے ۱۰۱۴ء/۴۰۵ھ میں مغربی پنجاب کو اپنی مملکت میں شامل تو کر لیا لیکن محمود خود کبھی مستقل طور پر یہاں نہ رہا ۔ البتہ لاہور کی عظمت اس طرح بڑھ گئی کہ یہاں اس کے بڑے بڑے معزز جرنیل گورنر بن گئے جن میں نیالتگین اور ایاز خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ایاز تو یہیں مدفون بھی ہے ۔ اس نے لاہور کو غزنوی حکومت کا دوسرا پایہ تخت بنا دیا ۔ چنانچہ یہ شہر جلد علم و ادب کا مرکز بن گیا اور برّصغیر میں رشد و ہدایت کے چشمے یہیں سے پھوٹے ۔ اگر ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان جیسے بلندپایہ شاعر یہاں ہوئے تو علامہ ابو ریحان البیرونی جیسے عالم اجل بھی لاہور ہی میں مقیم تھے ۔ سید اسماعیل بخاری اور حضرت سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش جیسے بزرگوں نے بھی یہیں سے برّصغیر کے باشندوں کو اسلام کی برکات سے روشناس کیا ۔ خسرو ملک ۱۱۶۰ء/۵۵۵ھ میں لاہور میں ہی تخت نشین ہوا ۔ اس کے عہد میں علاءالدین غوری (۱۱۴۹-۱۱۶۱) کے دو بھتیجوں غیاث‌الدین محمد

---

(۱) عتبی، تاریخ یمینی ص ۶، ۲۱ اور تاریخ فرشتہ، جلد اول، ص ۲۰ ۔

(۲) عتبی، تاریخ یمینی ص ۱۵۹ اور فرشتہ، جلد اول، ص ۲۴ ۔

(۳) ابن‌الاثیر، جلد ۷، ص ۳۰۱ اور البیرونی، جلد ۲، ص ۱۳ ۔

اور معزالدین محمد نے غزنوی سلطنت کا خاتمہ کر دیا ۔ غیاث‌الدین محمد نے مغرب کی طرف کشور کشائی کی اور معزالدین محمد عرف شہاب‌الدین غوری مشرق کی جانب ہندوستان کی طرف بڑھا جہاں اس نے لاہور میں خسرو ملک سے ۱۱۸۰ء/۵۷۶ھ میں جنگ کی ۔ یہ جنگ فیصلہ کن ثابت نہ ہوئی اور محمد غوری کو پھر پنجاب پر دو دفعہ اور حملہ کرنا پڑا اور بالآخر وہ ۱۱۸۶ء/۵۸۲ھ میں پنجاب پر قابض ہو گیا[1] ۔

غوری اور خاندانِ غلاماں ۱۱۸۶ء/۵۸۲ھ سے لے کر ۱۲۸۹ء/۶۸۹ھ تک تقریباً ایک سو سال اس علاقے پر قابض رہے اور پھر خلجیوں اور تغلقوں نے بالترتیب ۱۲۸۹ء/۶۸۹ھ سے ۱۳۳۰ء/۷۳۱ھ تک اور ۱۳۲۱ء/ ۷۲۱ھ سے ۱۴۱۲ء/۸۱۵ھ تک پنجاب کو زیرِ نگیں رکھا ۔

تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں پنجاب نے ایسا کردار ادا کیا جو یہاں کے باشندوں کا سرِ افتخار ہمیشہ کے لیے بلند کر دیتا ہے ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب منگولوں کی یلغار کے سامنے بڑے بڑے بادشاہ سرنگوں ہو گئے اور جلال‌الدین خوارزم شاہ ایسا عالی ہمت اور جوانمرد حکمران لشکرِ چنگیزی کی تاب نہ لا کر دریائے سندھ کو گھوڑے کی زین پر عبور کر کے (۱۲۲۱ء) ادھر آ جاتا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطان معزالدین بہرام شاہ کی غفلت کی وجہ سے منگولوں نے ۱۲۴۱ء میں لاہور کو بالکل تباہ و برباد کر ڈالا اور وہ ۱۲۷۰ء تک شمالی پنجاب کو تاخت و تاراج کرتے رہے ۔ مگر بعد میں سرزمین پنجاب ہی کفار کے اس سیل بیکراں کے سامنے سدِ سکندری بن کر کھڑی ہو گئی ۔ سلطان غیاث‌الدین بلبن (۱۲۶۵ء–۱۲۸۶ء) خود پنجاب آیا ۔ از سر نو لاہور کے قلعے اور شہر کی تعمیر کرائی ۔ قدیم باشندوں کو دوبارہ لا کر بسایا ۔ ملتان اور سندھ پنجاب کے بازو تھے ۔ ان کی فوجی تنظیم کی ۔ اپنے علم پرور بیٹے شہزادہ محمد کو نائب‌السلطنت کے طور پر ملتان تعینات کیا ۔ ان دفاعی انتظامات نے سندھ تک تمام علاقوں کو محفوظ کر دیا ۔ شہزادہ محمد انہی منگولوں کے ہاتھوں شہید ہوا مگر وہ بھی اس طرح جب وہ ان کے سردار کو شکست دے چکا تھا اور مردانہ وار تنہا آگے بڑھ رہا تھا کہ چند منگولوں نے گھات سے نکل کر اسے دبوچ لیا ۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کیخسرو لاہور اور ملتان کا حاکم مقرر ہوا ۔ ۱۲۹۱ء میں منگولوں نے پنجاب کے وسط میں زبردست شکست کھائی ۔ ان میں سے بہت سے گرفتار ہوئے اور دہلی بھیجے گئے جہاں سلطان جلال الدین خلجی کی تحریک اور ترغیب پر اکثر قیدیوں نے اسلام قبول کرلیا اور محلہ غیاث پورہ میں آباد ہوئے جو ان کی وجہ سے مغلپورہ کہلایا ۔ علاءالدین خلجی کے زمانے میں اس کے دلیر اور جانباز جرنیل امیر ظفر خان نے حوالئی لاہور میں منگولوں کو سخت شکست

(۱) تاریخ فرشتہ ، جلد اول ، ص ۹۰ ، طبقات ناصری ، ص ۲۶ اور فتوح السلاطین ، ص ۸–۶۶ ۔

(۱۲۹۶ء) دی اور جب وہ ادھر سے سندھ اور بلوچستان میں جا گھسے تو انہیں وہاں گھیر گھار کر مارا اور بہت سے قیدی دہلی بھیجوائے۔ مغلوں نے دوبارہ حملہ کیا۔ یہ دیکھ کر علاءالدین خلجی نے پنجاب کی طرف کے تمام قلعے مضبوط کیے۔ دیپال پور کو دفاعی انتظامات کا مرکز بنایا اور اس طرف کی تمام افواج کا سپہ سالار غازی ملک ایسے جری سردار کو مقرر کیا جو بعد میں غیاث‌الدین تغلق کے نام سے دہلی کا سلطان بنا۔ جب منگول پھر حملہ آور ہوئے تو غازی ملک نے ایسی ناکہ بندی کی کہ ہزاروں کو گرفتار کر کے دہلی بھیجا جہاں انہیں تہ تیغ کیا گیا اور ان کے سروں سے برج تعمیر ہوا۔ غازی ملک نے صرف دفاعی جنگ پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنی افواج کو لے کر قندھار اور غزنی پر حملے کیے اور منگولوں کی کمر توڑ دی۔ غازی ملک نے پنجاب میں رہتے ہوئے ایک اور شاندار کارنامہ بھی انجام دیا۔ جب سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی عیش پسندی اور عاقبت نااندیشی کے باعث ایک نیم مسلم غلام خسرو خاں ۱۴ اپریل ۱۳۲۰ء کو تخت پر قابض ہو گیا اور اس کے ہم قوم ہندوؤں کی وجہ سے مساجد میں بت رکھے گئے اور قرآن مجید کی بے حرمتی کی گئی تو غازی ملک نے اس اسلام کش پالیسی کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ پنجاب اور سندھ کے امیروں اور صوبہ داروں کے پاس ہرکارے دوڑائے۔ اوچ کے صوبیدار بہرام آیبہ نے دل کھول کر امداد دی۔ غازی ملک دیپال پور سے افواج لے کر دہلی کی طرف بڑھا۔ خسرو خاں کو شکست دی اور ہند کی ملّتِ اسلامیہ کو جو خطرہ درپیش تھا اس کا استیصال کیا۔ منگولوں کے خلاف اس کے بیٹے محمد تغلق نے لاہور کو اپنا مستقر قرار دیا اور کوہ سلیمان کے پار دفاعی مورچہ بنانے کا منصوبہ تیار کیا۔ منگول عرصہ سے اسلام قبول کر چکے تھے اور اب وہ مغول کہلاتے تھے۔ ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور جو مادری نسب کے اعتبار سے چنگیز خان کی اولاد تھا، انہی مغول کی فوج لے کر برّصغیر پر حملہ آور ہوا اور جب اس نے مراجعت کی تو ملتان کے گورنر خضر خان کو سلطنتِ ہند میں اپنا نائب مقرر کرتا گیا۔ یہی خضر خان دہلی میں خاندانِ سادات کا بانی بنا۔

مرکزی حکومت پر جب سید خاندان (۱۴۱۴ء/۸۱۷ھ - ۱۴۴۸ء/۸۵۲ھ) قابض ہوا تو پنجاب کا ایک باشندہ بنام ملک رجب ۱۴۲۱ء/۸۲۴ھ میں سید مبارک شاہ کے عہد میں لاہور کا پہلا وائسرائے مقرر ہوا۔ لودھیوں کے زمانے (۱۴۴۸ء/۸۵۲ھ ۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ) میں معاصر تاریخوں میں لاہور کا ذکر نہیں ملتا۔ اسی زمانے (۱۵۲۴ء/۹۳۰ھ) میں بابر چوتھی دفعہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے بعد لاہور اور پنجاب پر قبضہ کر لیتا ہے، اور اس سرزمین پر ۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ میں مغلوں کی حکومت قائم ہوتی ہے۔ ہمایوں ۱۵۳۰ء/۹۳۷ھ میں آگرے میں تخت‌نشین ہوا اور تقریباً دس سال بعد

۱۵۴۰ء/۹۴۷ھ میں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر اس نے پنجاب کا رخ کیا ۔ شیر شاہ نے مل بادشاہ کا تعاقب کیا اور اسے پنجاب سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا ۔ مگر چودہ سال بعد ۱۵۵۴ء/۹۶۱ھ میں وہ برصغیر میں کامران و بامراد لوٹا اور اگلے سال ۱۵۵۵ء/۹۶۲ھ میں دوبارہ سارے ہندوستان اور پنجاب پر قابض ہو گیا ۔ پھر اکبر کے زمانے میں لاہور پندرہ سال تک پایۂ تخت رہا ہے ۔ مغلوں کا عہد تہذیب و تمدن اور ادب و ثقافت کے لحاظ سے لاہور کے عروج کا زمانہ ہے ۔ چنانچہ سردار بیسکر اپنی کتاب (تاریخ ہند کا جائزہ) میں ڈیلاٹ[1] کے حوالے سے رقم طراز ہے[2] کہ سترہویں صدی میں لاہور ایشیا کا غالباً سب سے بڑا شہر تھا ، اور اس کی رونق اور وسعت کی انتہا نہ تھی ۔ جہانگیر کے زمانے میں شیخ فرید (م ۔ ۱۶۱۶ء) یہاں کے صوبہ دار ہوتے ہیں جو اپنے عدل ، اپنی قوت منتظمہ اور اپنی سخاوت اور ذاتی وجاہت کی وجہ سے شیخ جیو کہلاتے تھے ۔ جہانگیر کو پنجاب اس قدر پسند تھا کہ لاہور کے مغرب میں شیخوپورہ اپنے نام سے بسایا اور یہاں اپنے لیے ایک عیش گاہ بھی تعمیر کی ۔ جہانگیر کے آخری ایام پنجاب ہی میں گزرے اور یہیں اس کی وفات ہوئی ۔ چنانچہ لاہور ہی میں اس کا اور اس کے بعد اس کی ملکہ (نور جہاں) کے مقبرے تعمیر کیے گئے ۔ حتی کہ نور جہاں کا بھائی آصف خان بھی جو شاہجہان کا خسر اور اس کا وزیر اعظم بھی تھا یہیں مدفون ہوا ۔ شاہجہاں نے یہاں کئی سال گزارے اور اپنی رہائش کے لیے لاہور کے قلعہ میں شیش محل ، نولکھا اور موتی مسجد تعمیر کی ۔ لاہور کی اہمیت اورنگ زیب کے دل میں اس قدر تھی کہ ایشیا بھر کی عظیم ترین جامع مسجد اس نے یہیں بنائی ۔

بابر کی سلطنت کی ڈالی ہوئی داغ بیل سے مغلوں کی شہنشاہت کا امتداد ۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ تک وسعت پذیر ہوتا ہے اور اس کے بعد مغل شہنشاہت سکڑ کر سلطنتِ دہلی میں تبدیل ہو جاتی ہے ، کیونکہ شاہ عالم کے عہد (۱۷۵۹ء-۱۸۰۶ء) میں مغل بادشاہ کی اپنی حکومت دوآب ، دہلی ، آگرہ اور موجودہ ہریانہ تک محدود تھی ۔ بندہ بہادر ۱۷۱۵ء میں قتل ہوا تھا ۔ لیکن جب وہ لاہور پر حملہ آور ہونے کے لیے سالا مار باغ تک پہنچا تھا تو مغل صوبیدار کو بے دست و پا دیکھ کر اہلِ لاہور کے مجاہدوں نے راتوں رات اپنی فوج تیار کر کے سکھوں پر ایسا شبخون مارا کہ وہ تمام ساز و سامان چھوڑ کر امرتسر کی طرف بھاگ گئے ۔ لاہور کا آخری مشہور صوبیدار معین الملک عرف میر منو ہے (۱۷۱۸ء) ، جس نے سکھوں کے خروج اور ان کی تباہ کن بے اعتدالیوں کا کامیاب مقابلہ کیا ۔ ۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ میں احمد شاہ ابدالی نے جب پنجاب پر حملہ کیا تو یہاں کوئی مستقل حاکم بھی مدافعت کے

---

۱ ۔ ڈیلاٹ (Delaet) ڈچ صاحب علم تھا ۔

۲ ۔ Panikkar, K.M., *A Survey of Indian History*, P.176

لیے موجود نہیں تھا ۔ اور افغان فوجیں جب لاہور پر قابض ہوگئیں تو احمد شاہ ابدالی نے حاجی کریم داد خان کو اپنا نمائندہ اور لاہور کا حاکم مقرر کیا ۔ اس وقت تک سکھ بھی مختلف علاقوں پر اپنی چھوٹی چھوٹی سرداریاں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور بالآخر ۱۷۶۸ء/۱۱۸۲ھ میں احمد شاہ کی آخری مراجعت پر لاہور پر قبضہ کر لیتے ہیں اگرچہ یہ قبضہ عارضی ہوتا ہے ۔ ان کا پہلا حاکم رنجیت سنگھ ہے جو پنجاب میں ۱۷۹۹ء/۱۲۱۴ھ میں مرکزی حکومت قائم کرتا ہے ۔ احمد شاہ ابدالی کے پوتے شاہ زمان (۱۷۹۳ء - ۱۸۰۰ء) نے پنجاب پر قبضہ قائم کرنے کے لیے مجاہدانہ عزم کا اظہار کیا اور وہ لاہور تک پہنچ بھی گیا لیکن افغانستان میں اس کے بھائی محمود نے بغاوت کر دی جس کی بنا پر اسے فوراً واپس ہونا پڑا ۔ اس طرح پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لیے خالی رہ جاتا ہے ۔ لیکن اس کی موت ۱۸۳۹ء/ ۱۲۵۵ھ کے ساتھ ہی سیاسی ابتری پیدا ہو جاتی ہے اور دس سال بعد یعنی ۱۸۴۹ء میں انگریز پنجاب کو اپنے ہندی مقبوضہ سے ملحق کر لیتے ہیں اور اس کے حاکم بن جاتے ہیں ۔

پنجاب پر انگریزوں کی حکومت ۹۸ سال کے بعد ۱۹۴۷ء میں استقلال پاکستان کے ساتھ ختم ہوتی ہے اور بٹوارے میں پنجاب کا جو حصہ پاکستان کو ملتا ہے' اس کو ایک صوبہ بنا کر اس کا نام مغربی پنجاب رکھ دیا جاتا ہے - ۱۹۵۶ء میں پاکستان کے مغربی حصے کے تمام صوبوں (سرحد ، مغربی پنجاب ، سندھ ، بلوچستان) اور بہاولپور ، خیرپور قلات ، لس بیلا اور دیگر ریاستوں کو ملا کر ایک صوبہ بنا دیا گیا اور اس کا نام مغربی پاکستان رکھا ۔ اس کے بعد سرکاری کاغذات سے قدیم پنجاب کا وہ لفظ نکال دیا جو غالباً جہانگیر کے عہد ۱۶۲۷ء/۱۰۰۵ھ میں اس کے کسی ناقابل تعیّن حصے کو نصیب ہوا تھا ۔ اس طرح اس نام کو تقریباً ساڑھے تین سو سال دوام حاصل ہوا ۔ لیکن اس وقت بھی اس علاقے اور اس سے ملحق علاقے میں رہنے والے لوگ جو زبان ، عام بول چال اور کبھی کبھی تحریر کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں اور جن کی مجموعی تعداد تادم تحریر (۱۹۶۸ء) تقریباً تین کروڑ ہے اسے پنجابی کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ یکم جولائی ۱۹۷۰ء سے مغربی پاکستان کی سیاسی وحدت ختم ہو گئی اور اس کے پرانے صوبوں یعنی پنجاب ، سرحد ، سندھ اور بلوچستان نے پھر علیحدہ صوبائی حیثیت اختیار کر لی ۔

معاشرتی پس منظر

پنجاب کی شہری زندگی

پنجاب کی انفرادی تہذیب میں شہری زندگی کو بہت دخل ہے کیونکہ زمانۂ قدیم سے یہ خطۂ زمین بڑے بڑے تہذیبی مراکز کی وجہ سے ممتاز رہا ہے ۔ ہڑپا سے قطع

نظر جب سکندر اعظم اس علاقے میں داخل ہوا تو اس نے ٹیکسلا کو ایک عظیم الشان شہر پایا ۔ ہند باختری حکمران می ناندر کے زمانے میں ساکلا (سیالکوٹ) ہند یونانی تہذیبی اشتراک کا مرکز تھا ۔ کنشک نے جس گندھارا تہذیب کو یہاں ابھارا ، وہ پنجاب اور سرحد دونوں صوبوں میں یکساں طور پر پھولی اور پھلی ۔ جب گرجارا قوم برصغیر میں داخل ہوئی تو اسی سرزمین میں اس نے اپنی بستیاں بسائیں ۔ گوجر خان ، گجرات ، گوجرانوالہ ، گوجرہ وغیرہ انہیں کے ناموں سے منسوب ہوئیں ۔ اسی قوم نے وسط ہندوستان میں گرجارا پرتی ہارا سلطنت قائم کی (۸۱۶ء - ۱۰۱۹ء) ۔ ملتان زمانہ قدیم سے برصغیر کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا تھا ۔ محمد بن قاسم کے زمانے میں بھی یہ پنجاب کا سب سے بڑا شہر تھا ۔ تھوڑی دیر بعد اوچ کا شہر مذہبی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز بنا اور یہاں سے سید جلال الدین بخاری (م - ۱۲۹۱ء) ، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت (م - ۱۳۸۴ء) ، سید راجو تال (م - ۱۴۲۳ء) اور سید محمد غوث گیلانی (اوچ میں ورود ۱۴۸۳ء) ایسے بزرگوں نے اِدھر اُدھر رشد و ہدایت پھیلائی ۔ چنانچہ خلجیوں کے عہد میں اوچ ایک صوبہ کا مرکزی شہر تھا اور جیسا کہ پیشتر ازیں ذکر ہو چکا ہے جب غیاث الدین تغلق صوبہ دار دیپالپور نے ناصرالدین خسرو خاں (جس نے بکرماجیت کے نام سے دہلی کا پایہ تخت آخری خلجی سلطان سے غصب کیا) کے خلاف لوگوں کو جہاد کی دعوت دی تو اوچ کے صوبہ دار بہرام آیبہ نے اس دعوت کو قبول کیا ۔ غزنوی عہد میں لاہور اور سیالکوٹ تہذیبی مراکز تھے اور برصغیر کے پہلے مسلمان حکمران سلطان قطب الدین ایبک نے لاہور ہی کو اپنا پایہ تخت بنایا ۔ ظاہر ہے جس علاقہ میں شہری زندگی زمانہ قدیم سے موجود تھی اور جو سندھ وادی کی تہذیب سے لے کر اسلامی ثقافت و شعار کے پہلے داعی یعنی غزنویوں کے عہد میں سب سے پہلا مرکز بنا ،اس کے معاشرہ میں تہذیبی نفاستوں کی کمی نہیں ہو سکتی ۔ مگر چونکہ بڑے شہر عام طور پر بین الاقوامی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اس لیے ہم پنجاب کی شہری تہذیب پر علیحدہ کچھ نہیں لکھنا چاہتے ۔ مگر پنجاب کے عوام کی زندگی ایک ایسی نہج پر قائم تھی جو حوادث زمانہ سے متزلزل نہیں ہوئی اس لیے ہم اس کا تفصیلی ذکر کرنا چاہتے ہیں ۔

دیہاتی تہذیب

چونکہ اقتدار اعلیٰ کی منتقلی کے باوجود مقامی انتظامی ڈھانچے میں کوئی خاص ردّ و بدل نہیں ہوتا تھا اور نہ حکومت مقامی باشندوں کے اندرونی معاملات میں دخل انداز ہوتی تھی ، اس لیے یہاں کا معاشرتی نظام منتشر ہونے سے بچا رہا اور زیادہ تر پرانے قبائلی طریقوں پر قائم رہا ۔ بلکہ ان میں پرانی عصبیت بھی زندہ رہی ۔ یہاں کے باشندے یا تو کھیتی باڑی کرتے یا پھر فوج میں بھرتی ہو کر فوجی خدمات انجام دیتے ۔ معاشرتی

طور پر ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر لینے کے باوجود اس علاقے کی زندگی کا یہ انداز آج بھی برقرار ہے ۔ دیہاتوں میں ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کے لیے مختلف پیشہ ور تھے اور اب بھی ہیں ۔ مثلاً قصاب ، لوہار ، ترکھان ، جولاہے ، زرگر اور ٹھٹھیار وغیرہ جو شروع میں تو ہندو تھے لیکن بعد میں مسلمان ہونے لگے ۔اوّل تو عربوں کے عہدِ حکومت (۱۰۱۰ء - ۷۱۲ء) میں ہی مگر خاص طور پر محمود غزنوی کے دور میں جب بہت سے مسلمان خاندان یہاں مستقل طور پر آباد ہوگئے تو اسلامی اثرات اور تیزی سے پھیلنے لگے سلاطین کے تین سو سالہ دورِ حکومت میں جب اسلامی عقائد جڑ پکڑ گئے تو ملّا ، اور پھر قاضی اور قلندر بھی اس معاشرتی نظام میں شامل ہوگئے ۔ البتہ مسلمانوں کو دوسرے پیشے اختیار کرنے میں ذرا دیر لگی ۔ شروع میں مسلمانوں کی اکثریت سپاہی پیشہ تھی ، وہ گھوڑے دوڑاتے ، شکار کھیلتے ، کشتیاں لڑتے ، جفاکشی اور مشقت آموزی کے مشغلوں سے دل بہلاتے ۔ تاہم آہستہ آہستہ انہوں نے دیگر پیشے بھی اختیار کر لیے ، اور اس طرح معاشرتی اونچ نیچ کا تصور بھی بہت کم رہ گیا ۔ یہ لوگ بلا کسی طے شدہ معاوضے کے معاشرے کی خدمات بجا لاتے ۔ ان کو عیدین اور دوسرے تہواروں کے علاوہ فصل پکنے پر اجناس کی صورت میں معاوضہ دیا جاتا ۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ پیشے ذاتیں بن گئیں اور لوگ اپنے پیشوں ہی سے پہچانے جانے لگے ۔ اس کے علاوہ ایک طرف اگر مسلمانوں کی رواداری اور برابری کے اصول نے معاشرے کے طبقات میں غیریت اور بُعد کو کم کرکے ان میں یگانگت اور ہمدردی کے جذبات ابھارے تو دوسری طرف ذات پات کے ہندوانہ نظام نے اپنا اثر دکھایا ۔ چنانچہ سید ، مغل ، پٹھان ، راجپوت اور دوسری ذاتیں اسلامی معاشرے میں نمودار ہو گئیں لیکن ان میں ایک دوسرے کے لیے ہمدردی اور معاونت کے جذبات برقرار رہے ۔

مکانات کچی اینٹوں سے بنائے جاتے تھے جو کھلے اور سادہ ہوتے ۔ دو تین کمرے ان کے آگے صحن اور پھر بڑا سا برآمدہ ۔ برآمدہ کے باہر ایک آدھ درخت ضرور لگایا جاتا تاکہ گرمیوں میں گھر کے افراد اس کے سائے تلے بیٹھ سکیں ۔ باہر کے دروازے کے ساتھ ڈیوڑھی ہوتی جس کے ساتھ ایک کمرہ مویشیوں کے لیے بھی بنایا جاتا ۔ گھروں میں غسل خانے اور طہارت خانے بنانے کا رواج نہیں تھا ۔ صحن میں ایک طرف دیوار بنا کر پردہ کر لیا جاتا اور گھر کی عورتیں وہاں غسل کرتیں ۔ مرد باہر مسجد کے غسل خانے ، راہٹ یا نہر پر نہاتے ۔ گھروں کی ضرورت کے لیے پانی ماشکی ڈالتا جس کو بہشتی کہتے ۔ طہارت کے لیے بلا امتیاز گھر کے سب افراد کھیتوں میں جاتے ۔ زمیندار طبقہ بڑی بڑی حویلیوں میں رہتا ۔ جن میں کشادہ کمروں کے علاوہ مویشی خانے اور اصطبل بھی ہوتے ۔ ایک طرف مردوں کے بیٹھنے کے لیے بیٹھک بھی بنائی جاتی ، جس میں چوکیاں ، تخت اور پلنگ رکھے ہوتے ۔ مکانات کے برخلاف گاؤں کی مسجد پکی اینٹوں

سے بنائی جاتی تھی اور امام مسجد کی معاشرہ میں خاصی عزت ہوتی -

وہاں کی طرح یہاں کے باشندوں کا لباس بھی بہت سادہ تھا - کرتہ ، تہ بندھ اور سر پر پگڑی - پڑھا لکھا طبقہ شلوار ، قمیض اور اچکن کے ساتھ رومی ٹوپی پہنتا یا کلاہ کے ساتھ پگڑی باندھتا - صنعتی ترقی اور تعلیم کے فروغ کی بدولت دیہاتوں اور شہروں کا بعد اب ختم ہو رہا ہے - گاؤں میں بجلی کی فراہمی کی وجہ سے ریڈیو اور ٹیلیویژن بھی پہنچ گئے ہیں - ٹرانزسٹر تو ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں لٹکا نظر آتا ہے - مکانات پکی اینٹوں سے بنے لگے ہیں - لباس میں تبدیلی آ رہی ہے - شہروں سے اعلیٰ تعلیم پا کر لوٹنے والا طبقہ اب دیہاتوں میں بھی کوٹ پتلون پہنے نظر آنے لگا ہے - پیشہ ور افراد اپنی محنت کا معاوضہ طے شدہ معیاروں کے مطابق نقدی کی صورت میں وصول کرنے لگے ہیں - تاہم ان معاشرتی تبدیلیوں اور مادی آسائشوں کے باوجود آج بھی گھوڑ سواری ، نیزہ بازی ، کبڈی اور کشتیوں کے مقابلے ہوتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ لوگ اپنی جاں بازی اور دلیری کے اس جوہر کو جس کی وجہ سے یہ سارے برصغیر میں مشہور ہیں ، برقرار رکھے ہوئے ہیں - بلکہ یہ لوگ لڑنے مرنے کو ہر دم تیار رہتے ہیں - چنانچہ دیہاتوں میں لڑائی فساد کی وارداتیں ہوتی ہی رہتی ہیں -

پنجابی زبان اور معاشرہ

معاشرتی اعتبار سے پنجابی کسی مخصوص قوم ، نسل ، مذہب اور ملک کی زبان رہی ہے اور نہ ہے - اس کا دائرہ اثر ان حدود سے ہمیشہ متجاوز رہا ہے - جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا ہے راقم کا عقیدہ یہ ہے کہ اس زبان کا قدیم اور اصل نام کوئی ہو سکتا ہے تو ہپتہ ہندوئی (سات دریاؤں کی سر زمین کی زبان) ہو سکتا ہے - مگر اس نام کو معیّن کرنے کے شواہد آج ہماری دسترس سے باہر ہیں ، لیکن ظاہر ہے کہ آریاؤں کی آمد سے بہت پہلے یعنی آج سے تقریباً پانچ ہزار سال قبل اس علاقے کے لوگ جو زبان استعمال کر رہے تھے وہی اس کی اصل اور ابتدائی شکل ہوگی- اور اس زمانے میں چونکہ 'اوستا' میں اس علاقے کا نام ہپتہ ہندو درج ہوا ہے اس لیے اس نسبت سے اس کا قدیم نام یہی ہوگا جو ادھر درج ہوا ہے - لسانی اعتبار سے بھی اس زبان میں ابھی تک ایسے الفاظ موجود ہیں جو آریائی زبان (سنسکرت) سے پہلے کے ہیں - مثلاً لوڑ (ضرورت) ، لوڑنا (ڈھونڈنا) ، سٹنا (پھینکنا) وغیرہ اور ایسے ہی لفظوں نے دکن کے سوا دیگر آریائی زبانوں میں سفر بھی نہیں کیا - چونکہ اس علاقے کا اتنے ہزار سال پہلے کا کوئی ادب موجود نہیں اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زبان کی شکل کیا تھی - لیکن چند سو سال پہلے سے اس زبان کے الفاظ دستیاب ہونے شروع ہو جاتے ہیں -

اس کا نام اگر ہپتہ ہندوئی نہیں تو مسلمانوں کے زمانے میں ہندوئی ضرور ملنا شروع ہو

جاتا ہے۔ اور پھر بعد میں اس کا تلفظ ہندوی (ہ ن د و ی) بھی نظر آنے لگتا ہے۔ اس سلسلے میں قدیم ترین بیان 'لباب الالباب' کے مصنف محمد عوفی کا ہے جو ۱۲۲۸ء میں خواجہ مسعود سعد سلمان لاہوری کی منظوم کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :

"او را سہ دیوان است، یکی بتازی و یکی
بپارسی و یکی بہ ہندوئی[1] "

اس کی تائید امیر خسرو بھی کرتے ہیں :

"پیش ازیں شہاں سخن کسی را
سہ دیوان نبود ، مگر مرا کہ خسرو ملک کلامم ،
مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست اما آن
سہ دیوان در عبارت عربی و فارسی و ہندوئی است[2] "

افسوس ہے کہ گیارھویں صدی کے آغاز میں کہی جانے والی اس ہندوئی کے نمونے ناپید ہیں۔ لیکن اس سے سو ڈیڑھ سو سال کے بعد اس زبان کا اثر معاشرہ پر اتنا نظر آتا ہے کہ اس عہد میں فارسی کے جو لغات لکھے جا رہے ہیں ، اس میں اس زبان کو ہندوی یا ہندوئی پکارا جا رہا ہے اور فارسی کلمات کے جو مترادفات دیے جا رہے ہیں ، وہ آج بھی پنجابی میں رائج ہیں اور ان میں بیشتر ایسے ہیں جو اردو میں رائج نہیں ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ لغت نویس زبان کو ہندوی کا نام دے رہے ہیں اور الفاظ پنجابی کے درج کر رہے ہیں تو یہ زبان پنجابی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ چونکہ یہ مقام اس موضوع پر مفصل بحث کرنے کے لیے موزوں نہیں ، اس لیے یہاں فارسی کے ان قدیم لغات سے صرف چند مثالیں دینے پر اکتفا کی جاتی ہے ۔

فرہنگ زفان گویا از ملا رشید مرتبہ ۱۳۷۱ء / ۷۷۳ھ

آھار ۔ پت جامہ کہ جولاماں کنند، بہ ہندوی پان گویند

برز ۔ بلندی ، بالائی مردم، تند ، درخت ، بلندی بحر (زین بہندوی میری گویند) ۔

بتگن ۔ در فرہنگنامہ آوردہ است نوعی از ساز بزرگوی است یعنی تختۂ شیار کہ بہ ہندوی بروتھ گویند ۔

پالاوان ۔ آنکہ بداں چیزی پالایند یعنی تنک بیز کہ بہندوی آنرا ہنگی گویند ۔

خیک ۔ مشک بزرگ کہ بہندوی پکھال گویند ۔

---

(۱) محمد عوفی ، لباب الالباب ، جلد دوم ، ص ۲۴۶ ۔
(۲) دیباچہ غرۃ الکمال ، (کلیات امیر خسرو ، نسخہ خطی برٹش میوزم ، برگ ۳۲ الف) ۔

فرہنگ ادات الفضلا از قاضی بدر محمد دھاروال مرتبہ ۱۴۱۹ء/۸۲۲ھ
شیراز ۔ آں شیر کہ بر دوغ دوشند و ہندوی گوجھا گویند ۔
دستک ۔ ملوح باریک پیچیدہ کہ بہ ہندوی او را پونی گویند ۔

فارسی فرہنگ نویسوں کے ہاں پنجابی مترادفات کا یہ استعمال آگے چل کر بھی ہوتا رہا ہے اور کم از کم سولھویں صدی عیسوی تک اس کے شواہد مل جاتے ہیں ۔ مثلاً فرہنگ 'مدارالافاضل' ۱۵۹۲ء میں مرتب ہوئی ہے ۔ اس کا مصنف شیخ اللہ داد فیضی سرہندی بھی پنجابی کے لفظ استعمال کرتا ہے ۔ صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے :

ڈک بھر ۔ نالاوں و گویند نوعی از غربال کہ بزبان ہند ہنگی گویند

پنجابی کے اس استعمال سے اس امر کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ علمی حلقوں میں اس کا اثر کس حد تک تھا ، گو عمومی حیثیت سے یہ زبان اس علاقے میں لوگ ہمیشہ سے بول چال کے لیے استعمال کرتے چلے آئے ہیں ۔

صوفیائے کرام کی آمد

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ، تاریخی اعتبار سے یہ زبان اس سر زمین پر اسلام کے فیوض و برکات کی اشاعت سے بہت پہلے موجود تھی ۔ اس لیے جب اس زبان کو استعمال کرنے والے مشرف با اسلام ہوئے تو انہوں نے اسے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ایک وسیلے کے طور پر استعمال کیا ۔ قیاس کہتا ہے کہ جب گیارھویں صدی عیسوی میں حضرت سید علی ہجویری جیسے بزرگانِ دین نے ہجویر سے یہاں تشریف لا کر عوام الناس کو اسلامی رشد و ہدایت کی دعوت دی تو باہمی رابطے کے لیے اس زبان کی کوئی شکل استعمال ہوئی ہو گی ۔ کیوں کہ اس سر زمین کے غیر مسلم لوگ نہ سنسکرت جانتے تھے یا نہ زبان ، جبکہ حضرت سید علی ہجویری عربی اور فارسی کے عالم تھے ۔ ظاہر ہے کہ آسان ترین ذریعۂ کلام یہی زبان بن سکتی تھی ۔ شیخ اسمعیل لاہوری (م ۔ ۱۰۵٦ء/۴۴۸ھ) ان سے پہلے ۱۰۰۵ء میں لاہور وارد ہوئے ۔ ابھی یہاں ایک ہندو راجہ حکمران تھا جو شاید سلطان محمود غزنوی کو خراج دیتا تھا ۔
شیخ صاحب واعظِ اسلام تھے ۔ ان کی مجلسِ وعظ میں سامعین کا ہجوم ہوتا تھا ۔ انہوں نے اپنی آمد کے بعد جب دوسرا جمعہ پڑھایا تو ۵۵۰ ہندوؤں نے اسلام قبول کیا اور تیسرے جمعہ کے بعد ایک ہزار ہندو حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے ۔ بادی النظر میں یہ بات بڑی تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں شیخ اسماعیل لاہور میں آتے ہی یہاں کے باشندوں کے کانوں میں اپنے مواعظِ حسنہ اس عمدگی سے پہنچا

دیتے ہیں کہ وہ ان کے مطالب کو فوراً سمجھ جاتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نو وارد خطیب اور حاضرینِ جلسہ ایک دوسرے کی زبان اچھی طرح سمجھتے تھے ۔ عربی فارسی اور سنسکرت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یقیناً وہ پنجابی زبان تھی جسے ان دنوں میں ہندوئی کہا جاتا تھا ۔ اہلِ لاہور کی یہ مادری زبان تھی لیکن شیخ صاحب کو اس پر قدرت کیسے حاصل ہوگئی؟ اس سوال کا جواب دینا مشکل نہیں[1] ۔ ہم جانتے ہیں کہ ہندو شاہی خاندان کی حکومت جلال آباد (لمغان) تک تھی۔مزید برآں ہندو بادشاہ کابل پر بھی حکمرانی کرتے رہے ہیں ۔ چنانچہ شہر کابل کے مغرب میں پہاڑی کے آر پار وہاں کے ہندو حکمران شاہ رتبیل کی بنائی ہوئی دیوار آج بھی موجود ہے ۔ پھر کابل کے عجائب گھر میں افغانستان کی حدود میں سے جمع کردہ بدھ کے مجسمے کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں ۔ ان حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم کنشک کے عہد سے لے کر جے پال کے زمانہ تک افغانستان کے لوگوں اور یہاں کے ہندوؤں کا میل جول جاری رہا ۔ علاوہ بریں میل جول کی ایک اور صورت بھی تھی ۔ قیامِ پاکستان کے بعد تک ہوں ہزار در ہزار پاوندے غزنی اور کابل کی طرف سے ہر سرما کو پنجاب میں تجارت کی غرض سے آتے رہے ہیں۔ اور سردیاں گزارتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ زمانہ ہائے دراز سے شروع ہوا ۔ اس لیے غزنی اور کابل کے لوگ ہندوئی زبان سے شروع ہی سے آشنا رہے ہیں ۔ لٰہذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ جب شیخ اسماعیل اور بعد میں سید علی ہجویری کا لاہور میں ورود ہوا تو وہ اس وقت کی پنجابی یعنی ہندوئی زبان پر یہاں آنے سے پہلے اچھی خاصی قدرت رکھتے ہوں گے ۔ یہاں پہنچتے ہی آناً فاناً یہاں کی زبان سیکھ لینا اور بڑی فصاحت سے اس میں تقریر کرنا از قبیل ناممکنات ہے ۔ اس زمانہ میں افغانستان کے بعض حصوں میں اس زبان کا اس حد تک رواج اس کی وسعت اور قدامت کا بیّن ثبوت ہے ۔

اس سر زمین میں اسلام قبول کرنے والے باسیوں نے جس شد و مد سے فکری اور معاشرتی لحاظ سے اسلامی اثرات قبول کیے ، اس کی تصویریں ہمیں اس ادب میں بڑی وضاحت سے ملتی ہیں جو اس زبان میں محفوظ رہ گیا ہے ۔ سجان رائے مؤلف 'خلاصۃالتواریخ' کے بیان کو اگر صحیح تسلیم کیا جائے تو امیر خسرو (پ ۔ ۱۲۵۳ء) سب سے پہلا پنجابی شاعر قرار پاتا ہے جس نے وزنمامہ یا وار پنجابی میں لکھی ۔ سجان رائے لکھتا ہے :
چنانچہ امیر خسرو بزبان پنجاب مرغوب مقدمہ غازی الملک تغلق شاہ و ناصر الدین خسرو خاں گفتہ کہ آں را بزباں ہند وار گویند)[2] ۔

اس وار کا موضوع غازی الملک تغلق شاہ اور ناصر الدین خسرو خاں کی آویزش تھی ۔

---

(۱) یہ ساری دلیل ادارہ کی ایزاد ہے ۔ مدیر عمومی
(۲) سجان رائے ، خلاصۃالتواریخ ، ص ۔ ۲۳۵

لیکن سجان رائے کے اس بیان کےعلاوہ اس وقت تک اس کی کوئی شہادت نہیں مل سکی کیونکہ یہ روزنامہ یا وار اب ناپید ہے ۔ لیکن امیر خسرو کے عہد سے ذرا آگے بڑھیں تو پہلا پنجابی شاعر جو سامنے آتا ہے وہ بھی مسلمان ہی ہے ۔ اس کا تخلص فرید ہے اور نام شیخ فرید الدین ابراہیم یا بہرام ہے ۔ اس کا زمانہ اندازاً ۱۴۵۰ء اور ۱۵۷۵ء کے درمیان کا ہے اور یہ گورونانک (۱۴۶۹ء-۱۵۳۸ء) کا ہم عصر ہے ۔ اس فرید کو عام لوگ صرف صوفی کا درجہ دینے سے مطمئن ہو جاتے ہیں ۔ لیکن اس کے دستیاب ہونے والے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو اس پر جا بجا اسلام اور اسلامی طرزِ فکر کی گہری چھاپ نظر آتی ہے ۔ مثلاً :

کجھ نہ بجھے کجھ نہ سجھے دنیا گجھی بھاہ
سائیں میرے چنگا کیتا نہیں تاں میں بھی ونجھاں آہ

دنیا کی یہ تصویر اور اس کی ہوا و حرص کی دلآویزی کے خلاف انتباہ عین اسلامی تصور ہے ۔

فرید کوکیندیاں جا کہندیاں متیں دیندیاں نت
جو سیطان ونجایا سے کت پھیرے چت

یہ اسلامی موضوع کی تفسیر ہے جس کے مطالب یہ ہیں کہ شیطان کے بہکائے ہوئے لوگوں کے دلوں پر گمراہی کی مہر لگی ہوئی ہے نہ کچھ دیکھتے ہیں نہ کچھ سنتے ہیں ۔

یہ فرید تو اس قدر باشعور اور معاشرے پر اثر پذیر شاعر ثابت ہوتے ہیں کہ وہ اپنے غیر مسلم ہم عمر گرونانک کو اسی زبان میں راہ ہدایت دکھاتے نظر آتے ہیں ۔ گورونانک اور ان کے منظوم مکالمات دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئے ہیں ۔ ان کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو :

گورونانک ۔ صاحب دیاں دو حداں ، کس نوں پکڑاں کس نوں چھڈاں ؟
فرید ۔ صاحب کی دو حد سچ نوں پکڑ کوڑ نوں چھڈ ۔

یہ عہدِ سلاطین کے اختتام ور مغلئی عہدِ حکومت کے آغاز کا زمانہ ہے ۔ اس سے آگے بات بڑھتی ہے اور اس وقت کی مروجہ درباری اور دفتری زبان میں جب پہلی مرتبہ 'ہیر رانجھا' کا قصہ نظم ہوتا ہے[1] ۔ تو اکبر کے زمانے (۱۵۵۶ء - ۱۶۰۵ء) میں پنجابی کا آزاد رو شاعر شاہ حسین (۱۵۹۹ء - ۱۵۹۹ء) اس کے کرداروں کو مختلف النوع اسلامی تصورات کے لیے مثالی طور پر استعمال کرتا ہے ۔ مثلاً اس نے اپنی ذات کو اپنے

---

(۱) ڈاکٹر محمد باقر (مرتب) پنجابی قصے فارسی زبان میں، جلد دوم، ص ۳۶ :

سے بر تر کی ذات میں مدغم کرنے کے لیے شدید جذبے کی تبلیغ ہیر اور رانجھا کے باہمی اُنس و علاقہ کی تشبیہ سے یوں کی ہے :

رانجھن رانجھن مینوں سب کوئی آکھو ہیر نہ آکھو کوئی
رانجھن رانجھن کوکدی میں آپے رانجھن ہوئی

(مجھے ہیر کہہ کے کوئی نہ پکارے اور سب مجھے رانجھا کہیں ۔ میں محبوب کے نام کا ورد کرتے کرتے اب رانجھا بن گئی ہوں) ۔

شاہ حسین نے اسلام سے متعلق جو کافیاں لکھی ہیں ان میں بالوضاحت اس قسم کے مضامین کو سمویا ہے جن میں سے چند ایک یہ ہیں :

(الف) خود شناسی
(ب) ریاضت اور مجاہدہ کی سرخروئی
(ج) اللہ سے رشتہ استوار کرنے کی برکات
(د) گمراہی سے پرہیز کی تلقین
(ہ) فقر اور قناعت
(و) فنا کا خوف پیدا کر کے غرور ، نخوت اور گمراہی سے بچنے کی تلقین ۔

اسی طرح سلطان باہو (۱۶۲۹ء - ۱۶۹۰ء) کے کلام میں ذاتِ باری سے عقیدت اور اس سلسلے میں رہبر کامل کی اعانت کا ذکر جا بجا ملتا ہے :

الف چنبیے اللہ دی بوٹی میرے من بوٹی وچ مرشد لائی ہو
نفی اثبات دا پانی دتا ہر رگ ہر جائی ہو
اندر بوٹی مشک مچایا جان پھلن تے آئی ہو
جیوے مرشد کامل باہو جیں ایہہ بوٹی لائی ہو

پنجابی شاعروں کا اسلام سے یہ شغف ابتدا سے لے کر انتہا تک یعنی عصرِ حاضر تک قائم رہتا ہے ۔ اور یہ لوگ صراحۃً یا ایمائی اسالیب میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کرتے چلے جاتے ہیں ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس سرزمین میں اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کا ذریعہ صدیوں تک پنجابی زبان ہی رہی ہے ۔ اس سلسلے میں اگر ہزاروں نہیں تو سینکڑوں ایسی کتابیں لکھی گئیں جن کا ہدف سیدھی سادی زبان میں ہر عمر کے لوگوں کو مذہب ، دین ، شرع ، اوامر و نواہی اور اسلامی اخلاق و کردار سے روشناس کرانا تھا ۔ 'پکی روٹی' اور 'انواع' کی اقسام کی کتابیں تقریباً ہر گھر میں پڑھی جاتی تھیں اور بہت سے لوگوں کو حفظ تھیں اور ہیں ۔ ان کتابوں اور ان کے مطالعہ کی

کمی دیگر علل کے علاوہ مذہب سے یگانگی کا ایک بہت اہم سبب ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ آج تک مقامی مسلمان معاشرے بالخصوص دیہات میں ان کتابوں کی جگہ کسی اور زبان کی ایسی کتابیں لے نہیں سکیں جن سے دین اور مذہب کا علم آسانی سے لوگوں کی گرفت میں آ جائے۔

اسلامی معاشرہ کے اثرات ادب پر

اسلام ، اسلامی روایات ، اسلامی فکر اور اسلامی ثقافت سے گہرے ، مسلسل اور علمی تعلق کے علاوہ پنجابی ادب کا معاشرتی زندگی سے ہمیشہ سے قریبی تعلق رہا ہے۔ اس میں معاشرہ کی جامع اور صحیح عکاسی کی جاتی رہی ہے۔ اس سارے ادب کے سانچے خالص دیسی ہیں۔ اس کی روایات ، اسالیب بیان ، محاورے ، تشبیہیں ، استعارے ، مانوس اور معروف حقائق پر مبنی ہیں۔ حالانکہ یہ وہی علاقہ ہے جس میں فارسی زبان و ادب کی سب سے پہلے یورش ہوئی ، لیکن پنجابی شاعر اور ادیب فارسی کی ان ادبی خصوصیات کو نہیں اپنایا جن کا رشتہ وہ اپنے ماحول سے مربوط نہیں کر سکا۔ مثال کے طور پر وہ عمومی حیثیت سے فارسی گوؤں کے تتبع میں پنجاب میں کمیاب اور نایاب بلبل و سمن کی بات نہیں کرتا اور ضرورت کے وقت کاگ ، چکور اور چنبے کو کام میں لاتا ہے۔ یہ فارسی کی منظوم اوضاع و اصناف سے بھی زیادہ متاثر نہیں ہوتا اور اپنے انداز میں ہی حمد ، نعت ، معراجنامے ، نور نامے ، اشتر نامے ، چوہرڑیڑی نامے ، چرخے نامے ، جوگی نامے ، جنگ نامے ، وارس ، سی حرفیاں ، بیت ، چو مصرعے ، کامن ، ڈیوڑھ ، کافیاں ، باراں ماسے ، دوھڑے ، ماہیئے ، اٹھوارے ، بانیاں ، شلوک ، نھال ، سرکھنڈیاں ، کوزڑے ، کنڈلیاں ، فقر نامے ، اور سلام لکھتا ہے۔ ان میں سے اکثر اصناف و اوضاع سخن کی مثالیں کسی اور مقامی ادب میں نظر نہیں آتیں۔ غزل ، مثنوی اور جدید نظم کی اوضاع و اصناف بالکل حال کی پیداوار ہیں اگرچہ ان میں بھی اب قدر قابل ادبی تخلیقات ہونے لگی ہیں۔ کلاسیکی پنجابی شاعر کا فلسفہ ، فکر ، طرز اظہار و بیان ، موضوعات ، الغرض شاعری کا تانا بانا سبھی اس معاشرے اور ماحول سے یک جان ہے جس کی عکاسی وہ کرتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

(سولھویں صدی) فرید (موضوع روایتی تواضع اور علم کی تلقین)

فریدا خاک نہ نندئیے خاکوں جیڈ نہ کوئے
جیوندیاں پیراں تلے مویاں اپر ہوئے

(سترھویں صدی) شاہ حسین (موضوع ۔ بڑھاپا اور محرومی ۔ عملی تشبیہات)

بڈھا ہوئیوں شاہ حسیناں دلدیں چھیراں پیّاں
اٹھ سویرے ڈھونڈن لگوں سنجھ دیاں جو گئیاں

(سترھویں صدی) پیلو ۔ (موضوع ، عورتوں کا روایتی عشق خام)

چڑھدے مرزے خان نوں جٹ و نجھل دیندا مت
بھٹھ رناں دی دوستی کھری جنہاں دی مت
ہس کے لاندیاں یاریاں روکے دیندیاں دس
ہتھیں یار کوھاندیاں دھر چھاتی تے لت
جس گھر لائیے دوستی مول نہ گھتیے لت
لتھی ہتھ نہ آوندی دانش منداں دی پت

(سترھویں صدی) حافظ برخوردار (موضوع ، اسلامی قصے ۔ یوسف کے روایتی حسن کو دیکھ کر زنانِ مصر کی روایتی بیخودی کا اظہار)

بھل گئے اوہ فخر رناں دے ، لافاں وسر گیاں
یوسف دے ول تاریاں وانگوں تر تر ویکھن پیاں
چھریاں نال ترنج کٹ دیاں پرزے ہتھ کیتونے
قلم انگشتاں شنگرف ہویاں سر خط دتو نے

(اٹھارھویں صدی) بلھے شاہ (موضوع ، فراقِ محبوب)

کدی آ مل یار پیاریا
تیریاں واٹاں تو سر واریاں
چڑھ باگیں کوئل کوکدی
نت سوز الم دے پھوکدی
مینوں تتڑی کوں شام وساریا

(اٹھارھویں صدی) وارث شاہ (موضوع ، مرکزی کردار ہیر کے سراپا کی مقامی تشبیہات سے روشن وضاحتیں)

گردن کونج دی انگلیاں روانہہ پھلیاں ہتھ کولڑے برگ چنار وچّوں
باھاں ویلنے ویلیاں گنہ مکھن چھاتی سنگ مرمر گنگ دھار وچّوں

سرخی ہونٹھاں دی لوھڑ دندا سڑنٹ دا خوحے کھتری قتل بازار وچوں
شاہ پری دی نھین پنج پھول رانی گجّھی رہے نہ ہیر بزار وچوں
سنیاں نال لشکدی مان متی جویں ہرنیاں ترٹھیاں بار وچوں

تھوڑی کو ولایتی سیب ، زلف کو خزانہ بار کا ناگ ، دانتوں کو چنبے کی لڑی اور انگلیوں کو روانہہ کی پھلیوں سے جو تشبیہیں دی گئی ہیں وہ معاشی رنگ کے نہایت حسین مظاہر ہیں - ہیر کی سہیلیوں کو ان ہرنوں سے تشبیہہ دینا جو بار سے سہمی ہوئی بھاگی ہوئی ہوں اور ہیر کے متکبر انداز کو قندھار کی فوج کہنا مقامی اور سیاسی حالات کی بڑی دلکش مصوری ہے -

(انیسویں صدی) مولوی غلام ر ول عالم پوری (موضوع ایک بوڑھی حرافہ کا سراپا)

پنحر چھاتی مجر کاتی ہس گلے دا کھورا
تھوڈی نوڈی روڈی بھوڈی ہے وچ عذر نہ بھورا

دو پستاں وڈیریاں مشکاں اسے نچوڑے ہوئے
اک رگ شکم پٹھاھاں دھیا تونبے توڑے ہوئے

کن نبودیاں چھلاں ورگے نک سکا سک کالا
نک متھا مونہہ حدوں کھلا جس وچ جسھ نوالا

داہڑاں دا کجھ پتہ نشانی لبھدیاں ہتھ نہ آوے
جیبھ ہلے جیوں وچ سوراخے چوہا پوچھ ہلاوے

اس سے زیادہ کریہہ منظر ادب میں شاید ہی کسی نے پیش کیا ہو -

(انیسویں صدی - نصف آخر) کالیداس کی 'پورن بھگت' سے ایک بند ملاحظہ ہو - اس میں شاعر نے پورن کے رانی سندراں سے فرار کی کیفیت بیان کی ہے شاعر کی تشابیہ میں پورے پنجابی معاشرہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے :

پورن گیا حاں گولیاتاں تکڈ دیکھے نسیا باغ کولوں
پنچھی اوڈدا جویں بندوق کولوں بندا نسدا جس طرح ناگ کولوں
جند چھوڈی جسطرح موت کولوں وشے نسدے جویں ویراگ کولوں
روگ نسدا جسطرح اوشد ھی توں سفنہ نسدا جس طرح جاگ کولوں

جویں جینہاں ماس شراب کولوں مایا نسدی جویں پتاگ کولوں -

کالیداس اڈاریاں مار ڑیا ہنس نسدا جس طرح کاگ کولوں
کائر نسدا جس طرح جنگ کولوں دشمن نسدا جیویں شمشیر کولوں
سپ نسدا جس طرح گدڑ کولوں رات چھپدی جس طرح سویر کولوں
نسے بکری جویں بگھیاڑ کولوں گئو نسدی جس طرح شیر کولوں
داس دوئی توں جویں فقیر نسے تے دوستی میرتے تیر کولوں
جھوٹھا نسدا جس طرح سچیانتوں نیک نسدا جویں الزام کولوں
چور نسدا جس طرح چاننی توں صبح نسدی جس طرح شام کولوں
سجدہ کرن تو جویں شطان نسے بے ایمان قرآن کلام کولوں
دیا نسدی جس طرح لوبھ کولوں جویں دھرم کرددہ تے کام کولوں
اس گھڑی بھگوان دابجھن کریے پاپ نسدے جس طرح جاپ کولوں
کالیداس تیوں نسیا پورن بھگت راون ہاریا جس طرح رام کولوں

پنجابی شاعروں نے نظم میں تاریخ نویسی کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اس سلسلے میں وارث شاہ کی تشبیہات اور ایمائی اشاروں کے علاوہ نجابت نے 'نادر شاہ دی وار' اور شاہ محمد نے 'سکھاں دی وار' لکھ کر بہت سا معاصر تاریخی مواد بہم پہنچایا ہے۔ نجابت سکھوں کے ابتدائی عہد کا شاعر ہے اور شاہ محمد آخری دور کا۔ ان واروں کے علاوہ پنجابی شعراء کا محبوب مشغلہ مقامی رومانی حکایات کو نظم کرنا تھا۔ ان میں سے کچھ جزوی طور پر حقائق پر مبنی تھیں۔ یعنی غالباً ان کے کردار جیتے جاگتے انسان تھے۔ ان میں سے مشہور پنجابی قصے 'ہیر رانجھا'، 'سسی پنوں'، 'سوہنی مہینوال'، 'پورن بھگت'، 'یوسف زلیخا'، 'سیف الملوک'، 'مرزا صاحباں'، 'دل خورشید' وغیرہ ہیں۔

قدیم کلاسیکی پنجابی ادب میں نثر بہت کم نظر آتی ہے۔ اگر ہے تو اسے بیشتر مذہبی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً 'پکی روٹی' وغیرہ کی قسم کی تالیفات، لیکن عصرِ حاضر میں ڈرامہ، ناول، کہانی، افسانے اور مقالے لکھے جانے لگے ہیں اور ان کا معیار کسی طرح اُردو ادب کی اسی قسم کی اصناف سے کم معلوم نہیں ہوتا بلکہ چونکہ وہ پنجابی معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں، اس لیے ان میں زیادہ توانائی نظر آتی ہے۔ پنجابی ادیبوں کی یہ حیات آفرین تخلیقات ایک قسم کی نشاۃ ثانیہ کی دلیل ہیں۔ مثال کے طور پر ایک نظم ذیل میں دی جاتی جس کا عنوان 'بھکھ' ہے۔ پنجابی

زندگی کی یہ ایک جمالیاتی تصویر ہے ، اگرچہ ساری نظم ایک علامت پر مبنی ہے :

شہروں ، پنڈ نوں کل میں جا رہیاں ساں ، چار بجے، دوپہر سی ڈھلی ہوئی
نکی پھٹ دیاں ای ، لکی کھا کے تے ، شہروں پنڈ نوں سی چلو چلو ہوئی
بیلدے پیاں چھبتی بھکھ لگ دی اے ، بھکھوں جی نوں کجھ بے کلی ہوئی
شہروں ، نئی چیزاں بندہ کھا لیندا اے، کدی کوئی پکی، کوئی تلی ہوئی
واہوں واہی میں پنڈ نوں جا رہیاں ساں، دوروں اک پیلی رسی نھلی ہوئی
اوس پیلی دے نے دے نال کر کے ، اک ات مشار سی کھلی ہوئی
ساوے کپڑے دودھاں رنگ اوہدا ، دودھ مکھناں دے نال پلی ہوئی
نکے وال اوہدے سونے وانگ لشکن، انوں دھپ سی والاں وچ الی ہوئی
جویں کسے نے ددھ وچ گھول کے تے، ڈولی والاں تے سونے دی ڈلی ہوئی
دھپے نھلی دھلی کلی ہس رہی سی، لشک دنداں دی ہور وی نھلی ہوئی
سچے سونیاں دی دوہری پال اتے، نمی جیہی لالی جوس ملی ہوئی
تے اوہ پلسی بھشت دا قطعہ جاپے ، اک نور دے ولگنے ولی ہوئی
تے اوہ ات مشار، مٹیار سی ، کہ حور حسن دے سانچے وچ ڈھلی ہوئی
اوہنوں ویہندیاں چمک پئی بھکھ مری، ثابت رہیا نہ ویکھ کے کلی نوں میں
اوتھے تیسرا وی نہیں سی کوئی ناصر، جھٹ توڑ کے کھا گیا چھلی نوں میں

(مطبوعہ پنج دریا بابت ماہ جنوری فروری ۱۹٦۷ء) یہ مثال بھی ہماری ایزاد ہے ۔ فاضل مقالہ سے ان اضافوں کے لیے ہم معافی کے خواستگار ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ مدیر عمومی

دوسرا باب

(فصل اول)

پنجابی زبان کی ابتدا اور نشوونما

یہ کہنا مشکل ہے کہ پنجابی زبان کب پیدا ہوئی اور کن مقامی بولیوں سے مل کر اس کا بنیادی ڈھانچہ تیار ہوا ۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ایک علاقے میں مدت سے رہنے والے لوگوں کی زبان میں لسانی اصولوں کے تحت آہستہ آہستہ اتنی لچک پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اعلیٰ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بن جائے۔ اگرچہ دوسری زبانوں کے اثرات سے اسماء ، صفات اور حتیٰ کہ حروف عطف کے اضافے سے زبان میں تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے ، لیکن اس کے افعال اور ان کا بنیادی ڈھانچہ وہی رہتا ہے ۔ یہ درست ہے کہ چیزوں کے ناموں میں ، ان کے استعمال کی وجہ سے ایک معتدل تبدیلی رونما ہو جاتی ہے لیکن تھوڑی سی کوشش سے ان الفاظ کی اصل اور بنیادی صورت کو پہچانا جا سکتا ہے ۔ اکثر زبانوں کی یہی کیفیت ہے ۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک زمانے میں کوئی لفظ ایک علاقے میں محدود یا کسی گروہ سے مختص ہو کر رہ جاتا ہے ، لیکن کسی دوسرے علاقے یا گروہ میں وہاں کے تہذیبی اور لسانی اختلافات کی بنا پر وہ دوسری شکل اختیار کر لیتا ہے ۔

اس سلسلے میں علماء کے نظریے کی بنیاد قیاسی طریقۂ استدلال پر ہوتی ہے اور اس کے لیے وہ حوالے کی کتابوں ، پرانی کہاوتوں ، عام بول چال کی زبان اور مستند محاورات سے مثالیں دیتے ہیں ۔ ہم میں سے اکثر اپنی اس زبان کو جسے وہ بولتے ہیں بہت پرانی ثابت کرنا چاہتے ہیں ، لیکن غالباً مواد کی عدم موجودگی یا کسی اور وجہ سے ہم اس خواہش کو استدلال کا رنگ نہیں دے سکتے ۔ زبان کی اصل کے کھوج میں یہ بات نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ زبانیں اور ان کا دستور پنڈتوں ، عالموں یا معلّمین ، حتیٰ کہ ماہرینِ لسانیات ، فرہنگ نویسوں یا مؤلفینِ لغت کے بھی تابع فرمان نہیں ہوا ۔ زبان تو کسی خاص معاشرے کے افراد کے استعمال سے صورت پذیر ہوتی ہے ۔ اس کی نشوونما پر سب سے زیادہ اثر اس گروہ کا ہوتا ہے جو اس معاشرے کی تہذیبی زندگی پر حاوی ہوگا ۔ مثال کے طور پر اگر معاشرے کا بنیادی پیشہ لڑائی ہے تو اس معاشرے کی زبان میں صنعت کے مقابلے میں زیادہ تر الفاظ جنگی ہتھیاروں

یا فن حرب و ضرب سے متعلق ہوں گے ۔ اگر آبادی کی اکثریت کھیتی باڑی کرتی ہے تو ان کی زبان میں زیادہ تر الفاظ ہل چلانے، بیج بونے، فصل کاٹنے، موسمی تغیر و تبدل اور کمی بیشی کے متعلق ہوں گے ۔ اسی طرح اگر معاشرہ مہذب اور شہری ہے تو یہاں سادہ اکھڑ اور براہ راست اظہارِ مدعا کے الفاظ کے مقابلے میں شائستہ اندازِ گفتگو کے الفاظ کا استعمال زیادہ ہوتا ہے، جن میں نازک خیالات اور مختلف جذبات کے اظہار کے لیے خوبصورت اور معنی خیز پیرایۂ بیان پیدا ہو جاتے ہیں ۔

اس خطے میں جو سترھویں صدی عیسوی سے پنجاب کے نام سے موسوم ہے، یہاں جو زبان بولی جاتی تھی اس کے تحریری نمونے اس کی قدامت کو تیرھویں صدی عیسوی تک لے جاتے ہیں، اگرچہ یہ زبان اس وقت پنجابی نہیں کہلاتی تھی ۔ پنجاب کی اصطلاح غالباً اکبر کے دور سے پہلے رائج نہ تھی ۔ ابوالفضل جہاں 'آئینِ اکبری' میں اکبر کے زیر نگیں علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں کے نام گنواتا ہے وہاں پنجابی کا نام نہیں لیتا ۔ امیر خسرو نے اپنی مثنوی 'نہ سپہر' میں لاہوری زبان کا ذکر کیا ہے مگر پنجابی کا نہیں ۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس علاقے میں بسنے والے کوئی زبان ضرور بولتے تھے جس کو مختلف لوگوں نے مختلف نام دیے ۔ کہیں یہ لاہوری کہلائی، کہیں جانگلو اور ملتانی یا سرائیکی اور ہندکو (ممکن ہے ہندکو کا لفظ یونانی زبان کے لفظ انڈیکا سے لیا گیا ہو) ۔ مشرقی پنجاب میں اس زبان کو ہریانوی کہنے لگے ۔

صدیوں سے اس زبان کی تین شکلیں مروج رہی ہیں اور یہ تینوں شکلیں پنجاب کے تین حصوں میں عمودی تقسیم سے تعلق رکھتی ہیں ۔ تقسیم سے پہلے کے پنجاب کے چوتھائی حصے یعنی انبالہ کی کمشنری میں ہریانوی زبان بولی اور لکھی جاتی تھی ۔ درمیانی اور سب سے بڑے حصے میں جو کہ جالندھر، لاہور اور راولپنڈی ڈویژنوں پر مشتمل تھا پنجابی رائج تھی ۔ ملتان اور ڈیرہ جات میں لہندی یا مغربی پنجابی بولی جاتی رہی ہے ۔ (یہ پنجابی کی قدیم ترین شکل ہو سکتی ہے) ۔ ان تینوں علاقوں کی زبانوں میں اس قدر قرابت پائی جاتی ہے کہ ضلع ہزارہ کا رہنے والا لدھیانے یا فیروزپور یا ساہیوال اور ملتان کی زبان آسانی سے سمجھ سکتا ہے ۔

اگر ہم اور پیچھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ سندھ ساس کا علاقہ ہزاروں سالوں سے تمدن کا مسکن رہا ہے ۔ راولپنڈی کے نزدیک سوان وادی میں ایسے پتھر کے آلات ملے ہیں جن کی تاریخ ۳،۰۰،۰۰۰ سال پرانی بتائی جاتی ہے ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آریاؤں کی آمد سے قبل پنجاب میں کون سی زبان مروج تھی ۔ جغرافیائی نسبت سے اس کا جواب یہ ہوگا کہ اس وقت بھی پنجاب میں ایسی زبان بولی جاتی

تھی جس کے آثار اب بھی زبان میں موجود ہوں گے ۔ اسے اگر قدیم 'پنجابی' کہا جائے تو تعجب نہ ہو گا ۔ بعینہٖ جس طرح ایران کی قدیم زبان کو قدیم ایرانی اور یونان کی زبان کو قدیم یونانی کہتے ہیں ۔ یہ بات مسلّمہ ہو چکی ہے کہ آریوں کی آمد سے قبل وادئ سندھ میں دراوڑی قبائل کو بالادستی حاصل تھی ۔ لیکن محققین کی رائے ہے کہ آریوں کی طرح دراوڑ بھی یہاں کے حقیقی باشندے نہ تھے ۔ بلکہ غالباً آریوں کی آمد سے تین ہزار سال پہلے یہاں وارد ہوئے تھے ۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ منڈا قبائل برِصغیر کے قدیم ترین باشندے ہیں اور دراوڑوں کے ورود سے قبل یہاں آباد تھے ۔ اس بات کو تقویت پنجابی زبان میں موجود منڈا زبانوں کے الفاظ سے بھی ملتی ہے ۔ یہ الفاظ شادی ، بیاہ ، موت اور دوسری رسومات اور تہواروں سے متعلق ہیں ۔ ان کی چند ایک مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں :

روز مرہ منڈا	پنجابی	اردو
لیجا	ریجا	وہ کپڑا جو شادی کے موقعہ پر مختلف رشتہ داروں کو دیا جاتا ہے ۔
دیہہ	دیہہ	جسم
منڈی	منڈی	سر
کنڈ	کنڈ	کمر ، پیٹھ
کھری	کھر	پاؤں
پیڑھی	پیڑھی	نسل
مُندرا	مُندراں	بڑی بالیاں
لتھ	نتھ	نتھ

خورد و نوش : اناج ، ان پانی ، دانہ پانی ، دال ، گڑ ، وغیرہ منڈا زبانوں کے الفاظ آج بھی اسی طرح مستعمل ہیں ۔

نباتات : ببول ، بکائن ، بڑ ، (پنجابی میں بوہڑ کہتے ہیں) دھتورہ ، لیم ، پپیتا ۔ یہ الفاظ بھی منڈا زبانوں میں ملتے ہیں ۔

حیوانات :

بچھا	وچھا	بچھڑا
لد	لد	گھوڑے کا فضلہ

ضروریات زندگی :

باٹھا	بھٹڑہ	بھٹہ
چولا	چلہا	چولہا

پانڈا	پانڈی	سالن پکانے کا برتن
تسلا	تسلا	تھالی
چالو	چاٹی	گھڑا
جانگیرا	چنگیر	چنگیر
ٹنڈ	ٹنڈ	رہٹ میں استعمال ہونے والا مٹی کا برتن
بھاڑا	بھاڑا	کرایہ
بابرو	بھانبھڑ	تیز آگ
نبڑا	نبڑنا	ختم کرنا
پسراؤ	پسرنا	پھیلنا
تانگی	تانگ	انتظار

آریوں کی آمد سے پہلے ہڑپہ، موئن‌جوداڑو اور اس عہد سے تعلق رکھنے والے دیگر کھنڈرات کی کھدائی سے جو انسانی ڈھانچے ملے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں مختلف قومیں یا نسلیں آباد تھیں۔ ماہرینِ لسانیات بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ 'رگ وید' میں ایک جگہ مترا دیوتا کی حمد میں یہ بھجن ہے:

"پانچ قوموں نے ہمارے محافظ مترا دیوتا کے سامنے اپنے سر نگوں کر دیے"۔

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقے میں مختلف بولیاں رائج تھیں جو ایک دوسری پر اثر انداز بھی ہوتی رہتی تھیں۔ چنانچہ دراوڑی اور پنجابی زبان میں بڑی حد تک اشتراک ملتا ہے۔ صوتی اور صرف و نحو کے اعتبار سے ان میں مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ صرف و نحو کے اعتبار سے یہ اتصالی گروہ میں شامل ہیں، کیونکہ ان دونوں میں اکثر بنیادی الفاظ کے ساتھ لاحقات کے اتصال سے مطلوبہ معنی حاصل کیے جاتے ہیں۔ اور تصریفی حلقہ کے برعکس ان میں بنیادی الفاظ اور لاحقات کو بڑی آسانی سے ایک دوسرے سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ بعض دفعہ یہ لاحقات مکمل الفاظ کا مخفف ہوتے ہیں اور انفرادی طور پر معنی کے حامل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان لاحقات کی اصل گم ہو چکی ہوتی ہے اور انفرادی طور پر یہ کچھ معنی نہیں دیتے، لیکن بنیادی الفاظ کے ساتھ مل کر با معنی ہو جاتے ہیں۔ ذیل میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

کناری (دراوڑی گروہ)	پنجابی	اردو
(الف) اے انوبا یکتا گا گد لانون سوڑو	انہاں وادھو کاغذاں نوں ساڑو	ان فالتوں کاغذوں کو جلاؤ

(ب) کلے دی راتری کا لودہ آلتو	کل دی رات چوری ہو گئی (کالا بمعنی چور پنجابی میں آج بھی مستعمل ہے)	کل رات چوری ہو گئی
(ج) باہلا سیک اگیدے	باہلا سیک ہے گا	بہت گرمی ہے
(د) ناں گے گاڑی ٹپے تو	میں گڈی ٹپا دتی	میں گاڑی سے رہ گیا
(ہ) روٹی گے بین چناگ ہچھو	روٹی نوں مکھن چنگاؤ لا	روٹی کو مکھن اچھی طرح لگاؤ

تلگو (دراوڑی گروہ)	پنجابی	اردو
(الف) اتانوں بھاریا نوں کٹینو	اونے بڈھی (بیوی) نوں کٹیا	اس نے بیوی کو مارا
(ب) پیٹی کو بیگام دئیی	پیٹی نوں جندرا لاو	صندوق کو تالا لگاؤ
(ج) دیا ونچھی کونچھم پرے کی زرگن دی	دیا کر کے کجھ پرے سرکو	مہربانی کر کے کچھ آگے سرک جائیں ۔
(د) اے باٹ اکاڈ کی پوتوندی	اے واٹ کتھے پھوندی اے	یہ راستہ کہاں لے جاتا ہے ؟

اس کے علاوہ ملیالم ، کورخ ، براہوئی ، گونڈی وغیرہ دوسری دراوڑی گروہ سے تعلق رکھنے والی زبانوں کے تقابلی جائزہ سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آریوں کی آمد سے قبل اس پانچ دریاؤں کی سر زمین میں جو زبان عمومیت کے ساتھ مروج تھی وہ دراوڑی حلقہ سے منسلک تھی اور جب آریہ یہاں وارد ہوئے تو جہاں انہوں نے مقامی زبانوں سے گہرے اثرات قبول کیے ، وہاں کچھ حد تک مقامی زبانوں کو بھی متاثر کیا ۔ لیکن اقلیت میں ہونے کی وجہ سے یہ اثرات اتنے ہمہ گیر نہ تھے ۔ اس سے مقامی زبانوں کا زیادہ ترلغوی پہلو ہی متاثر ہوا اور صرف و نحو کا ڈھانچہ کافی حد تک محفوظ رہا اور ہڑپہ اور موئن‌جوداڑو کی زبان اپنی نئی تبدیل شدہ ہیئت میں آج بھی پنجابی زبان کی شکل میں موجود ہے ۔ اہلِ علم حضرات نے قدیم غیر آریائی بولیوں کو پراکرت کے نام سے موسوم کیا ہے اور مقامی بولیوں کو انہی سے ماخوذ قرار دیا ہے ۔ دوسرے معنوں میں ہم یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ پنجابی زبان آریائی کنبہ کی شاخ نہیں بلکہ اس کی مورث اعلیٰ براہِ راست دراوڑی زبانیں ہیں ۔

آریوں کی زبان موجودہ اصطلاح میں ہند آریائی لسانی گروہ کی ایک شاخ تھی ۔

سنسکرت ، اوستائی ، یونانی ، لاطینی ، جرمنی ، انگریزی ، فرانسیسی اور یورپ کی اکثر قدیم اور جدید زبانیں اسی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں ۔ اگر ہم اس نظریہ کو تسلیم کر لیں کہ شروع شروع میں آریائی قبائل کسی ایک ہی وطن میں آباد تھے تو پھر اس بات کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ یہ قبائل ایک ہی زبان بولتے ہوں گے ۔ ممکن ہے اس زبان میں علاقائی لب و لہجہ کا تفاوت موجود ہو لیکن بنیادی طور پر اس کا صوتی ، لغوی اور صرفی و نحوی ڈھانچہ ایک ہی ہوگا ۔ لیکن آبائی وطن سے نقلِ مکانی کے بعد مقامی اثرات کے تحت ان میں اختلافات پیدا ہوتے گئے اور آخر یہ زبان جو شروع میں ایک ہی تھی مختلف زبانوں میں بٹ گئی ۔ پاکستان و بھارت میں مقامی آریائی زبان جو کہ سنسکرت کے نام سے موسوم ہوئی ، کے صوتی ڈھانچے کا آریائی کنبہ کی مشہور زبانوں فارسی ، یونانی اور لاطینی سے موازنہ کیا جائے تو ان کے درمیان ایک واضح فرق نظر آتا ہے ۔ فارسی میں حروف صحیحہ کی تعداد انتیس ہے۔ لیکن ان میں صوتی لحاظ سے ہم مخرج حروف جیسے ط ، ت ، ذ ، ز ،ض ، ظ اور ث،س، ص وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر حروف عربی سے مستعار ہیں۔ اگر فارسی ابجد سے عربی سے مستعار شدہ حروف کو خارج کر دیا جائے تو باقی صرف بیس حروف رہ جاتے ہیں جو کہ آریائی صوتیات کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ اسی طرح یونانی میں حروف صحیحہ کی تعداد ایس اور لاطینی میں سترہ ہے ۔ ان کے مقابلے میں سنسکرت میں حروف صحیحہ کی تعداد تینتس ہے اور ان میں کوئی دو حروف ہم صوت نہیں ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ فالتو حروف جو کہ زائد صوتی اکائیوں کی ترجمانی کرتے ہیں بنیادی طور پر آریائی صوتیات کا حصہ نہیں ہو سکتے ۔ اس لیے کہ سنسکرت کے علاوہ دیگر تمام آریائی زبانیں حلقی ، تالوئی اور لثوی ، غنائیہ اور اکثر ہائیہ آوازوں سے یکسر عاری ہیں ۔

اسی طرح سنسکرت اور اس کی ہمعصر آریائی شاخ اوستائی میں بھی گہرا صوتی تفاوت موجود ہے ۔ اوستائی میں اکثر ہائیہ ، لثوی اور غنائیہ آوازیں موجود نہیں ۔ اسی طرح سنسکرت میں مروجہ کئی ایک مصوتوں کو ظاہر کرنے والی صوتی اکائیوں کے مترادفات سے بھی اوستائی تہی دامن ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ سنسکرت کی یہ زائد آوازیں غیر آریائی ہیں ، اور لامحالہ قدیم مقامی زبانوں یعنی دراوڑی اور منڈا گروہ سے مستعار شدہ ہیں ۔ ان میں سے لثوی اور غنائیہ آوازیں دراوڑی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں اور ہائیہ آوازیں منڈا گروہ سے مخصوص ہیں ۔ پنجابی زبان صرفی اور نحوی اعتبار کے علاوہ صوتی لحاظ سے بھی آریائی گروہ کی زبانوں سے بالکل مختلف ہے ۔ اس کا صوتی نظام بھی دراوڑی اور منڈا گروہ کی زبانوں کی خصوصیات کا حامل ہے ۔ یہ انہی کی طرح ملحقی یا انصالی گروہ سے تعلق رکھتی ہے جبکہ آریائی زبانیں تصریفی گروہ سے منسلک ہیں ۔

الفاظ کے اعتبار سے پنجابی زبان نے اس وقت جو اثرات قبول کیے ہم اس تقسیم کی یوں کر سکتے ہیں :

الف ۔ خالص آریائی الاصل الفاظ
ب ۔ خالص دراوڑی الاصل الفاظ
ج ۔ مشترک آریائی الاصل الفاظ وہ سرمایۂ الفاظ جو کہ پنجابی کے ساتھ ساتھ سنسکرت
د ۔ مشترک دراوڑی الاصل الفاظ اور دراوڑی گروہ کی زبانوں میں مشترکہ طور پر مستعمل ہے ۔

خالص آریائی الاصل الفاظ میں پیر (سنسکرت پڈ) ناس ، نک (سنسکرت ناسا) اکھ (سنسکرت اکشی) دند (سنسکرت دنت) دو (سنسکرت دوو) اور ترے (سنسکرت تراد) ہیں۔ مشترک آریائی الاصل میں اگ (آگ) سوٹی ، دئیوتا (دیوتا) مٹھا (مٹھیا) مٹھیائی (میٹھائی) اور راجا ہیں ۔ یہ تمام الفاظ اپنی ہیئت تبدیل کر چکے ہیں ۔ ایسے الفاظ کی تعداد جو بغیر کسی تبدیلی کے سنسکرت سے مستعار لیے گئے ہوں ، نہایت قلیل ہے ۔ دوسرے وہ ہیں جن کی مثالیں اوپر دی گئی ہیں جو تبدیل شدہ صورت میں ملتے ہیں ۔ لیکن اصل الفاظ جو کہ اس زبان کی ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے ہیں مقامی اور غیر آریائی ہیں اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔

اس کے بعد یہ علاقہ دوسری قوموں کی آماجگاہ بنا ، جن کے اثرات سے اس زبان میں نئی تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ ہخامنشی خاندان کے بانی سائرس اعظم نے سندھ اور بلوچستان کو فتح کیا ۔ پھر دارائے اعظم نے جنرل سکائی لیکس کو مغربی پاکستان کے شمالی علاقہ پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا ۔ جب سکندر نے وادیٔ سندھ پر حملہ کیا تو اس وقت راوی تک یہاں چار حکومتیں قائم تھیں ۔ پشاور (گندھارا) کی وادی میں اس کا مقابلہ اسکوئیز (Ascenkois) سے ہوا ، سندھ ساگر کے علاقہ میں راجہ امبھی سے ، رچنا دوآب میں راجہ پورس اور باری دوآب میں ملاوی قوم سے ہوا جن کا دارالخلافہ غالباً مولستان (ملتان) یا اس کے نزدیک کوئی شہر تھا ۔ اس دور میں پنجابی زبان میں بہت سے یونانی الفاظ داخل ہوئے ۔ پنجابی زبان میں شامل ہونے والے یونانی الفاظ کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

اول ۔ وہ سرمایۂ الفاظ جو کہ آریائی زبانوں کے مشترکہ سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے اور سنسکرت و یونانی میں یکساں طور پر موجود ہے ۔ گو مقامی زبانوں میں یونانی کی بجائے سنسکرت کی راہ سے داخل ہوا ۔

دوم ۔ وہ الفاظ جو کہ عربی اور فارسی نے یونانی سے مستعار لیے اور پھر ان زبانوں

سے پنجابی زبان میں داخل ہوئے۔

سوم۔ وہ یونانی الاصل الفاظ جو مغربی زبانوں کی راہ سے پنجابی میں آئے۔

چہارم۔ وہ الفاظ جو کہ ہند یونانی عہد میں یا اس کے بعد براہ راست یونانی سے ہماری زبان میں منتقل ہوئے۔ مثال کے طور پر یونانی، پنجابی، اور اردو گرامر میں مذکر سے مؤنث بنانے کے لیے یکساں طور پر 'ن' کا لاحقہ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً:

ہیلیوس	Helios	(روشنی)	ہیلن	Helen
کاتھرو	Kathros	(نا کیرہ)	کاتھرن	Katharine
ہیرو	Hero	(بطل)	ہیروئن	Heroine
ہرمیز	Hermes	(ایک یونانی دیوتا کا نام)	ہرمیونی	Hermioine

اردو میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں مالی سے مالن، دولہا سے دلہن، جوگی سے جوگن اور پنجابی سے پنجابن وغیرہ رائج ہیں۔ تانیث بنانے کا یہ طریقہ نہ تو سنسکرت میں موجود ہے اور نہ ہی عربی اور فارسی میں۔ ظاہر ہے کہ یہ قاعدہ براہِ راست یونانی زبان سے ہی حاصل کیا گیا۔ یعنی ہند یونانی عہد میں یہ قاعدہ پنجابی زبان میں داخل ہوا اور یہاں سے آگے اردو میں ودیعت ہوا۔

ذیل میں یونانی الفاظ کی مثالیں دی جاتی ہیں:

یونانی		پنجابی	اردو
کانون	Kanun	کنون	قانون
دبھترا	Thephthera	دپھتر	دفتر
بھلگم	Phlegm	بلگم	بلغم
کمیا	Chemeia	کمیا	کیمیا
تلسما	Telesmos	طلسم	طلسم
کیسران	Xeron	اکسیر	اکسیر (دوائی)
تاپھو	Tophos	تبوت	تابوت
کوپھنیو	Koipinos	کپھون	کفن
کری	Kui	کڑی	لڑکی

محمد بن قاسم کے حملہ کے ساتھ عرب اور مغربی برصغیر کے درمیان تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ برصغیر میں اسلامی حکومت کے قیام کے ساتھ ساتھ یہاں اسلام کی روشنی بھی پھیلنی شروع ہو گئی۔ اس طرح کوئی بارہ سو سال سے یہاں عربی کو مذہبی زبان ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ نیز عہدِ اسلامی میں یہ درس و تدریس کا ذریعہ بھی تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود عربی کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو اسے عراق اور

شمالی افریقہ میں نصیب ہوا ـ یعنی وہاں کی قدیم بابلی ، قبطی اور بربری زبانیں اس لئی لہر کے سامنے خس و خا شاک کی طرح بہہ گئیں اور ان کی جگہ نو وارد عربی زبان نے لے لی ـ برصغیر کی دوسری زبانوں کی طرح پنجابی بھی کچھ سخت جان واقع ہوئی تھی کہ عربی زبان اس کے صرف لغوی پہلو کو ہی متاثر کر سکی ـ یہ سرمایۂ الفاظ زیادہ تر مذہبی امور تک محدود ہے ـ مثلاً حج ، زکواۃ ، دعا ، ثواب ، حلال ، حرام ، سنت ، فرض ، صبر ، شکر ، خیرات اور نمازوں کے نام وغیرہ ـ صلوٰۃ کی جگہ یہاں سنسکرت الاصل لفظ نماز اپنی جگہ قائم و دائم ہے اور آج اس لفظ کی غیر اسلامی اصل کے بارے میں گمان تک نہیں ہوتا ـ سنسکرت میں اس کا مادہ نام بمعنی جھکنا اور خم ہونا کے ہیں ـ اسی مادہ سے مشتق لفظ نامس عبادت کرنے ، عقیدت کااظہار کرنے اور جھکنے کے معنی دیتا ہے ـ نماز اسی نامس کی ہی بدلی ہوئی شکل ہے ـ اس کے برعکس صلواۃ کو بالکل الٹے معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور اس سے مراد گالی لی جاتی ہے ـ جیسے صلواتیں سنانا وغیرہ ـ

مذہبی امور کے الفاظ کے علاوہ پنجابی میں مروّج عربی الفاظ تین صورتوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں ـ اول وہ الفاظ جو اپنی اصل شکل میں مستعمل ہیں جیسے اجر ، اجل ، اصل ، آخر ، جاہل ، حد ، جلسہ ، جمع ، حاجت ، حجرہ ، حاکم ، حکیم ، ضا ، حیا ، خبیث ، خدمت ، خصلت ، دکان ، دوا ، سوال ، جواب وغیرہ ـ دوسری صورت میں وہ الفاظ آتے ہیں جو مقامی لب و لہجہ کی وجہ سے بدل گئے ہیں جیسے ترابی (تراویح) جلیبی (زلیبا) گریب (غریب) تسبی (تسبیح) گجک (گزک)وغیرہ ـ سوئم وہ الفاظ ہیں جو عدم واقفیت ، کم علمی یا بے علمی کی بنا پر غلط مفہوم پا گئے ہیں ـ مثلاً :

شہدا (گواہ) غریب، بھوکا بیچارہ ، غنڈہ ـ

مجاور (پڑوسی)	مسجد یا خانقاہ کا رکھوالا
غریب (مسافر)	بے سرو سامان
جعل (بنانا)	کھوٹا ، نقلی
خصم (مدمقابل)	مالک ، آقا
نفر (مرد)	غلام ، نوکر
حضرت (حاضر ، نزدیکی)	چالاک ، عیار وغیرہ

ایک اور بات جس کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ یہ ہے ، کہ جب مسلمانوں نے اس علاقے کو جو آج بلوچستان کہلاتا ہے فتح کیا تو انہوں نے دیکھا کہ مکرانی بحیثیت بولی جانے والی زبان کے ایک منظم زبان ہے ـ اور سندھ میں سندھی مروّج ہے ـ ظاہر ہے کہ

ملتان کے اردگرد کے لوگ ملتانی بولتے تھے۔ حالانکہ عوام کی زبان کو عرب ہر جگہ سندھی کہہ دیتے تھے۔ مسعودی کا جو ۹۱۵ء - ۹۱۶ء میں ہندوستان آیا تھا، کہنا ہے کہ یہاں کے لوگ سندھی اور عربی بولتے تھے۔ اسی طرح ابن حوقل نے جو کہ ۹۷۶ء میں اس علاقے میں وارد ہوا، دیکھا کہ اس علاقے میں جسے کچھ دیر کے لیے مغربی پاکستان کہا جاتا تھا، دو بڑی ریاستیں تھیں ایک ملتان اور دوسری منصورہ جسے عربوں نے آباد کیا۔ یہ شہر حیدرآباد کے شمال میں واقع تھا۔ ظاہر ہے ان دونوں ریاستوں میں علی الترتیب ملتانی اور سندھی بولی جاتی تھیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب محمود غزنوی نے پنجاب کو فتح کیا اور لاہور کو مرکز ثانی بنایا تو یہاں بہت سے شعراء، درویش اور دوسرے ہنر مند کئی جگہ سے آ کر جمع ہو گئے۔ ان کے ساتھ بہت سے لوگ روزی کمانے اور قسمت آزمائی کے لیے بھی پہنچ گئے اور ہزاروں کی تعداد میں ترک، افغان اور وسطی ایشیا کے لوگ محمود کی فوج میں بھرتی ہوئے۔ جن کو مختلف جگہوں پر رکھا گیا۔ ظہیر الدولہ سلطان ابراہیم غزنوی (۱۰۵۹ء-۱۰۹۹ء) جو کہ اس سلطانی سلسلہ کا بارھواں حکمران تھا کے سپہ سالار ابو النجم زاور شیبانی کے تحت ۴۰۰۰۰ ہزار جوانوں پر مشتمل فوج تھی۔ جیسا کہ ابوالفرج رونی جو کہ لاہور کا پہلا فارسی شاعر تھا، نے لکھا ہے کہ ابوالنجم نے بنارس اور حبول کہ سومناتھ پر حملہ کیا تھا۔ تھانیسر اور قنوج کو ساتھ ملایا۔ میرٹھ کو بھی اپنے ماتحت کیا۔ اس کا جانشین سیف الدولہ بنا جس نے آگرے کو فتح کیا۔ علاءالدولہ مسعود سوم (۱۰۹۹ء-۱۱۱۵ء) کا زمانے میں سراستی فتح ہوا۔ ان تمام حقائق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے سلطان محمود کے ایک سو سال بعد تک اپنی فتوحات جاری رکھیں۔

ان فتوحات کے نتائج یہ ہوئے کہ وہ مسلمان جو ان مفتوحہ علاقوں میں بس گئے تھے، انہوں نے یہاں کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ ظاہر ہے کہ لونڈیاں، باندیاں، کنیزیں سب مقامی ہوں گی۔ گھریلو اور دوسرے کاموں کے لیے یہاں کے لوگوں کو اپنے ہاں ملازم رکھا گیا۔ دوسری اقوام سے رابطہ پیدا کرنے اور کیمپ اٹھانے والے مزدور بھی یہاں سے لیے گئے، پھر اراضی کاشت کرنے والے مضارعین بھی یہیں کے باشندے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان سے رابطہ اور میل ملاپ کے لیے یہاں کے عوام کی زبان کو استعمال کیا گیا اور عوام کی زبان وہ ہوگی جس میں یونانی، بکھڑین، ساکا، کوشان، گوجر اور ہن جنہوں نے پنجاب اور سرحد میں اپنی حکومتیں قائم کیں، کی زبانوں کے ہزاروں الفاظ شامل ہوئے اور اس زبان کا حصہ بن گئے، جسے آج ہم پنجابی کے نام سے جانتے ہیں۔ مسعود سعد سلمان خواجہ سعد سلمان کا بیٹا تھا۔ خواجہ سعد سلطان مسعود اول (۱۰۳۱ء-۱۰۴۰ء) کے لڑکے شہزادہ محمود

کا خزانچی تھا ۔ سعد سلمان لاہور ہی میں پیدا ہوا اور اس نے یہیں پرورش پائی ۔ اس نے فارسی کے علاوہ یہاں کی مقامی زبان میں بھی شاعری کی ، جسے وہ ہندوی زبان کے نام سے پکارتا ہے ۔ یہ نام بھی دوسرے ناموں کی طرح بیانیہ ہے ۔ اس سے مراد موجودہ پنجابی زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی ۔

شیخ اسماعیل بخاری (م-۱۰۵۶ء) ، ۱۰۰۴ء میں لاہور تشریف لائے ۔ انہوں نے ہزاروں ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کیا ۔ یہ حقیقت ہے کہ کئی بار ایسا ہوا کہ نماز جمعہ کے خطبہ سے متاثر ہو کر بیک وقت ہزار کے مجمع میں سے ۵۰۰ کی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے ۔ ظاہر ہے کہ غیر مسلموں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے انہوں نے یہاں کی مقامی زبان سیکھی ہوگی ۔ سر رچرڈ ٹمپل نے اپنی تالیف 'حکایات پنجاب' کی جلد اول میں مسعود سالار غازی جو کہ سلطان محمود کا بھتیجا تھا اور بھروچ (اودھ) اتر پردیش میں لڑتا ہوا مارا گیا تھا کی کہاوت بھی لکھی ہے ۔ بعد میں سالار غازی چھاؤنی کے لوگوں کا روحانی سرپرست بن گیا تھا ۔ اس کے حالات عبدالرحمٰن چشتی کی 'مراۃ المسعودی' میں بھی درج ہیں ۔ یہ دو حوالے اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ غزنوی دور کے شمال مغربی ہندوستان کی تاریخ کے ۱۷۰ سالوں میں مسلمان ایک وسیع علاقے میں پھیل چکے تھے ۔ یہ سب حقائق اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں کہ ابتدا میں عربی بولنے والوں کے تین سوسالہ دور حکومت میں اس علاقے میں جو آج مجموعی طور پر مغربی پاکستان کہلاتا ہے، عربی ، فارسی اور ترکی بولنے والے حکمرانوں کے اثرات اور اگلے ۱۷۰ سالوں میں اس علاقے کے علاوہ دہلی تک فارسی اور ترکی بولنے والے حکمرانوں نے بہت سے اثرات چھوڑے اور پھر آخری دو غزنوی حکمران خسرو خان اور خسرو ملک (۱۱۵۲ء-۱۱۸۶ء) نے لاہور کو پایۂ تخت بنایا اور یہاں سے حکومت کی ۔ اس سے لاہور، جالندھر ، ملتان اور دوسرے شہروں کے تہذیبی ماحول کا ، جہاں غزنوی شرفا ، فوجی کمانڈر اور دوسرے افسران اور ان کا عملہ مقامی لوگوں کے ساتھ پرسکون زندگی بسر کرتا تھا ، اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ لیکن اس وقت ان کی تعداد تمام آبادی کے دس فیصد سے زیادہ نہ ہوگی ۔ یقیناً یہ لوگ اپنے روزمرہ کاموں کی انجام دہی میں یہاں کے لوگوں کی زبان کے الفاظ کا سہارا لیتے تھے ۔ اس تہذیبی ماحول کے اثر سے پنجابی زبان بہت زیادہ متاثر ہوئی ۔ اس نے بہت سے فارسی زبان کے الفاظ لیے ۔ بعد میں پنجابی نے فارسی رسم الخط بھی اختیار کر لیا جس سے یہ زبان فارسی نما بن گئی ۔ یہی وہ تاریخی حقائق ہیں جنکی وجہ سے آج پنجابی زبان میں سینکڑوں الفاظ پشتو ، فارسی ، ترکی اور عربی الاصل پائے جاتے ہیں ۔ ذیل میں ہم فارسی ، پشتو اور ترکی زبانوں کے الفاظ کی کچھ مثالیں دیتے ہیں ۔

پہلی قسم کے فارسی الاصل الفاظ :

گلاب ، نرگس ، امرود ، داشپاتی ، انار ، پستہ ، بادام ، دیگ ، دیگچہ ، سلوار ، کرتہ ، جراب ، باجی ، تنگ ، شرم ، آمدنی ، بے وقوف ، سست ، میوہ ، دلگل ، دبہہ ، ہوس ، رکابی ، افسوس ، نوکر ، زندگی ، زندہ ، بندہ ، شربت ، جوش ، چادر ، دشمن ، دوا وغیرہ۔

دوسری قسم کے فارسی الاصل الفاظ :

فارسی	پنجابی	اردو
پائجامہ	پجاما	پائجامہ
لحاف	لیف	لحاف
گزک	گجک	گزک
رضائی	رجائی	رضائی
چغہ	جھگا	چغہ
خواجہ	کھوجا	خواجہ
شاباس	شاوا	شاباس

پشتو الاصل الفاظ۔

پہلی قسم کے پشتو الاصل الفاظ :

ادل بدل ، پلنگ ، تڑاق ، تہس نہس ، چپڑقناتی ، خرچ ، خیر خبر ، دستر خوان ، الا بلا۔

دوسری قسم کے پشتو الاصل الفاظ :

پشتو	پنجابی	اردو
پرہ	پرا (قطار)	پرا
خچر	کھچر	خچر
خصم	کھسم	خصم
چاکو	چکو	چاقو
افیم	فیم	افیم

ترکی الاصل الفاظ۔

پہلی قسم کے ترکی الاصل الفاظ :

بیگم ، تکہ ، کوچ ، تسمہ ، توپ ، باورچی ، وظیفہ ، وکالت ، وکیل ، ولی ،

وراثت ، وزیر ، وضو ، وجود ، وقلت ، وفا ، وبا ، وطن ، باجی ، بی بی ، قلی ، خانم ، خان ۔

دوسری قسم کے ترکی الاصل الفاظ :

ترکی	پنجابی	اردو
تمغہ	تکمہ	تمغہ
قالین	کلین	قالین
غالیچہ	گلیچہ	غالیچہ
قورمہ	کورمہ	قورمہ
قنات	کنات	قنات
قینچی	کینحی	قینچی

پنجابی اور ترکی زبانوں میں عربی ، فارسی الفاظ کی موجودگی بھی ایک قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے ۔ پنجاب اور ترکی میں اہلِ اسلام کی آمد کے بعد عربی کو مذہبی زبان اور فارسی کو علمی وادبی زبان کا درجہ حاصل رہا ۔ اس لیے دونوں زبانوں کا عربی اور فارسی سے یکساں طور پر متاثر ہونا ایک فطرتی امر تھا ۔ اگر ہم ایسے سرمایہ' الفاظ کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دونوں زبانوں میں نوّے فیصدی تک اشتراک موجود ہے ۔ ذیل میں ہم ترکی زبان کی واؤ کی تختی سے چند ایک مثالیں پیش کرتے ہیں ، جہاں تلفظ کا اختلاف ہے اسے خطوط وحدانی میں ظاہر کر دیا گیا ہے :

واجب (ترکی واشپ) ، وعدہ (ترکی وادے) ، وحی ، وحشت ، وعظ ، واقف ، وقت ، والی ، ورق ، وصف ، واسطہ ، وطن ، وظیفہ ، وفا ، وبا ، وفات ، وہم ، وکالت ، وکیل ، ولی ، وراثت ، وثیقہ ، وزیر ، ولائت ، ویران ، وضو ، وجود ، وغیرہ ۔

الفاظ کا یہ ملاپ لوگوں کے قدرتی ملاپ کا نتیجہ تھا جو آریوں کی آمد سے لے کر ترکوں کی آمد تک (دو ہزار پانچ سو سالوں تک) پھیلا ہوا ہے ۔ یہ بات کوئی تعجب خیز نہیں ۔ اس لیے کہ ان زرخیز لسانی ذرائع نے دور جنوب کے بالائی دکن تک کے علاقے کی زبان کو متاثر کیا ۔ اغلباً علاءالدین خلجی اور ملک کافور کے سپاہیوں اور خیمہ برداروں میں زیادہ تعداد اس علاقے سے تعلق رکھتی تھی اور یہ لوگ اپنی زبان بھی ساتھ لے گئے ۔ اس کے علاوہ جب محمد تغلق نے دولت آباد میں دوسرا دارالسلطنت بنایا تو دولت آباد میں سکونت اختیار کرنے والے سب طبقوں میں یہاں کے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو کہ بالائی دکن میں بس گئے ۔ بہمنی سلطنت جو کہ تغلق شہنشاہیت کی جانشین تھی شمال مغرب سے کٹ گئی ۔ چنانچہ یہاں ترکوں اور ایرانیوں کا داخلہ پہلے کی طرح نہیں

رہا تھا ۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی مشترک زبان (جو دکنی اردو کہلائی) تبدیل ہونے لگی اور تیزی سے یہاں کے عوام الناس کی بولی نے ترقی کرنی شروع کی ۔ جب بہمنی سلطنت (۱۳۴۷ء - ۱۵۲۷ء) پانچ مختلف ریاستوں یعنی خاندیش، احمد آباد ، بیدار ، گولکنڈہ اور بیجاپور میں تقسیم ہو گئی تو یہ زبان جس میں پنجابی الفاظ کی بڑی تعداد شامل ہو چکی تھی ، تہذیبی زبان بن گئی ۔ اس نے دکنی زبانوں سے بھی الفاظ لیتے اور اس طرح ایک بین الاقوامی لسانی ڈھانچہ تیار ہو گیا ۔

ذیل میں ہم بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کے کچھ مصنفین کی تحریروں سے مثالیں درج کرتے ہیں ۔ ان میں پنجابی زبان کے الفاظ کو جلی حروف میں لکھا گیا ہے ۔ یہ الفاظ دریائے راوی کے دونوں طرف آج بھی بولے جاتے ہیں ۔ پہلی مثال گولکنڈہ کے سلطان قلی قطب شاہ (م ۱۶۱۰ء) کے کلام سے لی گئی ہے :

منگے عاشق جو او پھول سکنے   کہ اپنے جیو کتاباں پر لکھو رنج

پیسا

بہوت ہیں رمز کی باباں پیا اوسائیں میں   دو تن غرض کیا تیری ذات ہی کجات صریح

پیسا

چندنی مکھ کے اپر مکری کا ڈلنا گستاخ   جب زکھیے کان اُپر تو دسے ہمنا گستاخ

پیسا

مجب پہلے پرتاں لے کھڑیاں   دسے یوں الن پٹ میں جیوں سور چند

پیسا

کہنے گھانس پر یوں چھانوں سٹ اپنے کرم سوں
کہ جیوں سٹتا ہے چھانوں اپ گھانس پر دو قد شمشاد

اگلی مثال لیجئے ، یہ ملا وجہی کی 'سب رس' سے ہے جو ۱۶۳۵ء میں لکھی گئی تھی :

"سبھے لوکاں اسی تے دنیا چھوڑے نہیں ، دنیا تے دل کوں توڑے نہیں ، بھلے آدمی کاشکے دنیا میں نا آتے تو برے لوکاں سیتی جفا نا پاتے ۔ برے لوکاں شہر میں کو نجے کونجے بھرے ہیں ۔ برے آدمی بھلیاں کوں برے کرے ہیں" ۔

"رقیب روسیاہ کوں ، اس گمراہ کوں ، خواہی نخواہی ، وقت میں قصور تھا ، سلام کو کچھ کلام کر چپ نہیں رہیا ۔ کیا کہ میں حکیم ہوں ، بہوت معتبر ہوں ، سب حکمت تے باخبر ہوں ، سرتی پاوں لم علم ہوں ، نیر ہوں ، بے جاں کوں دیوں کا جاں" ۔

یا ملا نصرتی کی 'گلشن عشق' جو کہ ۱۶۵۷ء میں چھپی تھی کی یہ مثال ملاحظہ فرمائیے :

یو سن بات او شخص نالیا کے تاب دیا شاہ زادے کو دکھ سوں جواب
کہ راجے کوں یہاں کے کنواری تھی ایک قبیلے کوں سارے پیاری تھی ایک
یکا یک او ہوی غیب سو باغ تی جلیا ہے جنا حلق اسی داغ تسی
کہ یو راج عادل جوان مرد ہے تو عالم بھی اس ساتھ ہمدرد ہے
اسی غم کا ہر تن میں یو زہر بھید ہوئے ہیں سو جیو نے تی سب نا امید

یا ابن نشاطی کی مشہور مثنوی 'پھول بن' کو لیجئے اس کا سن تصنیف ۱۶۵۵ء ہے :

دلاسا شاہ تے بلبل جو پایا زبان مطلب کے باتاں سوں اچایا
لگیا کہنے اول گزرے سوباتاں برہ اس نیں سوں کتیا سو گھاتاں
مرا تھا باپ سوداگر ختن کا نہ تھا پروا اسے کچھ مال و دھن کا
بڑا تھا بہوت سب سودگراں میں اتھا مشہور سالم بندراں میں
پڑے تھے اس کنے مہراں کے انبار ڈھگاروں سے تھے روپے ہور دینار
منان سوں تھا رہا کھنڈیاں سوں سنا تھے لاکھاں اشرفیاں کراڑاں سوں حنا

مندرجہ بالا نظم و نثر کی مثالوں میں پنجابی الفاظ کی کثرت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس لسانی ڈھانچہ نے جو قطب الدین ایبک (۱۲۰۶ء-۱۲۱۰ء) سے پہلے مسلمانوں کے پانچ سو سالہ دور حکومت میں پنجاب میں مختلف زبانوں کے باہمی اثرات سے وجود میں آیا ، دکنی اور ہندوستانی اُردو دونوں کو متاثر کیا ۔

حقیقت یہ ہے کہ قدیم ترین پنجابی زبان کے نمونوں کو قدیم اُردو کے طور پر پڑھنا سمجھنا اور تصور کرنا چاہیے ۔ اس کی واضح شہادت ہمیں بابا فرید گنج شکر (م - ۱۲۶۶ء) کے اشعار سے ملتی ہے :

الف ۔ فریدا جے جانیں تِل تھوڑڑے سنبھل بک بھریں
جے جانیں شوہ نڈھرا تاں تھوڑا مان کریں

ب ۔ فریدا جے تیں عقل لطیف ہیں کالے لکھ نہ لیکھ
اپڑیں گریباں میں سر نیواں کر کے دیکھ

ج ۔ فریدا گلئیں چِکڑ دور گھر نال پیارے نیونہہ
چلاں تے بھجے کملی رہاں تے ٹٹے نیونہہ

حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب 'پنجاب میں اُردو' میں پنجابی اور اردو کی

مشابہت کی ایک دلچسپ مثال دی ہے۔ اس نے بھاشا ، اُردو اور پنجابی کے الفاظ کا موازنہ کر کے بتایا ہے کہ بھاشا کے وہ الفاظ جو پنجابی الاصل ہیں اُردو میں بھی وہی صورت و شکل رکھتے ہیں ، سوائے اس کے کہ پنجابی میں جہاں جب یہ پہلے Consonent کے بعد آتے ہیں تو الف کی آواز کو چھوڑ دیتے ہیں ۔ ذیل میں اس کی مثالیں دی جاتی ہیں :

ہندی	پنجابی	اُردو
بیاکل	بیکل	بیکل
چچا	چچا ، چاچا	چچا
باندر	باندر	بندر
ماچھر	مچھر	مچھر
سانچ	سچ	سچ
ماکھی	مکھی	مکھی
تاکڑی	تکڑی	تکڑی
ماٹی	مٹی	مٹی

پنجابی اور اُردو میں بے شمار الفاظ کی آوازیں مشترک ہیں ۔ سوائے 'و' کی آواز کے جو اردو میں 'ب' میں بدل جاتی ہے ۔ ایسے الفاظ کی تعداد سینکڑوں ہے ۔ اس تبدیلی کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں :

پنجابی	آردو
ویچنا	بیچنا
وال	بال
ورتارا	برتارا
والی	بالی
وکاؤ	بکاؤ
وسنا	بسنا

پنجابی زبان نے اپنی موجودہ صورت مغلوں کے دور سے بہت پہلے اختیار کر لی تھی جیسا کہ بابا فرید کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے ۔ لیکن بد قسمتی سے اس کے بعد شیخ ابراہیم فرید ثانی (م ۔ ۱۵۵۱ء) تک ہمیں کسی دوسرے شاعر کی تحریر دستیاب نہیں ہوتی ۔ ان کی کافیاں بھی متنازعہ فیہ بنی ہوئی ہیں تاہم دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیے :

فریدا خاک نہ نندئیے خاکوں جیڈ نہ کوئے جیوندیاں پیراں تلے مویاں اُپر ہوئے

فریدا میں بھلاوا پگ دا مت میلی ہو جائے گیہلا روح نہ جان دا سر بھی مٹی کھائے

پنجابی کی وہ شاعری جس نے بین الاقوامی معیار حاصل کیا لال حسین (م - ۱۵۹۹ء) کی کافیاں ہیں ۔ مثلاً ایک کافی ملاحظہ ہو :

میں بھی جانا جھوک رانجھن دی ، نال مرے کوئی چلے
پیریاں پوندی منتاں کر دی جاناں تاں پیا اکلّے
نین وی ڈونگی تلہ پراناں سیناں پتن ملے
جے کوئی متراں دی خبر لیاوے میں ہتھ دے دینی آن چھلّے
راتیں درد رہن درماندھی گھاو متراں دے الّے
رانجھن یار طبیب سنیدا میں تن درد اولّے
کہے حسین فقیر نماناں سائیں سنیہوڑے گھلّے

مندرجہ بالا اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ پنجابی سولہویں صدی عیسوی کے آخر تک ایک شستہ اور وسیع ذخیرۂ الفاظ کی حامل زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی ۔ لال حسین کی شاعری اور پیلو کی 'مرزا صاحباں' اس کی ترقی کے عینی ثبوت ہیں۔ اس کے بعد سترھویں صدی کے شعراء نے اس میں اور اضافے کیے ، جن میں حافظ برخوردار ، حضرت سلطان باہو ، احمد گوجر ، میرن اور فضل شاہ بڑے پایہ کے شاعر گذرے ہیں ۔ اس طرح یہ زبان زندہ رہنے کے قابل ہو گئی اور گراں قدر ، قیمتی اور بھرپور ادب کے اظہار کا وسیلہ بنی ۔

دوسرا باب

فصل دوم

پنجابی ادب کی خصوصیات

پنجابی ادب کی تحقیق و توثیق سے اس امر کا پختہ سراغ ملتا ہے کہ اس کی ادبی ابتدا بھی مذہبی عقیدہ کی بنیاد پر استوار ہوئی ہے ۔ اور یہ وہی قدیم تاریخی اصولِ کار ہے ، جو ہر زبان کے ادب کا بنیادی عمل رہا ہے ۔ دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر زبان کی ادبی ابتدا شعری ہو یا نثری ، مذہب اور عقیدے کے ماحول سے متاثر ہو کر اپنے معاسرہ کے انفرادی افکار و کردار کے اظہار و بیان کا ذریعہ بنتی ہے ، جنہیں ہم منفرد ادبی تخلیقات کا نام دیتے ہیں ۔

چنانچہ پنجابی ادب بھی اپنے آغازِ کار میں اسی طرزِ تحریر و ترکیب کا حامل رہا ہے ۔ مگر اس کے مزاج میں اپنی انفرادیت کی وجہ سے ایسی اصنافِ سخن پائی جاتی ہیں جو اس ادب کی مخصوص اور منفرد اصناف کی حیثیت رکھتی ہیں ۔

جیسا کہ پہلے باب میں مجملاً ذکر ہو چکا ہے ، اس ادب کے ذخیرہ میں گیت ، بول ، سر ، ماہیا ، ڈھولا ، ٹپہ اور سٹھ کے علاوہ سی حرفی ، کافی ، وار ، بارہ ماہے ، اٹھوارے اور چرخہ نامہ وغیرہ کی اصناف شامل ہیں ۔

یہ ادب جس طرح اپنی اصنافِ سخن میں اندازِ فکر کے لحاظ سے انفرادیت کا مالک ہے ، ویسے ہی اپنے اوزان و بحور کی مخصوص بندش اور ترکیبی ہیئت بھی رکھتا ہے ۔ البتہ اس کے تاریخی مواد میں کافی اور طویل رومانی نظموں کے اندازِ تحریر میں ، اردو اور فارسی کے چند مستعمل بحور کا استعمال بھی دیکھنے میں آتا ہے ۔ یہی صورت اس ادب کی کچھ دیگر اصناف اور سی حرفی کی بھی ہے ، جسے ہم پنجابی ادب کی مخصوص صنفِ سخن یا طرزِ فکر خیال کرتے ہیں ۔ چونکہ سی حرفی کی بندش اور ہیئت ترکیبی کا اندازِ منفرد ہے ۔ اس لیے ہمیں اسے پنجابی کا مخصوص ادب ماننے میں باک نہیں ہونا چاہیے ۔

سی حرفی

یہ پنجابی نظم کی وہ قسم ہے ، جو 'الف' سے شروع کر کے 'ی' تک ایک ایک حرف سے گرہ کر کے لکھی جاتی ہے ۔ چونکہ اس میں چار مصرعوں کی پابندی

ہوتی ہے اس لیے ہم اسے رباعی بھی کہہ سکتے ہیں ۔ مگر چونکہ اس کے بحور و اوزان اردو ، فارسی میں رباعی کے مستعملہ بحور و اوزان سے مختلف اور جداگانہ ہوتے ہیں ، اس لیے ان اشعار کو چومصرعے کہا جاتا ہے ۔ گو چو مصرعہ میں بھی رباعی ہی کی معنویت کا اظہار ہوتا ہے ۔ علمی طور پر رباعی اور چومصرعہ میں یہ فرق ہے کہ جہاں رباعی میں مصرعۂ ثالث کا غیر قافیہ ہونا معمول و مروّج ہے ، وہاں چومصرعہ میں چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں ۔ اگر چومصرعہ میں چاروں مصرعے ہم قافیہ نہ ہوں ، تو اس کی بندش غیر علمی ہونے کی وجہ سے غلط متصور کی جاتی ہے ۔

علاوہ ازیں سی حرفی میں مختلف افکار کے اظہار و بیان کا ہونا بھی جائز ہے ۔ شاعر اس میں ہر فکر و نظر کے اظہار کے لیے مختار ہوتا ہے ۔ البتہ چو مصرعہ میں ایک ہی خیال کی ترتیب و تسلسل کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے ۔ اساتذۂ شعر و ادب کے ہر شاہکار میں اس قاعدہ کی پابندی اس طرح لازمی شمار ہوتی ہے جس طرح مختلف اوزان میں مبادیِ عروض کی ۔ اس پابندی کے بغیر چومصرعہ وحدتِ فکری کھو کر چومصرعہ نہیں رہتا ۔

سی حرفی کا پنجابی ادب میں عام رواج پایا جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ تقریباً ہر پنجابی شاعر نے سی حرفی لکھی ہے ۔ چنانچہ سلطان باہو رحؒ (۱۶۳۱ء - ۱۶۹۱ء) ، علی حیدر (۱۶۹۰ء - ۱۷۷۷ء) ، سید ہاشم شاہ (۱۷۵۲ء - ۱۸۲۱ء) ، قادر یار (۱۸۰۲ء - ۱۸۹۱ء) ، بردا پشاوری (۱۸۲۷ء - ۱۸۹۷ء) ، احمد علی سائیاں (۱۸۳۶ء - ۱۹۲۹ء) ہدایت اللہ لاہوری (۱۸۳۸ء - ۱۹۲۹ء) کے علاوہ رحم یار (۱۸۵۱ء - ۱۹۰۳ء) محمد بوٹا گجراتی (۱۸۵۱ء - ۱۹۳۰ء) باغبان ، مسافر اور بابو کرم سب نے سی حرفیاں لکھی ہیں جو عوام میں مقبول ہیں ۔ سی حرفی میں رواں بحر طویل کے علاوہ مثنوی اور دو ایک علاقائی اندازِ فکر کی بحریں بھی مروّج ہیں ، جن کے نمونے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے :

رواں بحر طویل کی مثالیں :

(۱)

۱ - الف - ایہہ تن میرا چشماں ہووے میں مرشد ویکھ نہ رجّاں ہو
۲ - لوں لوں دے مڈھ لکھ لکھ اکھّاں اک کھولاں اک کجّاں ہو
۳ - اتنیاں ڈٹھیاں صبر نہ آوے ہور کتے ول بھجّاں ہو
۴ - مرشد دا دیدار ہے باہو مینوں لکھ کروڑاں حجّاں ہو

(حضرت سلطان باہو رحؒ)

(۲)

۱ - الف - ایتھے اوتھے آساں آس تینڈی اتے آسرا تینڈڑے زور دا ای
۲ - سبھیں سب حوالڑے تینڈڑے نی اساں خوف نہ گنڈڑے چور دا ای!
۳ - تو ہیں جان سوال جواب سبھو سانوں ہول نہ اوکھڑی گور دا ای!
۴ - علی حیدر نوں سک تینڈڑی اے تینڈے باہجھ نہ سائل ہور دا ای

(علی حیدر)

(۳)

۱ - ک - کتھے شاہ سکندر دارا اتے جام گیا کت جم دا
۲ - تھڑکن دیو جنھاں دی تیغوں اتے دہل پیا نت کسم دا
۳ - ڈھونڈیاں خاک تنہاں نہیں لبھدی ایہ جگ برا گھر غم دا
۴ - ہاشم جان غنیمت دم نوں بھلا کیا بھروسا دم دا

(سید ہاشم شاہ) -

(۴)

۱ - ع - عقل تے علم نہ کم آوے قسمت جدوں انسان دی ہار جاوے
۲ - ڈھوئی ملے نہ وچ جہان سارے بھانویں لنگھ سمندروں پار جاوے
۳ - جدوں ساعتاں پھرن حضور ولوں ہو ہور دی ہور بہار جاوے
۴ - وسے مینہہ مسافرا کرم دا جان ہو کنڈیاں تھیں گلزار جاوے

(مسافر)

کافی

سی حرفی کی طرح پنجابی ادب میں کافی کی صنفِ سخن کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے - اس میں صوفیانہ رنگ غالب ہوتا ہے - پنجابی صوفیانہ شاعری کا ایک مخصوص رنگ ہے - فارسی اور اُردو شاعری میں عاشق اور محبوب کے لیے ایک ہی صیغۂ استعمال ہوتا ہے - البتہ بعض اوقات محبوب کے اوصاف سے اس کے مؤنث ہونے کا پتہ چلتا ہے - یعنی فارسی اور اُردو شاعری میں عشق کا اظہار مرد کی طرف سے ہوتا ہے - اس کے برعکس پنجابی صوفیانہ شاعری میں عشق کا اظہار اکثر عورت کی طرف سے ہوتا ہے - صوفی شعراء اپنے آپ کو اور روح کو ہیر ، سوہنی اور سسی اور اپنے خدا اور مرشد کو رانجھا (رانجھن) ، مہینوال اور پنوں کے نام سے مخاطب کرتے ہیں - بعض اوقات (میں نمانی) کی ترکیب بھی استعمال کی جاتی ہے - اس کی مثالیں شاہ حسین رح (۱۵۳۹ء - ۱۵۹۳ء) ، سلطان باہو رح (۱۶۳۱ء - ۱۶۹۱ء) ، حضرت بلے شاہ رح (ز - ۱۷۶۷ء) ، ہاشم شاہ (۱۷۵۲ء - ۱۸۲۱ء) کے کلام میں بکثرت ملتی ہیں -

غالباً یہ ہندی روایات کا اثر ہے ۔ البتہ ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ پنجابی کے تقریباً تمام صوفی شعراء اپنے افکار، تاثرات اور دلی واردات کو فقط صوفیانہ شاعری اور عارفانہ کلام تک محدود رکھتے ہیں ۔ معشوقِ حقیقی کے سوا ان کا کوئی مطلوب نہیں ہوتا اور مجاز و حقیقت کا تضاد ان کے کلام میں نہیں ملتا اور کافی کی صنفِ سخن ان کی اس طرزِ فکر کے لیے مخصوص ہے ۔

کافی پنجابی ادب کی عارفانہ شاعری کی ایک بے مثل صنف ہے ۔ اس میں تین تین چار چار مصرعوں کا ایک بند ہوتا ہے ۔ آخر کا مصرعہ بار بار آتا ہے ۔ جیسے پڑھنے والی ٹولی دہراتی رہتی ہے ۔ کافی گانے جانے کے لیے لکھی جاتی ہے ۔ شاہ حسین اور بلّھے شاہ کی کافیاں مشہور ہیں اور اکثر کافیاں مختلف راگوں کے مطابق لکھی گئی ہیں ۔

کافی کی لفظی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ لغتِ عرب میں کفایت کرنے والی منظوم بندش کو کافی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ عربی ادبیات میں اسے مصادر کی مختلف صورتوں اور ان کا استعمال عام دیکھنے میں آتا ہے ۔ منفرد عربی ادب کے علاوہ قرآن مجید میں بھی اس طرزِ فکر کی کئی مثالیں ملتی ہیں ۔ جیسا کہ "و کفٰی باللہ شہیدا" "یا کفٰی اللہ المومنین القتال" "یا وکفٰی باللہ حسیباً" سے ظاہر ہوتا ہے ۔

جہاں تک شعرائے عرب کا تعلق ہے ۔ ان کے ہاں کافی کے عنوان کی کوئی مثال نہیں ملتی ۔ البتہ مذکورہ کافی کی ترکیبِ لفظی کو وہ چند قوافی کے ربط سے مکمل کی گئی نظم کے لیے استعمال کر لیتے ہیں ۔ مگر کسی نظم کے عنوان کی جگہ اس لفظ کا کبھی استعمال نہیں کرتے ۔ غالباً یہ لفظی ترکیب ان کے نزدیک بہ نسبت بندش الفاظ کے معنوی ضرورت کو زیادہ پورا کرتی ہے اس لیے وہ کافی کے لفظ کی بجائے قافی کے استعمال کو زیادہ موزوں اور مناسب سمجھتے ہیں ۔

پنجابی ادب میں بہ مقابلہ عربی ادب کے، کافی کے لفظ کی ترویج نہ صرف عام ہے، بلکہ اس قدر مخصوص فنی حیثیت اختیار کر چکی ہے کہ اب اسے عنوانِ نظم کی بندش سے جدا کرنا ناممکن نظر آتا ہے ۔ اس کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس ادب کے صوفی شعراء نے بولی اور دوہڑے کی فنی اقدار کے ساتھ جب کافی کی لفظی ترکیب کا آغاز کیا، تو اسے اپنی طرزِ فکر کے تقاضے سے مذہبی عقیدت مندی کے سانچے میں ڈھال کر لازوال بنا دیا ۔

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اس طرزِ عمل کے لیے یہ فن کار مجبور بھی تھے، کیونکہ ان کے سامنے قرآن حکیم کے متن کے ساتھ تراجم و تفاسیر اور فقہ و احادیث کے ضخیم اور وسیع تر باب کھلے تھے ۔ جو ایک طالب علم کے لیے درسی طور پر پڑھنے، سننے صرف محال ہی نہیں ناممکن بھی تھے ۔ اس لیے انہوں نے ان دروس

علم و ادب کی روح کشید کرکے کافی کی طرزِ فکر میں محفوظ کر لینا ہی عوام کے لیے ''کافی'' سمجھا اور ایسے ضخیم اور عظیم دفاتر ادب کے مقابلہ میں دو چار بند کی مختصر سی نظم کو ''کفایت کرنے والی'' سمجھ کر اس کا نام کافی رکھ دیا ۔

اس قسم کے تحقیقی حقائق کی روشنی میں ہمیں جو تاریخی واقعات نظر آتے ہیں ، ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ کافی اسلامی ادب ہی کی اختراع و ایجاد ہے ۔ چنانچہ اسی لیے یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسے واقعات کا کچھ تذکرہ کر لیا جائے ۔

قدیم پنجاب کے علاوہ قدیم ہندوستان میں بھی کافی کے گانے کا عام رواج دیکھنے میں آتا ہے ۔ ان دنوں یہ بھجن کی صورت میں تھی ۔ اسی لیے بعض کہتے ہیں کہ کافی قدیم ہندی گرنتھوں سے ماخوذ ہے ۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ سندھی ادب کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبدالطیف بھٹائی کافی کے موجد تھے ۔ یہ صحیح نہیں کیونکہ حضرت لال حسین سولھویں میں کافیاں لکھ رہے تھے اور حضرت عبدالطیف بھٹائی اٹھارویں صدی کے بزرگ ہیں ۔ بلکہ بعض اہلِ علم اپنی تحقیق و توثیق کے اعتبار سے بھی ان دونوں کا کافی سے ایسا کوئی تعلق تسلیم نہیں کرتے ۔ آپ ان دونوں نقطہ ہائے نگاہ کے متعلق اہلِ علم کی رائے سنیے ۔ سید لطف علی شاہ منظوز سندھی ادب کے تذکرہ میں شاہ عبدالطیف بھٹائی کے کلام پر ایک تنقیدی مضمون میں رقمطراز ہیں :

> ''شاہ عبدالطیف بھٹائی کافی کے موجد نہیں ۔ کافی ہندوؤں کے قدیم گرنتھوں کے مطابق ہندی موسیقی کے ایک ٹھاٹ سے پیدا شدہ ایک راگ کا نام ہے ۔ جس کا ذکر آج سے سات سو سال قبل پنڈت سارنگ دیو نے اپنے گرنتھ رتناکر میں ہرپریامیل کے نام سے کیا ہے ۔ اس ہرپرامیل ٹھاٹ کو اس سے پہلے سری راگ بھی کہا کرتے تھے ۔ اس زمانے میں تقریباً ہر ایک ٹھاٹ سے وقت کے موسیقاروں نے نئے نئے راگ ایجاد کیے اور اسی طرح ہرپریامیل سے بھی کئی راگنیاں ایجاد ہوئیں ۔ مثلاً دھنا سری، بھیم پلاس، مدھ ملہار، بھاگیسری، حسین لہرا ، رامداسی ملہار ، پیلو ، میاں کا سارنگ ، بروہ اور ماونت سارنگ وغیرہ'' ۔

ایک اور سندھی فن کار اور ادیب رشید لاشاری سندھی کافی کے اندازِ فکر میں نئے راگوں کی ایجاد کے بارے میں مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کرتے ہیں :

> ''ستار کے موجد امیر خسروؒ نے بادشاہِ وقت کے تعاون سے تقریباً سات سو سال قبل اس زمانے کے شاہی موسیقار نائیک گوپال کو شکست دینے کی غرض سے ہندی اور عجمی راگ کے ملاپ سے چند نئے راگ ایجاد کیے ۔ مثلاً عجمی راگ یمن سے ایمن کلیان ، حجاز سے ہجیج اور ہرپریامیل سے کافی ، اور بروہ

راگ ایجاد کیا ۔ یعنی امیر خسرو نے ہرپریامیل سے ایک سمپورن راگ وضع کیا اور اس کا نام کافی رکھا ۔ اس راگ کو کافی اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں موسیقی کے سب راگ براہِ راست موجود تھے" ۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے سید عبدالقادر نے لکھا ہے :

"جناب شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام میں کافی کا لفظ نظر نہیں آتا ۔ اس لیے شاہ صاحب کو کافی کی بجائے ، وائی کا موجد کہنا بالکل بجا ہوگا ۔ وائی کی بندش آ نٹر ٹپہ کے طریقہ پر ہوتی ہے ۔ ٹپہ چونکہ ایک ہی مصرعہ پر مشتمل ہوتا ہے، اس لیے اس کو وائی بھی کہا جا سکتا ہے ۔ کافی میں ڈیوڑھے، دگنے، تگنے اور چوگنے مصرعے گائے جاتے ہیں اور وائی کے مقابلہ میں اس کی تاریخ بھی بالکل قدیم نظر آتی ہے ۔ لیکن ہمارے متاخرین نے غلط فہمی کی وجہ سے وائی کو بھی کافی سمجھ لیا ۔ کیونکہ اضافہ شعریت یا موسیقی کا سندھ میں اتنا مواد موجود نہیں تھا ، اس لیے یہ امتیاز قائم نہ ہوسکا کہ وائی کیا چیز ہے اور کافی کیا چیز" ۔

کافی در حقیقت عربی لغت کا لفظ ہے ۔ جس کے معنی ہیں وافر ، زیادہ ، کفایت کنندہ اور وائی سندھی لغت کا لفظ ہے جس کو عموماً بات بھی کہا جاتا ہے ۔ وائی کا لفظ واؤ (ہوا) سے مشتق ہے ۔ اور اکثر شعراء نے اظہارِ درد یا فریادِ محبت کے مضمون کو ہوا سے تشبیہہ دی ہے ۔ اسی تاویل اور مناسبت سے سندھی شاعری کو اس صنف کی وائی کہنا بالکل بجا اور مناسب معلوم ہوتا ہے ۔

واقعات اور حالات کی اس تفصیلی بحث سے ، ایک تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کافی کا تعلق پنجابی زبان و ادب سے مخصوص ہے ۔ دوسرا یہ کہ اسلامی ادب ہی اس کا مخرج ہے ۔ تیسرا یہ کہ ایک عظیم مسلمان شاعر اور ادیب ہی اس کا موجد ہے ، جو اپنے دور کے اصفیائے کبار سے گہری نسبت رکھتا تھا ۔

سلسلۂ سلوک و تصوف کی مناسبت سے امیر خسروؒ کا واسطہ خواجہ نظام الدین اولیاء سے تھا اور خواجہ صاحب کی نسبت بابا فرید الدین گنج شکر سے تھی ۔ بابا فرید گنج شکر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی ملت حضرت خواجہ اجمیر رحمۃ اللہ علیہ سے تھی ۔ اور یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس سلسلۂ سلوک کو ساز و آہنگ سے ایسا گہرا تعلق تھا کہ قوالی ان کے سلسلہ کا بنیادی شعار بن کر رہ گئی تھی ۔

چنانچہ قوالی کے درمیان مجلس نکھارنے کی غرض سے قوال کسی کافی کا الاپ کرتے تو وجد و حال کی کیفیت کا یہ عالم ہوتا کہ صوفیہ کو مئے وحدت کے کیف و سرور

میں استغراق کامل کی وجہ سے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہتی۔ اور وہ اپنے آپ کو بارگاہِ رب العزّت کے حضور محسوس کرتے۔

اسی قسم کی صوفیانہ مجالس نے کافی کو ایسی اہمیت بخشی ، کہ یہ فنی طرزِ فکر پنجابی شاعری کے عارفانہ انداز اظہار کے لیے اس کے ادب کی ایک بے مثل صنف بن گئی۔ شعری اصطلاح کی مناسبت سے کافی کا اندازِ اظہار مسدس ، مخمس ، مثلث اور دو سخنی ترکیب تک دیکھنے میں آتا ہے۔ چنانچہ ذیل میں اس کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیں :

(۱)

راگ جے جے ونتی
طرزِ اظہار ، قطعہ

متراں دی مجانی خاطر دل دا لہو چھانی دا

کڈھ کلیجہ کیتم بیرے — سو بھی لائق ناہی تیرے
ہور توفیق ناہی کجھ میرے — پیو کٹورا پانی دا
متراں لکھ کتابت بھیجی — لگا بان پھراں تڑپھیندی
تن وچ طاقت رہی نہ مولے — رو رو حرف پچھانی دا
تن من اپنا پرزے کیتا — تینوں مہر نہ آئی میتا
سانوں ہور عذر نہ کوئی — چارا کیہا نمانی دا
کہے حسین فقیر نمانا — تیں باجھوں کوئی ہور نہ جاناں

توں ای دانا ، توں ای بینا ، توں ای تان لتانی دا

(لال حسین)

(۲)

سر جوگیا ، وقت سحری ،
طرزِ اظہار ، مسدس

اٹھ جاگ گھراڑے مار نہیں
ایہہ سون تیرے درکار نہیں
اک روز جہانوں جاناں ہے
جا قبرے وچ سماناں ہے
تیرا گوشت کیڑیاں کھاناں ہے
کر چیتا مرگ وسار نہیں

اٹھ جاگ گھراڑے مار نہیں
اِہ سون تیرے درکار نہیں

(سید بلھے شاہ)

(۳)

سر تلنگ ، وقت ظہر
طرزِ اظہار ، مخمس

منہ آئی بات نہ رہندی اے
جھوٹھ آکھاں تے کجھ بچدا اے
سچ آکھیاں بھانبڑ مچدا اے
جی دوہاں گلاں نوں جچدا اے
جچ جچ کے جیبھا کہندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

(سید بلھے شاہ)

طویل رومانوی نظمیں

پنجابی زبان و ادب کی یہ صنفِ سخن جہاں اس کے ادب کی مخصوص و معیّن بحر طویل میں رائج ہے وہاں اردو اور فارسی ادب کی مروّجہ بحروں میں بھی مرتب و مدوّن نظر آتی ہے ۔ قواعدِ عروض کے لحاظ سے گو مثنوی کی مخصوص اور مشہور و معروف بحر متقارب مثمن محذوف الآخر فعولن فعولن فعولن فعل ہے ، مگر بعض اساتذۂ جدید و قدیم کئی ایک دوسری بحروں میں بھی کہہ لیتے ہیں ۔ بعینہٖ پنجابی شعر و ادب میں بھی اپنی مخصوص اور منفرد بحر طویل کے علاوہ اور بحریں بھی مثنوی کی صنفِ سخن کے لیے مروّج ہیں ۔ علاوہ ازیں بعض اساتذۂ فن نے تو اردو و فارسی ادب و شعر میں قطعہ اور رباعی تک کی معیّن بحروں کو پنجابی مثنوی کے لیے استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا ۔ چونکہ اس فنی معمول کی صرف دو نہیں ، بلکہ اس سے زیادہ مثالیں ملتی ہیں ، اس لیے اس طریق عمل کو ہمیں پنجابی شعر و ادب میں بطور قواعد کے مدلل اور موثوق ماننا پڑے گا ، خواہ فارسی اور اردو میں یہ اوزان قطعہ اور رباعی ہی کے لیے مخصوص اور معیّن کیوں نہ ہوں ۔

پنجابی زبان کے مندرجہ ذیل اشعار میں بحر ہزج مسدس محذوف الآخر کی ایک کامیاب کوشش دیکھیے ، جو مولوی غلام رسول نے اپنے شاہکار 'سسی پنوں' میں استعمال کی ہے ۔

اس مثنوی میں نعت کا یہ مطلع ہے :

صبا روضے رسول اللہ دے جائیں   میرا احوال رو رو کے سنائیں

(مفاعیلن مفاعیلن فعولن)

اُردو فارسی کے مخصوص اوزان جو رباعی کے لیے معیّن ہیں ، پنجابی مثنوی کی مندرجہ ذیل مثالوں میں نظر آتے ہیں ۔ یہ اشعار مثنوی 'سوہنی مہینوال' قادر یار سے ماخوذ ہیں ۔ آغازِ داستان میں عشق کے عنوان کا مطلع کہا گیا ہے :

اک بات دلیلوں عشق دی کیتی اساں وچار

عشق شہر وچ جا وڑے کھلے رخت بازار

چونکہ رباعی کے چاروں مصرعے اس کے دس (۱۰) مستعملہ بحور میں الگ الگ لکھنے بھی جائز ہیں ، اس لیے تقطیع کے اعتبار سے متعلقہ ارکان کے اختلاف کے باوجود وزن میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ اس لیے یہ عمل اساتذہ کے نزدیک جائز ہے ۔ مندرجہ ذیل بحور میں ان کی مماثلت کا اظہار بالکل نمایاں نظر آتا ہے ۔ مفعول مفاعیل مفاعیل فعول ، مفعول مفاعیلن مفعول فعول یا مفاعلن مفاعیل مفعول ۔

مزید برآں رباعی کی اس علمی اور عملی طرزِ اظہار کے مطابق قطعہ کے بحور و اوزان کا استعمال بھی پنجابی شعر و ادب کے اندازِ بیان میں نمایاں اور وافر ہے ، 'یوسف زلیخا' مولوی غلام رسول عالم پوری اور 'سیف الملوک' میاں محمد بخش میں اس کی مثالیں ملتی ہیں ۔ 'یوسف زلیخا' میں حضرت یوسف کے فروخت ہوتے وقت ایک اصولی بات کے اظہار میں ذیل کا شعر کہتے ہیں :

جس نوں یار وکیندا لبھے قیمت ہووس پلّے

اس دے جیڈ نہ طالع والا اس دے کرم سوّلے

یہ بحر ہزج مثمن ابتر "مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن فع" سے قطع ہے ۔ ذیل میں دوسری مثال 'سیف الملوک' کے بحر کی ہے جس میں ، حمد کا مطلع دعائیہ ہے :

رحمت دا مینہ پا خدایا باغ سکا کر ہریا

بوٹا آس امید میری دا کر دے ہریا بھریا

اس مثنوی کا وزن بحر مدید میں ہے ۔ جو فارسی شعر و ادب میں بھی مستعمل ہے ۔ فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن ۔

علاوہ ازیں ان نظموں کے اندازِ بیان میں کسی ایک واقعہ کا ہی اظہار نہیں ہوتا ، بلکہ اس میں کسی معاشرہ کی پوری تصویر بیان کی جاتی ہے ، اور اس دور کے معاشرتی اور

تمدنی حالات کی عکاسی کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پہلو اکبر کا زمانہ (۱۶۰۵ء-۱۶۵۶ء) اور حافظ برخوردار (سترھویں صدی کا نصف آخر) کی 'مرزا صاحباں'، مقبل کی 'ہیر' 'وارث شاہ کی ہیر'، (۱۷۶۶ء)، ہاشم (۱۷۵۲ء - ۱۸۲۱ء) کی 'سسی پنوں'، امام بخش (۱۷۷۸ء-۱۸۶۳ء) کی 'شاہ بہرام گل صنوبر' اور 'چندر بدن' مولوی غلام رسول (م - ۱۸۹۲ء) کی 'احسن القصص' فضل شاہ (۱۸۲۷ء - ۱۸۹۰ء) کی 'سوہنی مہینوال' اور 'لیلیٰ مجنوں' اور میاں محمد بخش (۱۸۳۰ء - ۱۹۰۶ء) کی 'سیف الملوک' مشہور ہیں۔ ان میں مختلف علاقوں کو چھوڑ ہمیں سارے دیس کی مربوط زندگی کی ترجمانی اور فطری ماحول کی منظر نگاری اور عوامی جذبات کی تصویر کشی ملتی ہے۔

حافظ برخوردار کی 'مرزا صاحباں' سے دو چار سرخیوں کے نمونے ملاحظہ کیجئے۔ پنجابی اکیڈیمی کے مطبوعہ نسخہ کے صفحہ ۹ پر سرخی نمبر ۱۳ کے زیر عنوان وہ صاحباں کے حسن کی تعریف میں ایک دو چو مصرعے سپرد قلم کرتا ہے:

(۱۳)

کھیوے ماہنی وڑدیاں اک صورت نظر پئی
ذات پری دی استری جٹی ہو گئی
اوہدے نین شکاری جھٹلے ویہندیاں جان لئی
اوس بھر اکھیں جت ویکھیا جندیں کھیت رہی

(۱۴)

اودھی کایا بنی پلٹنی وچ کٹھیالی ڈھال
جویں سچے وچ سنیاریاں سوناں پایا گال
رکھ دگرا ساں تے اوہنوں کیتی تیز لوہار
اوہدیاں اکھیں پیل والیاں کھو توں کت ہندال
اوہ وچ سیاں دے کھیڈ دی اوہدا حافظ حسن کمال
جشاں پھل لبیٹیا وچ بھورے پا روسال

مرزے دے حسن دی تعریف (۱۵)

منیں کھرل قدیم تھیں وڈے ساکاں نال
مرزا نکڑا ہندا پیر نال پلیا گھر ننھال
اُسدی صورت اتے حسن دا آھا روپ کمال
ویکھ سیالیں اوسنوں ہو ہو ہون نہال

مرزے دی جوانی (۱٦)

مرزے چڑھی خماری حسن دی ہویا آ جوان
اوہدے خونی لین لشار چی عشق چڑھائے سان
چویس رت کلیجئوں دل دا گوشت کھان
داد سیالاں دے اوس پاس ھک آون ھک جان

گلزار

پنجابی شعر و ادب میں اس کے بعض فنکاروں نے گلزار کے عنوان سے جنگ ناموں کی طرز پر پیغمبروں کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ مولوی محمد مسلم (۱۸۰۵ء - ۱۸۸۰ء) کی 'گلزار موسیٰ'، 'گلزار سکندری' اور 'گلزار محمدی' اور مولوی محمد دلپذیر (پ - ۱۸۷٦ء) کی 'گلزار آدم'، 'گلزار محمدی'، 'گلزار موسیٰ' اور 'گلزار مکہ' مشہور و معروف گلزاریں ہیں۔ مولوی محمد دلپذیر 'گلزار محمدی' میں مضامین کتاب ہذا کے زیر عنوان ایک سرخی سپرد قلم کرتے ہیں:

لیہہ گلزار محمدی قصہ شاہ رسل — حال رسولؐ کریم دا اس وچ لکھاں کل
نور نبی تھیں کھن کے پیدائش دا حال — جیوں پھر ہوئی پرورش لکھاں کل مقال
اتری جویں پیغمبری ہویا وحی نزول — گئے جیویں معراج تے حضرت پاک رسولؐ
بھی اصحاب کبار تے آندا جیوں اسلام — ہجرت جیونکر مکیوں کیتی نبیؐ کرام
وچ مدینے اپڑیاں جیوں ہوئی تعظیم — جنگ بدر، جنگ احد جیوں کیتا نبیؐ کریم

'گلزارِ سکندری'، مولوی محمد مسلم کی تصنیف ہے، جس میں سکندر[1] کے حالات اور کوائف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ''دربیان آغاز قصہ فیلقوس و سلطان سکندر و احوال دارا شاہ ایران'' کے زیر عنوان لکھا ہے:

اللہ باب آسان کر حال سکندر شاہ — جیونکر خلقت اوس نے پائی سدھے راہ
آتش کدے کفار دے جو سی وچ جہان — رہن نہ دتا ہک بھی سنیاں جس مکان
بت جو آہے پوجدے اندر شہر بلاد — نالے پوجن والیاں مار کیتا برباد
ہویا ذوالقرنین سا اندر جس زماں — ہیں مختلف روائتاں راوی کرن بیاں
بعضے کرن بیان ایہہ راوی نیک رئیس — ہویا ذوالقرنین سا وقت نبی ادریس

۱۔ اس قصہ میں بلکہ اکثر قصص میں سکندر یونانی کو بے وجہ قرآن کریم کے ذوالقرنین کے مترادف قرار دے دیا گیا ہے ..... مدیر عمومی

ہوئے وچ جہان دے شاہ سکندر دو | پہلا اکبر جان توں دوجا اصغر ہو
اکبر اسنوں جاں تو پہلا ذوالقرنین | اصغر آہا دوسرا جدے جدے ایہ، ہین

اسی طرح ان ۔ونوں کے حالات ۹۵ صفحات کی ضخامت پر پھیلے ہوئے ہیں - تمام نظم کی زبان سادہ اور بامحاورہ ہے -

وار

فارسی اور اردو ادب کے جنگ ناموں یا رزمیہ نظموں کی طرح پنجابی ادب میں وار کے عنوان سے کسی قوم کے جنگی کارناموں کا اظہار ہوتا ہے - جیسے نجابت (اوائل اٹھارھویں صدی عیسوی) کی 'نادر شاہ دی وار' اور پیر محمد (انیسویں صدی عیسوی) کی 'چٹھیاں دی وار' اور شاہ محمد (۱۸۶۲ء - ۱۸۸۹ء) کی 'سکھاں دی وار' معروف واریں ہیں - واروں سے مفصل بحث ہم نے چوتھے باب میں کردی ہے -

وار کے عنوان کے تحت پنجابی زبان و ادب میں رزمیہ اندازِ بیان کے علاوہ عشقیہ طرزِ فکر کا بھی رواج عام ملتا ہے - جیسے وار 'مرزا صاحباں' ار پیلو -

نادر شاہ دی وار

اس کو سب سے پہلے سر ایڈورڈ میکیگن گورنر پنجاب نے ترتیب دیا اور بعد ازاں رائے بہادر ہری کشن کول نے ان کے جمع کیے ہوئے متن میں مزید تحقیق و تلاش کر کے چند سرخیاں اور بڑھائیں اور انہیں ایک مقالہ کی صورت میں ترتیب دیا - یہ مقالہ پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کے سالانہ اجلاس میں ۲۶ ستمبر ۱۹۱۶ء کو پڑھا گیا -

اس وار کا اگر علمی جائزہ لیا جائے ، تو یہ اس برصغیر کی اہم جنگی تاریخ معلوم ہوتی ہے ، جس کا دامن اس دور کی عظیم انقلابی سازشوں سے داغ دار نظر آتا ہے - اس میں شاعر نے جہاں اپنی نظم کے لیے سادہ ، سلیس اور با محاورہ زبان استعمال کی ہے ، وہاں شعر و سخن کی فنی اقدار کو بر محل سمو کر پنجابی سخنوری کی اصطلاحات و تلمیحات کی واضح تشریح بھی کی ہے جس سے وار کی منظوم حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے -

چٹھیاں دی وار

اس وار کو مرحوم قاضی فضل حق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور نے مرتب کیا - اس کا متن انہیں اپنے عم بزرگوار حکیم نور الدین صاحب مرحوم کے کتب خانے سے ملا - جو کسی کم سواد کاتب کے ہاتھوں کا لکھا ہوا تھا - چنانچہ انہوں نے یہ چند اوراقِ پریشان بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے درست کرکے ترتیب

دیے اور دسمبر ۱۹۱۶ء میں 'چٹھیاں دی ہوڑی' کے نام سے اس تاریخی دستاویز کو پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کے اجلاس میں پڑھا ۔

اتفاق کی بات ہے کہ ان کا یہ مضمون ان کے کسی دوست کی لاپرواہی سے گم ہو گیا اور ان کے پاس اس کا خاکہ ہی رہ گیا ، جسے انہوں نے دوبارہ ترتیب دے کر ۲۰ فروری ۱۹۲۵ء کو 'چٹھیاں دی وار' کے نام سے کریمی پریس لاہور سے طبع کرا دیا ۔

اس وار کا مصنف پیر محمد ہے ۔ وہ تعلیم یافتہ معلوم ہوتا ہے اور اصول شاعری سے بھی واقف ہے ۔ اس کی زبان نہایت ٹھیٹھ اور شستہ پنجابی ہے ، جو گجرات ، سیالکوٹ ، گوجرانوالہ اور لاہور میں عام طور پر بولی جاتی ہے ۔ علاوہ بریں وار میں تلمیحات و محاورات اور تمثیل نگاری کا پہلو غالب ہے ۔ آغاز نظم کے اشعار اس کی اسی فنکارانہ صلاحیت کے آئینہ دار ہیں :

رّب جبار قہار دا کسے الت نہ پایا — تے کہہ کے لفظ اس کن دا سبھ ملک بنایا
تے آدم حوّا سرج کے اس آپ لکھایا — تے کدھ انہاں نوں جنتوں وچھوڑا پایا
تے گھت طوفان اس نوحؑ نوں چا غرق کرایا — تے ابراہیمؑ خلیل نوں چا چخا چڑھایا
تے اسماعیلؑ اس باپ تھیں چا آپ کہایا — رکھ آرہ سر ذکریے اس چیر وڈھایا
سر یحییٰؑ دا کٹ کے وچ تھال ٹکایا — تے یونسؑ نوں منہ مچھ دے اس چا نگلایا

تمام وار کے متن میں اسی قسم کی تاریخی تمثیل نگاری کے نمونے ملتے ہیں ، جنہیں بامحاورہ زبان میں مصنف نے موثر انداز میں پیش کیا ہے ۔

سکھاں دی وار

اس وار کا مصنف شاہ محمد شاعر بٹالہ ، ضلع امرتسر ، مشرقی پنجاب کا رہنے والا تھا ۔ شاہ محمد نے اپنی یہ وار پنجابی زبان و ادب کی روائتی بحر میں لکھی ہے ۔ اس کی زبان سلیس اور بامحاورہ ہونے کے علاوہ بیانیہ طور پر نہایت موزوں اور مؤثر ہے ۔ یعنی شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ اسلوب کی کسی الجھن کے بغیر صاف طور پر کہہ دیتا ہے ۔ مثلاً ذیل کے چو مصرعے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کی عملداری اور اس کی حکومت کے تاریخی دور کا تذکرہ کس قدر مکمل اور حسن و خوبی سے کیا گیا ہے :

مہان بلی رنجیت سنگھ ہویا پیدا نال زور دے ملک ہلا گیا
ملتان کشمیر پشور چنبہ جموں کانگڑا کوٹ نوا گیا

ہور دس لداخ تے چین توڑی سکہ اپنے نام چلا گیا

شاہ ھدا جان پھاس برساں اچھا رح کے راج کا گیا

میدان جنگ کا نقشہ کھینچ کرانگریزوں کے ہاتھوں سکھوں کی شکست کا جو بیان ہے ، اس پر وار ختم کر دی جاتی ہے :

سمت انی سے دوسرا آنریا سی جدوں ہویا فرنگی دا جنگ میاں

اسی خون دی اوہ زمین پھاسی ہویا سرخ شراب دے رنگ میاں

دھرتی وڑکے دھوڑ دے ہنیں بدل جشوں چڑھے اکاش پتنگ میاں

شاہ ھدا سراں دی لا بازی نہیں موڑ دے سورمے انگ میاں

گیت

یہ بڑی دل نواز صنفِ شعر ہے اور پنجابی زبان میں اس کے ذخیرے کا اندازہ لگانا محال ہے۔ پنجاب دیہاتوں کی سر زمین ہے اور ہر دیہہ کے تمام افراد کی زبانوں پر گیت موجود ہوتے ہیں ۔ مرد ، عورتیں ، بچے ، جوان ، حتیٰ کہ بوڑھے بھی گیتوں کے ذریعے دلوں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں ۔ گیت اتنے ہی قدیم ہیں جتنی کہ خود پنجابی زبان قدیم ہے ۔ اور چوں کہ یہ مقامی ماحول کی پیداوار ہیں اس لیے ان کی ہیئت یا اوزان پر کسی اور زبان کا اثر نہیں ۔ ان میں جذبات کی شدت ہوتی ہے ۔ خوشی اور غم کے تمام مواقع سے ان کا تعلق ہوتا ہے ۔ موسموں کی آمد و رفت ، فصلوں کے پکنے ، گھریلو زندگی اور معاشرتی رسموں وغیرہ سب کے لیے علاحدہ علیحدہ گیت آپ کو ملیں گے ۔ پھر مردوں اور عورتوں کے مخصوص گیت ہوتے ہیں ۔ عورتوں کے گیتوں میں نزاکت ، ملائمت اور شرمیلا پن پایا جاتا ہے ، جیسے معصوم روحیں ، پیارے پیارے شیریں الفاظ میں گا رہی ہوں ۔ ان میں ہر حسرت اور ہر آرزو کا اظہار ہوتا ہے ۔ ہر گیت میں کوئی انوکھا اور دل میں اتر جانے والا خیال ہوا کرتا ہے جو سینے میں براہِ راست ٹھوکر لگاتا ہے ۔ خیالات سادہ ہوتے ہیں اور زبان بھی سادی ۔ ان کی چھوٹی بحریں بھی ہوتی ہیں اور لمبی بھی ۔ اسی طرح قافیے والے گیت بھی ہوتے ہیں اور قافیے کے بغیر بھی ۔ بعض گیتوں میں لمبی چھوٹی بحریں ملی ہوئی ہوتی ہیں ، قافیہ بھی ہوتا ہے اور بلینک ورس بھی ۔ گیت ڈھولک پر ، بانسری کی لے کے ساتھ اور ویسے سریلی آواز کے ساتھ گائے جاتے ہیں ۔ چراگاہوں میں ، کھیتوں میں ، دریاؤں کے کناروں پر ، پہاڑوں پر ، گھروں میں ان کی تانیں سنی جا سکتی ہیں ۔ ان کی بہت سی قسمیں ہیں ۔ پنجابی لوک گیتوں کا ایک مجموعہ ۱۹۶۵ء میں نیشنل کونسل آف میوزک

آف پاکستان نے طبع کرایا تھا اور ایک دوسرا مجموعہ جدید ناشرین لاہور کی طرف سے بھی اسی سال چھپا تھا ۔ لیکن ان میں ہر قسم کے گیت نہیں ۔ ہم ذیل میں لوک گیت ماہیا کے کچھ بند بطور نمونہ درج کرتے ہیں :

۱ ۔ کوٹھے اُتے اِل ماہیا لوکاں دیاں رون اکھیاں ساڈا رونداا ے دل ماہیا
۲ ۔ دو پتر اناراں دے اک واری مل ماہیا دکھ جان پیاراں دے
۳ ۔ سونے دی ونگ ماہیا قسم اے خدا دی میں تیری منگ ماہیا
۴ ۔ کوٹھے اُتے آ ماہیا نالے ساڈی گل سن جا نالے گھڑا وے چُکا ماہیا

دو اور گیتوں سے کچھ سطور ملاحظہ ہوں ۔ ان سے پنجابی گیتوں کا تاثر اور حقائق انسانی اور بشری تقاضوں سے واقفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے :

(الف) کون جاندا اے دلاں دے گجے روگ نوں
لگی والے کولوں پچھئے وجوگ نوں ۔ ۔ ۔
(ب) پہلے ڈنگ دا عشق پچھوں رنگ دا
نئیوں سنگدا بے موقع سولی ٹنگدا ۔ ۔ ۔

بارہ ماہے و اٹھوارے

پنجابی شعر و ادب کی اس طرزِ فکر سے شاعر اپنے محبوب کے ہجر و فراق میں سال کے بارہ مہینوں کی کیفیت مہینہ وار ، ہفتہ وار ، مہینہ یا دن کے نام سے بیان کرتا ہے ۔ کہ فلاں مہینہ یا دن کیسے گذرا ۔

پنجابی زبان کی اس طرزِ فکر میں تقریباً پنجابی زبان کے ہر شاعر نے طبع آزمائی کی ہے ۔ جدید شعراء کے مقابلہ میں شعرائے قدیم میں سے تقریباً ہر شاعر نے اس فنّی اندازِ بیان کے لیے بارہ ماہے اور اٹھوارے ضرور لکھے ہیں ۔ جس میں بلھے شاہ (ز ۔ ۱۷۶۷ء) شاہ مراد (م ۔ ۱۷۱۲ء) ، خواجہ فرد فقیر (پ ۔ ۱۷۰۴ء) اور میاں ہدایت اللہ (۱۸۳۸ء ۔ ۱۹۲۹ء) کے بارہ ماہے اور اٹھوارے مشہور و معروف ہیں ۔ ذیل میں بلھے شاہ کے بارہ ماہے کا نمونہ ملاحظہ کیجئے :

اسّوں

اسوں لکھوں سندیسوا واچے مورا پی
مگن گیا تم کاہے کو جو کلمل آیا جی
اسوں اساں تساڈی آس ساڈی جند تساڈے پاس
جگر مڈھ پریم دی لاس دکھاں ھڈ سکائے ماس

سولاں سائیاں

سولاں ساڑی رہی بے حال   مٹھی تدوں نہ گئیاں نال
الٹی ہریم لگر دی چال   بلھا شوہ دی کرساں بھال
پیارے ماریاں

سید بلھے شاہ کی یہ طرزِ فکر صوری لحاظ سےبالکل منفرد اور اپنے مخصوص انداز بیان کی مالک ہے ۔ اس کی یہ فنی خصوصیت ہمیں اس لیے تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس طرزِ تحریر کو ہمارے خیال میں اور کسی مفکر نے اختیار نہیں کیا ۔ دیگر پنجابی شعرائے جدید و قدیم نے اگرچہ اس اندازِ بیان کے لیے مختلف بحریں استعمال کی ہیں ، مگر انہوں نے بلھے شاہ کی طرح انہیں گیت کی صورت نہیں دی ، بلکہ صاف اور سادہ نظم کے رنگ و روپ میں بارہ ماہے لکھے ہیں ۔ مثال کے طور پر خواجہ فرد فقیر کا نمونۂ کلام دیکھئے :

ماہ چیت

سب صفت ثنا الاہے نوں   جھڑا بخشے کل گناہے نوں
بھی آکھ درود رسولؐ نوں   اس اللہ دے مقبول نوں
جس عاصی سب بخشانے نے   کہو برکت چارے یار دی

لیکن پنجابی شعر و ادب کے مشہور شاعر مسافر (ز۔ ۱۹۳۹ء) نے اس صنفِ سخن کو پنجابی ادب کی منفرد بحرِ طویل میں باندھا ہے ۔ وہ ماہ چت کے متعلق ذیل کا ایک شعر کہتے ہیں :

ماہ چیت

چیتر چیت سہالی رت رہنا شاخاں رنگ برنگیں پھلیاں نی
ونکھ پھل رویل تے چنبیاں نوں مست پھر دیاں بلبلاں بھلیاں نی
امروں وگی اے وا وچھوڑیاں دی کلیاں لٹ زمین تے ڈھلیاں نی
گھر آ مسافرا تدھ باہجھوں میرے گلے وچ مینڈھیاں کھلیاں نی

پنجابی شعر و ادب کے فن کاروں نے اس صنفِ سخن کو بالعموم اسی طویل بحر میں لکھا ہے ، جیسے کہ مسافر کے بارہ ماہے کا نمونہ آپ ملاحظہ کرچکے ہیں ۔ مگر مسافر کے ہمعصر میاں ہدایت اللہ لاہوری کے بارہ ماہے کا انداز اور ہے ۔ وہ پہلے ایک چو مصرعے میں چیت سے پھاگن تک کا ذکر بحر طویل میں کرتے ہیں ۔ مجموعی تاثر دینے کے بعد وہ ایک ایک مہینے کو لیتے ہوئے ، چیت سے شروع کرتے ہیں ۔ ہر مہینے کی کیفیت علیحدہ علیحدہ بیان کرتے ہیں ۔ لیکن اب ان تمام کے لیے مثنوی کی مجموعی طرزِ تحریر کا

نمونہ ، مجموعی تاثر والا بحر طویل میں جو مصرعہ یہ ہے :

ماہ چیت تے پھاگن تک

چیتر چاہ وساکھ لوں وصل لوڑاں چڑھیا جیٹھ جالی میرا یار گیا
ہاڑے ہاڑ گھتاں ساون سواں نائیں بھادوں بھا لگا ٹیکے یار گیا
اسوج وگن آنسو کتیں کون کٹے مگھر ملک رہیاں سوہنا یار گیا ! !
پوہ پواں کیکر ماگھ ماہی باہجھوں پھگن ہدایت لوں ساڑ گیا

بارہ ماہوں کا نمونہ دینے کے بعد ہم شاہ مراد (م-۲۰۷۱ء) کے اٹھوارے کا نمونہ دیتے ہیں ۔ شاہ مراد نے اپنے اٹھوارے میں ایک نئی خصوصیت پیدا کی ہے ۔ وہ یہ کہ پنجابی زبان میں ہجر و فراق کی کیفیت بیان کر کے ہر دن کے ذکر کے ساتھ ایک فارسی قطعہ بھی دے دیتے ہیں جس میں اسی کیفیت کا بیان ہوتا ہے ۔ وہ اس بات کا بھی التزام کرتے ہیں کہ پنجابی زبان میں فارسی یا عربی کے الفاظ داخل نہ ہونے پائیں ۔ ٹھیٹھ پنجابی کے ساتھ خالص فارسی ہمیں سترھویں صدی عیسوی کے ماحول میں پہنچا دیتی ہے ۔ جب اورنگ زیب عالم گیر حکمران تھے اور مسلسل فارسی کے ساتھ علاقائی زبانوں سے بھی دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی شعر کہتے تھے ۔ یاد رہے شاہ مراد اردو (ریختی) کے بھی شاعر تھے ۔ اب ان کے سینچروار کے متعلق پنجابی اور فارسی کے بند پڑھیے :

چھن چھن وار فراق نے مار ڈالا جانی جانے نائیں کیہا حال بنیا
مکھ پیلا میرا جسّہ نیلا ہویا ، خون اکھیں روون ، رنگ لال بنیا
دانہ پانی بن یار دے نہیں کاری ماری مار وچھوڑا دجّال بنیا
آپ کہا کٹاری میں ماری وفجاں میرا لال نائیں میرا کال بنیا

ہیہات کجا آں ذات نکو آیات چو خور مہ خوبرو
دلدار شکر گفتار کمر مودار بھر مو نافہ بو
چو حور سراسر نور بحق منظور نگارم نکتہ گو
در ریز چہ شور انگیز چو رستاخیز فغانش سو بہ سو

پنجابی کے اٹھوارے لکھنے والے دیگر شعراء صرف پنجابی زبان ہی استعمال کرتے ہیں ۔ ساتھ ساتھ فارسی میں یہ شغف صرف سترھویں صدی عیسوی کی خصوصیت ہے ۔

ڈیوڑھے اور دوہڑے

ڈیوڑہ چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ لیکن ہر مصرعہ کے بعد دو رکن بڑھادیے جاتے ہیں ۔ فارسی میں اسے مستزاد کہتے ہیں ۔ ڈیوڑھوں میں عشقیہ قصے اور جذبات و حقائقِ زندگی بیان کیے جاتے ہیں ۔ ہاشم شاہ (۱۷۵۲ء - ۱۸۲۱ء) اور فضل شاہ (۱۸۲۷ء - ۱۸۹۰ء) کی ڈیوڑہیں مشہور ہیں ۔ نمونہ ملاحظہ ہو :

(۱)

کامل شوق ماہی دا مینوں نت رہے جگر وچ وسدا — لوں لوں رسدا
رانجھن بے پرواہی کر دا اتے کوئی گناہ نہ دسدا — اٹھ اٹھ نسدا
جیوں جیوں حال ساواں رو رو ویکھ نتی ول ہسدا — ذرا نہ کھسدا
ہاشم کم نہیں ہر کس دا اتے عاشق ہوں درس دا — برہوں رسدا
(سید ہاشم شاہ)

(۲)

الف الھڑ میل ماہی نوں ہجر ماہی دے تلیاں — پھاٹاں تلیاں
اک ماہی نوں لے گل لاون اک اٹھ ڈھونڈن گلیاں — اس غم گلیاں
میں نہ بھلیاں ماہی پچھے لکھ ہزار بُھلیاں — بھلیاں بھلیاں
اک نڑفن فضل پیارے باجھوں جیوں بن پانی ملیاں — درداں ملیاں
(سید فضل شاہ)

دوھڑوں کے دو یا چار مصرعے ہوتے ہیں ۔ ان میں عشق و محبت کی باتیں اور زندگی کے بڑے بڑے راز بیان کیے جاتے ہیں ۔ ہاشم شاہ (۱۷۵۲ء - ۱۸۲۱ء) اور مولوی جان محمد (۱۸۲۰ء - ۱۸۹۵ء) کے دوھڑے مشہور ہیں ۔ ثانی الذکر کا ہم ایک دوہڑا بطور نمونہ دیتے ہیں :

الف آ میاں ڈھولا کہیاں مدناں نیں لایاں
خونی عشق نساڈے جگ دھاں نیں پایاں
دیکھ برہوں تیرے نال ساڈے نیں چائیاں
ڈھولا میریاں کیتیاں پیش میرے نیں آئیاں

مولود نامہ

اس نظم میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت با سعادت ، حضور کے

اخلاقِ حسنہ اور متعلقہ اسلامی مسائل کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اور مصنف ایسے اوراد و وظائف میں شامل رکھنا باعثِ برکت و بخشش بیان کرتا ہے۔ نور نامہ جس طرح شروع ہوتا ہے ملاحظہ کیجئے :

صفت تیری لولاکی آئی ہر فائق تھیں فائق
میں پامال زمین خلقیدی نہ نبیاندی لائق

چونہوں طبقاں تھیں عبد نہ خالی کو باری کو آبی
کو تاثیر آتش دی رکھے کوئی خاک ترابی

خاکی تھیں درویش او پائے واؤ تھیں متکبر
آتش تھیں بخیل او پائے آبوں مرد زورا ور

کہیا فیر خداوند عالم ساریاں نوں میں پالاں
بداں نیکاں نوں دنیا اندر روزی دے سنبھالاں

بخیل ہووے کوئی متکبر یا زورا ور بندہ
غنی فقیر سوالی ہووے سبناں رزق دہندہ

نور نبیؐ دا ظاہر کیتا اپنے ہی خود نوروں
دوست کیتا میں نال محبت دے کے شرف حضوروں

حضور صلعم کے اوصاف اور شمائل اسی طرح پر تاثیر زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔ زبان سلیس ہے اور اندازِ بیان سادہ۔ جذبات میں گہرائی ہے۔ لے بھی بڑی پسندیدہ ہے۔ بالخصوص عورتوں میں 'نور نامہ' بڑا مقبول ہے۔ وہ اسے از بر کر لیتی ہیں اور سحری کے وقت پڑھا کرتی ہیں۔ بچوں کو گود میں لے کر پڑھتی ہیں تو عجیب محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

بول (شلوک)

بزرگوں اور صوفیائے کرام کے اندازِ سخن کو بول یا شلوک کہتے ہیں ، اس میں صوفیانہ خیالات کا بیان اور ان کی قلبی یا روحانی واردات کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ صنفِ سخن صرف دو مصرعوں کے ایک شعر سے مرتب ہوتی ہے۔ قدیم و جدید شعراء نے اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ جدید شعراء نے اس صنفِ سخن کو صوفیانہ خیالات کے اظہار کے علاوہ اخلاق اور معاشرتی اصلاح کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ قدیم شعراء میں حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۷۳ء - ۱۲۶۶ء) ، حضرت شیخ ابراہیم فرید ثانیؒ (۱۴۵۰ء - ۱۵۷۵ء) کے بول مشہور ہیں۔ شعرائے جدید میں سید ممتاز علی شاہ مفطر

بخاری (۱۹۱۶ء-۱۹۵۹ء) کے بول مقبولِ عوام و خواص ہیں - ذیل میں بابا فرید کا نمونہ کلام ملا خطہ فرمائیں :

بول فریدی

فریدا کالے مینہڈے کپڑے کالا مینڈا ویس
گناہیں بھریا میں پھراں لوک کہن درویش

(۲)

فریدا راتیں وھڈیاں دھخ دھخ اٹھن پاس
دھرگ تنہاں دا جیوناں جنہاں وڑانی آس

(۳)

فریدا رکھی سکی کھا کے ٹھنڈا پانی پی
ونکھ پرائی چوپڑی نہ ترساویں جی

شیخ ابراہیم فرید ثانی ، بابا فرید کے بارھویں (۱۲) سجادہ نشین تھے - چنانچہ ان کی اسی نسبت سے شیخ مذکور نے جہاں سلسلہ سلوک میں زیادہ سے زیادہ حضرت کی عملی تقلید کی وہاں فکرِ اظہار کے واسطے سے کچھ بول بھی کہے - بابا فرید کے کچھ بول جو گرو گرنتھ میں شامل ہیں ، پہلے شیخ ابراہیم سے ہی منسوب کیے جاتے رہے - مگر اب یہ تاریخی مغالطہ دور ہوچکا ہے - اور یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ گرو گرنتھ میں شامل کیے گئے وہ بول بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے ہیں - ذیل میں شیخ کے اس قسم کے بول ملاحظہ کریں :

(۱)

بڈھا ہویا شیخ فرید کنبن لگی دیہہ
جے سو ورھیاں جیوناں بھی تن ہوسی کھیہہ

(۲)

شیخ حیاتی جگ نہ کوئی تھر رہیا
جس آسن ہم بیٹھے کیتے بیس گیا

اب شعرائے جدید میں سے سید ممتاز علی شاہ مضطر کا نمونہ کلام ملاحظہ کریں - مضطر نے یہ بول متفرق بحروں میں کہے ہیں :

(۱)

وار گھسایاں وار نہ چھٹے چلنا وارو وار
اک چلے اک چل گئے اک بیٹھے چلن ہار

(۲)

چنگا کرے چنگیائی ہر تھاں دیوا دیوے لو
صندل اگ وچ سٹیے تاںوی دے خشبو

(۳)

اکناں دے کتے بسکٹ کھاون اکناں دے بھکھے ایانے
شاہ ممتاز اس کانی ولڈ دا مجرم کس نوں جانے

چرخہ نامہ

چرخہ دیہات میں عام کاتا جاتا ہے ۔ سگھڑ عورتیں بڑے شوق سے اسے کاتتی ہیں اور کاتے ہوئے سوت سے مختلف قسموں کے کپڑے تیار کراتی ہیں ۔ پنجابی زبان کے شاعر نے اس معمول کو سامنے رکھ کر عجیب و غریب نکات پیدا کیے ہیں ۔ بد اعمالی سے اجتناب ، اعمالِ صالحہ کا التزام ، توشہ آخرت پر نگاہ ، ان باتوں کے متعلق بڑے موثر پیرائے میں درس دیا ہے ۔ چرخہ وجودِ انسانی کے لیے علامت کا کام بھی دیتا ہے ۔ شاعر کہتا ہے اپنے وجود کا صحیح استعمال آخرت کے لیے بڑا نتیجہ خیز ثابت ہوگا ۔ اسی طرح مختلف قسم کے بنے ہوئے کپڑوں کے نام شاعر کے کلام میں خاص خاص اصطلاحات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ۔ مثلاً وہ چولسے کھدر سے عناصر اربعہ مراد لیتا ہے ، پنیسی یعنی پانچ تار سے حواس خمسہ ، چھسی سے چھ جہت اور ستسی سے سات ستارے ۔ اس طرح ایک سادہ سی رواں نظم بڑے گہرے مطالب کی حامل بن جاتی ہے ۔ پنجابی ادب کی یہ منفرد صنفِ سخن ہے ۔ ذیل میں مولوی عبدالستار (۱۸۲۳ء - ۱۹۱۳ء) کے چرخہ نامہ کے چند بند درج کیے جاتے ہیں :

سب صفتاں سرجنہارے نوں جس کیتا عالم سارے نوں
جس بھیجیا نبی پیارے نوں کہہ کلمہ رحمت پاویں گی
کت چرخہ شام مناویں گی
اس کھیڈن توں پچھتاویں گی

تیرا چرخہ لٹک مرینداں نی کیا سوہنا سوت کتینداں نی
وچ کون آواز کریندا نی اس رمز کنوں شوہ پاویں گی
کت چرخہ شام مناویں گی
اس کھیڈن توں پچھتاویں گی

تک تند تکلے ول پاندی نوں	کیہ ہو گیا پیندی کھالدی نوں
ہے زوف چڑکھڑا ڈاہندی نوں	جب سوہنی تند نہ پاویں گی
کت چرخہ شام مناویں گی
اس کھیڈن نوں پچھتاویں گی

اشتر نامہ

اس صنفِ سخن میں شاعر اپنے آپ کو اونٹ کی طرح بردبار تصور کر کے عشق کی تکالیف برداشت کرنے کا ذکر کرتا ہے۔ پنجابی ادب میں اشتر ناموں کی تعداد خاصی ہے۔ ذیل میں شاہ شرف بٹالوی (۱۶۵۹ء – ۱۷۲۵ء) کے اشتر نامہ کا نمونہ ملاحظہ کیجیے :

جے کر شتر قبول نہ کر دا ستّے روز ازل
واقف رمز نہ ہندا مڑ کے عشق حمیل نہ پاندا گل
شوق نکیل الف وچ پینی سیس سجود جھکاندا دل
عشق مراد مہار ہجر دی پکڑی لئی جاوے جت ول
سالک تیر چلاوں محکم نال ارادت چین مزل
دیوے قدم نہ مڑے پچھاہاں مستی تھیں نہیں کرے عمل
بھارے بھار سنگار کراوے پیڑ پلان دہرے محمل
شغل پہاڑ سفر دے سرتے ریک اجاڑیں ریت جبل

تیسرا باب

(ابتدا سے ۱۷۰۷ء تک)

علمی ، ادبی اور تحقیقی لحاظ سے ہر زبان کے ادب کی دو قسمیں ہوتی ہیں جنہیں ہم ادبی اصطلاح میں دائمی ادب اور عارضی ادب کہہ سکتے ہیں ۔ دائمی ادب وہ ادب ہے جو زمانی اور مکانی قیود سے آزاد ہو اور ہر دور میں لوگوں کے لیے اپیل رکھتا ہو ۔ ظاہر ہے یہ ادب بشریت کے تمام امکانات اور ذہن و قلبِ انسانی کی تمام وسعتوں کی ترجمانی کرتا ہے ۔ عارضی ادب وہ ادب ہے جس کی اہمیت وقت اور جگہ کی مناسبت سے ہوتی ہے ۔ مثلاً وہ ادب پارے یا نظمیں جو کہ ملکی حالات کی ابتری یا عدمِ مساوات کے خلاف لکھی گئیں ، ان کی اس وقت کوئی حقیقت باقی نہیں رہے گی جب ملک میں مساوات کا دور دورہ ہوگا ۔ اگرچہ ایسے ادب نے اپنا مقصد پورا کردیا ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے ۔ مقصدی ادب میں یہی کمزوری ہے کہ وہ وقت کے تقاضے تو پورے کر دیتا ہے مگر روح و نفسِ انسانی کے ممکنات کی عکاسی پوری طرح نہیں کرتا ۔

ادبیاتِ عالم کے انہی اصول و قواعد کے مطابق پنجابی ادب بھی علمی اور ادبی اقدار کا متحمل اور نقیب ہے ۔ ۱۵۲۶ء سے پہلے کے پنجابی ادب کا بیشتر حصہ تلف ہو گیا ہوا ہے ۔ جو بچ گیا اس میں دائمی عناصر غالب ہیں اسی لیے وہ لوگوں کے حافظے میں محفوظ رہ گیا ۔ اب اس حافظہ میں موجود رہ جانے والے حصہ میں سر ، ٹپہ ، سد ، ماہیا ، ڈھولا ، جندوا ، لوری ، سٹھیاں ، کاسن ، تھال وغیرہ اور تاریخی ادب میں بول بھلی ، شلوک اور مذہبیات و تصوف کی دیگر اصنافِ سخن مثلاً 'منظوم داستانیں' ، 'وارنامے' 'نوزنامے' اور 'جنگ نامے' وغیرہ شامل ہیں جو اپنے اندازِ فکر کے لحاظ سے کئی ایک مخصوص عنوانات سے منسوب ہیں ۔ ذیل میں یاد رہ جانے والے ادب کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں ، جو پنجابی عوام کے زبان زد ہیں ۔ مندرجہ ذیل گیت میں ماں اپنے بچے کو لوری دیتی ہے ۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ٹپے اور لوریاں کب لکھی گئیں مگر غالباً اس اس کو تسلیم کرنا مشکل نہیں کہ عوامی ادب کے یہ نمونے بہت پرانے ہوں گے ۔

لوری

اللہ بھاوے ، سکھ ویہاوے ،
بالک کھیڈ ملھ کے آوے ،
سکھ دا ہوکا ملیا
مال میرے بالک دا چھڑیا ، چھڑکے باگیں وڑیا
باگیں ٹھنڈیاں چھاواں ، بال میرے دیاں دور بلاواں

نوخیز لڑکیاں ، گیند اچھالتی اور جھرمٹ میں بیٹھی گیت گاتی ہیں ، جسے وہ فن کے لحاظ سے تھال کے عنوان سے منسوب کرتی ہیں -

تھال

کوٹھے اتے گنّاں ، ویر میرا لمّا
بھابھو میری پتلی ، جدھے نک مچھلی
مچھلی تے میں نہوں چلے ، لنڈے پپل بیٹھ
لنڈا پپل ڈھے پیا ، مچھلی آگئی بیٹھ
مچھلی دے دو مامیں آئے ، میرا آیا جیٹھ
جیٹھ دی میں روٹی پکی نال پکائیاں توریاں
اللہ میتوں بھاگ لایا ، ویراں دیاں جوڑیاں
بھراواں دیاں جوڑیاں ، کنہٹ لیاوں بوریاں
بوری بوری گھیو ، جیوے راجہ پیو
پیو پیریں جتی ، جیوے لوہی کتی
کتی دے کتورے میرے سبھے تھال پورے

ساس بہو کا طبعی اختلاف سابقہ پنجاب کی زندگی کا ایک مستقل مشغلہ رہا ہے - چنانچہ ایک نو بیاہتا دلہن کا ایک گیت اس کے دلی جذبات کی کیا ترجمانی کرتا ہے - بہو کا گیت ملاحظہ ہو :

تڑکڑی تے ادھ سیرا ، نکل سسٹرئیے گھر میرا ،
اگے کھاہدا ای بتھیرا ، ہن ویلا آیا میرا

ذیل میں کھارے اور گھوڑی کے گیت دیکھیے ، جو اپنے اپنے مقام پر رسوم ہی کی حیثیت سے نہیں ، بلکہ قاعدے اور ضابطے کی صورت میں معیّن ہو چکے ہیں - نوشاہ

کو جب غسل کے لیے کھارے پر چڑھاتے ہیں اور پھر سہرا بندی کے بعد گھوڑی پر سوار کیا جاتا ہے ۔ تو مندرجہ ذیل گیت گائے جاتے ہیں :

جے توں چڑھیوں کھارے وے ، تیری ماں روپیے وارے وے

وغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔

کھارے پر سے غسل کے بعد لیچے اتارنا دولہا کے ماموں کا فریضہ ہوتا ہے جس کے متعلق ذیل کے گیت گائے جاتے ہیں ۔ ماموں کو اس وقت کچھ زر و مال یا کچھ تحائف دینے پڑتے ہیں :

۱ ۔ بول ماماں بول وے توں بولینداڑا کیوں نہئیوں وے
کول تیرے مجھیں گائیں دینداڑا کیوں نہئیوں وے

۲ ۔ بول ماماں وے توں بولینداڑا کیوں نہئیوں وے
کول تیرے روک روکانواں دینڈرا کیوں نہئیوں وے

سہرا بندی پر سہرے سے متعلق گیت گائے جاتے ہیں اور پھر گھوڑی پر سواری کے بعد رنگ رنگ کے راگ الاپے جاتے ہیں ، جنہیں 'بول' اور 'سٹھنی' کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں ۔ 'سٹھنیوں' میں جب برات دلہن کے گھر پہنچتی ہے ، تو دلہن کی سہیلیاں طنز و مزاح کے انداز میں دولہا اور براتیوں سے خطاب کرتی ہیں ۔

سٹھنی

ساڈے تے ویہڑے مڈھ مکئی دا ، دانے تے منگدا ، اجڑ گئی دا
بھٹھی تے تہدی نہیں وے لجئیو لج تہانوں نہیں ۔

اس ادب کے فنی انداز میں نوبت اگر گالی گلوچ تک پہنچ جائے تو اسے کامن کہا جاتا ہے جس میں بے شمار گیتوں کا ذخیرہ دستیاب ہے ۔

پنجابی ادب میں قدیم گیتوں کا ادبی سرمایہ ماہیا ، ڈھولا تو اس کی تحریکِ حیات کے قدم قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے ۔ اس میں تمام گیت اپنے اپنے عنوان کی مناسبت سے منفرد بھی ہوتے ہیں ، مگر بعض عنوانات میں ان کی اجتماعی ہیئت ترکیبی بھی دیکھنے میں آتی ہے ۔ جیسے ذیل کے گیت راوی سے عیاں ہے ۔

گیت راوی

(۱)

وگدی اے راوی ماہیا وچ بوٹا پھلاہی دا ، ڈھولا
میں نہ جمدی ماہیا وے توں کتھوں ویاہی دا ، ڈھولا

(۲)

وگدی اے روای ماہیا وچ سٹاں پتاسے ، ڈھولا
آپ ٹر چلئیں ماہیا سانوں دیں دلاسے ، ڈھولا

اس زندگی آمیز ادب کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پنجابی زندگی کے آغاز سے انجام تک کی ایک واردات بھی ایسی نہیں جو انکے اپنے مقامی تعلق سے مخصوص اور معیّن نہ ہو۔

پنجابی شاعری میں معاشرے کی عکاسی متذکرہ بالا اشعار سے بخوبی ہوتی ہے۔ اس میں اس معاشرے کی رسومات ، رہن سہن اور اقدار کا پتہ چلتا ہے ۔ مثلاً 'لوری' جس میں ماں اپنے بچے کو لوری دیتی ہے ، اس کو سکھ چین کی زندگی بسر کرنے کی دعائیں دیتی ہے ، اس سے ماں کی مامتا کا اظہار ہوتا ہے ۔ 'تھال' گیت کی ایک قسم ہے ۔ جس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ پنجاب کے مرد لمبے اور عورتیں پتلی دبلی ہوتی ہیں ۔ شادی شدہ عورتیں ناک میں ایک زیور پہنتی ہیں جسے مچھلی کہتے ہیں ۔ جیٹھ ، کی خاطر تواضع روٹی اور توریوں سے کرنا ، بھائیوں پر ناز کرنا ، ساس بہو کی جھڑپیں شادی بیاہ کی رسمیں یعنی سہرا بندھنا ، گھوڑی پر دولہا کا چڑھنا ، ماں کا پیسے نچھاور کرنا اور شوہر کے پردیس جانے پر الوداعی گیت وغیرہ ، یہ سب اشعار پنجاب کی دیہاتی زندگی اور معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں ۔

پنجابی ادب کا یہ حصہ محمود غزنوی کے عہدِ حکومت سے شروع ہوتا ہے ۔ اس ادب کا وہ حصہ ایک حد تک اپنی تاریخی نشاندہی بھی کرتا ہے ۔ اس کے بعض گوشے نہ صرف مقبول عام ہیں ، بلکہ اپنی فصیح و بلیغ ادبی حیثیت سے جذب و کرب کا لا زوال مرقع بھی نظر آتے ہیں ۔

خواجہ سعد سلمان

امور سلطنت کے انتظامی توسط سے خواجہ سعد سلمان بعہد سلطان مسعود شہید ، شہزادہ مجدد کے خزانچی کی حیثیت سے اس شہر میں وارد ہوئے ۔ اردو ، فارسی اور پنجابی[۱] کے عہد آفرین شاعر خواجہ مسعود سعد سلمان انہی کے فرزند دلبند تھے ۔

خواجہ مسعود سعد سلمان

یہ لاہور[۲] ہی میں پیدا ہوئے ۔ اور یہیں نشو و نما اور تعلیم و تربیت پائی ۔ یہی وجہ

---

(۱) پنجابی اس عہد میں ہندی کہلاتی تھی ۔
(۲) حافظ محمود شیرانی ، پنجاب میں اردو ، ص ۶۶ ۔

ہے کہ وہ لاہور کو اپنے حبسیات میں مادرِ وطن کے نام سے یاد کرتے ہیں :

اے لاہور دیمک بے من چگونہ ای | بے آفتابِ تاباں روشن چگونہ ای
تاابی عزیز فرزند از تو جدا شدہ است | بادرد اوبہ بنوحہ و شیون چگونہ‌ای

جس سے رہائی کی ناامیدی پر پھر کہتے ہیں :

کار اطلاق من چوں بستہ بماند | کہ ہمیں ایزدش نبکشاید
مرمرا حاجتیے ہمی باشد | وز دلم خارشیے ہمیں زاید
مخلیے باید از خداوندم | کہ ازو بوئے لوہور آید
کہ ہمی از آرزوئے لوھاور | جان و دل در تنم ہمی نائید

مسعود سعد کے متعلق تمام متقدمین و متاخرین متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ وہ ہندی یا ہندوی میں بھی صاحبِ دیوان تھے ۔ اس عہد میں ہندوی زبان سے پنجابی زبان مراد لی جاتی تھی اور اس کے بعد بھی پنجابی زبان کے مفکرین نے عہد بعہد پنجابی کے لیے ہندی یا ہندوی ہی کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ چنانچہ پنجابی زبان کا عظیم شاعر حافظ برخوردار اپنی تصنیف 'فرائض ہندی' میں اور شاہجہان کے عہد کا نامور شاعر مولانا عبداللہ عبدی پنجابی کا ذکر ہندی ہی کے نام سے کرتے ہیں ۔

ان حقائق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسعود سعد کے بعد بھی سالہا سال تک پنجابی کو ہندی کہا گیا ۔ جس کی وجہ ارضِ ہند کی مقامی مناسبت ہی ہو سکتی ہے ۔ محمد عوفی اور امیر خسرو بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ مسعود سعد سلمان پنجابی (ہندی یا ہندوی) کے بھی صاحبِ دیوان تھے ، اگرچہ یہ دیوان محفوظ نہ رہ سکا ۔

شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر (۱۱۷۳ء - ۱۲۶۵ء)

آپ کے والد کا نام حضرت جمال الدین تھا ۔ شیخ جمال الدین حسب نسب کے لحاظ سے فاروقی تھے ۔ آپ شہاب الدین غوری کے زمانے میں کابل سے لاہور آ کر قصور شہر میں بس گئے ۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد سلطانِ وقت کے حکم سے ملتان چلے گئے ۔ آپ تین بھائی تھے ۔ بڑے عزیزالدین محمود اور چھوٹے نجیب‌الدین متوکل تھے ۔ ۵ اپریل ۱۱۷۳ء (۵۶۹ھ) کو شیخ فریدالدین کی پیدائش[۱] ملتان ہی میں ہوئی اور وہیں آپ نے تعلیم حاصل کی ۔ پھر آپ نے مولانا منہاج‌الدین ترمذی کی درس گاہ سے کسبِ فیض کیا ۔ آپ فقیرانہ زندگی کی طرف مائل تھے ۔ درس و تدریس کی تکمیل کے بعد روحانی فیوض و برکات کے حصول کے لیے دہلی پہنچنے اور اٹھارہ

---

۱ ۔ آپ کا سالِ پیدائش ۱۱۸۴ء/۵۸۰ھ بھی بتایا گیا ہے

برس کی عمر میں پہلی بار چشتی سلسلہ کے عظیم شیخ خواجہ قطب‌الدین بختیار کاکی کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ پھر آپ نے ملتان ، قندھار اور بغداد شریف کا سفر کر کے شیخ شہاب‌الدین سہروردی ، حضرت بہاءالدین زکریا ملتانی ، شیخ فریدالدین عطار نیشا پوری وغیرہ بزرگان کی صحبت میں رہ کر قلب و نفس کی پاکیزگی و صفائی حاصل کی ۔ پھر عراق ، خراسان اور مکہ شریف کی زیارت کر کے واپس دلی آئے ۔ خواجہ صاحب کے قریب ہی غزنی دروازے کے ایک حجرے میں رہنے لگے ۔ ہمہ وقت تلاوتِ کلام پاک میں منہمک رہتے اور کئی کئی دن روزہ رکھتے ۔ آپ دہلی کے عوام و خواص میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے ۔ ہندو مسلم عوام کے علاوہ تاجدارِ دہلی سلطان التتمش ہفتہ میں دو دفعہ خواجہ صاحب کی خانقاہ پر حاضر ہوتا ۔ آپ اپنی علمی اور صوفیانہ عظمت و وجاہت کی بدولت عجز و انکسار اور شفقت و محبت سے عوام و خواص کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہے ، جو ان کے علم و فضل کا اصل جوہر تھا ۔

آپ نے صوفی اور عالم ہونے کے علاوہ اس وقت کی مقامی زبان میں ، جسے اب پرانی پنجابی کے مترادف قرار دینا بعید از قیاس نہیں اور فارسی میں بھی اشعار کہے تھے ۔ آپ کی تصنیفات درجِ ذیل ہیں :

(۱) شلوک فرید (پنجابی) مؤلفہ منشی جیشی رام مشتاق ۔ (۲) 'راحت‌القلوب' مؤلفہ حضرت نظام الدین دہلوی (۳) 'اسرار الاولیاء' مؤلفہ حضرت بدر الدین ۔ (۴) فوائد السالکین' (۵) 'شلوک بابا فرید' خالصہ ٹریکٹ سوسائٹی امرتسر ۔ آپ کی تاریخ پیدائش اور وفات کے بارے میں بہت سے تاریخ دانوں اور محققین کی آراء میں اختلاف ہے ۔ اندازاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ ۱۱۷۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۵ء میں وفات پائی(۱) ۔

عوام میں مشہور ہے کہ آپ کے بیشتر اشعار دوہوں کی صنفِ سخن میں ہوتے تھے ۔ میر خورد نے بابا فرید کے نثری اقوال بزبان پنجابی کے علاوہ آپ کے منظوم کلام کے متعلق بھی دوہے کی ایک مثال دے کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کا کلام پنجابی زبان کی اس صنفِ سخن یعنی دوہے میں ملتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ کلام میں ٹھیٹھ ملتانی اور لاہوری زبان کے نمونے پائے جاتے ہیں ۔

ذیل میں حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کے جھولنے سے دو شعر ملاحظہ کیجئے جو کہ پنجابی زبان کا صاف اور واضح نقش پیش کرتے ہیں ۔ یہ چار صفحے کا

(۱) آپ کی وفات ۱۲ اکتوبر ۱۲۶۵ء مطابق ۵ محرم الحرام ۶۶۴ھ بتائی گئی ہے

ر رسالہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کو کہیں سے دستیاب ہوا تھا۔
ۂ ذکر جلی)[1]

جلی یار کی کرنا ہر گھڑی یک تل حضور سوں ٹلنا نہیں
اٹھ بیٹھ یار سوں شاد رہنا گواہ دار کو چھوڑ کے چلنا نہیں
پاک رکھ نوں دل کو غیر ستی اج سائیں فرید کا آونا ہے
قدم قدیمی کے آونے سیں لازوال دولت کو پاونا ہے

بعض تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ بابا فرید شکر گنج کے وہ تمام دوہے جو گورو گرنتھ
ب میں موجود ہیں ان کے بارھویں سجادہ نشین شیخ ابراہیم (فرید ثانی) کے ہیں۔
بعض محققین کی رائے ہے کہ مندرجہ ذیل اشعار اور دوہے صدیوں پہلے کی تصنیف
۔ یہ دو منظوم اقوال اور ایک دوہا کتاب 'خزانۂ رحمت'[2] میں مندرج ہیں :

(۱) راول دیول ہمیں نہ جایے پھاٹا پہنہ روکھا کھایے
بم درویشنہ آھے ریت پانی لوریں اور مسیت

(۲) جس کا سائیں جاگتا سو کیوں سوئے داس۔

(۳) دوھا

آو دلدہو سالہتر دا لویں بجھ کریں
مول سنبھالیں آپنا باچھیں لاھا لیں

دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ بابا فرید شکر گنج کی ذات امن و سکون میں ایسی
رم تھی، جنہیں ہندو مسلمان اور دیگر مذاہب کے لوگ نہایت عزت و تکریم کی نگاہ سے
کھتے اور ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ آپ کے بعد آپ کے خلفاء میں ایسا کوئی بزرگ
، ہوا۔ جو اوصاف میں آپ کا ہم پایہ ہو۔ اس لیے یہ تو ہو سکتا ہے کہ گورونانک
کی عظیم شخصیت سے متاثر ہو کر اس امر کے خواہش مند ہوئے ہوں کہ ان کا کلام
رو گرنتھ میں محفوظ کر لیا جائے۔ تا کہ مسلم عوام کی طرح ان کے خدام اور عقیدت
۔ بھی اس سے روحانی فائدہ حاصل کر سکیں۔ اس لئے شیخ ابراہیم فرید ثانی کے متعلق یہ
ال ظاہر کرنا کہ گورو گرنتھ میں ان کا کلام درج ہے غالباً ناموں کی مماثلت کی
ہ سے ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

---

۱) ڈاکٹر مولوی عبدالحق : اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام
۲) شیخ باجن : خزانۂ رحمت ۔ آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کے بزرگ ہیں ۔

حضرت بابا فرید سے منسوب شدہ کچھ بول یا دوہے جن سے ان کی غرض یعنی تبلیغِ حق و صداقت نمایاں ہوتی ہے ، ملاحظہ کیجئے :

(۱) ویکھو فریدا جوتھیا داڑھی ہوئی بُھور
آگا نیڑے آیا پیچھا رہیا دُور

(۲) فریدا جے توں عقل لطیف ہیں کالے لکھ نہ لیکھ
آپنڑے گریوان میں سر نیواں کر کے ویکھ

(۳) فریدا راتیں وڈیاں دھکھ دھکھ اٹھن پاس
دھر گ تنہاں دا جیوناں جنہاں وڈانی آس

(۴) فریدا لوڑے راکھ لجوریاں ککر بیجے جٹ
ہنڈے ان کتائیدا پیدھا لوڑے پٹ

خواجہ امیر خسرو (۱۲۵۳ء–۱۳۲۵ء)

آپ کا پورا نام ابوالحسن یمین الدین اور تخلص خسرو تھا ـ ۱۲۵۳ء میں امیر سیف الدین محمود کے ہاں پٹیالی (جو ضلع ایٹہ کمشنری آگرہ میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے) میں پیدا ہوئے ـ ابھی دس ہی سال کی عمر تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا ـ نانا کے ہاں پرورش پائی ـ آپ کی والدہ ایک نو مسلم رئیس کی بیٹی تھیں ـ شاعری کا جذبۂ عطیۂ الٰہی تھا ـ بچپن ہی سے شعر کہتے ـ پندرہ برس کی عمر میں سب درسی علوم و فنون حاصل کیے ـ کم سنی ہی میں آپ کے فنکارانہ رجحانات کا چرچا علم و ادب کی دنیا میں ہونے لگا ـ علمی فراست اور وسیع مطالعہ کے علاوہ آپ عربی ، فارسی ، ہندی ، سنسکرت ، گجراتی اور کئی زبانوں سے بخوبی واقف تھے ـ گمان غالب ہے کہ ملتان کے پنج سالہ قیام میں مقامی بولی میں بھی جو اس وقت بھی ملتانی کہلاتی تھی دستگاہ حاصل کرلی ہو گی ـ یہ بات اس لیے بھی صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ تمام بزرگانِ دین جنہوں نے اس برِ صغیر میں اسلام کی اشاعت کی ، پہلے مقامی بولی سیکھتے تھے ، اور پھر اس میں وعظ فرماتے ـ مقامی طور پر تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا کام مقامی زبانوں ہی سے لیتے تھے ـ ہندوی خسرو کی مادری زبان تھی جس کے علاوہ سنسکرت ، فارسی ، عربی ، ترکی اور ہندوستان کی کئی صوبائی زبانیں جانتے تھے ـ خوش الحانی ان کی شاعری کا زیور تھی ـ اپنی عمر کے سولھویں سال ہی میں دربارِ بلبن کے ایک ممتاز رکن ملک چھجو کے پاس جا کر ملازم ہوئے اور اس کی تعریف میں کئی ایک قصیدے لکھے ـ ۱۲۸۰ء میں بلبن کے دوسرے بیٹے خان شہید کے ملازموں میں شامل ہو کر ملتان پہنچے جو کہ دہلی کے بعد

علم و ادب کا بڑا مرکز تھا - ۱۲۸۵ء میں شہزادہ مغلوں کے ہاتھوں شہید ہوا اور آپ نے بلبن کے دربار میں پہنچ کر خان شہید کا پر درد مرثیہ پڑھا - بلبن کے بعد کیقباد تخت نشین ہوا جس نے امیر خسرو سے کہہ کر بغرا خان (اس کے والد) کی ملاقات کا حال نظم میں بیان کرایا ، چنانچہ ۱۲۸۹ء میں 'قران السعدین' تصنیف ہوئی - پھر سلطان جلال الدین خلجی نے جو کہ خود شاعر اور سخن فہم تھا ، امارت کا عہدہ اور ملبوسِ خاص عطا کر کے اپنی تاجپوشی کے حالات کو 'مفتاح الفتوح' میں نظم کرایا - ۱۲۹۵ء یعنی جلال الدین خلجی کی وفات کے بعد خسرو نے اس کی فتوحات کو بھی نثر کی ایک کتاب 'خزائن الفتوح' میں بالتفصیل بیان کیا ہے اور 'خمسۂ نظامی' کے جواب میں جو پانچ مثنویاں لکھی ہیں وہ بھی سب علاء الدین کے نام معنون کر دی ہیں - اسی بادشاہ کے ولی عہد خضر خان اور دیول رانی کے عشق کی کہانی بھی ایک مثنوی بنام 'عشقیہ' میں بیان ہوئی ہے (۱۳۱۶ء) -

علاء الدین کے بیٹے قطب الدین مبارک شاہ نے امیر خسرو کی قدردانی میں سب سے سبقت لے لی - جب خسرو نے ۱۳۱۸ء میں مثنوی 'نہ سپہر' اس کے نام سے معنون کی تو اس نے امیر خسرو کو ہاتھی برابر تول کر روپے دیے -

جب آخر میں سلطان غیاث الدین تغلق لکھنوتی (بنگالہ) گیا تو امیر خسرو بھی ہمراہ تھے - کچھ ہی دن کے بعد خواجہ نظام الدین اولیاء کے انتقال کی خبر پہنچی تو فوراً دہلی (مزارِ مقدس) کی جانب روانہ ہو گئے - مرشد کے چھ ماہ بعد ۱۰ نومبر ۱۳۲۵ء کو رحلت کی اور مرشد کے پائیں مزار دفن ہوئے -

آپ کی والدہ غالباً ہندو الاصل تھیں - اس لیے ہندو مذہب اور معاشرت سے انھیں خاصی واقفیت تھی - ان کی تصانیف میں ہندوستانی تشبیہیں اور مضامین جابجا ملتے ہیں - اور مثنویوں میں تو انھوں نے ہندوستانی چیزوں کا دوسرے ملکوں کی چیزوں سے تقابل بھی کیا ہے - اور اپنے وطن کو برتر ظاہر کیا ہے - مثنوی 'عشقیہ' (دیول رانی خضر خان) کے ایک باب میں باغ کی سیر دکھائی ہے جس میں چمپا ، کیوڑہ ، مولسری ، کرنہ ، جوہی اور دوسرے پھولوں کی تعریف کے بعد لکھا کہ اگر یہی پھول روم یا شام میں اگتے تو ان کی تعریف اس سے بھی زیادہ ہوتی - مثلاً :

چہ بینی ارغوان و لالہ خنداں — کہ رنگے ہست و بوے نیست چنداں
گر این گل خاستے در روم یا شام — کہ بودے پارسی یا تازیش نام

مثنوی 'نہ سپہر' میں چار سو ابیات پر مشتمل پورا ایک باب ہند و پاکستان کے رہنے والوں کی تعریف میں قلمبند کیا ہے - اس کے مطالعہ سے امیر خسرو کی 'حب الوطنی

اور ہندوؤں کے علوم و فنون سے کیا حقہ واقفیت کا پتہ چلتا ہے -

حضرت امیر خسرو نے اس وقت کی مقامی بولی ہندی یا ہندوی کو جو کہ جہانگیر کے دور میں پنجابی کے نام سے ملقب ہوئی اپنے افکار و خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا - اور غالبؒ ملتان کے پانچ سالہ قیام میں بھی اپنی شعر و شاعری اور تبلیغِ اسلام کا کام اسی زبان سے لیا جس سے اس زبان کو ترقی ملی - امیر خسرو کی مشہور و معروف بجھارتیں اسی زبان میں نہ صرف عوامی بلکہ علمی حیثیت اختیار کر چکی ہیں - نثر اور نظم دونوں میں، اس صنفِ سخن کے نمونے ملتے ہیں - بچوں کی سوجھ بوجھ اور فکری ریاضت میں پختگی پیدا کرنے سے متعلق یہ بجھارتیں کامیاب درسی اندازِ بیان کی بھی حیثیت رکھتی ہیں ، ان بجھارتوں کی زبان سادہ اور روزمرہ زندگی کی باتوں پر مبنی ہے - مثلاً :

(۱) اچے لمے ماسی وسے ، میں جانواں تے کھڑ کھڑ ہسے - (کپاس)[1]

(۲) دو کبوتر کولو کول کھسب اونہاندے کالے
چال اونہاندی اڈکی ملکی رب اونہاں نوں پالے (آنکھیں)

امیر خسرو اپنی پدری زبان ترکی پر بھی ہندوی کو ترجیح دیتے تھے :

اثبات گفت ہند بہ حجت کہ را حج است - بر پارسی و ترکی از الفاظ خوش گوار

حضرت لال حسین (۱۵۳۹ء - ۱۵۹۳ء)

نام لال حسین اور حسین تخلص کرتے تھے - اپنے فقر و غنا کی وجہ سے شاہ حسین کے نام سے بھی متعارف ہیں - آپ کی ولادت ۱۵۳۹ء اور وفات ۱۵۹۳ء میں ہوئی - یہ لاہور میں ٹکسالی دروازہ کے اندر شیخ عثمان کے ہاں ہوئی جو کہ پابند صوم و صلوٰۃ اور متقی و پرہیزگار تھے - حضرت لال حسین نے مسلسل کوششوں سے فہمِ قرآن . متعلقہ علوم تفسیر ، فقہ و حدیث میں کامل دستگاہ حاصل کی - مبادیاتِ تصوف سے متعلقہ آگاہی کے بعد ۲۶ سال مسلسل داتا گنج بخش کے مزار پر چلہ کشی کی - اس کسبِ فیض کے بعد رندی و مستی کے دور کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے ان کی طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل ہوئی - ان کا ذکر اگلے باب میں بالتفصیل ہوگا - مجملاً عرض ہے کہ حضرت لال حسین کا چرچا اکبر کے زمانے میں بہت ہوا اور بادشاہ تک شکایت پہنچی کہ یہ نشے میں مدہوش بازاروں اور گلیوں میں ناچتے گاتے پھرتے ہیں - دراصل حضرت لال حسین ملامتیہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے ، جس سے اپنے نفس امارہ کو تکلیف پہنچانے کی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں - گویا لوگوں کی فہمائش یا طعن و تشنیع ان کے لیے تازیانہ بن کر

---

۱ - ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ (مؤلف) پنجابی ادب کی مختصر تاریخ ، ص ۲۳ - ۲۵ -

ہر وقت انہیں اپنی بے بضاعتی کا یقین دلاتی رہتی ۔

حضرت لال حسین پنجابی زبان کی شاعری میں کافی کے موجد ہیں ۔ کافی میں حضرت لال حسین کے کلام کی بنیاد عشقِ الہی اور طلبِ صادق پر استوار ہے۔ کافیوں میں انہوں نے ملتانی ، ہندی اور عربی الفاظ عمدگی اور سلاست سے استعمال کیے ہیں اور مقامی تلمیحات بلکہ گھریلو ماحول کے استعارےان کے ہاں عام ہیں حتی کہ ہیر اور رانجھے یا رانجھن کے ناموں کو بطور علامت کے استعمال کیا گیا ہے ۔ نیز یہ کافیاں انہوں نے مختلف راگ اور راگینوں کے وزن پرکہی ہیں ۔ مگر ایک بات جو ان تمام کافیوں میں جاری و ساری ہے وہ ان کی اللہ تعالیٰ سے والہانہ محبت ہے ۔ وہ اس محبت میں سرشار بلکہ مبہوت نظر آتے ہیں اور اسی پر مستزاد ان کی انکساری اور ان کا جذبہٗ تعبد ہے ۔ وہ کسی کو برا نہیں کہتے اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں ۔ ان کے نزدیک اس زندگی میں خیر و شر ، جہالت و علم ، ادراک و عرفان کا تصادم بھی ایک بے حقیقت شے ہے ۔ ان کی کافیاں جو انہیں صوفیانہ شاعری میں اعلیٰ مقام کا حقدار قرار دیتی ہیں ، اپنی سرمستی و کیف کی وجہ سے ایک ایسے سرمدی عشق کا پتہ دیتی ہیں جس میں نفسِ انسانی کا شائبہ نظر نہیں آتا ۔ نمونہ کے طور پر ایک دو کافیاں ملاحظہ ہوں :

واریاں وو ! وار ڈاریـــــاں وو !

(۱) سائیں ! میں واریاں وو ! واریاں وو وار ڈاریاں وو!
چپ کراں تاں دیوں طعنے جاں بولاں تاں ماریاں وو !
اکناں کھتّی نوں ترساون اک ونڈدے نیں ساریاں وو !
اکناں ڈھول کلاوے نی سیّو ! اک کنتاں باہجھ بچاریاں وو !
اوگن ہاری نوں کو گن ناہیں نت اٹھ کردی زاریاں وو !
کہے حسین فقیر سائیں دا فضل کرے تے میں تاریاں وو!

(۲) یا دلبر یا سر کر پیارا !

جے توں ہیں مشتاق یگانہ سر دیوں دا چھوڑ بہانہ
دے دے لعل لباں دے لارے سولی اپر چڑھ لے ہلارے
جنہاں سچ تنہاں لب نہیں پیارے سچّو سچ بھر سچّے تہارے
شاہ حسین جنہاں سچ پچھاتا کامل عشق تنہاں دا جاتا
آئے ملیا تنہاں پیارا یا دلبر یا سر کر پیارا !

حضرت سلطان باہو (۱۶۳۱ء - ۱۶۹۱ء)

سلطان العارفین حضرت سلطان باہو نام تھا ۔ آپ کے اشعار یعنی دوہوں میں ہر مصرعہ کا آخری لفظ ''ہو'' ہوتا تھا ۔ یعنی ہر مصرعہ کو 'ہو' کے لفظ پر ختم کرتے ۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عشقِ الٰہی آپ میں ایسا رچا ہوا تھا کہ آپ خدا تعالیٰ کو ہر وقت حاضر و ناظر دیکھتے نظر آتے۔ ان کا ذکر بھی ہم نے تفصیل کے ساتھ اگلے باب میں کر دیا ہے ۔ مگر یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لال حسین کی کافیوں اور ان کے دوہوں میں کچھ فرق دکھائی دیتا ہے ۔ حضرت لال حسین ایک ایسے عاشقِ الٰہی ہیں جنہیں خدا کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا ۔ اور وہ اپنی حقیقت کو کبھی خیال میں نہیں لاتے ۔ حضرت سلطان باہو کی دنیا ان سے وسیع ہے ۔ اس میں خیر و شر ، ریا و دروغ ، خارجی اور داخلی تجرباتِ حیات اور عبادت و ریاضت میں ایک دائمی کشمکش جاری ہے ۔ وہ خدا کو حاضر و ناظر جانتے ہیں ۔ مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ شجر و حجر کو بھی خدا کا مظہر مانتے ہیں ۔ مراد اس سے یہ ہے کہ حضرت کے نزدیک دنیا کرودھ و کھٹ کا ڈیرا ہے اور طالبِ الٰہی کو یہاں بے شمار آزمائشوں و لغزشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ حضرت لال حسین ماسوا اللہ کو پہنچانتے ہی نہیں ۔ حضرت سلطان باہو دنیا کو دیکھتے اور اس کی جاذبیت کو پہچانتے ہیں ۔ مگر ان کے نزدیک یہ چیزیں ایک سالک کے لیے بے حقیقت ہیں اور ان کو رد کرنا سالک کا اولین فعل ہے ۔ خدا کا نور انہیں ہر جگہ کار فرما نظر آتا ہے ۔ ان کا علمی تبحر ان کے کلام ، ان کے استعاروں اور تصویر کاری سے مترشح ہوتا ہے ، اگرچہ حضرت لال حسین کی طرح وہ بھی خانگی زندگی سے اپنی تلمیحات اخذ کرتے ہیں ۔ ذیل میں ان کے ایک دو دوہے دیے جاتے ہیں جن سے معرفتِ الٰہی اور عشقِ حقیقی کے امکانات کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے دوہوں میں شاید وہ کیف اور سپردگی نہیں جو حضرت لال حسین کی کافیوں میں ہے ، مگر اپنی جگہ ان کے دوہے بھی صوفیانہ شاعری میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں :

(۱) ت ۔ تن من یار میں شہر بنایا دل وچ خاص محلّہ ہو
آن الف دل وسّوں کیتی میری خوب ہوئی تسلا ہو
سب کجھ مینوں پیا سنیوے جو بولے ما سو اللہ ہو
دردمنداں ایہہ رمز پچھاتی (باہو) بے درداں سر کھلا ہو

(۲) ذ ۔ ذکر فکر سب ارکے ایرے جاں جان فدا نہ فانی ہو
فدا فانی تنہاں حاصل ہووے جھڑے وسن لامکانی ہو
فدا فانی اوہناں نوں ہویا جنہاں چکھی عشق دی کانی ہو
ہو دا عشق سریندا ہر دم باہو یار نہ ملیا جانی ہو

پیلو (سولھویں صدی عیسوی کا نصف آخر)

پیلو کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں ۔ البتہ داخلی شہادت اور دوسرے شعراء کے حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکبر کے زمانہ (۱۵۵۶ء - ۱۶۰۵ء) کا شاعر تھا ۔ اس کی مشہور نظم 'مرزا صاحباں' بھی تقریباً کالعدم ہو چکی تھی ۔ مگر سر رچرڈ ٹمپل نے جب حکایاتِ پنجاب کو جمع کرنا شروع کیا تو اسے اس نظم کا سراغ ملا اور اس نے بھاٹوں کی زبان سے اسے سن کر قلم بند کیا اور اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ موجودہ صورت میں یہ نظم نا مکمل ہے۔ اور اس کے کئی حصے غائب ہیں ، مگر مجموعی تاثر میں یہ ابھی تک ایسی زور دار ہے کہ باوجود خامیوں کے پنجابی داستانوں میں اس کی حیثیت منفرد ہے ۔ یہ نظم غالباً سندھ ساگر دوآب سے تعلق رکھتی ہے اور اس علاقہ کے معاشرہ کی ترجمانی کرتی ہے ۔ قبائلی ماحول ، نسلی عصبیت ، رسم و رواج کی کڑی پابندیاں ، خاندانی غیرت ، ذاتی تہور ، دو محبتوں کا تصادم ، بطل داستان کی المیہ کمزوری یعنی اس کا غرور ، یہ سب عناصر اس نظم کو دنیا کی بڑی المیہ نظموں کی صف میں لے آتے ہیں ۔ 'مرزا صاحباں' کی نظم سے ہم اگلے باب میں منظوم داستانوں کے ضمن میں مفصل بحث کریں گے ۔

کہانی : مختصراً یہ کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم ایک المیہ کا ایک واقعہ ہے۔ یعنی بطل داستان اپنی محبوبہ کے پیغام سننے کے بعد اکیلا اسے جیت کر لے آنے کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے ، اور اپنی محبوبہ کو بحیلۂ تمام لے کر نکل بھی آتا ہے ۔ مگر کئی دنوں کا تھکا ہوا ہونے کے باعث کچھ دور آ کر نیند سے مغلوب ہو جاتا ہے ۔ اس کی محبوبہ صاحباں جاگتی رہتی ہے ۔ مگر اسے یہ ڈر رہتا ہے کہ اس کے بھائی اس کے تعاقب میں آ رہے ہوں گے ۔ وہ مرزا کو جگاتی ہے مگر مرزا اٹھتا نہیں ۔ جب گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آنے لگتی ہے۔ تو وہ پھر مرزا کو جگا دیتی ہے مگر مرزا یہ کہہ کر کہ اگر اس کے بھائی آ بھی گئے تو وہ اپنے تیروں سے انہیں ایک ایک کر کے مار گرائے گا ، پھر سو جاتا ہے۔ صاحباں کے دل میں بھائیوں کی محبت اور محبوب کی محبت میں تصادم ہوتا ہے اور بھائیوں کی محبت محبوب کے عشق پر غالب آ جاتی ہے ۔ یہ مشرق یا یہ کہیے ملکی معاشرہ کا ایک دائمی موضوع ہے ۔ چنانچہ یہ ہمارے معاشرے کی سچی تصویر معلوم ہوتی ہے ۔ وہ مرزا کا ترکش اور اس کی کمان اونچی شاخ پر لٹکا دیتی ہے ۔ چنانچہ جب اس کے بھائی آ پہنچتے ہیں تو مرزا جاگ اٹھتا ہے۔ مگر اپنے آپ کو بے ہتھیار پاتا ہے اور صاحباں کے بھائی شمیر کے ہاتھوں مارا جاتا ہے

المیہ منظوم داستانوں میں پیلو کی 'مرزا صاحباں' کی خوبی اسی وجہ سے ہے کہ

اس میں شاعر نے اختصار کے تمام فنی امکانات کو استعمال کیا ہے ۔ جہاں وہ اشارے سے کام لے سکتا ہے وہ بیان اور تشریح سے گریز کرتا ہے ۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مرزا کو صحیح معنوں میں ایک بطلیہ کردار کے طور پر پیش کرتا ہے ۔ شجاعت میں فرد ، قول کا دھنی ، ہمت کی مثال ، وفا شعار اور ہشیار ، مرزا میں تمام بطلیہ صفات موجود ہیں اور ساتھ ہی وہ المیہ خامی بھی ہے ، جو اس کی موت کا باعث ہوتی ہے ۔ یہ اس کا غرور ہے ۔ اسی طرح صاحبان بھی بطلیہ ہیروئن ہونے کے قابل قرار دی جا سکتی ہے ۔ کیونکہ وہ محبت میں ثابت قدم ہے اور کمزور دل بھی نہیں ۔ مگر اس کی المیہ کشمکش جس کی وجہ سے وہ بشریت کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہے ، اس داستان کو المیہ شاعری کی اعلیٰ مثال بنا دیتی ہے ۔ پیلو کی فنی مہارت اس نظم کے آخری دو بندوں سے ظاہر ہوتی ہے :

(۱) تن سو کانی مرزے جوان دی، دیندان سیالاں نوں ونڈ
پہلی مار دا ویر شمیر دے ، دوجی کلے دے تنگ
تیجی ماراں جوڑ کے ، جھیدی ہیں توں منگ
سر تے منڈاسا اڈ گیا ، گل وچ پیندی جھنڈ
باجھ بھراواں جٹ ماریا ،کوئی نہ مرزے دے سنگ

(۲) پیلو پچھے شاعر نوں ، کے ول گیا جہان
بہ بہ گیاں مجلساں ، لگ لگ گئے دیوان
مرزا ماریا ملک الموت دا ، کجھ ماریا اوہنوں کہان
وچ قبراں دے کھپ گیا ، مرزا سوہنا جوان
ایہ قصہ مرزا صاحباں دا جوڑیا
پیلو شاعر نے جس نوں جانے جگ جہان

چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نظم کا یہ اختتام اس منظوم داستان کو دنیا کی مشہور بطلیہ داستانوں میں لا کھڑا کرتا ہے ۔ اس اختصار اور تاثر سے کسی اور پنجابی شاعر نے کام نہیں لیا ۔ مقابلہ کے لیے آپ فضل شاہ کی 'سوہنی مہنیوال' لیجئے جب سوہنی ڈوبنے لگتی ہے تو وہ سات کوکیں مارتی ہے اور اس پر بھی نہیں ڈوبتی ۔ ماں ، قسمت اور مہینوال کو بار بار پکارتی ہے ۔ جس سے وہ تاثر جو ایک ہیروئن کی عظیم قربانی سے ہمارے دل پر ہونا چاہیے زائل ہو جاتا ہے ۔ برعکس اس کے پیلو آخری بند کی تیسری چوتھی سطور پر المیہ کے پورے امکانات کا مظاہرہ کر دیتا ہے ۔

دامودر[1] (وفات بعہد اکبر)

۔ دامودر اکبر کے دور (۱۵۵۶ء - ۱۶۰۵ء) کا شاعر تھا ۔ اس کی شہرت کا باعث ہیر اور رانجھے کی عشقیہ داستان ہے ، جسے دامودر نے سب سے پہلے پنجابی زبان میں نظم کیا ۔ دامودر کا کہنا ہے کہ اس نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دوستوں کے کہنے پر لکھ کر محفوظ کر دیا ۔ یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ حضرت لال حسین کی کافیوں میں ہیر اور رانجھا یا رانجھن بطور علامت استعمال ہوئے ہیں اور زبان میں اسماء کا یہ استعمال بہت دیر میں آتا ہے ۔ بعد میں یہ قصہ وارث شاہ کے ہاتھوں لازوال شہرت پا گیا ۔ دوسری منظوم داستانوں کی طرح دامودر کے اصل قصے میں بھی ردّ و بدل ہوتا رہا ۔ چنانچہ اس وقت دامودر کی ہیر کے مختلف نسخے ملتے ہیں جن میں طرزِ ادا اور واقعاتی جزئیات میں بھی اختلاف موجود ہے ۔

دامودر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسانی نفسیات اور معاشرے کے تہذیبی عناصر پر گہری نظر رکھتا ہے ۔ اس کے ہاں کردار اپنی کمزوریوں اور خوبیوں کے ساتھ مکمل صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ اس کی رومانوی داستان کی بساط اگرچہ وارث کی طرح وسیع نہیں ، لیکن وہ واقعات کی ان جزئیات اور کرداروں کی ایسی حرکات جن سے اس واقعہ کی وضاحت یا کردار کی تکمیل میں مدد ملتی ہے ، بیان کرنا نہیں بھولتا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کردار نامکمل نہیں رہتے ۔ وارث شاہ کے ہاں یہی باتیں موجود ہیں مگر ایسے کامل طور پر کہ اس سے ایک وسیع اور بھرپور دنیا کا اندازہ ہوتا ہے ۔ دامودر کے ہاں وہ اس کی شعوری کوشش کا خوب صورت نمونہ ہیں ۔ مثال کے طور پر دھیدو کا کردار لیجئے ۔ بعد کے داستان گو اس کردار کو کمزور یا منفی حیثیت دیتے ہیں مگر دامودر کے ہاں یہ ایسا بودا کردار نہیں ۔ یہاں دھیدو ایک نکمے ، غیر ذمہ دار نوجوان کی بجائے بھائیوں کی ہوسِ دولت کا شکار دکھایا گیا ہے جو آگے چل کر کمزور دل ، محبت کا بھوکا اور سہارے کا متلاشی ہونے کے باوجود اپنی خود داری کا یوں ثبوت دیتا ہے کہ ہیر کا باپ جب اسے زمین ، گھر اور مویشی دینے کی پیشکش کرتا ہے تو دھیدو اسے ایک پر وقار طریقے سے منع کر دیتا ہے ۔ دھیدو کا باپ جب یہ دیکھتا ہے کہ اس کے دوسرے بیٹے دھیدو سے حسد کرتے ہیں ۔ اور اس کی جان کے دشمن ہیں تو وہ اس کی شادی کسی بڑے گھر میں کرنا چاہتا ہے تاکہ دھیدو کو سہارا مل سکے ۔ ہیر بھی اپنے سسرال کے گھر سے نہیں بھاگتی بلکہ اپنے میکے آ کر ماں کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ اسے رانجھے کے ساتھ جانے دے ، لیکن جب وہ نہیں مانتی تو پھر رانجھے کو ساتھ لے کر

---

(۱) موہن سنگھ دیوانہ ، دامودر کا دور ۱۴۸۶ء سے ۱۵۶۸ء تک مقرر کرتے ہیں ۔

چلی جاتی ہے ۔ یہ سب واقعات حقیقی زندگی کے زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں ۔

داسودر کی ہیر میں دیہاتی زندگی اور اس زمانے کے رسم و رواج بھی پورے طور پر منعکس ہوتے ہیں ۔ زمینداروں کے ہاں ملازموں کی کثرت ، ڈوم یا برہمن کا شادی کا پیغام لے جانا ۔ منگنی کا چھوٹی عمر میں رواج ہونا ۔ سگائی کا کل قبیلے کی مساوات سے طے پانا وغیرہ کو داسودر نہایت خوبی سے چند الفاظ میں بیان کر دیتا ہے ۔ اس کے ہاں الفاظ کا بہت عمدہ انتخاب ہے ، بھرمار نہیں ۔ مثال کے طور پر ذیل میں دو تین بند دیے جاتے ہیں ۔ جس سے داسودر کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے :

(۱) تورا لٹ گیا ہیرے دا جو بولی ات بھتی
ہوئی خاک زمین دی لوکا رہیوس نہ ماناں ترتی
گل وچ پلو۔ وست پیراں تے ۔ عشق گوائے متی
جیہوں پیراں رانجھے لوں رتا۔ تیوں ہیر رانجھیٹے رتی

(۲) تاں من معظم اہ گل کیتی ۔ دھیدو جوگ منگائیں
موئی سو ماں مت میں مرو نجاں۔ کیندی جھولی پائیں
ویراں مندی نظر کیتی ۔ اسے وکاڑن تائیں
آلھے پھر معظم دھونی وانگوں۔ دھکھے سنجھ صباحیں

(۳) گھن مسیتی جے آن رکھیو سو۔ میہندی چیکوں لائے
آکھ دمودر کنج کواری لوں ۔ امڑ مائینیئیں ہائے

حافظ برخودار (بعہد عالمگیری)

نام برخوردار اور حافظ قرآن ہونے کی مناسبت سے انہوں نے حافظ تخلص اختیار کر لیا ۔ بزارہ کے نزدیک ایک گاؤں مسلمانی ضلع سرگودھا میں ۱۶۲۰ء (۱۰۳۰ھ) کے لگ بھگ پیدا ہوئے ۔ ذات رانجھا تھی جو سابقہ پنجاب کے اضلاع گجرات اور جھنگ و سرگودھا کی ایک قدیم اور مشہور قوم ہے ۔ اپنی عمر کا بیشتر حصہ سیالکوٹ میں گذارا اور سیالکوٹ ہی میں وفات پائی ۔ آپ کے استاد کا نام مولوی عبدالحکیم تھا اور آپ خود بھی بڑے عالم تھے ۔ آپ کی تصنیفات میں ' مرزا صاحباں ' ، 'سسی پنوں ' 'یوسف زلیخا ' ، ' شیریں فرہاد ' ، ' نہر العلوم ' ، ' بحر العلوم ' ، ' رسالہ نماز ' 'شمس العلوم' ، 'مفتاح المصلی' ، 'فقہ اچہال' ، 'نجات المسلمین' ، 'بیان سابقہ اصلی'

سی حرفی' ، 'مفتاح السعادت' ، 'میزان شریعت' ، 'تنبیہہ المفسدین' ، 'شرف النکاح' 'سراج المعاملات' ، ' فرائض ہندی' ، 'ترجمہ قصیدہ غوثیہ' ، 'رسالہ بے نمازاں' قابل ذکر ہیں۔

حافظ برخوردار کی دیگر کتب و تصانیف کی مقبولیت کے علاوہ اس کا قصہ 'مرزا صاحباں' خاص طور پر پنجابی عوام میں مقبول ہے۔ سابقہ پنجاب کا کوئی گاؤں یا شہر ایسا نہیں جس میں اس کے 'مرزا صاحباں' کے قاری و حافظ نہیں ملتے۔ حافظ کے اس شاہکار کی زبان سلیس اور رواں ہے۔ الکی 'مرزا صاحباں' کے کئی اشعار اور مصرعے تو پنجابی زبان کے محاورہ اور روزمرہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ حافظ برخوردار کا اپنا ایک الگ اور منفرد اسلوب ہے۔ آپ جزئیات اور تفاصیل سے کام لیتے ہیں۔ ان جزئیات کی بدولت خانہ پری ضرور ہوتی ہے ، لیکن اہم بات یہ ہے کہ معاشرے کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے بھی کھنچ جاتی ہے۔ پیلو نے بھی 'مرزا صاحباں' لکھی ہے مگر وہ جزئیات کی بجائے اختصار سے کام لیتا ہے اگرچہ اس اختصار میں اکثر اوقات برخوردار کی تفصیل و جزئیات سے زیادہ اثر معلوم ہوتا ہے۔

حافظ برخوردار نے حسن و عشق کے قصوں کے علاوہ شرعی مسائل پر بھی کئی رسائل لکھے ہیں۔ ان میں اسلامی شعار پر عمل کرنے کی تاکید کے علاوہ دنیاوی امور کے متعلق بھی کام کی باتیں ملتی ہیں۔ سلاستِ زبان کے لحاظ سے اُن کی یہ شاعری بھی منفرد ہوتی ہے۔ درجِ ذیل اشعار میں وہ کسبِ حلال کی تاکید مؤثر اور پختہ اندازِ اظہار میں کرتے ہیں۔ اور متعلقہ احکام کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے بزرگوں کی مثالیں دے کر کس طرح ابھارتے اور اپنے مقصد کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ ملاحظہ کریں :

کرنا کسب حلال دا مومن فرض پچھان
ہوویں نہ محتاج توں لوکاں وچ جہان
ہندی طاقت کسب دی جو کوئی کھاوے منگ
شامت ایس حرام دی ایتھے اوتھے تنگ

مگر حافظ برخوردار ہر جگہ سادہ اور پھیکی زبان استعمال نہیں کرتے۔ تشبیہ اور استعارہ سے بھی وہ بہت کام لیتے ہیں ، مثلاً اپنے قصہ 'یوسف زلیخا' میں زلیخا کے

حسن کی تعریف میں آن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔ اگرچہ ان میں سے اکثر تشبیہات پرانی اور شاید کسی حد تک متبذل بھی ہیں ، مگر بیان میں سادگی اور برجستگی سے وہ ایک خاص اثر پیدا کر دیتی ہیں :

صورت حد حسابوں باہر کیا کیا صفت کریوے
مونہہ مہتاب صنوبر قامت اکھیں روشن دیوے
پلکاں تیر کماناں ابرو دند چنبے دیاں کلیاں
نازک بدن صراحی گردن انگلیاں جیئوں پھلیاں

ذیل میں اس کے قصہ 'سسی پنوں' کا تحریری اور فکری کمال ملاحظہ کریں ۔ سسی کی ہمجولیاں اسے طعنہ زنی کرتی ہیں :

ہر سسی نوں بولن بولیاں کڑیاں انن بانہہ
جے رڑھدی کڈھی ہیں دھوبیاں نوں دھی انہاندی نانہہ
رب انب کھوائے دھوبیاں لگاوت پھروانہہ
اسیں قدرت تیری نوں رباں لکھ واری بل جانہہ

اسی قسم کی فنکارانہ چابک دستی اور موثر اندازِ فکر ان کی نظم 'مرزا صاحباں' میں بھی ہے ۔ اس میں صاحباں کے حسن کی تعریف میں شاعر کی کاوشِ فکر ملاحظہ کیجئے :

عشق وسے وچ چندلے عاشق گھت پھرن
بیڑے عشقِ مجاز دے اس وچ لکھ ترن
جھنگ مثال بہشت دے جتھے حوراں وار کھڈن
پنچھی جویں جو جھاڑیاں کھرے عشق پون
دھی کھیوے دی صاحباں جس تے حوراں گھنڈ کڈھن
تے پریاں پربت تینے جٹی دا ویکھ حسن
صاحباں دا قد سرو کل کونج جیئوں دوھے واہ پون
لباں سیں جام شراب دا پی عاشق مست تھون
صاحباں دے خونی نین پکھا ولے بازاں وانگ تکن
اوہ پاڑن ول ول دلاں نوں بکیں رت پیون

حافظ برخوردار خود ، پیلو کی شاعری کا قائل نظر آتا ہے اور جیسے ذیل کے

شعر سے ثابت ہوتا ہے - شعر ملاحظہ کیجئے :

یارو پیلو نال برابری شاعر بھل کریں
جس نوں پنجاں پیراں دی تھاپیاں کندھی دست دھریں

مگر اس میں انکساری کا عنصر بھی موجود ہے - چونکہ جہاں تک تخیّل کا تعلق ہے حافظ برخوردار پیلو سے بلند ہے - مگر ڈرامائی اندازِ بیان میں پیلو حافظ برخوردار سے بازی لے جاتا ہے - یوں پیلو اور حافظ برخوردار کی ' مرزا صاحباں ' کا اگر تقابل کیا جائے تو درجِ ذیل چند نکات ہمارے سامنے آتے ہیں - پیلو کی زبان مجرّد ہے اور حافظ برخوردار کی مقابلتاً مرصّع - حافظ کردار نگاری اور قصہ پن پر زیادہ توجہ دیتا ہے جب کہ پیلو پلاٹ کو فوقیت دیتا ہے - پیلو کی کردار نگاری میں تفاصیل سے کام نہیں لیا گیا ، فقط اشارے کر دیے گئے ہیں - مکالمات مختصر مگر مؤثر ہیں - اکثر کرداروں کی داخلی کیفیات کا ذکر ایک ہی مصرعہ میں کردیا جاتا ہے - حافظ برخوردار جزئیات نگاری کی بدولت معاشرے کی پوری تصویر کھینچ دیتے ہیں -علاوہ ازیں حافظ برخوردار جگہ جگہ موضوعات دے کر سوال جواب کی صورت میں قصہ میں واقعیت کا عنصر داخل کر دیتے ہیں -

حافظ برخوردار کی زبان ٹھیٹھ پنجابی ہے - جس میں کہیں کہیں فارسی اور ہندی بھاشا کے الفاظ کی ملاوٹ بھی ہے - اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ قدیم پنجابی میں ہندی الفاظ بھی شامل تھے - اسی زبان میں لہندی کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں - قصہ 'مرزا صاحباں' اسی ٹھیٹھ پنجابی زبان میں ہے - ، سدان ، یا ، واراں ، میں فارسی اوزان سے کام لیا گیا ہے - حافظ برخوردار نئی تشبیہیں سادہ مگر مؤثر زبان کے استاد ہیں - عشقیہ مضامین کو ادا کرتے کرتے وہ اپنے سوزِ دل کا حال بھی بیان کر جاتے ہیں - جس سے اظہار میں چبھن پیدا ہو جاتی ہے - 'مرزا صاحباں' کے علاوہ ان کی 'سسّی پنوں' اور 'یوسف زلیخا' بھی مشہور ہیں - اسلامی کتب میں خالص پنجابی زبان نہیں ہے - بلکہ فارسی اور عربی کے بیشتر الفاظ بھی استعمال کیے گیے ہیں - آپ نے ' بحر العلوم ' میں قصہ خوانی کو بدعت قرار دیا ہے -

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حافظ برخوردار نے عشقیہ قصے کب لکھے - آثار سے پتہ چلتا ہے کہ 'فرائض ہندی' ۱۶۷۰ء (۱۰۸۱ھ) میں لکھا گیا اور 'یوسف زلیخا' ۱۶۷۹ء(۱۰۹۰ھ) میں ، مگر 'سسی پنوں' اور 'مرزا صاحباں' کے قصوں کا کوئی سنِ تصنیف نہیں ملتا - 'یوسف زلیخا' میں زلیخا کی زبان صاف ستھری پنجابی ہے - 'سی حرفی' بھی صاف پنجابی زبان میں ہے - ' یوسف زلیخا ' کے دو ایک شعر ملاحظہ ہوں :

اس نے مندرجہ بالا طویل بحر کے علاوہ چھوٹی بحروں میں بھی مشقِ سخن کی ہے۔ ان سی حرفیوں میں زبان ملتانی پنجابی کا زیادہ استعمال نظر آتا ہے۔ مگر 'عیش نامہ' میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ اس کی پیش کی گئی 'ہیر' کی زبان کے ہی مطابق سادہ اور صاف پنجابی ہے۔ جس میں ملتانی د ، ڑ کا فرق نظر نہیں آتا۔ اور یہ میرن کی ادبی صلاحیت کا کمال ہے۔ کیونکہ وہ مظفر گڑھ سے جب بہاول پور منتقل ہوئے تو یہیں کے ہو رہے۔ ظاہر ہے کہ بہاول پور میں بھی ملتانی زبان کا رنگ ہی غالب ہوگا۔ اگر اس کی مادری زبان کے اندازِ اظہار کو مدنظر رکھا جائے تو یہ اس کا فنکارانہ کمال ہے کہ اس نے اس طبعی مجبوری کی موجودگی میں صاف اور ستھری پنجابی زبان میں یہ ادبی خدمت انجام دی۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے :

عیش نامہ

عشق پیر پیارے دے آکھے کارن میں ناں اہ رسالہ بنایائی
جب جوڑ مرتب سارا کیتا عیش نامہ ناں ناؤں رکھایائی
بہت سوہنا تے عمدہ ہے بہت عاشقاں دے من بھایائی
جویں لکھیا سی وچ کوک سندے میرن ایتھے وی توں لکھایائی

(۲)

سچ صفت کیجے سجے ربدی جی جن زلفاں محبوبا دیا پا لباں نی
سورج پاس رب انہاں نوں واس دتا ایس واسطے ہوئیاں کالیاں نی
کون زلفاں آکھے انہاں بھاہیاں نوں اوہ ناگناں وس والیاں نی
میرن سوہنے پھندک رب کیتے جنہاں دل اجیہاں جالیاں نی

مولوی عبدالکریم (۱۶۵۷ء - ۱۷۰۷ء)

یہی نام اور یہی تخلص کرتے ہیں۔ مضاف مگھیانہ ضلع جھنگ کے رہنے والے تھے۔ تاریخ پیدائش و وفات کسی تذکرہ میں نہیں ملتی۔ نہایت صاف اور سلیس زبان استعمال کرتے ہیں۔ تصانیف میں تین کتب کا تذکرہ ملتا ہے۔ 'معیار الایمان' اور 'نجات المومنین'۔ تیسری کتاب مصنف نے ۱۶۷۵ء میں منظوم 'رسالہ فقہی' کی صورت میں تصنیف کی جو ایک مدت تک اسلامی مدارس میں متداول رہا۔ اور آج بھی مطبوعہ دستیاب ہے۔ (۱۶۷۵ء / ۱۰۸۶ھ) خود اس کا سنِ تصنیف ظاہر کرتے ہیں۔ ملاحظہ کریں :

ہجرت اک ہزار بھی اہر چھیاسی جان
ایہہ رسالہ فقہ دا کیتا رب آسان !

نام نجات المومنین ایس کتابسے جان
پڑھ کے کرسی عمل جو رہسی وچ امان !
فرض مسائل فقہ دے ہندی کر تعلیم ،
کارن مردان امیاں جوڑے عبدالکریم

مولوی عبدالکریم کی دیگر ہر دو کتب اس وقت دستیاب نہیں ہو سکیں ۔ شاید وہ دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گئی ہوں ۔

حافظ معزالدین (۱۶۵۸ء - ۱۷۰۷ء)

حویلی پتھراں والی لاہور میں مسجد سبھراواں کے امام تھے ۔ یہ مسجد نواب سعداللہ خاں وزیر دربار شاہ جہان کے صاحب زادہ نے تعمیر کی تھی ۔ اس نسبت سے نواب صاحب اکثر اس مسجد میں نماز ادا کرتے اور اس کے بعد حافظ معزالدین (جو کہ نابینا ہونے کے باوجود مذہبی علوم سے کماحقہ' بہرہ یاب تھے) سے مذہبی باتوں پر تبادلہ خیال کرتے ۔ اور ان کے وسیع مطالعہ اور قابلیت سے متاثر ہو کر آپ نے 'قصیدہ امالی' کے پنجابی ترجمہ کرنے کی فرمائش کی ۔ حافظ صاحب نے اس ادبی اور مذہبی کام کو انجام دیا جس کا ذکر ذیل کے اشعار میں وہ خود کرتے ہیں :

ہندی شرح کسے نہ کیتی — گل اپناں دی میں من لیتی
فکر میں اسدے اندر کیتا — جساتم بہت محال اے
دوسال کم صدیاں یاراں — بعد نبی دے سال شماراں
شہری جمادی الاوّل جائین — تاریخ ستارہ روز پچھالیں
وار ادینہ تم قصیدہ — وقت دوپہراں والی اے
اس عربی تھیں ہندی کیجے — سبھے خلق سو کھلے لیجے
خان سعداللہ نے فرمایا — قصیدہ شرح امالی اے
تاں میں ایہ تصنیف جو کیتی — سبھراواں دی بیٹھ مسیتی
ایہ آسان ہوئی میں اتے — کیتا کرم تعالیٰ اے
رب مریسی خلقت ساری — فیر جویسی دوجی واری
ہر اک نال حساب کریسی — حسبہ عمل سزا اوہ دیسی
تہی ملدی جزا ہر اک نوں — جیہا کسب خصالی اے
سے اوہ بے پرواہ الہی — نہ اسدی کوئی عورت آہی

نہ اس دھی پتر نہ کائی نہ رب بابا نہ رب مائی
نہ رب خویش قبیلہ کوئی نہ رب اہل عیالی اے

ان کی ایک تصنیف 'توبہ نامہ' بھی بتائی جاتی ہے

مولوی عبداللہ لاہوری (ز — ۱۶۶۴ء)

نام عبداللہ تھا اور تخلص عبدی کرتے تھے ۔ عبداللہ اور عبد بھی استعمال کیا ہے ۔ عہدِ شاہ جہان اور دورِ عالمگیری کے شاعر ہیں ۔ آبائی وطن موضع ملکہ ہانس ضلع ساہیوال (منٹگمری) تھا ۔ پیدائش عہدِ اکبری کے آخری ایام میں ہوئی ۔ اور وفات عالمگیری عہد کی ابتدا میں ۔

پیدائشی طور پر درویش طبع ، فقیر صفت واقع ہوئے تھے ۔ تحصیلِ علم دین کے ساتھ ساتھ بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے ۔ ایک دن چراگاہ میں بھیڑیں چرا رہے تھے کہ خدا کی تجلّیات سے دل و دماغ مسور ہوگیا ۔ پیر رشد و ہدایت کی تلاش میں لاہور کا سفر اختیار کیا ۔ لاہور پہنچ کر بابا حسن محمد کے فقر و غنا کے بڑے چرچے سنے جنہیں عوام بابا حسو تیلی کے نام سے پکارتے تھے ۔ یہ چونکہ صاحبِ حال اور عظیم مراتبِ سلوک پر فائز تھے ، عبداللہ نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے مریدوں میں شامل ہوگئے ۔

ہادیؒ ہدایت کے فرمان کے مطابق آپ رزقِ حلال کی خاطر چکی پیستے اور اس کی بافت سے اپنا گزارہ کرتے تھے ۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ایک دن کسی فقیر نے ان کی یہ حالت دیکھ کر کہا کہ آپ چکی پیسنے کی مشقت میں اپنا منہ سر بھی آٹے سے مکدر کر لیتے ہیں ۔ میں آپ کو ایک وظیفہ بتلاتا ہوں ۔ جس کے عمل سے ضرورت سے زیادہ روپیہ خود بخود آپ کے پاس آ جایا کرے گا ۔ یہ سن کر آپ نے جواب دیا ۔ ''لعنت ہے ایسے مال پر جو اپنی محنت مشقت کے بغیر حاصل ہو ۔ ایسی دولت سے لالچ اور حرص و آز میں ترقی ہوتی ہے ۔ اور عبادت میں سستی اور غفلت'' ۔

تصنیفات ، میں 'بارہ انواع' آپ کی مشہورِ زمانہ تصنیف ہے جس میں آپ نے بارہ رسالے جمع کیے ہیں ۔ یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۹۲۱ء میں لاہور کے ایک تاجر نے چھاپی تھی ۔ اس میں مندرجہ ذیل رسالے شامل ہیں جن کے سنِ تصنیف کا اظہار مولوی عبداللہ نے مندرجہ ذیل ترتیب سے کیا ہے :

(۱) ۔ تحفۃ (۱۶۱۶ء/۱۰۲۵ھ) (۲) ۔ نص فرائض (۱۶۲۲ء/۱۰۳۲ھ) (۳) ۔ خلاصۃ معاملات (۱۶۳۳ء/۱۰۴۳ھ) (۴) ۔ انواع العلوم (۱۶۳۴ء/۱۰۴۴ھ) (۵) معرفتِ الٰہی

(۱۶۳۵ء/۱۰۵۵ھ) (۶) خیرالعاشقین کلاں (۱۶۴۴ء/۱۰۵۴ھ) (۷) - فرائض شرح سراجی (۱۶۴۸ء/۱۰۵۸ھ) (۸) خیرالعاشقین خورد (۱۶۵۴ء/۱۰۶۵ھ) (۹) حصار الایمان ، تاریخ نہیں دی گئی (۱۰) حصار الایمان اول ، تاریخ نہیں دی گئی (۱۱) حصار الایمان دوئم ، تاریخ نہیں دی گئی (۱۲) - حمد و ثنا ، تاریخ نہیں دی گئی -

پروفیسر قاضی فضل حق مرحوم نے مندرجہ کتب کی تفصیل مولوی عبداللہ کے نام سے نقل کی ہے - جو تعداد میں گیارہ رسالوں پر مشتمل ہے :

۱ - رسالہ مہندی (۱۵۸۸ء/۹۹۷ھ) ، (۲) تحفۃ الفقہ (۱۶۱۶ء/۱۰۲۵ھ) (۳) نص فرائض (۱۶۲۲ء/۱۰۳۲ھ) (۴) خلاصۂ معاملات (۱۶۳۳ء/۱۰۴۳ھ) ، (۵) انواع العلوم (۱۶۳۴ء/۱۰۴۴ھ) ، (۶) معرفت النبی (۱۶۴۴ء/۱۰۵۴ھ) (۷) خیر العاشقین کلاں (۱۶۴۴ء/۱۰۵۴ھ) ، (۸) فرائض شرح سراجی (۱۶۴۸ء/۱۰۵۸ھ) (۹) خیر العاشقین خورد (۱۶۵۴ء/۱۰۶۵ھ) (۱۰) حصار الایمان تاریخ نہیں دی گئی ، (۱۱) رسالہ فقہ ہندی (۱۶۴۴ء/۱۰۷۵ھ)

مندرجہ بالا کتب کی اس تاریخی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ۸۷ سال مسلسل قلمی خدمت انجام دی ہے - اور یہ کام ایک فاضل کی زندگی کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے - جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے - مولوی صاحب کے نزدیک معیارِ نظم کیا ہے - 'نص الفرائض' کی فصل در بیان نظم میں ذیل کے اشعار تحریر کرتے ہیں :

نظم جیدا ناؤں ہے ، باہجھوں فقہ اصول
تس اللہ دی درگاہ وچ ، ناہیں نظم قبول
فقہ اصول تے وحدانیت نظمے بجھن ناہیں
راہ حقانی چھوڑ کراھن ، وتن کوڑی راہیں

فقہ اصول نہ سمجھ نظمے   انہاں سیری دل پرچایا
ایہ آکھن شعر ملائک لکون   اینہاں حق نہ پایا

مولوی عبداللہ کے نزدیک نظم کا یہ رنگ محض اس لیے جائز ہے کہ قرآن پاک اسی انداز فکر کو جائز قرار دیتا ہے - شعر و ادب میں مبالغہ آمیزی شاید ادبی عظمتِ فکر تو ہو لیکن فقہ اور اخلاق میں اس کی زیادہ وقعت نہیں - یہی وجہ ہے کہ مولوی عبداللہ نے سوائے عوام کے فائدے کے اپنے تمام شعری مجموعہ میں ایک شعر بھی ایسا گوارا نہیں کیا جو محض ہا و ہو کی خاطرداری انجام دے سکے - اور عوام کا اس سے کوئی فائدہ نہ ہو - اور ان کی رائے میں بے مقصد شاعری نہ صرف بیکار ہے بلکہ نقصان دہ بھی ، جس سے سب ہی لوگ اتفاق کر سکتے ہیں -

ذیل میں رسالہ 'خیر العاشقین' کے چند اشعار ملاحظہ کریں ۔ جن میں وہ اعمالِ صالح کی نہایت مؤثر پیرایہ میں تلقین کرتا ہیں :

عبدی ملک الہلی طلب کریسن کیا توں آندا
جے کجھ پلے چنگا کھڑسیں نہ تھیسیں درماندا
نیک اعمال جو کرسن مومن لیسن کیا مزدوری
الواعِ نعمت ، جا کسے نے میوہ ماس کافوری
کاہل عبد عبادت اندر ذرا خاص نہ ہو
عیب اساڈے ونجن دھوتے جو خالق لاہے دھو

ذیل کی سرخی جو 'خیر العاشقین خورد' سے ہے ملاحظہ کریں ۔ دعائیہ انداز میں خدا سے مغفرت طلب کی ہے اور اپنے بڑھاپے کی کمزوری کے پیش نظر آخر میں پھر یہی یقین کیا ہے کہ خداوند تعالیٰ کے رحم اور فضل کے بغیر کچھ نہیں ہو گا :

الٰہی بخش بندہ ہور ماں پیو اسدا کل اولاد نساء
ہر استاد ہر دوست خلقت بخش خدا
ایمان ہمیشہ بخش الٰہی طاعت مُد درد
روزی کر دیدار ہمیشہ عاصی کیجئے مرد ؟؟
بیزار ہولیا عبداللہ کفروں حق لہیں اسلام
ایمان ہمیشہ بخش الٰہی کر توں فضل تمام
پچھ عبداللہ جوانی نالیں کیا کجھ میرا حال
جوہر خوبی تیری آہی کا نہ رہیا سال
جیوں گھن کھاہدی لکڑی ہئی تر کھانے وس
جوہر خوبی تیری آہی پیری کھڑیا کھس
باہجھوں فضل خدا دے ناہیں کیتا عبدی صحیح
ایہہ سر خود نفسے خبرا کہندا ہورس باب نہ کہی

اس قسم کی سلیس اور رواں زبان کے ساتھ ساتھ وہ اخلاق کا ایسا سبق دیتا ہے جس کا سر چشمہ قرآن حکیم ، فقہ اور حدیث کو متاثر کرتا رہتا ہے ۔

شاہ شرف بٹالوی (۱۶۵۹ء - ۱۷۲۵ء)

شرف نام اور یہی تخلص کرتے تھے ، آپ کے بزرگ ہندو مذہب کے پیروکار تھے ۔ ان کے دادا جو بٹالہ ہی کے رہنے والے تھے اور وہیں قانون گو کے عہدہ پر فائز تھے ، دین اسلام کے مذہبی حقائق سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے ۔ شاہ شرف کے نام کے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ 'عمدۃ التواریخ' مولفہ سوہن لال سوری میں شیخ شرف 'خزینتہ الاصفیا' مولفہ مفتی غلام سرور میں ، شاہ شرف لاہوری ، اور 'پنجابی ادب دی مختصر تاریخ' مولفہ موہن سنگھ دیوانہ میں ، شیخ شاہ شرف بتایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا صحیح نام کسی کو معلوم نہیں ۔ شاہ شرف ان کا خطاب ہے جو ان کو شیخ محمد فاضل شاہ قادری نے دیا تھا ۔

شاہ شرف بچپن سے ہی بڑے خاموش طبع اور متفکر واقعہ ہوئے تھے ۔ اس لیے اسلامی ماحول اور دینی تعلیم نے انہیں اور زیادہ علم دوست اور صوفیانہ اقدار کا والہ و شیدا بنا دیا ۔ چنانچہ اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی میں ، گھر میں ناراضگی کے سبب ترک دینا کا ارادہ کر کے گھر کو خیر باد کہا اور لاہور کا رخ کیا ۔ یہاں پہنچ کر شیخ محمد فاضل قادری شطاری سے بیعت کی ۔

شیخ صاحب نے محنت اور توجہ سے روحانی جلا دے کر صوفیہ کے حلقہ میں داخل کر کے شاہ شرف کا خطاب دیا ۔ چنانچہ سلسلہ سلوک ہی کے تاثر نے ان کی طبع کا رخ شعر و ادب کی طرف موڑا اور وہ اپنے سلسلہ کے بزرگ صوفی شاعر بلھے شاہ کی تقلید میں صنف کافی میں اپنے تاثرات کا اظہار کرنے لگے ۔ نمونہ دیکھیے :

کافی

رہ وے اڑ رہ وے اڑیا
ایتھے بولن دی نہیں جا وے اڑیا
جو بولے سو ماریے منصور جویں
کوئی بجھدا نہیں وے اڑیا
جے تیں من دا راہ پچھاتا
دم نہ مار وے رہیں چپاتا
جو دیوے شہ سہہ وے اڑیا
قدم نہ پاچھے دیویں حالوں
توڑے سر دکھ کیجے دھڑ نالوں

تاں بھی حال نہ کھو وے اڑیا
جانجی مانجی مڑ گھر آئے
مجلس وڑیا شوہ وے اڑیا
رہ وے اڑیا رہ وے اڑیا
شاہ شرف اہ بات بتائی
کرم دا لکھیا ملیا بھائی
کہ شکرانہ بہہ وے اڑیا

کافیوں کے علاوہ ان کی ایک طویل نظم 'ستر نامہ' بھی ہے جس میں شتر کے لفظی نمایہ سے نفسانیت ، اس کی حرص و آز اور قباحت کا مداوا اور منازلِ معرفت و توحید کی نشاندہی کی گئی ہے ۔ ایک بند ملاحظہ کریں :

جے کر شتر قبول نہ کردا ستے روز ازل
واقف رمز نہ ہندا مڑ کے عشق حمبل نہ پاندا گل
شوق نکیل الف وچ بینی سیس سجود جھکاندا دل
عشق مراد مہار ہجر دی پکڑ لئی جاوے جتول
سالک تیر چلاون محکم نال ارادت چین مزل
دیوے قدم نہ مڑے پچھاہاں مستی تھیں نہیں کرے عمل
بھارے بھار سنگار کراوے پیڑ پلان دھرے مخمل
سغل پہاڑ سفر دے سرتے ریگ جاڑیں رود جبل
زانو مار بہے جھک نیواں ہر دم وحدت وچ عمل
چڑھ محبوب کجاوے بہندا مکے جویں خطیب عدل
دل دا خون پلاون عاشق لا نہ ذکر کرن دا چھل
اوہ کیوں کرے ہواز مستی چکدا چندن ہور صندل
وچ چھوہے اجاڑاں باراں وچ وسدیاں مار و تھل
ہر جتول چھکے شرف مہاران ہر جا وسدا یار مثل

احمد گوجر (ز - ۱۶۹۲ء)

احمد نام اور یہی تخلص بھی تھا ذیل کا ایک مصرعہ جو وہ اپنے ادبی شاہکار ہیر کی تکمیل کے متعلق کہ وہ کس سن اور کس دور میں لکھی گئی ۔ لکھتا ہے :

"سن چار (۴) تے تیھہ (۳۰) اورنگ شاہی کتھا ہیر تے رانجھے دی ہوئی پوری،
ترجمہ : اورنگ زیب عالمگیر کی تخت نشینی کو ۳۴ سال گزرے ہیں کہ داستان 'ہیر و رانجھا' مکمل ہوئی ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر ۱۶۵۸ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ چنانچہ ۵۸ میں ۳۴ سال کا عرصہ جمع کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ احمد نے 'ہیر' کی تکمیل ۱۶۹۲ء میں کی تھی۔

شاعر دمودر جس طرح پہلا پنجابی شاعر ہے جس نے چو مصرعوں کی صنفِ ادب میں اپنی 'ہیر' لکھی ہے ، احمد اسی طرح پہلا پنجابی شاعر ہے جس نے طویل سرخیوں کے ساتھ 'ہیر رانجھا' کی داستان تحریر کی اس کے کلام سے جدت نگاری اور زبان سے سحر نگاری کا پتہ چلتا ہے۔

احمد نے اپنی طرزِ تحریر میں فکر سے کام لیا ہے کہ یہ داستان حسن و عشق کا ایک غیر فانی ادبی مرقع بن گئی ہے۔ مقبل اور سید وارث شاہ جو دونوں احمد کے بعد بہ ترتیب آنے والے بڑے شاعر ہیں ، اور 'ہیر' کے مصنف بھی ہیں ، اپنی ادبی ، فکری اور طرزِ نگارش کی جامعیت کے باوجود احمد کے مقلد نظر آتے ہیں۔ یعنی احمد کی 'ہیر' ان دونوں کی نگاہ میں تھی۔ خصوصاً سید وارث کے ہاں تو نہ صرف لفظی اور فکری تقلید ہی دیکھنے میں آتی ہے ، بلکہ مکمل مصرعے احمد کی ہیر سے لیے ہوئے ثابت ہوتے ہیں اور کہیں کہیں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ احمد کی ہیر کی ایک سرخی کا بیشتر حصہ وارث شاہ کی ہیر میں موجود ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل سرخی میں یہ مماثلت ملاحظہ کریں :

احمد

تینوں کہے ننان توں سنیں ہیرے نواں شہر ساڈے جوگی آئیا ہے
تک سہیلیاں تے محراب متھے کل ہینکلا عجب بنایا ہے
اکھیں نال صاحب دے رتیاں نی متھے چمکدا نور سوایا ہے
درد نال پکاردا میل سائیاں کوئی مواتتوں یار ونجایا ہے

وارث

گھر آ ننان نے گل کیتی بھابھی اک جوگی نواں آئیائی
کنیں اوسدے روشنی منداں نی گل ہینکلا عجب سہائیائی
نیویں نظر پھردا وچ کھیڑیاں دے متھے چمکدا روپ سوائیائی ..

درد نال پکارا دا مبل سائیاں جائی یار کوئی اوس وکھایائی

مندرجہ بالا مثال کی طرح کئی ایک دیگر کرداروں میں بھی ایسی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ وارث نے احمد کی بندش اور طرزِ فکر سے استفادہ کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وارث نے اس قسم کی قلمی کاوش جہاں کہیں بھی کی ہے اسے احمد کے مقابلہ میں زیادہ رنگین اور جاذبِ نظر بنایا ہے، جو اس کی فکری عظمت، قادر الکلامی اور فصیح و بلیغ پیرائیہ کا قدرتی تقاضا ہے۔

احمد کے تذکرہ نگار ہیر کے علاوہ اس کی کسی اور تصنیف کا ذکر نہیں کرتے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی یہی ایک تصنیف یادگارِ زمانہ ہے۔ ذیل میں کلام کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔ رانجھا جب جوگی کے لباس میں رنگپور پہنچ کر گداگری کے لیے ہیر کے سسرال والوں کے ہاں پہنچتا ہے تو ہیر کی نند جس کا نام سہتی تھا جوگی سے کچھ نوک جھونک کے بعد اس سے خفا ہوتی اور اپنی ایک سہیلی کی مدد سے رانجھے جوگی کو گھر سے باہر نکال دیتی ہے۔ صرف چار مصرعوں میں شاعر کی منظر کشی کا کمال ملاحظہ کریں:

سہتی سنے لونڈی سر گرم ہوئی زور راولے تے آن پائیونیں
وت نیوڑدں ضابطے کھت اٹھیاں وانگ ویریاں دھک چالائیو نیں
دھکے دے دے وڑدوں کڈھیونیں نے دروازے سب لگا ئیو نیں
گھروں کڈھ کے فیر گھر آن وڑیاں بوہے نرت دے ناک چڑھائیو نیں

رانجھا جوگی اس گھر سے نکالے جانے کے بعد پریشانی کے عالم میں دل سے باتیں کرتا ہوا چلا جا رہا ہے:

گھروں کڈھیا بہت حیران ہوئیا سائیاں ایت گھر فیر میں کدوں وڑساں؟
مشہور ساں ہیر نوں لین آئیا، مڑیا سکھنا وطن کی نال کھڑساں
بانہہ کڈھ آئیا ایسا کم تائیں سوئی اٹکیا فیر کی بانہہ پھڑساں
پلے دام نہیں دیاں حاکماں نوں جتاں معاملہ چاؤنڑے جا چڑھساں
میری احمداشرم خدائے نوں ہے رب لائسی تاں کسے ڈھنگ اڑساں

خیال کی یہ بلندی، طرزِ فکر کا یہ پختہ انداز، اظہار مطالب سادہ اور آسان، اور ہیئت اور ساخت شعری کی باہمی مناسبت جیسے فنی کمالات احمد کے کلام کا لازوال سرمایہ ہیں جس سے کہ وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

محمد بخش نوروز (۱۶۵۸ء - ۱۷۰۷ء)

نام محمد بخش ، نوروز تخلص ۔ قصبہ مبارک پور علاقہ سابقہ ریاست بہاولپور کے رہنے والے تھے ۔ ملتانی پنجابی کے مشہور شاعر ہونے کی وجہ سے عوام و خاص میں قدر و منزلت سے دیکھے جاتے تھے ۔ تصانیف میں ایک دیوان ملتا ہے ۔ ڈیوڑھ اور کافی کی اصناف سخن میں لکھتے اور چھوٹی بڑی تمام بحور میں لکھنے کے مشاق ہیں ۔ متفرق علوم کے علاوہ علم عروض کے بھی طالب علم نظر آتے ہیں ۔ ذیل میں نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے ۔ ملتانی کے عظیم شاعر علی حیدر کی مخصوص بحر میں ایک پانچ کلیہ قطعہ دیکھئے ، اشعار میں سوز و تڑپ اور صوفیانہ جھلک ہے ۔ تشبیہات و استعارات زبان فارسی کے قواعد کے زیر اثر ہیں :

اک لوکاں دے تالگھوڑے بتیاں برہوں دی بھائیں بلیاں
سڑ گیا بدن سڑینڈا ہے سے سیک ہو اڑاں جھلیاں
یار نہ آن مہاینا اصلوں شہر ساڈے دیاں گلیاں
ویندیں منت کریندیں تھک گئیاں پیراں دیاں تلیاں
نوروز آنے سہاوے ہا ہک وار جوانیاں ڈھلیاں

(۲)

پئی باد شمال دی لڑھک لنگھ آون بدلے سُرک سُرک
اکھیاں ٹھکیاں ول ول پھرک پھرک لگے بدل گجن آئی ساون رت
اکوار صحن تے تھئی چک چک رل سئیاں ٹرن سب ڈھلک ڈھلک
مٹی دل کو سک تیں یار دی چھک کر سانگ ملن آئی ساون رت

مولوی محمد مسلم (۱۸۰۵ء - ۱۸۸۰ء)

حالات زندگی : مولوی محمد مسلم ۱۸۰۵ء میں میاں محمد عظیم قوم ارائیں ساکن لدھیانہ کے گھر پیدا ہوئے ۔ زمانہ کے رواج کے مطابق عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی اور پھر خود درس دینا شروع کر دیا ۔ متقی اور پرہیزگار انسان تھے ۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ کے لیے جالندھر کے قریب پنڈ گڑھا میں اقامت اختیار کی اور کچھ زمین خرید لی ۔ بعد میں جالندھر چلے آئے اور کتب فروش بن گئے ۔ آپ کی وفات ۱۸۸۰ء میں ہوئی ۔

تصنیفات : مولوی صاحب نے 'عجائب القصص' کے نام سے تصنیفات کا ایک سلسلہ

شروع کیا جس کی پہلی تصنیف 'گلزار آدم' ہے۔ باقی 'گلزار موسیٰ'، 'گلزار سکندری' اور 'گلزار ہدیٰ' ہیں ان کی دیگر تصنیفات 'تاثیر الصلوٰۃ' اور 'تقویۃ الاسلام' ہیں۔ 'تقویۃ الاسلام' ۱۸۷۷ء میں لکھی گئی۔ یہ آپ کی آخری کتاب ہے۔

آپ کی تصنیفات پر تبصرہ : جیسا کہ کتابوں کے ناموں سے ظاہر ہے ان تمام کا تعلق مذہب سے ہے۔ 'عجائب القصص' میں انہوں نے پیغمبروں کے حالات نظم کیے ہیں۔ 'گلزار آدم' میں صرف حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر ہی نہیں بلکہ حضرت شعیب[ؑ]، حضرت ادریس[ؑ]، حضرت نوح[ؑ]، حضرت ہود[ؑ]، حضرت صالح[ؑ] اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے حالات بھی ہیں۔ حضرت یوسف[ؑ] کا قصہ خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کتاب حضرت شعیب[ؑ] کے حالات پر ختم ہو جاتی ہے۔ کل پندرہ انبیاء کے حالات منظوم ہوئے ہیں اور ۵۹۸۰ اشعار ہیں۔ تاریخ تصنیف ۲۳ جولائی ۱۸۶۰ء ہے۔ مصنف کے بڑھاپے کے ایام تھے جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں :

ایہہ بڈھاپا آ گیا گئی جوانی سب — جان غنیمت زندگی جو دتی ہے رب
پنج دھاڑے عمر ہے رہندی گئی وہا — ڈر کے تینوں خالقوں آیا نہیں حیا

اس سلسلہ کی باقی کتابیں ایک ایک پیغمبر سے تعلق رکھتی ہیں۔ گلزار ہدیٰ' میں مصنف نے اپنی عقیدت و محبت کا اچھی طرح اظہار کیا ہے۔ شبِ معراج کے حالات لکھتے ہوئے جب مولوی صاحب سدرۃ المنتہیٰ سے آگے رفرف پر حضورؐ کے سفر کا ذکر کرتے ہیں تو بے ساختہ ان الفاظ میں حرکت کی اضافیت کی طرف بھی خفیف سا اشارہ کر جاتے ہیں :

اوہر اسدے قدم جان دہریا حضرت جا — ھک حرکت وچ لے گیا اوپر عرش اٹھا

باقی کتابیں دینی مسائل سے متعلق ہیں۔

اسلوب : مولوی صاحب پچپن سال کے تھے جب انہوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ سترہ سال اس شغل میں گزارے۔ اس وقت ان کے جذبات سرد پڑ چکے تھے۔ زہد و اتقاء کے طویل سالوں نے تخیل کی جولانی بھی ختم کر دی تھی۔ اس لیے ان کے اسلوب میں نہ تو جذبات پروری ہے اور نہ ہی خیال انگیزی۔ واقعات کو سیدھے سادے انداز میں نظم کرتے چلے جاتے ہیں۔ البتہ ذہن صاف ہے اور زبان پر کافی عبور حاصل ہے۔ اس لیے مولوی صاحب جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بڑی وضاحت اور قادرالکلامی کے ساتھ کہہ دیتے ہیں۔ اور چونکہ آپ ایک مخلص دیندار بزرگ تھے

آپ کے کلام میں خلوص اور چاشنی موجود ہے۔ آپ کے سامنے ہر وقت دینی تقاضے رہتے تھے اس لیے آپ کے پند و نصائح کا تعلق سراسر دینی زندگی سے ہے۔ معاشرتی، اقتصادی یا سیاسی حالات کی طرف آپ متوجہ نہیں ہوتے۔ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا ذکر کرتے ہیں لیکن غور فرمائیے جذبات کی نسبت واقعات کی طرف زیادہ توجہ ہے:

پیا مدینے غلغلہ پائی نبی وفات — دنیا فانی چھڈ کے پیتی آب حیات
رووں حرم رسول دے گھر گھر پئی کہا — رولدی بی بی فاطمہ[۴] تائیں صبر نہ آ
رولدے حسن حسین سی آوے نہ قرار — بہے سید پاک جید عالم دے سردار
خبر وفات رسول دی جان سندے اصحاب — مسجد اندر جمع سی ہو گئے بیتاب

مولوی صاحب کا یہ سارا شعری کارنامہ اس لیے قابل قدر ہے کہ آپ نے پنجابی زبان میں انبیاء علیہم السلام کے حالات سادہ اور پختہ اسلوب میں نظم کر دلیے ہیں اور اس طرح پنجابی ادب کے سرمایہ میں قیمتی اضافہ کیا ہے۔

حامد شاہ عباسی (پ - ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ)

قوم کے سید اور پنڈ چوغتہ پرگنہ پٹھانکوٹ ضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام سید عطاء اللہ اور دادا کا سید اعظم شاہ تھا۔ آبا و اجداد توران سے آئے تھے جیسا کہ خود کہتے ہیں:

وطن بزرگاں پچھلیاں ماءالنہر یقین — مول نہ وطن سہیڑیا اندر ہند زمین

معلوم ہوتا ہے برصغیر میں وارد ہونے کے بعد ان کے باپ دادا کسی خاص علاقہ میں بود و باش اختیار نہ کر سکے بلکہ تبلیغِ اسلام کی خاطر ادھر ادھر پھرتے رہے۔ آپ کی ولادت ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ میں ہوئی۔ ۱۸۰۵ء/۱۲۲۰ھ میں آپ زندہ تھے جب آپ نے 'ہیر حامد' تصنیف کی۔

تصنیفات: آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ سب سے پہلے آپ نے 'جنگ حامد' لکھی۔ اس میں امام حسین اور امام حنیف کے حالات نظم کیے گئے ہیں۔ تاریخی حقائق کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا۔ بیس سال کے تھے کہ اسے شروع کیا اور دس سال کے بعد ۱۷۷۷ء/۱۱۹۱ھ میں اسے مکمل کیا۔ یہ عوام کی خاطر لکھی گئی تھی۔ فرماتے ہیں:

ہیگی عربی فارسی خاصاں نوں مطلوب — عاماں لوکاں واسطے ہے پنجابی خوب

اس زمانے میں عربی فارسی کا رواج زیادہ تھا ۔ لیکن یہ زبانیں صرف خواص سیکھتے تھے ۔ اُردو کی طرف اعتنا کم تھی ۔ عوام کی زبان پنجابی تھی اور چونکہ اپنے باپ دادا کی طرح حامد شاہ بھی عوام میں تبلیغ کرنا چاہتے تھے آپ نے انھی کی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا ۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آپ ان کی زبان کو پنجابی کہتے ہیں ۔ ہندی یا ہندوی نہیں کہتے ۔

حامد صاحب کی دوسری تصنیف 'اخبار حامد' ہے جو ۱۷۸۲ء/۱۱۹۷ھ میں تصنیف ہوئی ۔ اس میں آپ نے دنیا کی تخلیق ، ولادت آدم ، دوزخ ، بہشت ، عذاب ، ثواب وغیرہ کا ذکر منظوم طور پر پیش کیا ہے ، اور معلومات زیادہ تر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی ہیں ۔

ان کے علاوہ آپ کی باقی تصنیفات 'گلزار حامد' ، 'تفسیر حامد' ، 'فقر نامہ جدید' ، 'احکام الصلوٰۃ' اور 'ہیر حامد' ہیں۔ ہیر حامد ۱۸۰۵ء/۱۲۲۰ھ میں تصنیف ہوئی ۔ انہوں نے اپنی ہیر لکھتے ہوئے دمودر ، مقبل اور احمد یار کو سامنے رکھا ہے اور اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا ہے ۔

حامد شاہ کا اسلوب : حامد شاہ فطرتاً شاعر تھے ۔ اگر وہ تبلیغی مقاصد سامنے نہ رکھتے اور دینی مباحث کی طرف زیادہ توجہ نہ دیتے تو ان کا یہ جوہر خوب چمکتا ۔ 'جنگ حامد' آپ کی پہلی تصنیف ہے ۔ بیس سال کی عمر میں شروع کی تھی ۔ سخن گوئی پر ابھی اتنی زیادہ قدرت حاصل نہیں ہوئی تھی ۔ اسی لیے اسلوب ہموار اور صاف نہیں ۔ لیکن آپ جوں جوں آگے بڑھتے ہیں شعر گوئی کا جوہر منجھتا چلا جاتا ہے ۔ جذبہ اور تخیل کا اثر نمایاں ہونے لگتا ہے ۔ مثلاً حضرت حسین[۴] اپنی شہادت کے روز جناب صغرا کے مکتوب کا جواب لکھتے ہیں تو حامد شاہ حضور کی طرف سے یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں :

ساتھی میرے کٹ گئے نالے شاہ عباس ۔ قاسم اکبر ٹر گئے میں بھی کھڑا اداس
اصغر نے بھی مرگ دا پیتا میٹھا شیر ۔ حلق اہدیوے چہ ماریا کھچ یزیدی تیر
گل حقیقت حال دی میتھوں لکھی نہ جا ۔ جگر قلم دا پھٹ گیا کاغذ مارے آہ

اس اختصار میں کس قدر اثر انگیزی ہے ۔ اس سے پہلے روز عاشورہ ہفتم کا ذکر کرتے ہوئے حضرت قاسم کی برات کا نقشہ یوں کھینچا ہے :

قاسم دا وچ کربلا ہویا اج ویاہ ‏ ‏ ‏ جانجی قاسم شیر دے دلسوزی تے آہ
ہے ہے تے دلگیریاں بے صبری آزار ‏ ‏ ‏ بے آرامی جنج سی آئی زور و زار
ظلم اتے خونریزیاں نعرے ہیبت ناک ‏ ‏ ‏ بے ترسی ، بے رحمیاں ، غم غضب دا ماک

یہ حقیقی شاعری ہے اور یہاں حامد شاہ انیس و دبیر کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ آپ نے انسانی جذبات کی بہتر طور پر عکاسی کی ہے۔ روز عاشورہ اول سے دہم تک ایک ایک روز کا بیان ہے اور ہر روز کے بیان سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم بتدریج ایک نہایت ہی الم انگیز سانحہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ درد انگیزی کے لحاظ سے عاشورہ کے اس بیان کی مثالیں کم ملیں گی۔

حامد شاہ کی ہیر کی طرف کم توجہ ہوئی ہے حالانکہ اس میں کئی لحاظ سے انفرادیت موجود ہے۔ ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ مختلف ٹکڑوں کی مختلف بحریں ہیں۔ اس میں ہیر وارث شاہ والی بحر بھی ہے اور یہ بحر بھی۔ (یہاں ہیر کی سہیلیوں اور طورے خان کی فوج کا مقابلہ ہو رہا ہے)۔

ایتھے چوڑیاں دی چھنکار میاں ‏ ‏ ‏ اوتھے زرہ سنجوہ جھنکار سی جی
ایتھے ہار آہا گل سار بھائی ‏ ‏ ‏ اوتھے لٹکدی گلیں تلوار سی جی
ایتھے چشم نگاہ دی مار میاں ‏ ‏ ‏ اوتھے کمر دے وچ کٹار سی جی

یہ بھی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔ زبان میں ہندی کی آمیزش کا لطف دیدنی ہے۔ 'ہیر حامد' میں دوہڑے بھی ہیں۔ ان میں بھی بڑی شیرینی ہے ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حامد شاہ معمولی درجے کے شاعر نہیں تھے۔ انہیں پنجابی کے صف اول کے شاعروں میں جگہ دینی چاہیے۔

باب چہارم

(فصل اول)

تصوف اور صوفی شعراء

حقیقت کو پہچاننے کے دو طریقے ہیں ، ایک کسبی اور دوسرا وہبی - کسبی طریقہ قوتِ مُدرکہ یعنی عقل و علم کا راستہ اختیار کرتا ہے اور وہبی ذریعہ حقیقت تک انسان کو براہ راست لے جاتا ہے - مگر ان دونوں میں بہت فرق ہے - عقل میں استدلال کارفرما ہے اور شک و شبہ کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ عقل اصل حقیقت تک پہنچنے سے قاصر ہوتی ہے مگر عشق وہ وہبی جذبہ ہے جو تمام حدود کوپھلانگ کر محض تعلقِ قلب اور ارتفاعِ نفس کے ذریعے حقیقت الحقائق تک پہنچ جاتا ہے - عالم لوگ عقل و علم کو مشعل راہ بناتے ہیں مگر صوفی عشقِ حقیقی کے طالب ہونے کی وجہ سے ظواہر کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے - عقل شواہد سے بحث کرتی ہے اور عشق ماورائی کیفیات کو احاطہ کرنے کی لگن میں مصروف رہتا ہے - یہی کشمکش شریعت اور طریقت کو دوراہا بنا دیتی ہے اگرچہ دونوں ایک ہی ذات کی طلب کے دو رُخ ہیں - صوفی شعراء عشق الٰہی کو اپنی زندگی کا مقصد و منتہا مانتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی رضا جوئی کو اپنی عبادت کا ماحصل تصور کرتے ہیں -

امید ہے مذکورہ بالا چند سطور کے مطالعہ سے حقیقتِ تصوّف سے مجمل سی آگاہی حاصل ہو گئی ہوگی - دراصل اس مقالہ میں پنجاب کے صوفی شعراء حضرت لال حسین ، حضرت سلطان باہو ، حضرت بلھے شاہ ، علی حیدر ، ہاشم شاہ اور حضرت غلام فرید کا تعارف کرانا مقصود ہے - ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس خطّے میں ایسے بلند مشرب صوفی پیدا ہوئے ہیں جنہیں دنیا کے صوفیائے کبار کے درمیان بڑا قابلِ قدر مقام حاصل ہے - ان کا ایک اور کارنامہ بڑا قابلِ تعریف ہے - انہوں نے پنجابی زبان کو وسیلۂ اظہار بنا کر ثابت کر دیا کہ اس زبان میں بھی افکارِ عالیہ بڑی عمدگی سے بیان کیے جا سکتے ہیں -

بڑے اختصار کے ساتھ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ فقر اور سلوک کے جذبات و افکار میں اشتراک کے باوجود یہ صوفی شعراء اپنی اپنی افتاد طبع کے مطابق مختلف شخصیتوں کے مالک تھے۔ لال حسین کی فطرت میں مسکنت تھی جس نے ذات الٰہی کے سامنے سپردگی کی جو صورت اختیار کی وہ دوسرے صوفی شعراء میں نظر نہیں آتی۔ لال حسین، بلھے شاہ، سلطان باہو اور غلام فرید چاروں انجام کار 'رانجھا' ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ فنا فی اللہ اور بقا باللہ کا مقام ہے۔ یہاں بظاہر یکسانیت ہو سکتی تھی' لیکن اس مقام پر بھی اختلاف موجود ہے۔ لال حسین کے وصال میں بے حد خلوص اور انکساری ہے تو بلّھے شاہ کا وصال رفاقت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور وہ ایک بے تکلف دوست کی طرح ذات مطلق سے مکالمت کرتے ہیں۔ ادہر سلطان باہو کے ہاں اس مقام پر فعّالیت زیادہ نظر آتی ہے۔ خواجہ غلام فرید کے ہاں بھی فعّالیت ہے مگر اس کے ساتھ تمکنت اور وقار کے عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک تجلّی کا تعلق ہے، معلوم ہوتا ہے وہ حضرت سلطان باہو اور بلّھے شاہ کے حصے میں آئی ہے۔ لال حسین میں جذب و مستی ہے۔ سلطان باہو عالم وجد میں رہتے ہیں اور بلّھے شاہ میں عرفان کی سائی دکھائی دیتی ہے۔

محبت کا جذبہ ان تمام میں موجود ہے۔ ہستئ الہٰ' میں شمولیت پر مسرت تمام کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ پھر انی اپنی افتاد طبع کے مطابق چاروں امام غزالی کی طرح خلّاقیت کے مرحلے پر بھی جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ یعنی از سر نو تخلیق معاشرہ ان کا مقصود زندگی بن جاتا ہے۔ اس طرح تصوّف کا کردار محض قبول کرنے والے کا نہیں رہتا بلکہ اپنے ہاتھ سے کچھ دینے والے کا ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، تصوّف زندگی کا ایک فعّال اصول بن جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے معاشرہ میں ایک نئی حرکت، ایک نئے جذبۂ عمل اور ایک صالح نصب العین کے حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ تہذیب و تمدّن میں ترقی ہوتی ہے اور انسان بہتر قسم کی اجتماعی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ تصوّف اسلامی کے تمام خانوادوں کی تاریخ ہمیں اس سلسلہ میں کافی اور وافی ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔

شاہ حسین لاہوری (۱۵۳۹ء - ۱۵۹۹ء)

حالات زندگی: شاہ حسین ۱۵۳۹ عیسوی میں پیدا ہوئے جبکہ مغل شہنشاہ ہمایوں کا زمانہ تھا۔ ان کے والد کا نام شیخ عثمان تھا۔ یہ نو مسلم شیخ تھے۔ ان کے جدّ اعلیٰ کلجس رائے نے فیروز شاہ تغلق کے عہد (۱۳۵۱ء - ۱۳۸۸ء) میں اسلام قبول

کیا تھا - قوم کے جولاہے[1] تھے - والدین لاہور کے ٹکسالی دروازہ کے اندر رہتے تھے - اس کے باہر دریائے راوی کے قریب ایک مسجد میں مولوی ابوبکر (ساکن بگہ نزد بھیرہ) قرآن مجید حفظ کرایا کرتے تھے - چنانچہ دس سال کی عمر میں شاہ حسین نے بھی ان سے قرآن مجید حفظ کر لیا - اس اثنا میں چنیوٹ ضلع جھنگ کے ایک قادری بزرگ شیخ بہلول لاہور آئے اور شاہ حسین ان کے مرید ہو گئے - شیخ بہلول واپس گئے تو انہیں حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر باقاعدہ حاضری دینے کی تاکید کرتے گئے - اس لیے لگاتار بارہ سال شاہ حسین ہر روز وہاں حاضر ہوتے رہے اور عبادات میں بھی مصروف رہے - رات کو دریائے راوی میں کھڑے ہو کر تلاوت قرآن کرنا ان کا معمول تھا -

چھتیس سال کی عمر میں ایک فاضل بزرگ شیخ سعداللہ سے 'تفسیر مدارک' سبقاً پڑھنے لگے اور کوئی ایسا جذبہ طاری ہوا کہ ملامتیہ طریقہ اختیار کر لیا - شیخ بہلول نے سنا تو لاہور آئے اور شاہ حسین سے دریافت کیا مگر پتہ چلا کہ ان کا مرید جذب و سلوک میں بہت آگے نکل چکا ہے - اس لیے مطمئن ہو کر واپس چلے گئے - شاہ حسین کو ایک برہمن لڑکے مادھو لال سے محبت بھی ہو گئی - وہ بھی ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر انہی کا ہو گیا - یہ محبتِ الٰہی میں اپنی کافیاں گاتے - جذب کے عالم میں رقص کرتے اور بھنگ کا نشہ استعمال کرتے تھے - ہزاروں لوگ ان کے فقر کے معتقد تھے جلال الدین اکبر کے کانوں تک بھی ان کے حالات پہنچے - شاہزادہ سلیم نے ایک شخص بہار خان منشی مقرر کیا ہوا تھا جو شاہ حسین کی خدمت میں رہ کر ان کے ملفوظات لکھتا اور روزنامچہ کی صورت میں شاہزادہ کے پاس بھیجا کرتا تھا - 'تحقیقاتِ چشتی' کا مصنف لکھتا ہے کہ بہار خان نے 'بہاریہ' کے نام سے شاہ حسین کے حالات پر مشتمل ایک کتاب

---

۱ - شاہ حسین اپنی ذات کے متعلق کہتے ہیں ''نالئوں حسینا تے ذات جلاہا گالیاں دیندیاں تانے والیاں'' ان کا یہ مصرعہ بلکہ ان کا سارا کلام ظاہر کرتا ہے کہ جلاہوں کی ایک لمبی چوڑی برادری سے ان کا تعلق تھا - ان کا ایک اور مصرعہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ نیچی جاتی سے تھے ! سبھے جاتی وڈی ' نیانی فقیراں دی ذات - نیچی جاتی کے ہندوؤں کا سلاطین دہلی کے زمانے میں قبول اسلام ایک تاریخی حقیقت ہے - شاہ حسین کے آباواجداد کے سلسلہ میں بھی یہی بات صحیح نظر آتی ہے - وہ نیچی جاتی کے افراد تھے اور فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں مسلمان ہوگئے تھے - اونچی جاتی کے ہندوؤں کا پاندگی پیشہ اختیار کرنا قرین قیاس نہیں - اس لیے شاہ حسین کو کالستھ ہندو یا ڈاڈھی راجپوت کہنا درست نظر نہیں آتا - شاہ حسین کے ایک ایک لفظ سے مسکینی ظاہر ہوتی ہے - کہیں بھی انہوں نے اپنی اعلی نسبی کا ذکر نہیں کیا - مگر اس سے انکی شخصی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا - عجزو مسکنت اور ان کی سپردگی انہیں وہ مقام عطا کرتی ہے جو اہل فقر کے لیے باعث رشک ہے اور ان کے کلام کو تازگی اور جاذبیت عطا کرتی ہے - -

لکھی ۔ شاہ صاحب ۱۵۹۹ء میں، جب کہ ان کی عمر ساٹھ [1] سال تھی فوت ہوئے۔ پہلے ان کی تدفین شاہدرہ میں ہوئی؛ لیکن جب ان کی پیشن گوئی کے مطابق دریائے راوی میں سیلاب آیا تو ان کی میت کو باہو پورہ (باغبان پورہ) میں دفن کیا گیا ، جہاں اب بھی ان کا مقبرہ موجود ہے ساتھ مادھو لال کی بھی قبر ہے اور ہر سال وہاں ان کے عرس کے موقعہ پر میلہ لگتا ہے۔

کلام شاہ حسین : شاہ حسین کا کلام کافیوں کی صورت میں ہے۔ اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ ان کافیوں کو کب مرتب کیا گیا ۔ ان کے ایک مخطوطے کا ذکر بھی سننے میں آتا ہے ۔ انہیں کئی بار چھاپا جا چکا ہے اور حال ہی [2] میں مجلس شاہ حسین لاہور نے "۱۶۵" کافیوں کا مجموعہ نقوش پریس لاہور سے مارچ ۱۹۶۶ء میں شائع کرایا ہے۔ اس میں شاہ حسین کا وہ تمام کلام شامل ہے؛ جو اب تک دستیاب ہو سکا ہے۔

کافیوں کی زبان : سادہ ، عام فہم پنجابی زبان کا اس سے بہتر نمونہ شاید ہی کوئی ہو گا ۔ الفاظ زیادہ تر گھریلو زندگی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ان میں عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ اپنی صحیح صورت میں دس سے بیس فی صد تک موجود ہیں اور اس قدر عام فہم ہیں کہ پڑھنے والوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان زبانوں کے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محمود غزنوی کی آمد (۱۰۰۱ء) سے لے کر شاہ حسین کی ولادت (۱۵۳۹ء) تک ، ۵۳۸ ، سال کے عرصہ میں پنجابی زبان عربی اور فارسی زبان کے شامل ہونے سے ایک نئی شکل اختیار کر چکی تھی ۔ شاہ حسین نے عربی فارسی کے بگڑے ہوئے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں ۔ مثلاً مہانی (معانی) مالم (معلوم) ، البت (البتہ) وغیرہ ۔ ان زبانوں سے نئے الفاظ بھی بنائے ہیں مثلاً بخشنہارا ، گمانیا (مغرور) ۔ الفاظ کو جدید معانی میں بھی استعمال کیا گیا ہے ، مثلاً لازم بمعنی شرمندہ ۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ شاہ حسین کا معاشرہ عربی فارسی کے الفاظ پنجابی زبان میں ان چار صورتوں میں استعمال کر رہا تھا ۔ ان کے علاوہ ان کے کلام میں ہندی اور لہندی کے الفاظ بھی ہیں ۔ جہاں تک مروّجہ ضرب الامثال کا تعلق ہے شاہ حسین نے بہت سی استعمال کی ہیں اور چونکہ ان کے کلام میں بیساختگی پائی جاتی ہے اس لیے ان کے اپنے بہت سے فقرے ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ مثلاً :

جگ وچ جیوّن تھوڑا کون کرے جنجال ۔ جت تن لگے سو تن جانے ہور گلاں کرن سکھالیاں ۔
جے تیں اپنا آپ پچھاتا سائیں دا ملن اسان ۔

---

(۱) یہ عمر شمسی تقویم کے مطابق ہے ۔ قمری حساب سے تریسٹھ سال (۱۰۰۸ء - ۹۴۵ھ)

(۲) مارچ ۱۹۶۲ء میں مکتبہ پنج دریا لاہور کی طرف سے کافیاں شاہ حسین بمعہ فرہنگ و شرح شائع ہوئی ہیں ۔ تعداد ۱۶۹ ہے ۔ قابل قدر چیز استعاروں کا مفہوم ہے ۔

کافیوں کا اسلوب : شاہ حسین صاحبِ حال صوفی تھے ۔ ان کی جو کیفیات ہوتی تھیں سادہ الفاظ میں بیان کر دیتے تھے ۔ اپنے کلام میں انہوں نے تکلف داخل ہونے ہی نہیں دیا ۔ لیکن ایک تو ان کی قوتِ مشاہدہ تیز تھی ۔ دوسرے حافظِ قرآن تھے اور تفسیر اور تصوف کا مطالعہ کیا ہوا تھا ۔ تیسرے انہوں نے فقر کی بڑی منزلیں طے کی تھیں ۔ اس لیے ان کے سادہ الفاظ میں بھی گہرے معانی پائے جاتے ہیں ۔ اور ان کی کافیوں کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عامیانہ الفاظ بھی علامات بن چکے ہیں ۔ مثلاً چرخہ سے وہ اپنا وجود مراد لیتے ہیں ۔ تانے بانے سے تعلق باللہ ۔ وپاری سے ملک الموت ۔ بابل آلگن سے پیاری محبوب دنیا ۔ ساہورا گھر سے اگلی دنیا ۔ سالو سے مقام قرب و رضا وغیرہ وغیرہ ۔ ان کی مثالیں اور استعارے وہ ہیں جو لاہور کے قرب و جوار سے متعلق ہیں اور مرئی اور مجسم ہیں ، مثلاً گڈی (پتنگ) ، بوھڑ (بڑ کا درخت) بھور (بھونرا) اس کا مطلب یہ ہے کہ تخیل سے کام لیتے ہوئے بھی ان کے قدم زمین پر قائم رہے ہیں ۔ اسی لیے وہ واضح تصورات پیش کرتے ہیں اور پھر ان کی کافیاں مختلف راگوں سے تعلق رکھتی ہیں ، جنہیں آسانی سے گایا جا سکتا ہے ۔

مؤنث کی حیثیت سے خطاب : کافیوں میں شاہ حسین اپنے آپ کو مؤنث کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اس لیے ان میں بڑا رچاؤ اور گداز ہے ۔ خیال پیدا ہوتا ہے کہ عورت کے متعلق ہندوؤں کے کلاسیکی عہد میں سمرتی وغیرہ کتب کی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ یہاں عشقیہ شاعری میں محبوب کو مذکّر کے طور پر پیش کیا جانے لگا ۔ سپردگی ، وفاداری اور قربانی مثالی[1] بیوی کی صفات شمار ہوتی تھیں ۔ ستی انہی صفات کا اظہار تھا ۔ سینکڑوں سالوں تک یہ تعلیمات جاری رہیں اور معاشرے کے افکار و احساسات میں پوری طرح سرایت کر گئیں ۔ جہاں خاوند دیوتا ہو اور بیوی داسی ، وہاں شاعری میں عجز و انکسار ، دلگیری و درماندگی ، محبت و خلوص ، وفاداری اور تحویلِ کامل کے اظہار کے لیے اپنے آپ کو مؤنث سمجھنا اور محبوب کو جس سے مراد اکثر و بیشتر دیوتا ، اوتار یا خدا ہوتا تھا ، مذکر قرار دینا قدرتی امر تھا ۔ شاہ حسین کا یہ انداز انہی پرانی روایات کا نتیجہ نظر آتا ہے ۔

شاہ حسین کا فقر : ان کا فقر کی طرف میلان فطری تھا ۔ شروع ہی سے باقاعدگی اور ذوق و شوق کے ساتھ عبادتِ الٰہی کیا کرتے تھے ۔ انہیں ذاتِ حقہ کی تلاش تھی ۔ کہتے ہیں :

دل میرے وچ ایہو گزری میں سچے سو نیہوں لائیں

چھتیس سال کی عمر میں جب تفسیر کا درس لیا کرتے تھے انہیں ایک روز اچانک

---

(۱) اس کے لیے دیکھئے Maujamdar , R.C., The Classical Age pp, 568—571

محسوس ہوا کہ جس چیز کی انہیں طلب تھی وہ انہیں مل گئی ۔ سب کچھ بھلا کر اسی کے خیال میں مگن ہو گئے ۔ لیکن نظر آتا ہے کچھ عرصہ تک جو جلوہ انہیں مقصود تھا اس کا نظارہ عام نہیں ہوتا تھا ، اس لیے درد سے بھری ہوئی کافیاں لکھتے تھے ۔ ان میں تلاش کا جذبہ نمایاں ہے ۔ "نی سیو مینوں ڈھول ملے تاں جاپے ، جنگل بیلے پھراں ڈھوڈیندی اجے نہ پایو لال،، ان ایام کی شاعری میں بیحد عجز و نیاز اور درماندگی ہے ۔ خدا کو مختلف ناموں سے مخاطب کرتے ہیں ۔ سائیں ، صاحب ، پیاریا ، ساجن ، سالول ، رانجھن وغیرہ ۔ مختلف طریقوں سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں ۔ لیکن بالآخر انہیں وصال نصیب ہو گیا اور وہ طالب سے مطلوب بن گئے :

تسیں رل مل دیہو مبارکھاں میرا سوہنا سجن گھر آیا ای
رانجھن رانجھن منوں سب کوئی آکھو ہیر نہ آکھو کوئی

جب وہ فقر کی اس منزل پر پہنچے تو انہوں نے بڑے زور شور سے لوگوں کو اس راستے کی طرف بلانا شروع کیا ، جو خود ان کے لیے سعادت کا موجب بنا تھا ۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا " زندگی بڑی قیمتی چیز ہے ۔ اسے ضائع نہ کرو ۔ موت کا آنا یقینی ہے ۔ ایسا نہ ہو کہ موت آجائے اور تمہیں کفِ افسوس ملنا پڑے "۔ ان کی کافیوں میں موت کا بار بار ذکر ہے ۔ نیک اعمال کی بھی بڑی تلقین ہے اور وقت کے ضیاع پر اظہارِ افسوس بھی بڑا شدید ہے ۔ جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے وہ حلیمی اور نرمی کا درس دیتے ہیں ۔

ان کے فقر کی فکری حیثیت : ملامتیہ فرقے سے تعلق رکھنے کے باوجود شاہ حسین کے فقر کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر ہے ۔ معلوم ہوتا ہے ان کی اس روش کا تعلق بھی آیہ کریمہ **ولا یخافون لومة لائم** (اور وہ ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے) سے ہے ۔ ان کے بہت سے مصرعے ایسے ہیں جو آیاتِ قرانی یا احادیث اور عربی کے مقولوں کا ترجمہ نظر آتے ہیں ۔ مثلاً ' جیوندیاں مر رہئے وو ، **موتوا قبل ان تموتوا** کا ترجمہ ہے ۔ اور 'کہے حسین سہاگن سائی جوشوہ کے رنگ رنگی' ، میں اس آیہ قرآنی کا معنی موجود ہے ۔ 'ومن احسن من اللہ صبغۃ' اور اللہ کے رنگ سے کونسا بہتر ہے ۔ ایک جگہ شاہ حسین کہتے ہیں ۔ موڈھے تیرے دوئین جنے لکھدے نے عیب ثواب ، یہ کراماً کاتبین کا تصور ہے جو خالص اسلامی ہے ۔

اسی طرح اگرچہ قربِ الہی حاصل کرنے کے بعد وہ مقامِ اتحاد کا بھی دو ایک

---

(۱) اس ضمن میں شاہ حسین کے دو مصرعے پڑھیے :

ع جس ساجن دا تسیں دیہو میہناتس ساجن دی میں گولی
ع اک سنیندا ، لکھ سنے ، برا کیہہ کریگا کوئی

جگہوں پر ذکر کرتے ہیں۔ لیکن ان کے افکار تصوّف زیادہ تر توحید، خوف و رجا انس و محبت، شوق اور رضا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ افکار وہی ہیں جو ابتدائی مسلمان صوفیوں کے تھے۔ حضرت بایزید بسطامی (م-۸۷۵ء) حضرت منصورحلاّج (م-۹۲۲ء) اور ابن العربی (م - ۱۲۴۰ء) سے ان کا تعلق بہت کم ہے ۔ عشاق میں سے شاہ حسین نے صرف رانجھے[1] کا نام لیا ہے۔ وہ اپنے پیر کے علاوہ کسی اور صوفی کا ذکر نہیں کرتے اور اس طرح فکری سطح پر بھی اذہان کو وہ اپنے ماحول کے اندر رکھتے ہیں ۔

حضرت سلطان باہو (م ۔ ۱۶۹۱ء)

آپ اس برصغیر کے ایک ممتاز صوفی ہیں ۔ اعوان قوم کے فرد تھے ۔ آبا و اجداد علاقہ سون سکیسر ضلع سرگودھا سے تعلق رکھتے تھے ۔ آپ کی ولادت شورکوٹ ضلع جھنگ کے قریب قلعہ قعرگان کے گاؤں میں ہوئی، جہاں آپ کے والد ماجد بایزید محمد رہا کرتے تھے ۔ متشرع بزرگ تھے ۔ مسائل فقہ پر حاوی تھے ۔ غالباً اسی بنا پر مغلوں کے منصبدار تھے ۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام راستی تھا ۔ حضرت باہو کے اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ بڑی نیک فطرت خاتون تھیں :

رحمت حق بر روان راستی راستی با راستی آراستی

ان کی والدہ نے ہی انہیں راست روی سکھائی اور انہی کے فرمان کی تعمیل کرتے ہوئے شورکوٹ کے جنوب کی طرف گڑھ بغداد[2] میں ایک بزرگ حبیب اللہ قادری کے پاس روحانی تربیت کے لیے گئے ۔ اس کے بعد آپ نے حجرہ شاہ مقیم کے حضرت عبدالقادر اور صوفی عبدالرحمٰن دہلوی سے روحانی فیض حاصل کیا ۔ آپ بہت سے اور بزرگوں کے پاس بھی اس غرض کے لیے آتے جاتے رہے ۔ ملتان میں حضرت بہاء الحق کے مزار پر چلہ کشی بھی کی ۔ آپ کی ظاہری تعلیم بہت کم تھی ۔ لیکن آپ کی تصنیفات

---

(۱) ڈاکٹر لاجونتی نے قوالوں کی زبانی ایک کافی سنی جس میں سہینوال کا لفظ تھا (Punjabi Sufi poets, p. 22) انہوں نے خود تسلیم کیا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے مخطوطے میں یہ کافی سہینوال کا لفظ نہیں رکھتی ۔ یہ کافی نمبر ۱۰۵ ہے جو مجلس شاہ حسین کے مجموعہ کافیاں شاہ حسین کے صفحہ ۷۵ پر موجود ہے ۔ اور جس مصرعے میں ڈاکٹر لاجونتی نے لفظ سہینوال سنا وہ یوں درج ہے ع جنگل بیلے پھراں ڈھونڈیندی اجے نہ پایو لال معلوم ہوتا ہے قوالوں نے 'اجے نہ پایو لال' کی بجائے 'اجے نہ آیا سہینوال' کہنا شروع کر دیا ۔

(۲) یہ گاؤں مدت سے اولیاء اللہ کا مسکن ہونے کی وجہ سے مشہور چلا آرہا ہے ۔ آج کل بھی وہاں کے ایک نیک باطن مبلغ اسلام پیر مبارک شاہ ہیں ۔

سے پتہ چلتا ہے کہ عربی اور فارسی میں آپ قابل قدر استعداد رکھتے تھے ۔ علمِ باطنی نے البتہ علوم کے دروازے آپ پر کھول دیے تھے ۔ خود لکھتے ہیں :

"این فقیر را علم ظاہری چندان نہ بود ۔ اما از واردات و
فتوحات علم باطنی چندان علوم کشاد کہ برائے اظہار آن
دفتر ہا باید ۔ اما بزرگان ماقلّ و دلّ فرمودہ اند :
اگرچہ نیست ما را علم ظاہر زعلم باطنی جان گشتہ طاہر

آپ کی چار بیویاں تھیں جن میں سے ایک ہندو عورت تھی ۔ جس نے اسلام قبول کرلیا تھا ۔ آٹھ بیٹے تھے ۔ آپ اکثر اپنا حال چھپانے کے لیے سیر و سیاحت پر نکل جاتے ۔ شکل و صورت اور لباس بالکل درویشانہ ہوتا ۔ خود شکنی کے لیے گدائی بھی کرتے ۔ فرماتے ہیں :

نفس را رسوا کنم من از گدا ہردرے قدمے زنم بہر خدا

کبھی کبھی کھیتی باڑی بھی کیا کرتے تھے ۔ بیل خرید کر کاشت کرتے اور فصل ابھی کچی ہوتی کہ بیلوں کو کھلا دیتے اور خود تنہا یا کسی اور درویش کے ساتھ سفر شروع کر دیتے اور نامعلوم مقامات پر استغراق کے عالم میں بیٹھے رہتے ۔ تیس سال آپ اپنے مطلوب کو ڈھونڈتے رہے اور جب مل گیا آپ 'طالب بیا ، طالب بیا' پکارتے رہے ۔ لیکن کوئی اولوالعزم طالب آپ کو نہ ملا ۔ ترک بدرجۂ کمال تھا ۔ آپ فرماتے تھے : دین و دنیا کا یک جا رہنا ناممکن ہے ۔ شرع کی پابندی کا بڑا اہتمام فرمایا کرتے تھے ۔ آپ کا طریقہ صحو اور شریعت کا ہے :

ہر مراتب از شریعت یافتم پیشوائے خود شریعت ساختم

ایک مرتبہ ماہ رمضان تھا اور آپ کارکہار ضلع جہلم کی ایک غار میں استغراق کی حالت میں رہے ۔ روزے قضا ہو گئے مگر بعد میں حتیٰ کہ نماز تراویح کی بھی قضا ادا کی ۔ آپ کا وصال تریسٹھ سال کی عمر میں یکم جمادی الثانی ۱۱۰۲ھ مطابق ۲ مارچ ۱۶۹۱ء بروز جمعرات ہوا ۔ فقر میں آپ کو سلطان العارفین کا مقام حاصل تھا ۔ آپ کے نام باہو کے ساتھ سلطان کا لفظ اسی لیے شامل کیا گیا ہے ۔ آپ کو پہلے قلعہ قہرگان کے اندر دفن کیا گیا لیکن ایک سال بعد جب دریائے چناب قبرستان کو بہا لے

---

(۱) اپنی قبر اور میت کے متعلق آپ کا یہ شعر معنی خیز ہے :

گم قبر ، گمنام بے نام و نشان جسم را باخود برم تا لامکان

فنا کے آپ اس حد تک قائل تھے اور ہوا بھی یہی ۔ دریا برد ہونے کے بعد موجودہ مزار کا بننا بڑا پراسرار ہے ۔

گیا آپ کا مزار موجودہ جگہ پر بنا ۔

آپ کی تصنیفات : ان کی تعداد ایک سو چالیس بیان کی جاتی ہے ۔ فقیر نور محمد کلاچوی (م ۔ ۱۹۶۰ء)[1] لکھتے ہیں کہ انہوں نے ان میں سے چھوٹی بڑی چالیس قلمی کتابیں اکٹھی کی تھیں ۔ یہ تمام عربی فارسی میں ہیں اور فقر و تصوف سے تعلق رکھتی ہیں ۔ ان کی زبان سلیس اور سادہ ہے ۔ ایک ایک لفظ میں مصنف کی روح کا جوش اور تیقن موجودہ ہے ۔ آپ کے ایک دیوان کا بھی ذکر کیا گیا ہے ۔

پنجابی ابیات : عربی فارسی کی محولہ بالا تصنیفات کے علاوہ آپ کے پنجابی زبان میں ابیات بھی ملتے ہیں جو سی حرفی کی صورت میں ہیں ۔ ہر حرف کے تحت بندوں کی تعداد برابر نہیں ۔ بعض حروف ایک بند پر ختم ہو جاتے ہیں ۔ بعض کے[2] متعدد بند ہیں اور بعض بالکل ترک کر دیے گئے ہیں ۔ ہر بند کے چار مصرعے ہیں مگر حرف 'ج' کا ایک بند پانچ مصرعے رکھتا ہے ۔ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی طے شدہ سکیم کے مطابق شاعری کی غرض سے یہ ابیات نہیں لکھے گئے بلکہ وقتاً فوقتاً اپنے تاثرات اور کیفیات بیان کرنے کے لیے کہے گئے تھے ۔ ان میں ابتدائی زمانہ کے ابیات بھی ہیں جب آپ تلاش حق میں سرگرداں تھے اور زمانۂ وصول کے بھی ۔بعض بند الحاقی[3] بھی ہیں ۔ 'انوارِ سلطانی' میں فقیر نور محمد کلاچوی نے ہر قسم کے کل ۱۱۴ بند دیے ہیں مگر مقبول الٰہی نے ۱۸۶ بند درج کیے ہیں اور دوسری طرف ان کا انگریزی نظم میں عمدہ ترجمہ بھی دیا ہے ۔

ابیات بلحاظ زبان و اسلوب : ابیات میں ضلع جھنگ کی پنجابی زبان استعمال ہوئی ہے ۔ عربی فارسی کے الفاظ بعض بندوں میں پچاس فیصد تک پہنچ جاتے ہیں ۔ بعض مقامات پر سلطان صاحب نے علمی اصطلاحات استعمال کی ہیں جن کا سمجھنا آج کل کے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی مشکل ہو جاتا ہے ۔ مگر بہت سے بند ایسی سادہ اور ٹھیٹ پنجابی زبان میں لکھے گئے ہیں کہ ان پڑھ پنجابی عوام بھی بآسانی سمجھ سکتے ہیں مثلاً :

ددھ تے دہی ہر کوئی رڑکے عاشق بھا رڑکیندے
تن چٹورا من مندھانی آہیں نال ہلیندے
دکھاں دا نیترا کڈھے لسکارے غماں دا پانی پیندے

---

(۱) نور محمد کلاچوی ۔ مخزن الاسرار ۔ ص ۱۹۲
(۲) مثلاً ج ، د ، ع ۔
(۳) انوارِ سلطانی ۔ ص ۵۸ ۔ اس صفحہ پر فقیر نور محمد کلاچوی تسلیم کرتے ہیں کہ بعض بند الحاقی ہیں ۔ فقیر صاحب جہاں سلطان صاحب کے بیحد معتقد ہیں وہاں تحقیق و جستجو کے بھی عادی ہیں ۔ غالباً یہ کالج کی تعلیم کا اثر ہے ۔

نام فقیر تنہاں دا باھو' جھڑے پڈاں توں مکھن کڈھیندے

اس بند میں جو تصویر کاری کی گئی ہے وہ بالکل دیہاتی زندگی سے تعلق رکھتی ہے - الفاظ بھی دیہاتیوں کے اپنے ہیں - اس طرح کے بند کافی تعداد میں ہیں اور جلد از بر ہو جاتے ہیں - ان میں تشبیہات اور استعارات بھی دیہات سے متعلق ہیں - لیکن بعض اوقات ان خصوصیات کے ساتھ جب جذبہ کی گرمی اور فکر کی گہرائی شامل ہو جاتی ہے تو بند بڑا بلند ہو جاتا ہے اور اسے بلاشبہ عالمی ادب کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے - مثلاً :

دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانڑے
وچ ہن بیڑے وچ ہن جھڑے وچ ملاح مہانڑے
چوداں طبق دلے دے اندر جتھے عشق تنبو وچ تانڑے
فاصل سٹ نصلات بھٹے جداں دل لگا ٹھکانڑے

لیکن سلطان صاحب ذاتِ مطلق کے پرستار ہیں جہاں اضافات ختم ہو جاتے ہیں - زمان و مکان ، موت و حیات اور کفر و اسلام کا قصہ باقی نہیں رہتا - عبد بھی معبود کے ساتھ مطلقیت میں شامل ہو جاتا ہے - سلطان صاحب کے فکر و فقر کی اس حیثیت کا اثر ان کے اسلوب پر بھی پڑا ہے - وہ جب اس کا ذکر کرتے ہیں اور علمی رنگ غالب رہتا ہے تو ان کے اسلوب میں اشکال پیدا ہو جاتا ہے - مثال کے طور پر یہ بند پڑھیے :

'موتوا' والی موت نہ ملسی جیں وچ عشق حیاتی
موت وصال تھیوسی ھکو جد اسم پڑھیوسی ذاتی
عین دے وچوں عین تھیوسی دور ہوئے قرباتی
ھودا ذکر ہمیش سڑیندا باہو دینہاں سکھ نہ راتی

اس کے باوجود اپنی فکر کو اس سطح پر رکھ کر جب سلطان صاحب معنوی باتیں استعارے کے ذریعے بیان کرتے ہیں ، تجسیم سے کام لے کر فکر کو مرئی رنگ دے دیتے ہیں - اور عوامی شعور کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں اس وقت ان کی شاعری فنی لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے اس کے لیے ان کے ابیات کا پہلا بند 'الف اللہ چنبے دی بوٹی میرے من وچ مرشد لائی' ملاحظہ ہو - اس کا ایک ایک لفظ سارے بند کی تشکیل میں مصروف نظر آتا ہے -

---

(۱) مقبول الٰہی - ابیات سلطان باھو (بمعہ ترجمہ انگریزی) مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء

اسی طرح لامکاں ، اپنی ذات اور دنیا کے تعلق کا ڈرامائی تاثر کے ساتھ بیان ذیل کے بند میں قابل دید ہے :

عشق چلایا طرف آسماناں عرشوں فرش اُٹکایا
رہ نی دنیا ٹھک نہیں ساڈوں ساڈا اگے جی گھبرایا
اسیں پردیسی ساڈا وطن دوراڈا اہویں کوڑا لالچ لایا
مر گئے جو مرنے تھیں پہلے تناں ہی رب نوں پایا

اسلوب کے اعتبار سے آپ کے ابیات میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے - آج آپ کے ہر مصرعہ کے اختتام پر لوگوں نے لفظ ہو بڑھا دیا ہے ، حالانکہ آپ نے اس ردیف کے بغیر شعر کہے تھے - اس کی وجہ سے ترنم بیشک مسحور کن ہو جاتا ہے اور جذبہ اور وارفتگی پیدا ہوتی ہے ، لیکن جس صورت میں سلطان صاحب نے یہ بند کہے تھے وہ زیادہ بلیغ ہے - توجہ معانی کی طرف زیادہ رہتی ہے اور ہم مخرج حروف کا صوتی تاثر بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے -

آپ کے فقر کی خصوصیات : آپ علم کے بغیر فقیری کو ضرور وساں سمجھتے ہیں - ان کے خیال میں اس طرح سینکڑوں سال بھی عبادت کی جائے غفلت دور نہیں ہوتی اور انسان اللہ سے بیگانہ رہتا ہے - الٹا کفر میں مبتلا ہونے کا احتمال ہوتا ہے - اس علم کو بھی آپ بیکار قرار دیتے ہیں جس کا نتیجہ محبتِ الٰہی نہ ہو - عشق کے بغیر نہ علم کا فائدہ ہوتا ہے اور نہ عبادت کا نفع - آپ کے فقر کو قوت اور حرکت عشق سے حاصل ہوتی ہے - اسی لیے آپ کے فقر میں جوش اور توانائی ہے- عشق کے ساتھ آپ ذکر اور فکر کو ضروری تصور فرماتے ہیں - ذکر جذبہ میں پختگی پیدا کرتا ہے اور فکر ایسی بصیرت عطا کرتا ہے جو ہر ذہنی الجھن کو دور کرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے :

ذکر کنوں کر فکر ہمیشہ ایہے لفظ تکھا تلوار کنوں
کڈھن آہیں تے جان جلاوں فکر کرن اسرار کنوں
فکر دا پھٹیا کوئی نہ جیوے جان پٹے مڈھ ہار کنوں
حق دا کلمہ آکھیا باہو جند رکھیے نہ فکر دی مار کنوں

فکری طور پر جو دشمن شکست کھا جاتا ہے کبھی جانبر نہیں ہو سکتا - اس لیے سوزِ عشق کے ساتھ فکر ضروری ہے - اس طرح جان بآسانی فدا کر کے انسان اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے - غور فرمایئے سلطان صاحب کا یہ انداز کتنا فلسفیانہ ہے !

اسی لیے آپ کا فقر ابن العربی کے فقر سے مشابہت رکھتا ہے - ابن‌العربی (م - ۱۲۴۰ء) اور عبدالکریم الجیلی (م - ۱۴۲۸ء) کے مردِ کامل کی طرح کمال فقر حاصل کرنے کے بعد آپ فلسفۂ اطلاق کا مظہر بن جاتے ہیں - آپ کی زبان سے سنئیے :

ہُو دا جامہ پہن کرندے اسم کماون ذاتی
نہ اوتھ کفر اسلام دی منزل نہ اوتھ موت حیاتی
شاہ رگ تھیں نزدیک لدھو سے پا دل اندر جھاتی
اساں اونہاں وچہ اوہ اساں وچ دور رہے قرباتی

آپ ذاتِ مطلق میں اس طرح شامل ہو جاتے ہیں کہ مقرب فرشتے بھی پیچھے رہ جاتے ہیں - آپ اس فقر کو حاصل کرنے کے لیے مرشدِ کامل سے توسل اور استفادہ ضروری سمجھتے ہیں - لیکن ایک بات بڑی تعجب انگیز ہے - آپ فرماتے ہیں کہ راہ فقر پر چلانے سے پہلے مرشد کامل اپنے روحانی تصوف سے مسترشد کو احتیاج سے ضرور بے نیاز کر دے - آپ فرماتے ہیں کہ طالب کے دل میں ہر وقت اللہ کا تصور رہے جو خدا وند تعالیٰ کا ذاتی نام ہے - کلمۂ طیبہ زبان سے نہیں بلکہ دل سے پڑھا جائے اور اپنے باطن کی طرف ہر لحظہ نگاہ رہے - فقر کی اولین منزل اس وقت شروع ہو گی جب روحانی طور پر بارگاہِ نبوی میں حاضری نصیب ہو گی - پھر راہ ہموار ہے - باہمت انسان ذاتِ بے رنگ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے - لیکن اس غرض کے لیے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہنا پڑے گا اور اپنا حقیقی راز چھپا کر رکھنا ہو گا - آپ نے خود ہمیشہ اسی طرح کیا - ایک بار جمعہ کے روز آپ جامع مسجد دہلی میں تھے - لوگوں کی قلبی کیفیات میں ہیجان سا پیدا ہو گیا - اورنگ زیب عالمگیر بھی موجود تھا - اس کی اپنی کیفیت یہی تھی - تلاش شروع ہوئی - آپ کملی پہنے ہوئے تھے - لوگ آپ کو لے گئے - شہنشاہ نے بیعت کے لیے عرض کی - آپ نے علیحدگی میں فرمایا - فیض چاہتے ہو تو خاموش رہو -

اگرچہ آپ نے اپنے متصوفانہ خیالات کا اظہار وضاحت سے اپنی باقی تصنیفات مثلاً 'رسالہ روحی'، 'نورالہدیٰ'، 'اسرارالوحی'، وغیرہ میں کیا ہے لیکن' جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہے پنجابی زبان پر آپ کا یہ احسان ہے کہ اپنے ابیات میں اعلیٰ درجے کے افکارِ تصوف بڑے حسن کے ساتھ بیان کر کے آپ نے ہر ایک کو بتا دیا کہ یہ زبان بلند و باریک افکار کو بدرجہ اولیٰ ادا کر سکتی ہے -

حضرت سلطان باہو اور شاہ حسین : دونوں قادری بزرگ تھے ۔ مگر دونوں کے جذبۂ فکر اور اسلوب میں بڑا فرق ہے اور اس فرق میں دونوں کے نسلی تفاوت کا بڑا اثر نظر آتا ہے ۔ شاہ حسین بہت منکسر المزاج تھے ۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے ان کے آبا و اجداد کو ہندو معاشرے میں جو چھوٹا مقام حاصل تھا اس کی وجہ سے عاجزی اور مسکینی ان کی فطرت کا جزو بن گئی تھی ۔ شاہ حسین کو یہ صفات ورثے میں ملیں ۔ اپنے اس عجز و نیاز کو جس خلوص اور درد مندی اور جس انداز سپردگی کے ساتھ وہ اپنے سانول یعنی محبوبِ حقیقی کی درگاہ میں پیش کرتے ہیں اس کی مثالیں بہت کم ملیں گی اور اسی بنا پر ادبی دنیا میں اُن کی کافیوں کا مقام بڑا بلند ہے ۔ لیکن حضرت سلطان باھو اعوان قوم کے فرزند تھے جو قوم اپنے بہادرانہ کارناموں کی وجہ سے شہرت رکھتی ہے ۔ حضرت سلطان صاحب اسی جوش و ہمت کا اظہار عشقِ الٰہی میں بھی کرتے ہیں اور بڑے پر جوش جذبات کے ساتھ اپنی کیفیات اور اپنے خیالات کو بیان کرتے ہیں ۔ اُن کے زیادہ پر آرزو ہونے میں بھی یہی نسلی[1] فرق کارفرما نظر آتا ہے ۔ شاہ حسین اس بات پر خوش ہیں کہ ان کا رابطہ ذاتِ الٰہی سے استوار ہو گیا ۔ اس کے سرور سے سرشار ہو کر وہ ہر شے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں ۔ مزید فکر انہیں غیر ضروری نظر آتا ہے ۔ لیکن حضرت سلطان صاحب کا دلِ پر آرزو نبی اکرمؐ ، اہلِ بیت کرام اور حضرت پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۔ ۱۱۶۶ء) سے روحانی طور پر پوری طرح مستفیض ہو کر جب تک ذاتِ حقہ کے ساتھ "من تو شدم تو من شدی" والا غیر معمولی رابطہ قائم نہیں کر لیتا مطمئن نہیں ہوتا ۔ اور پھر ان کا غور و فکر برابر جاری رہتا ہے ۔ عرفانِ کامل ان کا منتہائے مقصود ہے ۔ طبائع کا یہی فرق شاہ حسین کی کافیوں اور حضرت سلطان صاحب کے ابیات میں ہر جگہ نظر آتا ہے ۔ سلطان صاحب کی بلند پروازی اگرچہ عوام کو متاثر اور مسحور کرتی ہے مگر دراصل وہ خواص کو مخاطب کرتے ہیں اور شاہ حسین کی مخاطبت تو کلیتہً عوام سے ہے ۔ اس لیے ان کی کافیاں عوامی شاعری کا سرمایہ ہیں اور اگرچہ کافیوں میں علامتی اسلوب اختیار کیا گیا ہے مگر عوام کے لیے ان کا سمجھنا دشوار نہیں ۔

سید بلھے شاہ (پ ۔ ۱۶۸۰ء)

سوانح زندگی : آپ سید ہیں اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۔ ۱۱۶۶ء) سے

---

۱ ۔ اسلام ان اکرمکم عنداللہ اتقکم، کا قائل ہے اور نسلی امتیازات کا خاتمہ کر دیتا ہے ۔ اہلِ فقر شدت سے ان امتیازات کے خلاف ہیں اور ، کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست ، ان کا مسلک ہوتا ہے ۔ یہاں صرف نسلی توراث کے مخفی اثرات کی طرف اشارہ ہے ۔

آپ کا شجرہ نسب چودہ واسطوں سے جا ملتا ہے - آپ کے آبا و اجداد اوچ گیلانیاں میں رہتے تھے - چنانچہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ کی ولادت وہیں ہوئی - اپنے کلام میں آپ نے ان رشتہ داروں کو مخاطب کیا ہے جو وہاں رہا کرتے تھے - آپ کے والد سید سخی محمد درویش اوچ کو چھوڑ کر پہلے ملک وال ضلع ساہیوال میں آباد ہوئے - بعد میں پنڈ پانڈو چلے گئے جو تحصیل قصور ضلع لاہور میں ایک گاؤں ہے - وہاں کے امام مسجد بنے - ان کے علم و فضل اور تقدس کی بنا پر زمیندار انہیں بڑے شوق کے ساتھ وہاں لے گئے تھے -

سید بلّھے شاہ کی ولادت ۱۶۸۰ء میں بیان کی جاتی ہے - اصل نام عبداللہ تھا جس کا ذکر آپ نے کئی بار اپنے ابیات میں کیا ہے بعد میں بگڑ کر بلّھے شاہ ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے شہرت پا گیا - مسجد کوٹ قصور میں آپ نے مولانا غلام مرتضیٰ قصوری اور مولانا غلام محی الدین قصوری سے تعلیم حاصل کی - کہا جاتا ہے کہ ثانی الذکر بھی پنجابی زبان کے شاعر تھے - آپ کے ابیات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے قرآن مجید ناظرہ طور پر پڑھنے کے علاوہ فارسی میں 'گلستان' اور 'بوستان' پڑھی اور منطق، نحو، معانی کنز قدوری، 'شرح وقایہ' سبقاً پڑھتے رہے - آپ کے ایک مصرعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے 'امرت کنڈ' کا ترجمہ 'بحرالحیوۃ' [1] بھی پڑھا تھا جو شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری (م - ۱۵۶۲ء) نے کیا اور جس میں ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے اطوار و اشغال کی تفصیل ملتی ہے -

آپ نے شاہ عنایت قصوری (م - ۱۷۲۸ء) کی بیعت کی جو حضرت شاہ محمد رضا قادری شطاری لاہوری (م - ۱۷۰۶ء) کے مرید اور خلیفہ تھے - شاہ عنایت مفسر قرآن تھے - تصوف کے متعلق کئی کتابوں کے مصنف تھے - ان کی تصنیف 'دستورالعمل' میں یوگ کے طور طریقوں کا ذکر بھی ہے - شطاری فرقہ کے فقراء ایسے اشغال اختیار کیا کرتے تھے جو تیزی سے "فنا بحق اور بقا بحق" کی منزل پر پہنچا دیتے تھے - حضرت بلّھے شاہ کے خاندان میں کئی نسلوں سے فقر و للّٰہیت کے ساتھ وابستگی چلی آ رہی تھی اور ان کی اپنی فطرت بھی بڑی موزوں تھی - اس لیے انہوں نے بھی بڑی تیزی سے منازلِ فقر طے کیں اور انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شریعت کے ظواہر پر لوگ زندگی بھر عمل کرتے رہتے ہیں اور علم حاصل کرتے کرتے منتہی ہو جاتے ہیں مگر حقیقی مقصد

---

(۱) ہندو یوگیوں نے بھی توحید کے متعلق معنی خیز باتیں لکھی ہیں - مسلمان اہلِ علم انہیں اپنا گم شدہ خزانہ تصور کرتے تھے میرزا مظہر جان جاناں (م - ۱۷۸۱ء) نے بھی اپنے خطوط میں ہندو یوگیوں کی توحید پرستی کا ذکر کیا ہے امرت کنڈ کے اس ترجمہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ کتاب کے مفہومات کا زنار توڑ کر توحید اور اسلام کی تسبیح ان کی گردن میں ڈالی گئی ہے اور صاحب تحقیق صوفیوں کے اذکار و اشغال سے ان کی تطبیق کی گئی ہے -

سے دور رہتے ہیں ۔ اس کے برخلاف شیخ کامل کا اتباع مختصر مدت میں واصل باللہ کر دیتا ہے ۔ اسی لیے آپ شاہ عنایت کے بڑے مداح ہیں ۔ ان کے ساتھ بے حد محبت رکھتے ہیں اور اپنی تمام تر روحانی کامیابیوں کے لیے انہی کے شکر گذار ہیں ۔ سلسلۂ قادریہ کے بانی اور اپنے مورث اعلیٰ شیخ عبدالقادر جیلانی کا انہوں نے صرف دو بار ذکر کیا ہے ۔ مگر شاہ عنایت کا نام بڑے نیاز مندانہ لہجے میں بار بار لیتے ہیں ۔

شاہ عنایت قوم کے ارائیں تھے ۔ دوسرے لوگ بالعموم اور نسب پر فخر کرنے والے سید بلّھے شاہ کے رشتہ دار بالخصوص طعنہ زنی کیا کرتے تھے کہ انہوں نے گیلانی سید ہونے کے باوجود ایک ارائیں کی بیعت قبول کرلی ہے ۔ مگر وہ فرطِ عقیدت سے کہا کرتے ۔ " بلنھے کو سید مت کہو وہ بھی ارائیں ہے" ۔ اس طرح اپنے قول و فعل سے آپ ثابت کیا کرتے تھے کہ فقر کی دنیا میں نام و نسب بے حقیقت ہیں ۔ شاہ عنایت عمر کے آخری حصے میں قصور کے حاکم حسین خان سے کبیدہ خاطر ہو کر لاہور چلے آئے اور یہیں ۱۷۲۸ء/۱۱۴۱ھ میں فوت ہوئے ۔ آپ کا مزار چڑیا ۔گھر لاہور سے مغرب کی طرف اس سڑک پر ہے جو اسمبلی ہال سے اچھرے کی طرف جاتی ہے ۔ ان کے قصور سے چلے آنے کی وجہ سے بلّھے شاہ بڑے مغموم ہوئے اور کئی کافیوں میں دردِ جدائی کا ذکر کیا ۔ جن میں شکایت کا انداز بھی ہے ۔ مگر معلوم ہوتا ہے بعد میں تصوّرِ شیخ ہر وقت حاصل رہتا تھا اسی لیے انہوں نے کہا :

بلھا شوہ عنایت مینوں پل پل درشن دیندے او

بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ عنایت کی وفات کے بعد بلّھے شاہ تیس سال کے قریب اپنے مرشد کے خلیفے بنے رہے ۔ اگرچہ آپ بڑے عابد اور زاہد تھے لیکن آپ کی فطرت میں جذب و سکر ، عشق و محبت اور وجد و سماع کی طرف زیادہ میلان تھا ۔ آپ کی بہت سی کافیاں ایسی ہیں جن سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ گائے جانے کے لیے لکھی گئی تھیں ۔ جوشِ جذبات میں آ کر بعض اوقات آپ ایسے الفاظ کہہ دیتے تھے جو بظاہر احکامِ شرع سے مطابقت نہیں رکھتے تھے ۔ اسی لیے شاہ عنایت زندہ تھے تو ایک بار ان سے ناراض بھی ہو گئے کیونکہ وہ شریعت کی ہر طرح پابندی کر کے طریقت کی طرف جانا پسند کرتے تھے ۔ اس وقت حضرت بلّھے شاہ نے بھیس بدل کر قلندروں کی وضع میں آپ کے سامنے رقص کیا اور معافی مانگنے کی راہ نکالی ۔ لیکن حضرت بلّھے شاہ کے مزاج میں جذب و سکر آخر دم تک موجود رہا ۔ بالخصوص آخری ایام میں مشرب بالکل قلندرانہ ہو گیا تھا ۔ آپ وسیع المشروب اور صلح کل تھے ۔ مقامِ حیرت انتہائے فقر ہے ۔ اس کی کیفیات آپ کے مزاج پر طاری رہتی تھیں ۔ قصور میں فوت ہوئے اور وہیں مدفون ہوئے ۔ قصور آپ ہی کی نگری کہی

جاتی ہے۔

'خزینۃ الاصفیا' میں آپ کا سال وفات ۱۷۵۷-۱۸۵۸ء/۱۱۷۱ھ درج ہے۔ آپ کے مزار پر جو کتبہ ہے اس میں دو مادہ ہائے تاریخ ہیں۔ "شیخ اکرم" اور "ہادی"، "اکبر مست توحید"۔ دونوں سے علیحدہ علیحدہ ۱۱۷۱ کا عدد برآمد ہوتا ہے۔ مگر ضمیمہ اورینٹیل کالج میگزین مئی ۱۹۲۹ء کے صفحہ "۲۰" پر مولانا محمد شفیع مرحوم اوراد و وظائف کے ایک نسخہ کا ذکر کرتے ہیں جس پر حضرت بلھے شاہ کی مہر اس طرح ثبت ہے :

۱۱۸۱ قادری بلھا شاہ

نام سید عبداللہ عشقی درج ہے۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ آپ ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ء) میں زندہ تھے۔ دوسرے زندگی کے آخری ایام تک اوراد اور وظائف کے پابند رہے۔ وظائف میں درود کبریت احمر بھی شامل ہے جو اول سے لے کر آخر تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بڑی فصیح اور بلیغ مدح پر مشتمل ہے اور قادری، چشتی اور نقشبندی سلسلوں میں آج تک پڑھا جاتا ہے۔

عہد اور معاشرہ : جب اورنگ زیب ۱۷۰۷ء میں فوت ہوئے تو بلھے شاہ کی عمر ۲۷ سال تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر عہد عالمگیری میں ہو چکی تھی۔ انہوں نے مغلیہ تخت و تاج کے بارہ مالک دیکھے جن میں سے کئی ایک کو تہ تیغ کیا گیا۔ مرہٹوں، سکھوں، روہیلوں اور طالع آزما مغل اُمراء کی وجہ سے جہاں مغلوں کی سلطنت بتدریج کمزور ہوتی چلی گئی وہاں برصغیر کا امن و امان بھی تہ و بالا ہوا۔ بالخصوص احمد شاہ ابدالی نے سید بلھے شاہ کے زمانے میں متواتر پانچ حملے کیے۔ لاہور اور دہلی کو کئی دفعہ لوٹا۔ زمینداروں سے خراج وصول کیا۔ دیہات کے دیہات ویران کیے۔ اس کے بعد سکھوں نے اپنی مخصوص سکھا شاہی سے اور تباہی مچائی۔ چنانچہ پنجاب کی حالت ابتر ہو گئی۔ قصور لاہور سے دور تھا اور نہ ہی امرتسر سے۔ اس لیے افغانوں، سکھوں، مرہٹوں اور مغل اُمراء کی وجہ سے جو خلفشار پیدا ہوا اس کی زد اس پر براہ راست پڑتی رہی اور یہ سب کچھ حضرت بلھے شاہ کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ اس لیے وہ کہتے ہیں :

در کھلا حشر عذاب دا
برا حال ہویا پنجاب دا

مغلوں کے متعلق لکھتے ہیں :

مغــلاں زہر پیالے پیتے
بھوریاں والے راجے کیتے
سب اشراف پھرن چپ کیتے

"چڑیاں شہبازوں کو مار رہی تھیں اور بھیڑیں چیتوں کو،" اور عوام ایک دوسرے سے جس طرح دست و گریباں تھے اس کے متعلق لکھتے ہیں :

بلھا شاہ ہن کیا بتاوے جو دسے سو لڑدا
لت بلتی گتّ بکتی کوئی نہیں ہتھ پھڑدا
دیکھو کیا قیامت آئی آیا خــر دجال

معلوم نہیں "خرِ دجّال" سے کونسا تاریخی کردار[1] مراد ہے۔ بہرحال ملک کی سیاسی ابتری کے متعلق شاہ صاحب نے اپنی کئی کافیوں میں کھل کر لکھا ہے۔

اپنے معاشرے پر انہوں نے اس لحاظ سے تنقید کی ہے کہ علم اور عبادت کا مقصد غالب اکثریت کے نزدیک تہذیبِ نفس اور اصلاحِ حال نہیں بلکہ حصول زر و مال ہے

حضرت بلّھے شاہ کا فقر : آپ شریعت کو دایہ قرار دیتے ہیں اور طریقت کو ماں، ظاہری اور باطنی تربیت کے لیے دونوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اس بات کی بار اظہار کیا ہے کہ کلمۂ طیبہ اور شریعت پر گرفت مضبوط رہی تو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوضِ روحانی اور آپ کی شفاعت پر یقینِ کامل رکھو۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ اذان رسولی سے میرا دل پھول کی طرح کھل پڑا ہے اور ہم نے ان کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرکے دیکھ لیا ہے کہ زہد و عبادت آپ کا زندگی بھر شعار رہا۔ لیکن اس زہدِ و عبادت میں انہوں نے عشق سے گرمی پیدا کی۔ عشقِ حقیقی سے پہلے وہ عشق مجازی کو ضروری گردانتے ہیں اور کہتے ہیں راہ مجاز اختیار کرکے ذات حقہ سے پیوند قائم کرنا آسان ہے۔ صوفیائے اسلام میں سے حضرت بایزید بسطامی (م - ۸۷۵ء) نے عشق حقیقی میں اشتعال کی جو کیفیت پیدا کی تھی اس کی بنا پر وہ شطاری[2] فرقہ کے بانی بنے۔ حضرت عبدالقادر جیلانی (م - ۱۱۶۶ء) نے بعد میں سلسلہ قادریہ شروع کیا اور انہوں نے ولولۂ عشق تیز تر کر دیا۔ حضرت بلّھے شاہ کے مرشد قادری شطاری تھے

---

۱ غالباً جسّہ کلال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۲ شطّارۃ کا لغوی معنی بے خوفی ہے۔ اس لیے اصطلاح کے طور پر شطّار کا معنی یہ ہے کہ وہ عاشقِ الٰہی جو بے خوف ہو کر تیزی سے عشق میں آگے بڑھتا ہے۔

اس لیے انہیں جذبۂ عشق دو آتشہ ہو کر ورثے میں ملا ۔

ابتدائے عشق میں محبوبِ حقیقی کی تلاش تھی ۔ جذبہ تیزی سے بیتاب کن ہو رہا تھا لیکن وصال کی گھڑی ابھی نہیں آئی تھی ۔ پکار پکار کہتے تھے :

بھا نوس جان نہ جان و بے وبھڑے آ وڑ میرے

شاید اسی پکار کا نتیجہ تھا کہ اپنے گھر میں اس کے جلوے دکھائی دینے لگ گئے ۔ لیکن یقین نہیں آتا تھا کہ یہ ذات حق کے جلوے ہیں ۔ خیال گزرتا کہ نظر کا دھوکا نہ ہو ۔ بعد میں ہر وقت کا قرب اور حضور حاصل ہو گیا ۔ چلتے پھرتے ، سوتے جاگتے حضور ہی حضور تھا ۔ لیکن پھر ایک اور انقلاب آیا جس کا ذکر تمام صوفیائے کرام کرتے ہیں ۔ اذا تم الفقر فھواللہ ۔ اور مولانا روم فرماتے ہیں ۔ اولیاء اللہ ، اللہ اولیاء ۔ اس منزل پر حضرت بلھے شاہ نے بھی کہنا شروع کر دیا ۔ "پیا پیا کہتے ہمیں پیا ہوئے اب پیا کس نو کہئے" ۔ اور "رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی" ۔ اس تدریجی ترقی کا اظہار شاہ صاحب نے اپنے کلام میں مختلف مقامات پر کیا ہے ۔

پنجاب کے متقدم صوفی شعراء یعنی شاہ حسین اور سلطان صاحب بھی اس منزل کا ذکر کرتے ہیں ۔ لیکن شاہ حسین صرف نام لے کر خاموش ہو جاتے ہیں اور سلطان صاحب اس کا ذکر اجمال سے کرتے ہیں اور اشاروں میں کام لیتے ہیں ۔ حضرت بلھے شاہ کے ہاں یہ اجمال تفصیل کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ ان کی مختلف کافیوں کو سامنے رکھ کر دولت وصال حاصل کرنے والوں کے متعلق ہم بڑی معنی خیز معلومات حاصل کر سکتے ہیں ۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں جب وصال ہوتا ہے تو فرق باقی نہیں رہ جاتا ۔ بلکہ پہلے واصل ہونے والوں اور بعد کے پہنچنے والوں میں بھی امتیاز باقی نہیں رہتا ۔ تمام کا وصال ایک ہی حقیقت سے ہوتا ہے ، وہ حقیقتِ کبریٰ جو الآن کما کان ہے ' تمام واصلین ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہوتے ہیں ۔ یہ حقیقت تمام میں جاری و ساری اور تمام پر حاوی ہوتی ہے ۔ مختلف زمانوں میں ہونے کے باوجود وہ اس لحاظ سے ایک جیسے ہوتے ہیں کہ ان کے اندر ایک ہی حقیقت سمائی ہوئی ہوتی ہے ۔ صرف ان کا ظاہری رنگ روپ مختلف ہوتا ہے ۔ زمانی اعتبار سے اپنی پیدائش سے پہلے کے سب چھوٹے بڑے حادثات و واقعات اس طرح نظر آتے ہیں گویا ان کے بعد رو پذیر ہوئے اور یہ سب کچھ اس لیے کہ وہ ابدیت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں ۔ اس حالت میں انہیں اس امر کا عرفانِ کامل نصیب ہوتا ہے اور مشاہدہ اس کی تصدیق کرتا ہے کہ حقیقت حقہ کے بغیر کوئی اور شئے جلوہ گر نہیں ۔ اپنے پرائے، دوست دشمن ، اسلام اور کفر ، زمین اور زمان ، بہشت اور دوزخ ایک ہی حقیقت میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ بنابریں دونوں جہانوں میں جو کچھ ہوتا ہے ، انہیں

اسی حقیقت کی کار فرمائی نظر آتی ہے ۔ انسان اخلاقی اور روحانی لحاظ سے اس قدر بلند ہو جاتا ہے کہ کرۂ ارض کا شہری ہونا کی بجائے خود تمام کرہ ہائے افلاک سے بالاتر ہو کر وہ اس حقیقت مطلقہ کا شہری بن جاتا ہے جس میں امتیازات کا نام و نشان نہیں اور جہاں تمام اضافات مٹ جاتے ہیں ۔

حقیقتِ مطلقہ کے ساتھ اس طرح وصال حاصل کرنے کے باوجود حضرت بلھے شاہ کا یہ وصف ہے کہ وہ اپنے قدم زمین پر مضبوطی سے جمائے رکھتے ہیں اور عوام کے درمیان نظر آتے ہیں ۔ جب کہ حضرت سلطان باہو صاحب اس منزل پر پہنچ کر ذات حقہ' کی شان مطلقیت کا مظہر بن جاتے ہیں خواہ اجمالی طور پر سہی ۔ ویسے فکر اور جذبہ کے اعتبار سے پنجاب کے یہ دونوں بزرگ بایزید بسطامی اور ابن العربی کے ہم نشین ہیں اور پنجابی زبان بجا طور پر ناز کرسکتی ہے کہ اپنشدوں کی اس سرزمین میں اس کے یہ دونوں صوفی شاعر عرفان کی اس منزل کی نشاندہی کرتے ہیں جو دنیائے فقر میں لاریب قابل رشک ہے ۔

حضرت بلّھے شاہ کی شاعری': جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہے سید بلّھے شاہ کی شاعری کا تعلق تصوف سے ہے ۔ بنیادی طور پر تصوف تزکیہ' باطن کرتا ہے اور ذات الٰہی سے گہرا رابطہ قائم کرتا ہے ۔ لیکن محی الدین ابن العربی (م ۔ ۱۲۴۰ء) نے جذبات کی گہرائی کے ساتھ تصوف میں فلسفیانہ افکار بھی شامل کردیے تھے اور آپ تھے بھی قادری بزرگ ۔ اس لیے بعد کے قادری صوفیوں نے ابن العربی کے خیالات کو خصوصیت کے ساتھ قبول کیا ۔ اسلامی تصوف میں مابعدالطبیعات سے متعلق مسائل پائے جانے کی وجہ زیادہ تر یہی ہے ۔ اب تصوف چونکہ سر تا پا انسان کے باطن سے تعلق رکھتا ہے ، مابعدالطبیعاتی افکار بھی جذبہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اگر صوفی اتفاق سے شاعر بھی ہو تو یہ افکار اشعار میں جذبات انگیز طور پر ظاہر ہوتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ بلّھے شاہ کی شاعری جہاں مؤثر ہے وہاں اعلیٰ درجے کے مابعد الطبیعاتی افکار کی حامل بھی ہے ۔ مثلاً تخلیق کائنات کے سلسلہ میں یہ بند :

کن کہیا فیکوں کہایا
بے چونی سے چوں بنایا
احد دے وچ میم رلایا
تاں کیتا ایڈ پسار

(۱) آپ کا کلام پنجابی ادبی اکیڈیمی نے لاہور سے ۱۹۶۰ء میں خاصے اہتمام سے طبع کرایا ہے ۔ لیکن یہ نامکمل ہے ۔ مثلاً اس میں وہ مشہور ابیات شامل نہیں جو اس طرح شروع ہوتے ہیں
بلھے نوں سمجھاون آیاں بھیناں تے بھرجائیاں

ہن میں لکھیا سوہنا یار — جس دے حسن دا گرم بازار

اس بند میں عربی کے معروف اور پنجابی کے آسان الفاظ استعمال کیے گیے ہیں ۔ ان کے حقیقی معانی کا علم اس وقت ہوتا ہے جب پتہ چلتا ہے کہ ذات احد جو بے چون و بے چگون اور بے شبہ و بے نمون ہے ' تنزلات کے ذریعے تخلیق کا موجب بنی اور جس ذات نے حقیقت محمدیہ کو ' جسے نظریہ تنزلات کی رو سے وحدت کہا جاتا ہے مادۂ تخلیق قرار دیا ۔ یہ بڑے گہرے افکار ہیں اور ابن العربی کی وجہ سے صوفیائے اسلام میں پھیلے جنہیں ہر کوئی و مہ سمجھ بھی نہیں سکتا ۔ لیکن انہیں بلھے شاہ بڑی روانی ، بے ساختگی اور جذبات پروری کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں ۔ مندرجہ بالا بند جس نظم سے لیا گیا ہے اس کے آغاز میں ذاتِ بے رنگ کا ذکر ہے ۔ یہ ظہورِ صفات کے مرتبہ سے پہلے کی بات ہے :

جد احد اک اکلّا سی
نہ ظاہر کوئی تجلّی سی
نہ رب رسول نہ اللہ سی
نہ جبّار تے نہ قہّار

ہن میں لکھیا سوہنا یار — جس دے حسن دا گرم بازار

ربوبیّت، معبودیّت، الوہیّت ، اور دیگر صفاتِ الٰہی کا تعلق مخلوقات سے ہے ۔ اس لیے مرتبۂ تنزیہہ پر انہیں معدوم سمجھا جائے گا ۔ یہ بڑے گہرے مطالب اور حقائق ہیں لیکن بلھے شاہ وفورِ جذبات کی وجہ سے بڑی روانی کے ساتھ انہیں سادہ الفاظ میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں ۔

اسلوب کے لحاظ سے سلطان باہو اور بلھے شاہ کی شاعری میں بڑا فرق ہے ۔ ایک تو بلھے شاہ کے لہجے میں بڑی بیباکی ہے اور جذبہ بڑا قلندرانہ ہے ۔ دوسرے سلطان صاحب اپنے افکار و خیالات کی توضیح کے لیے مسلسل استعارے سے کام لیتے ہیں اور بلھے شاہ تلمیحات استعمال کرتے ہیں اور پھر ان کی تلمیحات میں بڑی وسعت ہے ۔ آیات قرآنی اور احادیثِ نبوی کے علاوہ پیغمبرانِ اسلام ، فرشتے ، دینی ادب کے معروف نام ، ہند اور بیرون ہند کے صوفی ، ہند اور بیرون ہند کے مسلمان عشاق اور ہندوؤں کے تقریباً تمام مذہبی رہنما اور ان سے متعلقہ افراد بلھے شاہ کا تلمیحاتی سرمایہ ہیں ۔ وہ تفصیل کے قائل ہیں اجمال پر اکتفا نہیں کرتے ۔ ہاں عشاق میں سے انہیں رانجھا سے زیادہ وابستگی نظر آتی ہے ۔

جیسا کہ پہلے اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ بلھے شاہ زندگی کے عام موضوعات کے متعلق بھی شعر کہتے ہیں ۔ ان موضوعات کو علامت قرار دے کر بےشک گہرے معانی نکالے جا سکتے ہیں لیکن موضوعات کے عوامی ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ مثلاً ونجارے (بیوپاری) شہر شہر گھوم کر اپنی چیزیں بیچا کرتے ہیں ۔ ان کے متعلق بلھے شاہ نے ایک لمبی نظم لکھی ہے ۔ ونجاروں نے اپنی اشیائے فروخت کی ہانک لگائی اور بیچ رہے ہیں ۔ ایک دوشیزہ لجاتی ہوئی وہاں آتی ہے اور کہتی ہے :

بھائی وے لالاں والیا ویرا انہاں دا مل دسائیں
جے تو آئی ہیں لال خریدن دھڑ توں سیس لہائیں
ڈھم کدی سوئی دا نہ سہیا سر کتھوں دتا جائے
لازم ہوکے مڑ گھر آئی چھہسن گواہنڈی آئے
سے ونجارے آئے نی مائے سے ونجارے آئے
لالاں دا اوہ ونج کریندے ہوکا آکھ سنائے

معاشرے پر اثر : عجیب اتفاق ہے کہ حضرت بلھے شاہ کے علاوہ دو اور قادری بزرگ بھی اسی زمانے میں (البتہ جب بلھے شاہ کا عہد شباب تھا) پنجابی زبان میں شعر کہہ رہے تھے ۔ ایک تو حضرت سلطان باہو (م - ۱۶۹۱ء) ہیں اور دوسرے علاقہ دھنی کے ایک بزرگ شاہ مراد[1] (م - ۱۷۰۲ء) ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیک وقت تین قادری بزرگوں نے پنجاب کے عوام کو ان کی اپنی زبان میں عشق و محبت ، تزکیہ نفس اور اصلاحِ اعمال کا پیغام دیا ۔ اپنی زبان تھی ، کانوں سے گزرتی ہوئی دل تک پہنچ گئی ۔ اس زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں کئی قوموں ، متعدد تہذیبوں اور چند در چند زبانوں نے تنوّع پیدا کیا تھا ۔ اس لیے مشکل سے مشکل مطالب اس میں آسانی سے بیان ہو جاتے تھے اور اتنی ہی آسانی سے عوام کے اذہان تک رسائی حاصل کر لیتے تھے ۔ بنابریں شاہ حسین کی کافیوں کی طرح سلطان باہو ، شاہ مراد اور بلھے شاہ کا کلام آج بھی اصلاحِ معاشرہ کے لیے اتنا ہی مفید ہے جتنا کہ اس سے پہلے تھا ۔ مثلاً بلھے شاہ کا یہ شعر اصلاح اور تربیتِ نفس کے سلسلہ میں کس قدر پُر تاثیر ہے :

---

(۱) ان کے فقر و فکر اور اسلوب نگارش سے آگاہی کے لیے دیکھئے Riaz Chishti کی تصنیف 'Selections from Shah Marad'

بلھیا سن منجولا منج دا کتے گوشے بہ کے کٹ

ایہہ خزانہ تینوں عرش دا توں سنبھل سنبھل کے لٹ

تاریخی لحاظ سے بھی یہ اشعار خاص اہمیت کے حامل ہیں ۔ بھگتی تحریک نے عہد سلاطین میں زور پکڑا تھا لیکن اس تحریک کے دوران میں تخلیق شدہ دوہے وغیرہ ہندو عوام کی زبان پر عہد مغلیہ میں بھی موجود رہے ۔ پنجابی زبان میں صوفی شعراء کا یہ کلام عامۃ المسلمین کے روحانی ذوق کو پورا کرتا رہا اور ان دوہوں کے مقابلے میں تریاق کا اثر رکھتا تھا ۔

پشتو اور سندھی کے معاصر صوفی شعراء

بلھے شاہ کے عہد میں صوفی شعراء نے مقامی زبانوں میں شعر کہہ کر عوام کو ایک دفعہ پھر تعلیمات اسلامی کی طرف توجہ دلائی ۔ توحید ، رسالت ، جزا سزا ، اعادہ اور یگانگت کے مطالب عام فہم انداز میں از سر نو بیان کیے ۔ انہوں نے محسوس کیا کہ امتداد زمانہ سے یہ مطالب بھولتے چلے جا رہے ہیں ۔ اس لیے اثر انگیز پیرائے میں ان کا اعادہ ضروری ہے ۔ پشتو میں یہ کام عبدالرحمٰن بابا نے کیا ۔ ان کی ولادت اور وفات کی قطعی تاریخیں معلوم نہیں ۔ البتہ ان کے کلام سے اس امر کا یقین ہو جاتا ہے کہ انہوں نے شاہ جہان ، اورنگ زیب اور شاہ عالم بہادر شاہ کا زمانہ پایا ۔ رحمان بابا عاشقان الٰہی میں سے تھے ۔ ان کے تین اشعار کا اردو میں ترجمہ پڑھیے :

کیا مری زندگی ہے کیا ہے سر جبکہ دل سے ہوں طالب دلبر
زندگی جب تلک ہے عالم میں چھٹ سکے گا کبھی نہ مجھ سے یہ در
یہ اسی کی طلب کا ثمرہ ہے خشک رہتے ہیں لب تو چشم ہے تر

اب عشق الٰہی کے متعلق بلھے شاہ کے ایک بند کا مطالعہ کیجئے :

ہن کیوں رولدے لین تراسے آپے اوڑک پھاہی پاسے
ہن تا چھٹن اوکھا ہویا چارہ نہیں بیچاری دا
سجناں دے وچھوڑے کولوں تن دا لہو چھانی دا

سندھ میں شاہ عبداللطیف بھٹائی (۱۶۸۹ء – ۱۷۵۱ء) یہ فریضہ انجام دے رہے تھے ۔ یہ حضرت بلھے شاہ کے پوری طرح معاصر ہیں ۔ ان کے چند سندھی اشعار کا ترجمہ ایک قطعہ کی صورت میں دیا جاتا ہے :

کان میں بانگ الست کی پڑی جس دم صدا
قلب نے صدق و صفا سے کہہ دیا قالو بلیٰ
اور یارانِ وطن سے باکمال ذوق و شوق
میں نے فوراً عہد و پیمانِ محبت کر دیا

اسی آیہ قرآنی کو لے کر بلّھے شاہ فرماتے ہیں :

الست بربکمہ پیتم بولے سب سکھیاں نے گھنگھٹ کھولے
قالو بلیٰ ہی یوں کر بولے لآ اِلٰہ اِلا اللہ

اٹھارھویں صدی عیسوی میں ان تمام صوفی شعراء کو موجودہ مغربی پاکستان کے مختلف گوشوں میں علیحدہ علیحدہ تعلیات اسلامی کی ترویج و اشاعت میں مصروف دیکھیے۔ جب ان بزرگوں نے مّلی زندگی اور تہذیب و ثقافتِ اسلامی کو مختلف تاریخی عوامل کی وجہ سے خطرات میں گھرا ہوا دیکھا تو انہوں نے مقامی زبانوں کے ذریعے بڑے موثر پیرائے میں عوام کی روح کو بیداری کا پیغام دیا اور ایک دفعہ پھر ان کے دلوں میں جذبۂ ایمان کو تازہ کر دیا ۔ ظاہر ہے فکری اور معاشرتی انشار سے محفوظ رکھنے میں اُن کا یہ کردار اسلامیان ہند و پاکستان کے تہذیبی اور اخلاقی تحفّظ کے لیے بہت ضروری تھا ۔

علی حیدر ملتانی (م - ۱۷۷۷ء)

گیلانی سید تھے ۔ والد کا نام شیخ محمد امین تھا ۔ چوتڑہ ضلع ملتان میں ۱۰ مئی ۱۶۹۰ء کو پیدا ہوئے ۔ حافظ قرآن ہونے کے علاوہ فارسی اور عربی کے فاضل تھے ۔ قادری سلسلہ میں بیعت تھی ۔ اپنی روحانی کامیابیوں کو شیخ عبدالقادر جیلانی اور خواجہ معین الدین چشتی کا فیض سمجھتے تھے ۔ شعرو سخن کا ذوق فطری تھا ۔ چوتڑہ میں ۱۷۷۷ء کو فوت ہوئے ۔ ویسے تو آپ کی زندگی کے زیادہ واقعات نہیں لیکن اپنے پُر تاثیر کلام کی وجہ سے آپ کی شہرت ان تمام علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے جہاں جہاں پنجابی زبان بولی جاتی ہے ۔

آپ کا کلام کئی بار چھپ چکا ہے اور ۱۹۶۳ء میں پنجابی ادبی اکیڈیمی نے اسے از سر نو مرتب کرا کے 'کلیّاتِ علی حیدر' کے نام سے طبع کرایا ہے ۔ اس میں متفرق اشعار کے علاوہ پانچ سی حرفیاں ہیں ، ایک نعت اور ایک نظم بعنوان "ایہ ناز بھری ملتانی دسے نی" بھی ہے ۔ یہ نظم بڑی پہلودار اور معنی خیز ہے ۔ کلیّات میں 'قصۂ ہیر' بھی شامل کر دیا گیا ہے اگرچہ جیسا کہ خود مرتب نے کہا ہے یہ ہیر حیدر شاہ

ساکن جلال پور جٹاں کی تصنیف ہے ۔ شاہ صاحب کے اپنے اشعار گیارہ سو کے قریب ہیں ۔

علی حیدر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں پیدا ہوئے اور شاہ عالم ثانی کے عہد میں فوت ہوئے اورنگ زیب عالمگیر کے بعد آپ کی زندگی میں مغل شنہشاہوں کو کئی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ لیکن آپ کے دل و دماغ پر زیادہ اثر نادر شاہ کے حملے کا ہے ۔ نعت میں دعا مانگتے ہیں :

فارساں دی آتش پھر وسیا رسولؐ خدا دے

اور پانچویں سی حرفی کے تیسرے بند میں کہتے ہیں :

ایہہ ایرانی نادر ظالم ظلم کنوں مول نہ سگدے نی
میڈے دل دی دلی لٹی وے حیدر ہور کیہ سانھوں منگدے نی

انہیں دلی کے لوٹ جانے کا بڑا غم تھا ۔ اس سے اگلے بند میں اس لوٹ کو وہ مغل امراء کے منصوبہ کا نتیجہ قرار دیتے ہیں ۔ اسی رنج و غم کی بنا پر انہوں نے ردیف ب کے متفرق اشعار میں قطعہ نمبر دوم بڑے درد و کرب کے عالم میں لکھا ہے کہتے ہیں ۔ یہ راجے ، یہ تورانی امراء ، یہ ہندوستانی اکابر شرم و حیا کے باعث زہر کھا کر مر کیوں نہیں جاتے ۔ کیوں خزانے بھر بھر کر ایرانیوں اور خراسانیوں کو دے رہے ہیں ۔ وہ تمام توپچی ، برقنداز اور متکبر فوجی سردار کہاں گئے ؟

علی حیدر کی تمام تر تشبیہات اور ان کے استعارات دیہاتی تمدن سے تعلق رکھتے ہیں ۔ پچھلی رات دودھ بلونے اور لسی سے مکھن نکالنے کا ذکر ہے ۔ پتہ چلتا ہے کہ عورتیں سرخ رنگ کی چولیاں پہنتی تھیں جن پر تنیاں لگی ہوئی ہوتی تھیں ۔ کانوں میں سونے کی بالیاں پہنی جاتی تھیں اور زلفیں گندوانے کا رواج تھا ۔ منہ چھپانے کے لیے گھونگھٹ نکالا جاتا تھا ۔ معاشرے میں پنڈت ، برہمن اور قاضی موجود تھے ۔

شاہ صاحب عام حسن سے منہ نہیں پھیرتے ، بلکہ اسے لطف لے کر دیکھتے ہیں اور بعض اوقات تو اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا موضوع یہی عام حسن ہے اور اسی کی رعنائیوں میں وہ کھوئے رہتے ہیں ۔ چنانچہ یہ بھی خیال گزرتا ہے کہ ان کی محبت بھی عمومی قسم کی ہے ۔ مثلاً یہ قطعہ پڑھیے :

م میتاں صدقہ اکھیں متوالیاں دا ، مڑ بھال وے دلبرا واسطہ ای
صدقہ زلفاں پریشاں کالیاں دا ، ویکھ حال وے دلبرا واسطہ ای

بھلا صدقہ سونے دی والیاں دا ، سن گال وے دلبرا واسطہ ای
میں صدقہ گلاں آپ والیاں دا ، غم ٹال وے دلبرا واسطہ ای
تقصیراں حیدر والیاں دا ، نامہ ڈال وے دلبرا واسطہ ای

شاہ صاحب کے ان الفاظ سے کوئی اور معانی نہیں نکالنے چاہیئیں ۔ ان سے مراد حسن مجاز ہی ہے ۔ البتہ فرق اس وقت پڑتا ہے ، جب اس حسن کی رنگینیاں انہیں ذات بے رنگ کی اپنی رنگینیاں نظر آتی ہیں اور وہ کہہ اٹھتے ہیں :

انہاں سوہنڑیاں تے گل رنگاں کو'وں سانوں بے رنگ دی بو آوندی اے

یا جیسا کہ اس دوہرے میں آپ فرماتے ہیں :

الف انہاں رنگلیاں دے رنگ کنوں رنگ بیرنگ دا نظر آوندا ای
ایہہ خوبیاں نے نقاش دیاں جھڑا پانی تے نقش ٹکاوُندا ای
اوہو عکس پوتے نقاش دا بھی وچ پانی جے نقش بناوُندا ای
دسے بے رنگ رنگلے تھیں حیدر اتے پانی دے نقش دکھاوُندا ای

بنابریں شاہ صاحب کی شاعری میں مجاز اور حقیقت کا بڑا حسین امتزاج نظر آتا ہے ۔ خال، لب و رخسار کو دیکھتے دیکھتے وہ بے ساختہ اللہ اور اہل اللہ کا ذکر شروع کر دیتے ہیں ۔ پنجابی شاعری میں یہ رنگ ان سے مخصوص ہے اور اسے وہ بڑی خوبی اور بیحد دلکشی کے ساتھ نباہتے ہیں ۔ فارسی شاعری میں یہ رنگ ہمیں عراقی کے ہاں ملتا ہے اور یہ بات حیرت افزا ہے کہ علی حیدر اور عراقی دونو کا تعلق ملتان سے بڑا گہرا تھا ۔ حسن و جمال کے نقطہ نگاہ سے علی حیدر کا فکر مدارج ارتقا طے کرتا ہوا ہمیں اس منزل پر بھی نظر آتا ہے جہاں وہ اچانک کہنے لگ جاتے ہیں :

کوئی نقش نہیں نقاش جیہا توڑے اپنا رنگ بناوُندا ای

کہتے ہیں اپنے حسن ذاتی کے اعتبار سے وہ ذات بے مثل اور بے نظیر ہے ۔

علی حیدر ذات احد کے پرستار ہیں ۔ اسی کے جلوے کو ہر شئے میں دیکھتے ہیں ۔ ان کے نزدیک وجود صرف ذات احد ہی رکھتی ہے ۔ کائنات اس کا ظل اور عکس ہے ۔ احد اور احمد میں انہیں فرق نظر نہیں آتا ۔ 'م" محض پردہ ہے ورنہ اصل حقیقت وہی ہے ۔ اہل علم تو ان کے اس استدلال کو حقیقت محمدیہ کی توضیح قرار دیں گے ، جس میں ذات مطلق کا مکمل ظہور ہوتا ہے ۔ مگر شاہ صاحب کا یہ بیان عوام کے لیے بڑا مغالطہ انگیز ہے ۔ تخلیق کائنات کے سلسلہ میں شاہ صاحب 'کن فیکون' کے نظریہ کے قائل

ہیں ۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ عشق اس واقعہ سے پہلے ہی موجود تھا ۔ چونکہ آپ حافظ قرآن اور فاضل انسان ہیں ، اس لیے ان مطالب کی تشریح کے لیے آیات قرآنی اور علمی اصطلاحات استعمال میں لاتے ہیں ۔ علم ان کے نزدیک قابل قدر چیز ہے ' لیکن 'معلوم' تک نہیں پہنچاتا ، حالانکہ انہیں تو معلوم سے محبت ہے :

ع علم دا پڑھنا نیک بھوں ہر عشقے دی بات انوکھڑی اے
چن تے سورج دی روشنی بھوں پر یاردی جھات انوکھڑی اے
شب قدر دی رات‌بھی‌بھوں چنگی بروصل دی رات انوکھڑی‌اے
مشکل باتاں سبھے او حیدر ہر برہوں دی رات انوکھڑی اے

شاہ صاحب اسی لیے بار بار عشق کا تذکرہ کرتے ہیں ۔ وہ وصالِ الٰہی چاہتے ہیں اور اس غرض کے لیے انہیں پچھلی رات کا ذکر ضروری نظر آتا ہے ۔ استعارے کی کس خوبی کے ساتھ کہتے ہیں :

الف اٹھ سوانی تے گھت مدھانی ، ویلڑا پچھلی رات دا ای
اتو بوئی دھمی تے دبی نہ جمی ڑڑکناں بھی کسے گھات دا ای
جٹ نہ ٹٹے تے ددھ نہ وٹے ویلا وقت برات دا ای
جویں ددھ تھیں دہی مکھن وے حیدر تویں فرق نہ رب دی ذات دا ای

حصولِ مقصد کے لیے وہ مسلسل ذکر اور خلوصِ کامل کے قائل ہیں ۔

خواجہ فرد فقیر

حالات زندگی : خاص گجرات کے رہنے والے تھے ۔ مسجد میں درس دیا کرتے تھے ۔ علم و فضل اور تقدس کی بنا پر لوگ ان کے ارادت مند تھے ۔ معلوم ہوتا ہے خدمتِ دین میں خاموشی سے زندگی گزار دی ۔ پیدائش اور وفات کے سال صحیح طور پر معلوم نہیں ۔ کسب نامۂ بافندگاں' کے مندرجہ ذیل شعر میں آپ نے (۱۷۴۹ء/۱۱۶۳ھ) کا ذکر کیا ہے :

یاراں سے تریسٹھ برساں سن نبی دا آیا   ایہ رسالہ کامل ہویا حکم دھر وسوں آیا

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط میں آپ زندہ تھے ۔ 'کسب نامہ' کے فکر اور اسلوب میں بڑا توازن ہے ۔ آپ اپنے پختہ افکار کو جدید اسالیب بیان اختیار کرکے پیش کرتے ہیں ۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں مختصر سے جچے تلے الفاظ

میں کہہ دیتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب 'کسب نامہ' لکھا گیا ان کی پختگی عمر کا زمانہ تھا ۔ توازنِ اسلوب کے علاوہ اس وقت آپ کے پختہ عمر ہونے کا ایک ثبوت اور بھی ہے ۔ آپ نے ذکر کیا ہے کہ جس شاگرد کی خاطر داری کرتے ہوئے آپ نے 'کسب نامہ' لکھا وہ بچپنے سے آپ کا خادم تھا اور اب بڑی عمر کا ہو کر خدمتِ دین بجا لا رہا تھا ۔ اس لیے ۱۷۰۴ء (۱۱۱۶ھ) کی تاریخ پیدائش جو مولا بخش کشتہ نے دی ہے ، قرین قیاس ہے ۔ ان کی تاریخ وفات ۱۷۰۹ء بتائی گئی ہے ۔ اگر آپ 'کسب نامہ' کی تصنیف کے بعد مزید اکتالیس برس زندہ رہتے تو تصنیفات کی تعداد یقیناً زیادہ ہوتی اس لیے ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے اتنی طویل عمر نہیں پائی ۔

تصنیفات : آپ کی تین تصنیفات 'سی حرفی' ، 'کسب نامہ بافندگان' اور 'باراں ماہ' ، 'دریائے معرفت' کے نام سے اللہ والے کی قومی دکان نے لاہور سے کئی بار طبع کرایا ہے ۔ 'سی حرفی' نصائح پر مشتمل ہے ۔ ہر بند اس مصرعے پر ختم ہوتا ہے ۔ 'فردا لیکھا لیسیا رب قادر جل جلال" ۔ 'کسب نامۂ بافندگاں' کے ۱۶۶ شعر ہیں ۔ اس میں بتایا گیا ہے ۔ کہ بافندگی انبیاء اور صلحا کا پیشہ ہے ۔ بافندوں کے اوزار ہر وقت ذکرِ الٰہی کرتے رہتے ہیں ۔

کانے ہتھ کناں تے دھردے نلے بھی رووݨ سارے
ڈردا خوف خدا دے چرخہ توبہ توب پکارے
یا ھو یا ھو یا اللہ کچ صدا نت کہندی
دنیا ہے برباد ہمیشہ آکھے اٹھدی بہندی
حسبی اللہ حسبی اللہ ہتھا روز پکارے
استغفار پڑھے نت نالی جان ایہہ تانی چاڑے

خواجہ صاحب کا کمال یہ ہے کہ اس کسب کے آداب بتانے کے علاوہ وہ بافندگی سے متعلقہ چیزوں کو استعارہ کی حیثیت دے کر الفاظ کی معنویت بڑھا دیتے ہیں ۔ مثلاً :

بالڈی ننگی صحنک جوٹھی باہر کوئی نہ سٹے
نلیاں والا چوڈ نہ بھالڈا ،ت کوئی کتا چٹے
جھب جھب نلی و کا فقیرا اتنا کیوں اٹکائے
تانی والے پھر پھر جاندے مت کو آستائے

یہاں نلی سے مراد عملِ صالح، تانی سے زندگی اور تانی والے سے فرشتۂ موت ہے ۔ علاوہ بریں

خواجہ صاحب شعر گوئی کے تخلیقی عمل کو بھی بڑی عمدگی سے بافندگی کے اعمال کے ذریعے بیان کرتے ہیں :

جان ایہہ شعر وتن میں بیٹھا کھڈی جا بنائی
دولویں پیر فکر وچہ پھاتھے دل نے اولدہی پائی
گنڈہ گنڈہ دھاگے عقل فکر دے خاصہ شعر بنایا
لائی پان برابر اسنوں تیل نہ بھتا پایا

'باراں ماہ' میں جذبات کی شاعری ہے۔ فکر صرف پس منظر کے طور پر موجود رہتا ہے اور نظم تمام کی تمام عشقِ مہجور کا اثرپرور بیان ہے۔

فرد فقیر کی اور بھی تصنیفات ہیں۔ 'کسب نامۂ بافندگان' کی طرز پر ایک 'کسب نامہ حجاماں'، اور عبدالکریم کی 'نجات المومنین' کی طرح 'روشندل' ہے۔ جس میں فقہ کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ علماء اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ احمد حسین قریشی ان کے ایک 'فقرنامہ' کے قلمی نسخہ کا بھی ذکر کرتے ہیں جو ان کے پاس موجود ہے۔

فرد فقیر کا فقر : آپ اپنے فقر کی بنیاد شرح مصطفوی کی پابندی پر رکھتے ہیں۔ تمام اعمال میں خلوص کو اولیّن حیثیت دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ عبادت چھپ کر کرنی چاہیے :

اندر کرتوں بندگی باہر پردہ پا

بندگی میں ریا کا شائبہ تک نہیں ہونا چاہیے۔ آپ حصول علم ضروری قرار دیتے ہیں مگر اس کا مقصد اصلاحِ باطن قرار دیتے ہیں، حصولِ زر نہیں۔ ہر بات میں تاثیر کے لیے اکلِ حلال ضروری ہے۔ اسی لیے اپنے پیرو کاروں کو وہ کسب اختیار کرنے کی تاکید کیا کرتے تھے اور حلم، قناعت اور انکساری کی تلقین کرتے تھے۔ پرخلوص عبادت، اعمالِ صالح اور اخلاقِ حسنہ کے باوجود آپ کا بھروسہ فضلِ الٰہی پر تھا :

ط۔ طاقت ناہیں عدل دی کریں کریا فضل توشہ ناہیں راہ دا سرتے بھاری منزل

آپ کے فقر کا ایک خاص پہلو ہے۔ مزدوروں اور مفلس لوگوں کی آسودہ حالی آپ کو بڑی عزیز تھی اور آپ نہیں چاہتے تھے کہ کسب کی بنا پر ان کی تذلیل ہو یا جابر لوگ انہیں ستائیں :

حاکم ہو کے بہن دلیجے بھتا ظلم کماندے
محنتیاں نوں کمین آکھن خون انہاندا کھالدے

بھڑو گیارے لے لے جاون خوف خدا دا ناہیں
فرد فقیرا دردمنداں دیاں اک دن پوسن آہیں
یا رب کریں سکال ہمیشہ مٹھے روز نہ آون
ایہہ پھر یار غریب بیچارے رج رج ہتا کھاون

انسان دوستی کا وسیع جذبہ ہمیشہ سے اہل فقر کا امتیازی شعار رہا ہے ۔ اور خواجہ فرد فقیر کو اس سے حصہ وافر ملا تھا ۔

ہاشم شاہ (۱۷۵۲ء - ۱۸۱۱ء)

حالات زندگی : آپ تحصیل اجنالہ ضلع امرتسر کے ایک گاؤں جنگ دیو میں (۱۷۵۲ء/ ۱۱۶۶ھ) میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام حاجی محمد شریف تھا ۔ قریشی النسب تھے ۔ آپ کے دادا حاجی معصوم شاہ بچپنے میں عرب سے جنگ دیو کے ایک ترکھان حاجی کے ساتھ ادھر آئے تھے ۔ ان کے والد حاجی محمد شریف ایک درویش طبع بزرگ تھے ۔ کئی بار حج بیت اللہ سے مشرّف ہوئے ۔ وہ طبیب تھے مگر انہوں نے ساتھ ساتھ لوگوں کی رشد و ہدایت کا سلسلہ بھی جاری رکھا ۔ ان کے خلوص دل اور قلب کی پاکیزگی کا اثر تھا کہ زندگی کی ابتدا ہی میں ہاشم شاہ کے دل میں محبوب حقیقی کی لگن پیدا ہو گئی ۔ والد نے تعلیم و تربیت کی طرف خاصی توجہ دی تھی اسی لیے انہوں نے چودہ سال کی عمر میں عربی فارسی اسلامی علوم پر کافی عبور حاصل کر لیا ۔

والد کی وفات کے بعد ہاشم شاہ صاحب نے بھی سلسلۂ ارشاد جاری رکھا ۔ طبابت کا شغل بھی تھا ۔ ترکھانوں والا کام بھی کرتے تھے ۔ لیکن آپ کو دراصل صرف جذبۂ دل سے سروکار تھا ۔ آنکھیں جمال الٰہی دیکھنے کو ترستی تھیں ۔ اسی جذب و شوق کے عالم میں آپ کی زبان سے اشعار جاری ہو جاتے تھے ۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ (۱۷۸۰ء - ۱۸۳۹ء) کو جب اقتدار حاصل ہوا تو اس نے غالباً ہاشم شاہ کے فقر کی شہرت سن کر ان سے رابطہ قائم کیا ۔ رنجیت سنگھ نے ۱۸۰۱ء میں مہاراجہ کا لقب اختیار کیا تھا ۔ اس وقت ہاشم شاہ کی عمر ۴۹ سال تھی جب ان کا فقر حد کمال کو پہنچ چکا تھا ۔ لہٰذا مہاراجہ رنجیت سنگھ کا معتقد ہو جانا قرین قیاس ہے ۔ ایک دن مہاراجہ کے دربار میں انہوں نے اپنی مندرجہ ذیل ڈیوڑھ پڑھی :

کامل شوق ماہی دا مینوں رہے لت جگر وچ وسدا لوں لوں رسدا
رانجھن بے پرواہی سودا اتے کوئی گناہ نہ دسدا آلھ آلھ لسدا

جیوں جیوں حال سناواں رو رو ، ویکھ تتی ول ہسدا ذرا نہ کھسدا

ہاشم کام نہیں ہر کسی دا عاشق ہون درس دا ہرہوں وسدا

مہاراجہ بڑے متاثر ہوئے اور دیر تک ڈیوڑھ دہراتے رہے ۔ مختلف مواقع پر انہوں نے جنگ دیو اور تھرپال کے گاؤں ہاشم شاہ صاحب کو جاگیر کے طور پر دیے ۔ تھرپال جا کر آباد ہونے کے متعلق شاہ صاحب لکھتے ہیں :

مہاراجہ رنجیت سنگھ کہن جنہوں سرکار مہان سنگھ گھر جمیا مہابلی اوتار

اس نے سانوں بخشیا سی ایہہ پنڈگراں ایس سبب جگدیوں تھرپالین بیٹھے آن

بعض اہلِ علم ہاشم شاہ صاحب کو مہاراجہ کا درباری شاعر ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب ۱۷۹۲ء میں رنجیت سنگھ کا باپ مہا سنگھ مرا تو ہاشم شاہ نے اس کا مرثیہ لکھا تھا اور اس طرح تعلق بڑھتا گیا ۔ اول تو وہ مرثیہ یا اس کا کوئی شعر کسی کو دستیاب نہیں ہوسکا ، نہ ہی اس مرثیہ کی شہادت ان کے باقی کلام سے ملتی ہے ۔ دوسرے ۱۷۹۲ء میں ہاشم شاہ صاحب کی عمر چالیس سال تھی یعنی جب ان کی پختگیٔ فقر کا زمانہ تھا اور یقیناً وہ دربار درای سے بالاتر ہو چکے تھے اور اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں ایک بلند فطرت انسان راست روی اور حق گوئی کے بغیر اور کسی بات کا روا دار نہیں ہوتا ۔ مہاراجہ کے دربار میں انہوں نے جو ڈیوڑھ پڑھی ہے وہ ہمارے خیالات کی تائید کر رہی ہے ۔ اسی حق گوئی کی بنا پر انہوں نے اپنے عہد کی سکھ گردی کی برائی بیان کی ہے :

کہ کجھ حال حقیقت ہاشم ہن دیاں بادشہاں دی

ظلموں کوک گئی اسمانیں دکھیاں روز دلاں دی

آدمیاں دی صورت وسدے واکھش آدم خورے

ظالم چور پلیت زناہی ۔ خوف خداؤں کورے

بس ہن ہور نہ کہو کجھ ہاشم جیوں رب رکھے رہنا

ایہہ گل نہیں فقیراں لائق برا کسے نوں کہنا

یہاں سکھوں کی نازیبا حرکات کا نقشہ بڑی جراٗت سے کھینچا گیا ہے ۔

ہاشم شاہ صاحب نے تین شادیاں کیں ۔ دو برادری میں اور ایک برہمن عورت کے ساتھ ۔ تیسری شادی کی وجہ سے انہیں کچھ آزمائش میں بھی مبتلا ہونا پڑا تھا ۔ آپ کی اولاد بھی تھی ۔ ۱۸۱۱ء/۱۲۲۷ھ میں آپ نے وفات پائی اور تھرپال میں دفن

ہوئے ۔ تقسیم ملک تک آپ کے مزار پر باقاعدگی سے عرس منایا جاتا تھا ۔

تصنیفات : آپ نے دوھڑے لکھے ہیں جو بلند پایہ شعریت اور جذبہ کے حامل ہیں ۔ آپ نے چند ڈیوڑھیں بھی کہیں ۔ آپ کی 'سسّی پنوں' کا مقام بڑا بلند ہے ۔ آپ نے 'سوہنی مہینوال' ، شیریں فرہاد' اور 'ہیر رانجھا' بھی تصنیف کیں ۔ ان کے علاوہ بھی آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں جن میں سے بعض طب اور رمل کے متعلق ہیں ۔ کہا گیا ہے کہ آپ نے ہندی زبان بنارس جا کر سیکھی تھی ۔ اس لیے آپ کے بعض دوھڑے ہندی میں ہیں ۔ پنجابی ادبی اکیڈیمی نے 'ککارے' کے نام سے آپ کے دوھڑوں اور ڈیوڑھوں کے ساتھ 'سسی پنوں' اور 'سوہنی مہینوال' کو ۱۹۶۳ء میں لاہور سے طبع کرا دیا ہے ۔

آپ کا فقر : اپنی تمام تصنیفات میں شاہ صاحب بنیادی طور پر اپنے جذبۂ عشق کو بیان کرتے ہیں ۔ ان کا یہ جذبۂ شوق ، تلاش اور انتظار کے مراحل میں سے گزرتا ہے اور پھر مستقل درد و سوز کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ یہ درد و سوز انہیں بے حد عزیز ہے اور اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ عشاق کا کوئی دین و مذہب نہیں ہوتا ، کیونکہ وہ درد کو ہی اپنا معبود سمجھتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا فقر دین و مذہب کی رسوم ظاہری کی بجائے صرف عشقِ الٰہی کو اپنا مقصود و مدعا بنا لیتا ہے ۔ ان کے لیے زندگی سے مراد عشقِ الٰہی کے بغیر اور کچھ نہیں ۔ فرماتے ہیں :

دل تو ہیں دلبر بھی تو ہیں اتے دید تو ہیں دکھ تیرا
نیندر بھکھ آرام تو ہیں اتے تیں بن جگت اندھیرا
نین پران حیاتی تو ہیں ، تو ہیں تکیہ ڈیرا
ہاشم سانجھ تساڈے دم دی ، ہور وسدا ملک بھنیرا

اپنی شخصیت کے اس بنیادی اور ہمہ گیر نکتے کا ذکر وہ اپنے تمام کلام میں بار بار کرتے ہیں ۔ انہیں جب کسی مثنوی کے تصنیف کرنے کا موقع ملتا تو وہ غیر شعوری طور پر صرف اسی نکتے کو بیان کرتے ہیں ۔ ان کی مثنوی 'سوہنی مہینوال' کی ترکیب اتنی زیادہ منطقی نہیں ، لیکن 'سسّی پنوں' آغاز سے انجام تک نہایت ہی مناسب تدریج کا اظہار کرتی ہے اور ہر نیا مصرعہ ایک خاص عروج کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا ہے ۔ سسّی حقیقت میں ہاشم شاہ صاحب کے اپنے درد و سوز کی علامت ہے ۔ سسی کو سامنے رکھ کر وہ بتاتے ہیں کہ ان کا عشق جو ان کے فقر کی روح ہے کس طرح کھلے دل سے بڑی سے بڑی تکلیف برداشت کرتا ہے اور نہایت ہی زہرہ گداز حالات میں جان

کی بازی لگا دینے کو ادنیٰ سی بات سمجھتا ہے ۔ وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے پروانہ وار آگے بڑھتا ہے پیچھے نہیں ہٹتا ۔ یہ ان کے فقر کا نقطۂ عروج ہے ۔ سسی تپتے ہوئے صحرا میں پنوں کی تلاش میں نکلتی ہے اور جل بھن کر جان دے دیتی ہے ۔ یہ سسی نہیں ، خود ہاشم شاہ ہے ۔ جو ہر آزمائش سے بے نیاز ہو کر اپنے مقصود کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے ۔ اس نقطۂ عروج کا مطالعہ اسی مثنوی سے کرنا مناسب ہو گا :

نازک پیر ملوک سسی دے مہندی نال سنگارے
عاشق ویکھ پھرے اک واری جی تنہاں پر وارے
لو ریت پتی وچ تڑکن ، بھنن جوں بھٹیارے
ہاشم ویکھ یقین سسی دا ، پھیر نہیں دل ہارے

ہاشم شاہ دولت وصال کا بہت کم ذکر کرتے ہیں ۔ نہ تو وہ فلسفۂ عشق کو زیر بحث لاتے ہیں ، نہ وہ اس کیفیت کو بیان کرتے ہیں جو حصولِ وصال کے بعد قلب ماہیت کر دیتی ہے ۔ اور نہ ہی ادراک کی وہ راہیں ان کے سامنے کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں جہاں ظاہری یا باطنی حواس کی رسائی نہیں ہو سکتی ۔ تذکرہ نگاروں نے ذیل کا شعر ان سے منسوب کیا ہے ، مگر اسی مفہوم کا شعر حضرت لال حسین اور حضرت بلھے شاہ سے بھی منسوب ہے :

رانجھن رانجھن کر دی نی میں آپے رانجھا ہوئی
سدو نی مینوں دھیدو رانجھا ہیر نہ آکھو کوئی

لیکن ''آپے رانجھا ہوئی'' کے متعلق ان کے کلام میں شواہد نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ اس لیے نہ تو وہ لال حسین ہیں ، نہ سلطان باھو اور نہ ہی سید بلھے شاہ ۔ البتہ عشق کے جذبۂ بیتاب کے لحاظ سے ان کا مقام بلند ہے ۔ تصوف کے فلسفیانہ پہلو اور عقلیت کا دخل ان کے کلام میں نظر نہیں آتا ۔ مابعد الطبیات سے انہیں سروکار نہیں ۔

نمونۂ کلام : سطور بالا میں ضمناً ہاشم شاہ صاحب کے دوہڑوں ، ڈیوڑھیوں اور مثنویوں کا نمونہ دیا جا چکا ہے ۔ لیکن چونکہ دوہڑے ان کا حقیقی سرمایہ ہیں ان میں سے یہاں مزید دو ایک کا درج کر دینا مناسب رہے گا ۔ ڈیوڑھ ہوی دراصل دوہڑا ہوتی ہے ۔ لیکن فارسی اور اردو میں جس طرح مستزاد کا رواج ہے ان میں بھی ہر مصرعہ کے بعد ایک جملہ ہوتا ہے جو ڈیڑھ یا دو رکن پر مشتمل ہوتا ہے اور بڑے مؤثر انداز میں

مصرعہ کا حقیقی مفہوم دلنشین کراتا ہے ۔ دوہڑوں میں شاہ صاحب نے صوفی کی حیثیت سے اپنے احساسات و جذبات کو قلمبند کیا ہے ۔ ان کا تصوف سرتاپا عشق ہے اور "والّذین آمنوُا اشدّ حباً للہ کی علمی تفسیر ۔ اس عشق کے ہاتھوں وہ جس طرح مجبور ہو چکے ہیں اس کے متعلق کہتے ہیں :

میں وچ دوس نہیں کوئی مولوں مینوں لکھیا لیکھ ُبھلاوے
جس نوں نفر کیتا تقدیروں اوہنوں صاحب کون بناوے
میں گڈی ان ہتھ ڈور کھڈاڑی مینوں خواہش نال پھراوے
ہاشم نرد ہووے جس پاسے اوہنوں پرت پوے دس آوے

وہ عشق کو اپنے لیے نوشتۂ تقدیر سمجھتے ہیں اور یہ جذبہ انہیں جہاں لے جانا چاہتا ہے وہاں جانے پر مجبور ہوتے ہیں ۔

مگر عشق جو ان کی تقدیر ہے انہیں کشاں کشاں آگے لیۓ جاتا ہے وہ صدقِ دل سے آگے کی طرف بڑھتے ہیں ۔ طوفانی سمندروں اور بلاؤں کے درمیان ، یہی صدق ان کا ناخدا اور ہمدم بنتا ہے اور وہ اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں پرواز کرکے بہت کم لوگ پہنچ سکتے ہیں ۔ لامکان ہوتا ہے اور ذات الٰہی کا حضور :

صدق ملاح سمندر تارے جتھے پنچھی پار نہ ہووے
جس جا تھاؤں مکان نہ رہدا تس جا حضور کھلووے
اوڑک مل پوے جھڑا موتی لت مژگاں نال پرووے
ہاشم تاہنگ ہووے جس دل دی اوہ جد کد حاصل ہووے

ان کا جذبۂ عشق خلوص کا قائل ہے ۔ حصول کی طلب ان میں نمایاں نہیں ۔ یہ بھی تصوف میں ایک اعلیٰ مقام ہے ۔ دراصل بے غرض حقیقی محبت کا اظہار ان کی شاعری کی بڑی صفت ہے۔ اس لحاظ سے ان کا یہ دوہڑا بڑا معنی خیز ہے :

اک بہہ کول خوشامد کردے پر غرضی ہون کمینے
اک بے پرواہ نہ پاس کھڑوون پر هوون یار نگینے
کونجاں وانگ ہزار کوہاں تے اوہناں شوق وکھو وکھ سینے
ہاشم ساجن کول ہمیشہ بھالویں وچھڑے ہون مہینے

کہتے ہیں وہ جہاں بھی ہوں خلوص کی بنا پر انہیں ہر وقت وصال محبوب حاصل رہتا ہے ۔

خواجہ غلام فرید (م - ۱۹۰۱ء)

حالات زندگی: شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی (۱۶۵۰ء - ۱۷۲۹ء) نے سلسلہ چشتیہ کا احیاء کرکے تعلیم و تربیت کا جو سلسلہ برصغیر میں ادھر ادھر شروع کیا تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ انیسویں صدی کے اواخر میں ہمیں خواجہ غلام فرید ایسے بلند پایہ بزرگ بہاولپور کے علاقہ میں ایک کثیر آبادی کو رشد و ہدایت کی راہ دکھاتے نظر آتے ہیں - پنجاب میں سلسلۂ چشتیہ کے یہ عروج کا زمانہ ہے - خواجہ محمد سلیمان تونسوی (م - ۱۸۵۰ء) کے خلیفہ خواجہ شمس الدین سیالوی (م - ۱۸۸۲ء) اور حضرت سیالوی کے خلیفہ اکبر خواجہ غلام حیدر علی شاہ جلالپوری (م - ۱۹۰۸ء) خواجہ غلام فرید کے معاصر ہیں -

خواجہ صاحب ۲۶ نومبر ۱۸۴۵ء کو چاچڑاں میں پیدا ہوئے - "خورشید عالم / ۱۲۶۱ھ" آپ کا تاریخی نام ہے - والد صاحب کا اسم گرامی مولانا خدا بخش تھا ، جو سکھوں کے مظالم سے تنگ آکر اپنے وطن مٹھن کوٹ کو ترک کرکے ریاست بہاولپور کے شہر چاچڑاں میں چلے آئے تھے - نواب بہاولپور نے لنگر کے اخراجات کے لیے چند مواضع پیش کیے مگر آپ نے قبول نہ کیے - آپ کا وصال ۱۸۵۳ء میں ہوگیا - اس لیے خواجہ غلام‌فرید کی ظاہری اور باطنی تربیت آپ کے بڑے بھائی خواجہ غلام فخرالدین نے کی - نواب صادق محمد خاں والئی ریاست کی استدعا پر آپ کی پرورش شاہی محل صادق گڑھ میں ہوئی - اس لیے زندگی بھر اسی محل کو آپ اپنا گھر تصور فرماتے رہے - سولہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ ہمہ تن باطنی علوم کے سیکھنے میں مصروف ہوگئے اور سلوک اور معرفت میں کمال حاصل کیا - ویسے جہاں تک کتب بینی کے شوق کا تعلق ہے اسے عمر بھر قائم رکھا - تاریخ و جغرافیہ ، تصوف ، فقہ ، حدیث ، تفسیر ، منطق ، علم الانساب ، جفر ، رمل ، نجوم موسیقی تمام علوم سے آپ کو شغف تھا - اس لیے تبحر علمی پیدا ہوگیا تھا -

ایک عرصہ سے آپ کے خانوادہ میں فقر و تصوف کا چرچا تھا - فاروق النسل تھے - آپ کے ایک بزرگ مخدوم نور محمد کو شاہ جہان نے پانچ ہزار بیگھہ اراضی عطا کی تھی - اور آپ کے پردادا قاضی محمد عاقل کے ساتھ آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو بڑی عقیدت تھی - شاہی قلعہ والوں کا یہ نیاز مندانہ تعلق آپ کے والد ماجد مولانا خدا بخش سے بھی جاری رہا - بہادر شاہ ظفر کے پوتے مرزا احمد اختر نے یہ سلسلہ جاری رکھتے ہوئے خواجہ غلام فرید کی بیعت کی اور آپ کے حالات پر مشتمل ایک مستند کتاب 'مناقب فریدی' دو جلدوں میں لکھی -

آپ کی طبیعت میں وقار تھا اور شعر و نغمہ اور مناظر فطرت سے لگاؤ رکھتے تھے ، جو لطافت ذوق و احساس کا ثبوت ہے۔ ۱۸۷۶ء میں آپ براستہ لاہور دہلی اور بمبئی حج پر گئے۔ ایک سو ہمراہیوں کا خرچ خود برداشت کیا۔ عرب پہنچ کر بڑی دولت تقسیم کی۔ آپ قرآن و حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ اہلِ اللہ کی زیارت کا شوق تھا۔ ہفت زبان تھے۔ آپ کا وصال ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء کو ہوا۔ مزار مٹھن کوٹ میں ہے۔

آپ کا معاشرہ : آپ کے کلام میں چولستان کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ وہاں روہی میں آپ سالہا سال تک رہے اور مٹھن کوٹ ، چاچڑاں یا کہیں اور جانا پڑتا تھا تو روہی کے فراق میں اسے مخاطب کرکے کافیاں لکھا کرتے تھے۔ صحرا میں بارش کا برسنا ، ہر طرف گھاس کی روئیدگی ، گایوں کا گھاس کھا کر فربہ ہونا اور دودھ دینا ، پچھلی رات کی سہانی گھڑیوں میں ہر طرف دودھ بلونے کی آواز ، ان باتوں کے علاوہ بارش کا پانی جمع کرنے کے لیے وہاں کھلے تالابوں کا ہونا ، کریر اور ٹون کے درخت ، پھوگ اور کھپ کے پودے ، موسم آنے پر پیلو اور ڈیھلے کے پھل اور چھیاں لے کر عورتوں کا گروہ در گروہ چننا ، چاندنی راتوں میں ان کا کھیلنا اور آرائش جمال کے لیے کجلے اور سرمے کا استعمال الغرض انہوں نے اپنے کلام میں صحرا کی زندگی کی مکمل منظر کشی کی ہے۔

خواجہ صاحب کے متصوفانہ افکار : آپ کے افکار کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ کے خیالات پر عہدِ فراق کا غلبہ ہے یعنی جس طرح اکابر صوفیہ کہتے ہیں ، خواجہ صاحب کا بھی خیال ہے کہ تخلیق سے پہلے جملہ حادث اشیاً ذاتِ احدیت میں پنہاں تھیں ، اس نہانخانہ سے علیحدگی خواجہ صاحب کے افکار کا محور ہے۔ یہ نظریہ دراصل ابن العربی نے پیش کیا تھا۔ اور رومی نے اسے بڑی شدومد کے ساتھ اپنی مثنوی میں بیان کیا۔ خواجہ صاحب کی واحد آرزو یہی ہے کہ مراجعت اسی نہانخانۂ ازل میں ہو جائے جہاں ہر طرف جلوہ ہی جلوہ تھا۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے ذاتِ واحد کے جلوے انہیں فقط گاہے گاہے مناظر فطرت میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا انعکاس انہیں اپنے باطن میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ جب انشراح ہوتا ہے تو وہ خوش ہو کر اشعار میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ کائنات کا گوشہ گوشہ انہیں مہبطِ انوار نظر آتا ہے اور وہ کہنے لگ جاتے ہیں :

ہے یار دا جلوہ ہر ہر جا سبحان اللہ سبحان اللہ

خواجہ صاحب نے اپنے کلام میں اتحادِ کامل حاصل ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔ کئی مواقع پر آپ نے حضرت لال حسین لاہوری اور سید بلھے شاہ کی طرح کہا :

ہن میں رانجھن ہوئی
رانجھن لوں لوں رلیا ہے
نہیں قال بےشک حال ہے
پل پل اساڈے نال ہے

لیکن اتحاد اور معیت کے مطالب ان کے فکر میں اتنا بڑا مقام نہیں رکھتے، جتنا رومی کی طرح ان میں دردِ فراق کو غلبہ حاصل ہے۔ وہ مابعد الطبیعیاتی تناظر کو ترک کرکے عام انسانوں کی طرح فنا کا جائزہ بھی لیتے ہیں جو ہر علمی، روحانی اور دنیوی کمال کا خاتمہ کردیتی ہے اور اس سے عبرت کا درس دیتے ہیں۔ آپ نے اپنے کلام میں "انہد" کی واردات کا بھی ذکر کیا ہے جو ہندو یوگیوں کی اصطلاح ہے اور جس سے صدائے قلب مراد ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے سامنے اصل حقیقت تھی۔ اس راہ میں وہ تنگ نظری کو دخیل کار نہیں ہونے دیتے تھے۔

خواجہ صاحب کی تصنیفات اور آپ کے متعلق کتابیں: عقائد و اعمالِ صالحہ کے متعلق آپ کی تصنیف 'فوائد فریدیہ' ہے۔ آپ کے ملفوظات، 'مقابیس المجالس' یا 'اشارات فریدیہ' کے نام سے جمع کیے گئے تھے۔ آپ اردو زبان میں بھی شعر کہا کرتے تھے۔ چنانچہ دیوانِ اردو بھی طبع ہوا تھا مگر آپ کا اصل سرمایہ ملتانی زبان میں کہی ہوئی کافیاں ہیں اور انہی کی بنا پر بالخصوص ملتان اور بہاولپور کی طرف 'فرید، فرید' کی گونج سنائی دیتی ہے۔ آپ کے کلام کا نمائندہ انتخاب بزمِ ثقافتِ ملتان کی طرف سے 'کلامِ فرید' کے نام سے طبع ہوا ہے۔ علاوہ بریں کشفی ملتانی صاحب نے کلام فرید کا منظوم اردو ترجمہ بھی 'نغمہ صحرا' کے نام سے کیا ہے۔ ان تالیفات سے پہلے ضخیم دیوانِ فرید ۸۴۸ صفحات پر مشتمل بڑے محاسن صوری کے ساتھ عزیز المطابع پریس بہاولپور سے چھپا تھا۔ خواجہ صاحب کے حالاتِ زندگی سے تعلق رکھنے والی چار کتابیں 'مناقب فریدی'، 'گوہرِ شب چراغ'، 'ہفت اقطاب' اور 'فقرِ فرید' ہیں۔

آپ کا اسلوب شعر گوئی: خواجہ صاحب کی شخصیت اور آپ کے فکری سرمایہ کے متعلق سطور بالا میں ذکر ہو چکا ہے۔ شخصیت اور افکار ہی دراصل اسلوب کو تشکیل دیتے ہیں۔ آپ صاحبِ حال صوفی تھے۔ جب حال طاری ہوتا تھا، وفورِ شوق و محبت اور درد و سوز میں خود بخود نئی کافیاں تخلیق ہو جاتی تھیں۔ بعض اوقات کیفیت تخلیقی اس قدر طویل ہوتی تھی کہ آپ لمبی لمبی کافیاں ایک ہی نشست میں کہہ لیتے تھے۔ مثلاً مستانی مطول، ایکاسی قسم کی کافی ہے جس میں پچیس چھبیس بند ہیں اور وہ احوال و مقاماتِ تصوف پر مشتمل ہے۔ آپ جس علاقے میں رہتے تھے وہ جیسلمیر، پتن

سندھ اور مارواڑ سے قریب تھا ۔ ایک طرف ملتان اور ڈیرہ غازی خان کے علاقے تھے ۔ اس لیے آپ نے وہ تلمیحات اور علامات استعمال کیں جو ان تمام علاقوں میں رائج تھیں ۔ اسی لیے پنل (پنوں) ، سالول (سا نولے رنگ والا محبوب) آپ کے کلام میں بار بار استعمال ہوئے ہیں ۔ رانجھا بھی آپ کی مرغوب تلمیح ہے ۔ آپ نے جس زبان کو ذریعہ اظہار بنایا وہ بنیادی طور پر ملتانی پنجابی تھی ۔ یہ زبان بڑی شیریں ہے ۔ خواجہ صاحب نے اس میں فارسی کے الفاظ کا بر محل استعمال بڑی مقدار میں کیا ۔ اس لیے ان کی زبان شیریں تر بن گئی ۔ ہندی زبان کی طرح آپ کے کلام میں عورت ہی عاشق ہے ۔ چونکہ آپ کی کافیوں میں صحیح جذبات عشق و محبت بڑے شاعرانہ اسلوب میں بیان ہوئے ہیں جو ان علاقہ والوں کے اپنے جذبات تھے اس لیے آپ کے کلام کو قبولیتِ عامہ کا شرف حاصل ہوگیا ۔

نمونۂ کلام : اب ہم ذیل میں نمونہ کے طور پر خواجہ صاحب کی ایک مختصر سی کافی نقل کرتے ہیں اور پھر اس پر ضروری بحث کرکے اپنا بیان ختم کرتے ہیں :

درد اندر دی پیڑ ڈاڈھا سخت ستایا
ہجر فراق دے تیر دل نوں مار موٹھایا

عشق ہے ڈکھڑے دل دی شادی
عشق ہے رہبر مرشد ہادی
عشق ہے ساڈا پیر جیں کل راز سجھایا

اے دل مٹھڑی گندڑی مندڑی
جاون لادی برھوں دی بندڑی
ازلوں تانگھ دا تیر جانی جوڑ چوبھایا

ناز تبسم' کجھڑے ہاسے
چالے پیچ ، فریب دلاسے
حسن دے چار امیر جنھاں چوگوٹھ نوایا

وٹھڑی بالی سدا متوالی
مینہ وسراندتے والی آلی
روہی رشک ملمیر ویندا بخت ولایا

تھیاں سر سبز فرید دیاں جھوکاں
سبھجوں خشک چائی سوکاں
لند نہ ساون کھیر   مولا ماڑ وسایا

یہ کافی ایک ہی کیفیت تخلیقی کی پیداوار ہے ۔ شاعر دردِ فراق سے مجبور ہو کر قلم اٹھاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے اظہار سے اپنے دل کو ہلکا کرے ۔ اس کا ذکر ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ تخیل نے وسیع تر فضاؤں میں پرواز شروع کر دی اور شاعر کو بتایا کہ دردِ عشق تو ایک نعمت ہے اسی وجہ سے ہجر محبوب نہ صرف قابلِ برداشت ہو جاتا ہے ۔ بلکہ اس کی بدولت محبوب تک رسائی بھی حاصل ہوتی ہے ۔ اس لیے وہ بے اختیار ہو کر عشق کو موجب مسرت ، اپنا ہادی ، رہبر اور پیر و مرشد کہتا ہے ۔ اس وقت اس پر منکشف ہوتا ہے کہ " یہ جذبہ تو میرے دل میں روزِ تخلیق سے شروع ہو گیا تھا ۔ میں بالکل بے حقیقت اور ناچیز تھا ۔ لیکن محبوب نے مجھے اپنے لیے منتخب کر لیا اور تیر عشق اس طرح تاک کر چلایا کہ ہمیشہ کے لیے میرے سینے میں پیوست ہو گیا'' ۔

عملِ تخلیقی کے دوران میں شاعر کو بڑی شدت کے ساتھ اس امر کا احساس ہوا کہ اسے اپنا بنانے کے لیے محبوبِ ازل نے عام حسینوں کی طرح پوشیدہ ناز و تبسم ، درپردہ مذاق ، پیچیدہ چالوں اور فریب آمیز دلاسوں سے کام لیا ۔ حقیقت حقہ اسی طرح مخفی اشاروں سے صاحب دل لوگوں کو اپنی طرف بلاتی ہے اور یہ اس کا بہت بڑا احسان ہوتا ہے ۔ ورنہ بلبل چہ خبر داشت کہ گلزارے ہست ۔ جب شاعر کو درد عشق اسی طرح نعمت غیر مترقبہ کی صورت میں نظر آیا تو اس نے کہا! ''میں تو مشتِ خاک تھا ۔ ایک لق و دق صحرا کی طرح بالکل بے آب و گیاہ ۔ لیکن عشق اچانک ابرِ رحمت بن کر برسا اور جس طرح روہی بارش کی وجہ سے رشک ملیر[1] بن جاتی ہے میرا وجود بھی رشک فردوس بن گیا ۔ اس میں سے محبتِ الٰہی کے سوتے اسی طرح رواں ہو گئے جس طرح بارش کے دنوں میں صحرائی گایوں کے خشک تھنوں سے گھاس کی بہتات کے سبب دودھ بہنے لگتا ہے اور مارواڑ کا علاقہ از سر نو آباد اور خوشحال ہو جاتا ہے''۔ ظاہر ہے یہ پوری کافی خواجہ صاحب کے اپنے حال کی تفسیر ہے[2] ۔

---

(۱) کراچی سے پندرہ میل دور سرسبز مقام
(۲) خواجہ فرید سے مفصل بحث علاقائی ادبیات جلد دوم میں 'سرائیکی ادب' میں کی گئی ہے ۔

پنجابی کی صوفیانہ شاعری کا مجموعی جائزہ

برِ صغیر میں روحانیت کا چرچا مدت سے تھا ، اور جوگ کی رسم کوئی نئی بات نہ تھی - ہر شہر میں جوگی اور جوگنیں یہ دعویٰ کرتے تھے کہ انہوں نے سب دنیاوی خواہشات کو تیاگ کر ساری زندگی روح کی پرورش اور اس کے روحِ کل سے حاصل کی ہوئی لگن میں صرف کر دی ہے - پنجاب کے دیس میں بھی یہ کیفیت موجود تھی - یہاں کے لوگ بھی روحانیت کو مذہبی زندگی کا ایک اعلیٰ و ارفع شغل تصور کرتے تھے - چنانچہ جب مسلمان یہاں آئے تو انہوں نے بھی اپنی روحانی تشنگی کو دور کرنے کی خاطر ریاضت میں کسی قسم کی کمی نہ کی - دنیائے اسلام میں ادھر آدھر فقر و تصوف مقبول تھا - لیکن برِ صغیر میں اس میں زیادہ شغف دیکھ کر مسلمانوں نے غالباً اس کی طرف زیادہ توجہ دی اور اسے اشاعتِ اسلام کا ذریعہ بھی بنایا -

پنجاب میں روحانیت کے ساتھ مسلمانوں کے شغف نے جو نتائج دکھائے وہ کئی لحاظ سے ممتاز ہیں - نہ صرف یہ کہ یہاں بڑے بڑے صوفی پیدا ہوئے بلکہ انہوں نے جس عمدگی کے ساتھ پنجابی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا وہ تعجب خیز ہے - چودھویں صدی کے آخر تک پنجابی ایک منجھی ہوئی زبان بن چکی تھی - دراوڑوں ، آریاؤں ، بدھوں ، یونانیوں ، گرجاروں وغیرہ اقوام نے اس کو وسیع ذخیرۂ الفاظ عطا کیا ہوا تھا ، اظہارِ مطالب کی اس میں اہلیت موجود تھی اور اس میں ہر قسم کے افکار و خیالات پیش کرنے کا وسیلہ پایا جاتا تھا - ہمارے صوفیائے کرام نے پنجابی زبان کی ان ممکنات کو سمجھ کر ان سے فائدہ اٹھایا - انہوں نے دیکھا کہ کسی اور زبان کے اسالیب بیان کا سہارا لیے بغیر وہ ہر قسم کے خیالات بڑے حسن و کمال کے ساتھ پنجابی میں بیان کر سکتے ہیں - اس لیے انہوں نے جو کچھ کہنا تھا دل کھول کر کہا - باریک سے باریک معنی یا لطیف سے لطیف خیال کو ادا کرنے میں انہیں کو دقت پیش نہ آئی - افکار ان کے اپنے تھے - زبان مقامی تھی - زبان کی ثروتِ الفاظ میں انہوں نے خود بھی اضافہ کیا - عربی ، فارسی اور ترکی کے الفاظ ہندوؤں کے ساتھ میل جول کے ذریعے انہوں نے پنجابی زبان میں اس طرح شامل کیے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ پنجابی کے نہیں حتیٰ کہ بابا گورو نانک اور دوسرے ہندو سکھ ادیب اور شعراء ان کو اپنی مادری زبان کے الفاظ سمجھ کر استعمال کرنے لگ گئے اور گرو گرنتھ میں عربی ، فارسی اور ترکی کے وہی الفاظ اب شانِ تقدیس کے ساتھ موجود ہیں -

گورو نانک کی وفات ۱۵۳۹ء میں ہوئی - شاہ حسین جو ہمارے پہلے صوفی شاعر ہیں ،

ان کا سال پیدائش بھی یہی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس ماحول میں انہوں نے پرورش پائی، اس میں وہی زبان بولی جاتی تھی جو گورو نانک کی زبان تھی ۔ اور گرو گرنتھ میں موجود عربی ۔ فارسی اور ترکی کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی اپنی زبان تھی جس کے ارتقاء میں انہوں نے بڑا حصہ لیا تھا اور جو اس قابل ہو چکی تھی کہ اس میں جدید مذہبی اور صوفیانہ خیالات آسانی سے بیان کیے جا سکیں ۔ چنانچہ جس بے ساختگی سے شاہ حسین (م - ۱۵۹۹ء) نے شعرگوئی کی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان میں لچک اور معنی خیزی موجود تھی ۔ لال حسین کے کلام میں محبت و شیفتگی پائی جاتی ہے ۔ اس میں وہی جذبہ عشق اور مستی موجود تھی جو بھکتی شعراء نے مسلمان صوفیائے کرام کے تین سو سالہ پرخلوص جذبے، عشقِ الٰہی، ذوق و شوق اور انسان دوستی سے متاثر ہوکر اپنے اندر پیدا کی تھی۔ چنانچہ حضرت لال حسین کی شیفتگی میں اور اس لگن جو میرا جی اور بھگت کبیر یا بعد میں تلسی داس کے بھجنوں میں پائی جاتی ہے بڑی مماثلت ہے ۔ زبان اور جذبات و خیالات کے لحاظ سے ہم شاہ حسین کے ماحول کو نظر انداز نہیں کر سکتے ۔ اگر ایک طرف اگر بھکتی کی آواز بلند ہو چکی تھی تو دوسری طرف اسی جاذبیّت کے ساتھ شاہ حسین نے اسلامی فقر کی صدا لگائی جس کی روایت حضرت اویس قرنی اور حضرت خواجہ حسن بصری کے زمانے سے اسلامی معاشرہ میں چلی آ رہی تھی ۔ چانچہ بھکتی تحریک کا جواب مسلمان صوفیائے کرام اور صوفی شعراء نے اپنے والہانہ اظہارِ عشق سے دیا جو قلب و نظر دونوں کے لیے سرشاری کا پیغام لایا اور روح کے لیے تسکین کا باعث ہوا ۔

شاہ حسین کے کلام میں سپردگی کی بڑی کیفیت ہے ، ابیاتِ سلطان باہو میں توانائی ہے اور بلّھے شاہ کی کافیوں میں عرفان کی درخشندہ جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔ مؤخر الذکر دونو صوفی شعراء کے کلام میں وثوق اور گیرائی بلکہ بیباکی ہے جو شاہ حسین کی سپردگی کا تقابل پیش کرتی ہے ۔ دنیائے ادب میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جو اس صفت کے لحاظ سے شاہ حسین کا ہم پلہ ہو ۔ وہ اپنی جان و آبرو ، اپنا مال و متاع ، اپنے دوست اور رشتہ دار یعنی اپنا سب کچھ اپنے محبوب کے لیے ترک کر دیتے ہیں اور اس پر خوش ہیں ۔ یہ سب کچھ دے کر وہ ایک سچے عاشق کی طرح فقط محبوب کی خوشنودی کے طالب ہیں ۔ مگر وہ جس قدر اپنی خودی کو مٹاتے چلے جاتے ہیں اسی قدر ان کے محبوب یعنی ذات حق، کا جلال و کمال آشکارا ہوتا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں ان کے پرتاثیر کلام کو پڑھ کر ذاتِ خداوندی کی عظمت اور کبریائی کا احساس گہرا ہو جاتا ہے ۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ اپنے آپ کو مٹا کر شاہ حسین نے ذاتِ الٰہی کی بقا کو نمایاں کیا ہے ۔ ان کا محبوب ان کی وجہ سے ایک خاص رفعت و شان کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے آتا ہے ۔ شاہ حسین کی شاعری کا یہ خصوصی پہلو ہے جو کسی اور صوفی شاعر

کے ہاں نظر نہیں آتا ۔

متصوفانہ شاعری میں روحِ انسانی کو روحِ کل سے وصال کے لیے بیتاب اور سرگرداں' دکھایا جاتا ہے اور اس کے لیے مختلف علامات استعمال کی جاتی ہیں۔ اس لیے شاعری میں روحِ انسانی کے لیے رادھا اور روح کل کے لیے کرشن کی علامات اختیار کی گئی ہیں ۔ ہمارے پنجابی شعراء نے ان تعلیمات کو گوارا نہیں کیا ، سوائے اس کے کہ شاہ حسین نے کہیں شیام کا استعارہ استعمال کیا ہے ۔ یہ اس لیے کہ وہ اسلامی توحید کے علمبردار تھے اور رسول اللہ' کی تعلیمات کو یہاں رائج کرنا چاہتے تھے ۔ کرشن اور رادھا کو علامت کے طور پر اختیار کیا جاتا تو لوگوں کے ذہن ان کے ماضی سے الگ نہ ہو پاتے ۔ بھکتی تحریک کا بنیادی طور پر مقصد ہی یہی تھا کہ مسلمانوں کو ہندو معاشرے میں جذب کر لیا جائے ۔ اگر ان علامات کا استعمال جاری رہتا تو مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو نقصان پہنچتا ۔ دوسرے کرشن اور رادھا کا تعلق بیرون پنجاب سے تھا اور ہمارے شاعر اپنی تمام لسانی اور اسلوبی ضروریات پنجاب ہی سے پورا کرنا چاہتے تھے ، کیونکہ وہ پنجاب کے معاشرہ کو مخاطب کر رہے تھے ۔ اس لیے انہوں نے اس غرض کے لیے ان کرداروں کو منتخب کیا جو اہلِ پنجاب کے تخیّل میں رچے ہوئے تھے ۔ انہوں نے روحِ انسانی کے لیے ہیر اور روح کل کے لیے رانجھا یا رانجھن کے استعارات استعمال کیے ، جو پنجابی شاعری کے لیے موزوں اور مناسب تھے اور اس طرح بڑا قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ۔ وارث شاہ جب ہیر کی زبان سے یہ مصرعہ کہلواتا ہے :

بھلا موئے تے ''وچھڑے'' کون میلے اینویں جیوڑا لوک ولاوندا ای

تو اس میں بھی روحِ کل سے روحِ انسانی کی جدائی کا تصور کام کرتا نظر آتا ہے ۔ ہیر اور رانجھا کی یہ حیثیت میاں محمد (م ۔ ۱۹۰۴ء) کی مثنوی 'سیف الملوک' کے مندرجہ ذیل دو اشعار سے پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے :

جنہاں ہک گھٹ بھر کے پیتا وحدت دے زلالوں
علم کلام نہ یاد رہیا تے گذرے قال مقالوں
دوئے جہان بھلائے دل توں خبر نہ رہی اسے والوں
رانجھے وچ سما محمد چھٹی ہیر جنجالوں

یہاں لفظ ' سمانا ، بتا رہا ہے کہ روح انسانی اور روح کل کا وصال ہو گیا اور پھر استعارہ

---

۱ ۔ اس لحاظ سے رومی کے یہ اشعار تو کلاسکی حیثیت رکھتے ہیں :

بشنو از نے چوں حکایت میکند — وز جدائی ہا شکایت میکند
چوں مرا از نیستاں ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

ہیر اور رانجھے کا استعمال ہوا ہے جو خالصتاً پنجاب سے تعلق رکھتا ہے ۔ یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ بالخصوص آخری مصرعے میں کس بلا کی آمد ہے ا۔۔۔ یہ بات پنجابیوں کے تخیل سے ان استعاروں کی کامل ہم آہنگی کی دلیل ہے ۔

پنجاب کی اپنی زبان اور یہاں کے اپنے استعارات کے ذریعے مطالب اور معانی کو بیان کرنا اور دوسری زبانوں کے ادب سے کچھ بھی مستعار نہ لینا ، پنجابی کے صوفی شعراء کا عظیم کارنامہ ہے ۔ پنجاب دریاؤں کی سر زمین ہے ۔ یہاں کی معیشت بھی زرعی ہے ۔ گائیں بھینسیں، ہوتی ہیں جن کا دودھ بلونا جاتا ہے ۔ کپاس بوئی جاتی ہے اور عورتیں چرخہ کاتتی ہیں ۔ یہ تمام باتیں پنجابی کی صوفیانہ شاعری میں رمزیت و اشاریت کے طور استعمال ہوئی ہیں اور شاہ حسین سے لے کر خواجہ غلام فرید تک تمام صوفی شعراء نے ان سے کام لیا ہے ۔ شاہ حسین اور بلھے شاہ خصوصیت سے دریا اور چرخہ سے متعلق استعارات کے ذریعے تمام رموزِ فقر دبان کر جاتے ہیں ۔ حضرت سلطان باہو کے ماحول میں تربوز اور گمے تھے ۔ ان "دو لے کر انہوں نے ایسے حقائق بیان کیے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے ۔ فارسی یا اُردو زبان میں ہمیں اس پایہ کا کوئی شعر نہیں ملتا ملاحظہ ہو :

ن ۔ نال کوسنگی سنگ نہ کرئیے کل لوں لاج نہ لائیے ہو
تمے تربوز مول نہ ہندے توڑے توڑ مکے لے جائیے ہو
کاواں دے بچے ہنس نہ تھیندے توڑے موتی چوگ چگائیے ہو
کوڑے کھوہ نہ مٹھے ہندے باھو توڑے سے مناں کھنڈ پائیے ہو

یہاں جن جن چیزوں کے نام لیے گیے ہیں وہ تمام سلطان صاحب کے اپنے ماحول میں ملتی ہیں ۔ اسی طرح باقی شعراء نے یہیں کے پرندوں ، جانوروں اور جغرافیائی ماحول کا ذکر کیا ہے ۔ معاشرے کے رسم و رواج بھی اپنے گرد و پیش کے ہیں ۔ پنجاب لسانی ، اسلوبی اور فکری لحاظ سے انہیں اس قدر معمور نظر آیا کہ انہیں ادھر اُدھر سے کوئی بات یا علامت یا تلمیح مستعار نہ لینی پڑی ، چنانچہ ایسا کلام تخلیق ہوا جس کی روح ہماری زندگی سے کامل مطابقت رکھتی ہے اور ہمارے دل میں اعتماد پیدا کرتی ہے کہ ہمارے ماحول میں بڑی معنویت موجود ہے ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اسی بنا پر پنجابی صوفی شاعری میں خاص آفاقیت پیدا ہو گئی جو جغرافیائی حدود سے ماورا ہے ۔

ان صوفی شعراء سے متعلق ایک اور بات بھی خاص توجہ کی مستحق ہے ۔ شاہ حسین (م - ۱۵۹۹ء) سے لے کر خواجہ غلام فرید (م - ۱۹۰۱ء) تک لگا تار متعدد شعراء نے تصوف کو اپنا موضوع بنایا ۔ ان میں سے ہر ایک اعلیٰ درجہ کا صوفی ہونے کے علاوہ

بلند پایہ شاعر بھی تھا ۔ شاہ حسین ، سلطان باھو ، بلّھے شاہ ، علی حیدر ، خواجہ فرد فقیر ، ہاشم ، غلام رسول ، میاں محمد ، خواجہ غلام فرید ان میں سے کون ہے جس نے فقر کے مقامات عالیہ حاصل نہیں کیے ، اسی لیے ان کے کلام میں تازگی اور زندگی کا دور دورہ ہے ۔ ان میں شاہ مراد (م - ۱۷۰۲ء) کو بھی شامل کر لیجیے اور اس صدی کے ربع اول کے ایک اور دہرہ نویس الٰہی بخش کو بھی ذہن میں رکھئیے ۔ الٰہی بخش پنڈ دادنخان ، ضلع جہلم کے ایک بزرگ تھے ۔ ان کے اسرارِ معرفت سے لبریز دہرے عمر حیات خان ٹوانے کی وساطت سے طبع بھی ہوئے تھے اور قوالی کی محفلوں میں اس طرف آج بھی گائے جاتے ہیں ۔ اتنی تعداد میں صوفی شاعر شاید دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں ملتے ۔

اور پھر یہ صوفی شعراء تارک الدنیا قسم کے لوگ نہیں تھے ۔ معاشرے میں رہ کر اور معاشرتی اور گرہستی زندگی کے فرائض کا حصہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے جذبۂ فقر کی پرورش کی ۔ وہ دوسروں کے رنج و غم میں برابر شریک ہوتے رہے ۔ نادر شاہ افغان ، احمد شاہ ابدالی ، سکھوں اور انگریزوں کی وجہ سے عوام کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا ، ان کا ذکر وہ بڑے دردِ دل کے ساتھ اپنے کلام میں کرتے ہیں ۔ وہ عوام کے ہمدرد تھے ، پریشانی کے وقت ان کا سہارا بنتے تھے اور اپنی پاکیزہ سیرت کے ذریعے ان کے اخلاق سنوارتے تھے ، ان کو روحانیت کا درس دیتے ، انہیں برتر زندگی کی نوید دیتے تھے اور انہیں متحد اور متفق رکھتے تھے ۔ ایک بزرگ سے وابستگی بے شمار لوگوں کو ایک ہی مسلک میں پرو دیتی تھی ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان صوفی شعراء کا وجود ہر لحاظ سے معاشرہ کے لیے خیر و برکت اور جامعیت کا موجب تھا اور وہ معاشرہ کی اقدار کو مستحکم کرنے اور اخلاق زندگی کو استقامت دینے میں ایک اہم کردار ادا کر گئے ۔

باب چہارم

(پنجابی کی منظوم داستانیں)

(فصل دوم)

منظوم داستانوں کی کہانیاں

ہیر رانجھا

ضلع سرگودھا کے مشہور قصبہ تخت ہزارہ میں ایک معزز زمیندار چوہدری موجو رہتا تھا ۔ اس کے سب سے چھوٹے لڑکے کا نام دھیدو تھا جو بعد میں اپنی ذات کی نسبت سے رانجھا کے نام سے معروف ہوا ۔ باپ کا لاڈلا بیٹا ہونے کی وجہ سے کھیتی باڑی کے کاموں سے ناآشنا رہا اور جب باپ مر گیا تو بھائیوں کے حسد اور بھابیوں کے طعنوں کا نشانہ بنا ۔ آخر ایک روز اس نے تنگ آ کر گھر کو خیر باد کہہ دیا اور ایک طرف کو روانہ ہو گیا ۔ جھنگ کے قریب دریائے چناب کے کنارے اس کی ملاقات ہیر سے ہوئی ۔ ہیر اس کے مردانہ حسن سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے باپ سے کہہ کر رانجھے کو اپنے ہاں بھینسیں چرانے پر ملازم رکھوا لیا ۔ دونوں کی ملاقاتیں ہوئیں اور دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے ۔ عشق و محبت کے قول و اقرار ہوئے۔ بات چھپی نہ رہی ۔ چنانچہ ہیر کے ماں باپ نے اس کی شادی موضع رنگ پور کے رئیس کے بیٹے سیدھے سے کر دی ۔ رانجھا مایوس و نامراد واپس اپنے گھر لوٹ آیا ۔ اور گرو بالناتھ کے پاس جوگ لینے کی غرض سے چلا گیا ۔ گرو کی دعا سے اس میں کچھ روحانی صفات پیدا ہو گئیں اور وہ فقیر بن کر ہیر کے در پر جا پہنچا ۔ یہاں ہیر کی نند سہتی ان کی راز دار بن گئی ۔ ایک روز دونوں اس کی مدد سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ، لیکن پکڑے گئے ۔ مگر ہیر نے کھیڑوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا ۔ اب مقدمہ قاضی کے سامنے پیش ہوا ۔ قاضی نے ہیر کی بد دعا کے خوف سے اسے رانجھے کے حوالے کر دیا ۔ مگر ہیر کے والدین نے رانجھے کو کہا کہ وہ باقاعدہ بارات لائے اور ہیر کو بیاہ کر لے جائے ۔ ادھر رانجھا اپنے گھر بارات لینے گیا ، آدھر ان لوگوں نے بدنامی

کے خوف سے ڈر کر ہیر کو زہر دے کر مار ڈالا ۔ رانجھے کو جب خبر ہوئی تو وہ بھی روتا ہوا ہیر کی قبر پر پہنچا اور وہیں اس نے جان دے دی ۔

سوہنی مہینوال

گجرات شہر میں عزت بیگ نامی ایک کوزہ گر رہتا تھا جس کے فن کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی ۔ اس کی ایک لڑکی تھی جو اپنے حسن و جمال کی مناسبت سے سوہنی کے نام سے معروف تھی ۔ اسی زمانے میں ایک سوداگر بخارا واپس جاتے ہوئے گجرات میں رکا ۔ سوہنی کی تعریف سن کر عزت بیگ کی دکان پر پہنچا اور اس کے حسن کا شکار ہوگیا ۔ روزانہ عزت بیگ کی دکان سے مہنگے داموں برتن خرید تا اور سستے داموں بیچنے لگا ۔ اس طرح ساری دولت لٹا کر عزت بیگ کا ملازم ہوگیا ۔ سوہنی بھی اس کی چاہت میں بیتاب رہنے لگی ۔ ملاقاتیں ہوئیں ۔ جب سوہنی کے ماں باپ کو پتہ چلا تو انہوں نے مہینوال کو نوکری سے الگ کر دیا اور سوہنی کی شادی کر دی ۔ مہینوال فقیر بن کر دریا کے کنارے رہنے لگا ۔ اب رات کو دریا پر ملاقاتیں ہونے لگیں ۔ مہینوال دریا سے مچھلی پکڑتا اور ہر روز سوہنی کے لیے تازہ مچھلی کے کباب بنا کر لاتا ۔ ایک روز مچھلی نہ ملی تو اس نے اپنی ران سے گوشت کاٹ کر کباب بنائے اور زخمی حالت میں دریا پار کیا ۔ سوہنی ، مہینوال کے اس انداز عشق سے گھبرا گئی اور گھڑے کے سہارے خود دریا پار کر کے مہینوال سے ملنے لگی ۔ چنانچہ ایک روز سوہنی کی نند نے اس کا پیچھا کیا اور اسے دریا پار کرتے دیکھ لیا ۔ اگلے روز اس نے سوہنی کو سزا دینے کے لیے رات کی تاریکی میں پکے گھڑے کی جگہ کچا گھڑا رکھ دیا ۔ سوہنی نے حسب معمول گھڑا اٹھایا تو جان گئی کہ بھید کھل گیا ہے ۔ لیکن اب واپس جانا بھی توہین محبت تھی ۔ چنانچہ کچے گھڑے کو دریا میں ڈال دیا ۔ کچا گھڑا کہاں تک ساتھ دیتا ، بہہ گیا اور سوہنی بھی مہینوال کو پکارتے پکارتے موجوں کی نذر ہو گئی ۔ ادھر مہینوال نے اس کی آواز سن کر دریا میں چھلانگ لگا دی اور ڈوب کر محبوب سے جا ملا ۔

مرزا صاحباں

مرزا دانا باد (ضلع شیخوپورہ) کے کھرلوں کے قبیلے کے سردار کا بیٹا تھا ۔ اس کی ماں ماہی سیال (جو کھیوا خان کہلاتا تھا) کی بہن تھی ۔ صاحباں کھیوا خان کی لڑکی تھی ۔ مرزا بچپن میں کھیوے اپنے ننھیال آ گیا ، مرزا اور صاحباں مکتب میں اکٹھے پڑھنے لگے ۔ دونوں کو ایک دوسرے سے پیار ہو گیا جو عمر کے ساتھ

عشق میں بدل گیا ۔ صاحباں کے والدین کو پتہ چلا تو انہوں نے صاحباں کو پہلے تو مکتب سے اٹھا لیا پھر چنڈاں قبیلے کے ایک نوجوان طاہر خان سے اس کی منگنی کر دی اور مرزے کو دانا باد اس کے گھر بھیج دیا ۔ مرزا یہاں آ کر صاحباں کے فراق میں دن گزارنے لگا ۔ ایک دن اسے صاحباں کا پیغام ملا کہ اس کی بارات آئی ہوئی ہے ۔ یہ سن کر مرزا تیر کمان سے لیس ہو کر اپنی گھوڑی بکھی پر سوار ہو کر کھیوے کی طرف چل پڑا ۔ اسی گاؤں میں اس کی ایک پھوپھی بھبھو رہتی تھی ۔ مرزا اسی کے گھر آ کر ٹھہرا ۔ بھبھو نے صاحباں کو بھی یہاں بلا لیا اور دونوں کی ملاقات کروا دی اور طے پایا کہ رات کے وقت مرزا صاحباں کو لے کر فرار ہو جائے ۔ چنانچہ شادی کی رات مرزا دیوار پھاند کر صاحباں کے گھر داخل ہوا اور اسے لے بھاگا ۔ مگر کئی رات کا جاگا ہوا مرزا تھک کر راستے میں ایک جھنڈ کے درخت کے نیچے لیٹ کر سو گیا ۔ صاحباں نے اس خوف سے کہ اس کے ماں باپ پیچھا کرتے وہاں تک نہ پہنچ جائیں مرزا کو جگا کر کہا کہ وہ اسے اپنے گھر لے جائے مگر مرزے نے کہا کہ وہ پیچھا کرنے والوں کی کیا پرواہ کرتا ہے ۔ وہ اپنے تیروں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا ۔ اور پھر سو گیا ۔ صاحباں نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا بھائی نہ مارا جائے ، مرزا کی کمان درخت کے اوپر لٹکا دی ۔ کچھ دیر بعد طاہر خان اور سیال پیچھا کرتے وہاں پہنچ گئے اور نہتے مرزا کو ہلاک کر دیا ۔ مرزا کو بچاتے ہوئے صاحباں بھی ماری گئی ۔ جب کھرلوں کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ بھی چڑھ دوڑے اور اس لڑائی میں دونوں طرف کے بہت سے آدمی مارے گئے ۔

سسی پنوں

بھمبھور کے بادشاہ آدم جام کے گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی تو نجومیوں نے بادشاہ کو بتایا کہ یہ لڑکی بڑی ہو کر خاندان کے لیے بدنامی کا باعث بنے گی ۔ چنانچہ ان کے کہنے پر اسے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیا گیا ۔ یہ صندوق عطا نامی ایک دھوبی کے ہاتھ لگا ۔ اس نے اسے عطیہ' قدرت سمجھا اور اس کا نام سسی رکھا ۔ سسی جوان ہوئی تو اس کے حسن کے چرچے دور دور تک ہونے لگے ۔ ایک روز سسی نے خواب میں دیکھا کہ ایک قافلہ بھمبھور آیا ہے جس کا سردار ایک خوبصورت نوجوان ہے ۔ سسی اس کے لیے بیتاب رہنے لگی ۔ آخر اس کی حقیقی ماں یعنی آدم جام کی رانی اس کی راز دار بن گئی اور بادشاہ سے کہہ کر اس کے لیے دریا کے کنارے ایک باغ بنوا دیا ۔ سسی شہر میں داخل ہونے والے قافلوں سے ٹیکس وصول کرنے کے بہانے اپنے خوابوں

کے شہزادے کو تلاش کرنے لگی ۔ ایک روز خواب والے لوگوں سے ملنے جلتے کچھ مکرانی اس کے باغ کے پاس سے گزرے ۔ سسی شہزادی نے ان کو گرفتار کر لیا مگر اُن میں اپنے جوابوں کے شہزادے کو موجود نہ پا کر انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنے شہزادے کو وہاں بلالیں ۔ چنانچہ ان لوگوں نے ساری باتیں پنّوں کو لکھ بھجیں ۔ پنوں آیا تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی عشق کی آگ میں جلنے لگے ۔ پنوں نے سسی کے کہنے پر اپنے آپ کو دھوبی ظاہر کیا ہے اور اس طرح دونوں کی سادی ہو گئی ۔ لیکن دوسری طرف جب پنوں کے والدین کو اس بیاری کا پتہ چلا تو انہوں نے اس بات کو ناپسند کیا چنانچہ پنوں کے بھائی مکران سے آئے اور اسے شراب پلا کر کے مدہوش کر لے گئے ۔ ادہر سسی اس کی تلاش میں صحرا میں دیوانہ وار دوڑتی پھری اور تھک کر ریت میں دب گئی ۔ ادہر پنوں کو جب ہوس آیا تو وہ واپس سسی کی طرف لوٹا مگر راستے ہی میں جان دے دی ۔ یوں دونوں کا دائمی وصال ہو گیا ہے ۔

پورن بھگت

سیالکوٹ کے راجہ سالباہن کی بڑی بیوی کے گھر ایک سادھو کی دعا سے لڑکا پیدا ہوتا ہے ۔ جوتشیوں کے مشورے پر بارہ سال تک والدین کی نظروں سے دور علیحدہ اس کی پرورش ہوتی ہے ۔ بارہ سال کے بعد خوشیوں کے جلو میں اسے دربار میں لایا جاتا ہے ۔ درباریوں سے تعارف کے بعد بادشاہ کی خواہش کے مطابق پورن اپنی ماں سے ملنے محل میں جاتا ہے ۔ سوتیلی ماں لوناں اس کے حسن سے متاثر ہو کر اسے دعوتِ گناہ دیتی ہے لیکن پورن انکار کر دیتا ہے ۔ لوناں اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اُس پر دست درازی کا الزام لگا دیتی ہے اس طرح پورن کے ہاتھ پاؤں توڑ دے جاتے ہیں اور اسے کنوئیں میں پھینک دیا جاتا ہے ۔ وہ مزید بارہ سال یہاں پڑا رہتا ہے آخر ایک روز گروناتھ جی اس کنوئیں کے پاس آکر ڈیرا لگاتے ہیں اور ان کے چیلے پانی کی غرض سے کنوئیں پر آتے ہیں اور اُسے نکال کر لے جاتے ہیں ۔ گروناتھ کی دعا سے اس کے اعضاء درست ہو جاتے ہیں ۔ اور یوں اسے نئی زندگی ملتی ہے اور وہ گروناتھ کے چیلوں میں شامل ہو جاتا ہے گوروناتھ اس کو آزمائش کے طور رانی سندراں کے پاس بھیک مانگنے بھیجتا ہے ۔ رانی سندراں اس پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور خود گرو کی خدمت میں حاضر ہو کر اسے مانگ لیتی ہے ۔ گرو کے حکم کے مطابق بادل نخواستہ وہ اس کے ہاں چلا تو جاتا ہے مگر اسے چھوڑ کر پھر گرو کے پاس بھاگ آتا ہے ۔ گرو ناراض ہوتا ہے اور اسے اپنے ماں باپ کے پاس بھیج دیتا ہے جہاں اس کی کرامات کی شہرت سن کر عام لوگوں کے علاوہ اس کا باپ اور لوناں اولاد کے لیے دعا کروانے آتے ہیں ۔ پورن باتوں باتوں میں لوناں سے

اس کے گناہ کا اقرار کروا لیتا ہے ، تاہم اُن کو خوش خبری دیتا ہے کہ ان ہاں ایک لڑکا پیدا ہو گا جو بڑی شہرت پائے گا ۔ رانی شدّتِ جذبات سے اپنے گناہ کا اقرار کر لیتی ہے ۔ رانی اچھران یعنی پورن کی اندھی ماں بھی بیٹے کو دیکھنے آتی ہے ۔ پورن اقرار کرتا ہے کہ وہی ان کا کھویا ہوا لڑکا ہے ۔ اس کے بعد پورن واپس سادھوؤں میں آ ملتا ہے ۔

احسن القصص

حضرت یعقوب[ؑ] کی اپنے بیٹے حضرت یوسف[ؑ] سے محبت اور پھر حضرت یوسف[ؑ] کا اپنے بھائیوں پر برتری پانے کے خواب دیکھنا ان کے سوتیلے بھائیوں کو ان کی جان کا دشمن بنا دیتی ہے ۔ چنانچہ وہ حضرت یوسف[ؑ] کو شکار کے بہانے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور ایک کنوئیں میں پھینک آتے ہیں ۔ اور واپس گھر جا کر حضرت یعقوب[ؑ] کو اس کی موت کا یقین دلا دیتے ہیں ۔ اتفاق سے ایک قافلہ ادھر سے گزرتا ہے وہ لوگ حضرت یوسف[ؑ] کو کنوئیں سے نکال کر مصر لے جاتے ہیں جہاں عزیزِ مصر ان کو خرید لیتا ہے ۔ عزیز مصر کی بیوی زلیخا ان پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور ایک روز دعوتِ گناہ دیتی ہے ۔ حضرت یوسف[ؑ] گناہ سے بھاگتے ہیں تو وہ پیچھے سے ان کا کرتہ کھینچتی ہے جو پھٹ جاتا ہے ۔ جب عزیز مصر کو پتہ چلتا ہے تو وہ حضرت یوسف[ؑ] پر الزام لگانے کی کوشش کرتی ہے مگر ناکام رہتی ہے ۔ تاہم انہیں جیل بھیج دیا جاتا ہے ، جہاں وہ دو قیدیوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتاتے ہیں جو بعد میں درست ثابت ہوتی ہیں ۔ ان میں سے ایک قیدی بادشاہ کا مالی بنتا ہے ۔

انہی ایام میں بادشاہ خواب دیکھتا ہے جس کی تعبیر جب کوئی نہیں بتا سکتا تو مالی کے کہنے پر حضرت یوسف[ؑ] کو بلایا جاتا ہے ۔ حضرت یوسف[ؑ] بتاتے ہیں پہلے سات سال خوشحالی کے ہوں گے اور پھر سات سال سخت قحط پڑے گا ۔ چنانچہ عزیزِ مصر انہیں اپنا مشیر بنا لیتا ہے ۔ تعبیر کے مطابق وہ پہلے سات سال خوب اناج اکٹھا کرتے ہیں جو قحط کے سات سالوں میں ان کے کام آتا ہے ۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ کنعان سے ان کے بھائی بھی اناج لینے آتے ہیں ۔ حضرت یوسف[ؑ] ان کے ذریعے اپنے چھوٹے بھائی بن یامین کو بلاتے ہیں اور اسے بہانے سے اپنے پاس روک لیتے ہیں ۔ آخر حضرت یعقوب[ؑ] کے کہنے پر جب بھائی بن یامین کو لینے آتے ہیں تو فرطِ محبت سے حضرت یوسف[ؑ] چھپا نہیں سکتے کہ وہ ان کے بھائی ہیں چنانچہ بھائی قدموں میں گر پڑتے ہیں اور اس طرح ان کے خواب کی تعبیر پوری ہو جاتی ہے جو انہوں نے بچپن میں

دیکھے تھے ۔ تقریباً تقریباً یہ سورۂ یوسف کی کہانی ہے ۔

سیف الملوک

ملک شارستان میں ایک باغ ہے جس کا نام باغ ارم ہے ۔ اس باغ میں پریاں رہتی ہیں ۔ یہاں کے حکمران کا نام شہپال ہے جو حضرت سلیمان کا جانشین ہوتا ہے ۔ اس کی لڑکی بدیع الجمال حسن میں اپنا ثانی نہیں رکھتی ۔ مصر کا ایک سلطان سیف الملوک نامی اس پر عاشق ہو جاتا ہے اور اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے ۔ سمندری سفر میں اس کی کشتی الٹ جاتی ہے اور سب ساتھی بچھڑ جاتے ہیں ۔ وہ پھرتا پھراتا ایک جزیرے میں میں پہنچ جاتا ہے ۔ یہاں کا حکمران بہرام دیو ہوتا ہے ۔ بدیع الجمال کی بہن ملکہ خاتون اس کی قید میں ہوتی ہے ۔ سیف الملوک ملکہ خاتون کی مدد سے بہرام دیو کا خاتمہ کر کے اسے لے کر اس کی ماں کے پاس سراندیپ چلا جاتا ہے ۔ یہاں اس کی ملاقات بدیع الجمال سے ہوتی ہے ۔ وہ بھی سیف الملوک پر عاشق ہو جاتی ہے اور اپنی دادی مہر افروز سے اپنے باپ کو سیف الملوک سے شادی کی سفارش کرواتی ہے ۔ وہ تھوڑی سی تکرار کے بعد مان جاتا ہے اور سیف الملوک کو دیکھنے کی خواہش کرتا ہے اس دوران میں دوسرے دیو بہرام دیو کا بدلہ لینے کے لیے قلعہ اسفند باش پر جہاں سیف الملوک ٹھہرا ہوا ہوتا ہے حملہ کر دیتے ہیں اور اسے گرفتار کر کے بہرام کے باپ ہاشم دیو کے پاس لے جاتے ہیں جو اسے الٹے کنوئیں میں قید کر دیتا ہے ۔ شہپال کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملتی ہے تو وہ ایک بڑے لشکر کے ساتھ قلزم پر حملہ آور ہوتا ہے ۔ دو دن کی لڑائی کے بعد ہاشم دیو گرفتار ہو جاتا ہے اور سیف الملوک کو رہائی ملتی ہے ۔ شہپال اس کی عقل کا امتحان لینے کے لیے سوالات کرتا ہے ۔ جن کے سیف الملوک نہایت مناسب جواب دیتا ہے ۔ اس کے بعد اسے باغ ارم میں لا کر دونوں کی شادی کر دی جاتی ہے اور وہ دونوں شارستان میں آ جاتے ہیں ۔

ہیر رانجھا

اس فصل میں مندرجہ ذیل شعراء کے منظوم 'ہیر رانجھا' سے بحث کی گئی ہے ۔

۱ ۔ حیات خان کولابی (بزبان فارسی) عہد اکبر (۱۵۵۶ - ۱۶۰۵ء)

۲ ۔ دمودر " " " "

۳ ۔ سعید سعیدی (بزبان فارسی) عہد شاہجہان (۱۶۲۸ء : ۱۶۵۸ء)

۴ ۔ احمد کوی (بزبان پنجابی) تصنیف ۱۶۹۲ء

۵ - مقبل	(بزبان پنجابی)	تصنیف ۱۷۴۷ء سے قبل
۶ - وارث شاہ	(بزبان پنجابی)	تصنیف ۱۷۶۶ء
۷ - احمد یار	(بزبان پنجابی)	م - ۱۸۵۲ء
۸ - محمد شاہ	(بزبان پنجابی)	م - ۱۸۴۵ء
۹ - جوگ سنگھ	(بزبان پنجابی)	انگریزی عہد

ہیر رانجھا کا قصہ سب سے پہلے حیات خان کولابی نے فارسی میں لکھا ۔

باقی کولابی (م - ۱۵۷۹ء)

باقی کولابی کے متعلق اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوئیں کہ وہ قصبہ کولاب کا رہنے والا تھا ۔ یہاں سے وہ ہندوستان آیا اور مدت تک یہاں رہا ۔ آخر ۱۵۷۹ء میں جولپور کے مقام پر معصوم خان کابلی کی بغاوت میں مارا گیا ۔ اس کا قصہ 'ہیر رانجھا' پنجابی زبان میں لکھے جانے والے دوسرے قصوں سے مختلف ہے ۔ یہاں دھیدو طبعی طور پر عشق پسند ہے اور ہیر کا نادیدہ عاشق ۔ ماں کے سمجھانے کے باوجود گھر سے بھاگ جاتا ہے ۔ پنج پیروں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے اور وہ اسے اپنا نظر کردہ بنا لیتے ہیں ۔ جب ہیر کے شہر پہنچ کر وہ ہیر کے والد سے ملتا ہے تو یہاں ہیر اس پر عاشق ہو جاتی ہے وغیرہ وغیرہ ۔

اس کے بعد دمودر کی تصنیف آتی ہے ۔

دمودر

دمودر کے عہد اور حالاتِ زندگی میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ مولانا مولابخش کشتہ اس کی پیدائش لودھی اور وفات اکبر کے زمانے میں بتاتے ہیں ، جبکہ عبدالغفور قریشی اسے شاہجہان اور اورنگ زیب کے درمیانی زمانے کا لکھتے ہیں ۔ سر رچرڈ ٹمپل نے لکھا ہے کہ وہ عہدِ اکبر میں جھنگ میں پٹواری تھا ۔ تاہم عام خیال یہ ہے کہ وہ ذات کا اروڑہ گلاٹی تھا اور جھنگ کا رہنے والا تھا اور یہیں دکان کرتا تھا ۔ دمودر کی داستان میں دھیدو چھ سال کا ہوتا ہے کہ اس کی ماں مر جاتی ہے ۔ باپ کو عزیز ہونے کے باعث بھائی اس سے حسد کرتے ہیں ۔ باپ اس کی شادی کہاں اور بڑے گھرانے میں کرنا چاہتا ہے تاکہ دھیدو کو سہارا مل جائے ، مگر موت مہلت سے مہلت نہیں دیتی ۔ بھائیوں کے خوف سے دھیدو گھر سے بھاگ جاتا ہے ۔ ا
پیروں سے ملاقات ہوتی ہے ۔ وہ اسے ہیر بخش دیتے ہیں ۔ دھیدو ہیر کی

کے بعد اپنے گھر لوٹ آتا ہے ۔ مگر اپنی منگیتر وڑائچ کی لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے ۔ ہیر اپنی نند کی مدد سے رانجھے کو بلاتی ہے ۔ رانجھا جوگی بن کر جاتا ہے اور ہیر کو بھگا لے آتا ہے ۔ کوٹ قبولے کے قاضی کے پاس مقدمہ پیش ہوتا ہے ۔ مگر جب قاضی کھیڑوں کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہے تو اس کے شہر کو آگ لگ جاتی ہے ۔ قاضی ہیر رانجھے کو ملا دیتا ہے تو آگ بجھ جاتی ہے ۔ شہر کے لوگ ان کو وداع کرنے آتے ہیں ۔ قاضی کے پوچھنے پر رانجھا بتاتا ہے کہ وہ حج کرنے مکہ چلے جائیں گے اور پھر ان گاؤں میں واپس نہیں آئیں گے ۔

کولابی اور دمودر

کولابی کے قصے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ دھیدو کا کردار اتنا کمزور نہیں جتنا بعد میں لکھے جانے والے قریباً سبھی قصوں میں ملتا ہے ۔ یہاں اس کو نکمے اور غیر ذمہ دار نوجوان کی بجائے بھائیوں کی ہوسِ زر کا شکار بتایا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ کمزور دل ، محبت کے بھوکے اور سہارے کے متلاشی دھیدو کو جس طرح لاڈ پیار میں پلی ، من مانی کرنے والی ہیر کے زیر اثر دکھایا گیا ہے ۔ اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں ، کیونکہ ہیر جیسی زبردست کردار والی عورتوں کو اسی قسم کے نرم مزاج خوش شکل مگر مطیع قسم کے مرد پسند آتے ہیں ۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہیر سسرال کے گھر سے نہیں بھاگتی ، حالانکہ اگر وہ چاہتی تو ایسا کر سکتی تھی ، مگر نہیں کرتی ۔ پہلے بہانے سے میکے آتی ہے اور ماں کو رانجھے کے ساتھ جانے کی اجازت دینے پر راضی کرنے کی کوشش کرتی ہے جب وہ نہیں مانتی تو پھر یہیں سے رانجھے کے پاس چلی جاتی ہے ۔ انجام بھی طربیہ ہے اور یہ طربیہ انجام پہلے تینوں شاعروں یعنی کولابی ، دمودر اور سعید سعیدی کے ہاں یکساں ملتا ہے ۔

دمودر کی ہیر کے لکھے ہوئے مختلف نسخے ملتے ہیں جن میں طرزِ ادا اور واقعاتی جزئیات میں بھی اختلاف موجود ہے[1] ۔ پھر ان قصوں کی زبان بھی اتنی قدیم نہیں جتنی کہ دمودر کے زمانے کی ہونی چاہیے ۔ کیونکہ اکبر کے زمانے میں پنجابی زبان پر فارسی زبان اور قصص کا اتنا اثر نہیں پڑا تھا جتنا دمودر کی ہیر میں ملتا ہے ۔ کولابی اور دمودر ایک ہی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ دمودر کا کہنا ہے کہ اس نے ہیر رانجھے کا یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ، لیکن اس کا یہ دعویٰ محلِ نظر معلوم ہے ۔ اس لیے کہ اگر یہ واقعہ جس طرح کہ دمودر کا کہنا ہے ، اس کے زمانے تو پھر کولابی اور دمودر کے ہاں واقعاتی اختلاف نہیں ہونا چاہیئے تھا ۔

---

۱ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ، یونیورسٹی اورینٹیل کالج میگزین ۔ شمارہ ۱۶

دراصل یہ رومان بہت پرانا معلوم ہوتا ہے ۔ دوسرے اس قسم کے دعوے اکثر افسانہ نگار کر دیا کرتے ہیں ۔ ان باتوں سے قطع نظر دمودر نے جس طرح اس رومان کو بیان کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انسانی ذہنی کیفیات اور معاشرے کے تہذیبی عناصر پر گہری نظر رکھتا تھا ۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ لیجیے ۔ ہیر اور رانجھے کے عشق کا چرچا عام ہونے لگا تو ہیر کے باپ چوچک نے رانجھے کو ملازمت سے الگ کر دیا لیکن صرف اس بات کی بنا پر کہ بھینسیں اس کی سدھائی ہونے کی وجہ سے دودھ نہیں دیتیں ، وہ رانجھے کو واپس بلا لاتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ بھینسیں ایک دو نہیں تھیں کہ ان کے دودھ نہ دینے پر رانجھے کو واپس بلا لیا ۔ بلکہ ان کی تعداد سولہ ہزار تھی ۔ گویا وہ پورے قبیلے کی بھینسیں تھیں ۔ ظاہر ہے کہ مجبور ہو کر چوچک نے اس کو روکا مگر اس کے ساتھ یہ پابندی بھی لگا دی کہ رانجھا بیلے ہی میں رہے گا ۔ دوسری مثال لیجیے ۔ دھیدو کا باپ جب یہ دیکھتا ہے کہ اس کے دوسرے لڑکے دھیدو سے حسد کرتے ہیں ، بلکہ شاید اس کی جان کے دشمن بن جائیں تو اس کی شادی کسی بڑے گھر میں کرنا چاہتا ہے تاکہ دھیدو کو سہارا مل جائے ۔ مگر وہ مر جاتا ہے ، یہ بات بھی واقعیت پر مبنی معلوم ہوتی ہے ۔ وہ کرداروں کے اعمال اور جذبات کی عکاسی مؤثر انداز سے صرف چند الفاظ میں کر دیتا ہے ۔ ہیر جیسا منہ زور اور لٹ کھٹ کردار جیسا اس کے ہاں ملتا ہے ویسا کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں ملتا ۔ نورخان جب ۳۶۰ سواروں کے ساتھ اپنی کشتی چھڑانے آتا ہے تو یہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کرکے اس کے آدمیوں کو مار بھگاتی ہے ۔ اسی لیے دمودر نے اس کو اکبر کے حرم کے قابل بتایا ہے ۔ بعد میں ہیر کے بھائی پہنچتے ہیں اور گلہ کرتے ہیں کہ ہیر نے ان کو اطلاع کیوں نہ دی ۔ اس پر ہیر جو جواب دیتی ہے ، ملاحظہ فرمایے :

سن ویرا خاناں تے سلطاناں کسے تسانوں کوڑ سنایا
بھکھے چاک کداؤں آئے ولّیں نوں ہتھ پایا
کڑیاں کڈھے چک کواہی ، مینوں نظر نہ کوئی آیا
کت نوں آکھاں تدھ سدائیں کجھ اکبر میتھے دھائیا

دیہاتی زندگی اور اس زمانے کے رسم و رواج کی بھی یہاں مکمل عکاسی کی گئی ہے ۔ زمینداروں کے ہاں ملازموں کی کثرت ، سگائی کے پیغام کا ڈوم یا برہمن کا لے جانا ، منگنی کا چھوٹی عمر میں رواج پانا ۔ (ہیر کی سگائی تین برس میں اور رانجھے کی منگنی سات برس میں طے پاتی ہے) سگائی کا پورے قبیلے کی مشاورت سے طے پانا اور جاٹوں کی لڑکیوں کا شوہر کو خود منتخب کرنے کے رواجوں کی تفصیلات سے واقعیت کا رنگ گہرا ہو جاتا ہے ۔

دمودر کے بعد بھی یہ رومان ایک فارسی مثنوی کی صورت میں ملتا ہے - اسے سعید سعیدی نے شاہجہان کے دور میں لکھا -

سعید سعیدی -

سعید سعیدی کے حالاتِ زندگی بھی کہیں نہیں ملتے - اس کی مثنوی 'افسانہ' دلپذیر' سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس کا نام سعید تھا اور تخلص سعیدی اور وہ عہد شاہجہان (۱۶۲۸ء - ۱۶۵۸ء) میں زندہ تھا - مصنف کا کہنا ہے کہ اس نے یہ قصہ کہیں سے سنا یا پڑھا نہیں بلکہ یہ طبعزاد ہے - اس مثنوی میں رانجھے کے متعلق مشہور ہو جاتا ہے کہ وہ کسی کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے - چنانچہ اس کے بھائی اس کو گھر سے نکال دیتے ہیں - راستے میں اس کی خواجہ خضر سے ملاقات ہوتی ہے ، جو ہیر کو اس کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں - اس کے بعد وہی معروف قصہ ہے -

اس قصے میں مصنف نے رانجھے کو ایک کمزور کردار کے طور پر پیش کیا ہے ، بلکہ دونوں بنیادی کرداروں یعنی ہیر اور رانجھے میں اخلاقی ضعف کا اضافہ بھی کر دیا ہے - یعنی وہ قصے کے دوران میں ایک بار نہیں تین چار بار گھر سے بھاگتے ہیں اور ہر بار پکڑے جاتے ہیں - ہر بار ہیر رانجھے کو چھپا دیتی ہے اور خود پیچھا کرنے والوں کے ساتھ واپس لوٹ آتی ہے - اس قصے کو بہت حد تک طربیہ بنا دیا گیا ہے - کئی ایک مقامات پر مافوق الفطرت عناصر بھی ان کی مدد کرتے ہیں - ابتدا میں رانجھے کو گھر سے نکال دینا قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا کیونکہ آخر میں جب ناکام لوٹتا ہے تو زیادہ بدنام ہوچکتا ہے اور یہ لوگ اسے گھر میں رکھ لیتے ہیں اور اس کی آؤ بھگت بھی کرتے ہیں - اس کے علاوہ رانجھا جوگی بننے کے لیے باقاعدہ جوگ نہیں لیتا بلکہ ایک جوگی سے جو اسے راستے میں ملتا ہے سمجھوتہ کر کے اس کو نئے کپڑے دے کر اس سے کپڑے بدل لیتا ہے - یہ بات بھی ایک طرف جوگیوں کی تضحیک کا باعث ہے تو دوسری طرف رانجھے کے کردار میں ایک اور کمزوری کے اضافے کا باعث بنتی ہے - یعنی رانجھا صرف ہیر سے ملاقات کے لیے جوگی کا روپ دھارتا ہے - اس قصے میں واقعیت کا رنگ بہت ہلکا ہے اور افسانہ طرازی زیادہ ہے اور معاشرہ کی پابندیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے -

احمد کوی (عہد اورنگ زیب)

ان رومانوں کے بعد وہ رومان لکھا گیا جو بعد میں وارث شاہ کے رومان کی بنیاد بنا - اس کا مصنف احمد کوی ہے جس نے اس

قصے کو ۱۶۹۲ء میں نظم کیا ۔ احمد کوی کے حالات زندگی کسی تذکرے میں نہیں ملتے ۔ اس کے متعلق اتنا ہی لکھا جاتا ہے کہ وہ اورنگ زیب کے زمانے میں ہوا ور اس نے اپنی ہیر ۱۶۹۲ء میں مکمل کی ۔ اس میں اور وارث شاہ کے معروف قصے میں صرف اتنا اختلاف ہے کہ آخر میں جب رانجھا اپنے گھر بارات لینے جاتا ہے تو اس کے پیچھے ہیر مر جاتی ہے ۔لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیسے مری ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وارث شاہ نے اپنے قصے کا پلاٹ احمد کوی سے لیا ہے ۔ اس لیے کہ سوائے ہیر کی موت کی وضاحت نہ ہو سکنے کے وارث شاہ اور احمد کوی کے قصوں کی جزئیات ایک جیسی ہیں ۔ معاشرے کی عکاسی بھی احمد کوی کے ہاں اسی طرح ہوئی ہے ۔ جس طرح وارث شاہ کے ہاں ہے ۔ تصویریں بھی وہی ہیں ، البتہ وارث شاہ نے اپنی طبیعی خلّاقیت سے ان میں بہت سے رنگ بھر دیے ہیں ۔ بلکہ اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ احمد کوی کی زبان کرداروں کی ذہنی اور علمی سطح کے مطابق استعمال ہوئی ہے ۔ ان میں غلو اور تصنّع نہیں پایا جاتا جو کہیں کہیں وارث شاہ کے بیان میں ملتا ہے ۔

مقبل (عہد محمد شاہ)

اس کے ۵۵ سال بعد ۱۷۴۷ء میں مقبل نے اس قصہ کو شعری جامہ پہنایا ۔ مقبل کے حالات زندگی کے متعلق صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ محمد شاہی عہد میں گذرا ہے ۔ اس کا نام شاہجہان اور تخلص مقبل تھا وہ آنکھوں سے نابینا تھا ۔ اس نے ہیر کے علاوہ 'جنگ نامہ امام حسین'[۴] اور ایک سی حرفی حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح میں لکھی ۔ اس رومان میں بھی احمد کوی کا تتبع کیا گیا ہے ۔ اس میں اور وارث شاہ کے معروف قصہ میں فرق یہ ہے کہ وارث شاہ کے ہاں رانجھا ہیر کے حسن کی شہرت سن کر عاشق ہوتا ہے ، لیکن مقبل کے قصے میں رانجھا ہیر کو خواب میں دیکھ کر اس پر عاشق ہوتا ہے ۔ یہ ایک افسانوی یا داستانی روایت ہے ۔ اس رومان کا انجام بھی حزنیہ ہے ۔ اس رومان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مقبل اور وارث شاہ ایک ہی شاعرانہ انداز کے حامل ہیں ۔ ان میں شعری مماثلتیں بھی بہت پائی جاتی ہیں ۔ تاہم تحریر میں شخصیتوں کا اثر نمایاں ہے ۔ مقبل کے ہاں بھی وارث شاہ کی طرح معاشرتی تصویریں اپنی پوری جزئیات کے ساتھ موجود ہیں ۔ مثلاً شادی بیاہ اور دیہاتی زندگی کے دوسرے طور طریقوں ، رسم و رواج ، اخلاق اور سماجی قدروں کی عکاسی کی گئی ہے ۔ زبان سادہ ہے ۔ لمبی چوڑی تشبیہوں اور استعارات سے کام نہیں لیا گیا اور الفاظ ٹھیٹھ استعمال ہوئے ہیں ۔ عبارات کے بر محل استعمال سے قصے کے واقعات اور کرداروں کے احساسات کی وضاحت ہوتی چلی جاتی ہے ۔

وارث شاہ (پ - ۱۷۲۲ء)

وارث شاہ نے اپنا مشہور رومان ۱۷۶۶ء میں لکھا ۔ ان کی تصنیف 'ہیر رانجھا' سے پتہ چلتا ہے کہ وارث شاہ ۱۷۲۲ء/۱۱۳۵ھ کے قریب جنڈیالہ شیر خاں ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہوئے ۔ ان کے باپ کا نام قطب شاہ تھا ۔ وارث شاہ مخدوم قصوری جن سے بعض تذکرہ نگار سید غلام مرتضیٰ اور بعض غلام محی الدین قصوری مراد لیتے ہیں ، سے درس لیا کرتے تھے ۔ تاہم اس سلسلے میں کچھ وثوق سے نہیں کہاجا سکتا ۔ اسی طرح ان کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پنڈ ٹھٹھہ جاور کی ایک عورت بھاگ بھری نامی سے انہیں عشق ہو گیا تھا اور اسی عشق کو انہوں نے ہیر رانجھے کے قصے میں سمو دیا ۔ لیکن کسی مستند ذریعے سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی ۔ افسوس ہے کہ پنجابی زبان کے معروف ترین شاعر کے حالات گمنامی میں رہ گئے ہیں ۔

ہیر کے قصے کے علاوہ انہوں نے 'معراج نامہ' ، 'چوہڑیٹی نامہ' ، 'اشتر نامہ' اور 'سسی پنوں' لکھے ۔ اس کے علاوہ ۱۹۱۸ء میں 'سو ہنی' کی منظوم داستان بھی ان کے نام سے چھپی' ۔ لیکن ہیر میں شعروں کے اضافے کی طرح یہ بھی ان کے نام کے ساتھ ایک اضافہ ہے ۔ اس میں وارث شاہ کہیں نظر نہیں آتا ۔ اگرچہ وارث شاہ نے اپنی مشہور نظم کے پلاٹ ، زبان اور پیرائے بیان میں احمد گوی اور مقبل کی ہیروں سے استفادہ کیا ہے لیکن اس میں جزئیات اور واقعات کا اضافہ وارث شاہ کا حصہ ہے ۔ چنانچہ وارث شاہ نے ہیر اور رانجھے کے قصے کے پس منظر میں اس زمانے کی معاشرتی ، تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی بھرپور عکاسی ہی نہیں کی، بلکہ بعض سیاسی واقعات کے بیان سے سیاسی حالات کی طرف بھی اشارے کیے ہیں (نادر شاہ کے حملے کا ذکر) ۔ وارث شاہ کی بساط بہت وسیع ہے ۔ قصے کے واقعات و کردار اپنے پورے خد و خال کے ساتھ ابھرتے ہیں ۔ جو کردار جیسا بھی ہے اسے دیانتداری سے پیش کر دیا گیا ہے ۔ رانجھے کی مردانہ کمزوری ، انفعالی مزاج ، دبی ہوئی شخصیت کے مقابلے میں ہیر کا دوسروں پر حاوی ہو جانے اور نہ دبنے والا کردار ہی پیش کیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ زبان کے بے باک انداز نے کرداروں کے اندر چھپے رہنے والے پہلوؤں کو بھی قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے ، جس کی وجہ سے کوئی تصویر بھی ادھوری نہیں رہتی ۔ سوال و جواب کا انداز ، ضرب الامثال ، تمثیلیں عوام الناس کے افعال پر نظر اور لہجے کی شگفتگی ، قصے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے کافی ہیں ۔ البتہ بعض اوقات وارث شاہ اپنے زورِ بیان میں اپنی ہی بات کی تردید بھی کر جاتے ہیں ۔ مثلاً ایک جگہ بتاتے ہیں کہ ہیر اور رانجھا بیلے میں داد عیش دیتے رہے اور دوسری جگہ (ہیر دا خط بھرجائیاں نوں) اسے 'ان چھوئی' لکھتے ہیں ۔

اسی طرح سہتی کہتی ہے کہ " وہڑے وڑیں تاں جنڈیاں کھوہ سٹوں" ۔ اس سے پہلے رانجھے کے متعلق بتا چکے ہیں کہ وہ سر منڈا کر جوگی بن چکا ہے وغیرہ ۔ واقعاتی اختلافات معمولی ہیں ۔ رانجھا ہیر کے حسن کی شہرت سن کر اس پر عاشق ہوتا ہے ۔ بھاوجیں ہیر بیاہ لانے کا طعنہ دیتی ہیں ۔ جوگی بن کر ہیر کے پاس جانے کا پیغام ایک شادی شدہ لڑکی کے ذریعے ملتا ہے ۔ رومان کا انجام حزینہ ہے ۔ اس کے مقابلے میں احمد یار (م - ۱۸۴۵ء) جس نے اپنی ہیر وارث شاہ سے ایک سو سال بعد لکھی کے ہاں دونوں ایک دوسرے کو خواب میں دیکھتے ہیں اور عاشق ہو جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ انجام بھی مختلف ہے ۔ سیال ہیر کو دفن کرکے رانجھے کو اطلاع بھیجتے ہیں تو وہ آہ کرکے وہیں جان دے دیتا ہے اور اس کے بھائی اسے دفن کر دیتے ہیں ۔ لیکن صبح دیکھتے ہیں تو قبر غائب ہوتی ہے ۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ ملائک اسے اٹھا کر ہیر کے دامن میں دفن کر دیتے ہیں ۔

احمد یار (۱۷۶۸ء - ۱۸۴۵ء)

آپ کے بزرگ وزیرآباد کے قصبہ سوہدرہ کے رہنے والے تھے ۔ وہاں سے آپ کے دادا جلال پور جٹاں کے قریب قلعہ اسلام گڑھ میں منتقل ہو گئے ۔ ۱۸۴۰ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے کہنے پر لاہور آ کر 'فتوحات خالصہ' ، شاہنامہ کی طرز پر فارسی نظم میں لکھی ۔

ان کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ بتائی جاتی ہے ۔ مشہور تصانیف یہ ہیں ۔ 'ہیر' ، 'قصہ چندر بدن' ، 'سسی پنوں' ، 'لیلیٰ مجنوں' ، 'قصہ کامروپ' ، 'قصہ راج بی بی' ، 'سوہنی مہینوال' ، 'حاتم نامہ' ، قصہ تمیم انصاری' ، 'جنگ بدر' ، 'جنگ احد' ، 'تّولد نامہ' ، 'وفات نامہ' وغیرہ ۔

احمد یار نے بھی قصے کے بیان میں پنجابی معاشرے کو پورے طور پر سامنے رکھا ہے ۔ اس نے اس کی تہذیبی روایات سے پوری طرح ہم آہنگ ہو کر نقش ابھارے ہیں ، جس میں شوخی یا تیکھے پن کی بجائے متانت اور سادگی پائی جاتی ہے ۔ جذباتی اور خون کے رشتوں کی اہمیت ، اخلاقی قدروں کے ٹوٹنے کا غم ، سوسائٹی کے بنائے ہوئے ضابطوں کی پاسداری ، جاٹ لڑکیوں کا بے باکانہ انداز میں اپنے جذبات کا اظہار اور اپنی خواہشات کی تکمیل میں کسی اخلاقی ممانعت کے احساس سے بھی آگے نکل جانا وغیرہ ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک لوگ ہیر اور رانجھے کے عشق اور ان کے انجام کو تائیدِ غیبی پر محمول کرتے تھے ۔ اس لیے کہ اب پیروں سے بڑھ کر ملائک بھی

ان پر مہربان دکھائے گئے ہیں۔ تاہم معاملاتِ عشق اور چھیڑ چھاڑ کے بیان میں احمد یار وارث شاہ کے قریب قریب پہنچ جاتے ہیں۔ رانجھا جب جوگی بن کر رنگ پور آتا ہے تو لڑکیاں اس سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہیں اور خود اپنی زبان سے اپنے حسن کی تعریف کرکے اس کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں ـــــ ''جوگی جی ذرہ ویکھو ساڈا جوبن حسن جوانی'' ۔ کئی جگہوں پر قرآنی آیات سے واقعات کو آفاقی انداز میں پیش کیا ہے مگر باتوں کو عمومی بنا کر دکھانے کا احساس دانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محاورے اور ضرب الامثال کا استعمال عام ہے ۔

احمد یار کے بعد ہم دو اور 'ہیر رانجھوں' کا ذکر کریں گے ۔ ان میں اول چار سہ حرفیوں پر مشتمل ہے ۔ اور اس کا مصنف محمد شاہ ہے جو انیسویں صدی کے نصف آخر کا شاعر ہے ۔ یہ پوٹھوہار کا رہنے والا تھا ۔ اس میں (سنِ تصنیف ۱۸۵۲ء) رانجھا جب دل برداشتہ ہو کر گھر سے نکلتا ہے تو اس کے دل میں ہیر کا کوئی تصور موجود نہیں ہوتا ۔ ہیر کا خیال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب رانجھے کو چناب کے علاقے میں رات پڑتی ہے اور پنج پیر ظاہر ہو کر اس کو دودھ پلاتے ہیں اور ہیر کو اسے بخش کر اسے جھنگ کی طرف جانے کی ہدایت کرتے ہیں ۔ اس کے بعد کا حصہ معروف قصے پر مبنی ہے البتہ انجام میں قاضی کے فیصلے کے بعد یہ دونوں ہزارے میں آ کر صبح و شام خدا کو یاد کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں ۔ یہ سہ حرفیاں واقعاتی لحاظ سے مختصر ہیں ۔ ان سہ حرفیوں میں دوسری جزئیات اور معاشرتی اور تہذیبی پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے مصنف نے قصہ کے صرف عشقیہ پہلو ہی کو بیان کیا ہے اور یہ بیان بھی روا روی میں ہوا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں سے قصہ پن غائب ہو گیا ہے جس سے دوسرے شعراء مثلاً وارث شاہ وغیرہ نے اپنے قصوں کی واقعیت بڑھانے کے لیے مدد لی ہے ۔ مگر عشق کی کیفیات اور وارداتِ قلبی کا اظہار مصنف نے بڑی توجہ سے کیا ہے ۔ اس میں ایک بات نمایاں ہے وہ یہ کہ ہیر کی منگنی پر رانجھے کے مسلسل طعنے دینے سے کم ظرفی کا شبہ پڑتا ہے اور یہ سمجھ نہیں آتا کہ وہ ہیر کی مجبوری کو کیوں نہیں سمجھ سکتا اور اس کی محبت اور وفاشعاری سے بے اطمینانی کیوں ظاہر کرتا ہے ۔ اس کے مقابلے میں ہیر میں ایک وقار اور خود اعتمادی ملتی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ ایک خلا میں وقوع پذیر ہوا ہے ۔ شاید مصنف کا مقصد ہی ہیر اور رانجھے کے عشق کی واردات بیان کرنا تھا ۔ بہر حال یہ نظم دوسری منظومات سے مختلف ہے اور جامعیت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔

جوگ سنگھ

دوسری سہ حرفی جوگ سنگھ کی ہے ۔ لیکن اس کے سنِ تصنیف یا عہد کا سراغ نہیں مل سکا ۔ مگر اندازہ ہے کہ یہ انیسویں صدی کی تخلیق ہے ۔ جوگ سنگھ کے بیان کے مطابق بیلے میں پنج پیر ہیر اور رانجھے کا نکاح پڑھاتے ہیں اور ان دونوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ یہ دنیا جھوٹ سے بھری ہوئی ہے ، لہٰذا وہ عبادت کیا کریں اور غرورکو دل میں جگہ نہ دیں ۔ پھر غائب ہو جاتے ہیں اور اس بات کا صرف رانجھےکو ہی علم ہوتا ہے ۔ ان کے ہاں کہانی کا انجام بھی مختلف ہے ۔ آخر میں جب رانجھا برات لینے اپنے گھر آتا ہے تو ہیر بیمار رہ کر اپنی فطری موت مر جاتی ہے ۔ قصہ مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے ۔ کرداروں کی نوک جھونک اور تکرار میں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے ۔ مکالمات میں جلد تصفیہ کی طرف آنے کے رجحان کا انداز پایا جاتا ہے ۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد رانجھا بہت دل گیر رہتا ہے کام میں مصروف رہ کر غم کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ مگر جب مشقت سے جی گھبراتا ہے تو فقیر بن کر کسی طرف کو نکل جانے کا ارادہ کرتا ہے ۔ بھائی اور بھابیاں سمجھاتی ہیں مگر وہ نہیں مانتا اور گھر سے نکل پڑتا ہے ۔ یوں کہانی سیدھے سادھے انداز میں آگے بڑھتی ہے ۔ محاورات و ضرب الامثال کا استعمال بہت کم ہے ۔ لیکن الفاظ کے چناؤ میں جوگ سنگھ کو جو مہارت ہے اس کی وجہ سے کرداروں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی اچھی طرح ہو جاتی ہے ۔ معاشرے کی تصویریں شوخ نہیں مگر ان کے خاکے جزئیات سے خالی نہیں ۔ جن میں قاری اپنے تجربے اور پنجابی ماحول سے واقفیت کی بنا پر رنگ بھر سکتا ہے ۔ یہ داستان بھی ہیر رانجھا کی روایات کی ایک مضبوط کڑی ہے ۔

ذیل میں ہم اس رومان کے ایک واقعہ پر مندرجہ بالا شعراء کی منظومات سے تقابلی انتخاب دیتے ہیں ۔ ان سے ان شعراء کے اسلوب ، اندازِ بیان ، مزاج اور کردار و واقعات کے متعلق ان کے رویوں کا اندازہ ہوتا ہے ۔ یہ واقعہ وہ ہے جب رانجھا ہیر کی شادی کے بعد اس کے کہنے پر جوگی بننے کے لیے گرو بالناتھ کے پاس جاتا ہے ۔ اس بیان سے اگرچہ ظاہر یہی ہوتا ہے کہ رانجھا جوگ ہیر کو پانے کے لیے لیتا ہے ۔ لیکن بہ باطن وہ اپنے سفر کی دوسری منزل یعنی نفس کی تطہیر میں داخل ہوتا ہے ۔ یہ واقعہ اس رومان کی گہرائی اور دوسطحی پن پر دلالت کرتا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے :

دمودر

تخت ہزارہ وطن اساڈا معظم دا میں جایا
پیا وخت میں گھروں لکھیا سک سیالیں آیا
چوچک دے گھر بیٹی چنگی ہیر سوناؤں رکھایا
دیکھ وکانا اس دے پچھے اس میرا جیو پھایا
ہرنی گئی دیس کھیڑیاں دے تاں میں قضیہ پایا
آکھ دمودر ہور نہ سجھے تاں سام تساڈی آیا

احمد کوی

ردھ سدھ والا لوک آکھدے سے تاں میں آئیا ساں ایت ڈیرے
میں تاں واسطے ہیر دے جوگ لیا ہورکم ناں سا کوئی نال تیرے
مینوں ورجیو وگڑیا کم میرا مینوں دکھڑے پئے آن گھنیرے
کرامات تیری اساں ڈھونڈھ ڈٹھا حکم دیہہ جے رہند لگاں سویرے
بھٹھ جوگ بھبوت لے اپنی دو پھیر کن درست کر دے میرے

مقبل

رانجھا آکھدا منیاں حکم تیرا مول کراں نہ ذرا عدول میاں
جاساں ہیر تے رنگپور کھیڑیاں دے جیندا مڈھ کلیجے دے سول میاں
خاطر ہیر دے ملن دے جوگ لیتا دکھ تے درد قبول میاں
مقبل رب تھیں ہیر دواؤ مینوں ہور عرض نائیں کجھ مول میاں

وارث شاہ

ناتھا جیولدیاں مرن ہے کھرا اوکھا ساتھوں ایہ نہ وعدے ہوونے نی
اسیں جٹ ہاں ناڑیاں کرن والے اساں کچکرے لئیں پرووݨے نی
اینویں کن پڑا لیکے خوار ہوئے ساتھوں نٹیں ہندے ایڈے رووݨے نی
ساتھوں کھیری ناد نہ جائے سانبھی اساں ڈھگ ہی انت نو جووݨے نی
رناں نال جے ورجدے چیلیاں نوں ایہ گورو نہ بنھ کے چووݨے نی

رناں دین گالیں اسیں چپ رہیے ایڈے صبر دے پیر کس دھووے نی
بس کھیڈنا چا تساں جا منع کیتا اساں دھوئیں گوہے کہے دھووے نی
وارث شاہ کیہ جانیے الت آخر کھٹے چووے کہ مٹھے چووے نی

احمد یار

ناتھا اگدوں لیک لایوئی وت متیں دیوں لگوں
درداں میریاندی کر کاری راہ کم دا دس رگوں
چگ کڈھیا میں ہیر جٹی دے عشق جہانوں جگوں
دنیا وچ کائی پت نہ میری رہی لہ واہڑی بگوں
پنجھی ورہے چکایاں مہیں طمع والی اس رگوں
پلے پیا نئیں اک پیسہ مہینوں چوچک ٹھگوں
اس کھیڑیاں توگوت دتی ڈولی پلک پیا اس جگوں
احمد یارا وید سینائیں میر کر کوئی دارو سگوں

محمد شاہ

عرض سنکے ساہو رانجھنے دی گرو دے پاس لیجاوندائے
نمسکار کرکے گورتھ ناتھ اگے چرن پکڑ کے عرض سناوندائے
گورو سنکے گل حقیقتاندی منتر جوگ دا ہتھ پھڑاوندائے
محمد شاہ رانجھنے دے کن پاڑے کڈ درشنی مندراں پاوندائے

جوگ سنگھ

پاڑ کے تے کن میرے نفع کیتا ناتھ جی نئیں عورتاں بیگانیاں دا تیاگ مینوں دس کے
ایہہ گل آکھ جے سناووں لگی مینوں پل لہ کھلوندا تیرے پاسوں جاندا نسکے
واسطے میں ہیر دے پڑائے کن جوگ ایہہ پھل پایا تیرے بھاہے وچ پھسکے

دمودر کے ہاں رانجھے میں ایک دھیمے مزاج کے انسان کا کردار دکھایا گیا ہے، جسے اپنی شخصیت کا زیادہ احساس نہیں ۔ اس کے جذبات میں ایک سکون ہے اور اس شدت جذبات کا اظہار نہیں جو احمد یار یا وارث شاہ اور جوگ سنگھ کے ہاں ملتی ہے ۔ بالناتھ کہتا ہے ایک بار اسے پہلی دفعہ اس وقت پریشانیوں سے دو چار ہونا پڑتا تھا

جب وہ بھائیوں کے ڈر سے گھر سے نکلا تھا اور دوسری بار اب زندگی میں ہیر کی شادی کھیڑوں کے ہاں ہونے سے وہ ذہنی تکلیف میں مبتلا ہوا ہے ، چنانچہ رانجھا جب سب طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو وہ اپنے دکھ کا علاج جوگ لینے میں پاتا ہے ۔ یعنی ہیر سے وصال کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو باطنی صفا کا راستہ اختیار کرتا ہے ۔

احمد کوی کی منظوم میں رانجھا ایک میانہ رو ، مستقل مزاج اور انسانی فطرت سے آشنا کردار دکھایا گیا ہے ۔ اسے اپنے جذبات پر قابو ہے ، وہ نہ تو بالناتھ سے جھگڑتا ہے اور نہ ہی اس سے اس کی تلخ کلامی ہوتی ہے بلکہ ایک طرف وہ بالناتھ کے کشف و کرامات کی تعریف کرتا ہے اور دوسری طرف اپنی مصیبت اور دکھ کا اظہار کرتا ہے ، تا آنکہ اپنے خلوص کی وجہ سے وہ بالناتھ کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لیتا ہے ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ جوگ کے تقدس کا قائل ہے اور اسے دل سے قبول بھی کرتا ہے ۔ اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ احمد کوی کے ہاں رانجھا مجازی اور حقیقی دونوں سطحوں پر زندہ پیش کیا گیا ہے ۔

مقبل نے دکھایا ہے کہ رانجھا ایک منکسر المزاج آدمی ہے جو بالناتھ کی منت کر کے جوگ لیتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ اپنے گرو کی اطاعت کرے گا ۔ وہ نہ تو وارث شاہ کے رانجھے کی طرح جوگیوں کے اعمال پر تنقید کرتا ہے اور نہ ہی احمد یار کی طرح اسے معاشرے میں اپنے حسب و نسب اور وجاہت کا احساس ہے ۔ وہ بالناتھ کے ساتھ بھی رو کر بات کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگرچہ جوگی بن کر 'جیو دی میل' دھاتی ہے مگر روحانی طاقت حاصل کرنے کے بعد بھی وہ اپنے انسانی حیثیت اور بشری حقوق سے دست بردار نہیں ہوتا ۔ اسلام میں رہبانیت یوں بھی جائز نہیں اور یہ ضروری نہیں کہ جوگ لے کر رانجھا اپنی مجازی زندگی سے کلیتہً فارغ ہو جائے ۔ گویا مقبل کا رانجھا مجازی سطح پر زندہ رہتا ہے مگر نہ تو وہ سماج کا نمائندہ ہے نہ احتجاج کی علامت اور نہ کسی روحانی طلب کا مجازی روپ ۔

وارث شاہ میں رانجھا کا کردار بے حرکت نہیں ۔ اس میں حالات کی مناسبت سے ارتقا ہوتا رہتا ہے اور جب وہ جوگ لینے جاتا ہے ، اس وقت وہ ایک الڑھ نوجوان ہی نہیں بلکہ ایک بے باک اور باشعور، بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ معاشرتی لحاظ سے ایک بالغ النظر انسان بن چکا ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جوگ لینا اور فقیر ہوجانا کوئی آسان کام نہیں ۔ اس کام میں جس طرح ذات کی نفی کرنا پڑتی ہے ، شاید وہ اس سے نہ ہو سکے گی ۔ مگر ہیر اس کی روح میں اس طرح بس گئی ہوئی ہے کہ وہ آپ اپنے محبوبِ مجازی کو ہی اصل حقیقت تصور کرتا ہے ۔ اس لیے جوگ کا مقصد ہی اس کے نزدیک یہ ہے کہ ہیر کو

حاصل کرے ، جو پالچ پیروں نے اس کے نام لکھ دی ہوئی ہے اور یہی بات وہ اپنے گورو کو بھی بتاتا ہے ۔ مگر یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ وارث شاہ کے ذہن میں یہاں خود ایک دورنگی پیدا ہو گئی ہے اور وہ مطلوبِ حقیقی اور مقصود مجازی میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا ۔ کیونکہ رانجھے اور سہتی کے مکالمے میں جوگیوں کے کردار پر حرف آتا ہے تو وہاں وہ ایک مکمل جوگی کے روپ میں دکھایا جاتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وارث شاہ رانجھے کو تینوں حیثیتوں سے زندہ رکھنا چاہتا ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہے یعنی رانجھا سماج کے نمائندے کی حیثیت سے اس پر تنقید کرتا رہتا ہے ۔ یہ تنقید اصل میں احتجاج کی ہی ایک صورت ہے ۔ تیسرے وہ مجازی طلب کے لیے روحانی روپ بھی دھارتا ہے ۔ رانجھے کا احتجاج بعض اوقات تشکک کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے جیسا کہ منتخبہ بند کے آخری مصرع سے ظاہر ہوتا ہے :

ع وارث شاہ کی جانیے آخر کھنٹے چووے کہ مٹھے چووے نی

اس منظوم میں رانجھے کے کردار کا یہ پہلو بہت نمایاں ہے کہ جب بھی معاشرتی حالات پر گفتگو ہوتی (اور وارث شاہ کی ہیر کے قریباً ہر بند میں ہوتی یہ بات ہے) رانجھا فوراً معاشرے کے نمائندے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے بلکہ ایک مبصّر کے طور پر پیش کر دیا جاتا ہے ۔ گویا یہاں بھی اس کی ایک حیثیت انفرادی ہے اور ایک عمومی ۔ مثلاً :

ع ساتھوں کھہری ناد نہ جائے سانبھی اساں ڈھگے ای الت نوں جووے نی

مگر یہاں ایسا معلوم ہوتا کہ وہ یہ بات رانجھا کی حیثیت سے نہیں کہہ رہا ، بلکہ ایک جاٹ کی طرح اپنے اندازِ عمل کا اظہار کر رہا ہے ۔

احمد یار کا رانجھا اپنے ماحول اور ارد گرد سے باخبر اور اس سے پوری طرح متاثر دکھائی دیتا ہے ۔ اسے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ اس نے ہیر کو پالنے کے لیے اس کے باپ کی ۲۵ برس خدمت کی مگر ہیر کا باپ ایک ٹھگ نکلا جس نے اس کی محنت اور خدمت کا اسے کوئی معاوضہ نہیں دیا البتہ بدنامی اسے ضرور حاصل ہوئی ۔ جس کی وجہ سے وہ محسوس کرتا ہے کہ معاشرے میں اب اس کی کوئی عزت نہیں ۔ یہاں رانجھے کو اپنے بے عزت ہونے اور دھوکہ کھانے کا شدید احساس ہے ۔ یہ ایک مجازی صورتِ حال یا کیفیت ہے اور نفسیاتی بلکہ سماجی اثرات کی حامل ہے ۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ احمد یار کو رانجھا کی عزت نفس کا زیادہ پاس ہے ۔

محمد شاہ کی منظوم میں رانجھا اطاعت گزار آدمی کی طرح بالناتھ سے جوگ کے لیے منت کرتا ہے اور بالناتھ اس کے حالات سننے کے بعد اسے جوگ دے کر روانہ کر دیتا

ہے۔ یوں کہانی ایک صورت حال سے نکل کر دوسری صورت حال میں داخل ہو جاتی ہے۔ جس سے یہی مراد لی جا سکتی ہے کہ رانجھا ظاہری اسباب سے جب حصولِ مدعا میں ناکام رہتا ہے، تو سماجی سطح سے اتر کر بالناتھ کی دعاؤں کی صورت میں روحانی قوت کا سہارا لیتا ہے۔ البتہ جوگ سنگھ کا رانجھا ہیر کے فراق میں شدتِ جذبات سے جلتا ہوا دکھایا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ بالناتھ کا اسے نصیحت کرنا پسند خاطر نہیں ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رانجھا بالناتھ کے پاس جوگ سے زیادہ روحانی مدد لینے جاتا ہے، اس لیے وہ جوگ کے لوازمات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ چنانچہ یہاں رانجھا اگرچہ خارجی طور پر ایک نیا روپ دھار لیتا ہے، لیکن داخلی طور پر وہ ایک ہی سطح پر زندہ ہے اور وہ ہے اس کی معاشرتی حیثیت، مگر یہاں وہ بشری تقاضوں کا مظہر دکھایا گیا ہے۔

دیگر داستانیں

اسی طرح ہیر رانجھا کو اور بہت سے سعراء نے منظوم کیا ہے ان میں سے ذیل کے شعراء کے نام تذکروں میں ملتے ہیں:

پیل، بھائی گورداس، مولوی عبیداللہ، میاں چراغ اعوان، ہاشم، مولا شاہ، احمد شاہ، سائیں مولا بخش، پیر غلام جیلانی، میرن، علی حیدر، حامد شاہ، محمد شاہ، اقبال، دائم، امام دین منشی، عبدالستار، مولا بخش کشتہ، حسین، میراں شاہ، میاں محمد عمر، شاہ شرف، اللہ دتہ، عبدالواحد، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، غلام جیلانی رہتکی، نور دین، محمد دین سوختہ اور چراغ۔

خلاصۂ کلام

ہیر رانجھا کا قصہ پنجابی معاشرہ کے رو کی اس طرح عکاسی کرتا ہے کہ اسے بار بار منظوم کیا گیا ہے اور ہر نامور شاعر ضروری سمجھتا ہے کہ اس موضوع پر سخن آرائی کرے۔ اس قصہ کے رومانی اور علامتی پہلو بھی ہیں۔ اور چونکہ اکبر کے زمانے میں ہی حضرت لال حسین اپنی کافیوں میں ان دونوں ناموں کو علامت کے طور پر استعمال کرتے تھے اس لیے یہ نظر آتا ہے کہ پنجابی معاشرہ ان عاشقوں کی مثالی حیثیت تسلیم کرتا تھا۔ چنانچہ رانجھا یا رانجھن اور ہیر عشق یا طلب کی علامتیں بن گئیں۔ رانجھا مطلوب اور ہیر طالب۔ مگر ہیر حسن کا مرقع اور مطلوب بھی متصور ہوتی تھی۔ چنانچہ پنجابی کے ایک گیت میں یہ بول آتا ہے:

جٹیوں بنا لے رانجھا ہیر تیرا کیہڑا مل لگدا

یوں یہ گیت ذو معنی بھی ہو سکتا ہے ۔ مراد اس حوالہ کی یہ ہے کہ ہیر رانجھا معاشرہ کے رومانی اور روحانی تقاضوں کا جواب معلوم ہوتے ہیں ۔ اور یہ قصہ معاشرہ کی پابندیوں کے خلاف احتجاج بھی ہے اور ایک ناممکن الحصول مطمحِ نظر یا مقصدِ حیات کی تلاشِ جاوداں کی علامت بھی ۔

مرزا صاحباں از پیلو (تبصرہ)

عہد سولھویں صدی کا نصف آخر

اس قصے کو سب سے پہلے پیلو نے لکھا جس کا زمانہ ۱۵۶۳ء سے لے کر ۱۶۰۶ء تک متعین کیا جاتا ہے ۔ پیلو دھنی کا رہنے والا تھا ۔ اس نے قصے کے بیان میں بہت اختصار سے کام لیا ہے ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ قصہ نامکمل ہے ۔ پیلو نے اپنے قصے کو وہاں ختم کر دیا ہے جہاں مرزا زخمی ہو کر صاحباں سے گلہ کرنے کے بعد دم توڑ دیتا ہے ۔ بعد میں لکھنے والوں کے برخلاف وہ اس سے آگے نہیں بڑھتا ۔ اس کے علاوہ اس نے واقعات کے بیان میں تفصیل کی بجائے اشارے سے کام لیا ہے ۔ پھر بھی قصے کے پلاٹ میں کوئی بے ربطی نہیں پائی جاتی ۔ اس اختصار کی وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ شاعر غیر ضروری عوامل و عواقب کی بحث سے اجتناب کرنا چاہتا ہے اور اپنی نظم میں ڈرامائی عنصر کو نمایاں کرتا ہے مگر اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ اکثر مقامات پر واقعات کی کڑیاں ٹوٹتی نظر آتی ہیں مگر شاعر کی چابکدستی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ وحدتِ عمل موجود رہتی ہے اور نظم میں ایک تدریجی ارتقاء پایا جاتا ہے ۔ جو نقطۂ عروج سے گزر کر تیزی سے انجام کی طرف بڑھتا ہے اور کامل تاثر پیدا کرتا ہے ۔

پیلو نے غیرضروری کردار پلاٹ میں داخل نہیں کیے ۔ صرف ضروری کرداروں کے عمل سے اس کا پلاٹ شروع کیا ہے ۔ البتہ اپنے اپنے مقام پر دوسرے کردار اس میں شامل کر دیے ہیں ۔ ان کے اختلافات اور ٹکراؤ سے پیچیدگی پیدا ہوتی ہے ۔ پیلو کرداروں کے عمل کی توجیع نہیں کرتا بلکہ خود قاری کو اپنے حافظے سے کام لینا پڑتا ہے ۔ مرزا اور صاحباں اس داستان کے کلیدی کردار ہیں ۔ دونوں خوبصورت اور خوب سیرت ہیں ۔ مرزا بہادر ، نڈر اور جان باز عاشق ہے ۔ صاحباں وفادار ، محبوب کے لیے جان قربان کرنے والی اور وعدہ کی پابند محبوبہ ہے ۔ دونوں کے کردار زندہ اور

تابناک ہیں ، مگر عام انسانی صفات کے بھی حامل ہیں ۔ یعنی وہ مثالیت کی تصویر نہیں بلکہ اپنی شخصیتوں کی افتاد کی وجہ سے معاملات کو حسب منشا بدلنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ مرزا بہادر ہونے کے علاوہ ماہر تیر انداز بھی ہے مگر اس مہارت کی وجہ سے غرور کا شکار بھی ہے ۔ یہ دونوں خوبیاں اس کی کمزوری بن کر صاحباں کے لیے جذباتی کشمکش اور خود اس کی موت کا باعث بنتی ہیں ۔ لیکن مرزا موت کو حوصلے کے ساتھ ایک بہادر انسان کی طرح قبول کرتا ہے ۔ صاحباں کی جذباتی کشمکش عین فطری ہے جس میں مشرقی بہن بھائی کے رشتے کی حقیقی عکاسی ملتی ہے ۔ جہاں محبوب کے مقابلے میں بھائی کی محبت غالب آتی ہے ۔ وہ اپنی محبت کو قربان کر سکتی ہے ۔ مگر بھائی کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی ۔ مرزا کا باپ ونجل اور اس کی ماں دونوں مثالی کردار ہیں جس کا کام اپنے لڑکے کو سمجھانا اور نصیحت کرنا ہے ۔ اسی طرح مرزا کی بہن چھتی بھی روایتی بہن ہے جو اپنے بھائی کے لیے تڑپ سکتی ہے مگر روایات سے نکل کر کوئی چونکا دینے والا کام نہیں کر سکتی ۔ پیلو نے ان کرداروں کی صرف جھلکیاں دکھائی ہیں ۔ مکمل کردار نہیں وضع کیے ۔ لیکن یہ کردار مرزا صاحباں کے لیے معاشرتی پس منظر کا کام دیتے ہیں اور ہمارے لیے اپنے زور تخیل سے ان کی مکمل تصویریں بنا لینا کوئی مشکل کام نہیں ۔ اس لیے کہ یہ کردار پنجابی معاشرے کے جانے پہچانے کردار ہیں ۔ کرموں باہمن اور بیبو کی موجودگی بھی لازمی محسوس ہوتی ہے ۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں لیکن وہ قصے کو آگے بڑھانے اور اس کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کا موجب بنتے ہیں ۔ وقت کی نزاکت سے فائدہ اٹھانے کے لیے کرموں باہمن صاحباں سے عشق جتاتا ہے لیکن اس کا تزکیۂ نفس ہو جاتا ہے اور اس کی کمزوری عیاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے ۔ شمیر خاں کا کردار ایک غیرت مند بھائی کا کردار ہے جس کی عکاسی بھی بڑی عمدگی سے کی گئی ہے ۔ پیلو نے مخالف کرداروں سے مکالمے نہیں کہلوائے بلکہ ان کا سارا عمل اس نے خود بتایا ہے ۔ اس طرح یہ کردار منظر عام پر نہیں آتے ، پس پردہ ہی رہتے ہیں ۔ مرزا صاحباں چونکہ منظوم ڈرامہ نہیں اس لیے پیلو کا اختصار یا کردار نگاری پر توجہ صرف نہ کرنا چنداں قابل اعتراض نہیں ۔ پیلو نے اپنے قصے میں مقامی ماحول اور معاشرتی زندگی کی عکاسی کی ہے ۔ اس نے زبان کے استعمال میں اپنی فنی مہارت کا ثبوت بھی دیا ہے ۔ لہجے کی تیزی اور روانی کے باوجود ٹھہراؤ اور سنجیدگی اسلوب کی نمایاں صفات ہیں ۔ مکالمات میں اختصار اور جامعیت سے کام لیا ہے ۔ اکثر کرداروں کی داخلی کیفیات کا ذکر ایک ہی شعر میں کر دیا گیا ہے ۔ قصے کا انجام اس کا بہترین ثبوت ہے ، جہاں مرزے کے کردار اور اس کے المناک انجام کو صرف دو مصرعوں میں یوں بیان کیا ہے کہ ایک بڑا شاعر اور ایک عظیم

ہیرو ابھر کر حیاتِ جاوداں پا گئے ہیں ۔ اس داستان کے انجام کا مقابلہ ادبِ عالیہ کے کسی بھی عظیم المیہ کے انجام سے کیا جا سکتا ہے ۔

حافظ برخوردار
عہد سترھویں صدی کا نصف آخر

حافظ برخوردار کی شخصیت متنازعہ فیہ ہے ۔ ان کے نام سے بہت سی کتابیں منسوب ہیں لیکن اُن کی تاریخِ تصنیف میں زمانی بُعد بہت زیادہ پایا جاتا ہے ۔ اُن کی پہلی تصنیف ۱۶۷۰ء اور آخری ۱۷۶۲ء میں مکمل ہوئی ۔ لیکن کسی مستند ذرائع سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی کہ انہوں نے اتنی طویل عمر پائی کہ وہ قریباً ایک سو سال تک ادب تخلیق کرتے رہے ۔ تاہم اُن کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ لاہور کے گاؤں سلہانی میں پیدا ہوئے ۔ جوان ہونے کے بعد مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے سیالکوٹ پہنچے اور یہیں وفات پائی ۔ آپ کی مشہور کتابیں یہ ہیں :

'فرائض ورثہ' ، 'یوسف زلیخا' ، 'سسی پنوں' ، 'مرزا صاحباں' ، 'جنگ نامہ امام حسین[۴]' ، 'ترجمہ قصیدۂ غوثیہ' ، 'چرخہ نامہ' ، 'انواع برخوردار' ۔

دوسرا بڑا شاعر جس نے اس قصے کو نظم کیا وہ حافظ برخوردار ہے ۔ حافظ برخوردار کا زمانہ سترھویں صدی عیسوی کا نصف آخر ہے ۔ حافظ برخوردار اور پیلو کے قصوں میں کوئی بڑا اختلاف نہیں ، لیکن حافظ برخوردار کا برتاؤ پیلو کے بیان سے مختلف ہے ۔ چند ایک کردار بھی پیلو کے مقابلے میں زیادہ ہیں ۔ اس لیے واقعاتی اختلاف ضرور پیدا ہو گیا ہے ۔ پہلا اختلاف بھتو قاضی کی موجودگی سے پیدا ہوتا ہے ۔ جہاں صاحباں اس سے خط لکھوانے جاتی ہے تو وہ اسے شرم و حیا کی پابندی کا درس دیتا ہے ۔ دوسرا اختلاف کردار نگاری کی وجہ سے بھی پیدا ہوا ہے ۔ حافظ برخوردار کے قصے میں والدین واقعات کو زیادہ محسوس کرنے کی حد تک بدلتے ہیں ۔ مثلاً یہاں مرزا کی ماں حالات کے پیشِ نظر اس سے غیرت مندی کا تقاضا کرتی نظر آتی ہے ۔ پیلو کے ہاں شمیر مرزا کے تیر لگنے سے گرتا دکھایا گیا ہے ۔ جب کہ حافظ برخوردار کی داستان میں اس کی ملاقات گھمہار سے کرائی گئی ہے جہاں بھائی کے روایتی کردار کی عکاسی ہوئی ہے ۔ پیلو مرزا کی موت کے بعد کسی واقعہ سے سروکار نہیں رکھتا اس کے برخلاف حافظ برخوردار کئی ایک اور واقعات پیدا کرتا ہے ۔ ان میں مرزا کے والدین کا بھی منظر پر آنا اور کورلوں کا سیالوں سے انتقام لینا وغیرہ شامل ہیں ۔ ان اختلافات کے باوجود قصے میں کوئی بنیادی فرق نہیں پایا جاتا ، البتہ المیہ کی کسک کم ہو جاتی ہے ۔

حافظ برخوردار کے قصے میں پیلو کے مقابلے میں کردار نگاری اور قصے پن پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ وہ واقعات کے ساتھ ساتھ کرداروں پر کڑی نظر رکھنے کے ساتھ ان کی نفسیاتی کیفیت کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی داستان کے واقعات ایک دوسرے کا قدرتی اور ضروری نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ پیلو اپنے کرداروں کے ساتھ زیادہ دور تک نہیں چلتا ۔ لیکن حافظ برخوردار ان کی عادات و خصائل اور عمل سب کی توجیہہ کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے اگرچہ قصے کی رفتار میں فرق پڑ جاتا ہے لیکن کردار نمایاں ہو کر ابھر آتے ہیں۔ اور اس کی یہ نظم ڈرامے اور ناول کی حدود کو چھونے لگتی ہے۔ اس میں ایک طرف ناول نگاری کی جزئیات اور دوسری طرف مصنف کا تبصرہ یونانی المیہ کے کورس کی سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ مگر اس سے المیہ میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ پیلو کے مقابلے میں حافظ برخوردار اپنے قصے میں وقتاً فوقتاً ڈرامائی عناصر داخل کرتا ہے۔ لیکن کئی ایک جگہ پر یہ طوالت بوجھ بن جاتی ہے۔ انجام بھی اسی طوالت کی نذر ہو کر اپنا تاثر کھو دیتا ہے۔

گھمھار، سرجا، صوبہ اور سلطان حافظ برخوردار کے زائد ضمنی کردار ہیں۔ ان کے ہونے یا نہ ہونے سے قصے کے حسن یا سلوک میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ طوالت کا نقص پیدا ہو گیا ہے۔ حافظ برخوردار نے گھوڑی نیلی اور جنڈ کے درخت کو بھی تشخص دے دیا ہے۔ وہ بھی عام انسانوں کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ اس سے وہ مافوق الفطرت عنصر جو عوامی قصوں کا جزو ہے، اس داستان میں شامل ہو گیا ہے مگر اس سے واقعیت میں بھی کمی پیدا ہو جاتی ہے۔

حافظ برخوردار کا انداز بیان شگفتہ ہے۔ کلام میں روانی اور زبان پر عبور کی وجہ سے تکرار پیدا ہو گیا ہے اور خطابت پر زور دیتا ہیں۔ ان کا لہجہ سست ہے۔ مرزا کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک وہی کیفیت طاری ہے۔ اگرچہ یہ ٹھہراؤ اور برد باری اسلوب کو متوازن بناتی ہے لیکن طوالت کا باعث بن کر تاثر کو کمزور کر دیتی ہے۔ حافظ برخوردار نے معاشرتی، تہذیبی اور اخلاق اقدار کی بڑی وضاحت سے عکاسی کی ہے۔ اس سلسلے میں پیلو اور حافظ برخوردار کے اشعار میں کئی جگہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ ذیل میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

پیلو

سٹیں ہتھ نہیں آوندی دانش منداں دی پت

ماڑی تیری تیر کی مرزیا لیائیوں کدھروں ٹور
جے گھر نہ آہی تیرے باپ دے منگ لے آؤنوں ہور
گھوڑی کھیوے خاں دی بڑی مراتب کھور
بھجیاں نوں جان نہ دیں گے ادھل گئیاندے چور
چڑھدے مرزے خاں نوں ونجل دیندا مت
بھٹھ رناندی دوستی کھری جنہاں دی مت
مندا کیتا ای صاحباں میرا تر چا ٹنگیا جنڈ
تن سو کانی مرزے جوان دی دیندا سیالاں نوں ونڈ
پہلی مار دا ویر شمیر دے دوجی کلے دے تنگ
تیجی ماراں جوڑ کے جیدی ہے ای توں منگ

حافظ برخوردار

لکھیں پتھ نہ آؤندی دانشمنداں دی پت
چوہے رلکی دابلی آندی ٹلیوں ٹور
جے گھر ناتی سائی آپنی تاں ننگ لیئونوں ہور
خان کھیوے دی جھاوری سارے مراتب کھور
جاں نہ دیندے بھجدیاں ادھلیاندے چور
چڑھدے مرزے خاں نوں اک ونجل دیوے مت
جا بیگانی نار نوں مورکھ پاندے پتھ
برا کیتا ای صاحباں میرا ترکش ٹنگیوئی جنڈ
ترے سو سٹھ میں کانی ترکشوں دیاں سیالیں ونڈ
پہلی ماراں خاں شمیر نوں دوجی کلے دے تنگ
تیجی ماراں طاہر خان نوں جسدی توں سیں منگ

مذکورہ بالا دو معروف شعراء کے علاوہ جن اصحاب نے اس داستان کو نظم کیا ان میں منشی خواہش علی ، جیون خاں اور چراغ دین کے نام سرفہرست ہیں ۔ یہ تینوں شاعر دور جدید سے تعلق رکھتے ہیں ۔ یہ قصے اس لحاظ سے قابل اعتنا ہیں کہ ان سے اس رومان میں جدّت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ ذیل میں ہم ان کا

اجمالی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

منشی خواہش علی

منشی خواہش علی ساڑی کلاں ضلع شیخوپورہ کا رہنے والا ہے اس کا رومان ۱۹۴۶ء میں چھپا۔ مصنف نے قصے کی جزئیات میں بہت سے اضافے کیے ہیں۔ مرزا اور صاحباں بچپن سے ساتھ رہتے اور اکٹھے پڑھتے ہیں۔ 'قصہ صفت شہر کھیوا' 'چرخہ صاحباں' شہر 'دانا باد' اور 'شکار سزا' سےشروع ہوتا ہے۔ مرزا کے چار بھائیوں اور کھیوا خان کی بہنوں کا ان کے ناموں کے ساتھ تعارف دیا گیا ہے جس میں ہیر جٹی کا واضح طور پر ذکر ہے۔ مرزا جب کھیوے سے واپس بھیج دیا جاتا ہے تو بیمار رہنے لگتا ہے۔ اس دوران میں مرزا اور صاحباں کے درمیان خطوط کا تبادلہ ہوتا ہے۔ آخر صاحباں کا پیغام ملنے پر اسے شادی کے روز لینے چلا جاتا ہے۔ بہن کے روکنے سے جب نہیں رکتا تو بہن اسے بددعا دیتی ہے

جیو نہ آویں پھر نہ ہو بھکی اسوار

(قصے میں بد دعا تو ضرور دیتی ہے لیکن مرزا کے مرنے پر یہی اپنے دادا کو اکسا کر کھیوے پر حملہ کرواتی ہے)۔

مرزا جب کھیوے کی طرف جا رہا ہوتا ہے تو راستے میں اس کو جنڈھروں کا نائی صاحباں کی جہیز کی پٹاری اٹھائے نظر آتا ہے۔ وہ اسے روک کر سب چیزیں دیکھتا ہے اور پھر ایک روپیہ دے کر نائی سے ایک چھلا لے لیتا ہے۔ اس کے بعد باراتیوں سے شرط جیت کر دولہا سمیت سب کی پگڑیاں اتروا لیتا ہے۔ رات کو صاحباں شادی کے جوڑے میں اس کے پاس چلی آتی ہے جسے لے کر وہ فرار ہو جاتا ہے۔ آخر میں کھرلوں کی کھیوے پر چڑھائی اور بربادی دکھائی گئی ہے۔

قصہ میں جو اہم جزئیات داخل کر دی گئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قصہ اس دور میں لکھا گیا جب نفسیاتی تحلیل کا عنصر ادب میں داخل ہو چکا تھا۔ والدین مرزا کو بیمار سمجھ کر علاج کرواتے ہیں۔ صاحباں کا خط ایک موثر انداز کا حامل ہے مرزا کے جواب میں خود اعتمادی اور غرور کی جھلک نمایاں ہے۔ صاحباں مرزا کے ساتھ جنڈ کے درخت کے سایہ میں سو جاتی ہے اور برے خواب دیکھتی ہے جن سے اسے آنے والے حالات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ خواب سے چونک اٹھتی ہے اور مرزا کو جگا کر خواب سناتی ہے، مگر مرزا پھر سو جاتا ہے اور موت ان کو گھیر لیتی ہے۔

قصے میں کردار نگاری کی نسبت پلاٹ پر زیادہ زور دیا گیا ہے جس کی وجہ سے معمولی کرداروں کی نشوونما تو نہیں ہوتی البتہ کلیدی کردار نمایاں رہتے ہیں ۔ نظم کا اسلوب ایک رواں دواں کیفیت کا حامل ہے ۔

جیوںؔ خاں

جیوں خاں کی مرزا صاحباں واقعات اور کردار نگاری دونوں کے اعتبار سے سب سے الگ ہے ۔ اس میں صاحباں کو پھنڈار کھوہ میں چرخہ کاتتے دکھایا گیا ہے ۔ مرزا جوان ہو کر کھیوے آتا ہے ۔ صاحباں کے ساتھ ساتھ اس کا بھائی شمیر بھی مرزا سے انس کرنے لگتا ہے ۔ ہیر رانجھے کے رومان کی طرح یہاں شیخ سلیمان جن کی دعا سے مرزا پیدا ہوا تھا ، کھیوے آ کر دونوں کو ثابت قدم رہنے اور جان قربان کر دینے سے گریز نہ کرنے کی نصیحت کرتے ہیں ۔ اس رومان میں جب مرزا اور صاحباں کے عشق کا چرچا ہونا ہے اور مرزا کی ماں کو خبر ہوتی ہے تو وہ مرزا کو خط لکھتی ہے کہ وہ ماموں کی عزت نہ گنوائے اور اس کی نیکی کا یہ بدلہ نہ دے ۔ بدنامی سے بچنے کے لیے کھیوا خاں نیلی بار کا آدھا علاقہ اور نیلی گھوڑی دے کر مرزے کو کھیوے سے رخصت کر دیتا ہے ۔ مرزا جب صاحباں کے بلاوے پر گھر سے چلنے لگتا ہے تو اس کے والدین یا بہنیں کوئی منظر پر نہیں آتا اور کوئی اسے نہیں روکتا ۔ بیباں صاحباں کو اپنے گھر بھیج دیتی ہے اور خود وہیں باراتیوں میں رہتی ہے چنانچہ اس رومان میں مرزا صاحباں کو بیباں کے گھر سے بھگا کر لے جاتا ہے ۔ وہ تمام رات کھیوے کے گرد گھومتے رہتے ہیں اور دانا باد کا راستہ نہیں ملتا ۔ آخر جھکھڑ ملتا ہے جسے مرزا کہتا ہے کہ وہ مغل بادشاہ کا پیغام لے کر جا رہا ہے ۔ مگر جھکھڑ تاڑ لیتا ہے اور راستہ بتا کر نصیحت کرتا ہے کہ جلد یہاں سے صاحباں کو لے کر دانا باد چلا جائے ۔ تھوڑی دور جا کر خود صاحباں مرزے کو جنڈ کے درخت کے نیچے آرام اور پیار و محبت کی باتیں کرنے کو کہتی ہے ۔ پھر دونوں ایک ہی کھیس میں درخت کے نیچے سو جاتے ہیں ۔ نیلی کی ہنہناہٹ سن کر کمہار وہاں آ جاتا ہے ۔ دونوں کو اکٹھا سویا ہوا دیکھتا ہے ۔ نیلی کو کھول کر دریا کی طرف ہنکا دیتا ہے اور خود شکایت کرنے چل پڑتا ہے ۔ راستے میں چندھڑ اور سیال مل جاتے ہیں جو جنڈ کے نیچے پہنچ کر ان کو تیر مارتے ہیں لیکن وہ نہیں جاگتے حتیٰ کہ یہ لوگ لکڑیاں اکٹھی کر کے ان کو آگ لگا دیتے ہیں ۔ آگ لگی دیکھ کر خان وینیل کی رعیت وہاں آتی ہے ۔ وہ نیلی کو خالی دیکھتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں کہ مرزا مار دیا گیا ۔ آگ کے قریب جاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ آگ بالکل ٹھنڈی ہے

چنانچہ آگ میں آگے بڑھ کر مرزا اور صاحباں کو دیکھتے ہیں تو دونوں کی آنکھیں پتھرائی ہوئی اور دونوں کو ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے پاتے ہیں یہ لوگ ان کو دفن کر دیتے ہیں اور دانا باد خبر کرنے چلے جاتے ہیں۔

رومان کی ابتدا اور انجام دونوں روحانی اقدار کی حامل ہیں۔ مرزا پیدا ہوتے ہی عاشق صادق بنا دیا جاتا ہے۔ اس لیے دونوں کا وصل حقیقی اور اٹل ہو جاتا ہے۔ بہت سے واقعات پیلو، حافظ برخوردار، خوابش علی اور چراغ دین سے مختلف اور زائد ہیں۔ اس وجہ سے کردار بھی بہت حد تک بدل گئے ہیں۔ نفسیاتی تحلیل سے کام لیتے ہوئے مصنف نے انسانی خواہشات اور عادات و خصائل کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہاں صاحباں محبت میں سرشار ہے اور ہر طرح کے خوف سے بے نیاز۔ مرزا کو پا کر دنیا کی وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتی ہے حتیٰ کہ سر پر منڈلاتے خطرے کو بھی نظر انداز کر دیتی ہے۔ شمیر خان کا کردار بھی مختلف ہے۔ وہ مرزا کی وجاہت اور بہادری کی وجہ سے اس سے اس کرنے لگتا ہے۔ جب مرزا صاحباں کو نکال کر لے جاتا ہے وہ تب بھی مرزا کو برا نہیں کہتا۔ بلکہ عہد کرتا ہے کہ اگر مرزے پر مصیبت کا وقت آیا تو وہ حضرت حر[۴] کی طرح مرزا کا ساتھ دے گا۔ پھر یہ کہتا ہے کہ وہ تو خلق کی شرم کی وجہ سے ان کے ساتھ آ گیا ہے۔ ورنہ گزرے کام کو کون مٹا سکتا ہے۔ چونکہ قصے میں بنیادی خیال کے علاوہ بہت سی تبدیلیاں کر دی گئی ہیں اس لیے معاشرتی تصویریں مدہم پڑ گئی ہیں۔ لیکن نفسیاتی نکتہ رسی کے بہت سے ثبوت ملتے ہیں۔ کھیوا خاں مرزے کو مصلحت کے تحت عزت و احترام سے واپس بھیجتا ہے۔ شمیر خاں کو مرزا باوجود عزت کا چور ہونے کے اچھا لگتا ہے۔ لیکن بہن کو اس کے ساتھ سوتا دیکھ کر اس کی غیرت بھی جاگ اٹھتی ہے اور وہ بھی آگ لگانے والوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ پلاٹ پرانا ہونے کے باوجود نئی ادبی اقدار کا حامل ہے۔ البتہ مخالف کرداروں کو ابھرنے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔

چراغ دین

چراغ دین نے پہلی بار اس رومان کی تاریخ بیان کی ہے۔ اس کے مطابق یہ واقعہ ۱۶۷۹ء/۱۰۹۰ھ میں پیش آیا۔ اس نے دانا باد کا حدود اربعہ اور کھیوا شہر کا رقبہ بتایا ہے۔ جیون خان کے قصے میں شیخ سلیمان مرزا کو عشق کا درس دیتے ہیں تو چراغ دین کے ہاں مرزا کی پیدائش پر میاں مجنوں اس کے کان میں اذان کے ساتھ عشق کی گھٹی بھی دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ رہتی دنیا تک مرزا کا عاشقوں میں نام رہے۔ مرزا جوان ہو کر جب تیر اندازی میں ماہر ہو جاتا ہے تو کھیوے پہنچتا ہے۔

صاحباں اور مرزا دونوں عشق کا شکار ہوتے ہیں ۔ صاحباں کی شادی کی تاریخ مقرر ہونے کے واقعات روایتی قصے کے مطابق بیان ہوئے ہیں ۔ البتہ جب مرزا صاحباں کا خط ملنے پر اسے ملنے جاتے وقت ماں کو آگاہ کرتا ہے تو ماں بد دعا دیتی ہے ۔ ''بہن کی بارات چھوڑ کر جانے والے اللہ سے بدلہ پائے'' پھر بہن بھی بد دعا دیتی ہے ۔ یوں لگتا ہے کہ چراغ دین نے اپنی نظم خواہش علی سے متاثر ہو کر لکھی ۔ اسی طرح مرزا کی ملاقات نائی سے ہوتی ہے ۔ پھر وہ باراتیوں سے مقابلے میں ان کو ہرا کر سب کی پگڑیاں اتروا لیتا ہے لیکن کھیوے خان کے کہنے پر پگڑیاں واپس کر دیتا ہے ۔ شرط جیتنے کے لیے جب مرزا گھوڑی کو مارتا ہے تو وہ بھی بد دعا دیتی ہے ۔ جنڈ والے واقعہ میں جب مرزا نیند سے نہیں جاگتا اورغرور کا اظہار کرتا ہے تو صاحباں اسے سن کر یہودی کا معجزہ سناتی ہے ۔ اس کے جواب میں مرزا بھی اسے ایک قصہ سناتا ہے ۔ پھر صاحباں ہابیل اور قابیل کا واقعہ بیان کرتی ہے اور جب مرزا اپنی طاقت اور نشانے میں مہارت کے متعلق شیخی بگھارتا ہے تو اس کا امتحان لیتی ہے ۔ اس پر مرزا صاحباں کی خواہش کے مطابق تیر مار کر درخت پر بیٹھے ہوئے طوطے کی چونچ میں سے آم چھڑا دیتا ہے ۔ خان شمیر کے لشکر کو ہونی مرزا اور صاحباں کا پتہ دیتی ہے ۔ مرزا کے تیروں سے طاہر خان اور دوسرے آدمی مارے جاتے ہیں ۔ اس کے بعد مرزا جب دوبارہ سو جاتا ہے تو شمیر بہن کو دھوکہ دے کر یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے عزت سے رخصت کر دے گا ۔ اس پر صاحباں مرزا کے تمام تیر توڑ دیتی ہے ۔ اس پر شمیر کے ساتھی ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں تو صاحباں پچھتاتی اور مرزے کو جگاتی ہے ۔ جو دو ایک تیر باقی رہ گئے تھے ۔ مرزا چلاتا ہے اور ایک خان شمیر کو مارنے لگتا ہے تو صاحباں روک دیتی ہے اور مرزا مارا جاتا ہے ۔

چراغ دین کی اس منظوم میں کوئی ایسی بات نہیں جو توجہ کا باعث بن سکے ۔ نمایاں چیز یہ ہے کہ مصنف نے واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کی تاریخ متعین کی ہے ۔ اس کے علاوہ بے شمار تاریخی حوالوں سے تشبیہات دی ہیں جس سے مصنف کی تاریخ سے دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے ۔ شاعرانہ انداز اور لطیف بیان کی کمی ہے ۔ مرزا کا خط کسی عاشق کے بجائے اچھے خاصے منشی کا خط معلوم ہوتا ہے جو حساب کتاب یاد رکھتا ہے ۔ جنڈ کے درخت کے نیچے جب صاحباں مرزا کو جگاتی ہے تو وہ حصہ یقیناً شاعرانہ خصوصیات کا حامل ہے لیکن اپنی طوالت اور تکرار کی بدولت تاثر کھو دیتا ہے ۔ مافوق الفطرت عناصر بھی ملتے ہیں ۔ ہونی انسان کا روپ دھار کر شمیر خان کو ان کا پتہ دیتی ہے اور جان لے کر دم لیتی ہے ۔ اپنے عہد کی تہذیبی اور سیاسی اقدار کی جھلکیاں بھی یوں نظر آتی ہیں جیسے روا روی میں بیان کر دی گئی ہوں ۔ کردار نگاری

پر کوئی توجہ نہیں دی گئی - کہیں قصہ پر زور ہے تو کہیں پلاٹ پر؟ شمیر کو
اس کی غیرت مندی اور بہادری کی صفات سے محروم کر دیا گیا ہے - صاحباں پہلی بار
بھائی کی محبت سے مغلوب ہو کر مرزے کے تیر نہیں توڑتی بلکہ بھائی کے جھوٹے وعدے
پر یقین کر لیتی ہے اور دھوکہ کھاتی ہے - لیکن جب وہ مضطرب ہو کر مرزے کو
جگاتی ہے اور مرزا بچے ہوئے تیروں سے شمیر کو مارنے لگتا ہے تو پھر وہ مرزے کو
روک دیتی ہے - اس وقت بھائی کی محبت آڑے آتی ہے اور مرزا مر جاتا ہے - یہاں صاحباں کو
نفسیاتی الجھن کا شکار ہونے کی بجائے ایک فریب خوردہ عورت دکھایا گیا ہے جو اضطراری
طور پر مرزے کا ہاتھ روک دیتی ہے اور موت قبول کر لیتی ہے -

اسلوب میں روانی اور بے ساختگی کم اور آورد کا عمل دخل صاف نظر آتا ہے -
البتہ شاعر نے جو 'بارہ ماسہ' لکھا ہے اس میں شاعرانہ خصوصیات ملتی ہیں - اکثر مقامات
پر شاعر نے اپنی علمیت کا مظاہرہ کرکے قصے کو طوالت سے بوجھل کر دیا ہے اور
اس میں سست روی پیدا کر دی ہے - ان وجوہات کی وجہ سے یہ منظوم عمومیت کی
سطح سے بلند نہیں ہو سکتی -

سوہنی مہینوال (تبصرہ)

سوہنی مہینوال کے رومان پر جتنی منظوم نظمیں ملتی ہیں ان میں ہاشم شاہ
(پ - ١٧٥٣ء) وارث شاہ (پ - ١٧٤٠ء)، احمد یار (پ - ١٧٦٨ء)، قادر یار (سکھوں
کا عہد) اور سید فضل شاہ کے نام مشہور ہیں - ان نظموں میں جسے سب سے زیادہ شہرت
ملی وہ سید فضل شاہ (١٨٢٧ - ١٨٩٠ء) کی سوہنی مہینوال ہے - وارث شاہ سے جو قصہ
منسوب کیا جاتا ہے - وہ دراصل *ان* کا لکھا ہوا نہیں - باوا بدھ سنگھ مولف
'پریم کہانی' کے مطابق یہ قصہ عبدالحمید نامی شاعر کا ہے جو اس نے سید فضل شاہ
سے متاثر ہو کر لکھا ہے - اس لیے کہ اس کے تقابلی جائزہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس
کے بہت سے اشعار فضل شاہ سے ملتے ہیں - پھر زبان و بیان کا انداز بھی وارث شاہ
کا نہیں لہذا اس قصے کو وارث شاہ سے منسوب کرنا درست نہیں - ہاشم شاہ کی
منظوم 'سوہنی مہینوال' پنجابی ادبی اکیڈیمی لاہور کی طرف سے اس کے مجموعہ کلام
'ککارے' میں ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کے دیباچے کے ساتھ چھپی ہے -

ہاشم شاہ

امرتسر کے ایک گاؤں جگدیو میں ١٧٥٣ء میں پیدا ہوئے اور ١٨٤٣ء
میں وفات پائی - کہا جاتا ہے کہ آپ نے رنجیت سنگھ کے والد مہاں سنگھ کی وفات پر

ایک مرثیہ لکھا جس سے خوش ہو کر رنجیت سنگھ نے آپ کو اپنا درباری شاعر بنا لیا ۔ چونکہ آپ ایک صوفی شاعر تھے اس لیے دربار میں رسائی کے باوجود آپ نے ہمیشہ درباری زندگی کو ناپسند کیا ۔ آپ کو عربی اور فارسی پر کافی عبور حاصل تھا ۔ پنجابی کے علاوہ آپ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے ۔ سسی پنوں کے علاوہ آپ کی مشہور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :

'سوہنی مہینوال' ، 'ہیر رانجھا' ، 'لیلیٰ مجنوں' ، 'شیریں فرہاد' ، 'دوہڑے ہاشم' ، 'سلوک ہاشم' ۔

ہاشم کے قصے میں عزت بیگ کا ملازم آ کر سوہنی کی تعریف نہیں کرتا بلکہ وہ تو صرف تلے کے بنائے ہوئے برتنوں کی خوبصورتی اور نفاست کو بیان کرتا ہے ۔ چنانچہ برتنوں کی نفاست مہینوال کو کھینچ کر تلے کی دکان پر لے گئی جہاں اس نے تلے کی مصنوعات کے درمیان خدا کے حسین شاہکار کا نظارہ کیا باقی سارا قصہ عام مروجہ قصے پر مبنی ہے ۔ البتہ ایک دو جگہ معمولی واقعاتی اختلاف ملتا ہے ۔ مثلاً جب سوہنی کے والدین بدنامی کی وجہ سے مہینوال کو گھر سے نکال دیتے ہیں تو سوہنی ہیر کی طرح اس کو ایک سہیلی کے ہاتھ پیغام بھجواتی ہے کہ مہینوال اسے فقیر کے بھیس میں آ کر رات کو ملے ۔

ہاشم نے سیدھے سادھے انداز میں عشق کی اس واردات کو بیان کیا ہے ۔ اس کے ہاں مکالمہ بالکل نہیں ساری نظم بیانیہ انداز میں لکھی گئی ہے ۔ کہیں کہیں شعری اور فنی لوازمات کا التزام ملتا ہے ۔ نامانوس الفاظ سے زبان ناہموار اور اکھڑی اکھڑی ہے ۔ اکثر حقیقت کا سپاٹ اظہار کر دیا گیا ہے ۔ شاعر نے جگہ جگہ محاورے اور ضرب الامثال کا سہارا لے کر واقعات کے بیان کو مؤثر بنانے کی کوشش کی ہے ۔ مثلاً :

ہاشم شرم کہی گھر جس دے کردا عشق پسارا

یا

آتش تیرھویں تئیوں ہندی واؤلگے اٹھ رمکے

یا

سوناں صاف پیا کٹھیالی تانگے تئیوں چمکے

ان سے کرداروں کے جذبات و احساسات کا اندازہ تو ہو جاتا ہے مگر جب تک کرداروں کے اعمال سے ان کی تائید نہ ہو قاری نہ تو متاثر ہوتا ہے اور نہ

جذباتی طور پر کسی شدّت کو محسوس کر سکتا ہے ۔ صرف آخری حصے میں جہاں سوہنی دریا میں ڈوب کر محبوب کے وصل کی تشنہ آرزو لیے بپھری موجوں میں بہہ جاتی ہے شاعر نے نہایت خوبصورتی اور فنی مہارت سے تاریک رات میں بلاؤں کے نزول کی منظر کشی کی ہے ۔ یہاں قاری سوہنی کی بے بسی کو دکھوں کے اندھیرے کے ساتھ اڑتا دیکھتا ہے اور جب شاعر یہ کہتا ہے کہ :

دکھا ویکھ سوہنی نوں بھیڑیا ڈھونڈ تمام جہانوں

تو ان دکھوں، کو بیان کرنا نہیں بھولتا ۔ اس نے سوہنی کی راہ میں حائل ڈراؤنے موسم کی جو تصویریں بنائی ہیں وہ اس کے فن کی مظہر ہیں ۔ ملاحظہ فرمایئے ۔

ہوئی شام گھٹاں وچ بجلی چمکی نال مروڑاں
گویا توف تفنگ زنبورے چلن لا کھ ہزاراں
کنبے تخت زمین دا تھر تھر سہن پہاڑ نہ توڑاں
پایا زور اندھیری بارش ہوں جہاز آ بھٹھے

فارسی منظومات

احمد یار اور قادر یار کی نظمیں دستیاب نہیں ۔ ان کے بعد فضل شاہ کی منظوم سوہنی مہینوال کا تذکرہ مقصود ہے جو دیہاتی حلقوں میں بہت مقبول ہے ۔ لیکن اس سے پہلے ہم یہاں اسی زمانے میں فارسی میں لکھی جانے والی مہینوال کی داستان کا ذکر کرتے ہیں ۔ اس کا مطالعہ یوں بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہ واقعاتی اعتبار سے پنجابی زبان میں لکھی جانے والی نظموں سے کافی حد تک مختلف ہے ۔ یہ فارسی مثنوی' فضل حسین تبسم کے مطابق 'خمسہ نظامی' کے تتبع میں ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۱ء کے درمیان لکھی گئی ۔ اس کا مصنف محمد صالح ہے جو افغانستان کا رہنے والا تھا جسے حضرت عبدالحکیم رنگریز سے جن کا مزار بمقام عبدالحکیم ضلع ملتان میں ہے ، والہانہ عقیدت تھی ۔

محمد صالح

محمد صالح کی بیان کردہ کہانی اور پنجابی کے مشہور قصہ 'سوہنی مہینوال' میں ناموں کی یکسانی اور سوہنی کی موت کے واقعہ کے علاوہ کوئی چیز مشترک نہیں ۔ کہانی میں مافوق الفطرت عناصر کارفرما ہیں اور سیدھی سادھی معاشرتی زندگی کی

---

(۲) ڈاکٹر محمد باقر ، پنجابی قصے فارسی زبان میں ، ص ۱۹۳ ۔

جذباتی کشمکشوں کا اس میں ذکر نہیں ملتا ۔ طوالت کے خوف سے پوری کہانی یہاں نہیں دی جا سکتی ۔

اس منظوم کی بنیاد معاشرتی اقدار کی بجائے روحانی اقدار پر رکھی گئی ہے ۔ مصنف چونکہ خود پیر پرست ہے اس لیے اس نے اس کہانی کے تار و پود میں انہی عقائد سے کام لیا ہے ۔ سوہنی کے ناموں میں مماثلت بھی دلچسپی سے خالی نہیں ۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اس نے یہ قصہ لوگوں سے سنا تھا ۔ تو یقینی بات ہے کہ اس نے اسی طرح سنا ہو گا جس طرح پنجابی میں مشہور ہے اور وہ اس قصے سے مختلف ہے جو اس نے منظوم کیا ۔ اس لیے کہ کسی اور قصے یا روایت سے اس قصے کی تصدیق نہیں ہوتی ۔ چنانچہ قصے میں یہ تبدیلی اس کے ذہن کی پیداوار ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی قبولیت کا درجہ نہ حاصل کر سکی ۔ ورنہ فضل شاہ اس کا ضرور ذکر کرتا ۔ فضل شاہ نے اسی زمانے میں اپنی رومان لکھی جس زمانے میں صالح نے یہ مثنوی نظم کی ۔

سید فضل شاہ (۱۸۳۲ء - ۱۸۹۰ء)

سید فضل شاہ ۱۸۳۲ء میں نواں کوٹ لاہور میں پیدا ہوئے اور یہیں ۱۸۹۰ء میں وفات پائی ۔ آپ کا شجرہ نسب امام علی نقیؑ سے ملتا ہے ۔ آپ حضرت غلام محی الدین قصوری سے بیعت تھے ۔ آپ کے بزرگ مغلیہ عہد میں جاگیر دار تھے ان کو شعر و شاعری سے بچپن ہی سے لگاؤ تھا اور وہ ہمیشہ اپنے خیالات میں ڈوبے رہتے ۔ چنانچہ ساری عمر فنانس کمشنر کے دفتر میں ایک دفتری کی حیثیت سے گزار دی ۔ آپ نے 'سوہنی مہینوال' کے علاوہ ، 'سسی پنوں' ، 'لیلیٰ مجنوں' ، 'یوسف زلیخا' ، 'ہیر رانجھا' اور سی حرفی لکھیں ۔

فضل شاہ نے اپنی منظوم داستان میں مروج کہانی سے کہیں اختلاف نہیں کیا ۔ اس نے یہ رومان سادہ اور رواں زبان میں لکھا ۔ چونکہ فضل شاہ کوئی بڑا شاعر اور فن کار نہیں اس لیے اس کے قصے میں نہ تو کرداز نگاری ملتی ہے اور نہ ہی کسی گہرے نفسیاتی شعور کا احساس ہوتا ہے ۔ بے جا طوالت قصے کے تاثر کو بری طرح مجروح کرتی ہے ۔ مصنف نے ہر جگہ زور بیان دکھانے کی کوشش کی ہے ۔ اس کے بہاؤ میں اسے اس بات کا دھیان نہیں رہتا کہ کردار کی صورت بھی بگڑ رہی ہے یا قصے کی دلچسپی کم ہو رہی ہے ۔ سوہنی ڈوبتے وقت سات بار افسوس کرتی ہے ۔ اس کے بعد اپنی سہیلیوں کو یاد کرتی ہے ۔ ماں کو یاد کرتی ہے ۔ پھر اس سے معافی

مانگتی ہے اور آخر میں خدا سے دعا کرتی ہے تب کہیں اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرتی ہے ۔ اس طرح کی بیجا طوالت ہر واقعہ میں ملتی ہے ۔ البتہ ہاشم کے مقابلے میں اس نے مہینوال کا کردار قدرے بہتر دکھایا ہے ۔ ہاشم کے ہاں مہینوال ایک عاشق صادق ہونے اور محبت کے زیر اثر تکالیف اٹھانے کی بجائے کسی مجبوری کے تحت اپنا کردار ادا کرتے دکھایا گیا ہے ۔ وہ جب سوہنی کے عشق میں اپنا سکون اور مال و دولت سب کچھ لٹا چکتا ہے تو وہ ماضی کو یاد کر کے روتا اور پچھتاتا ہے ۔ فضل شاہ کے ہاں مہینوال کے کردار میں ایک طرح کا وقار ملتا ہے ۔ جس کے سامنے صرف اس کا محبوب رہتا ہے جس کی جدائی وہ کسی طرح برداشت نہیں کرنا چاہتا اور جب سوہنی مر جاتی ہے تو خود بھی زندہ نہیں رہتا ۔ پنجابی زبان کی ان رومانوی داستانوں کے مرکزی کردار وقت کے ساتھ ساتھ اپنی عام حیثیت سے بڑھ کر علامتی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ۔ ہماری صوفیانہ شاعری میں شعراء اپنے آپ (خود کو) ہیر ، سوہنی اور سسی اور اپنے خدا اور مرشد کو رانجھا ، مہینوال اور پنوں کے نام سے مخاطب کرتے ہیں ۔ اس کی مثالیں شاہ حسینؒ ، سلطان باہوؒ ، بلھے شاہؒ اور ہاشم شاہ کے کے کلام میں ملتی ہیں ۔ یہ صوفی شاعر محبوب حقیقی کی تلاش و جستجو میں اپنی بے چینی ، جذباتی واردات اور دلی کیفیات کو ان کرداروں سے مماثل پاتے ہیں ۔

سسی پنوں (تبصرہ)

حافظ برخوردار

پنجابی کے دوسرے رومانوں 'مرزا صاحباں' ، 'ہیر رانجھا' اور 'سوہنی مہینوال' کی طرح یہ رومان بھی بہت مقبول ہے اور اسے قریباً قریباً ہر شاعر نے نظم کیا ہے ۔ معروف شعراء میں جس نے سب سے پہلے اس رومان کو نظم کی صورت دی وہ حافظ برخوردار ہے ۔ اس نے یہ داستان عالمگیری عہد میں لکھی ۔ حافظ برخوردار نے مختلف کرداروں کے حقیقی جذبات کی نہایت اچھی تصویر کشی کی ہے ۔ اس نے بعض جگہ ایک مصرع میں صرف چند الفاظ کے استعمال سے معاشرہ کی مکمل تصویرکشی بھی کر دی ہے اور اسی طرح جذبات کا تجزیہ بڑی عمدگی سے کر دکھایا ہے ۔ ابتدا میں اس نے آدم جام کی بیوی کی اولاد کے لیے بے چینی کا نقشہ یوں کھینچا ہے :

اوہ ستی ستی سیج تے ہنجو رووے لت
رہا سب نہ مکھ پساریا ہوند نہ پئیاتت

ٹھیٹھ پنجابی زبان میں محاورہ بندی اور روزمرہ اُس کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے اور اس کا استعمال اُس نے جگہ جگہ کیا ہے ۔ وہ سیدھے سادھے سپاٹ انداز میں بات کرنے کی بجائے الفاظ میں اشاریت اور گہری معنویت سمونے کا عادی بھی ہے ۔ ایک بند ملاحظہ فرمایئے :

حافظ جے رب آوے مہر تے کلر کول کرے
سکے ڈھینگر قدرتی کردا رب ہرے
رب بھریاں نو کردا سکھنا خالی بھیر بھرے
یارو جیڈی قدرت رب نوں ایڈا زور جرے
سسی دا درد پنگھوڑا اڈیا جھولے دیندے دُکھ
اتے سول وچھائی پوتڑے تکن نہ ملیا مکھ

اس میں سسی کے پورے کردار کی طرف اشارے کر دیے گئے ہیں جس سے اس کی آئندہ زندگی بھی ہمارے سامنے آ جاتی ہے ۔ پھر وہ کرداروں کو ان کے اصل مرکز سے کبھی ہٹنے نہیں دیتا ۔ ہمارے سامنے ایک معاشرے کی اقدار ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ان اقدار کے حامل افراد کا عمل اور رّد عمل کیا ہونا چاہیے ۔ حافظ برخوردار ان معاشرتی اقدار کو ہمیشہ سامنے رکھتا ہے وہ ان سے وہی عمل کرواتا ہے جس کے لیے انہیں چنا گیا ہے ۔ یوں ایک مربوط معاشرے کی تصویر نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے ۔ بادشاہ جوتشی ، دھوبی اور دھوبن میں شہزادی کا اپنا الگ مقام ہے ۔ پنوں ، اس کا عشق اور اس میں ثابت قدمی ، ان سب کے لیے جواز موجود ہے ۔ یہاں انسانی فطرت اور معاشرے کے ضابطوں کے تحت سالہا سال سے ایک ہی طرح زندگی گزرتے ہوئے چند اصولوں کا فطرت ثانیہ بن جانا ایک قدرتی امر ہے اور جب یہ اصول فطری جذبات سے متصادم ہوتے ہیں تو انسان کے دل و دماغ میں ایک بحران پیدا ہو جاتا ہے ۔ سسی کے والدین پنوں سے وہی سلوک کرتے جو انہیں ایک دھوبی سے کرنا چاہیئے تھا ۔ مگر پنوں کے والدین کو یہ بات پسند نہیں آتی اور وہ عاشق و محبوب کے درمیان ایک دیوار بن جاتے ہیں اور آخر ان کی موت کا باعث بنتے ہیں ۔ ان سب باتوں کو حافظ برخوردار نے نہایت خوبی سے اپنی نظم میں بیان کیا ہے ۔

فارسی منظوم

پنجابی کے دوسرے رومانوں کی طرح یہ رومان بھی پنجابی کے علاوہ فارسی کے مثنوی گو شعراء کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے ۔ فارسی میں جس شاعر نے

سب سے پہلے اسے نظم کا جامہ پہنایا وہ منشی جوت پرکاش ہے۔ اس کی مثنوی کا نام 'دستورِ عشق' ہے' اور اس نے اسے ۱۷۷۳ء میں لکھا۔ یہ ایک طویل مثنوی ہے جو ۲۳۴۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ مصنف نے ہندو ہونے کے باوجود اس کا آغاز توحید الٰہی اور پھر خالق کائنات کے حضور مناجات کے اشعار سے کیا ہے۔ جس سے اس زمانہ کی تہذیب کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مثنوی اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے کہ اس میں مصنف نے پنجابی کے بہت سے قصوں سے واقعات لے کر ان کو نئے انداز میں لکھا ہے۔ یعنی قصہ تو وہی ہے مگر واقعات کی نوعیت مختلف کر دی گئی ہے۔ اس قصے میں جب سسی جوان ہو کر پنوں کو خواب میں دیکھتی ہے تو اس کی تلاش ماں کے مشورے سے اور بادشاہ کی مدد سے کرتی ہے۔ بادشاہ سسی کو بیٹی کے سمان تصور کر کے اس کی ہر خواہش کو پورا کرتا ہے۔ وہ باغ بنوانے کی بجائے شہر میں داخل ہونے والے راستوں کے پلوں کے نیچے بہنے والے دریا میں نوکرانیوں کے جلو میں گھومتی ہے اور ان پر سے گزرنے والے مسافروں کو دیکھتی ہے ایک روز جب کیچ مکران کے کچھ سوداگر پکڑے ہوئے اس کے سامنے لائے جاتے ہیں تو وہ ان سے ان کے وطن کا حال پوچھتی ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ ان کا سہزادہ اس کے خوابوں والا شہزادہ ہی ہے، ان کو شہزادے کے نام خط دیتی ہے جس میں اسے مشورہ دیتی ہے کہ بھمبھور آ جائے وغیرہ وغیرہ۔

اس قصے میں کرداروں کا رویہ کسی حد تک بدل گیا ہے۔ سسی کی ماں اس کی ہمدرد بن کر اسے پنوں کی تلاش میں مدد دیتی ہے۔ سسی کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ بادشاہ کی بیٹی ہے۔ اس لیے وہ کسی امتیازی سلوک کی متمنی نہیں ہوتی۔ اس طرح اس کہانی سے وہ حصہ بھی نکل گیا جو غربت اور امارت کے تقابل سے فلسفیانہ بحث کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے کہ سسی اپنے آپ کو غریب باپ کی لڑکی ہی سمجھتی ہے اور بادشاہ اس سے بیٹیوں جیسا ہی سلوک کرتا ہے، اس لیے ٹکراؤ کا کہیں موقع نہیں آتا۔ آخر میں جب دونوں مر جاتے ہیں تو دونوں کے ماں باپ قبروں پر پہنچتے ہیں۔ سب روتے پیٹتے ہیں تو قبروں میں سے آواز آتی ہے کہ انہوں نے وصالِ حقیقی پا لیا ہے اس لیے رونے کی ضرورت نہیں، تو سب لوگ مطمئن ہو کر چلے جاتے ہیں۔ اس داستان میں رانجھے کی طرح مافوق الفطرت عناصر بھی مدد کرتے ہیں۔

ہاشم شاہ (۱۷۵۳ء - ۱۸۴۳ء)

اس کے بعد جس پنجابی شاعر کی منظوم داستان کا تذکرہ یہاں مقصود ہے وہ ہاشم شاہ ہے۔ ہاشم شاہ نے اپنی 'سسی پنوں' کا آغاز حسبی کے

---

(۲) ڈاکٹر محمد باقر، پنجابی قصے فارسی زبان میں ص ۲۔

والد کی براہ راست اولاد کی خواہش کے بیان سے کیا ہے۔ وہ پیروں فقیروں سے رجوع کرتا ہے اسے سسی کی شب قدر میں پیدائش کی خبر ملتی ہے۔ یوں یہ داستان تیزی سے مگر بغیر کسی قسم کا تاثر چھوڑے آگے بڑھتی ہے۔ ہاشم بنیادی طور پر ایک صوفی شاعر ہے اس لیے ایسی عشقیہ داستان لکھنا غالباً اس کا مقصد نہیں تھا۔ اس نے سسی کو ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے جیسے سسی کوئی مافوق البشر روح ہو۔ جب اس کے والدین نجومیوں کی پیش گوئی کے بعد اس کو صندوق میں بند کرکے دریا میں بہانے لگتے ہیں تو وہ اس سے آخری بار بات کرنا چاہتے ہیں تو سسی ان کو تمام حقیقت حال سے آگاہ کر دیتی ہے " سسی صاف جواب دتو نے کھول حقیقت ساری"۔ دوسری بار جب اس کے پالنے والے اس سے شادی کے بارے میں رائے معلوم کرتے ہیں تو وہاں بھی سسی اس حقیقت سے واقف ہے کہ وہ ایک شہزادی ہے۔ پھر اس سے پہلے صندوق میں بند اسے حضرت یعقوب[۴] کی طرح روتا بتایا گیا ہے۔ یہاں بھی قصہ میں روحانی عنصر نمایاں ہے۔ ان کے نزدیک محبوبِ حقیقی کا وصال ہی اصل مقصود و منتہا ہے اس کے لیے وہ سسی کو ثابت قدم اور دکھ جھیلنے اور جان قربان کر دینے والی عاشق حقیقی ہی کے روپ میں پیش کرتے ہیں :

ترساں مول نہ ڈرساں راہوں جان تلی پر دھرساں
جب لگ سانس نراس نہ ہووں مرنوں مول نہ ڈرساں
آتش دا دریا کھلوتا تھل مارو دل چارے
ہاشم پھر چھاہاں لڑدی لوں لوں ہوت پکارے

اس داستان میں گوشت پوست کے متحرک کرداروں کی بجائے افراد کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ معاشرتی اقدار کی اگر کوئی جھلک نظر آتی ہے تو یہ اس لیے کہ خود قصہ ایک خاص معاشرتی پس منظر کا حامل ہے، مگر مصنف نے اس سے اپنی منظوم کا ڈھانچہ بنانے میں کوئی کام نہیں لیا۔ اس لیے اس منظوم میں کوئی پلاٹ پیدا نہیں ہوتا۔ زبان ٹھیٹھ نہیں، بلکہ اس میں فارسی الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔

احمد یار (۱۷٦۸ء - ۱۸۴۸ء)

تیسرا بلند پایہ شاعر جس نے اس قصے کو منظوم کیا احمد یار ہے احمد یار کی نظم میں قصے کی جزئیات بہت حد تک مختلف ہیں۔ اس کے ہاں سسی جوان ہونے کے بعد سہیلیوں کے طعنوں کی وجہ سے ماں سے اپنے بارے میں پوچھتی ہے مگر وہ راز چھپا جاتی ہے۔ اس پر وہ خود نجومیوں کو بلا کر انو سے احوال دریافت کرتی ہے۔ نجومی اسے بتاتے ہیں کہ وہ بادشاہ کی بیٹی ہے اور

بچپن میں ہی اس کے والدین نے اسے صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دیا تھا - اس کے علاوہ وہ اسے یہ بھی بتاتے ہیں کہ کیچ مکران کا شہزادہ اس کے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے ، چنانچہ اس کی تلاش کے لیے وہ رنگ محل بنوائے اور اس کی راہ دیکھے - نجومیوں کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے وہ بادشاہ کو خط لکھتی ہے جس میں یہ بتاتی ہے کہ وہ اس کی بیٹی ہے - لٰہذا وہ اس کے لیے دریا کے کنارے رنگ محل تعمیر کر دے - بادشاہ وزیروں کے مشورے سے اس کے لیے رنگ محل تیار کرواتا ہے جہاں وہ سہیلیوں کے ساتھ رہنے لگتی ہے - اس کے بعد پنوں سے ملاقات تک وہی معروف قصہ ہے -

احمد یار کے قصے میں مافوق الفطرت عناصر کرداروں کی مدد نہیں کرتے - اس نے عشق کے جذبے کو ہی اپنا راہنما بنایا ہے - یہی وجہ ہے کہ بے شمار موقعوں پر عشق کی تاثیر کا بیان دیا گیا ہے - اس میں پرانے عشقیہ قصوں کے کرداروں اور واردات کا ذکر کرکے واقعات کا جواز بتایا گیا ہے لیکن اس بات کا جواز پھر بھی نہیں ملتا کہ سسی جب یہ جان لیتی ہے کہ وہ بادشاہ کی بیٹی ہے اور رنگ محل بنوا کر علیحدہ رہنے لگتی ہے تو پنوں کو دھوبی ظاہر کرنے کی اُسے کیا ضرورت تھی - اگر چاہتی تو شہزادے کو رنگ محل میں ٹھہرا کر اس سے شادی کر سکتی تھی - اصل میں بات یہ تھی کہ احمد یار یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ عشق کے ہاتھوں آدمی مجبور ہو کر اپنی معاشرتی حیثیت کو خاطر میں نہیں لاتا اور ظاہری وقار کو عشق پر قربان کر دیتا ہے - پنوں نے سسی کے لیے دھوبی بننے میں کوئی عیب نہ جانا اور اس کے لیے اپنے آپ کو امتحان میں ڈال دیا - اس کے ذہن میں 'سوہنی مہینوال' اور 'ہیر رانجھا' کے ہیرو تھے جو اپنے محبوب کو حاصل کرنے کے لیے اپنی عزت وقار اور نام و نمود چھوڑ کر محبوب کی ملازمت اختیار کر لیتے ہیں - چنانچہ احمد یار نے پنوں کو بھی اسی معیار کا کردار بنانے کے لیے اسے دھوبی بنا لیا -

اگرچہ پنجابی کے دوسرے رومانوں کے برخلاف اس قصے میں سسی اور پنوں کی شادی ہو جاتی ہے اور اس کے لیے انہیں زیادہ تکالیف اور دکھ جھیلنے نہیں پڑتے ، لیکن مصنف کے نزدیک شادی وصال کا ذریعہ نہیں - اصل چیز عشق ہے جس کے بغیر حقیقی وصال ناممکن ہے - یہی وجہ ہے کہ سسی کو پیدا ہوتے ہی عشق کے جادو میں مسحور و مجبور رکھا گیا ہے - بچپن میں والدین اسی اندیشے کے پیش نظر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں ، لیکن اس سے اس کی تقدیر نہیں بدلتی - دھوبیوں کے ہاں جب مُلّا اسے تعلیم دیتا ہے تو وہ اسے کہتی ہے :

سسی غصہ کھا کے دتا ایہ جواب　　حرف نہیں کوئی عشق دا اللہ کسے کتاب
مینوں عشق پڑھایا دفتر ، جمدی لوں　　ہن کیکر علم پڑھا وسیں ملاں - قاضی نوں

اور عشق کا یہ اثر شروع سے آخر تک نمایاں ہے ۔ آخری حصے میں احمد یار کا یہ کہنا کہ :

عشق حقیقی رب دا عشق مجازی نال
مر کے ملنا رب نوں عشق باہجھ محال

ظاہر کرتا ہے کہ احمد یار کے نزدیک بھی صوفیانہ مسلک تھا ، جس نے اسے اس قصے کو نظم کرنے کے جذبے کو تحریک دی ۔

اس منظوم میں معاشرے کی جزوی عکاسی ہوئی ہے ۔ ایک دو واقعات کے علاوہ کہیں ایسے حادثات رونما نہیں ہوتے جن سے معاشرتی جھلکیاں نظر آئیں ۔ ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کے لیے خواہ وہ امیر ہوں یا غریب ، کھلم کھلا عشق کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اور معاشرہ اسے برداشت نہیں کرتا ۔ اس کے علاوہ رسوم کی پابندی یعنی برادری کے ضابطوں کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے ۔ اُن دنوں برادری سے باہر شادی کرنے کا تصور بھی ناممکن تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ دھوبی پنوں کا امتحان ایک بار نہیں تین بار لیتے ہیں ، پھر کہیں ان کی تسلی ہوتی ہے ۔

احمد یار کی زبان ٹھیٹھ اور رواں ہے ۔ واقعات کے بیان میں اگرچہ مکالمے کا انداز بھی پایا جاتا ہے لیکن سارا قصہ خود مصنف نے بیان کیا ہے ۔ چونکہ اس کی توجہ کا اصل مرکز عشق ہے ، اس لیے واقعات کے ساتھ عشق میں پیش آنے والی مشکلات کو ماضی کے قصوں سے تلمیحاً اور اشارتاً ظاہر کیا ہے اور اس کا ایمان ہے کہ عاشقوں کی مشکلات اللہ تعالیٰ آسان کر دیتا ہے :

شاہ وزیراں صوبیاں عشق کرے محتاج
پر آپ غالباں عاشقاں رب سوارے کاج

یہی وجہ ہے کہ کرداروں میں ایک طرح کا اعتماد پایا جاتا ہے ۔ وہ تکالیف اور دکھوں سے گھبرا کر گلہ یا شکوہ نہیں کرتے ۔

پورن بھگت (تبصرہ)

پنجابی زبان کی مشہور طویل داستانوں میں 'پورن بھگت' واحد داستان ہے جو ہندوانہ پس منظر کی حامل ہے ۔ یہ داستان بہت دفعہ منظوم ہوئی ہے اور پنجابی زبان کے کئی شعراء نے اسے نظم کیا ہے لیکن جو شہرت قادر یار کے قصہ 'پورن بھگت' کو ملی کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی ۔

قادر یار (۱۸۰۰ء - ۱۸۵۵ء)

قادر یار کا عہد ۱۸۰۰ء سے لیکر ۱۸۵۵ء تک متعین کیا جاتا ہے۔ آپ گوجرانولہ کے ایک گاؤں ماچھیکے کے رہنے والے تھے اور ذات سندھو کے زمیندار تھے۔ آپ کی دیگر مشہور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :

'سوہنی مہینوال'، 'وارہری سنگھ نلوہ'، 'راجہ رسالو' اور 'معراج نامہ'۔

قادر یار نے اس قصے کو چار سی حرفیوں میں بیان کیا ہے۔ پہلی سی حرفی میں پورن کی پیدائش سے لے کر رانی لوناں کے الزام عائد کرنے اور اگلے روز بادشاہ کے حضور پیش ہونے تک، دوسری سی حرفی میں ہاتھ پاؤں کاٹ کر کنویں میں ڈالنے اور پھر گرو ناتھ کے باہر نکالنے تک، تیسری میں پورن کے اپنی داستان سنانے سے رانی سندراں کا پکے ہوئے بھوجن کے ساتھ گرو کے درشن کو حاضر ہونے اور چوتھی میں رانی سندراں کے اسے مانگ لینے اور آخر میں پھر بھگتوں میں شریک ہونے تک کے واقعات کو نظم کیا گیا ہے۔ چوتھی اور آخری سی حرفی نامکمل ہے۔ ظ۔ ع۔ غ۔ ف۔ ک۔ گ۔ ل۔ م اور ن تک الفاظ کو ایک ہی شعر میں باندھا گیا ہے۔ اور اس کے بعد شاعر کہتا ہے کہ :

ل م کولوں بیت مک گئے قصہ جوڑنا سی توڑ ی تائیں
قادر یار کہندا سنن والیاں نوں کوئی‌دوس نہ دیوناں میں تائیں

باقی کے چار شعروں میں اپنے گاؤں ماچھیکے، ذات سندھو اور کل شعروں کی تعداد ایک سو چالیس اور سولہ دن میں قصہ کو نظم کرنے اور سنا کر ایک کنویں کی زمین انعام پانے کی اطلاع دے کر آئندہ 'راجہ رسالو' کی داستان لکھنے کا وعدہ کرتا ہے۔

بنیادی طور پر یہ کہانی صرف چار کرداروں پر مشتمل ہے۔ پورن، راجہ سالباہن لوناں اور رانی اچھراں۔ پورن اس کا مرکزی کردار ہے جو ۲۴ سال تک بدی، ظلم اور تکالیف کا مقابلہ کرتا ہے اور ثابت قدم رہنے کی وجہ سے روحانی سکون پاتا ہے۔ ان چوبیس سالوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں پہلے بارہ سال تعلیم و تربیت اور دوسرے بارہ سال نیکی پر چلنے کی ریاضت پر مشتمل ہیں۔ بارہ کا ہندسہ علامتی طور پر استعمال ہوا ہے۔ 'ہیر رانجھا' اور 'سوہنی مہینوال' کی داستانوں میں رانجھا اور مہینوال اپنے اپنے محبوب سے وصال کے لیے بارہ بارہ سال تک بھینسیں چراتے ہیں۔ 'پورن بھگت' کی داستان میں پہلے بارہ سالوں میں پورن کا ذہن و قلب اپنے

استادوں کی راہنمائی میں حقیقت کو پانے کی طرف مائل ہوتا ہے - جس کا اظہار وہ اس وقت کرتا ہے جب پہلی بار دربار میں آنے پر اس کا باپ سالباہن اس کی شادی کرنے کا اظہار کرتا ہے - یعنی وہ شادی سے انکار کر دیتا ہے - جس سے راجہ کو بہت دکھ پہنچتا ہے - سماج کے مروج اصولوں سے پورن کی یہ دوسری بغاوت ہے - اس کی پہلی بغاوت اس واقعہ سے منسوب کی جا سکتی ہے جو جوتشیوں کے کہنے پر اسے الگ تھلگ رکھنے سے متعلق ہے - دوسری بغاوت کے بعد اس کا امتحان لیا جاتا ہے جس میں وہ کامیاب ہو کر نکلتا ہے اور اس مادی دنیا سے الگ ہو کر روحانی دنیا میں چلا جاتا ہے - جس کو مصنف نے اس کی ٹانگیں اور بازو توڑ کر اسے اس زندگی سے رشتہ توڑنے کی علامات سے ظاہر کیا ہے - یہ رشتہ بارہ سال تک ٹوٹا رہتا ہے - بارہ سال کے بعد جب اس کی ریاضت مکمل ہو جاتی ہے تو یہ ٹوٹا ہوا رشتہ گرو ناتھ جی کے ذریعے پھر جڑتا ہے - اس کے اعضاء واپس مل جاتے ہیں جو اس دنیا میں واپس آنے کی علامت ہے - یہ واپسی ایک مکمل انسان کی واپسی ہے - اس کا ثبوت یوں بہم پہنچایا گیا ہے کہ وہ رانی سندراں کے حسن کے جال میں نہیں پھنستا ورنہ اس کی ۱۲ سالہ ریاضت کا خاتمہ ہو جاتا - اس کی اٹھان ہی دوسری طرح ہوئی تھی - وہ اس پہاری ظاہرہ زندگی کے لیے پیدا ہی نہیں ہوا تھا - اگر وہ چاہتا تو رانی سندراں کے ساتھ نہایت آرام و سکون کی زندگی گزار سکتا تھا - یہ صورت حال پہلی صورت حالت سے بالکل مختلف تھی - اس لیے کہ یہاں گناہ کا تصور حائل نہ تھا بلکہ یہاں تو محبت اور خلوص کے جذبات کارفرما تھے - جس کا ثبوت یہ ہے کہ پورن کے اسے چھوڑ آنے پر وہ زندہ نہیں رہتی - اس کے بعد پورن گرو کی ہدایت پر اپنے ماں باپ کے پاس جاتا ہے - اس کی واپسی ان کے لیے نئی زندگی کی نوید ہے - سوتیلی ماں لوناں اور ظالم باپ کے لیے بچے کی پیدائش کی خوشخبری کے ساتھ ساتھ ان کو پچھلے احساسِ گناہ سے بھی نجات دلاتا ہے - ماں کی تکالیف اور دکھ بھی اب ختم ہو جاتے ہیں - جب وہ واپس لوٹنے کی بات کرتا ہے تو سب روکتے ہیں - ان میں ایک طرف لوناں اور راجہ سالباہن ہیں اور دوسری طرف اس کی ماں - دونوں کے اعمال کا محرک مختلف ہے - راجہ سالباہن اپنی زیادتیوں کا بدلہ چکانا چاہتے ہیں، مگر ماں کا اضطراب صرف مامتا کی تشفی چاہتا ہے، جس میں بے غرضی ہے، نہ نام و نمود کی خواہش نہ بڑھاپے کے سہارے کی ضرورت - مگر پورن اب بھگت بن چکا ہے وہ کسی دنیاوی خواہش یا بندھن سے مجبور نہیں ہوتا اور سب کو چھوڑ کر عبادت الٰہی میں مستغرق ہونے کے لیے چلا جاتا ہے -

لوناں کے اسرار کے جواب میں پورن کا اسے بار بار ماں ہونا یاد دلانا بھی

اس کے شدید رد عمل کا باعث بنتا ہے ۔ اس لیے کہ جس حقیقت کی طرف پورن اُسے بلانا ہے وہ اس سے قبول نہیں کرنا چاہتی ، یعنی کہ وہ اس کی ماں ہے ۔ اس شدید ردِ عمل کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب پورن کو سزا ملتی ہے تو وہ خاص طور پر یہ کہتی ہے کہ دیکھا ماں کا پیار ، ماں نے تجھے کس پیار سے لوری دی ہے ۔ آخر میں اس کردار کی شکست میں نفسیانی خواہشات میں پنہاں بدی کی قوتوں کی شکست دکھائی گئی ہے ۔ مصنف نے حقیقت کو بھی اجاگر کیا ہے کہ بدی کبھی پھلتی پھولتی نہیں ۔ بدی تخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہوتی ہے ۔ لونان احساسِ گناہ کی شدت کے زیر اثر جب اقرار گناہ کر کے راستی کی طرف مائل ہوتی ہے تو اس میں تخلیقی قوت پیدا ہو جاتی ہے یعنی اُسے یہ نوید سنائی جاتی ہے کہ وہ ایک بڑے راجے کو جنم دے گی جس کا نام راجہ رسالو ہو گا ۔

راجہ سالباہن ایک دنیا دار انسان ہے جس کی آنکھیں حقیقت کو پہچاننے سے قاصر ہیں ۔ وہ رانی لونان میں چھپی ہوئی برائی کو نہیں دیکھ پاتا ۔ اس کی مکاری میں آ کر اپنے بیٹے کو سزا دلواتا ہے ۔ قادر یار نے زندگی میں چھپی ہوئی طنز کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے ۔ بیٹے کو خود سے جدا کرنے والا خود اسی سے بیٹے کی بھیک مانگتا ہے ۔ لیکن اس بھکت کے لبادے میں چھپے ہوئے پورن کو نہیں دیکھ سکتا ۔ اس کے مقابلے میں ماتا پہلی آواز سنتے ہی پہچان جاتی ہے کہ یہ اس کا کھویا ہوا پورن ہے ۔ حالانکہ وہ بیٹے کے فراق میں اندھی ہو چکی ہے ۔ ماں کی اس کیفیت کو قادر یار نے اس کی چھاتیوں میں دودھ اتر آنے کی علامت سے ظاہر کیا ہے ۔ اس میں دوسرا پنہاں مفہوم زندگی کے خشک سوتوں میں زندگی کا عود کر آنا بھی لیا جا سکتا ہے ۔ اس طرح کی علامات سے قاری کے ذہن کو رہنمائی ملتی ہے اور معنی و مفہوم کے دریچے کھل جاتے ہیں ۔ مصنف رونما ہونے والے واقعات کی طرف اشارے بھی کرتا رہتا ہے جس سے قاری کو کہانی میں آنے والے موڑ کا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ مثلاً جب پورن کو کنوئیں میں پڑے بارہ سال کا عرصہ گزر جاتا ہے تو اس کی زندگی میں ہونے والی خوشگوار تبدیلی کی یوں اطلاع دیتا ہے :

'کرم جان تیرے دے جاگ دے نی رب آن سبب لگاؤندا اے'

اسی طرح کئی ایک جگہ پیش گوئی یوں کرتا ہے کہ آخر میں اس کے سچ ہونے کا ثبوت بھی مل جاتا ہے ۔ مثلاً رانی اچھراں پورن کی ماں راجہ سالباہن کو اسے سزا دینے سے روکتی ہوئی کہتی ہے :

'انب وڈھکے اکانوں واڑ دینی پھوں تالینگا وقت وہالیکے جی'

اس سطر میں پوشیدہ حقیقت کے علاوہ واقعہ پر فن‌کارانہ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ پنجابی معاشرے میں بیٹے کو انب یعنی آم کے درخت سے تشبیہہ دیتے ہیں اور یہاں 'انب' کو کاٹ کر 'اک' کے بوٹے کو بچانے کے لیے باڑ لگانے سے مراد یہ ہے کہ راجہ اپنی بانجھ بیوی کی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو جو اس کی نسل کی افزائش کا باعث ہوگا مروا دینا چاہتا ہے۔ لونان کے بانجھ پن کا ثبوت آگے چل کر ملتا ہے جب وہ اسی بیٹے کے پاس بھیک مانگنے جاتی ہے۔

قصے کی زبان نہایت صاف اور رواں ہے۔ اسلوب میں واقعات پر گہری گرفت اور ان کے خارجی اور داخلی پہلوؤں پر کڑی نظر ملتی ہے۔ پلاٹ گھندا ہوا، واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے ملتی ہوئیں، بیان میں پختگی اور فنی گرفت بہت مضبوط ہے۔ کہیں جھول نہیں۔ کہانی نہایت ہموار انداز میں آگے بڑھتی ہے اور قاری کے ذہن کے پردے پر نیکی اور بدی کے ٹکراؤ سے نہایت گہرے نقش ثبت کرتی چلی جاتی ہے۔

سیف الملوک از میاں محمد (تبصرہ)

پنجابی کی رومانی داستانوں میں سیف الملوک اس اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتی ہے کہ یہ خالصتاً تصوف کی اصطلاح میں بیان ہوئی ہے۔ سیف الملوک کا اصل نام 'سفر العشق' بھی اسی نظریے کی دلالت کرتا ہے۔ میاں محمد نے یہ رومان ۱۸۵۵ء/۱۲۷۲ھ میں لکھا۔ میاں محمد ضلع جہلم کے قریب پنڈ کھڑی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد میاں شمس‌الدین اسی گاؤں میں حضرت پیرا شاہ غازی کے مزار کے سجادہ نشین اور ایک کامل صوفی تھے۔ انھوں نے فارسی زبان میں 'تذکرہ مقیمی' لکھا۔ انہی کے زیرِ اثر میاں محمد نے بھی صوفیانہ مسلک اختیار کیا اور شیخ احمد ولی کے فیض صحبت سے تصوف کی منزلیں طے کیں اور ارد گرد کے علاقے میں بہت مشہور ہوئے۔ حتیٰ کہ راجہ امرسنگھ اپنے درباریوں سمیت کھڑی میں شرف ملاقات کے لیے آیا اور دربار کے لیے جاگیر مقرر کی۔

شاہ محمد نے اپنی اس داستان کا آغاز خدا کے حضور دعا سے کیا ہے، جس میں وہ خدا تعالیٰ سے اس کو پہچاننے اور جہالت کو دور کرنے کی استدعا کے ساتھ " بخش ولایت شعر سخن دی" کی التجا بھی کرتے ہیں تاکہ:

سخن میرے دی شکروں ہووں مٹھے منہ قلم دے
شعر میرے دے عطروں کاغذ لاوے خال رقم دے

اور نیک دل صوفی کی زبان سے نکلی ہوئی یہ دعا اس طرح قبول ہوئی کہ اس داستان کا ہیر کے قصے کی طرح جہلم ، پنڈی اور کیمبل پور کے علاقے کے ہر گھر میں چرچا ہے ۔
اس کے بعد حمد پھر نعت اور معراج کی فضیلت اور پھر حضرت غوث الا عظم ، حضرت میراں شاہ ، اپنے مرشد حضرت پیرا شاہ اور سجادہ نشین کی مدحیں اور کتاب لکھنے کا باعث بیان کیا ہے ۔ یہاں پر حسن مہمندی کی حکایت کو ، جہاں سے قصہ وجود میں آیا ، درج کیا ہے ۔ پھر شعر گوئی کے اوصاف بیان کرنے کے بعد استاد کی مدح لکھی ہے ۔ آگے داستان لکھنے پڑھنے اور سننے والوں سے التماس ہے ۔ پھر حضرت پیر روشن ضمیر سے اپنی وابستگی کا اظہار کرکے عشق و عاشق و حلاوت اہل سوز و گداز محرم راز کے اوصاف بیان کیے ہیں ۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد شاہ محمد نے تصوف کی منازل بیان کی ہیں ۔ مثلاً ذکر منزل استغنا ، ذکر راوی و منزل توحید گوید ، ذکر و منزل حیرت گوید اور منزل فقر ۔ ان منازل کے ذکر کے بعد قصے کا آغاز ہوتا ہے ۔ ان بیان شدہ تمام باتوں کا ذکر اس لیے ضروری سمجھا گیا تاکہ قارئین اس پس منظر اور اس انداز فکر کا اندازہ کر سکیں جو اس قصہ کی تحریر کا باعث ہوئے ۔ اس سے ایک بنیادی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ میاں محمد ایک صوفی شاعر تھے اور انہوں نے اس قصے میں تصوف کے اسرار و رموز بیان کیے ہیں ۔ طالب کو سیف الملوک اور محبوب حقیقی کو بدیع الجمال کے فرضی نام دے دیئے ہیں ۔ دیو اور پریوں کو ہم حقیقت کے راستے کی مشکلات کے معنی پہنا سکتے ہیں ۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ میاں محمد کوئی گوشہ نشین صوفی تھے جنھوں عملی دنیا سے اپنا ناطہ توڑ لیا تھا ، بلکہ وہ تو عمل کے بڑی سختی سے قائل تھے اور اس پر بڑا زور دیتے تھے ۔ ذیل کا بند ملاحظہ فرماییے :

مرداں ہمت ہار نہ مولے مت کوئی کھوے نامردا
ہمت نال لگیں جس لوڑ لی پالے باہجھ نہ مردا
جاں تک سانس نراس نہ ہوویں سالس ٹٹے مڑ آسا
لوڑ کون تھیں ہٹیں ناہیں ہٹ گیوں تے ہاسا

اس سے ایک دوسری خصوصیت کا پتہ چلتا ہے یعنی اس قصے کا مرکزی کردار پنجابی کے دوسرے قصوں کے برخلاف باہمت اور فاعل کردار ہے ۔ یہاں بدیع الجمال اگرچہ شادی کے لیے راہ ہموار کرتی ہے مگر بدیع الجمال کا باپ جس بات سے متاثر ہو کر شادی پر راضی ہوتا ہے وہ سیف الملوک کی جوانمردی ، بلند ہمتی اور ذہانت ہے جس

کا وہ امتحان کرتا ہے اور یوں متاثر ہوتا ہے :

کھرے جواب سنے جد شاہے لوں لوں ہوئیوس شادی
شاہزادے دی عزت کیتی حدوں بہت زیادی
ہاشم شاہ نوں آکھن لگا دیکھاں رکھ لگائیں
سے تعریفاں لائق بندہ ہیگا ہے کہ نائیں

اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ بہادری ، نیکی ، عمل صالح اور مقصد کی لگن کے بغیر آدمی اپنی مراد کو نہیں پاسکتا ۔ ان اوصاف میں کسی ایک کی کمی ہونے کی صورت میں گوہر مقصود کو کوئی اور حاصل کر لیتا ہے ۔ یا پھر وہ اسے بھگا لے جانے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں لگن اور علم دونوں پر زور دیا گیا ہے ، اگرچہ عشق کو اولیّت کا درجہ دیا گیا ہے :

جس دل اندر عشق نہ رچیا کتے اس تھیں چنگے
خاوند دے در راکھی کردے صابر بھکھے ننگے

لیکن علم کی اہمیت بھی اس سے کم نہیں سمجھتے :

جوں سورج وچ نور تویں اے عشق روحے وچ جالے
نور باہجھوں سورج پتھر باہجھوں علم آدم حیوانے

چنانچہ دنیا کی بے ثباتی کا جو ذکر ان کے ہاں ملتا ہے وہ اصل میں بے علمی اور مقصد کی لگن کے فقدان کا نتیجہ ہے ۔ چنانچہ انتباہ کے طور پر کہتے ہیں :

سدا نہ لاٹ چراغاں والی سدا نہ سوز پتنگاں سدا نہ ڈاراں نال قطاراں رہسن کو کلنگاں
سدا نہ تھیں مہندی رتّی سدا نہ چھنکن ونگاں سدا نہ چھوٹے یا محمد رل مل بہناں کلنگاں

اس لیے میاں محمد کہتے ہیں کہ اس زندگی کو بے مقصد نہیں گزارنا چاہیئے اور کچھ کرنے کے لیے بھی جوانی کا زمانہ ہوتا ہے ۔ جب انسان کے اعضاء مشقت کرنے کے اہل ہوتے ہیں ۔ بڑھاپے میں آدمی قدم اٹھانے پر بھی گھبراتا ہے :

لوئے لوئے بھر لے کڑئیے جے تد بانڈا بھرنا
شام پئی بن شام محمد گھر جاندی نے ڈرنا

قصہ اگرچہ تصوف کے پیرائے میں بیان ہوا ہے لیکن اس کے باوجود عشقِ مجازی کا انداز نمایاں ہے ۔ سیف الملوک اور بدیع الجمال کی ملاقاتیں اور لگاوٹ اور بناوٹ کی

باتیں سب عام انسانوں جیسی ہیں ۔ وہ خوشی غمی کے سب جذبوں سے اسی طرح متاثر ہوتے ہیں جس طرح اور انسان ۔ بدیع الجمال جب تک منہ سے یہ نہیں کہتی کہ وہ پری ہے وہ عام خوبصورت لڑکی ہی دکھائی دیتی ہے تمام انسانی صفات سے متصف ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں میاں محمد براہ راست عشق حقیقی کی بات نہیں کرتے وہاں احساس نہیں ہوتا کہ اس قصہ میں کوئی علامتی انداز برتا گیا ہے ۔ ہم اسے میاں محمد کی خوبی تصور کرتے ہیں ۔ مثلاً :

شاہزادے ول ویکھدیاں ای شاہ پری شرمائی
منہ تے پلہ پا شتابی صورت پاک چھپائی
سر پیراں تے چدر تانی انگل رہی نہ والدی
شرم کنوں پس پردہ ہوکے عشاق نوں فرمالدی
کون کوئی توں کتھوں آئیوں صورت مند جواناں
شبر دلبر بہادر سوہنا دسیں روپ یگاناں
کہ اشنائی تیری میری بیٹھوں آن سرہالدی
نامحرم نوں ہتھ لگاویں الت کوئی قدہ آلدی
جےاک ذرا خبر ایس گل‌دی دیو میری کوئی پاوے
بوٹی بوٹی کر کے تیری وانگ کباباں کھاوے

میاں محمد کا اسلوب متوازن اور ہموار ہے ان کے ہاں بیان میں افراط و تفریط نہیں پائی جاتی ، حتیٰ کہ حسن کی توصیف میں بھی وہ ایک معیار سے آگے نہیں بڑھتے ۔ اس لیے کہ وہ نہیں چاہتے کہ ان کا کردار انسانوں سے نکل کر مافوق الفطرت کردار کا روپ دھارے ۔ اس سلسلے میں الفاظ کا چناؤ ان کی ذہانت اور فنی مہارت کا پتہ دیتا ہے ۔ ذیل میں چند شعر دیے جاتے ہیں جن میں ملکہ خاتون کے حسن کی تعریف کی گئی ہے ۔ پہلے سفر کے دوسرے بند میں آنکھوں میں جانے آنے کے محاورے کو بڑی خوبی سے باندھا گیا ہے :

سورج وانگ نورانی متھا نظر نہ کیتی جاوے
جے پتھر دل والا تکے اکھیں پانی آئے
جادوگر دونین کڑی دے ، وچ کجلے دی دھاری
صوفی ویکھ ہوون مستانے چھڈن شب بیداری

تھوڑی والگ خبانی سوہنی ہتی رس بھری سی
پتہ آچا قد رنگیلا نازک شاخ ہری سی

داستان کے آخر میں مصنف نے مناجات لکھی ہے اس میں شدّتِ احساس ، کم مائیگی اور گناہ‌گار ہونے کا احساس ، ان کے خلوص اور حضرت لال حسین کی کافیوں کی یاد دلاتا ہے :

سر تے پنڈ گناہاں والی قدر میرے تھیں بھاری
خونی لدی اجل دی اگے ناں میں تلہ نہ تاری
ناں اشنائی نال مارحان پلے نہیں مزدوری
کون لنگھائے پار بندے نوں جانان کم ضروری
عملاں والے لنگھ جاندے کون چڑھاوے مینوں
پار چڑھاں جے رحمت تری ہتھ پھڑاوے مینوں

حقیقت پسندانہ انداز بیان ، تصوف کے اسرار و رموز ، کرداروں کے جذبۂ ایثار و قربانی اور رواں اسلوب نے اس داستان کو بہت مقبولیت بخشی ہے ۔

احسن القصص از مولوی غلام رسول (تبصرہ)

پنجابی زبان میں لکھی جانے والی طویل داستانوں میں سے جس داستان کا ذکر ہم آخر میں کر رہے ہیں ، وہ مولوی غلام رسول کی تصنیف 'احسن القصص' ، یعنی 'قصۂ یوسف زلیخا' ہے ۔ مولوی صاحب ۱۸۴۹ء میں ضلع ہوشیار پور تحصیل دسوھہ کے ایک گاؤں عالم پور میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ۱۸۹۲ء میں وفات پائی ۔ انہوں نے یہ قصہ ۱۸۷۳ء میں نظم کیا ۔ مولوی غلام رسول نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مولوی حامد سے حاصل کی ۔ اس کے بعد کچھ کتابیں عربی اور فارسی کی قریب کے ایک گاؤں غازیاں کے مولوی عثمان سے پڑھیں مگر ان کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا عربی و فارسی زبانوں کا علم بہت زیادہ تھا ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ علم از خود حاصل کیا تھا ۔

مولوی صاحب کی تصنیف اس اعتبار سے باقی داستانوں سے الگ ہے کہ اس کے افرادِ قصہ ہمارے علاقے سے متعلق نہیں ۔ اس کی بنیاد انجیل کے پرانے عہد نامے کی کتابِ پیدائش (ب ۳۰ تا ب ۵۰) اور قرآن کریم میں بیان کیے گئے اس واقعہ پر ہے جو سورۂ یوسف (پارہ ۱۲ - ۱۳) کا موضوع ہے ۔ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ

مولوی غلام رسول نے اس قرآنی قصے میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے قصے میں کئی ایک اضافوں کے علاوہ اس کی بنیاد ہی تبدیل کر دی ہے ۔ قرآن کریم میں جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خدا انسانوں کو مشکلات میں ڈال کر ان کا امتحان لیتا ہے اور ان کے ثابت قدم رہنے پر انہیں انعام و اکرام سے نوازتا ہے ۔ دوسرے یہ کہ خدا کی حکمتوں میں عام بندے تو کیا پیغمبروں کو دخل نہیں ۔ ان کا علم بھی محدود ہوتا ہے وہ نہیں سمجھ سکتے کہ جو مصیبتیں اور تکالیف ان کو پیش آ رہی ہیں اس کی کوئی وجہ ہے ۔ مگر اس کے باوجود ان کے لب پر حرف شکایت نہیں آتا ۔ وہ صبر و شکر سے انہیں برداشت کرتے ہیں اور خدا سے دعا گو رہتے ہیں کہ وہ ان کا بوجھ ہلکا کر دے اور خدا نہ صرف ان کا بوجھ ہلکا کرتا ہے بلکہ انہیں عزت و تکریم کے بلند ترین مقام پر بھی فائز کرتا ہے ۔ اس قصے میں حضرت یوسف[ع] مصر کے نجات دہندہ کے طور پر قابل رشک مقام پر پہنچتے ہیں ۔ اس کے برعکس مولوی غلام رسول نے حضرت یعقوب[ع] کی تکالیف کا جواز پیدا کرنے کے لیے ان سے ایک لغزش کا ارتکاب کروایا ، یعنی بن یامین کے دوسرے بھائی کو بیچ ڈالا تاکہ بشیر کی ماں بن یامین کو اپنا پورا دودھ پلا سکے ۔ اور اس بات کی بھی پرواہ نہیں کی کہ ان کے اس اقدام سے ایک پیغمبر کے کردار میں خامی پیدا ہو گئی ہے ۔ وہ ایک جرم کے مرتکب ہوتے ہیں ۔ انہوں نے ایک بے گناہ عورت کا دل دکھایا ۔ چنانچہ خدا نے عورت کی دعا قبول فرمائی اور حضرت یعقوب[ع] سے ان کا پیارا بیٹا جدا کر دیا ۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب نے زلیخا کے کردار کو نظم کر کے اس قصے کو عشقیہ داستان کی صورت دے دی ہے ۔ زلیخا سات سال کی عمر میں حضرت یوسف[ع] کو خواب میں دیکھتی ہے اور ان کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے ۔ جوانی کی آمد کے ساتھ یہ عشق جنون کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ مگر :

نہیں محال ملے جے دلبر آن ہنے گھر آپے
ہر عاشق جان خاک ہووے وصلوں قدر نہ جاپے

چونکہ ابھی عشق خام تھا لہٰذا حضرت یوسف[ع] زلیخا کو خواب میں اس کے استفسار پر اپنا عزیزِ مصر ہونا بتاتے ہیں ۔ زلیخا عزیز مصر سے شادی کروا لیتی ہے ۔ مگر محبوب کا حصول اتنا آسان نہیں ۔ چنانچہ اسے اپنا خاوند دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے :

واہ قسمت میں کی کجھ منگیا آخر کی کجھ پایا
مرادوں روندی دکھ دوناں ہتھ آیا خالی رہی

اس کی وجہ یہ ہے کہ زلیخا کا عشق غالباً ابھی ہوس کی منزل سے آگے نہیں بڑھا تھا ۔ اس

کی نظر یوسفؑ کے ظاہری حسن پر تھی ، باطنی حسن تک ابھی وہ پہنچ نہ پائی تھی۔ اور جب تک جسم کی مادی دیوار حائل رہے حقیقی وصل نصیب نہیں ہوتا :

کہے زلیخا شکل تیری نے عقل لئی سب میری
یوسفؑ کہے ہوس نے ایویں عقل گوائی تیری

ایک طرف تو یہ ہوس ہے اور دوسری طرف اتقا کا وہ مقام کہ یوسف زلیخا کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے :

کہے زلیخا میرے رخ تے دو ہتھ پھیر پیارے
یوسف کہے ڈراں ہتھ جلن متاں وچ نارے

اس ایک شعر میں دونوں کردار نمایاں ہو کر سامنے آ جاتے ہیں ۔ ایک حصول خواہش میں کسی بھی سوچ سے بے نیاز ۔ دوسرا گناہ کے تصور سے لرزاں ۔ چنانچہ جب زلیخا محل میں خواہش وصل سے مجبور ہو کر حضرت یوسفؑ کی طرف بڑھتی ہے اور :

آ شیطان دھگاناں کتیس دہریا ہتھ ازارے
وقت قہاری دوہاں دلاں تھیں اٹھے قصد ہولارے
قصد زلیخا یوسفؑ دے ول تن اس دے تن لاواں
تے یوسفؑ دا قصد ایہائی جیوں کیوں روک ہٹاواں

یہ لمحات ایسے ہیں جہاں صرف خدا کی ذات ہی انسان کو گناہ سے آلودہ ہونے سے محفوظ رکھ سکتی ہے چنانچہ حضرت یوسفؑ کی نیکی کام آتی ہے اور خدا ان کو لغزش سے بچا لیتا ہے :

حکم کرے رب جبرائیلا خالص بندہ میرا
ویلا اج اوہدے تے آیا پالیس آفت گھیرا
حکم میرا ہے روک شتابی مت لغزش کھا جاوے
نور نبوت دی روشنائی موت گھٹ بدی بجھاوے

اصل میں یہ نیکی اور بدی کی قوتوں کے ٹکراؤ اور ان پر حاوی خدا کی حکمتوں کی داستان ہے ۔ ایک طرف حضرت یوسفؑ کے بھائی ہیں جو ایک اخلاقی گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں دوسری طرف زلیخا جنسی گناہ کی علامت بن جاتی ہے ۔ چنانچہ دونوں حضرت یوسفؑ کی راہ میں حائل ہوتے ہیں ۔ مگر حضرت یوسفؑ دونوں ہی سے اپنا دامن بچا کر نیکی کے راستے پر گامزن رہتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی غلام رسول کے قصے کا مزاج بھی بنیادی طور پر انہی قوتوں کے ٹکراؤ کا غماز ہے ۔ جہاں کہیں مولوی صاحب

نے قصے کی اس بنیادی روح سے انحراف کر کے اسے عشقیہ داستان کا روپ دینے کی کوشش کی ہے ۔ وہاں تضاد پیدا ہو گیا ہے ۔ مثلاً اوپر کے دو شعروں میں بیان کردہ حقیقت ، زلیخا کا حضرت یوسف[ؑ] کو خوابوں میں دیکھنا اور ان کے فراق میں بے کلی کی نفی کر دیتی ہے ۔ اس لیے کہ وہ ساری بیتابی بدی کی خواہش کا اظہار قرار پاتی ہے ۔ ایک جگہ مولوی صاحب زلیخا کی عشق میں سرشاری اور اس کے والہانہ پن کو یوں بیان کرتے ہیں :

میں واری بازار وکندیا مل تو لندیاں جاناں
میں وکنے تھیں اگے وکیاں کوک سنی سلطاناں

عشق دمیں میں وکدی آئی نیرے شوق وہاجی
مصر سٹی بیماریاں لایاں آج مل پیوں علاجی

آپ کہتے بہ رہیوں پچھاڑی مینوں تور اگاڑی
تو ہیں جان تنی دی ساڑی نو ہین گھروں اجاڑی

کیا ان شعروں میں ہیر، سوہنی یا سسی کے کردار کی جھلک نہیں ملتی؟ تو پھر اس بات کا جواز ذرا مشکل سے ہی ملے گا کہ اس کردار نے حصول وصل میں ناکامی کے بعد اس پر دست درازی کا الزام کیوں لگایا ۔ حالانکہ حضرت یعقوب[ؑ] کے زمانے کے معاشرے میں عورت کا دوسرے مرد کے ساتھ عشق کا اظہار کوئی بڑا گناہ نہ تھا ۔ اگر ایسا ہوتا تو زنان مصر کو ضیافت پر مدعو کر کے حضرت یوسف[ؑ] نہ دکھائے جاتے ۔

مولوی غلام رسول نے قرآنی قصے میں ایک اور بنیادی فرق پیدا کر دیا ہے ۔ قرآن مجید نے سورہ یوسف[ؑ] میں پیغمبرانہ کردار کی عظمت اور خوبی بڑی عمدگی سے بیان کی ہے ۔ بھائیوں نے حضرت یوسف[ؑ] سے جو سلوک کیا تھا ہر ایک کو معلوم ہے ۔ اس کے باوجود جب وہ حضرت یوسف[ؑ] کے سامنے اپنی خطا کا اعتراف کرتے ہیں اور شرم و ندامت کی وجہ سے سر جھکا لیتے ہیں تو سیرت یوسفی زیادہ خجالت کو برداشت نہیں کر سکتی ۔ عالی ہمتی ، عفو و درگزر سے کام لیتی ہے اور بلا تامل زبان سے یہ الفاظ نکالتے ہیں

لا تثریب علیکم الیوم

(ترجمہ) آج کے دن تم پر کوئی سرزنش نہیں

لیکن مولوی صاحب اس حسن سیرت کو قائم نہیں رکھ سکے ۔ قرآن والے یوسف[ؑ] اپنے بھائیوں کے لیے سرزنش کا ایک لفظ استعمال کرنا پسند نہیں کرتے مگر مولوی صاحب کے احسن القصص والے یوسف[ؑ] اس موقع پر کہتے ہیں :

تسیں جوانوں ظلم کمایا یوسفؑ نے فرمایا
یوسف تائیں باجھ گناہوں تساں عذاب پوچایا

نال پدر دے دغا کمایا وچ فراق ستایا
پاس اساں بگھیاڑے کھادا جھوٹھا حال سنایا

جلاداں نوں کہندا یوسفؑ پکڑلو دایہ سارے
قتل کرو ایہہ سبھے ظالم خوف رجاؤں ہارے

صرف اسی پر اکتفا نہیں بلکہ جلاد انھیں پکڑ کر چل پڑتے ہیں ۔ وہ روتے اور چلاتے ہیں اور پھر کہیں جا کر یوسف معاف کرتے ہیں ۔ ظاہر ہے سنگدلی کے اس مظاہرے سے لا تڑیب کی ساری روح زائل ہو جاتی ہے ۔

تضادات سے قطع نظر مولوی صاحب نے اپنی داستان میں بڑی خوبیاں پیدا کی ہیں ۔ مثلاً زلیخا کے کردار میں ایک بے چین روح کی عکاسی کی ہے جو اپنے جسم یعنی وصل کی تلاش میں ہے اور یہ روح اس وقت تک بھٹکتی رہتی ہے اور منزل تک نہیں پہنچ سکتی جب تک وہ صحیح راستہ اختیار نہیں کرتی ۔ بڑھاپے میں جب زلیخا کے عشق کا جذبہ ویسا ہی مستحکم رہتا ہے تو حضرت یوسفؑ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے ۔ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ زلیخا کو پھر سے جوان کر دے ۔ چنانچہ یہ دعا قبول ہوتی ہے ۔ اس کے بعد دونوں کی شادی ہو جاتی ہے ۔ مولوی صاحب نے اس خیال سے کہ کہیں جوانی میں زلیخا کا جذبات سے مغلوب ہو کر گناہ کا مرتکب ہونا اُسے حضرت یوسفؑ کے سامنے ہمیشہ احساسِ گناہ میں مبتلا نہ کیے رکھے اور حضرت یوسفؑ کے دل میں احساسِ برتری نہ آ جائے شادی کے بعد حضرت یوسفؑ کو بھی اُسی طرح جذبات سے بے قابو ہو کر زلیخا کے پیچھے بھاگتے اور ان کا دامن کھینچتے دکھایا ہے :

شوق وصال گیا اک راتے اس تھیں یوسفؑ سارا
یوسف طلب وصال گزارے تے اوہ کرے کنارہ

یوسفؑ پکڑے اٹھ دوڑے یوسفؑ مگر پیاسو
پکڑ پلو تس اوہ کھچن لگا جامہ پھاٹ گیاسو

اور بالکل اسی طرح اب زلیخا کو محبوب حقیقی یعنی خدا کے وصل میں سرشار بتاتا ہے جسطرح حضرت یوسفؑ تھے :

اجے زلیخا نسی جاوے تے یوسفؑ فرماوے
اوہ تیرا ہن عشق زلیخا مینوں نظر نہ آوے

کہے زلیخا تیتھیں چنگا لبھ پیا میں تالیں
اسدے اٹھ حضوروں یوسفؑ جاواں دس کتھالیں

'احسن القصص' کا ایک اور پہلو بڑا قابل تعریف ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عفو و درگزر کے سلسلہ میں مولوی صاحب سیرت یوسفی کی لطافت قائم نہیں رکھ سکے ، لیکن جب حسن اپنی تمام ترغیبات سے کام لے کر التجا اور اصرار کرتا ہے تو حضرت یوسف بڑی ثابت قدمی کا اظہار کر کے اسے ٹھکرا دیتے ہیں ۔ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے یہ بہت بڑی آزمائش تھی لیکن حضرت یوسفؑ اس پر پورے اترتے ہیں ۔ وہ موقع بھی آتا ہے جب محل میں دونوں تنہا ہیں ۔ دروازے بند ہیں ۔ متاعِ حسن لٹ جانا چاہتی ہے ۔ اس کی سب سے بڑی آرزو یہی ہے۔ ادھر حضرت یوسفؑ کے پہلو میں بھی دل ہے ۔ مولوی غلام رسول اس موقع پر خوب زورِ قلم صرف کرتے ہیں ۔ زلیخا اور حضرت یوسفؑ کے درمیان ان تنہائیوں میں گفتگو جہاں طویل ہے وہاں التجا و اصرار اور اس کے مقابلے میں انکار کو بھی نقطۂ آخریں پر دکھایا ہے ۔ انجام کار حضرت یوسفؑ بھی نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی موجود ہے ۔ اس موقع پر مولوی غلام رسول کہتے ہیں :

آ شیطان دھکاناں کیتس دھریا ہتھ ازارے
وقت قہاری دوہاں دلاں تھیں اٹھے قصد ہولارے

قصد زلیخا یوسفؑ دے ول بن اسدے تن لاواں
تے یوسف دا قصد ایہالی جیوں کیوں روک ہٹاواں

اتھ ہدایت جے نا ہوندی اللہ دے درباروں
کیا کیہاں ہو جاندا کائی قہر غضب دی کاروں

اس کشمکش کے وقت حضرت یوسفؑ کو جس چیز نے لغزش سے بچایا قرآن مجید کی طرح اسے مولوی غلام رسول بھی پردۂ ابہام میں دکھاتے ہیں ۔ اس طرح نفسیاتی تناؤ کا یہ بیان ہمارے جذبات کو اور بھی زیادہ آزمائش میں ڈالتا ہے ۔

چوتھا باب

(فصل سوم)

واریں

چٹھیاں دی وار

اس وار کا مصنّف پیر محمد ہے جو ضلع گجرات کے گاؤں 'نونان والی' کا رہنے والا تھا ۔ اس وار میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ بھی گجرات اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں رونما ہوئے ۔ مصنّف نے وار کی ابتدا حمد پھر نعت اور اس کے بعد براہِ راست پیر محمد چٹھے کے بیان سے کی ہے ۔ اس حصے میں پیر محمد کا تعارف یوں کرایا گیا ہے :

اک پیر محمد نام سی دھن جن دی مائی
رسول نگر دا چوہدری بھو دشمن کھائی
تے خویش قبیلہ انہاں سبھ بھناں بھائی
تے اس دی وچ پنجاب دے سبھ پھری دوہائی
بندہ شاہ اسلام سی با صدق صفائی

اس تعارف سے پتہ چلتا ہے کہ پیر محمد چٹھہ اپنے زمانے میں پنجاب بھر میں اپنی شجاعت اور نیکی کی وجہ سے مشہور تھا ۔ یہ صفات پیر محمد کے بعد آنے والے چٹھوں غلام محمد ، قطب الدین اور رحمت خان سب میں وراثتاً منتقل ہوئی تھیں ۔ بلکہ نیکی کی صفت اُن کی کمزوری بن کر ان کی تباہی کا باعث بن گئی ، جس کا آگے تفصیل سے ذکر آئے گا ۔ اس کے بعد پنجاب پر احمد شاہ ابدالی کے حملے اور گجرات میں سلطان مقرّب کو جانشین بنا کر لوٹ جانے کا ذکر کیا گیا ہے ۔ احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر یہ حملہ ۱۷۶۴ء میں کیا ۔ یہاں سے وہ واقعات لکھے گئے ہیں جو اصل 'وار' کی ابتدا کے پس منظر کا کام دیتے ہیں ، یعنی رحمت خان وڑائچ نے جو کہ جلال پور جٹاں کا حاکم تھا لاہور کے حاکم گجر سنگھ کو ساتھ ملا کر سلطان مقرّب پر حملہ کیا اور کچھ دیر بعد گوجرانوالہ کے علاقے پر چڑت سنگھ کی عملداری ہو گئی ۔ چڑت سنگھ کے بعد اس کی رانی 'دیساں' اور پھر میاں سنگھ کی حاکمیت کے ذکر کے ساتھ پیر محمد چٹھے کی موت اور

اس کے جانشین غلام محمد چٹھے کے دبدبے اور شان و شوکت کو یوں بیان کیا ہے :

تے اوس دی کیتی گل نوں کوئی مول نہ پھیرے
تے باتشاہی دے سلسلے سبھ اس دے ڈیرے

اور پھر اس کے وسعت اثر و اقتدار کو اس مصرعے میں یوں بیان کیا ہے :

ملک دبایا اوس نیں لا جہلم تا کر

اس کے بعد میاں سنگھ کے ردِ عمل کا ذکر کیا گیا ہے ۔ 'وار' کے آخر میں رحمت خان کو میاں سنگھ کے لشکر کا مقابلہ کرتے دکھا کر وار کو ختم کر دیا گیا ہے ۔ تاہم تاریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ رحمت خان نے سکھوں کے عروج کی تاب نہ لا کر ۱۷۹۷ء میں رنجیت سنگھ کی اطاعت قبول کر لی تھی ۔ یوں یہ وار ۱۷۶۴ء سے لے کر ۱۷۹۷ء تک کے واقعات پر محیط ہے ۔

مختصر کہانی : گوجرانوالہ کے ضلع میں نواب بہادر کے زمانے میں جب سید نگر میں سیدوں کا زور ٹوٹ گیا تو نور محمد چٹھے نے سید نگر پر قبضہ کر کے یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا جس کا نام کوٹ نور محمد رکھا ، اور ارد گرد کے علاقے کا خود مختار حاکم بن بیٹھا ۔ اس طرح اس نے گوجرانوالہ اور گجرات کے کئی ایک حصوں پر قبضہ کر لیا ، جس سے چڑت سنگھ کو بہت دکھ ہوا ۔ لیکن نور محمد کے رعب داب کے سامنے اس کو کبھی اتنی جراٗت نہ ہوئی کہ وہ اس پر حملہ کرے ۔ آخر یہ لڑائی میاں سنگھ اور غلام محمد چٹھے کے درمیان ہوئی ۔ غلام محمد چٹھے نے جب میاں سنگھ کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا تو میاں سنگھ نے سید نگر پر حملہ کر دیا ۔ غلام محمد قلعہ بند ہو گیا ۔ میاں سنگھ نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا جو ایک سال تک جاری رہا ۔ جب قلعہ طاقت سے فتح نہ ہو سکا تو وہاں کے کراڑوں کو ساتھ ملا اس نے قلعہ میں سرنگ لگائی اور ایک رات چٹھیوں پر اچانک حملہ کر دیا ۔ غلام محمد نے جب دیکھا کہ وہ مقابلہ نہیں کر سکتا تو اس نے بھاگ کر رسول نگر میں پناہ لی ۔

اگرچہ اس وار میں دوسرے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں ، جن سے ہمیں ایک مخصوص دور میں پنجاب کے مختلف علاقوں کے سیاسی حالات کا پتہ چلتا ہے ، لیکن اصل میں یہ وار دو کرداروں یعنی غلام محمد اور میاں سنگھ اور ان کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کی کہانی ہے ۔ جس میں لڑائی کے پس منظر میں ان کرداروں کی مکمل عکاسی کی گئی ہے ۔ غلام محمد نڈر ، بہادر اور شریف النسان ہے ۔ اس کے مقابلے میں میاں سنگھ اگرچہ

بہادر ہے لیکن کمینہ اور دھوکہ باز ہے ۔ غلام محمد شرافت کی وجہ سے ایک سے زیادہ بار میاں سنگھ کی چالوں کا شکار بنتا ہے ۔ خود کبھی چالاکی یا دھوکہ نہیں دیتا ۔ اس میں مصنف نے کسی مبالغے سے کام نہیں لیا بلکہ ان واقعات کی تاریخ تصدیق کرتی ہے ۔ یعنی یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ میاں سنگھ نے غلام محمد چٹھے کے ساتھ لڑائی میں دھوکہ کیا ۔ ڈاکٹر لطیف نے اپنی تالیف 'تاریخِ پنجاب' میں بھی غلام محمد اور میاں سنگھ کے درمیان لڑائی کے ذکر میں لکھا ہے کہ میاں سنگھ نے جب یہ دیکھا کہ وہ قوت سے غلام محمد کو مغلوب نہیں کر سکتا تو اس نے صلح کے جذبے اور نیک نیتی کے ثبوت کے طور پر گرنتھ پر اپنی مہر لگا کر اپنے بیٹے (رنجیت سنگھ) کے ہاتھ غلام محمد کو بھیجا ۔ اور اس یقین دہانی کے بعد جب غلام محمد غیر مسلح باہر نکل آیا تو اسے گرفتار کر لیا ۔ اس کے بیٹوں کو توپ کے آگے رکھ کر اڑا دیا اور شہر کو تاخت و تاراج کر دیا ۔ یہ واقعہ ۱۷۷۹-۷۸ء کا ہے ۔

شاعر نے کہانی کے ساتھ ساتھ واقعات پر جیسا کہ منظوم داستانوں کا رواج تھا ، مقولہ شاعر کے طور پر یا کسی بند کے آخری شعر میں تبصرہ بھی کیا ہے ، جس سے اس کی صلابت رائے اور بالغ نظری کا ثبوت ملتا ہے ۔ مثلاً جب میاں سنگھ اپنی ماں 'رانی دیساں' کو قتل کر کے خود حاکم بن بیٹھا تو شاعر نے یہ کہہ کر :

تے راج پیارے راجیاں ویر دلبر یارے
تے پیندے رت اوہ جانیاں ہو گھورے گھارے

رموزِ بادشاہی اور ان کے درمیان خون کے رشتوں کی قدر و قیمت کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے ۔ اسی طرح :

جے راج وراثت اوسدے جس رب بھی بھائے
پر ہندی قوت کون ہے جو زور نہ لائے

پیر محمد نے لڑائی کی بڑی جاندار تصویریں بنائی ہے ۔ اس نے سپاہیوں کی فن لڑائی میں مہارت کو ، ان کی حرکات ، جذبے اور جوش کے ساتھ آگے بڑھ کر وار کرنے ، تلواروں اور نیزوں کی چمک اور کاٹ کو پوری طرح ظاہر کیا ہے ۔ لڑائی کے مناظر میں ایسی آوازوں کو استعمال کیا ہے کہ لڑائی کی گونج سنائی دینے لگتی ہے ۔ میدانِ جنگ کا نقشہ ملاحظہ فرمایے :

تے جیئوں بھر واہاں چھکھوڑوں تیئوں تیر شکاوں
تے چامل چاپا گھوڑیاں اوہ گرد اٹھاوں

تے بدل ہو یا دھوڑ دا چڑھ ھاڈھاں آون
تے وریہا سینہ قدرت دا جیئوں لگا ساون
تے تیغاں تیس مریندیاں وچ رتو نہاون
تے سالگاں ورنگ پرندیاں بھر چیخوں جاون
پر غازی مرن قبول بھی نا پیر ہٹاون

پہلے مصرعے میں جھکھڑ کے چلنے سے ، پھر واہوں میں پیدا ہونے والی آواز کو تشبیہ دے کر میدان جنگ میں چلنے والے بے شمار تیروں سے پیدا ہونے والی کیفیت کو عمدگی سے اجاگر کر دیا ہے ۔ اسی طرح ایک جگہ میاں سنگھ کے میدان چھوڑ کر بھاگنے والے سپاہیوں کے گھوڑوں کے بھاگنے کو چڑیوں کی مانند اڑنے سے تشبیہ دی ہے ۔ پوری نظم میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں ۔

وار کی زبان ٹھیٹھ اور با محاورہ ہے ۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کے استعمال میں فنی مہارت کا پتہ چلتا ہے ۔ البتہ واقعات کے بیان میں بعض جگہ اتنے اختصار سے کام لیا گیا ہے کہ تسلسل ٹوٹتا محسوس ہوتا ہے ۔ مثلاً چٹھے بند میں رحمت خان اور گجر سنگھ مقرب خان پر حملہ کرتے ہیں اور رحمت خان مارا جاتا ہے ۔ لیکن فوراً بعد جرأت سنگھ کے علاقہ کا بیان آتا ہے ، جس سے ربط نہیں رہتا ۔ اسی طرح آخر کے دو مصرعوں میں رحمت خان کو میاں سنگھ کی فوجوں کا مقابلہ کرتا دکھا کر وار کو ختم کر دیا گیا ہے ۔ اس اچانک انجام سے تشنگی باقی رہ جاتی ہے ۔ اور قاری یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس مقابلے کا کیا نتیجہ نکلا ۔ جس طرح اوپر بیان ہوا ہے ، مصنف نے میاں سنگھ اور غلام محمد چٹھے کی لڑائی کو ہی قلمبند کیا ہے ۔ باقی باتوں کو اس نے اکثر ادھورا ہی چھوڑ دیا ہے ۔ لیکن اس سے وار کے مجموعی تاثر میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا ۔

سکھاں دی وار

(۲)

اس وار کا مصنف شاہ محمد (۱۷۸۹ء - ۱۸۶۲ء) ہے جو فقیر محمد فقیر کے سوا دوسرے تذکرہ نگاروں کے مطابق پنڈ وڈالہ ورک ضلع امرتسر کا رہنے والا تھا - فقیر محمد فقیر اپنی مرتبہ تالیف 'سکھاں دی وار' میں اسے بٹالے کا رہنے والا بتاتے ہیں - ان کے اس دعویٰ کی بنیاد وار کے مندرجہ ذیل تیسرے شعر پر ہے :

اک روز بٹالے دے وچ بیٹھے چلی آن انگریز دی بات آئی

سانوں آکھیا ہیرے تو نور خاں نیں جنہاں نال ساڈی ملاقات آئی

چونکہ وار کا اصل نسخہ ہمارے سامنے نہیں اس لیے پہلے مصرعے میں بٹالے والے لفظ کے متعلق کوئی بات وثوق سے نہیں کی جا سکتی - اس لیے کہ یہ لفظ کاتب کی مہربانی سے بھی وڈالے ، سے بٹالے ، میں تبدیل ہوسکتا ہے اور ممکن ہے یہی بات درست ہو ، اس لیے کہ وڈالہ نامی ایک گاؤں بٹالہ سے قادیاں جانے والی سڑک پر واقع ہے اور ان میں فقط پانچ میل کا فاصلہ ہے - چنانچہ اس قسم کی الجھن کوئی تعجب خیز بات نہیں - بہر حال اس نے یہ وار اپنے دوستوں ہیرے اور نورخان کے کہنے پر لکھی - اس وار میں اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد سکھوں میں پیدا ہونے والے باہمی جھگڑوں اور قتل و خون کے نتیجے میں ۱۸۴۸ء اور ۱۸۴۹ء میں انگریزوں سے ہونے والی دو جنگوں کا حال بیان کیا ہے - مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس نے یہ واقعات خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں - وار کے ایک سو چوتھے شعر میں لکھتے ہیں :

'جیہڑی ہوئی سو لئی ہے ویکھ اکھیں اگے ہور کیہ بنت بناونی جی'

مصنف نے ان لڑائیوں کا محرک مہارانی چند کوراں کے جذبۂ انتقام کو بنایا ہے - اس نے وار کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے کیا ہے - دوسرے بند میں دنیا کی پرفریبی اور اس کی بے ثباتی کو بیان کرنے کے بعد تیسرے بند میں اس کے لکھنے کے محرک کو بیان کر دیا

داستان کی ابتداء کی ہے - رنجیت سنگھ کی پیدائش ، اس کی فتوحات اور پھر موت کے بعد کنور لونہال سنگھ کے ہاتھوں کھڑک سنگھ کے دیرینہ دوست چیت سنگھ کا قتل، دوست کی موت کے غم میں کھڑک سنگھ کی موت واقع ہونا اور کنور اور اس کے دوست اودہم سنگھ کا ظاہری اظہارِ غم اور دھوم راج کے ذریعے ایک دوست کے ہاتھوں دونوں کی موت - کنور کی موت کی خبر سن کر اس کی ماں مہارانی چند کوراں اور شیر سنگھ کی لاہور میں آمد - لیکن شیر سنگھ کے قتل کو دیے جانے کے خدشے کے پیشِ نظر وزیر کا اسے لاہور میں داخل ہونے سے باز رکھنا اور پھر چند کوراں کی حکمرانی سے لے کر اس کی قید تک بے شمار واقعات کو نہایت جچے تلے اور موزوں الفاظ میں بیان کیا گیا ہے - اس پسِ منظر کے بعد اصل وار کی بنیاد رکھی جاتی ہے - اس بنیاد کا اظہار شاعر نے اس طرح کیا ہے :

مینوں آن چوفیریوں گھور دے نی لیندے مفت انعام روپے باراں
جٹی ہوواں تے کراں پنجاب رنڈی سارے دیس دے وچ جا ترن واراں
چھڈاں نہیں لاہور دے وڑن جوگے سنے وڈھیاں افسراں جمعداراں
پئے رلن گے وچ پردیس مردے شاہ محمدا ماوی ایس ماراں

یہ بنیاد ایسے جذبے پر رکھی گئی تھی جو اگر شدّت اختیار کرے تو انسان اندھا ہو جاتا ہے اور انتقام کی پیاس بجھانے کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے - چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا - چند کوراں کے جذبۂ انتقام کی شدّت کو محسوس کرنے کے لیے وار کے مندرجہ ذیل بند میں تباہی کی خوفناک تصویر کو اس کی نظر سے ملاحظہ فرمائیے - کس قدر حقیقی جذبات کی عکاسی کی گئی ہے :

چوڑے لہن گے بہت سہاگناں دے لتھ چونک تے والیاں ڈنڈیاں نی
جنہاں کوہ کے ماریا ویر میرا کھواہنگی انہاں دیاں جنڈیاں نی
دھماں جاہن ولائتیں پیس جاناں پانواں بکرے وانگ چاؤلڈیاں نی
شاہ محمدا پین گے وین ڈوہنگے جدوں ہون پنجابناں رنڈیاں نی

اور پھر چند کوراں نے سکھ فوجوں کو مروانے کے لیے انگریزوں کو خط لکھ کر کہا کہ جب سکھ فوجیں حملہ کریں گی تو وہ ان کا خراج بند کر دے گی - اور یہ بھی لکھا انگریزی فوجیں ان پر زور دار حملہ کر کے ان کو ختم کردیں - اس نے نہ صرف یہ کہا بلکہ سکھ فوجوں کو توپوں کے لیے جو بارود دیا اس میں پسی ہوئی سرسوں کو کالا رنگ دے کر ملا دیا جس کی وجہ سے سکھوں کی توپیں بیکار ہو کر رہ گئیں - چنانچہ سکھوں کی

انگریزوں کے ساتھ دو لڑائیاں ہوئیں اور آخر سکھوں کی طاقت ختم ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی ان کا اقتدار بھی جاتا رہا اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح پنجاب بھی انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا ، جس کے صلے میں چند کوراں نے جاگیر اور وظیفہ پایا ۔

شاہ محمد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے کرداروں کے اعمال اور ان سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کی سچی تصویریں بنائی ہیں ۔ اور انسانوں کی اندرونی کیفیات کی فنی مہارت سے عکاسی کی ہے ۔ اس لیے وہ بہت زیادہ الفاظ کا سہارا نہیں لیتا ، بلکہ نہایت مختصر طریقے سے دو چار الفاظ کے ذریعے کیفیات کی حقیقی اور مکمل ترجمانی کر دیتا ہے ۔ بے گناہوں کے قتل پر دکھ ، فریب کاری پر نفرت اور غصے اور دوسرے واقعات کے المناک انجام پر ہمدردی کے مختلف جذبات کے اظہار میں قاری مصنف سے اختلاف نہیں کر سکتا ۔ بلکہ اس سلسلے میں وہ مصنف کا تابع ہو کر رہ جاتا ہے ۔ یہی وہ خوبی ہے جو کسی فن‌کار کو بڑا بناتی ہے ۔ سرِ دربار چیت سنگھ کے قتل پر شاہ محمد نے کھڑک سنگھ کے کرب اور دکھ کا اظہار کوسنے دے کر یوں کہا ہے :

میرے بیٹھیاں ایہناں نے خون کیتا ایہ تاں غرق جاوے دربار میاں
پچھے ساڈے وی کنور نہ راج کرسی اسی مراں گے ایس نوں مار میاں
ناحق دا ایہناں نیں خون کیتا ایہہ تاں مرن گے سبھ سردار میاں
شاہ محمدا ہوئی ہن موت سستی خالی نہیں جاناں اک وار میاں

اس سے زیادہ کھڑک سنگھ کے بس میں نہ تھا ، ورنہ وہ انتقام لیے بغیر اسی غم میں ایک سال کے اندر اندر موت کی گود میں نہ چلا جاتا ۔

شاہ محمد نے پیر محمد کے بر خلاف وار کے بیان کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے تلمیحات کا بھی استعمال کیا ہے ۔ مثلاً :

اک لکھ پیٹا سوا لکھ پوتا راوں ماریا گھراں دے بھیت میاں

یا

بیڑا چڑھیا سلطان محمود والا توپاں نال امام شاہ والیاں نی

اب اختصار کی ایک مثال ملاحظہ فرمایے :

وجی ترم تنبور کرنیل شتری تنبو پرکاں نال نشان میاں
کوتل بگھیاں پالکی توپ خانے دوربین جنگی سائبان میاں

مصنف نے واقعات کے بیان میں تاریخی حقیقت کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کیا ۔ پہلی لڑائی میں اگرچہ سکھوں کو شکست ہوئی ، لیکن انگریزوں کو بڑی بھاری جانی نقصان پہنچا :

آئیاں پلٹناں پیڑ کے توپ خانے اگوں سنگھاں نیں پاسے تروڑ دتے
میوا سنگھ تے ماکھے خاں ہوئے سدھے ہلے تن فرنگی دے موڑ دتے
شام سنگھ سردار اٹاری والے بنھ شتروں جوڑ وچھوڑ دتے
شاہ محمدا سنگھاں نیں گوریاں دے وانگ نبو آن لہو نچوڑ دتے

آخر میں جب سکھ اس تلخ حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں کہ ان پر یہ تباہی چندکوراں کی لائی ہوئی ہے تو اس کے اظہار میں پائی جانے والی تلخی اور بے بسی ملاحظہ فرمائیے :

پچھوں بیٹھ کے سنگھاں نوں عقل آئی کہی چڑھی ہیں زہر نوں سان مائی
رکھناں کھنڈران وچ بھیسا کے جی توں تاں لاہ سٹے ساڈے گھان مائی
ہتھ دھو کے پئی ایں مگر ساڈے گھریں اجے نہ دینی ایں جان مائی
شاہ محمدا کھوہ ہتھیار بیٹھے نال لڑیتاں لیے پٹھان مائی

’سکھاں دی وار‘ میں ’ چٹھیاں دی وار‘ کے مقابلے میں تسلسل اور ربط پایا جاتا ہے اور کہیں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا ۔ واقعات ایک لڑی میں پروئے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ۔ زبان فصیح اور بامحاورہ ہے جس کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی ۔ بلکہ بحر میں ایک ایسا آہنگ ہے جو ایک رزمیہ نظم کے لیے بہت مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ غرض یہ کہ ’سکھاں دی وار‘ ایک ایسے صاحب نظر شاعر کی تصنیف ہے جو چند سالوں کے تمام سانحات کو ایک وقت میں دیکھ لیتا ہے اور ان میں تناسب قائم رکھتا ہے ۔ اس کے بیان میں جوش ہے اور انداز میں ایک تشویش جو قاری کو آگے لیے جاتی ہے ۔ مصنف کی آنکھ انہی واقعات یا کرداروں پر پڑتی ہے جو ڈرامائی کیفیت کے حامل ہو سکتے ہیں اور انہیں وہ نہایت مہارت سے نمایاں کر دیتا ہے ۔

نادر شاہ دی وار

(۳)

اس وار کو نجابت کوی نے لکھا ۔ نجابت ضلع شاہ پور کے ایک گاؤں مٹیلا ہرلاں کا رہنے والا تھا ۔ وار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انیسویں صدی کے شروع میں زندہ تھا ۔ اس نے نادر شاہ کے دہلی پر حملے اور اس وقت کی دہلی کے سیاسی حالات کو اپنی وار کا موضوع بنایا ہے اس وقت تک وار کا جو متن ہمارے سامنے آ سکا ہے وہ نامکمل ہے ۔ جیسا کہ قاعدہ تھا کہ یہ واریں میراثیوں اور ڈھومنیوں کو یاد ہوتی تھیں ، جو مختلف موقعوں پر لوگوں کو سنا کر ان سے داد و دہش وصول کیا کرتے ۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا کہ مختلف واروں کے بعض حصے ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو جاتے اور ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ۔ پھر یہ میراثی وار کے ان حصوں پر زیادہ زور دیتے جن سے لوگوں کے جذبات اُبھارنے میں آسانی رہتی تھی ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وار کی کئی درمیانی کڑیاں آہستہ آہستہ ان کے ذہنوں سے اُتر جاتیں ۔ اس وار کو سب سے پہلے سر ایڈورڈ میکلیگن نے جو ۱۸۹۲ء میں محکمہ جنگلات کے سربراہ تھے خانقاہ ڈوگراں ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں سنگت کے ایک میراثی سے سن کر لکھا ۔ اس وقت اس کے شعروں کی کل تعداد ۱۶۱ تھی ۔ اس کے بعد رائے بہادر ہری کشن کول نے کچھ اور حصے تلاش کر کے اس کو نئے سرے سے لکھا اور ۲۲ دسمبر ۱۹۱۶ء میں پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کے سالانہ جلسے میں اس پر ایک مقالہ پڑھا ۔ اس مقالے میں اُنہوں نے نجابت کو اس وار کے اصل مصنف ہونے میں شبہ کا اظہار کیا ہے اُن کا خیال ہے ۔ کہ وار کا اصل مصنف سید شاہ چراغ تھا جس نے راولپنڈی شہر بسایا تھا اور نجابت اس کا شاگرد تھا جس نے استاد کے مرنے کے بعد وار کو اپنے نام سے مشہور کر دیا ۔ دوسرے یہ کہ نجابت الیسویں صدی کے شروع کا شاعر تھا اور نادر شاہ نے یہ حملہ ۱۷۳۸ء - ۱۷۳۹ء میں کیا ۔ چنانچہ وار کی ساخت یہ بتاتی ہے کہ وار دلّی پر حملے اور کرنال کی لڑائی کے درمیانی وقفے میں لکھی گئی ۔ اس لیے کہ اگر بعد میں لکھی جاتی تو اس میں دلّی کا قتلِ عام جو نادر شاہ کے حملے کا سب سے بڑا واقعہ ہے ، کا بھی ذکر ضرور ہوتا ۔ جس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ پہلے یہ وار

ہرلان کے کسی مسلمان میراثی نے جوڑی ہوگی جو نادر شاہ کے حملے کے وقت زندہ ہوگا اور پھر اس سے لجابت نے لے کر لکھ دی ، لیکن یہ دونوں شبہات غالباً بے بنیاد ہیں ، اس لیے کہ وار کے متن سے ان کی تصدیق نہیں ہوتی ۔ البتہ ایک بات کا احساس عام قاری کو بھی ہوتا ہے کہ وار میں دلی کے قتل عام کا ذکر نہیں ملتا ۔ مرتب کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر پر نادر شاہ کا ڈر غالب تھا ۔ مگر اصل واقعہ کے قریباً سو سال بعد اس کے بیان کرنے میں کسی ڈر کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ۔ ہمارے نزدیک اس کی صرف یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ متن نا مکمل ہے اور ہو سکتا ہے کہ مرتب کو کوئی ایسا آدمی نہ مل سکا جسے وہ حصے بھی یاد ہوں جس میں اس واقعہ کے گھناؤنے پہلو کا ذکر ہو ۔ پھر یہ بات وار کے مزاج کے بھی خلاف ہے کیونکہ مصنف نے تمام واقعات کو کھلے اور واضح انداز میں بیان کیا ہے جس سے اٹھارھویں صدی عیسوی کے ہندوستان کی سیاسی حالت کی مکمل تصویر بنتی ہے ۔

اس وقت وار کے متن کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے وہ یہی پنڈت ہرکشن کا دریافت شدہ ہے جسے ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے مرتب کیا ہے اور جسے پنجابی ادبی اکیڈیمی لاہور نے شائع کیا ہے ۔ اس میں شعروں کی تعداد ۸۴۹ ہے اور اس کو موضوع کے اعتبار سے ۸۳ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ وار کا آغاز حسب معمول حمد سے ہوتا ہے ۔ اس کے بعد واقعات کا بیان شروع ہوجاتا ہے ، جو ہر بند میں آگے بڑھتا جاتا ہے ۔ چنانچہ دلی شہر کی ابتدا اور اس کی سیاسی تاریخ سے لیکر نادر شاہ کے حملے تک تمام واقعات کو بڑی خوبی سے اگرچہ مختصراً بیان کر دیا گیا ہے ۔

رائے بہادر ہری کشن کول کے نزدیک یہ وار واقعات کی صحیح اور مفصل تاریخ ہے اور مغربی پنجاب کی اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی کی شاعری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وار میں مصنف نے شاعرانہ مبالغہ کے باوجود تاریخ کو مسخ نہیں ہونے دیا ، لیکن بعض جگہوں پر مصنف نے خلاف حقیقت بھی باتیں کہی ہیں ۔ ایک جگہ نادر شاہ کو دلی پر حملہ کرنے کے لیے اکساتی ہوئی کہتی ہے :

تہاڈی مال ولائت لٹ کے لے گئے پنجابی

جبکہ یہ حقیقت ہے کہ تیمور شاہ کی فوج میں پنجابی شامل نہ تھے ۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل بند بھی قابل توجہ ہے ۔

ہکڑ کٹھے لکھ آدمی ، رلھہ بیان کہانان

کر سریاں دے دمدمے چڑھ کہائے کہانان

انیهاں چار منا کے گھرانا جرواناں
اوتھے کیا طاقت ہے میریاں نک لتھاں پاون
اوتھے مرداں قبضے کالھ دے سر کلاہ ہنڈاون
گھوڑیاں دے منہ لہاریاں نا ساخت پاون
اوہ ھن تائیں حکم تیمور دے براجا لیاون

نجابت نے میدان جنگ میں لڑائی کے مناظر کے بیان میں بھی حقیقت سے انحراف کیا ہے ۔ اس نے مغلوں کے زمانے میں مروّج اصول جنگ کے برخلاف قدیم لڑائیوں کے طرز پر طرفین سے بہادروں کا نکل کر دعوت مبارزت دینا دکھایا ہے ۔ اس سے جنگ کے تاثر کو ابھارنے کے سوا مصنف کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے ۔ نجابت کے مقابلے میں پیر محمد کا انداز زیادہ حقیقت پسندانہ ہے ۔ اس لیے کہ اس نے اپنی وار میں جنگ کا وہی انداز اختیار کیا ہے جو اس زمانے میں رائج تھا ۔ اسی وجہ سے باوا بدھ سنگھ کو اس وار کے پڑھنے سے پرانے ہندی اور فارسی بیرس کا شائبہ ہوا ۔

اس وار کی امتیازی خصوصیت اس کے دو کردار کل اور نارد ہیں جو آپس میں میاں بیوی ہیں ۔ ان دو کرداروں کا خانگی جھگڑا نادر شاہ کی جنگ کا باعث بن جاتی ہے ۔ کل ایک روز اپنے میاں نادر سے جھگڑتے ہوئے کہتی ہے :

میں نر جاں کسے ولائتیں تیری ستائی
اگے نادر شاہ دے جا دیاں دہائی
اوتھوں لشکر چڑھناں ایران تھیں کرسی دہائی
آکے ہندوستان وچہ کرن جدھ لڑائی

اور اسی پر عمل کرتے ہوئے نادر شاہ کے پاس پہنچتی ہے اور اس کے سامنے امیر تیمور کے اصفہان پر حملے اور تباہی کا حال بیان کر کے اسے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے اکساتی ہے ۔ دوسری طرف نادر شاہ محمد شاہ رنگیلے کو اپنے نمک حرام مصاحبوں سے ہوشیار کرتا ہے، یوں جنگ کا آغاز ہوتا ہے ۔ یہ کردار ہندوانہ طرز کی جنگوں سے لیے گئے ہیں ، کیونکہ انہی کی جنگوں میں کل جوگناں اور کالی آر کے درشن ہوتے ہیں ۔ ان کے ہاں کل موت دیوتا کا ایک نام ہے ۔ مصنف نے اس سے تباہی مراد لیا ہے ۔ اسی طرح نادر بھی ایک دیوتا ہے اور ویدوں میں اس کا ذکر اکثر ملتا ہے ۔ اس کو وشنو دیوتا کا دل کہتے ہیں ۔ جو

ہمیشہ دوسروں کو ورغلانے اور غلط راہ پر ڈالنے کے لیے بے قرار رہتا ہے[1] ۔ نجابت نے ان کرداروں میں میاں بیوی کی روائتی لڑائی کا عمدہ نہایت نقشہ کھینچا ہے ۔ مثال ملاحظہ ہو :

نادر آ آیندا اوڑک ہوسن گے اوہ کم جیڑے رب نو بھاون
نے مہاریاں دے آکھے مرد لگن مڑ پچھوں تاون
تیرے آکھے بادشاہ ایرانوں دھاون
تدوں نڈیاں ویہن اپھٹیاں ، پھل بیٹ لیاون
اگے جو ورتی آس مالک نال عاقل سمجھاون
اوتھے کیا طاقت ہے میریاں نک نتھاں پاون
اوتھے مرداں قبضے کاٹھ دے سر کلاہ ہنڈاون
گھوڑیاں دے منہ نہاریاں نا ساخت پاون
اوہ ہن تائیں حکم تیمور دے برا جا لیاون
جیوں لچھمن دا چھل کرن نوں بھین گھلی سی راون
پرتوں بھئی چلئیں سوپ لکھ وانگ نک وڈہاون

نجابت نے واقعات کے اظہار میں سادہ مگر بلیغ انداز اختیار کیا ہے ۔ انسانی جذبوں ، خوشی ، غمی ، دکھ اور تاسف کو ابھارنے میں تمثیلی رنگ کا بڑا حصہ ہے ۔

کہانی کے بیان میں کہیں کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی ۔ نجابت نے دوسرے مصنفوں کی طرح یہ دعویٰ تو نہیں کیا کہ اس نے یہ وار اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی لیکن اس کی فنی مہارت اور حقیقت نگاری کے جذبے نے حالات و واقعات کی نہایت واضح اور مکمل تصویریں بنائی ہیں ۔

۱۔ رائے بہادر ہری کشن کول ' ہندوستان کے نادر شاہ دی وار '

پانچواں باب

(۱۸۴۹ء - ۱۹۷۰ء)

پس منظر

اس دور کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب برِصغیر کے اس علاقے کا جو دہلی سے لے کر تورخم تک جاتا ہے، انگریزی سلطنت کے ساتھ الحاق ہوا ۔ اس میں ۱۹۰۵ء تک صوبہ سرحد اور ۱۹۱۱ء تک دہلی بھی شامل تھے ۔ اس الحاق کا اعلان لارڈ ڈلہوزی نے ۳۰ مارچ ۱۸۴۹ء کو کیا ۔ الحاق میں اس تقدّم و تاخر کا اثر یہاں کی زندگی پر پڑنا قدرتی امر تھا ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لسانی اور عمرانی لحاظ سے برِصغیر کے شمال مغربی علاقے میں ایرانی و افغانی اثرات زیادہ ہیں۔ یہاں تک کہ سکھوں کی سرکاری زبان بھی فارسی ہی رہی ۔ لیکن انیسویں صدی کے وسط تک انگریزی زبان و ادب سے لوگ واقف ہو چکے تھے ۔ کیونکہ انیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں ذریعۂ تعلیم پر جو زبردست علمی بحث ہوئی، وہ میکالے کی ۱۸۳۵ء کی تعلیمی روئیداد پر منتج ہوئی اور جب سرچارلس ایڈمنز نے ۱۸۵۴ء میں اپنا تعلیمی مراسلہ تیار کیا، اس وقت یہ رائے قبول کی جا چکی تھی کہ برصغیر میں انگریزی طرز پر جامعات قائم کی جائیں ۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں کلکتہ، مدراس اور بمبئی یونیورسٹیوں کا قیام ظہور میں آ گیا ۔ مگر شمال مغربی صوبہ (یعنی پنجاب اور سرحد) میں انگریزی اثرات ابھی جڑ نہیں پکڑ سکے تھے ۔ البتہ فارسی کے بعد اردو کو یہاں بہت اہمیت دی گئی ' مگر اعلیٰ تعلیم انگریزی ہی میں دی جاتی تھی ۔

پنجابی زبان کے بارے میں یہاں کے مسلمانوں کے احساسات کی دو سطحیں تھیں، انفرادی اور اجتماعی ۔ اس وقت کے حالات کے بعض تقاضوں کو قبول کرتے ہوئے اجتماعی حیثیت سے اردو کو پنجابی پر ترجیح دی گئی، لیکن انفرادی طور پر اس زبان سے دلچسپی بدستور قائم رہی ۔ چھاپہ خانوں کا رواج اور سکولوں کے قیام کے باوجود چونکہ خواندگی کی شرح ابھی ایسی زیادہ نہیں تھی، اس لیے اردو کے ساتھ ساتھ خواص اور عوام اسی زبان کو تفریحی اور تہذیبی معاملات میں وسیلۂ اظہار کے طور پر استعمال کرتے رہے ۔

پنجاب کی فتح کے گیارہ سال بعد ، ۱۸۶۰ء میں محکمۂ تعلیم کا دفتر لاہور میں کھولا گیا جس کے ماتحت مڈل تک تعلیم دینے کے لیے سکول قائم کیے گئے ۔ چار سال بعد اوریئنٹل کالج کی بنیاد رکھی گئی اور ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ، جس کے ذریعے یہاں کے رہنے والوں کو مغربی زبان و ادب سے روشناس ہونے کا موقعہ ملا ۔ لیکن اس کا اثر ہم پنجابی ادب میں واضح طور پر بیسویں صدی میں ہی دیکھتے ہیں اور وہ بھی ایک عرصہ تک سکھ اہل قلم کی تحریروں میں ۔ کیونکہ مغربی علوم سے آشنا ہونے والے مسلمان اردو کو وسیلۂ اظہار بنائے ہوئے تھے اور پنجابی صرف ان لوگوں کے لیے اشعار کی صورت میں تفریح کا اور مکالماتی طرز کے پمفلٹوں کی طرز میں دینی اور معاشرتی مسائل سمجھانے کا ایک ذریعہ رہ گئی تھی، جو ناخواندہ تھے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ دنیا کے کسی بھی خطّے میں کوئی زبان اس وقت تک نہیں پنپ سکی ، جب تک حکومتِ وقت نے اس کی سرپرستی نہیں کی ۔ یہی وجہ ہے پنجابی میں پاکستان کے قیام سے قبل وہ نثری آثار نہیں ملتے جو مسلمانوں کی تخلیق ہوں ۔ اگر مجموعی طور پر بھی پنجابی ادب کا جائزہ لیا جائے تو رومانی قصوں یا ہنگامی منظوم ٹریکٹوں کو چھوڑ کر ہمارے پاس جو کچھ بچ رہتا ہے وہ بہت کم ہے ۔ اس ادبی قحط کی بڑی وجہ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے اردو اور ہندی کا وہ جھگڑا تھا جس نے پنجابیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جس کی بنا پر مسلمانانِ پنجاب نے اردو کو ایک قومی اور تہذیبی زبان کے طور پر اختیار کر لیا ۔ چنانچہ پنجابی زبان و ادب کی طرف وہ توجہ نہ دی جا سکی جس کی وہ حقدار تھی ۔ اور توجہ دی بھی گئی تو اس توجہ سے اعلیٰ طبقے بالکل خارج تھے ۔

ان سب تہی دامانیوں کے باوجود ہم انگریزی دور کو ہی پنجابی ادب کا بہترین دور کہہ سکتے ہیں کہ اسی دور میں پہلی بار علمی اور تحقیقی انداز سے برِصغیر کی دوسری زبانوں کی طرح اس کا بھی مطالعہ کیا گیا ۔ کیپٹن سٹارکی نے ۱۸۵۳ء میں انگریزی ۔ پنجابی ڈکشنری تیار کی اور ۱۸۵۴ء میں لدھیانہ مشن نے ایک پنجابی لغت چھاپ دی ۔ لہندی زبان کی ایک ڈکشنری فارسی حروف میں تیار کی گئی ۔ ٹی ۔ پی ۔ بیلی نے پنجابی زبان سے متعلق متعدد کتابیں لکھیں ۔ ۔ ۔ 'پنجابی گرامر' ، 'ضمیمہ پنجابی ڈکشنری' ، 'پنجابی اصوات کی کتاب' ۔ کننگز کے ساتھ مل کر انہوں نے پنجابی زبان اور قواعد کے متعلق ایک اور کتابچہ لکھا ۔ ملتان کو ابتدائی لڑائیوں کے پیشِ نظر جو اہمیت مل گئی تھی اس کی بدولت ، اوبرائین نے ملتانی پنجابی کے الفاظ کے معانی کتابی شکل میں شائع کیے ۔ اسی طرح کئی اور لغت مرتب ہوئے ۔ گریئرسن کی سرکردگی میں اس سارے ملک کا جو لسانی جائزہ لیا گیا ، اس میں پنجابی

کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا ۔ انجیل کا پنجابی زبان میں اس سے بھی پہلے ترجمہ ہو چکا تھا ۔ سر رچرڈ ٹمپل نے پنجاب کے مشہور قصے کہانیوں کو لوگوں سے سن کر انگریزی ترجمے کی صورت میں شائع کیا ۔

انگریز سرکار یا عیسائی مشنریوں کی کوششوں کا یہ دائرہ بہت چھوٹا تھا ۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ جو کچھ موجود تھا ، اسے تلف ہونے سے بچا لیا (جس میں صنعتی انقلاب اور چھاپہ خانہ کی ایجاد کو کم دخل نہیں تھا) ۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان پنجابی لغات اور گرامروں کا مقصد غیر ملکی حکمرانوں اور مشنریوں کو ان الفاظ سے مانوس کرانا تھا جو یہاں کے لوگ بولتے تھے ، تاکہ وہ عوام سے بلا واسطہ رابطہ قائم کر سکیں ، جو ایک طبقہ کے لیے سیاسی اغراض کے لیے اور دوسرے کے لیے مذہبی طور پر ضروری تھا اور ہر چند انیسویں صدی میں پنجابی زبان سے متعلق یہاں جو کچھ بھی ان اداروں کی طرف سے شائع ہوا ، اس پراس مقصد کی چھاپ نظر آتی ہے ، پھر بھی ان مساعی کا بالواسطہ اثر یہ ہوا کہ اس سے پنجابی زبان و ادب سے دلچسپی کی نئی لہر پیدا ہو گئی ۔

پہلی فصل (الف) شعراً

اس عہد کی شاعری کو موضوع کے اعتبار سے ہم چار عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ الف ۔ عشقیہ ب ۔ متصوفانہ ج ۔ تبلیغی ، اصلاحی و اخلاقی د ۔ سیاسی اور معاشرتی ۔

(الف) پہلے عنوان کے تحت سید فضل شاہ ، میاں محمد بوٹا گجراتی ، ہدایت اللہ ، چراغ دین عشق لہر ، سوختہ امرتسری ، بابو کرم امرتسری ، احمد علی سائیں ، عبدالغنی وفا ، پیر فضل گجراتی ، مولا بخش کشتہ اور صوفی تبسم ہیں ۔ سید فضل شاہ کسی گہرے شعور سے عاری ، محض مرصّع ساز آتے ہیں ۔ میاں محمد بوٹا کے ہاں مجاز اور حقیقت کی خوشگوار آمیزش پائی جاتی ہے ، مگر مجازی رنگ غالب ہے ۔ ہدایت اللہ طرزِ قدیم کے شاعر تھے ۔ انہوں نے ہیر وارث شاہ میں اضافے کیے ۔ چراغ دین عشق لہر سے پنجابی میں غزل کی ابتدا ہوئی ۔ سوختہ امرتسری جذبے سے عاری قدیم بے روح ، عشقیہ رنگ کے شاعر تھے ، احمد علی سائیں کی شاعری میں شوکتِ الفاظ اور فارسی تراکیب و الفاظ کا بکثرت استعمال پایا جاتا ہے ۔ عبدالغنی وفا غزل بھی لکھتے تھے ، ان کی تشبیہیں استعارے اور تراکیب خوبصورت ہیں ۔ پیر فضل گجراتی کی غزل میں فارسی عربی الفاظ اور اردو بحروں کا استعمال بے تکلف ہوا ہے ۔ مولا بخش قدیم و جدید رنگ سخن کا شاعر ہے ، اس نے پنجابی میں سیاسی شاعری کی ابتدا کی اور صوفی غلام مصطفیٰ

تبسم سے عشقیہ شاعری کے علاوہ قومی شاعری کی روایت قائم ہوئی۔

(ب) دوسرے عنوان کے تحت میاں محمد بخش، مولوی غلام رسول اور سائیں مولا شاہ کے نام آتے ہیں۔ ان میں سے میاں محمد بخش اور مولوی غلام رسول کا پنجاب کی طویل رومانوی داستانوں کے ضمن میں تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے۔ اسی طرح خواجہ غلام فرید کی شاعری کا پنجابی زبان کے صوفی شعراء کے سلسلے میں بالتفصیل جائزہ لیا گیا ہے۔ ان شعراء کا اس باب میں صرف اجمالاً ذکر ہو گا۔ البتہ سائیں مولا شاہ کا چونکہ بڑے صوفی شعراء میں شمار نہیں ہوتا، لہٰذا ان پر اسی باب میں بحث ہو گی۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھے اور ان کے کلام میں بھی جذب و مستی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

(ج) تیسرے زمرے میں مولوی فیروز دین ڈسکوی، سر شہاب الدین اور فقیر محمد فقیر آتے ہیں۔ د۔ چوتھے میں جوشوا فضل دین، عبدالکریم ثمر، حکیم شیر محمد ناصر، احمد راہی صفدر میر، منیر نیازی، باقی صدیقی، عبدالمجید بھٹی اور شریف کنجاہی آتے ہیں۔ جوشوا فضل دین اور حکیم شیر محمد ناصر درویش صفت اور انسان دوست آدمی ہیں۔ ان کی شاعری انہی صفات سے مملو ہے۔ چراغ دین دامن بلند آہنگ میں سیاسی شاعری کرتے ہیں۔ عبدالکریم ثمر، احمد راہی، سلیم کاشر اور باقی صدیقی کے ہاں معاشرے کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

(الف)

سید فضل شاہ[1] (۱۸۲۷ء - ۱۸۹۰ء)

فضل شاہ کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جو شعر گوئی کو مرصّع سازی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں داخلی پہلو کی جھلک زیادہ نمایاں ہے اور اس میں سوز و گداز ہو نہ ہو مرصّع کاری ضرور ہے۔ مثلاً ایک شعر ملاحظہ کیجئے:

صرف دیکھنے مکھ دی بھکھ مینوں دکھ سکھ تہیں سدا انند رانجھا
سدھے نکلے ول اول پیا کوئی ول اولڈی تند رانجھا

فضل شاہ نے بالترتیب 'سوہنی مہینوال' 'لیلیٰ مجنوں' 'یوسف زلیخا' اور 'ہیر رانجھا' لکھ کر گویا ''خمسہ نگاری'' کی روایت کو پنجابی میں لیاہا۔

---

(۱) سید فضل شاہ، میاں محمد بخش اور مولوی غلام رسول پر تفصیلی بحث ''پنجابی کی طویل رومانوی داستانیں'' کے ضمن میں آ گئی ہے اسی طرح خواجہ غلام فرید کے کلام کا جائزہ پنجابی کے صوفی شعراء کے تحت لیا گیا ہے۔ لہٰذا اس باب میں ان کا ذکر اجمالی طور پر ہو گا۔

میاں محمد بوٹا گجراتی

میاں محمد بوٹا ، فضل شاہ کے کم سن معاصرین میں سے تھے اسی لیے ان کے کلام میں بھی مرصّع سازی کا رجحان ملتا ہے ۔ اگرچہ اس قدر نہیں کہ طبیعت پر گراں گزرے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی سی حرفیوں کو اس صنعتِ لفظی نے اور بھی رواں و دلکش بنا دیا ہے اور مصرعوں کو پرآہنگ، کیونکہ میاں محمد بوٹا نے جذبے کے خلوص کو بھی ان میں سمویا ہے اور پنجابی شاعری کی صنف کی روایت کا احترام کرتے ہوئے بیشتر جگہ عاشق کو عورت کے لباس میں پیش کیا گیا ہے :

ح ۔ حال کمال بے حال ہویا سینے یار دی تاہنگ دی سانگ مینوں
رہندو کار غبار ہزار دسن چڑھی آن فراق دی کانگ مونوں
گیا یار سدھار پیار والا ہوئی سار سسڑی والگ مینوں
محمد بوٹیا بھالدی پھراں واثاں کیتا تنگ محبوب دی تاہنگ مینوں

سی حرفیوں کے علاوہ محمد بوٹا نے بارہ ماہ بھی لکھے ہیں ، جو نسبتاً ابتدائی دور کے ہیں ۔ ان میں مجازی عشق کا رنگ شوخ ہے اور یہی ان کی طبیعت کا اصل رنگ تھا ۔ اگرچہ ادھیڑ عمر میں مذہبی رنگ غالب آ گیا تھا ۔ چنانچہ انہوں نے وارث شاہ اور فضل شاہ کے* نقش قدم پر چل کر 'چندر بدن' ، 'شیریں فرہاد' ، 'سسی پنوں' ، 'مرزا صاحباں' اور 'احسن القصص' کو لکھ کر نہ صرف خمسہ پورا کیا بلکہ کئی اور بھی چھوٹی بڑی تخلیقات پیش کیں ۔ یہ اور بات ہے کہ سی حرفیوں کے بعد 'مرزا صاحباں' ہی ان میں سے زیادہ مقبول ہوئی ۔ ان کے کئی شعر تو وارث کے اشعار سے پہلو مارتے ہیں ، جس کی بحر کو اس نے اپنے قصے کے لیے اختیار کیا مثلاً :

لالیاں لوتیاں دشمناں دوتیاں نے سانوں پیش ہن مشکلاں آئیاں نی
مینوں کھیویوں واف جواب ہوسی سنی گل جے تیریاں بھائیاں نی
چیتا صاحباں ڈردیاں جگ کولوں جالیں دس تو کہت جدائیاں نی
جے تے لسنا ایں نس جا اجو پچھوں بندیاں بیوفائیاں نی :
سخت بے لڑا عشق دا بیلڑا ای ایتھے وسدیاں درد بلائیاں نی
لیھوں پالنا جالنا جان تائیں ناہیں سوکھیاں ایہہ آشنائیاں نی

ہدایت اللہ (۱۸۳۸ء - ۱۹۲۹ء)

ہدایت اللہ نے اگرچہ اس قدر طویل عمر پائی کہ پنجاب کے تقریباً ایک صدی کے بدلتے رنگ دیکھے، لیکن شعر و سخن میں اپنے انیسویں صدی کے ہم عصر شعراء کی طرح طرزِ کہن ہی اختیار کی اور بارہ ماہ لکھے، دوہڑے لکھے یا پھر سی حرفیاں لکھیں۔ کلام میں سوز اور درد ہے۔ زبان سادہ اور عوام کے قریب ہے۔ بیان میں کوئی پیچیدگی نہیں اور موضوعِ کلام زندگی کی بے ثباتی اور اس سے شاخ در شاخ پھوٹتے ہوئے تصورات ہیں:

ت۔ توڑ جنجال جہان والے جے کر تدھ نوں شوق وصال ہویا
جنہیں عاشقی دا دم ماریا اے کوچے یار دے تے پائمال ہویا
ہویا یار دی نظرمنظور اوہ ای مر کے خاک جو خاک دے نال ہویا
دفتر عشق دا ویکھ ہدایت اللہ جو جو عاشقاں دا اگے حال ہویا

اس کے علاوہ ہدایت اللہ کا نام 'ہیر وارث شاہ' کو ضخیم تر بنانے کے سلسلے میں بھی زندہ رہے گا کہ اس نے یہ کام اس فن کاری سے کیا کہ آج بڑے بڑے دیدہ وروں سے بھی وہ پیوند کاری پہچانی نہیں جاتی اور لوگوں کو یہ ماننے میں ہچکچاہٹ ہوتی ہے کہ "ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں" ۔۔۔۔۔۔۔ یا "گیا بھج تقدیر دے نال ٹھوٹھا" ایسے زبان زد عوام و خواص بول، وارث شاہ کے ہیں۔ اور فقیر محمد فقیر کے الفاظ میں "یہ ایسا کام ہے جس سے وارث شاہ کی ہیر میں خواہ گڑ بڑ سی مچ گئی، لیکن اس سے ہدایت اللہ کی شعری اور فنی عظمت میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں رہی"۔

عشق لہر (۱۸۵۹ء - ۱۹۳۸ء)

چراغ دین عشق لہر لاہوری کفش دوزی کا کام کرتے تھے۔ اس دور میں لاہور ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور مشاعروں کی بدولت اکثر نوجوانوں کا شعر کہنے کو جی چاہتا تھا۔ نو عمر چراغ دین بھی اسی رو میں بہہ کر عشق لہر بن گیا۔ میاں فضل دین لوہار کی شاگردی کی۔ بارہ ماہ لکھے، سی حرفیاں لکھیں۔ سوہنی، سسی اور یوسف زلیخا کے قصے لکھے۔ غزلیں اور دوبیتیاں لکھیں۔ ان کے کلام میں پختگی اور روانی ہے لیکن موضوع اور اسلوب ٹھیٹھ ہے اور ان کا تخیّل بھی عوام کا سا ہے۔ جیسا کہ اس دوبیتی سے واضح ہے:

عشقا عاشقاں دے بر خلاف رہنا ایں دس کوئی دلی عداوت غریباں دے نال
مینوں اس طرح دا نیم جان کیتوئی کھلے کج نہ نسخے طبیباں دے نال

سوختہ امرتسری (۱۸۷۲ء - ۱۹۴۴ء)

عشق لہر کی طرح محمد بن سوختہ کا بھی رنگِ قدیم کے ان شعراء میں شمار ہوتا ہے جن کے ہاں عشق کسی گہرے جذبے کا حامل نہیں تھا ۔ دوسرے شعراء کی طرح سوختہ نے بھی پنجاب کی سب سے زیادہ مقبول داستانِ محبت یعنی 'ہیر رانجھا' کو لظایا ۔ بلکہ ہدایت‌اللہ کی پیروی کرتے ہوئے ہیر وارث شاہ میں سینکڑوں اشعار کا اضافہ بھی کیا ۔ لیکن یہ اضافہ اُن کی شاعری میں کسی خوبی کو پیدا کرنے کا باعث نہ بن سکا ۔ کیونکہ ان کی اپنی طبع زاد تصنیف میں بھی وہ رعنائی نہیں ملتی جو وارث کے اشعار کی خصوصیت ہے ۔

بابو کرم امرتسری (۱۸۵۲ء - ۱۹۵۱ء)

کرم دین نے بھی ہدایت‌اللہ کی طرح طویل عمر پائی اور زندگی کے بدلتے ہوئے سب رنگ دیکھے لیکن اس کی شاعری بھی صدائے بازگشت ہی رہی ۔ انہوں نے نظمیں اور دوبیتیاں لکھیں ۔ ان کا موضوع روایتی عشق و محبت ہے ، لیکن کوئی جدّت یا تازگی نہیں ۔

احمد علی سائیں (۱۸۳۶ء - ۱۹۲۹ء)

احمد علی سائیں پشاور میں پیدا ہوئے اور عمر عزیز کا بیشتر حصہ وہیں گذارا ۔ احمد علی سائیں کی زبان پشاور میں بولی جانے والی ہندکو پنجابی ہے ۔ انہوں نے دوبیتیاں بہت کہی ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس صنف کو مقبول اور بلند کرنے کا سہرا اسی صاحبِ طرز شاعر کے سر ہے ۔ شوکتِ الفاظ کا یہ رنگ ڈھنگ اس سے پہلے پنجابی شعر کو نصیب نہ ہوا ۔ ان مصرعوں کے تیور دیکھئے :

نزاکت دست سفاک دیکھو چالدا کدرے جا پولدی شمشیر کدرے
ابرو جوڑ لاندے دید بان کدرے شست نگہ چلاندی اے تیر کدرے

تراکیب و الفاظ کی کثرت نے (جو کہیں بھی ناگوار نہیں لگتی) سائیں کے کلام کو عام فہم نہیں رہنے دیا ۔ اس کے باوجود اس کے اشعار عوام میں زیادہ مقبول ہیں اور باقاعدہ کوئی مجموعہ نہ چھپنے کے باوجود ہر جگہ ایسے لوگ مل جاتے ہیں جن کو سائیں کے اشعار زبانی یاد ہیں ۔ احمد علی سائیں نے دو بیتیوں کے علاوہ زنجیری دار شعر کو بھی پنجابی شاعری میں رواج دیا ہے نمونہ' کلام ملاحظہ ہو :

ہستی نکہت دی میں مٹا دیواں بھرتاں آتشِ عشق چمکا دیواں
وانگ زلیخا دے غم نوں آڑا دیواں جے اوہ ستم گر ستم تھیں باز آوے

دور فرقت دا ہووے آزار دل توں آلھ جائے مصیبت دا بھار دل توں
یعنی حوریاں دیوان اتار دل توں دوروں کہیں جے اوہدی آواز آوے
درد تلخی جفا نوں روک دیوان آمد آمد سزا نوں روک دیوان
دے کے سو سو دم قضا نوں روک دیوان دم نزع جے مرا دم شاد آوے
بعد از مرگ ہو جائے وصال میرا عمر بھر دا مٹ جائے ملال میرا
سالیاں بھر سنگ صاحب جال میرا جے کرمیت تے بھر نماز آوے

خان صاحب عبدالغنی وفا (۱۸۸۷ء - ۱۹۶۴ء)

وفا صاحب گوجرانوالہ کے شعر پرور ماحول میں بڑے ہوئے اور ملازمت کا زمانہ زیادہ تر لاہور اور راولپنڈی میں گذارا ، جہاں استاد گامو خان ، حکیم آغا علی خان ، خلیفہ قمر ، مولا بخش کشتہ ، عشق لہر اور احمد علی سائیں اور ان کے شاگرد جوہر اور چنگی وغیرہ سے ان کی ملاقاتیں اور صحبتیں بلکہ بعض سے چشمکیں بھی رہیں کہ اپنے زور سخنوری میں یہ کسی کو خاطر میں کم لاتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ ان کو زور بیان عطا کرنے میں قدرت نے بخل سے کام نہیں لیا تھا ۔ چنانچہ اشعار میں بڑی بڑی اچھوتی تشبیہیں اور خوبصورت ترکیبیں اور معنی خیز استعارے لاتے تھے ۔ ایک تشبیہ ملاحظہ ہو :

وحشت شب فراق دی ہائے توبہ اختر فلک اتے ویکھ خوف آوے
آکھاں قاف تے کوئی سیمرغ بیٹھا بیضے ہیں جس دے زیر پر بکھرے

احمد علی سائیں کی بدولت فارسی تراکیب کو جو عمل دخل پنجابی شاعری میں ہو گیا تھا ان کا کلام بھی اس سے خالی نہیں ہے اور لاہور اور راولپنڈی کے دوبیتیاں اور غزلیں کہنے والے معاصر شعراء کی طرح ان کے کلام میں بھی صنائع و بدائع کا رجحان ملتا ہے ۔ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں ۔ نظمیں بھی اور دوبیتیاں بھی ۔ بلکہ کلام کا ایک خاصہ حصہ نعتیہ بھی ہے :

دیہہ دید لدیدیاں نوں اے خور خدا دے نور دیا
ارنی ارنی خدا دا واسطہ ای جلوہ دیہہ جمال کوہ طور دیا
کنڈے شہر مدینے دے راہ اندر چم چم اکھدے نین میریاں چھالیاں نوں
بچنوں کہہ بجھائی آپیاس دل دی مرحبا مسافرا دور دیا

بلبل سدرہ دی قسم کھا آکھدی اے گلزار تیرے جیہا ہور کوئی نہیں
والشمس مکھڑا ، واللیل زلفاں اے فخر غلماں تے حور دیا

پیر فضل گجراتی (پ - ۱۸۹۷ء)

غزل ان سے اور وہ غزل سے یوں وابستہ ہو چکے ہیں کہ ایک کے ساتھ دوسرا خود بخود ذہن میں آ جاتا ہے - پیر صاحب نے مولا بخش کشتہ کی طرح اردو بحروں کو پنجابی غزل کہتے ہوئے بلا تکلف استعمال کیا ہے - مثلاً :

گئی پھیلادی پھیل خوشبو   تری زلف دا تذکرہ اللہ اللہ

ساریاں خیراں نبن جے کر ہو گئی اونہاں دی دید
میریاں مرضاں نوں کہنا لادوا اچھا نہیں

پیر صاحب پنجابی زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کو بڑی خوبی سے بکثرت استعمال کرتے ہیں - یہ الفاظ کہیں بھی اجنبیت پیدا نہیں کرتے بلکہ پنجابی زبان کے مزاج کا ہی حصہ معلوم ہوتے ہیں - ان کی کتاب 'ڈونگھے پینڈے' کو رائٹرز گلڈ کی طرف سے انعام مل چکا ہے -

مولا بخش کشتہ امرتسری (۱۸۷۶ء - ۱۹۵۵ء)

آپ مسلمان پنجابی شعراء میں غالباً پہلے شخص ہیں جنہوں نے شعر گوئی کے ساتھ پنجابی زبان و ادب کی ترویج کی طرف بھی توجہ دی - بالکل اسی طرح جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے. وہ سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر بھی تھے - وہ غیر شعوری طور پر اردو سے متاثر معلوم ہوتے ہیں اور ان کی غزلوں میں اس دور کے اردو غزل گوؤں کی جھلک ملتی ہے - وہی سادگی اور نازک خیالی بلکہ شوخی جو امیر مینائی اور داغ کی بدولت مقبول ہو چکی تھی ، ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہے :

چھوٹی عمر وچ مل جائے حسن جس نوں کرے ودھ اوہ گفتار کیوں نہ
لگ جان جد کسے نوں کھمب آکے بھلا فیر ہووے اوہ اڈار کیوں نہ

★ ★ ★

میرا پتہ نشان تے عرض میری گھڑی مڑی کی پریاہ وچ پھدے او
ارے ہو کے سنو تے میں دساں کجھ ہے سرکار دے نسال مطلب

غزلوں کے علاوہ کشتہ صاحب نے سہ مصرعیاں ، مخمسیں اور مسدسیں بھی کہی ہیں اور موضوعی نظمیں بھی ۔ کلیات میں 'یتیم دے ہاڑے' اور 'مزدور دیاں ترلگاں' جیسی سیاسی شعور کی عکاس نظمیں بھی ہیں ۔ 'ھنے ای اکھ لگی ہے سجن دی' ۔ سدھراں اور چوڑیاں ایسی گرم لہو کی تپش والی نظمیں بھی ہیں اور 'گھاہ دی آواز' اور 'کم دیاں گلاں' ایسی درس بھری نظمیں بھی ۔ اس اعتبار سے مولا بخش خاص اہمیت کے حامل ہیں کہ انہوں نے پنجابی شاعری کو وقت کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ۔ پنجابی شاعری جو اب تک قدیم قصوں کی بازیافت اور مروجہ مضامین میں پابند ہو کر رہ گئی تھی ، کو وسعت دے کر اسے عصری شعور سے روشناس کرایا ۔ اس طرح پنجابی شاعری نے ایک نئی کروٹ لی جو اس کی بقاء اور ارتقاء کے لیے لئے خون کا باعث بنی ۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (پ ۔ ۱۸۹۹ء)

آپ کے مزاج میں شعر وسخن کا رجحان اوائل عمر ہی سے تھا ۔ اگرچہ اس کا اظہار اردو و فارسی ہی میں ہوتا رہا اور بہت بعد میں غالباً پاکستان بن جانے کے بعد انہوں نے پنجابی میں شعر کہنا شروع کیا ۔ لیکن اس ''دیر گوئی'' کی تلافی پختہ خیالی نے کر دی ۔ انہوں نے اصنافِ سخن کے لحاظ سے غزلیں بھی کہی ہیں ، نظمیں بھی اور مستزاد بھی ۔ جنگ کے دنوں میں گیت بھی لکھے اور قومی ترانے بھی ۔ کلام میں بے ساختگی اور مزاج کا رچاؤ پایا جاتا ہے ۔ موضوع اور ہئیت دونوں کے لحاظ سے ان کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے شعری روایت میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ تو نہیں کیا لیکن ذاتی اور داخلی تجربے کی آنچ میں روایت کو یوں پکا کر پیش کیا کہ قاری لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔ آپ کا مجموعہ کلام 'انجمن' کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۔ جس میں اردو و فارسی اور پنجابی تینوں زبانوں کے اشعار یک جا ہیں ۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے :

ساڈے عشق دے چمکدے لیکھاں تے ڈاڈھے غم دیاں سیاہیاں ڈہل گئیاں
جھڑیاں حسن ترے چمکالیاں سن او چانیاں راتاں رل گئیاں
ایس عشق نمانے دے دھاگے دیاں کجھ ایڈ اولیاں گنجلاں سن
کجھ کھلدیاں کھلدیاں ہور پئیاں کجھ پیندیاں پیندیاں کھل گئیاں

(ب)

خواجہ غلام فرید (۱۸۴۱ء - ۱۹۰۱ء)

خواجہ فرید کی شاعری میں ہمیں وہی روایت ملتی ہے جس کی آبیاری شاہ حسین اور بلھے شاہ نے ہمہ اوست کے چشمے سے کی اور جو صدیوں تک ایشیا کی رگوں میں خون گرم بن کر رواں رہی - ہمہ اوست کا تصور اختلافات پر نفرت کا رنگ نہیں چڑھنے دیتا کہ اس کی بنیاد ہی یہ ہے :

ہر ہر گھاٹی وادی ایمن ہر ہر پتھر ہے کوہ طور

اسی لیے جس احساس نے بلھے شاہ کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ :

کتے چور بنے کتے قاضی ہو کتے منبر تے بہہ واعظی ہو
کتے تیغ بہادر غازی ہو آپ اپنا کٹک چڑھائی دا

اسی کی ترجمانی خواجہ غلام فرید نے یوں کی :

اساں سو بد مست قلندر ہوں کدی مسجد ہوں کدی مندر ہوں
کدی چور بنوں کدی یار بنوں کدی توبہ استغفار بنوں
کدی زاہد عبادت کار بنوں کدی فسق فجوری اندر ہوں

میاں محمد بخش (۱۸۲۸ء - ۱۹۰۶ء)

میاں محمد بخش پیرا شاہ غازی کے مزار سے ملحق ایک گاؤں میں پیدا ہوئے جو آزاد کشمیر اور پاکستان کی سرحد پر واقعہ ہے - انہوں نے اپنی مایۂ ناز تصنیف میں سیف الملوک شہزادے کے بدیع الجمال پری سے عشق کی اس داستان کے پردے میں سفر عشق کو رمزیہ انداز میں بیان کیا ہے :

جس وچ گجھی رمز نہ ہووے دردمنداں دے حالوں
بہتر چپ محمد بخشا سخن اجیہے نالوں
بات مجازی رمز حقانی ون وناں دی کالھی
سفر العشق کتاب بنائی سیف چھپی وچ لالھی

جنہاں طلب قصے دی ہو سی سن قصہ خوش ہوسن
جنہاں جاگ عشق دی سینے جاگ سویرے روسن

مجاز کے پردوں میں حقیقت بیان کرنے کی یہ روایت ایران سے ہوتی ہوئی اس خطہ میں آئی جس میں کشمیر ، پنجاب ، سرحد اور سندھ واقع ہیں، اور میاں صاحب اس سے اس قدر متأثر نظر آتے ہیں کہ انہوں نے غنیمت کی مثنوی 'نیرنگ عشق' کا بھی پنجابی نظم میں ترجمہ کر دیا، جو تاریخی اعتبار سے اس نظریہ' فکر کی طبعزاد آخری فارسی مثنوی کہی جا سکتی ہے ۔ سیف الملوک ہم سب کی طرح ایک مادی مخلوق ہے اور بدیع الجمال اس حسن کی نمائندہ ہے جو غیر مادی و غیر مرئی ہے ۔

سیف الملوک کے علاوہ میاں صاحب نے کئی اور قصے بھی لکھے ہیں مثلاً 'قصہ شاہ منصور' ، 'قصہ سخی خواص خان' ، 'مرزا صاحباں' ، 'ترجمہ مثنوی غنیمت' ۔ وہ سی حرفیاں اور دوہڑے بھی کہتے ہیں ۔ بلکہ انہوں نے فارسی میں 'بوستان قلندری' بھی تصنیف کی، لیکن کسی نظم کو وہ بقائے دوام حاصل نہیں ہو سکی جو 'سفرالعشق' کے مقدر ہو چکی تھی ۔ (سیف الملوک پر تفصیلی تبصرہ پنجاب کی منظوم داستانوں میں آ گیا ہے) ۔

مولوی غلام رسول عالم پوری (۱۸۴۹ء - ۱۸۹۲ء)

میاں محمد بخش کی طرح مولوی غلام رسول بھی عربی فارسی کے عالم تھے اور ان کے اشعار میں بھی فارسی کا رنگ غالب ہے ۔ مولوی صاحب نے فارسی شاعری کا اس قدر تتبع کیا ہے کہ انہوں نے قصہ بھی فارسی کے مشہور شاعر مولانا جامی سے مستعار لیا اور کسی ایک کردار سے ذاتی دلچسپی نہیں رکھی ۔ چنانچہ 'احسن القصص' کے کردار جامی کے کرداروں کے مثنّیٰ معلوم ہوتے ہیں ۔ مولوی صاحب کی بہت سی تصانیف دستبرد زمانہ کی نذر ہو چکی ہیں اور اب 'احسن القصص' کے علاوہ 'داستان امیر حمزہ' ملتی ہے یا پھرچند منظوم چٹھیاں اور کچھ سی حرفیاں ۔ ان چٹھیوں اور سی حرفیوں کی زبان عوامی ہے عالمانہ نہیں ہے ۔ تشبیہیں اور استعارے بھی مقامی ہیں اور ان میں وارداتی سچائی لفظوں کی دبیز تہوں میں مستور نہیں ہے، بلکہ تراکیب و کلمات کی چلمن کو اپنے پرتو حسن سے رنگین کرتی جاتی ہے :

رو رو لکھئے چٹھیے درد بھرئیے پتہ لئیں پردیس دیے واسیاں دا
پیڑیا کھت پرائیاں سجناں تے چل پچھ لے حال اداسیاں دا

اکو حال پئے سڑ دے کالجے لہں سڑناں روٹیاں جیوں اکواسیاں ۵
پینڈے مکدے نہیں اداسیاں دے دل ہو گیا بیل خراسیاں دا

سائیں مولا شاہ (پ - ۱۸۹۷ء)

سائیں مولا شاہ کی زاد گاہ مجیٹھ ضلع امرتسر تھی - آبائی پیشہ قصّابی تھا ، لیکن گذر اوقات بھیڑ بکریاں پال کر کی - خیالات میں درویش مشربی تھی اور یہی رجحان بڑھتے بڑھتے ان کو جذب و وارفتگی کی منزل پر لے گیا - اسی عالم مجذوبی میں 'قصہ بشنو بکامل' ، 'سسی پنوں' ، 'مرزا صاحباں' اور 'ہیر رانجھا' نظم کیے - کافیاں اور سی حرفیاں بھی لکھیں - چوں کہ مرد قال نہیں تھے صاحب حال تھے ، اس لیے کلام میں بڑا سوز اور درد ہے اور متاع سوز کی اس فراوانی نے ڈاکٹر موہن سنگھ سے یہ کہلوایا کہ سائیں صاحب کی ہیر، وارث کی ہیر کے ہم پلہ ہے - 'سسی پنوں' کا ایک شعر دیکھیے :

سسی کھوج نے بیٹھ کے پئی رووے کھوج والڑا یار ملا اللہ
میں تاں چار چوفیرڑے بھال تھکی کھوج اوس دا نظر نہ آ اللہ

(ج)

مولوی فیروز دین فیروز ڈسکوی (۱۸۶۴ء - ۱۹۰۷ء)

ہر چند مولوی صاحب عربی فارسی اور اردو کے عالم تھے بلکہ تینوں زبانوں کی لغتوں کے مرتب بھی تھے، لیکن ان کے تبلیغی جذبے نے ان کو پنجابی شعر گوئی کی طرف ہی مائل رکھا کہ اس طرح زیادہ سے زیادہ لوگ ان کی باتوں کو سمجھ کر راہ حیات روشن کر سکتے تھے - چنانچہ انھوں نے 'خطبہ فیروزی' ، 'باغ بہشت' ، 'گلزار یوسف' اور 'نماز فیروزی' کے علاوہ قرآن کے پہلے چند پاروں کا پنجابی میں منظوم ترجمہ بھی کیا - لیکن عمر نے بےوفائی کی اور وہ اس کام کو مکمل نہ کر سکے - ترجمہ کی زبان سادہ اور عوام کے فہم کے قریب ہے اور اس میں نمائش علم نہیں ہے :

نقش طلسم تے جادو ٹونے کردے رہن ہمیشہ
دن تے راتیں لٹن دا بس ایہہ بنایا پیشہ

نقش طلسم تے جادو منتر لوکاں آپ بنائے
حضرت پاک سلیمان[۴] دے اینویں ول چا لگائے

سر شہاب الدین (۱۸۶۵ء - ۱۹۴۹ء)

انگریزی عملداری میں پنجاب کے الحاق سے یہاں جو اصلاحی تحریکیں اور سرگرمیاں شروع ہوئیں ان میں سے ایک دیہات سدھار کی لہر تھی اور چوہدری شہاب الدین کے حصے میں دیہاتیوں کو ابھارنے کا کام آیا - ہر چند کہ آج ان کو بیشتر 'مسدس حالی' کے پنجابی مترجم کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ بھی بہت بڑا کام تھا اور چوہدری صاحب کی اصلاح دوستی کا مظہر ، لیکن 'بگڑی سنبھال او جٹا' کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ پنجاب کی اکثریت کو تعمیری انداز میں تعمیرِ ذات کی طرف بلانے کی پہلی آواز تھی - ورنہ وارث شاہ سے لے کر محمد بوٹا گجراتی تک ہر کسی نے زمینداروں کو مطعون ہی کیا - اپنی ایک اور نظم کے ذریعے انہوں نے ان لوگوں کے دکھ درد اور دشواریوں کو حکومت کے گوش گذار کیا جو آبادکاری کی سرکاری مہم کو کامیاب بنانے میں اپنے مستقبل کا جوا کھیل رہے تھے - اس نظم کا عنوان تھا - "آبادکاراں دے باڑے" اس میں لکھتے ہیں :

پانی لبھدا نہیں سی پین جوگا ان کھساں نوں ہتھ نہ آیا سی
جھتے وسدے سن بگھیاڑ گدڑ جنگل آن اوہ اساں وسایا سی
مڈھوں پٹ کے جنڈ کریر سارے پانی پٹ کے کھال وگایا سی
ون وڈھ کے پھوک فنا کیتے ہل زوریں نے تدوں چلایا سی
پھنیر مار دے نال جتیاں دے خوف کھلڑی وچ نہ آیا سی
کٹیاں وبچ کے اپنا بھوں بھانڈا ڈیرہ بار دے وچ جمایا سی

فقیر محمد فقیر (پ - ۱۹۰۰)

چالیس پینتالیس سالوں میں انہوں نے بہت کچھ لکھا اور ہر متداول صنف سخن میں لکھا - غزلیں کہیں ، دوبیتیاں کہیں اور نظمیں کہیں - غزلوں کا رنگ روایتی ہے - نظمیں ویسے تو عمر اور حالات کے مطابق ہر رنگ کی لکھی ہیں لیکن مرور وقت کے ساتھ معاملاتِ عشق کا رنگ ان میں پھیکا ہوتا گیا اور وطن دوستی کا رنگ زیادہ نمایاں ہونے لگا یا پھر دین و مذہب کا - اسی طرح رباعیوں میں اصلاحی ، اخلاق اور صوفیانہ خیالات کی جھلک زیادہ ہے :

اک اکلی جان نمانی دکھ ہزاراں لکھاں
وصل فراق تے موت حیاتی کیہہ چھڈاں کیہہ رکھاں

تار ہجر دی رچی وچ ہڈاں اگ چھپائی ککھاں
پنجوں نیر فقیر اچھالن ڈب ڈب جاون اکھاں

ان کے علاوہ انہوں نے کئی کتابیں بھی مرتب کی ہیں ۔

شرف لاہوری (۱۸۹۲/۱۸۹۴ء - ۱۹۵۵/۱۹۵۴ء)

فیروز دین شرف کی شاعری کا زمانہ پنجابی شعر و ادب کے لیے آمدِ بہار کا زمانہ تھا ۔ ان دنوں ملک میں کئی سیاسی اور سماجی تحریکیں اٹھی ہوئی تھیں اور کئی اٹھ رہی تھیں جو لکھنے والوں کو نئے موضوعات سخن عطا کر رہی تھیں اور شرف کے نوجوان دل و دماغ نے ان اثرات کو پوری طرح قبول کیا ۔ اسی لیے ان کے کلام میں 'پنجاب دی رانی'، 'دھی دی قبر تے ماں'، 'وطن دا عاشق'، 'سپاہی' 'زمیندار اور مزدور'، ایسے عنوانات ملتے ہیں جن میں دیس پیار بھی ہے اور انسانی ہمدردی بھی ۔ وطن کے سرفروشوں کے قصیدے بھی ہیں اور غریبوں کی تہی دستیوں کا احساس بھی ۔ چنانچہ جہاں وہ سپاہی کی زبان سے یہ کہلواتے ہیں :

میں اڑ اڑ کے توپاں دے توپے تروڑاں میں پھڑ پھڑ کے دشمن نوں دھونوں مروڑاں
میں تر تر کے ویری دے بیڑے نوں بوڑاں میں لڑ لڑ کے لاہ دیواں آہو کروڑاں

میں بن بن کے بھانبڑ مداناں چ مچاں
پڑاں دا پٹولا میں دھاراں تے نچاں

وہاں بندہ مزدور کی تلخی اوقات کا تذکرہ بھی کرتے ہیں ۔ شرف نے یہ گیت لکھ کر پنجابی شاعری میں اس صنف کا اضافہ کیا ۔ ان کے بعض گیت اس قدر مقبول ہوئے کہ خواجہ دل محمد صاحب کے الفاظ میں ''اکثر ریڈیو اسٹیشن ان کے نغموں سے گونجتے تھے اور 'سوہنا دیساں وچوں دیس پنجاب نی سیو'۔ تو اس قدر ہر من پسند ہوا کہ اس کی گونج آج تک کئی کانوں میں ہو گی ۔

مارچ ۱۹۵۵ء میں اچانک فالج کا حملہ ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا ۔ آپ کے کلام کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں ۔ 'دکھاں دے کیرنے'، 'لعل دیاں لڑیاں'، 'نوری درشن'، 'شرف دے گیت'، 'ہرے ہلارے'، 'دل دے ٹکڑے'، 'سنہری کلیاں'، 'نورانی کلیاں'۔ ان میں آخری دو کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی ہے ۔

(د)

جوشوا فضل دین (پ - ۱۹۰۳ء)

جوشوا صاحب کے ساتھ ہم بیسویں صدی میں جنم لینے والے پنجابی شعراء کی طرف آجاتے ہیں۔ جوشوا صاحب اس دور کے سرفہرست شعراء میں سے ہیں لیکن عمر کے اعتبار سے اور فکر و نظر کے لحاظ سے وہ گذشتہ صدی کی ہی باز گشت ہیں اور کرنل بھولا ناتھ وارث کے بعد پنجابی کے غالباً دوسرے عیسائی شاعر۔ آپ کے اشعار میں خلوص ہے، سادگی ہے، روانی ہے بلکہ ایک مسیحی کی انسان دوستی اور جسم سے زیادہ روح کی فکر۔ آپ نے انجیل کا پنجابی نظم میں ترجمہ کیا ہے اور روحانی قدروں سے بھری ہوئی دو بیتاں کہی ہیں۔ جن کے ایک اک لفظ میں کسی درویش کا دل دھڑکتا ہے:

جن دھرو اس مٹی تے کیتا اوھدے دھروں نصیب نکھٹے
سگھڑ سیانف رہی اکارت اتے پانے پے گئے پٹھے

عبدالکریم ثمر (پ - ۱۹۰۸ء)

حاجی عبدالکریم ثمر اگرچہ استاد عشق لہر کے شاگردوں میں سے ہیں لیکن بیشتر اردو میں لکھتے ہیں اور استاد سے زیادہ اپنے ہمعصر اُردو شعراء سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے رواجی طور پر اپنے آپ کو استاد سے وابستہ کیا کہ سند رہے' کیوں کہ ان کے گاہے گاہے اخبار و رسائل میں چھپے کلام میں اپنے استاد والی کوئی بات نہیں ہے:

تینھوں تینو منگے سائیاں لمی کر کر جھولی
ہردم نام دھارے تیرا جیبھ بڑی بڑ بولی
دہر دے ویری سجن میرے لبھوں دی کھیڈن ہولی
ان ہونی ایہہ ہوئی۔ شکر وچ پیسازان گھولی

حکیم شیر محمد ناصر (پ - ۱۹۰۸ء)

حکیم حاجی شیر محمد ناصر طبیہ کالج لاہور کے سند یافتہ ہیں اور یہی فن ان کا ذریعۂ معاش ہے۔ پنجابی میں مشق سخن کرتے ہیں۔ شعر گوئی کے لیے طبیعت بڑی موزوں پائی ہے منظر کشی خوب کرتے ہیں۔ زبان بڑی میٹھی اور عوام کے قریب ہے۔ 'ایک پیر' 'ایک خمسہ' اور 'زندگی دے چار حصے' کے علاوہ ان کی قابل ذکر تصنیف 'سجرا سورج' ہے۔ اس کے بھی چار حصے ہیں۔ پہلا حصہ پھٹ پیا اے سجرا سورج جاگو لوکو

لوکو جاگو، قسم کی شاعری کا نمائندہ ہے ۔ دوسرے میں 'ویہندا رہو سوہنیاں شکلاں لوں' کے جذبات کی بازگشت ہے ۔ تیسرے حصے میں زندگی اور اس کو ڈھب سے گذارنے کی باتیں ہیں اور چوتھے میں اپنی مدد آپ اور تعمیرِ وطن سے متعلق نظمیں ہیں ۔

ناصر صاحب کی نگاہ سماجی کمزوریوں کے ذمہ داروں کو معاف نہیں کرتی اور وہ اپنے بھرپور طنزیہ واروں سے ان مجرموں کو الفاظ کی دار پر لٹکاتے ہیں ۔ ''لاہور دی سیر'' اور ''ہٰذا من فضل ربی'' میں انہوں نے اسی انداز میں رشوت اور جنسی بے اعتدالی وفیشن پرستی کے مکروہ گوشوں پر سے پردہ اٹھایا ہے ۔ اس قسم کی سیدھی سادھی فکر والی نظموں کے علاوہ ناصر صاحب نے وہ نظمیں بھی کہیں ہیں جن میں زندگی کے گہرے مسائل پر اظہار خیال کیا ہے ۔ اور ان کی نظم 'پھانسی' اس کی بڑی عمدگی سے نمائندگی کرتی ہے ۔

احمد راہی (پ ۔ ۱۹۲۳ء)

احمد راہی ان جدید پنجابی شعراء میں سے ہیں ، جو اردو میں شعر کہتے کہتے ادھر آنکلے، لیکن اس انداز سے کہ جیسے اپنے گھر آگئے ہوں اور بقول غالب ہر ایک مکان کو اپنے مکین سے شرف ہوتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ راہی کے گھر آجانے سے پنجابی شاعری کے در و دیوار کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ نہ صرف کئی اور صبح کے بھولے لوٹ آئے ہیں بلکہ احمد ندیم قاسمی صاحب کے الفاظ میں ''یہ راہی کی پنجابی شاعری کی برکت ہے کہ آج لوگ وارث شاہ ، علی حیدر اور خواجہ فرید کی گرد و غبار سے اٹی پڑی کتابیں جھاڑ پونچھ کر پڑھنے لگ گئے ہیں'' ۔ احمد راہی کا مجموعۂ کلام 'ترنجن' پنجابی کی بہت مقبول کتاب ہے اور اگرچہ اس کی نظموں کا اسلوب وہی ہے جس سے پنجاب کے عوام و خواص مانوس ہیں لیکن ان کا تمام تر مواد نئے زمانے کے نئے واقعات اور نئے تقاضوں سے ماخوذ ہے ۔ راہی نے پنجابی لوک گیتوں سے بڑی مدد لی ہے ۔ اور ان کے جانے پہچانے استعاروں ، مشہور تشبیہوں اور زبان زد عوام بولوں کو نیا مفہوم بخشا ہے :

نمونۂ کلام

نمی نمی وا وگدی

رکھ ڈولدے تے اکھ، نئیں لگدی ۔ نمی نمی وا وگدی ۔ سالوں ٹھک گئی یاد اک ٹھگدی

نمی نمی وا وگدی

راہواں تک تک تھکدیاں لہ ۔ اکھاں اکدیاں نا ۔ ہن بناں دیکھنے دے رہ سنکدیاں لم

اوہدی تاہنگ تے نالے ڈری جاگ دی

نمی نمی وا وگدی

سانوں ٹھک گئی یاد اک ٹھگ دی

نمی نمی وا وگدی

لوکاں کولوں تے لکانواں گی ہس ہس کے ۔ جھوٹھ سچ دس کے

پر دل کولوں جاوناں گی میں کتھے نس کے

لاٹ پیار والی لٹ لٹ جگ دی

نمی نمی۔ وا وگدی

منیر نیازی (پ - ۱۹۲۸ء)

منیر نیازی بھی احمد راہی اور صفدر میر کی طرح اردو شاعری میں اپنا نام اور مقام پیدا کرنے کے بعد پنجابی کی طرف متوجہ ہوئے اور دیگر شعراء کی طرح بہت جلد پنجابی ادب میں انہوں نے اپنی جگہ بنا لی ۔ ان کی شاعری میں اپنے بعض ہم عصر شعراء کی طرح وہ ایمائی رنگ غالب ہے جو تجرید و ابہام کا ہمزاد بن جاتا ہے ۔ ان کے اشعار کو سمجھنے کے لیے ایک مخصوص جذباتی و فکری جھکاؤ کی ضرورت ہے کیوں کہ ان کے ہاں الفاظ و تراکیب باہم حلقہ ہائے زنجیر کی طرح مربوط نہیں ہوتے۔ ان کے علاوہ ظفر اقبال کی شاعری بھی اسی انداز کی ہے اور یہ لوگ اس انداز کو کہاں تک مقبول بنا سکیں گے اس کا فیصلہ تو مستقبل کے ہاتھ میں ہے ، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس اندازِ فکر و اظہار کے لیے پنجابی کے دامن میں گنجائش بھی ہے اور وسعت بھی ۔ منیر نیازی صاحب کی نظم 'اک پکی رات' ان کے اس رنگِ سخن کی عکاسی کرتی ہے :

گھر دیاں کندھاں اتے وسن چھٹاں لال پھوار دیاں

راہی راتوں ہوہے کھڑکن ڈیناں چیکاں مار دیاں

سپ دی شوکر کوئیے جیویں گلاں کجھے پیار دیاں

ایدھر اودھر لک لک ہسن شکلاں شہروں پار دیاں

روحاں وانگوں کولوں لنگن مہکاں باسی ہار دیاں

قبرستان دے رستے دسن کوکاں پہرے دار دیاں

سلیم کاشر (پ - ۱۹۴۲ء)

والٹر کالڈز کی جانب سے انعام یافتہ مجموعے 'تتیاں چھانواں' کے اس نوخیز مصنف نے ماحول کو بیدار دیدہ و دل کے ساتھ دیکھا ہے اور ان دونوں نے جو کچھ جس رنگ میں پیش کیا ہے ، شعروں میں ادا کر دیا ہے - جیون ، لٹھے مچھیرے ، اِمک سوچاں ، پنگری نویں موہر ، بھی ان کے دیدہ و دل کی ویسی ہی صدائے باز گشت ہے ، جیسے چپ دا شہر ، گھن گھیر ، پروھناں اور ایک سوال - ان کی نظموں میں غمِ دوراں بھی ہے اور غمِ جاناں بھی - ملکی حدود کے اندر کی باتیں بھی ہیں اور بین‌الاقوامی وسعت کے مسائل بھی - اگرچہ اندازِ بیان دلآویز ہے ، لیکن ان کی غزلوں میں تنوع نہیں - چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :

وِنجلی دی سر والگوں مٹھی واج نے دل نو ماری
اٹھدے اٹھدے پیر اگاں نوں ہولے ہولے رک گئے
وقت دے زہری ناگ نے ڈسے جسے یاراں والے
سکم سکے باغ دلاں دے وس اوئے بدل کالسے
کالی رات غماں دی سر تے نہ تارا نہ لو
کون دلا تیرے ہاڑے سنسی ہولے ہولے رو

باقی صدیقی

باقی صدیقی پوٹھوار کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی لیے ان کی پنجابی نظموں میں پوٹھواری الفاظ ہی نہیں پورے پوٹھواری معاشرہ کی جھلک بھی ملتی ہے - ہر اچھے شاعر کی طرح ان کا ایک اپنا لہجہ ہے اور بات کہنے کا منفرد انداز - ان کی ہر نظم میں کوئی نہ کوئی 'ستر خفی' ہے جسے وہ ایک آدھ مصرعے کے ذریعے یوں ادا کر جاتے ہیں جیسے کوئی دل کی بات زبان کی جگہ نگاہ سے کہہ جائے - ان کی ایک مختصر نظم "جیویں" میں یہ کیفیت دیکھئے کس فنکاری سے نباہی گئی ہے :

جوں پکی بیری - جیہڑا لنگھے وٹے مارے - لگ گئی ویہڑے وچ - پتھراں نی ڈھیری

عبدالمجید بھٹی (پ - ۱۹۰۹ء)

بھٹی صاحب صوفی صاحب کی طرح اردو شاعری میں طبع آزمائی کے بعد پنجابی کو اپنا خون خمیر خیال کرتے ہوئے ایک خاص احساس کے ماتحت پنجابی شاعری کی طرف

آئے ۔ ان کے پنجابی کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔ 'دل دریا' اور 'اکتارہ' ۔ 'دل دریا' میں گیت ہی ہیں اور 'اکتارہ' میں نظمیں اور غزلیں ۔ الفاظ کا انتخاب بڑی مہارت سے کرتے ہیں ۔ خیالات میں وقت کے تقاضوں کی جھلک اور رجائیت بھی کہیں کہیں ملتی ہے ۔ گیتوں میں اس مٹی کی باس ہے جس سے ان کو خون خمیر ملا اور اس پنجاب کے چرچے ہیں جو اب صنعتی ترقی کے اثرات سے بدل رہا ہے ۔ انہوں نے احمد راہی کی طرح گیتوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے لیکن جہاں راہی نے نئے تقاضوں کے تحت ان میں تبدیلیاں کیں وہاں بھٹی صاحب نے روائتی اسلوب نگارش سے بدلتے ہوئے پنجابی معاشرے کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے ۔ ایک گیت کے چند بول ہیں :

پیار دی پٹاری دل پیکیوں لیائی آں وے
سدھراں دے نال چناں رکھیں توں سنبھال وے
جھڑی چن چانی نوں چیر کے بنائی سی
تاریاں دی چھانویں سارے جگ توں لکائی سی

چراغ دین دامن (پ ۔ ۱۹۰۷ء)

دامن صاحب لاہور میں پیدا ہوئے ۔ یہیں میٹرک تک تعلیم پائی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہنگامہ پسند و ہنگامہ آرا طبیعت کو بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام راس نہ آیا بلکہ خیاطی کا آبائی پیشہ بھی ایک جرمن فرم سے ڈپلومہ حاصل کرنے کے باوجود نوائے زندگی کی نرم خیزی سے اکتا کر چھوڑ دیا اور بدریا غلط و با موجش در آویز کا نعرہ لگاتے ہوئے پانی میں کود پڑے ۔ کئی بار ڈوبے کئی بار ابھرے لیکن کناروں سے سمجھوتہ نہ کر سکے اور نہ کیا ۔ کلام میں ایک جوش اور ولولہ ہے ۔ الفاظ بڑے مترنم اور پڑھنے کا انداز اس قدر جاذب ہے اور شخصیت اس قدر مسحور کن کہ سننے والوں کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں ۔ نظمیں زیادہ تر سیاسی لکھی ہیں ۔ غزلیں رندانہ اور گیت فلمی ۔ ایک نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں جس میں وہ بادلوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے بات کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں :

اسماناں تے بدل آئے — چٹے چٹے کالے کالے
ہلکے ہلکے گوہڑے گوہڑے — اک دوجے دے نالو نال
چڑھے بدل ایہ پاندے ہول — مست ہاتھی غولاں دے غول
اوہ سنگلاں نوں توڑی آوندے — حالو حال تے ہالو ہال

اہناں وچ جے کڑے بتھیرے اہناں وچ بجلی دے ڈیرے
اہناں وچ طوفان چھپے نے انج آولدے کن من دی چال

پروفیسر موہن سنگھ

پروفیسر موہن سنگھ کی شاعری میں زندگی سے گہرا پیار پایا جاتا ہے اور یہی پیار ان کو تغیّر پسند بنا گیا کہ زندگی نت بدلتی ہے ۔ ہے جیون ادلا بدلی تے ہونا رنگ برنگا ۔ اور ان کی نظموں میں یہی رنگا رنگی پائی جاتی ہے ۔ ان کا سب سے پہلا مجموعہ کلام 'ساوے پتر' چونکہ اردو رسم‌الخط میں بھی شائع ہوا تھا اس لیے اسی کو زیادہ شہرت بھی حاصل ہوئی لیکن اس کے بعد تقسیم ملک سے پہلے ان کے دو اور مجموعے 'کسنبڑا' اور 'ادھواٹے' شائع ہو چکے تھے ، جن میں زیادہ پختگی' فکری توانائی اور ترقی پسند تحریک سے اثر پذیری شروع ہو چکی تھی ۔ آزادی کے بعد اب تک ان کے تین مجموعے 'کچ سچ' ، 'آوازاں' اور 'وڈا ویلا' چھپ چکے ہیں جن میں زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں اشتراکیت کا رنگ لے گئی ہے اور رب، ماں' بھ ، چھتو دی بیری ، کھوہ دی گادہی اتے اور سہاں دی کندہی ایسی نظموں کے برعکس اب ہم موہن صاحب کو ہتھیار نواں شز اور کرانتی ایسی چیزیں کہتے پاتے ہیں اور وہ واشکاف کہتے ہیں کہ :

دو ٹوٹیاں دے وچ بھوں ونڈی اک محلاں دا اک ڈھوکاں دا
دو دھڑاں وچ خلقت ونڈی اک لوکاں دا اک جوکاں دا

امرتا پریتم (پ - ۱۹۱۵ء)

امرتا پریتم بلاشبہ پنجابی کی مقبول ترین شاعرہ ہے اور نظم و نثر کی کئی کتابوں کی مصنف ۔ نظم میں اس کے چند مشہور مجموعوں کے نام یہ ہیں ۔ 'امرت لہراں' 'جیوندا جیون' ، 'لمیاں واٹاں' ، 'رینہوڑے' اور 'کستوری' موہن سنگھ کی طرح امرتا پریتم کی زبان بھی مغربی پاکستان کے بیشتر پنجابی پڑھنے والوں کے لیے ایسی غیر مانوس نہیں ۔ شاید اسی لیے کہ دونو ہی پاکستانی علاقے میں پیدا ہوئے ۔ امرتا پریتم کی ابتدائی نظموں میں کہیں کہیں ماورائی رنگ ملتا ہے ۔ (مثلاً ندی ،) ۔ لیکن یہ دور جلد ہی ختم ہو گیا اور یہ شاعرہ لوگوں کے سماجی اور سیاسی مسائل میں دلچسپی لینے لگی ۔ 'جیوندا جیون' کے دیباچے میں وہ خود لکھتی ہیں "زندہ جسم کے دن کٹی جیتا جیون نہیں ہے ؛ جیون گھڑی ٹک ٹک کرتی ہوئے چاہے کتنی ہی خوبصورت اور کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہو اگر اس کی سوئیاں کام نہیں کر رہیں تو وہ ٹک ٹک کس کام ـــــ ان نظموں میں

میری آرزوئیں اور میرے ولولے سب اس مقصد کے لیے ہیں کہ وطن میں سانس لیتے ہوئے لوگ جیتے جاگتے انسان نظر آئیں،، ۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنا قلم وقف کر دیا اور وہ اس راہ پر چل پڑی اور انسانی دکھوں کو شعر کا جامہ پہنا کر انسانیت کے گیت گانے لگی ۔ تقسیم کے وقت جب یہاں کی عورت کو انسانیت سوز مظالم کا نشانہ بنایا گیا تو یہ دکھ چیخ بن کر امرتہ کے کلام میں یوں ڈھلا :

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبراں وچوں بول

امرتہ کے ہاں صرف لوگوں کے دکھ درد کی عکاسی ہی نہیں بلکہ اس کے مداوا کی قوی خواہش کا بھی اظہار ملتا ہے ۔ مگر اب یہ خواہش دھند لانے لگی ہے ۔ اس نظم کے آخری مصرعے مایوسی کی مکمل تصویر ہیں :

روز بھوکھ دا سہنا راتیں ورتیاں دی میلی چادر
ادہی اپنے اپر تانے ادہی اپنے ہیٹھ وچھاوے
کنا چر کج سوچے جاگے پھر نیندر دی گولی کھاوے

جدید پنجابی شاعری فصل (ب)

پنجابی ادب کے جدید دور کا دوسرا حصہ پنجابی زبان کے نوجوان شعراء و ادبا کے کلام پر مشتمل ہے ۔ یہ شعراء اگرچہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی اصناف شعر و ادب سے متاثر ہو رہے ہیں، لیکن پنجابی شاعری ہیئت کے اعتبار سے روایت کی کبھی پابند نہیں رہی ۔ پنجابی شاعر و فنکار کا زمین سے گہرا رشتہ ہے ۔ اس لیے اس کے ہاں زندگی اپنی تمام تازگی و توانائی کے ساتھ موجود ہے ۔ یہ درست ہے کہ اس نے اردو و فارسی کی دیگر اصناف کو پنجابی ادب میں رواج دیا ہے ، لیکن اس نے ان اصناف کے موضوعات کی حدود کی روایتی قیود کو قبول نہیں کیا ۔ بلکہ ان کو موضوع کی تنگی سے نکال کر وسعت اور فراخی عطا کی ہے ۔ مثال کے طور پر غزل کو لیجیے ۔ پنجابی شاعر غزل کے روایتی موضوع یعنی خیال محبوب اور وصال و فراق کے ذکر میں مقیّد نہیں ہوتا ۔ وہ غزل میں عام دنیاوی باتوں کا ذکر بھی کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ غزل میں کسی ایک موضوع کو لازمی نہیں قرار دیتا ۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے ذہن میں فراریت نہیں اور نہ اسے روگردانی یا چشم پوشی کی عادت ہے ۔ وہ زندگی کے مسائل کو کھلی آنکھ سے دیکھتا ہے اور ان کو روزمرہ کے واقعات کے پس منظر میں بیان کرتا ہے ۔ اسی لیے وہ نسبتاً عوام

سے قریب تر ہے، چنانچہ اس کے اور قاری کے درمیان کوئی اجنبیت نہیں رہتی ۔ شاعر کا ذہن زندگی کے مسائل کے بارے میں بالکل واضح معلوم ہوتا ہے ۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے صاف اور صریح انداز میں قاری تک پہنچا دیتا ہے ۔ اس لیے پنجابی ادب میں شاعر اور قاری میں کوئی معنوی بُعد نہیں رہتا ۔ بلکہ قاری اسے اپنا نمائندہ تسلیم کر کے اس کے کلام میں اپنی زندگی کے مسائل کی صحیح عکاسی کا طلبگار ہوتا ہے ۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ پنجابی زبان کا شاعر و ادیب اپنے آپ کو اسی معاشرےکا ایک ذمہ دار فرد تصور کرتا ہے اور اسے حقیقت سے گریز کی عادت نہیں اور نہ وہ اپنے آپ میں اور قاری میں کوئی تفاوت محسوس کرتا ہے ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ پنجابی کے اکثر مشاعرے اور ادبی محفلیں آج بھی بڑے بڑے ہوٹلوں کے کمروں کی بجائے باغوں یا محلے کے کسی چوک میں منعقد ہوتی ہیں ۔ ان میں کسی غرابت کا احساس نہیں ہوتا ۔ چنانچہ شعراء اپنے معاشرتی اور تہذیبی مسائل کے بارے میں کلام سناتے ہیں اور قارئین میں اپنائیت کا احساس بیدار ہوتا ہے ۔ وہ شاعر کو اپنا ہمراز اور ہمدرد پاتے ہیں ، چنانچہ شاعر ان کی داد سے یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اسی معاشرہ کا ایک فرد ہے ۔ ادھر قارئین شاعر کے خیالات میں اپنے جذبات کی بازگشت سنتے ہیں یہی وجہ ہے کہ پنجابی شاعری میں اکثریت ایسے عنوانات کی ہے جو زندگی کے سیاسی ، فکری ، معاشرتی اور تہذیبی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں مثلاً 'داج' ، 'رشتہ' ، 'اوڑاں' ، 'قربانی دے بکرے' ، 'بدل' ، 'تبرک' ، 'جیناں گھر دانے' ، 'طلاق' ، 'جاگو' 'پیسہ' 'ویلے دی لہر' 'ایہہ کڑیاں' ، غریب دی دھی' ، 'بوہن' ، 'تریہہ دی خوشبو' ، 'چنی' ، 'کرتہ' ، 'دس دی حیاتی' ، وغیرہ ۔ ذیل میں ہم چند معاصر شعراء کے کلام کا جائزہ پیش کرتے ہیں ۔ ان کے مطالعہ سے ہماری مندرجہ بالا رائے کی تصدیق ہوگی ۔

سعیدہ ہاشمی

سعیدہ تصدق ہاشمی کی ایک نظم کا عنوان ہے 'رشتہ' ۔ اس نظم میں اس نے موجودہ معاشرے میں لڑکی کے والدین کا اس کی شادی کے بارے میں رویہ اور اس کے نتائج کو موضوع بنایا ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں لڑکیوں کی شادی کرنا آسان نہیں رہا ۔ ان کے لیے موزوں رشتے تلاش کرنا ایک کٹھن کام ہے لیکن اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنی بیٹی کے لیے لڑکے کا ایک خاص تصوّر قائم کر لیتے ہیں ، جو حقیقی زندگی سے مناسبت نہیں رکھتا ۔ کبھی وہ لڑکے کو ایک وجہ سے رد کر دیتے ہیں اور کبھی دوسری وجہ سے ۔یوں وقت گزر جاتا ہے اور لڑکی بوڑھی ہونے لگتی ہے ۔ آخر،

اسے گھر سے اٹھانے کے لیے جیسا بھی لڑکا ملے اس سے شادی کر دی جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :

سولاں ورہیاں دی دھی ساڈی چڑھدی پئی جوانی اے
لمی دھون تے چھب نرالی ، اکھ بڑی مستانی اے
پروفیسر دا رشتہ آیا اے ، منڈا واہ واہ سوہنا اے
قد کاٹھ دا اچا لما اے بھولا تے من موہنا اے
اک گل نئیں پر چنگی لگی ، اوسدیاں تن بھیناں نیں
تنے ہن ویاہون والیاں کول بھرا دے رہناں نیں
نہ جی اسیں تے اپنی دھی نو ایہہ پھاہی نہ پاواں گے
جتھے منڈا کلا ہووے ، اوتھے کڑی ویاہواں گے

اسی طرح اور کئی اچھے رشتے آتے ہیں مگر کوئی پسند نہیں آتا۔ کبھی حق مہر زیادہ مانگا جاتا ہے اور کبھی لڑکے کی تنخواہ کم ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ :

اک وی ساڈے دل نہ لگا کنے رشتے آوندے رہے
چنگے بھلے کہاؤ رشتے ہتھوں اسیں گنواندے رہے
پنجیاں ورہیاں دی دھی ہو گئی ہن کوئی رشتہ آوندا نہیں
بھل بھلیکھے وی ہن ساڈے گھر کوئی پھیرا پاؤندا نہیں

اور آخر میں یہ ہوتا ہے کہ :

اک کلرک دا رشتہ آیا اے سنیا اے منڈا کانا اے
نوں بھیناں نیں ، پیو نہیں سر تے گھر وچ ایہو سیانا اے
سو سو شکر خدا دا کرئیے کجھ سر بندہ تے بنیا اے
لکھ واری بسم اللہ کر کے اساں ایہہ رشتا منیا اے
لوڑ دیاں گے ایسے نال ای بھاویں منڈا کانا اے
تیہہ وریاں دی ہو گئی لاڈو ہور ایتھے کس آنا اے

(رسالہ پنج دریا ، اکتوبر ۶۶ ، ص ۷ ، ۸)

اگرچہ یہ حقیقت شدید اتنی عام نہیں مگر یہ علامت ہے ایک سماجی مسئلہ کی اور دراصل

ایسا اکثر ہوتا بھی ہے۔ شاعر نے یہ نظم معاشرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اور روزمرّہ کے مسائل کی ترجمانی کے طور پر بھی لکھی ہے۔

خواجہ شفیع فیروز

ایک اور نظم ملاحظہ فرمایے۔ اس میں پنجابی زبان کی زبوں حالی اور پسماندگی کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں شاعر نے پنجابی زبان کے عظیم شعراء، یعنی وارث شاہؒ ، بلھے شاہؒ ، لال حسینؒ، سلطان باہوؒ ، ہاشم شاہ اور میاں محمد نے اس زبان کی جو خدمت کی اور اس میں اپنے کلام سے جس طرح اضافے کیے اس کا ذکر کیا ہے اور پھر لکھا ہے :

پنجے پانی رل کے جس نوں دھو دھو ستھرا کردے
ہائے افسوس کہ چکڑ سٹن اس تے اپنے گھر دے

جے ایہہ اپنے دیس دے اندر سکھیاں نال کھلوندی
اج نہ مان سہڑاں وانگوں بوہا بھڑ کے روندی

سدھراں ڈنگن ، بھکھاں لنگن ، پیڑاں سارے جسّے
کتھے کوکے کس نوں دسّے اپنے دکھ تے غصّے

کملے پت ، پرائے ویہڑے ، ودھ ودھ دیوے بالن
اس نوں وچ ہنیرے رکھ کے گھر دی پت اچھالن

کئی کروڑ انساناں دی نیروز پنجابی بولی
رانی ہو کے پتاں ہتھوں بنی ہوئی اے گولی

(رسالہ 'پنج دریا' ، نومبر ۱۹۶۶ء ، ص ۲۴)

شاعر نے پنجابی زبان و ادب کی ترقی میں کوئی دلچسپی نہ لینے کو مؤثر انداز میں پیش کر دیا ہے۔ شاعر کا تاثر اس کے الفاظ کے چناؤ سے عیاں ہے اور اس کے دلی جذبات کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ روزمرّہ اور محاورے کا استعمال واضح معنی دیتا ہے۔ کملے پت ، پرائے ویہڑے ، دیوے بالن ، پت اچھالن ، رانی اور گولی جیسے مترادف اور مخالف الفاظ سے اس کی حیثیت عیاں ہوتی ہے۔

اکبر لاہوری

اکبر لاہوری اگرچہ اب نوجوان نہیں کہلائے جا سکتے لیکن خیالات کے اعتبار سے وہ جدید دور کے شاعر ہیں ۔ ان کی نظم میں احتجاج کی ایک شدید کیفیت ملتی ہے ۔ بعض دفعہ الفاظ بالکل ننگے ہوتے ہیں ۔ ان کی علامات بھی بہت واضح ہوتی ہیں ۔ انہوں نے معاشرتی کھیلوں اور سیاسی حالات کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے ۔ ایک نظم 'دوغلے' ملاحظہ فرمایئے:

اک بندہ سی نمو جہانا منڈی وچ کھلوتا
آکھے سینوں لوڑی دا اے اک بندہ اک کھوتا
کسے کہیا "لے یارا تینوں ایسی چیز دوائیے
جو بندے دا بندہ ہووے تو کھوتے دا کھوتا
سارے کماں نوں او تیری مرضی نال چلاوے
جتھے آکھیں بیٹھا رہوے جتھے کہیں کھلوتا"
اوس کہیا "اہ گل نئیں مینوں اکا وارا کھاندی
اکو جنس لوڑیدی مینوں اوٹھ ہووے یا بوتا
مر جاواں پر دوغلیاں دے ویہڑے پیر نہ پاواں
بندہ اصلی بندہ لوڑاں تے کھوتا اصلی کھوتا

اکبر کے ہاں جذبات کی فراوانی اس قدر ہے کہ بعض دفعہ ان کی تصویریں بے حجاب ہونے کی وجہ سے آنکھ میں کھٹکنے لگتی ہیں اور ان کا تاثر کم ہو جاتا ہے ۔ مگر وہ اپنے زمانے کی نبض جانتے ہیں اور اپنے طنز کے نشتر سے فسد کا کام لیتے رہتے ہیں ۔

ڈاکٹر رشید انور

رشید انور کی نظر وسیع ہے وہ اپنے معاشرتی اور تہذیبی پس منظر سے پوری طرح آگاہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں اگرچہ روایت سے لگاؤ کا احساس ملتا ہے لیکن یہ احساس موجودہ دور کے حالات کے تقابل کا کام دیتا ہے ۔ قدیم شعراء کی طرح وہ غزل میں پنجابی زبان کے طویل رومانوں کے کرداروں کو علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے ۔ علامت کا استعمال غزل کے روایتی مضمون کو سنوارنے کے لیے نہیں ہوتا (جیسا کہ اکثر شعراء کرتے ہیں) بلکہ وہ موجودہ سیاسی اور معاشرتی حالات کو ایک مخصوص معنویت

دیتا ہے ۔ ذیل میں ڈاکٹر رشید کی ایک غزل دی جاتی ہے جس سے اس بات کا اندازہ ہو سکے گا :

اک نویں سویر دی گل سن کے دل میرے پایاں جلھیاں نیں
کیہ سمجھاواں جھلّے نوں ایہہ سبھے طفل تسلیاں نیں
اج فیر ہریتاں پئیاں نے کتے پیار دی ہرہیا لائی اے
ہنجواں دے روگ آ گئے نیں درداں نے گنڈھا گھلیاں نیں
تھل پیار دے ویکھے ہوئے نیں کیہ مڑ مڑ کے ازماونے نیں
کوئی روکو سدہراں سسّیاں نوں ایہہ فیر تھلاں تو چلیاں نیں
رولاسی نویاں سفراں دا ، خبرے کیہ ہونی ورتی اے
ہن ٹریاں پیریں چھالے نیں ، جتھے دے اندر کھلیاں نیں
ایہہ اتھرو پیڑاں ہنجواں دے رنگین کھڈونے میرے نے
میں کیہ سمجھاواں لوکاں نوں میں کیو ایہہ کھیڈاں ملیاں نیں
ہن نویں سویر دے قافلیاں نے کدہرے قدم ودھایا اے
میں چڑھ کے برج ہنیرے تے کئی واری سنیاں ٹلیاں نیں
ایہہ دل دا کوٹھا انور لئی اک عجب بجھارت بھنیاں ایں
کنہیا توں باہر ہموشی اے ہر کمرے وچ تھرتھلیاں نیں

رشید انور کے کلام میں موجود حالات کے بارے میں تجاہل عارفانہ کی سی کیفیت پائی جاتی ہے ۔ وہ حالات کے بدلنے کے متعلق پر امید ہیں ۔ البتہ اپنی داخلی کشمکش اور خارجی حالات میں مناسبت پیدا نہیں کر سکتے ۔ زبان سادہ اور اسلوب رواں ہے ۔ وہ کوئی ٹھیٹھ یا غیر مانوس لفظ استعمال نہیں کرتے ۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں جب پاکستان و ہند کی جنگ کے دوران پنجابی زبان کے شعراء نے غیر معمولی جذبے اور جوش کا مظاہرہ کیا اس وقت بے شمار شعراء نے جنگی اور قومی ترانے لکھے ۔ ان میں ڈاکٹر رشید انور کا ترانہ :

جنگ کھیڈ نئیں ہوندی زنانیاں دی

بہت مقبول ہوا ۔ اگرچہ اکثر پنجابی ترانے بہادری ، چیالے بن اور بے خوف ہوکر دشمن پر پل پڑنے کی للکار کے حامل تھے ، لیکن رشید انور نے جس انداز میں دشمن کو مخاطب

کیا وہ انداز منفرد ہے - یہی وجہ ہے کہ جتنی شہرت اس ترانے کو ملی وہ کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی - اصل میں اس ترانے کے مقبول ہونے کی وجہ شاعر کا وہ شدید جذبہ نہیں جو اکثر ایسے موقعوں پر خیالات پر حاوی ہو جاتا ہے بلکہ ایک پرسکون ، باحوصلہ ، پر اعتماد ذہن کا وہ طنزیہ نشتر ہے جس نے ہندو چالباز ذہنیت کو بے نقاب کر دیا ہے - اس میں شاعر نے ہندو قوم کو حربی صلاحیتوں سے عاری اور بزدل انسان دکھایا گیا ہے - اس کے علاوہ اس ترانے میں ہندو تہذیب کو عکس بند بھی کر دیا گیا ہے -

اس کے علاوہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم نے 'میرا ماہی چھیل چھبیلا نی' ، 'میریا ڈھول سپاہیا بنوں رب دیاں رکھاں' اور 'میرا سوہنا شہر قصور نی۔ عبدالمجید بھٹی نے ، 'لہو دیاں حداں' اور 'سانوں ڈر کوئی نا' ، شمیم چوہدری نے 'فوجی ویر جوان نی میتو' ، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے 'رہنا ہر ویلے ہوشیار' ، سلطان محمد آشفتہ نے 'سویر دی اذان' مقبل نے جکنی ، ٹپے ، ماھیاں اور گیت ، احمد راہی نے 'ساڈی فوج' ، محمد اسلم نے 'جنگ چھیڑ کے ماریاں ہند چیکاں' ، اسماعیل متوالا 'پاک وطن تو ہو قربان' ، سعیدہ نصدق حسین ہاشمی نے 'فوجی بھراواں نوں عید مبارک' ، عاصی واصفی نے 'یلغار' ، اسماعیل قلندر نے 'سنبھل جاؤ' ، فضل الٰہی بہار نے' ، 'آزادی دی شان' ، طالب چشتی نے 'غازی دے ناں' اور حکیم لا ر نے 'ساڈا ویر' اور دوسری نظمیں لکھیں، جن میں حب الوطنی اور مادرِ وطن کی آزادی اور سالمیت کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے -

سب سے آخر میں ہم ایک مشہور نظم کے ایک دو بند پیش کرتے ہیں یہ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے موقع پر لکھی گئی -

جنگ کھیڈ نئیں ہندی

اج ہندیاں جنگ دی گل چھیڑی اکھ ہوئی حیران ، حیرانیاں دی
مہاراج ! ایہہ کھیڈ تلوار دی اے ، جنگ کھیڈ نئیں ہندی زنانیاں دی
دلی وچہ بہہ کے مصرعہ آکھدے او ، دلد بھن سٹو پاکستانیاں دے
شہباز شاہین اسلام دے ہاں اسیں مچھر نے نئیں مچھردانیاں دے
اسیں سندھی ، بنگالی ، بلوچ پٹھے اسیں پت پنجاب دے پالیاں دے
اسیں نسل محمود جہے غازیاں دی دده پیتے نیں ماواں پٹھانیاں دے

پہلوں چھیڑ کے ہن پئے نس دے او، سٹ سہو تے سبھی پاکستانیاں دی
مہاراج! ایہہ کھیڈ تلوار دی اے، جنگ کھیڈ نئیں ہندی زنانیاں دی
گھر بیٹھیاں دند لئیں بھج جانے ایہہ تے گل اے سر میدان دی گل
سونہہ رب دی جیبھ نوں وڈھ دیئے مندی جو وی کرے پاکستان دی گل
وچ اکھاڑیاں دے آکے کھل دی اے کیہڑی سچی اے کیہڑے پہلوان دی گل
اسلحہ ہور کجھ اے جذبہ ہور شے وے کفر سمجھ کی سکے ایمان دی گل
مل ہور شہیداں دے خون دا اے، قیمت ہور اے گنگا دے پانیاں دی
مہاراج! ایہہ کھیڈ تلوار دی اے، جنگ کھیڈ نئیں ہندی زنانیاں دی

"منزلاں" ازاں پنجاب رنگ رجسٹرڈ رام کلی نمبر ۱

ہمارا خیال ہے کہ پنجابی ادب زندگی کے اب ایک نئے دور میں داخل ہو چکا ہے اور چونکہ اس کا محرک زندگی کا براہ راست مشاہدہ اور مطالعہ ہے اور اکثر نجی یا سماجی تقاضے ہی اس کا موضوع ہوتے ہیں ۔ گل و بلبل، یا سنبل و ریحان کی داستان نہیں ہوتی اس لیے یہ ادب زیادہ جی دار ہے۔ اس کا اظہار بھی بلا واسطہ، متنوع اور صحیح ہوتا ہے اور شاعر اپنے آپ میں اور معاشرے میں ایک قسم کی ہم آہنگی محسوس کرتا ہے اس لیے پنجابی نیا ادب روز بروز صحیح معنوں میں ترقی پذیر ہو رہا ہے ۔

ذیل میں ہم کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پنجابی شاعر زندگی سے کس قدر قریب ہے ۔ اس کے پاؤں ابھی تک اپنی زمین پر ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ تقاضائے بشری اور سماج کے دھندوں کو کسی وقت نظر انداز نہیں کرتا ۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ یہ رشتہ پنجابی ادب میں روح کی طرح جلوہ فرما ہے ۔ موضوعات میں تنوع پیدا ہونے سے پنجابی شاعری کا مزاج نہیں بدلا ۔ اور وہ حقیقت سے کبھی دور نہیں ہوا ۔ چنانچہ موضوعات کے انتخاب اور تشابیہ اور استعارات کے استعمال میں بھی وہ اپنی اصلیت کو قائم رکھتا ہے ۔ ذیل میں ہم ایک غزل درج کرتے ہیں ۔ بظاہر یہ غزل ہے مگر اس میں تغزل کا عنصر غالب ہے، بلکہ زندگی کے مسائل سے نہایت گہرا انہماک ضرور موجود ہے :

میں کیہ دساں ساڈے سر تے
کتنے جھکھڑ جھلے
کنج اساں پرچھاویاں بھکھاں
کون ایہہ ورقے تھلے

پانڈی دے وچ پتھر پا کے
پرنڈی چاڑھی چلنے
سانوں مٹی ملی تہانوں
خوشبوآں دے حلّے
اساں ہنڈائے کنکر پالے
تساں رضائیاں جلّے
خورے کد تک راج کریسن
لم سلمے کاٹے
انور ایہہ کیہ بدّل بنیا ایں
نہ وسّے نہ کھلّے

(نظام 'بدل' از انور مسعود ، پنج دریا ، مارچ ۱۹۷۰ء)

اس کے بعد ہم ایک نیم مزاحیہ منظوم ڈرامہ پیش کریں گے۔ یہ مسٹر انور مسعود کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں دو کردار ہیں ، ایک مالک، دوسرا باورچی۔ دونوں میں یہ گفتگو ہوتی ہے کہ آج کیا سالن پکانا جائے۔ ظاہر ہے کہ ہر گھر میں یہ بات روز ہوتی ہے مگر شاعر نے مزاح کے رنگ میں ایک روزمرہ کے دائمی مسئلہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ ہماری زندگی کی جیتی جاگتی تصویر بن گئی ہے :

چودہری : رحمیا فیر اج کر توں ای ، کوئی راہ دیہہ
چھیں تے بتؤآں دا وی آپنا سواد اے

رحان : رب تہاڈا بھلا کرے کیڈی سوہنی گل اے
کالے کالے لشکدے تے گول مول چاڑھ لئو
چودہری جی لوں تے بتوؤں چاول چاڑھ لئو

چودہری : رحمیاں پکانے نوں تے جی بڑا کردا اے
بھٹھیاں دی گرمی توں دل ذرا ڈر دا اے

رحان : سچ اے جی ، چودہری جی ، ڈھڈ کاہنوں بالنا
کھان والی چیز اے کوئی وینگناں دا سالنا

بھٹھیاں دے ڈک وچ سٹنے ضرور ہیں
اساں کوئی بھخانے ہیں ایہہ ڈھڈ کوئی تندور ہیں

دفع کرو بھٹھیاں نوں بھٹھے کاہنوں ساڑنیے
خبیثاں نوں چودہری جی گھر کاہنوں واڑنیے

کالیاں دے نال کاہنوں مارنیے اڈاریاں
ساڈیاں تے ہین امریکہ نال یاریاں

چودہری : ودھ ودھ بولنا ایں ایویں بڑ بولیا
سبزیاں توں جا توں سیاستاں نوں پھولیا

دوجے دی وی سن کجھ دوجے نوں وی کہن دیہہ
حکومتاں دی گل توں حکومتاں تے رہن دیہہ

چنگا فیر بجھ بھلا میرا کیہ خیال اے

رحان : بجھ لئی اے، چودہری جی، چھولیاں دی دال اے

اس کے بعد ایک غزل کے تین اشعار دیے جاتے ہیں۔ ان شعروں میں بجائے غزل کے جذباتی تموّج کے زندگی کی اخلاقی اور اجتماعی قدروں کا جائزہ لیا گیا ہے - یہاں زندگی کی جدوجہد ، ہمدردی اور ایثار کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے - اشعار ملاحظہ ہوں :

سجناں جیویں سدا حیاتی
نال طوفاناں کھیہہ کے ویکھ

میں تے کیہہ میری جان وی حاضر؟
کدی تے مونہوں کیہہ کے ویکھ ؟

جے توں پاؤنی دل دی دولت
کول اساڈے رہہ کے ویکھ .

اب ایک گیت لیجیے ۔ لطف یہ ہے کہ اس میں حسن و عشق کی گھاتوں کے بجائے بیوی اور خاوند کے درمیان ایک مکالمہ دیا گیا ہے - جس میں گھریلو معاملات کو بلا تکلف طور پر بیان کر دیا گیا ہے - توقعات اور وسائل کا تقابل شاعر نے بہت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے ، مگر اس میں کسی قسم کی مغائرت نہیں پائی جاتی کیونکہ یہاں کوئی

نظریاتی اشارہ نہیں کیا گیا :

کالی گھگری لوا دے گوٹا
وے جے توں میری چال ویکھنی
وڈا منڈا رٹھیا پھردا
نکا پاوے ڈنڈ !
کپڑ منڈی لانبو پھریا
جھڑی نہ تیری کنڈ
گھر دانے نہ دکانے آٹا
نی میں کیہ تیری چال ویکھنی

('کالی گھگری لوا دے گوٹا' از حسن اعراق ، اگست ۷۰ء)

آخر میں ہم ایک تازہ نظم کے چند اشعار پیش کرتے ہیں ۔ یہ ایک باپ کا اپنی لڑکی سے خطاب ہے ۔ مگر آپ اسے ایک علامت کے طور پر پڑھیے اور یہ خیال رکھیے کہ یہ ہر باپ ہر بیٹی کو غالباً ہر زمانے میں اسی قسم کی نصیحت کرے گا ۔ اس میں کوئی اخلاق درس نہیں ، مگر اخلاقی قدروں کا تحفظ ضرور ہے ، جس سے سوسائٹی کی بنیادیں قائم رہتی ہیں ۔

عزت ماپیاں دی وانگردانیاں دے پاکے چھج دے وچ نہ چھٹ ہیرے
آ باز ایہہ حرکتاں چنگیاں نہیں وانگ دانیاں زندگی کٹ ہیرے
بدبخت شریک ہن لیک لاؤندے لوک چندے بڑے منہ پھٹ ہیرے
برے کم توں منع جد کرن وڈے لائیے دیر ناہیں جالیے ہٹ ہیرے
ایس عشق بیوپار چوں دس اگے گئے ہین کیہڑے کھٹی کھٹ ہیرے
چٹے عشق دے برے نہیں رکھ ہندے دتے عشق نے جڑہاں توں پٹ ہیرے
قابو نفس شیطان تے جنہاں پایا بھرے لیکیاں دے اوہناں مٹ ہیرے
گلاں ملاں بے عمل دے وانگ کرکے غیرتمنداں نوں چاہڑ نہ وٹ ہیرے
آخر کار پچھتان گے حشر نوں اوہ عمل نیک کیتے جنہاں گھٹ ہیرے
فقر وانگ ضیاء دے صبر کر دے وچے عشق دی جنہاں نوں سٹ ہیرے

(نظم 'ہیرے' از ملک ضیاء اللہ ضیاء ، پنج دریا ، جنوری ، فروری ۱۹۷۱ء)

(ج) ناول اور افسانہ

پنجابی میں ناول کی ابتدا قرنِ رواں سے ہوئی ہے۔ شروع شروع کے ناولوں کا مزاج مذہبی تھا اور سکھوں کے سوا کسی اور گروہ کی اس صنفِ نگارش میں کوئی چیز نہیں ملتی۔ بھائی ویر سنگھ کے 'نانک چمتکار' اور 'کلغی دہرچمتکار' کے بعد بھی اسی موضوع سے ملتے جلتے مثالی لوگوں اور قومی بہادروں کے حالاتِ زندگی سے متعلق ناول لکھے گئے جس طرح اس دور میں اردو میں عبدالحلیم شرر اور بنگال میں بنکم چندر چیٹرجی نے لکھے۔ مگر ان پنجابی ناولوں کو ہم صحیح معنوں میں ناول نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان میں واقعیت کم تھی اور نفسیاتی حقیقت یا کردار نگاری یا زندگی پر تبصرہ کا ان میں نشان تک نہ تھا۔ دراصل ان کے خدو خال الف لیلیٰ اور طلسم ہوشربا سے ایسے مختلف نہیں تھے۔

لیکن جلد ہی ملک کی دوسری زبانوں کی طرح پنجابی میں بھی سماجی ناول لکھے جانے لگے، بلکہ خود بھائی ویر سنگھ ہی نے ۱۹۲۱ء میں 'بابا نودھ سنگھ' کے نام سے ایک ناول لکھا۔

میراں بخش منہاس

قیامِ پاکستان کے بعد پنجابی ناول نگاری کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ اس دور میں میراں بخش منہاس اور جوشوا فضل دین کے نام سرفہرست ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ناول اور افسانے کی ابتدا کی۔ میراں بخش نے ۱۹۲۷ء میں نواب خاں 'عرف جٹ دی کرتوت' لکھ کر ان تاریک گوشوں کو اپنا موضوع بنایا جن کو دیہاتی زندگی کو جنت نظیر ظاہر کرنے کے جوش میں بھائی ویر سنگھ نظر انداز کر گئے تھے۔ یہ ایک ایسے جاٹ کی ناعاقبت اندیشیوں کی داستان ہے جو جھوٹی ظاہر داریوں کو نباہنے کی خاطر قرض لیتا ہے اور پھر اس گرداب سے نکل نہیں سکتا۔ منہاس صاحب دیہات سدھار تحریک سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے یہ ناول اسی جذبے کے پیش نظر لکھا تھا۔ وہ بنیادی طور پر ناول نگار نہیں تھے۔ اس لیے ان کے ناول 'نواب خاں' میں زبان و بیان کی فنی پختگی نہیں پائی جاتی۔

جوشوا فضل دین

انہیں ایام میں جوشوا فضل الدین پنجابی ادب کے افق پر ابھرے ۔ انہوں نے پنجابی میں افسانے لکھے ، ناول لکھے بلکہ ڈرامے بھی لکھے ۔ تینوں اصناف میں جوشوا صاحب کی لکھی ہوئیں چیزیں ان کے اصلاحی جذبے کی عکاسی کرتی ہیں ۔ وہ دیہاتی زندگی کی بعض کمزوریوں پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں ، لیکن ناولوں میں وہ قدیم تہذیب کی حمایت اور جدید تہذیب کی درپردہ مخالفت کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ ان کے چند مشہور ناولوں مندرجہ ذیل ہیں 'پتی ورتا کملا' 'پربھا' 'برکتے' اور 'منڈے دا مل' وغیرہ ۔

عبدالمجید بھٹی

قیام پاکستان کے بعد عبدالمجید بوٹی صاحب کے ناول 'ٹھیڈا' کو رنگ قدیم سے انحراف کی پہلی کوشش کہا جا سکتا ہے ۔ 'ٹھیڈا' ایک تعلیم یافتہ لڑکی کی لغزش پا کی داستان ہے لیکن سوچیں تو محض شاہدہ کی لغزش پا کی نہیں بلکہ اس کے باپ کی کورچشمی اور بے بصری کی داستان بھی ہے ، جو اپنی دولت کے نشہ میں شادیوں پر شادیاں کرتا جاتا ہے اور جس کا نتیجہ اس کے سوا کیا نکل سکتا تھا کہ شاہدہ کے الفاظ میں "اونہاں دے روز روز دے ویاہ میراں نویاں پرانیاں ماتواں دے جھگڑے ، اک دوجی نوں طعنے مہنے ، تے اودوں ودھ کے اباجی نال اچیاں نیویاں ۔ جنانی مرد دے سنگ دی کوئی گل اجیہی نہیں سی جدا پتہ مینوں جوان ہون توں پہلاں نئی سی لگ گیا ۔"

ناول کی زبان بڑی پختہ اور منجھی ہوئی ہے اور جہاں جہاں مصنّف نے استعاروں اور تلمیحوں میں باتیں کی ہیں ، بڑی خوب کی ہیں ۔ لیکن بعض جگہ قلم اس قدر برہنہ ہو گیا ہے کہ آنکھیں دوبارہ الفاظ کو دیکھتے ہوئے جھجکتی ہیں ۔ فنی لحاظ سے ناول میں بعض باتیں ایسی بھی بیان ہوگئی ہیں ، جن سے بات خام سی ہو کر رہ گئی ہے، مثلاً شاہدہ اور اس کی ہم راز سہیلی صفیہ سیر کو باہر جاتی ہیں اور وہاں جوانی بھری باتیں کرتے کرتے اسی ترلنگ میں صفیہ شاہدہ کو لپٹ کر (سر راہ) اس کا منہ چوم لیتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں لڑکیاں ایسی باتیں کم ہی کرتی ہیں ۔

افضل احسن

عبدالمجید بھٹی کے ناول کے بعد افضل احسن نے ایک مختصر سا ناول ' دیوا تے دریا ' لکھا ۔ اس میں اسی دیہاتی زندگی کی جھلک ملتی ہے جو میراں بخش منہاس کے ناول کا موضوع تھی ' ہاں فرق کہ منہاس صاحب کے ناول کا مقصد نواب خان کی فضول خرچیوں کے غلط انجام کو عبرت ناک انداز میں پیش کر کے لوگوں کو اسراف زر سے روکنا تھا، جب کہ ' دیوا تے دریا ' کے پس پردہ کوئی ناصح بیٹھا ہوا نظر نہیں آتا ۔

ان کے علاوہ بہت سے ادیب ناول نگاری کی طرف توجہ دے رہے ہیں ۔ ان میں نواز ، الطاف قریشی ، شوکت چوہدری ، ریاض احمد سلیم ، سلیم خان گمی اور منظور انور قریشی کے نام قابل ذکر ہیں ۔

افسانہ

جوشوا فضل دین

قیام پاکستان سے قبل جوشوا فضل دین نے پنجابی زبان میں افسانہ لکھنے کی ابتدا کی ۔ اگرچہ ان افسانوں کا فنّی معیار وہ نہیں جو آج کے دور میں پنجابی افسانہ نویسی حاصل کر چکی ہے ۔ لیکن خشتِ اول کی حیثیت سے ان کی بڑی اہمیت ہے ۔ پنجابی زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اسے جدید اصناف سے روشناس کرنے والے اپنے گرد و پیش سے باخبر حقیقت پسند انسان تھے ۔ چنانچہ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جس طرح شاعری اپنے ماحول کی مکمل عکاسی کرتی تھی اسی طرح دوسری اصناف میں یہ رشتہ قائم رہا جس سے پنجابی زبان کے ادب میں معاشرے اور ادیب کے تعلق سے صحت مند اور مثبت رجحانات کو تقویت ملی ۔ جوشوا صاحب کے افسانوں کا موضوع وہ انسان ہے جو ان کے نزدیک کائنات کے حسن کا مرکز ہے ۔ ان افسانوں میں انسان کو اسی مرتبے پر دیکھنے کی خواہش کا اظہار ملتا ہے ۔ ان میں معاشرے کو سماجی برائیوں سے پاک رکھنے کے لیے قدرت کے اٹل اصول جس میں برائی کی سزا ضرور ملتی ہے ، کو موضوع بنایا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ نسلی امتیاز کے خلاف لوگوں کے جذبات ابھارنے پر توجہ دی گئی ہے ۔

قیامِ پاکستان کے بعد ان رجحانات میں پختگی آتی گئی اور اگرچہ پنجابی میں افسانے کی روایت بڑی مختصر ہے لیکن اس اعتبار سے بڑی توانا ہے کہ اس میں فن اور حقیقت پسندی کا امتزاج پایا جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان میں لکھے جانے والے بیشتر افسانے حقیقی پس منظر اور جیتے جاگتے کرداروں پر مبنی ہیں ۔

پنجابی افسانہ لکھنے والوں میں سے نواز ، عبدالمجید بھٹی ، انور سجاد ، رشیدہ سلیم سیمیں ، کہکشاں ملک ، حنیف باوا ، آغا اشرف اور امرتا پریتم کے علاوہ شمس نعمانی ، اصغر سرحدی ، مقصود اختر ، گلشن نعمانی ، صادق قریشی ، محمد آصف خان ، شہباز ملک ، افضل پرویز ، رحمٰن مرزا ، سلیم خان گمی ، لطیف منہاس ، ماجد صدیقی ، چوہدری محمد اکبر ، نذر فاطمہ ، عزیزالرحمٰن راہی ، ایس ایم ارشاد ، محمود چوہان اور اکبر لاہوری کے نام قابل ذکر ہیں ، جنہوں نے نہ صرف پنجابی افسانے کو موضوع اور فن کے اعتبار سے ایک معیار دیا بلکہ اسے دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے افسانوی ادب کے ہم پلہ کرنے میں مدد دی ہے ۔

(د) ڈرامہ

اگرچہ ان معنوں میں جو جدید زمانے میں "ڈرامے" سے لیے جاتے ہیں پنجابی زبان میں بیسویں صدی کے ربع اول سے پہلے کوئی ڈرامہ نہیں لکھا گیا ، لیکن بنیادی ڈھانچے کے اعتبار سے اس کی روایت بہت قدیم ہے ۔ راس دھاریوں کا ذکر تو بارھویں صدی عیسوی میں ملتا ہے ۔ عہد مغلیہ میں بھانڈ اور میراثی بیاہ شادیوں اور دوسری تقاریب پر زندگی کے مختلف پہلوؤں کو مزاحیہ رنگ دیکر ڈرامے کی صورت میں پیش کرتے ۔ پھر ان کے علاوہ علاقے کے حاکموں کے بزرگوں کے کارناموں کو بھی ڈرامائی انداز میں لوگوں کے سامنے بیان کیا جاتا ۔ پنجاب کی طویل رومانوی داستانوں مثلاً 'ہیر رانجھا' ، 'سوہنی مہینوال' ، 'مرزا صاحباں' اور 'سسی پنوں' کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کا رواج آج بھی پایا جاتا ہے بلکہ سر رچرڈ ٹمپل کی بہم شدہ 'حکایات پنجاب' کو پڑھنے سے معلوم ہوا کہ مکالمہ جو ڈرامے کی جان ہوتا ہے ، ان حکایات میں اعلیٰ معیار حاصل کر چکا تھا ۔ اس میں تکلف بالکل نہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ باتوں باتوں میں کردار کے خیالات کی عکاسی ہو جاتی ہے ادھر کہانی آگے بڑھتی ہے ۔ مگر جدید ڈرامے کی ابتدا گورنمنٹ کالج لاہور میں ڈرامیٹک کلب کے قیام سے ہوئی جب اس کلب نے ۱۹۲۰ء میں پروفیسر لندہ کا ڈرامہ 'سجدہ' پیش کیا ۔ ان کا ڈرامہ 'للی دا ویاہ' بہت مقبول ہوا ۔ اسی زمانے میں ریڈیو کی ایجاد سے بھی ڈرامے کو فروغ حاصل ہوا ۔ دیہاتی پروگرام میں پنجابی ڈرامے پیش کیے جانے لگے ۔ جن کے لیے سب سے معروف نام سجاد حیدر کا ہے ۔ ان کے ڈراموں کا مجموعہ 'ہوا دے بوکے' کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۔ ان میں سے 'جاگو میٹی رات' کا ور 'شہید' شہری زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور باقی ڈراموں کا تعلق دیہاتی زندگی سے ہے ۔ سجاد حیدر کے اکثر کردار مثالی ہیں ۔ ان کے بعد آغا اشرف کا نام آتا ہے ، ان کے ڈراموں کے دو مجموعے 'نماں نماں دیوا بلے' اور 'دھرتی دیاں ریکھاں' شائع ہو چکے ہیں ۔ آغا اشرف نے انفرادی مسائل کے ساتھ ساتھ قومی مسائل کو بھی ڈراموں کا موضوع بنایا ہے ۔ ان میں موجودہ اقتصادی حالات کی عکاسی بھی ملتی ہے ۔

ان کے علاوہ پنجابی ڈرامہ سلطان کھوسٹ ، شفقت تنویر مرزا ، انور سجاد ، ریاض احمد سلیم ، نذر قریشی ، اشفاق احمد ، بانو قدسیہ ، رفیع پیرزادہ ، شیخ محمد اقبال ، حسن اعرافی اور سلیم گمی کی مساعی کا مرہون ہے جن کی وجہ سے پنجابی ڈرامے کو فروغ ملا ۔

(ہ) تحقیق و تنقید

علم میں فروغ اور پنجابی اردو داں طبقہ کا پنجابی کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے اس زبان میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی لکھے جانے لگے ہیں اور یہ مضامین اسلوبِ

اور مواد کے اعتبار سے اعلیٰ معیار کے حامل ہیں ۔

ان مضامین کے لکھنے والوں میں ایسے نقاد بھی شامل ہیں جو اردو میں سند کا درجہ رکھتے ہیں ۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی پنجابی ادب کی دریافت نو نے پنجابی زبان و ادب اس کو نشاۃ ثانیہ کے دور میں داخل کر دیا ہے ۔

تاریخ و تنقید کی بنیاد باوا بدھ سنگھ نے رکھی ۔ انھوں نے چار کتابیں 'کوئل کو سنیہا بولو'، 'ہنس جوگ'، اور 'پریم کہانی' لکھیں ۔ آخرالذکر گورمکھی رسم‌الخط کے علاوہ اردو رسم الخط میں چھپی ۔ اس کے بعد پیرالدتہ نے وارث شاہ کا دیباچہ لکھا ۔ قاضی فضل حق نے 'چٹھیاں دی وار' مرتب کی اور ایک مضمون میں‌اس کی ترتیب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ ۱۹۳۵ء میں پروفیسر ضیا محمد نے 'بارگاہِ وارث' میں وارث شاہ پر تبصرہ کیا ۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے انگریزی میں 'اے ہسٹری آف پنجابی لٹریچر' اور پنجابی زبان کی مختصر تاریخ پنجابی زبان میں لکھی ۔

ڈاکٹر کرشنا لاجونتی نے 'پنجابی صوفی پوئٹس' کے نام سے ایک تحقیقی مقالہ بھی مرتب کیا ۔ جس میں پنجابی صوفی شعرا کے عرفان اور مقام کے تعیّن کی کوشش کی گئی ۔ محمد سرور نے پنجابی زبان اور اردو رسم الخط میں پنجابی زبان کے رسم الخط پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ دوسرے دور کے محققین اور نقادوں میں جناب عبدالمجید سالک، نواب زادہ مہدی علی خان، مرزا مقبول بیگ، 'شہباز ملک' عبدالسلام خورشید، نذر فاطمہ، صوفی تبسم، ڈاکٹر وحید قریشی، عین الحق فرید کوٹی، اختر احسن، محمد عالم کھورتھلوی، غلام یعقوب انور، محمد آصف خان، مرزا مراد پرویز، نصیرانور، میاں اخلاق احمد کشتہ، عبدالغفور اور احمد حسین احمد، شفقت تنویر مرزا، سلیم الرحمن، نور کشمیری، نجم حسین سید، ارشاد پنجابی اور راقم آتے ہیں ۔

(۵) رسائل

اس صدی کے ربع اول سے لے کر قیام پاکستان تک کئی ادبی رسالے مثلاً 'پنجابی دربار' ۔ 'سارنگ' اور 'پنجند' شائع ہوئے لیکن اس زبان کے لیے تدریسی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی عدم دلچسپی کا شکار ہو گئے ۔ پاکستان کے وجود میں آنے سے جہاں قومی زبان کو فروغ دینے کے لیے کوششیں ہونے لگیں وہاں علاقائی زبانوں کی ترقی کی طرف بھی توجہ دی گئی ۔ پنجابی زبان و ادب کو ثانوی اور اعلیٰ درجوں میں اختیاری اور اضافی مضامین کی حیثیت میں پڑھایا جانے لگا ۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک بار پھر ادبی رسائل کی کمی محسوس کی گئی ۔ چنانچہ روزنامہ "امروز"

لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبی مجلہ " راوی" میں پنجابی نگارشات کے لیے جگہ مخصوص کر دی گئی ۔ پاکستان کے قیام کے بعد باقاعدہ طور پر سب پہلے مولانا عبدالمجید سالک اور ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کی ادارت میں ماہنامہ "پنجابی" لاہور سے جاری ہوا ۔ اس کے بعد مولا بخش کشتہ کے فرزند چوہدری محمد افضل خان نے بھیں سے گورمکھی رسم الخط میں چھپنے والے ایک ماہنامہ کا نام اپناتے ہوئے اردو رسم الخط میں 'پنجدریا' شروع کیا ، جو اب تک بڑی خوش اسلوبی سے اس زبان کی خدمت کر رہا ہے ۔ پھر صوفی تبسم کی زیر نگرانی "پنجابی ادب" جاری ہوا ۔ چنانچہ اس سے پڑھے لکھے طبقے میں اس زبان سے دلچسپی بڑھنے لگی اور پنجابی زبان کے جرائد میں اضافہ ہونے لگا ۔ گذشتہ چند سالوں سے ماہنامہ "لہراں" بھی شائع ہورہا ہے البتہ ایک رسالہ "حق اللہ" اگرچہ بڑی آب و تاب سے جاری ہوا مگر جلد ہی بند ہو گیا ۔

پنجابی زبان و ادب سے دلچسپی اور اس زبان کی روز افزوں ترقی کے پیش نظر حکومت کی سرپرستی سے پنجابی ادبی اکیڈیمی کا قیام عمل میں آیا ۔ اکیڈیمی نے پنجابی کلاسیکی ادب کی دریافت نو کرکے اس زبان کے بہت سے قیمتی سرمائے کو ضائع ہونے سے محفوظ کر دیا ہے ۔ ۱۹۵۸ء میں جب پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا تو دوسری علاقائی زبانوں کے ساتھ پنجابی کی بھی ایک شاخ قائم کی گئی اور ہر سال اس زبان کی بہترین تخلیقات پر انعامات کا سلسلہ شروع ہوا ۔ چنانچہ ان سب باتوں کا اثر یہ ہوا کہ اردو زبان کے بہت سے پنجابی مصنفین نے اس زبان میں لکھنا شروع کر دیا ۔ جس سے پنجابی زبان کا دامن بہت وسیع ہو گیا اور اب اس میں سبھی قدیم و جدید اصناف میں ادب تخلیق ہو رہا ہے ۔

اس کے علاوہ ریڈیو پاکستان کے لاہور اسٹیشن سے روزانہ 'جمہور دی آواز' اور زراعتی پروگرام کے علاوہ مشاعرے ، ادبی مجلے ، فیچر ، ڈرامے ، مزاحیہ خاکے ، رپور تاژ ، گیت ، نظمیں ، غزلیں اور مختلف موضوعات پر تقاریر نشر ہوتی ہیں ۔ جن کے لکھنے اور حصہ لینے والے موجودہ دور کے مذکورہ بالا مصنفین اور شعراء ہوتے ہیں ۔ نیز کمرشل سروس سے اب کئی ایک تجارتی کمپنیاں اور صنعتی ادارے اپنی مصنوعات کے اشتہارات بھی پنجابی زبان میں نشر کرواتے ہیں ، اور یہ ایک نہایت خوش آئند بات ہے ۔ چنانچہ بجا طور پر امید کی جاتی ہے کہ اس زبان میں جلد دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح ہر قسم کے افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کو آسانی سے بیان کیا جا سکے گا ۔

تعلیم و تعلّم

۱۹۷۰ء سے پنجاب یونیورسٹی نے اورینٹل کالج لاہور میں ایم - اے پنجابی کی جماعت شروع کر دی ہے جسے ایسے فضلاء تعلیم دے رہے ہیں جنہوں نے اپنی عمر پنجابی زبان و ادب کی خدمت میں صرف کر دی ہے - اس سے نچلی جماعتوں میں بھی پنجابی کی تدریس جلد شروع ہو جائے گی - اس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہو گا کہ پنجابی زبان کی تحقیق لسانی نقطۂ نگاہ سے ہو گی ، پنجابی کی نظم و نثر کا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے گا اور پنجابی تخلیقات کو عالمی ادب کے مقابلہ میں پیش کیا جائے گا ، پنجابی زبان کی مبسوط ادبی تاریخ مرتّب کی جائے گی اور متعدّد نئی عالمانہ کتابیں تصنیف و تالیف کی جائیں گی - یہ تمام تحقیقات جذبۂ تخلیق کو بھی جلا عطا کریں گی اور پنجابی ادب خوب سے خوب تر کی طرف اپنا سفر ارتقا جاری رکھے گا -

سندهي ادب

باب اول

(فصل اول)

عربی دور میں سندھی ادب

۷۱۰ء تا ۱۰۵۰ء

برِ صغیر پاک و ہند میں خطۂ سندھ ، مکران (موجودہ بلوچستان) کے بعد دوسرا علاقہ تھا ، جس پر سنہ ۷۱۱/۷۱۲ء/۹۳ھ میں عربوں کا کامل تسلط ہو گیا اور تین سو سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک یعنی ۱۰۶۵ء تک قائم رہا ۔ اس عربی دور کے متعلق ہمارا علم محدود اور کسی حد تک ناقص بھی ہے ۔ اوّلین تاریخ ، جو عربی فتوحات اور حکمرانوں کے متعلق ملتی ہے وہ بلاذری کی 'فتوح البلدان' کے چند اوراق ہیں ، جن میں اس نے غزواتِ سندھ پر روایات جمع کی ہیں ۔ 'فتح نامہ سندھ' (چچ نامہ) کا ماخذ بھی وہی روائتیں ہیں ، جو بلاذری نے مدائنی اور دیگر عرب راویوں کے مخطوطات سے مستعار لی تھیں۔ اس کے بعد مؤرخین المسعودی ، الادریسی ، اصطخری ، بشاری مقدسی نے بھی وہی بیانات نقل کیے ہیں یا ان میں کہیں کہیں اپنی طرف سے اضافے کیے ہیں ۔ چنانچہ عربی دور کے متعلق جو بھی تاریخی مواد ملتا ہے ، اس کی حیثیت زیادہ تر روائتی ہے۔ اکثر تاریخوں میں عربی فتوحات اور سیاست کے متعلق کچھ تفصیل تو ضرور ملتی ہے لیکن سندھ کے علمی و ادبی ماضی سے متعلق کچھ نہیں ملتا ۔ 'چچ نامہ' میں چند سندھی الفاظ ملتے ہیں جن سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سندھی زبان کی لسانی کیفیت اور صرفی و نحوی شکل و صورت ۱۱ -۱۲۰ء (۹۳ھ) میں وہی تھی جیسی کہ ہمیں آج نظر آتی ہے ۔ ذیل میں چند الفاظ مثالاً پیش کیے جاتے ہیں :

قصبوں اور شہروں کے نام

ساولدی ، جھم (موجودہ جھمپیر) ، ساکرہ (موجودہ میر پور ساکرو)

قبائل اور افراد کے نام

لاکھا ، ٹھکر (ٹھاکر) سمہ ، سہتہ ، لوہانہ ، بھالیہ (بھالیہ) سہندی (سوہندی) چنگی وغیرہ ۔

جغرافیائی مقامات کے نام

مہران ، دلدہ (ڈھنڈھہ بمعنی جھیل) بیت (بیٹ بمعنی جزیرہ)

'چچ نامہ' سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں سندھی ایک تحریری زبان بھی تھی ۔ 'چچ نامہ' میں راجہ داہر کے ایک خط کا متن (فارسی ترجمہ) ملتا ہے ، جو اس نے محمد بن قاسم کو دیبل کی فتح کے بعد لکھا تھا ۔ 'چچ نامہ' کا مصنف لکھتا ہے کہ "محمد بن قاسم کو جب داہر کا خط موصول ہوا تو اس نے اپنے محرر کو اس کا ترجمہ کر کے سنانے کا حکم دیا"[1] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ داہر کا خط مقامی زبان میں لکھا گیا تھا ۔

سندھی زبان کا موجودہ رسم‌الخط ، انگریزوں کے دور میں عربی نسخ سے بنایا گیا تھا ۔ اس سے پہلے سندھی زبان کے کئی رسم‌الخط رائج تھے ۔ عربی دور میں بھی زبان کئی مختلف خطوں میں لکھی جاتی تھی ۔ محمد بن قاسم سے قریباً دو سو سال بعد ابن ندیم ، اپنی کتاب 'الفہرست' میں لکھتا ہے کہ اہل سندھ کئی مختلف زبانیں بولتے ہیں اور ان کے کئی مختلف مذاہب ہیں ۔ ان کے رسم الخط بھی مختلف ہیں ۔ ایک شخص نے جو ان کے ملک کی سیر کر آیا ہے ، مجھے بتایا کہ ان کے تقریباً ایک سو رسم الخط ہیں ....،، ۔ ابن ندیم کی اس مبالغہ آرائی سے قطع نظر ، یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سندھی زبان ایک سے زیادہ خطوں میں لکھی جاتی تھی ۔ البیرونی سندھ کے چار خطوں کا ذکر کرتا ہے ، جو یہ ہیں :

(۱) سندھوا یعنی سندھی ، (۲) لاڑی (جنوبی سندھ کا رسم الخط) ، (۳) اردھ ناگری ، اور (۴) مالواری[2] ۔ حال ہی میں کراچی کے نزدیک بھنبھور کے آثار قدیمہ سے برہمن اور ابتدائی عربی دور کے چند ظروف پر مقامی رسم الخط کے کچھ نشانات ملے ہیں ۔ اس خط کے متعلق ایک ماہر کی رائے یہ ہے کہ یہ خط اردھ ناگری سے ملتا جلتا ہے[3] ۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ بھنبھور کا یہ خط "لاڑی" رسم الخط میں ہے اور

---

(۱) فتح نامہ سندھ ص ۱۱۱-۱۱۲- (فارسی) تصحیحہ ڈاکٹر عمر بن محمداؤد پوتہ ۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۳۹ء ،

(۲) Alberuni's India --English Tran. By E. C, Sachan--London 1910-i-P.173.

(۳) A.H.Dani-Indian Paleography-Oxford university Press London 1965, P.112.

ایک تحریر سے سالِ تحریر سماوت ۱۲۴ برآمد ہوتا ہے[1] ۔ سندھی زبان کے یہ رسم الخط اب تک چند لوگوں کے پاس محفوظ ہیں ۔

عرب دور کے تحریری خط سامنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ادب بھی موجود ہو گا ، اگرچہ اس دور کے ادب کے نمونے اب مفقود ہیں ۔ البتہ اس دور کے اختتام اور مقامی سومرہ قبیلہ کا دورِ حکومت شروع ہونے پر جو شعر 'گاہوں' کی ہیئت میں ملتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شعر کی یہ روایت سومرہ عہد سے پہلے کی ہے ۔ سومرہ دور کے روایتی منظوم قصے اور منظوم داستانیں ، رزمیہ ''گاہیں'' زبان و معنی کے لحاظ سے پختہ گو شعراء کا کلام معلوم ہوتی ہیں ۔

سندھی شعر کے موضوع پر عربی دور میں بھی مختصر اشارے ملتے ہیں ۔ مثلاً امام ابو حاتم حبان البستی (م ۔ ۹۶۵ء/۳۵۴ھ) اپنی تصنیف 'روضۃ العقلاء و نزہت الفضلاء' میں واقعہ درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یحیٰی بن خالد برمکی کے دربار میں ایک سندھی شاعر نے ایک قصیدہ پڑھا ، جس کے چند الفاظ کچھ اس طرح تھے :

اره مره ککره ، کی کره منده

یحیٰی نے مترجم کو قصیدہ کا مفہوم بیان کرنے کا حکم دیا ۔ مترجم نے اس کا عربی ترجمہ کیا جس کا اردو ترجمہ یہ ہے :

ہمارے ہاں جب بھی نیکی اور اخلاق کا ذکر چھڑتا ہے ،
تو آپ کی مثال دی جاتی ہے

یہ ترجمہ سن کر یحیٰی نے اس سندھی شاعر کو ایک ہزار دینار انعام دینے کا حکم صادر کیا[2] ۔ اس سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ برمکیوں کے زمانۂ عروج میں (۵۴ ء سے ۸۰۲ء تک) سندھی زبان میں اچھے خاصے شعر کہے جاتے تھے ۔ اسی سلسلہ میں ایک شہادت بزرگ بن شہر یار کی تصنیف 'عجائب الہند' سے بھی ملتی ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ ۲۸۳ء میں منصورہ کے عرب عامل عبداللہ ہباری کے پاس سندھ کے کسی راجا نے یہ پیغام بھیجا کہ میں مذہبِ اسلام کے احکامات و عقائد جاننا چاہتا ہوں ۔ اگر کوئی عالم ان کا ترجمہ

Bhambore-Department of Archeaology Second Edition 1963-P-29. (۱)

(۲) روضۃ العقلاء و نزہت الفضلاء ، ص ۲۱۴ (مطبوعہ مصر ۱۹۵۵ء) مجمل التواریخ و القصص ص ۳۴۳ ۔ مطبوعہ ایران اس کے برعکس مشہور سیاح ابن نور الدین انمکی اپنی کتاب 'نزہتہ الجلیس' (جلد اول ص ۳۵۰) میں لکھتا ہے کہ یہ شعر حضرت بلال نے رسول اکرمؐ کی نعت میں ، حبشی زبان میں کہا تھا اور یہی شعر اس نے دمشق میں حضرت بلال کے مرقد پر لکھا ہوا دیکھا تھا ۔

دیسی زبان میں کر دے تو ان کو سمجھنے میں آسانی ہو گی ۔ عبداللہ بہاری کے حکم پر ایک عالم نے ، جو اصل میں کسی عراقی خاندان سے تھا اور شاعر بھی تھا ، تمام ضروری عقائد کا منظوم ترجمہ کردیا ۔ اس شاعر نے یہ بھی بتایا کہ راجا کی فرمائش ہی پر اس نے قرآن حکیم کا بھی مکمل ترجمہ کر دیا تھا اور راجہ نے انعام کے طور پر اسے 'چھ سو من' سونا عنایت کیا تھا' ۔ ان شواہد سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ عربی دور میں سندھی زبان میں نظم اور نثر دونوں کی تخلیق ہوتی تھی ۔ مگر اس دور کی کوئی تصنیف اب تک دستیاب نہیں ہو سکی ۔ اس صورتِ حال کے کئی اسباب ہیں ۔ اہلِ سندھ کے فکر و ادراک پر عربی فتوحات نے دو متضاد مگر بہت ہی واضح اثرات پیدا کیے تھے ۔ مفتوح ہونے کا احساس اور ایک نئے اور بہتر مذہب کے رابطۂ اخلاق کو اپنانے کے مواقع ۔ کسی قوم کے لیے یہ دونوں انقلابات شدید قسم کے ہوتے ہیں ۔ اور ان انقلابات و تغیّرات کا ردِّ عمل یہ بھی ہوتا ہے کہ ادبی ، تمدنی اور ثقافتی زندگی پر ایک عرصے تک جمود و تعطّل چھا جاتا ہے ۔ جو کچھ ادب تخلیق ہوتا ہے ، حالات کی ناسازگاری کے سبب اسے چھپانے کی شعوری کوشش کی جاتی ہے ۔ عربی عہد کے ابتدائی دور میں سندھ میں یقیناً یہ ردِّ عمل پیدا ہوا ہوگا ۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس دور کی درباری یا حکومت کی زبان عربی تھی اور سندھی تصنیفات کی وہ اہمیت باقی نہ رہ سکی ، جو مقامی حکمرانوں کے زمانہ میں ہو سکتی تھی ۔ تیسری اہم وجہ مگر بہت دیر کے بعد نادر شاہ اور دوسرے حملہ آوروں کی وہ قتل و غارت‌گری ہے جو انہوں نے سندھ میں مچا رکھی تھی ۔ نادر شاہ نے نور محمد کلہوڑا کے دورِ حکومت میں قتل و خون کے ایسے دریا بہائے کہ شاعروں نے "سند کربلا شد" ایسے فقروں سے اس سانحہ کی تاریخ کہی ہے ۔ نادر شاہ جہاں اور تباہی و بربادی کا مرتکب ہوا ، وہاں اس نے نور محمد کے شاہی کتب خانہ کو بھی تلف کر دیا ۔ اس کتب خانہ میں بے شمار مخطوطات و مسودات تھے ، جو نذرِ آتش ہو گئے ۔ ان میں نامعلوم کتنے بیش بہا اور نادر مخطوطے تھے ، جو سندھ بلکہ پورے برصغیر کی قدیم تاریخ کے آئینہ دار تھے ۔ یہ ہیں چند اسباب ، جن کی وجہ سے عربی دور سے متعلق کوئی تصنیف نہیں ملتی ۔

عربوں نے سندھ پر تقریباً ساڑھے تین سو سال حکمرانی کی اور اس دور میں دونوں قوموں کا ایک دوسرے پر گہرا معاشرتی اور ثقافتی اثر ہوا ۔ 'چچ نامہ' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم نے سندھ کے ہر آباد علاقہ میں عربوں کی بستیاں قائم کیں

---

(۲) بزرگ بن شہریار، عجائب‌الہند، ص ۴۴ ۔ (مطبوعہ لیڈن) نیز ملاحظہ ہو
پیر حسام‌الدین راشدی کا مضمون "منصورہ کی تاریخ کا ایک باب" سہ ماہی مہران ۱۹۶۱ء جلد اول ص ۱۰۳

عربوں نے دو بڑے شہروں محفوظہ اور منصورہ کو آباد کیا ۔ عرب مستقل طور پر یہاں آباد ہوتے گئے ۔ عربوں اور سندھیوں میں باہم رشتہ داریاں ہونے لگیں ۔ بنو اُمیہ کے مشہور جرنیل مہلّب کے دو بیٹوں مفضّل اور عبدالملک کی ماں بھی سندھی تھیں اور ان کا نام ' بھلی" تھا[1] ۔ بنو اُمیہ کے آخری سپہ سالار یزید بن عمر بن ہبیرۃ الغزاری کی ماں بھی سندھی تھیں اور اپنے دور کی حسین ترین عورتوں میں شمار ہوتی تھیں ۔ اسی سندھی النسل ہونے کی وجہ سے عربی کے مشہور سندھی شاعر ابو عطا نے اس کے قتل پر ایک مرثیہ کہا جو عربی ادب میں مستقل حیثیت رکھتا ہے[2] ۔

سندھی تہذیب کئی قدیم تمدنوں کے سنگم سے بنی تھی ۔ اس تہذیب پر ایک ترقی یافتہ مذہب یعنی اسلام نے سونے پر سہاگہ کا سا کام کیا، چنانچہ ایک صحتمند معاشرہ جنم لینے لگا ۔ اس نئے معاشرے ، اس نئے سنگم نے سندھ کو مستقبل میں تصوّف جیسے بلند اخلاقی نظام کا مسکن بنایا ۔ عرب دور میں عراق ، شام اور دیگر عرب ممالک سے کئی علمی خاندان ہجرت کر کے سندھ میں آئے اور انہی خاندانوں کے کئی افراد نے سندھ میں دینی ، ثقافتی اور تمدنی خدمات انجام دیں ۔ اسی طرح سندھ سے بھی کئی خاندان اور افراد عرب ممالک میں جا بسے اور انہوں نے حدیث و فقہ اور شعر و علم میں شہرت اور داد حاصل کی ۔

ان مشہور و معروف شعرائے کرام کے علاوہ ، تاریخ کے عظیم راوی ابو معشر بھی سندھی النسل تھے ۔ فرخ السندھی ، ابوالفرج السندھی اور خداد السندھی نے عربی نثر میں نام پیدا کیا ۔ ان کے علاوہ دوسرے مشہور نام یہ بھی ہیں :

احمد بن ابوبکر الزاہد السندھی البغدادی ، احمد بن السندھی البغدادی ، احمد بن السندھی الرازی ، احمد بن قاسم ، احمد بن محمد ابن الحسین ابوالفوارس السندھی البصری ، ابراہیم بن السندھی بن شاہک ، ابراہیم بن عبدالسلام السندھی البغدادی ، محمد بن زیاد ابن الاعرابی السندھی الکوفی ، مکحول بن عبداللہ السندھی ، منصور بن محمد السندھی الصبہانی ، ابوجعفر السندھی وغیرہ[3] ۔

ان اہلِ علم کے علاوہ سندھ کے اور ہنر مند لوگ مثلاً صرّاف ، سکہ ساز ، باورچی ، خزانچی اور دیگر کاریگر عرب ممالک میں پھیل گئے ۔ ان ہنرمندوں کی مقبولیت کا اندازہ

---

(۱) دیوان فرزدق ص ۷۷ ۔ (مطبوعہ پیرس)
(۲) ابن قتیبہ ۔ کتاب المعارف ص ۲۸ ۔
(۳) تفصیل کے لیے دیکھئے ۔ سہ ماہی مہران ۔ جلد ۱۶ ۔ ۱۹۶۷ء میں مولانا حافظ محمد اسماعیل کا مضمون (ساتویں صدی ہجری) سے پہلے سندھی علماء (i) ۔ ص ۹۷ ۔

مشہور عرب مؤرخ جاحظ کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے " (عراق میں) جتنے صراف ہیں سب کے ہاں خزانچی خاص سندھی ہو گا ، یا کسی سندھی کا لڑکا ہو گا ، کیونکہ ان کو حساب کتاب اور صرّافی کے کاموں سے فطری مناسبت ہے ۔ پھر یہ ایماندار اور وفادار بھی ہوتے ہیں[1] " سندھ کے باورچیوں نے عربوں میں سندھی کھانوں اور دیگر اشیاء خوردنی کو رائج کیا ۔ سندھ کے پلاؤ کی قسمیں عرب دنیا میں "لمیویہ" اور "سہلبیہ" کے ناموں سے بہت مشہور ہوئیں[2] سندھ کے بنے ہوئے کپڑے ، جوتے ، ادویات ، عطریات ، عمامے ، تلواریں اور دیگر سامان عرب ممالک میں مقبول تھا ۔

ان ثقافتی اور تمدنی تعلقات کی وجہ سے سندھی اور عربی زبانیں بھی متاثر ہوئیں ۔ سندھی زبان پر عربی کا گہرا اثر پڑا ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ عربوں کی علمی نشاۃ ثانیہ میں سندھی زبان کا بھی حصہ ہے ۔ جب بغداد اور دمشق میں علم کی شمعیں روشن ہوئیں ، تو سندھ اور ہند کے کئی عالم فاضل لوگ خلفائے وقت تک رسائی پانے لگے ۔ ان کے علم سے عرب اتنے متاثر ہوئے کہ قلیل عرصے میں ان کی کئی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں ۔ جب عراق میں عباسی خلافت کا سورج طلوع ہوا ، تو سندھ سے کئی علماء بغداد پہنچنے لگے اور جب خلیفہ منصور عباسی کی علم پرستی کی شہرت سندھ تک پہنچی تو سنہ ۷۷۰ء/۱۵۴ھ میں سندھی عالموں کا ایک وفد بغداد پہنچا[3] ۔ اس وفد میں ہیئت اور ریاضی کا ایک فاضل پنڈت بھی شامل تھا ۔ اس پنڈت کے علم سے امیر المومنین اتنے متاثر ہوئے کہ ان کے حکم پر ایک عرب ریاضی دان ابراہیم فزاری نے اس کی کتاب کا عربی ترجمہ کیا اور اس کا نام "السند والہند" رکھا[4] ۔ ریاضی پر یہ کتاب ایک بنیادی کتاب تھی جس سے مستقبل کے عرب ریاضی دانوں نے استفادہ کیا ۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے علاج کے لیے سندھ سے چند وید طلب کیے اور وہ ان کے علاج اور طبی علم سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کے حکم پر سندھی ادویات پر کئی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں ۔ برمکیوں نے اس میدان میں ہمیشہ کے لیے تاریخ میں اپنا مقام حاصل کر لیا ۔ کیونکہ ان کی سرپرستی میں طب ، نجوم ، ہیئت اور ادب و اخلاق کی متعدد کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں[5] ۔ جاحظ ، ابن ندیم ، ابن ابی اصیبعہ ، یعقوبی اور دیگر عرب مؤرخین کے ہاں جن علماء ، اطباء ، ویدوں اور پنڈتوں

---

(۱) السودان علی البیضان جاحظ رسالۂ فخر ص ۸۱ (مطبوعہ مصر) ۔

(۲) محمد بن الکاتب البغدادی کتاب الطبیخ ۔ (مطبوعہ موصل ۱۹۳۴ء) ص ۳۱ ، ۳۲ ، ۱۵۰ ۔

(۳) عرب و ہند کے تعلقات ۔ ص ۱۲۵

(۴) Alberuni's India P. 208.

(۵) اسما اور الفاظ میں سے چند کا تفصیلی ذکر "عرب و ہند کے تعلقات" ص ۱۳۰ - ۱۳۲ پر بھی ملتا ہے ۔ عرب و ہند کے تعلقات ۔ ص ۱۲۵ ۔

کے نام ملتے ہیں اور جن کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں سے بیشتر نام سندھی ہیں۔ منکہ (سندھی مانک) ، بہلہ (سندھی بھلا) ، رابطلہ (سندھی رائبو) ، داہر ، ابن دھن (سندھی ڈلہ) وغیرہ خالص سندھی نام ہیں۔ عربی علم و ادب پر ان تراجم کا اثر پڑا اور کئی سندھی اور ہندی النسل الفاظ اور اصطلاحات عربی زبان میں مستعمل ہوئیں۔ مثلاً:

عربی شکل	معنی	اصل سندھی لفظ
بارجہ ۔ جمع بوارج	(کشتی)	بیڑی یا بیڑا
دولیج ، جمع دوالیج	(کشتی)	ڈونڈی
مسک	(مشک)	مشک
لیلوفر	۔	لیزوپھر
بیلج	۔	ولیلہ
انبج	آم	انب
لیموں	۔	لیموں
قسط	۔	کُٹ

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عربی پر یہ اثر اتنا ہمہ گیر نہیں معلوم ہوتا ۔ اس کے برعکس عربی زبان اور ادب کا سندھی زبان اور ادبیات پر گہرا اثر پڑا ہے ۔ عربی کے بے شمار الفاظ سندھی زبان کا سرمایہ بن گئے اور چند الفاظ تو زبان میں اس طرح ضم ہو گئے ہیں کہ سرسری طور پر انہیں پہچاننا بھی مشکل ہے ۔ مذہبی الفاظ مثلاً اللہ ، رسول ، ایمان ، شریعت ، صدقہ ، حج ، زکوٰۃ ، درود ، کلمہ وغیرہ کے رائج ہونے کے علاوہ زبان کی تمدنی کیفیت بدلنے لگی ۔ سنسکرت اصل کے تمدنی الفاظ و اصطلاحات کے بجائے ہم معنی عربی الفاظ بولے اور لکھے جانے لگے ۔ مروت ، ضیافت ، شجاعت عصبیت ، عادات و اطوار ، اعمال ، تعلیم ، تہذیب و اخلاق ، عقل ، عمل ، ورثہ ، رسوم وغیرہ جیسے تخیلات کے تمام متعلقہ الفاظ زبان کا حصہ بن گئے ۔ اولاً ایسے الفاظ دیسی الفاظ کے ساتھ مروج ہونے لگے ۔ لیکن رفتہ رفتہ دیسی الفاظ متروک ہوتے گئے ۔ اس کیفیت کا اثر سندھی صرف و نحو پر بھی پڑا اور کئی نحوی اجزائے ترکیبی زبان میں ضم ہو کر رہ گئے ۔ مثلاً بالکل ، یعنی ، البتہ ، تمام ، فقط ، متجملہ ، یا وغیرہ جیسے نحوی اجزا ہم معنی سندھی الفاظ کے شانہ بشانہ رائج ہو گئے ۔ لسانی طور پر چند افعال بھی زبان کا حصہ بن گئے ۔ دفنائن (دفن کرنا) ، لعنن (لعنت کرنا) ، ضربن (ضرب لگانا) ، ترکن (ترکہ کرنا) وغیرہ عربی مصادر سندھی مصدری صورت میں استعمال

ہونے لگے - سندھی ادب پر عربی ادب کا جو اثر پڑا ہے ، اس کا کوئی یقینی ثبوت نہیں ملتا - لیکن اس کے بعد جب فارسی سندھ کی درباری زبان بنی ، تو اس کے توسّط سے عربی شعر کی بحور ، اوزان ، ہیئتیں ، صنائع و بدائع ، تلمیحات اور دیگر اصنافِ سخن سندھی زبان میں رائج ہو گئیں اور خالص سندھی اصنافِ سخن کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی رہیں - قصیدہ ، مرثیہ ، مسدس ، مخمس ، رباعی ، قطعہ اور دیگر عربی اصنافِ سخن سندھی ادب پر عربی ادبیات کا گہرا اثر ثابت کرتی ہیں - عربی زباّن کا سندھی علم و ادب پر گہرے اثر کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ عربی دور کے ختم ہو جانے کے باوجود سندھی ، عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگی - اور جب انگریزوں نے سندھی کے کئی مقامی رسم الخطوط میں سے کسی ایک خط کے انتخاب کے لیے ایک کمیشن بٹھایا تو لسانی اور تمدنی بنیادوں پر عربی رسم الخط کو سندھی زبان کے لیے موزوں ترین قرار دیا گیا - چند حروف کے اضافے کے ساتھ یہی خط موجودہ دور میں بھی قائم ہے -

باب اول

فصل دوم : سومرہ عہد

۱۰۵۰ء تا ۱۳۵۰ء

(۱)۔ عربی حکومت کا خاتمہ اور سومروں کا عروج

عرب حاکموں نے سندھ میں ۱۰۲۵ء (۴۱۶ھ) تک حکومت کی ۔ عربی حکومت کا خاتمہ محمود غزنوی کے ہاتھوں ہوا ، جس نے ۱۰۱۰ء (۴۰۱ھ) میں ملتان پر قبضہ کر کے اسماعیلی حکومت ختم کر دی[1] ۔ اسی طرح ۱۰۲۵ء (۴۱۶ھ) میں سومنات کو فتح کرنے کے بعد اس نے سندھ میں آ کر اسمعیلیوں کے مرکز منصورہ[2] پر قبضہ کیا اور سندھ اور ملتان میں غزنوی حکومت کی بنیاد ڈالی ۔ غزنوی گھرانے کے دسویں حکمران عزالدولہ سلطان عبدالرشید کو (۱۰۵۰ء - ۱۰۵۳ء) کمزور دیکھ کر سومرہ "تھرڑی" میں جمع ہوئے اور ابن سومرہ راجپال کو اپنا سردار مقرر کیا[3] ۔ اس طرح سندھ میں سومروں کی حکومت کی ابتدا ہوئی (۱۰۵۰ء) ۔

سومروں نے کل تین سو سال حکومت کی ۔ اس دور میں سلطان شہاب الدین غوری نے ۱۱۸۲ء (۵۷۸ھ) میں اچہ اور ملتان کے خطے فتح کیے ۔ ۱۲۱۰ء میں ناصر الدین قباچہ نے اور ۱۲۲۳ء (۶۲۰ھ) میں خوارزم شاہ نے لاڑ (زیرین سندھ) میں ٹھٹھ اور اس کے آس پاس کے گاؤں فتح کیے ۔ ان واقعات کے باوجود سومروں نے اپنا تسلط قائم رکھا اور تین سو سال تک برسراقتدار رہے ۔ سومروں کے نامور حکمرانوں[4] میں دودا اول ، سنگھار بن دودا ، سنگھار کی بہن تاری ، ہیمو (سنگھار کی بیوی) دودا ثانی پھل طور ، دودا سوم ، طائی ، چنیسر ، دودا چہارم (علاءالدین کا غیرت مند حریف) اومرو، بھومرو اور ہمیر کے نام قابل ذکر ہیں ۔

---

(۱) علی شیر قانع ، تحفۃ الکرام، ص ۹۰ ، سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۷ء ،
(۲) ایضاً
(۳) میر معصوم : تاریخ معصومی ص ۹۸ ، سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد ۱۹۵۳ء ۔
(۴) علی شیر قانع ، تحفۃ الکرام ، ص ۹۶، ۹۷ ، سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۷ء

سومروں کے آخری دور میں (۱۳۵۱ء) سمہ قوم طاقت پکڑ چکی تھی اور ادھر سومروں کی اخلاقی حالت پست ہو چکی تھی ۔ انار سومرو کے مظالم سے لوگ تنگ آ چکے تھے[1] ۔ سمہ قوم نے ایک جگہ جمع ہو کر "جام اُنڑ" (م - ۱۳۵۱ء) کو اپنا سردار منتخب کیا اور ۱۳۵۱ء میں سومروں کو شکست دے کر اپنا راج قائم کیا ۔ اس طرح سومرہ حکومت کا خاتمہ ہوا ۔

۲۔ عربی زبان کے مقابلے میں سندھی زبان کا رواج اور زبان و ادب کا نشو و نما

عربی زبان سندھ میں عرب فاتحین کے ساتھ داخل ہوئی اور دیر تک حکومت اور مذہب کی زبان رہی ۔ مگر عوام کے روزمرہ کے کام کاج اور سماجی تعلقات کا ذریعہ سندھی زبان ہی تھی ۔ عرب سیاحوں کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سندھی روزمرہ کی زبان تھی[2] اور وہ اس وقت بھی مختلف رسم الخطوں میں لکھی جاتی تھی[3] ۔ بھنبھور کی کھدائی میں مٹی کے برتنوں[4] پر جو عبارت تحریر ہے اور جسے پڑھ لیا گیا ہے ، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس وقت تک سندھی زبان تحریر میں آ چکی تھی ۔ اس زبان کا رسم الخط لوہانکا اور اردھ ناگدھی معلوم ہوتا ہے ۔ بڑے بڑے شہروں میں جیسے الور ، منصورہ اور دیبل میں دونوں زبانیں یعنی عربی اور سندھی بولی جاتی تھیں ۔ لیکن دیہاتوں کے رہنے والوں کے روزمرہ کے استعمال میں مقامی زبان سندھی ہی تھی ۔ اسی وجہ سے سندھ میں عربی زبان کی جڑیں مضبوط نہ ہو سکیں اور عربی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی عربی زبان کا رواج بھی ختم ہو گیا اور اس کی جگہ فارسی زبان نے لے لی ۔

(الف) سندھی زبان کی نشو و نما

یہ ایک حقیقت ہے کہ فاتح قوم کی زبان ، تہذیب اور رسم و رواج کا اثر مفتوح

---

(۱) میر معصوم ' تاریخ معصومی ص ۹۸ - سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۳ء

(۲) اصطخری ، مسالک الممالک اردو ترجمہ جلد اول ص ۵۷ ، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۰ء اور دیکھئے بشاری مقدسی ' احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم اردو ترجمہ ص ۳۳۱ ، ۳۳۸ اور دیکھئے ۔

ELLOTT, H.M., "History of India", Vol. I, Trubnes & Co., London, 1867, P. 39.

(۳) ابن ندیم ، الفہرست اردو ترجمہ ، جلد دوم ، ص ۴۷۳

Also see, Edward, C. Sachau Dr., "Alberuni's India, "Vol : 1, Kegan Paul and Trubner & Co., London, 1914, P. 173

4. Khan, F.A., "Bhambhore Excavations", Department of Archaeology, Govt., of Pakistan, Karachi, 1960, pp.11 & 12, Figure Nos. 10, 11 & 12.

قوم کی زبان پر ضرور ہو جاتا ہے ۔ ۷۱۲ء میں سندھ پر عربوں کے قبضے کے بعد عربی زبان کا اثر تمام سندھ میں پھیلنے لگا ۔ سندھ میں رہنے والوں کے لیے عربی ، اسلامی تہذیب اور قرآن کی زبان تھی ۔ چنانچہ عام گفتگو اور مذہبی جلسوں میں عربی کے نئے الفاظ استعمال ہونے لگے۔ جس سے سندھی زبان کی صورت بدل گئی ۔ انتظامیہ ، سیا سیات ، حدیث ، فقہ اور دوسرے اسلامی علوم و فنون کے کافی الفاظ سندھ کے علماء اپنی زبان میں استعمال کرنے لگے ۔ مثلاً قاضی ، غازی ، شہید ، مجاہد ، کفر ، اسلام ، ذکر ، مومن ، ملک ، مسجد ، کفن ، ایمان ، کوثر ، ملائک ، موت ، شیطان ، حج ، نفس ، حمد ، والی اور ملت وغیرہ ۔ اسی طرح سندھی زبان کے الفاظ بھی عربی میں داخل ہو گئے[۱] ۔ مثلاً بلنج (پلنگ) ، صندل (چندن) ، کافور (کپور) ، ہندول (ہندول) ، بارجہ (پیری) ، شیت (چیت) فوطہ (پٹ) وغیرہ ۔

(ب) سندھی ادب کا نشو و نما

عرب سیاحوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے لوگ نجوم ، منطق ، ریاضی اور طب میں مہارت رکھتے تھے ۔ عباسی خلفا[۲] کے زمانے میں سندھ کے علماء کو علمیت دکھانے کا موقع ملا ۔ ان کی علمی قابلیت کا اہم ثبوت یہ ہے کہ 'پنچ تنتر' کا عربی زبان میں 'کلیلہ دمنہ' کے نام سے ترجمہ کیا گیا ۔ خلیفہ منصور کے زمانے میں (۷۷۰ء) میں سنسکرت کی کتاب 'ستنت' کا عربی میں ترجمہ ہوا ۔ اسی طرح خلیفہ ہارون الرشید (حکومت ۷۸۶-۸۰۸ء) نے اپنے علاج کے لیے سندھ سے وید مانک ، نکا ، بہلو اور صالح بلائے ۔ جنہوں نے عربوں کے سامنے اپنی علمیت اور دانشمندی کا ثبوت پیش کیا[۳] ۔ سندھ کی علمی فضیلت کے بارے میں جاحظ[۴] (۸۶۴ء) ، یعقوبی[۵] (۹۰۰ء) ، بشاری مقدسی[۶] (۹۸۵ء) اور قاضی صاعد[۷] اندلسی (۱۰۷۰ء) کے

(۱) بزرگ بن شہر یار ' 'عجائب الہند' اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۰۲ ۔ اور دیکھیے سید سلیمان ندوی ' 'عرب و ہند کے تعلقات' ص ۱۳۰ ، ہندوستانی اکیڈمی ۲۹-۱۹۲۸ء ۔

(۲) Edward, C, Sachau, Dr., 'Alberuni's India,' Vol. I, Kegan Paul, Trubner & Co., London, 1910, Introduction Page XXXI.

(۳) ایضاً -IBID-

(۴) جاحظ ' 'رسالہ فخر السودان علی البیضان' ' اردو ترجمہ 'ہندوستان عربوں کی نظر میں' جلد اول ، ص ۱۰۴ ، دار المصنفین اعظم گڑھ ، ۱۹۶۰ء

(۵) یعقوبی ' تاریخ یعقوبی' جلد اول ، ص ۱۰۴ ، اردو ترجمہ ۔

(۶) بشاری مقدسی ' احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم' اردو ترجمہ ص ۳۸۰ ، ۳۸۴ ، ۳۸۵ ۔

(۷) قاضی صاعد اندلسی ' طبقات الامم ۔ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۔

خیالات مطالعہ کیے جا سکتے ہیں ۔

سندھ میں عربی حکومت کی ابتدا کے بعد علم و ادب کی ترقی میں حاکموں نے بھی حصہ لیا ۔ بہت سے محدث ، مؤرخ اور شعراء پیدا ہوئے ۔ اور سندھی نسل کے علماء اور فضلاء ابوالعطا سندھی[1] ، ابومعش سندھی اور ابوخلم[2] منصوری نے عربی علوم میں شہرت حاصل کی ۔ ادہر عربی نسل کے اہل علم البیرونی ۔ قاضی محمد بن ابی الشوراب علی بن محمد ابی الشوراب (۸۹۶ء)[3] ، مطیع بن ایاس[4] ، آبوالعباس احمد بن صالح التمیمی المنصوری[5] نے سندھی زبان کا مطالعہ بھی کیا ۔ عبداللہ بن عمر ہباری کے زمانے میں ۸۸۳ء (۲۷۰ھ) میں ایک سندھی عرب عالم نے قرآن پاک کا سندھی میں ترجمہ کیا[6] ۔

۳۔ ادبی ذخیرہ

سومروں کے دور میں (۱۰۵۱ء - ۱۳۵۱ء) مرکزیت اور سیاسی استحکام کے سبب سندھ کے لوگوں کا رجحان موسیقی ، شعر و شاعری اور رزمیہ داستانوں کی طرف ہوا ۔ ایسی محفلوں کے روح رواں چارن ، بہاٹ اور جاجک ہوتے تھے جو گجرات ، سندھ اور راجستھان میں آتے جاتے تھے[7] ۔

سومروں کا دور سندھی ادب کے نشو و ارتقاء کے لیے نمایاں حیثیت رکھتا ہے ۔ اس سے پہلے عبداللہ بن عمر ہباری کے زمانے (۸۸۳-۸۹۲ء) میں ، سندھی نثر کی موجودگی کے تاریخی شواہد ملتے[8] ہیں ۔ لیکن سومروں کا دور سندھی ادب کا رومانوی دور تھا ۔ اس دور کی ادبی روایات نے آنے والے دور کے لیے بنیاد کا کام دیا ۔ ماروی ، لیلیٰ ، مومل ، سسّی اسی دور کی یادگار ہیں ۔ ماروی کی حب الوطنی ، لیلا کی خودداری ، سسّی کی مستقل مزاجی ، مومل کی دانائی ، ہوش مندی اور مردانگی نے سندھی ادب کی

---

(۱) ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ' نتف من شعر ابی عطاء السندھی ، لجنة احیا الادب السندھی ، حیدر آباد ۱۹۶۱ء ۔

(۲) مخدوم امیر احمد' مقالہ ، سندھی علماء اور ان کی عربی تصنیفات' سہ ماہی مہران ۳-۴، ۱۹۶۶ء

(۳) ابن اثیر ' الکامل ، جلد ۷ ، ص ۳۳۴ ۔

(۴) مولائی شیدائی ' جنت السندھ ، ص ۱۷۳ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۸ء ۔

(۵) عبدالکریم ابن محمد سمعانی ' کتاب الانساب باب منصورہ یسین ، ص ۳۴۳ ۱۹۱۲ء ۔

(۶) جھمٹ مل بھاو نانی ' ڈھولا مارو ، ہندوستانی ساھیتہ مالا ، ص ۷۷ ، بمبئی ۱۹۵۶ء ۔

(۷) بزرگ بن شہر یار ' عجائب الهند اردو ترجمہ ، جلد دوم ، ص ۱۹۳ ۔

(۸) حسام الدین شاہ راشدی ' مقالہ منصورہ کی تاریخ کا ایک باب ، سہ ماہی مہران ، جلد اول ۱۹۶۱ء ' ص ۱۰۴ ۔

بنیادوں کو مضبوط کیا اور سندھی ادب کی تاریخ میں ایسے ابواب کا اضافہ کیا جو ولولہ ، امنگ ، جوش اور جذبہ کے نقوش سے مزین ہیں ۔

سومرہ دور کے ادبی ذخیرہ کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت شمار کیا جاتا ہے ۔

(الف) عشقیہ داستانیں

(ب) نیم عشقیہ داستانیں

(ج) مذہبی تحریریں اور گنیے (گنان)

(د) رزمیہ قصے

(ح) مدحیہ قصے

(و) گیت (گیچ)

(الف) عشقیہ داستانیں

دودا ، سومرہ اور علاء الدین کی لڑائی (۱۳۱۳ء)[1] میں دودا ، تنگر اور دوسرے سومروں کی ، مردانگی اور استقلال کے علاوہ چنیسر کی وطن فروشی اور وطن دشمنی کے واقعات کو بھاٹوں نے کہانیوں کے روپ میں پیش کیا اور جگہ جگہ سرداروں کے درباروں میں گایا ۔

دودا اور چنیسر کی رزمیہ داستانوں کے علاوہ تاریخ طاہری (۱۷۰۰ء) سے ظاہر ہوتا ہے کہ سومرہ دور میں بہت سے عشقیہ قصے وجود میں آئے ۔ غالباً گجرات ، راجھستان اور مکران کے ساتھ سندھ کے سرحدی میل جول کی وجہ سے بھی کئی عشقیہ واقعات رونما ہوئے ، جنہوں نے اپنی خاص خصوصیات کی وجہ سے آگے چل کر ادبی حیثیت اختیار کر لی ۔ اس دور میں جو عشقیہ اور رومانوی واقعات ہوئے ہیں وہ یہ ہیں :

سوہنی مہینوال ، سسی پنوں ، عمر ماروی ، لیلا چنیسر اور مومل رانو ۔ جس طرح دودا چنیسر کا واقعہ بھاٹوں نے کہانی کے روپ میں ڈھال دیا تھا اور اس کو پیش کرتے وقت کہیں کہیں خاص سروں میں گاہیں گا کر سننے والوں کو متوجہ کرتے تھے ، اسی طرح مذکورہ بالا عشقیہ داستانیں بھی سومرہ دور میں صرف زبانی ہی "سگھڑوں" کو یاد تھیں اور وہ محفلوں میں اپنے خاص انداز میں لوگوں کو سناتے تھے ۔ سومرہ دور میں ان کہانیوں کے ضبط تحریر میں آنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ۔

دراصل یہ کہانیاں پہلی دفعہ "سمہ" دور میں (۱۳۵۱ء-۱۵۲۱ء) منظوم ہوئیں ۔

---

(۱) رائے چند ، تاریخ ریگستان ، ص ۶-۶۹ ۔ سندھی ادبی بورڈ ۔ ۱۹۵۳ء ۔

اس ضمن میں سب سے پہلی مثال قطب عالم شیخ عبدالجلیل چوہڑ شاہ م ۱۵۰۴ء کے دربار میں گائے ہوئے سندھی سورٹھے کی ملتی ہے جس میں 'سوہنی مہینوال' کے عشقیہ قصے کو منظوم کیا گیا ہے۔

اسی طرح سمہ دور میں سید علی شیرازی (م - ۱۵۲۲ء) ایک بزرگ نے 'سسی پنوں' ، کی عشقیہ داستان کو منظوم کیا تھا۔ چار سال بعد مخدوم احمد بھٹی کی وفات (۱۵۲۹ء) کے فوراً ہی بعد سنار لڑکے نے جو شعر پڑھے تھے ان میں 'موکھی اور متاروں' کے رومانوی قصے کو سندھی میں منظوم کیا گیا ہے۔

سمہ دور کے بعد ارغون اور ترخان دور میں (۱۵۲۱-۱۵۵۵ء) شاہ کریم بلڑائی نے (۱۵۳۸ء - ۱۶۲۳ء) جو شاہ عبداللطیف بھٹائی کے پردادا تھے، 'عمر ماروی' کی داستان کو پہلی دفعہ سندھی میں منظوم کیا۔

چنانچہ سومرہ دور کی عشقیہ داستانوں (منظوم رومانیں) کو سمہ اور اس کے بعد ارغون اور ترخان ادوار میں قلمبند کیا گیا اور بہت دیر تک یہی قصے سندھی شاعری کے موضوع بنے رہے۔ اس وقت کے شعراء نے خود کو عاشق اور اللہ تعالیٰ کو معشوق تصور کیا۔ ان داستانوں کو تمثیل کے طور پر پیش کر کے اپنے دلی جذبات کو سندھی اشعار میں پیش کیا۔

دراصل سندھ کی منظوم رومانیں وہاں کے لوک ادب کا سرمایہ ہیں اور لوک ادب بڑی دیر کے بعد تحریر میں آتا ہے۔ چنانچہ یہ بہت مدت تک بھاٹوں کے ذریعے عوام و خواص تک پہنچتی رہیں۔ اس لیے واقعات کو ہر لوک شاعر نے اپنے تخیل اور فکر کی مدد سے بہتر سے بہتر اور حقیقت سے قریب تر لانے کی کوشش کی ہے۔ اور اسی کوشش ہیں واقعات ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے ہیں۔ غالباً ان واقعات کے اختلافات کا سبب علاقے اور معاشرے کی جدا گانہ خصوصیات ہوں۔ مثلاً 'سسّی پنوں' کی یہ منظوم رومان سندھی کے علاوہ پنجابی ، پشتو ، فارسی اور اردو میں بھی آج تک مروّج و مقبول ہے۔ ذیل کی سطور سے واضح ہو گا کہ مختلف شعراء ایک ہی قصے میں جزوی اختلافات لائے ہیں مگر نفس قصہ اور اس کی رومانی روح برقرار رہتی ہے۔

سسّی پنوں

'سسّی پنوں' میں سب سے پہلا واقعہ سسّی کی پیدائش سے متعلق ہے کہ کہیں سسّی ایک نائینا کی لڑکی ہے (از شیخ ایاز - سسّی پنوں) تو کہیں یہ راجہ کی بیٹی (از سید ہاشم شاہ 'ککارے' ، مرتبہ فقیر محمد فقیر - ص ۵۶) اور کہیں یہ برہمن کے

گھر پیدا ہوتی ہے۔ (یہ روایت سندھ میں مروّج ہے) ۔

۲۔ دوسرا اختلاف اس دھوبی کے متعلق ہے جو سسّی کو دریا سے نکالتا ہے اور پرورش کرتا ہے ۔ اس کا نام کہیں محمد ہے (سسّی پنوں از شیخ ایاز) تو کہیں عطا (از منشی جوت پرکاش) اور پنجابی زبان کے ایک منظوم قصہ میں اتا بھی لکھا ہے (سید ہاشم شاہ ، مرتبہ فقیر محمد فقیر ۔ ککارے ص ۶۰ پنجابی قصے فارسی زبان میں از شہباز اور فرخ بخش)

۳۔ تیسرا اختلاف یہ ہے کہ سسّی کو پنوں کا پتہ کیسے لگتا ہے ۔ کہیں وہ پنوں کو خواب میں دیکھتی ہے (از منشی جوت پرکاش) اور کہیں پنوں تاجروں کے ایک قافلہ کے ساتھ بھنبھور آتا ہے ۔ اور یہاں دونوں کی ملاقات ہوتی ہے (سسّی پنوں از شیخ ایاز) ۔ تیسری جگہ یوں درج ہے کہ پنوں کے شہر کے کچھ لوگ قافلے کی صورت میں بھنبھور پہنچتے ہیں اور سسّی انہیں دیکھ کر پہچان لیتی ہے کہ یہ وہی قافلہ ہے جو اسے خواب میں نظر آیا تھا ۔ سسّی ان کو قید کر لیتی ہے اور پنوں ان کو چھڑانے آتا ہے ۔ اس طرح سسّی اور پنوں ایک دوسرے سے ملتے ہیں (یہ (روایت سندھ میں مروّج ہے) اور پھر ایک شاعر نے اسی واقعہ کو یوں بھی نظم کیا ہے کہ سسّی کسی طور پنوں کی تصویر پاتی ہے اور اس کو دیکھ کر اس پر غائبانہ عاشق ہو جاتی ہے اور اس کی تلاش میں مشغول ہو جاتی ہے (سید ہاشم شاہ مرتبہ فقیر محمد فقیر ، 'ککارے' ۔ ص ۶۲) اور (پھر فرخ بخش پنجابی قصے فارسی زبان میں ص ۴۴)۔

عمر ماروی

عمر ماروی کے ایک حصہ میں جب ماروی ، شاہ عمر کی تحویل میں آ جاتی ہے اور عمر اس کو ہر طرح کا لالچ دیتا ہے، لیکن ماروی ہر لالچ کو ٹھکرا دیتی ہے ۔ بالآخر عمر ، ماروی کو باعزت اس کے وطن پہنچا دیتا ہے (یہ روایت سندھ میں مروّج ہے) اسی واقعہ کو دوسری جگہ پر یوں بیان کیا گیا ہے کہ کھیت (کھیٹ) ، ماروی کی تلاش میں فقیرانہ بھیس بدل کر محل تک پہنچتا ہے ۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر نامہ و پیام کی تدبیر سوچتے ہیں ۔ کھیت نواح میں ایک بزرگ کی خانقاہ کے قریب ڈیرا لگا لیتا ہے ۔ منصوبہ کے مطابق ماروی زیارت کے ارادے سے خانقاہ پہنچتی ہے اور کھیت تیز رفتار اونٹ پر ماروی کو سوار کر کے لے بھاگتا ہے ۔ (عمر ماروی از سید علی ملتانی ۔ 'چناب سے پدما تک' ۔ عوامی کہانیاں ۔ ص ۱۴۹) ۔

مومل رانو

مومل رانو میں صرف ایک چھوٹا سا اختلاف ہے کہ مومل اپنی بہن کو ایک جگہ تو خود شرارت سے اپنے پاس مردانہ لباس پہنا کر سلا لیتی ہے (یہ روایت سندھ میں مرّوج ہے) تو دوسری جگہ بہن خود شرارتاً ایسا کرتی ہے (مومل رانو از اللہ بخش عقیلی "چناب سے پدما تک،، ص - ۱۴۰)

سسّی پنوں

یہ داستان سندھ کے قدیم شہر بھنبھور[1] (ضلع ٹھٹہ) سے تعلق رکھتی ہے - سسّی ایک برہمن کے گھر میں پیدا ہوئی مگر ایک مسلمان دھوبی کے گھر میں پلی اور جوان ہو کر ایک بلوچ امیر زادہ پر عاشق ہوئی، جس کا نام پنوں تھا - مگر یہ عشق ناکام ثابت ہوا اور سسّی نے اپنے عشقِ صادق کو اپنی جان دے کر ثابت کر دیا - یہ قصہ سندھ اور پنجاب میں بہت سے شاعروں نے نظم کیا ہے -

یہ داستان مذہبی اور معاشرتی رسوم و رواج کی نمائندگی کرتی ہے - سسّی کو والدین نے محض اسی جرم کی پاداش میں ندی میں بہا دیا کہ اس کے نصیب میں ایک مسلمان سے نکاح تھا[2] -

سندھ کے شعراء نے اس قصے کو تمثیل کے طور پر بھی پیش کیا ہے - سسّی سے مراد طالب ہے اور پنوں سے مراد مطلوب یعنی خدائے تعالیٰ ہے - بھنبھور یہ جہان ہے مطلوب طالب کے دل میں محبت کی آگ لگا کر چلا جاتا ہے - عاشق دنیا کی نعمتوں کو ٹھکرا کر محبوب کی تلاش میں نکلتے ہیں - ہر قسم کی تکلیف کو ہمت اور مردانگی سے برداشت کرتے ہیں اور آخر محبوب سے ملاقات ہوتی ہے - سندھ کے اکثر ادیب اپنے پڑھنے یا سننے والوں کو یہ درس دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمیشہ عزم و ہمت سے کام لینا چاہیے -

عمر ماروی[3]

ماروی نگر پارکر کے نزدیک "بھالوا" میں چرواہوں کے گھر میں پیدا ہوئی - اس کی

---

(۱) بھنبھور میں آثار قدیمہ کی تازہ ترین کھدائی ہوئی - یہ آردابیچی اسٹیشن سے دو میل کے فاصلے پر ہیں -

(۲) آج بھی سسی پنوں کی ایک قبر لسبیلہ ضلع میں "ہبوئی" ناکہ کے قریب دیکھی جا سکتی ہے -

(۳) میر علی شیر قانع ' تحفۃ الکرام - ص ۱۰۰ - ۲۰۵ ، اس داستان کا سن ۱۳۵۱ء کے قریب ہے -

منگنی ''کھیٹ'' نامی ایک شخص سے ہو چکی تھی ۔ یہ بات کھیٹ کے رقیب ''پھوگ'' کو ناگوار گذری ۔ اس نے انتقاماً اس وقت کے بادشاہ عمر کو ماروی کے حاصل کرنے کی ترغیب دی ۔ عمر اسے زبردستی اٹھا لایا ۔ اور عمر کوٹ لے گیا جہاں اسے قید کر دیا ۔ عمر نے ماروی کو ہر طرح کا لالچ دیا لیکن ماروی نے ہر لالچ کو ٹھکرا دیا ۔ بالآخر عمر نے ماروی کو باعزت اس کے وطن پہنچا دیا ۔

بھالوا سے مراد عالم لی جاتی ہے اور ماروی سے مراد روح لی گئی ہے جس کو اس جہان میں لایا گیا ہے ۔ عمر کا قید خانہ یہ جہان ہے اور عمر سے مراد شیطان ہے ۔

لیلا چنسیر

یہ قصہ بھنبھور کے حاکم چنسیر داسڑے (حکومت تقریباً ۱۳۵۱ء) سے متعلق ہے[1] چنسیر ایک خوبصورت جوان حاکم تھا ۔ اس کی شہرت سن کر ''کچھ'' کے راجہ 'رائے کھنگار' کی بیٹی 'کنؤور' اپنی ماں کے ساتھ بھنبھور آئی[2] اور رانی لیلا کی نوکرانی بن گئی ۔ ایک دن لیلا نے کنؤرو کے پاس ایک نولکھا ہار دیکھا ۔ لیلا نے اس سے سودا کیا اور چنسیر کی خوابگاہ میں اپنی جگہ ایک رات سونے کی اجازت دے دی ۔ جب چنسیر کو علم ہوا تو بہت دکھ ہوا اور اس نے لیلا کو محل سے نکال دیا ۔ کچھ عرصے کے بعد وہ لیلا کے وطن گیا ۔ چنسیر کی آمد کی خوشی میں لیلا نے گھونگٹ نکال کر رقص کیا اور جان دے دی ۔ لیلا کو یوں جان دیتے دیکھ کر چنسیر نے بھی جان دے دی ۔

سندھی شاعری میں چنسیر سے مراد معشوق یعنی مالکِ حقیقی بھی لینے لگے ہیں اور لیلا سے مراد عاشق یعنی سالک ۔

مومل رانو

یہ قصہ سومروں کے آخری حکمران ہمیر سومرہ (۱۳۵۱ء) سے منسوب ہے[3] ۔ مومل نے اپنے والد راجہ نند کا کھویا ہوا خزانہ حاصل کرنے کے لیے جادو کا محل بنایا ۔ محل کے ارد گرد گھنا جنگل کھڑا کیا جس میں خونخوار جانور تھے ۔ سینکڑوں شہزادے مومل کو حاصل کرنے کے لیے آئے ، لیکن مومل کی کنیز ''ناتر'' کی چالاکی سے کوئی بھی محل تک نہ پہنچ سکا ۔ ہمیر سومرہ بھی کامیاب نہ ہو سکا ۔ بالآخر رانو نے مومل کے منتر کو توڑا اور اس کو حاصل کر لیا ۔ وہ ہر رات مومل کے پاس آتا تھا ۔ ایک

---

(۱) علی شیر قانع ' تحفۃ الکرام ص ۱۰۸ - ۱۱۲

(۲) علی شیر قانع ' تحفۃ الکرام ص ۱۰۸ - ۱۱۲

(۳) علی شیر قانع ' تحفۃ الکرام ص ۱۰۵ - ۱۰۸ -

رات رانو کے آنے میں دیر ہو گئی ۔ مومل نے اپنی بہن "سومل" کو مردانہ لباس پہنا کر اپنے ساتھ سلا لیا ۔ کچھ رات گئے رانو آ پہنچا ۔ مومل کے برابر ایک دوسرے مرد کو سویا ہوا دیکھ کر اپنی چھڑی نشانی کے طور پر چھوڑ کر واپس چلا گیا ۔ صبح مومل چھڑی دیکھ کر جان گئی کہ رانو ناراض ہو گیا ۔ وہ منانے کی خاطر گئی مگر نہ منا سکی ۔ دونوں نے ایک ساتھ جان دی ۔

رانو سے مراد خدا ہے ۔ مومل سے مراد سالک ہے ۔

(ب) نیم عشقیہ داستانیں

سندھ کی مشہور کلاسیکی عشقیہ داستانوں کے علاوہ نیم عشقیہ قصوں اور کہانیوں کا تعلق بھی مقامی روایت کے مطابق سومروں کی ابتدا اور عروج کے زمانے سے ہے ۔ نیم عشقیہ داستانیں یہ ہیں :

مل محمود اور سہر نگار ، ڈمن سنار ، خدا دوست اور محمود غزنوی

ان قصوں میں 'ڈمن سنار' کا قصہ سندھ کی ادبی تاریخ میں اہم ہے ۔

ڈمن سنار

راجہ دلورا کے وزیر اعظم کا نام ڈمن سنار تھا ۔ ایک دن کسی جوتشی نے راجہ سے کہا کہ تمہاری بیٹی کی شادی ڈمن سنار کے بیٹے سے ہو گی ۔ راجہ دلورا کو یہ بات ناگوار گزری ۔ اس نے ڈمن سنار کے پانچوں بیٹوں کو قتل کرا دیا اور ڈمن کو ملک بدر کر دیا ۔ جلا وطنی کے زمانے میں قدرت نے ڈمن کو دو بیٹے اور دے دیے ۔ قسمت کی بات ہے کہ ڈمن کے بیٹے دلورا کے شہر میں آئے ، جہاں کسی بہانے سے چھوٹے بھائی کی شہزادی سے ملاقات ہو گئی ۔ شہزادی اس پر عاشق ہو گئی ۔ راجہ کو جب پتہ چلا تو اس نے ڈمن کو اس کے بیٹوں کے ساتھ ایک ایسے کنویں میں پھینکنے کا فیصلہ کیا جس میں کیل اور بھالے ڈالے گئے تھے ۔ شہزادی نے یہ سن کر محل سے کنویں تک ایک سرنگ کھدوائی اور کیلیں وغیرہ نکلوا دیں ۔ بالآخر شہزادی (سوہائی) سے ڈمن کے چھوٹے بیٹے کی شادی ہو گئی ۔ اس قصہ سے چند "کافیں" منسوب ہیں ان میں سے دو کا ترجمہ مثال کے طور پر درج کیا جاتا ہے ۔

ترجمہ :

آگ کی لکڑی سے مسواک کا کام نہیں لیا جاتا ۔

---

(۱) ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ، سندھی بولی جی مختصر تاریخ ص ۶۱ ۔

سانپ کا گوشت نہیں کھایا جاتا
جہاں انسان کی جان کو تکلیف پہنچے
وہاں محبت نہ کی جائے۔

ترجمہ : بیدار ہو جاؤ، ہوش میں آؤ
ہوش سے کوڑیاں پھنکو،
کیونکہ پانچ تو پہلے ہی مارے گئے ہیں
یہ تو سوہائی کا سہاگ ہے !

(ج) رزمیہ قصے

سومروں کا زمانہ امن کا زمانہ تھا تاہم اس دور میں جو لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں تین خاص طور پر مشہور ہیں۔ سومروں اور گوجروں کی لڑائیاں۔ سومروں اور سلطان علاءالدین کی جنگ (۱۳۱۳ء)۔ ہمیر سومرہ اور جام ہالا اور ان کے بیٹوں کی لڑائیاں[1]۔

ان لڑائیوں کو اس وقت کے ''سگھڑ'' (بھاٹ)[2] سرداروں کے درباروں میں گاہوں کی صورت میں گاتے تھے۔ اس دور کی گاہوں میں رجزیہ اور قصیدہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ مذکورہ بالا لڑائیوں سے متعلق گاہوں میں رزمیہ مضمون کی فراوانی ہے۔ ان گاہوں میں جنگ کے ماحول و منظر کا عکس بہادروں کے حملے، ان کی بہادری کے کردار، دشمنوں کی بزدلانہ حرکات اور شور و شغل کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ مثلاً :

سومروں اور گوجروں کی لڑائیاں

یہ لڑائیاں ۱۱۵۱ء سے ۱۲۵۰ء میں ہوئیں۔ ان لڑائیوں سے جو گاہیں منسوب ہیں ان میں سے ایک کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے[3]۔

ترجمہ : لوٹوں سے پانی کو ختم نہیں کیا جا سکتا!
شاہی گھرانوں کے جو لوگ ہیں،
وہ طعنے برداشت نہیں کر سکتے !

---

(۱) ''سگھڑ'' راوی کو کہتے ہیں۔
(۲) ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، سندھی بولی جی مختصر تاریخ ص ۶۶۔
(۳) ایضاً ص ۶۳

اگر سومروں کی کنیز بھی گوجروں کو بیاہی گئی،
تو لوگ کہیں گے کہ یہ دودے کی بہن ہے!

دودا سومرا اور علاء الدین کی جنگ (۱۳۱۳ء)

سکھڑوں نے اس رزمیہ داستان میں سومروں کی بہادری کے ساتھ "ابڑے سمہ" کی شجاعت اور مردانگی کو بھی گایا ہے۔ "بھاگو بھان" نے اس لڑائی کے مناظر کو گاہوں میں پیش کیا ہے۔ اس لڑائی سے متعلقہ گاہوں میں سے ایک کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

ترجمہ : وہ جو ابڑا ہے وہ کبھی بھی بھاگ نہیں سکتا!
لیکن وہ ابڑا اس دیس میں نہیں ہے،
وہ کچھ کے پہاڑوں میں ہے۔

اسی طرح ہمیر سومرہ اور جام ہالا کی جنگ کے متعلق بھی گاہیں ملتی ہیں۔

(د) مدحیہ قصے

جنگی معرکوں کے بیانوں اور 'وید گاہوں'[1] کے علاوہ سومروں کے دور کے ادب میں سخی مردوں کی سخاوت کی تعریف اور سرکش و مغرور سرداروں کی شکایت میں بھی گاہیں ملتی ہیں۔ جن چارنوں[2] (بھاٹ وغیرہ) نے گاہیں بنائی ہیں ان میں "سمنگ چارن" (تقریباً ۱۰۵۰ء) کا نام سرفہرست ہے۔ سمنگ چارن کی دو گاہوں کا ترجمہ ذیل میں درج ہے :

ترجمہ : در پر آنے والے فقیر کو،
تو ہر شخص دے سکتا ہے۔
لیکن 'جام سپٹر' کی سخاوت کا عالم یہ ہے،
کہ وہ غربا کی جھونپڑیوں میں جاکر سخاوت کرتا ہے۔

---

۱ - وید گاہیں ، رزمیہ گاہیں۔
۲ - چارن ، جس طرح پنجاب میں میراسی اور راجستھان میں بھاٹ ہوتے ہیں اسی طرح سندھ، گجرات کاٹھیاوار میں چارن ہوتے ہیں۔

(۵) مذہبی تحریکیں اور گنٹیے[1]

سومروں کے دور میں اسلام کے جدا جدا فرقوں کے داعی سندھ میں پھیل گئے اور بدھ دھرم اور جین دھرم کے پرچاروں کی طرح نو مسلموں کو ان کی مقامی زبان میں اسلام کے اصول سمجھانے لگے۔ چونکہ سومرہ اسماعیلی تھے[2] اس لیے اسماعیلی مبلغوں کو اس دور میں تبلیغ کی سہولتیں حاصل تھیں۔ سومروں کی حکومت کی ابتداء کے اٹھارہ سال بعد (۱۰۷۹ء / ۴۶۲ھ) میں اسماعیلی عقیدہ کے اٹھارھویں امام سیدنا مستنصر باللہ کے فرمان کے مطابق سید نور الدین سندھ اور گجرات میں آئے۔ انہوں نے خود کو "سید سادات" اور ست گر نور (ست = سچا ، گر = مرشد) کے نام سے مشہور کیا[3]۔ اس بزرگ نے نو مسلم اسماعیلیوں کو اسلام کے اصول ، ویدانت اور تصوّف کے اصول ایک نئے طریقے سے سمجھائے۔ اس نئے طریقے کو انہوں نے "ست پنتھ" (سچی راہ) کہا۔ اس بزرگ نے مقامی زبانوں کو اپنا ذریعۂ تبلیغ بنایا۔ اس کے بعد اس کے سلسلۂ تبلیغ کو سومروں کے دور میں سید نور الدین پیر شمس سبزواری ملتانی (۱۰۶۵ء/۵۶۰ھ تا ۱۱۷۶ء/۶۷۵ھ) پیر شہاب الدین اور ان کے بیٹے پیر صدر الدین (۱۲۹۰ء/۶۸۹ھ تا ۱۴۰۹ء/۸۰۸ھ) نے جاری رکھا۔ ان سب پیروں کے مذہبی اور تبلیغی کلام کو گنٹیے (گنان) کہتے ہیں۔ ان کے کلام میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا ، صدق دل سے کلمہ پڑھنا ، جھوٹ کو ترک کرنا ، مایا سے من ہٹانا ، صاحب (امامِ وقت) سے محبت کرنا اور دنیا کو فانی سمجھنا جیسے مضمون اور موضوع بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً نور الدین کے کلام کا ترجمہ دیا جاتا ہے۔

ترجمہ : کلمہ پاک کے سوا جو شخص عبادت کرتا ہے ،
اس کی عبادت بے سود ہے۔
انسان فانی ہے اور اس دنیا سے ہر ایک کو جانا ہے۔
تمہیں ست پنتھی تب کہا جا سکتا ہے ،
جب تم ست پنتھ کی سادھنا کرو گے۔

پیر صدر الدین نے لوہانکا رسم الخط میں اصلاح کی اور اسے اپنے مریدوں میں پھیلایا۔ یہ رسم الخط آج بھی پیر صدر الدین کے مریدوں یعنی خواجہ جماعت میں

---

۱ - گنٹیے ، اسماعیلی پیروں کے صوفیانہ اور مذہبی کلام کو گنٹیے کہتے ہیں۔
۲ - ظفر ندوی ، تاریخ سندھ ، ص ۲۸۷ - اعظم گڑھ۔
۳ - علی محمد چنارا ، نور مبین اردو ، ص ۳۳۲ -

رائج ہے۔ اس کو خواجہ کا سندھی ''اکھر یا چالیھ اکھڑی'' (چالیس حرف) کہتے ہیں۔ یہ رسم الخط افریقہ، انڈیا، برما، ملایا، سیلون میں آج بھی سندھی کے نام سے مشہور ہے۔

ان سب پیروں کے کلام کی ہیئت ایک سی نہیں؛ پیر نور الدین اور پیر شمس الدین کے گنتیے کا ہر بند اشلوک[1] (دوہے) کی شکل میں ہے[2]۔ پیر صدر الدین کے گنتیے کی ہیئت ''کافی'' (سندھی کافی)[3] کی طرح ہے[4] ان میں مطلع ایک مصرعہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ مطلع کے ہر بند میں دوہے کی طرح دو مصرعے ہیں۔ ہر بند کے بعد مطلع دہرایا جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ترجمہ: اپنے دل میں دیوتا کی پوجا کیجیے۔
کیونکہ دل ہی میں دیوتا کا بسیرا ہے۔
رب دل میں آپ ہی بستا ہے،
اور اس کے درشن دل ہی میں ہو سکتے ہیں۔

★ ★ ★ ★

ست پنتھی وہ شخص ہے،
جو اپنا ست قائم رکھے۔
من بد نہ رکھے۔
ست پنتھی وہ شخص ہے
جو سچی بات کہتا ہے؛ اور
باقی ہر چیز کو رد سمجھتا ہے!

پیر شہاب الدین کے کلام کا ترجمہ

ترجمہ: اے بندے اپنے رب سے محبت رکھ،

۱۔ دوہا، دومصرع کا شعر۔ جس میں ہر مصرع کے آخر میں قافیہ آتا ہے۔ ہندی میں اس کو دوہا اور پنجابی میں دوہڑا کہتے ہیں۔
۲۔ ڈاکٹر موہن سنگھ، کافیاں شاہ حسین، ص ۶۷۔ شاہ حسین یادگار کمیٹی لاہور ۱۹۶۵ء،
۳۔ کافی، وہ صنف ہے جس کو پنجابی زبان میں کافی کہتے ہیں۔
۴۔ عبدالجبار جونیجو، مقالہ، قدیم سندھی شعر پر ایک نظر؛ رسالہ مزن ''مہو کھوڑی'' ص ۷۸ - ۷۹ - ۶۳ - ۱۹۶۴ء۔

موت سر پر کھڑی ہے ،
اپنا وقت بیکار ضائع نہ کر ۔
ایک تو وہ شخص ہے جو جاگتا ہے ،
اور ایک وہ شخص ہے جس کو نیند پیاری ہے ۔
اے غافل ! تو جاگ
اور جاگ کر اپنے شاہ کے ساتھ صحبت رکھ ۔

پیر صدر الدین کے کلام کا ترجمہ[1]

ترجمہ : اے ہوشیار شخص ہوش میں آ !
اور اچھے کام کر !
موت کے وقت اکیلا ہی جانا ہے ۔
ماں باپ یا کوئی بھی عزیز تیرا ساتھ نہیں دے گا !

★ ★ ★ ★

اگر سر کی قربانی دینی ہے تو رات کو جاگ ،
اپنا دل ذکر میں لگا ،
اس طرح رب تمہارے پاس آئے گا ۔

★ ★ ★ ★

رب کی نوازش اس پر ہوتی ہے ،
جو صبح جاگ کر عبادت کرتا ہے ۔
اے بندے تو ساری رات سوتا ہے ۔
اور اٹھ کر اپنے رب کی عبادت نہیں کرتا !

(ز) والعاتی دوھا

سومروں کے دور کی شاعری میں شاہ حسین اپلانی (پیر پٹھا ، وفات ۱۲۴۸ء مطابق ۶۴۶ھ) کا ایک بیت ملتا ہے ۔ شیخ پیر پٹھا بزرگ غوث بہاءالدین زکریا

---

۱ ۔ خواجہ غلام علی الانا ، حوالہ لیا گیا ہے ، ص ص ۱۵۲ ۔ ۱۵۵ ۔

ملتانی (م - ۱۲۶۲ء) کے ہم عصر اور مرید تھے ۔ ان کے منظوم بیت میں اس دور کے جغرافیہ اور تاریخ کا بیان ملتا ہے ۔ مذکورہ بیت میں دیبل بندر اور مکلی تک دریا کے سیلاب کے پانی کا ذکر ہے ۔ مثلاً

ترجمہ : دیبل کی طرف بے انداز پانی آیا،
مکلی کے مقام پر ہم الگ ہو گئے ۔

باب اول

فصل سوئم : سمہ عہد (۱۳۵۰ء - ۱۵۲۲ء)

(الف) سومروں کا زوال اور سمہ دور کا آغاز

سمہ سندھ کی ایک قدیم اور طاقت ور قوم ہے۔ سندھ میں اس قوم کے اقتدار کا تاریخی ثبوت اسلام کی آمد سے پہلے ملتا ہے۔ 'چچ نامہ' سے معلوم ہوتا ہے کہ چچ کے زمانے (حکومت کا سن ۶۳۲ء) میں رائے سیوراج دیبل کا حکم تھا۔ سومروں کے زوال کے زمانے میں یہ قوم سندھ کے زیرین خطے میں اچھی خاصی طاقت رکھتی تھی۔ سومروں کے آخری حکمران ہمیر سومرو کے زمانے (۱۳۵۱ء) میں سمہ قوم نے اکٹھے ہو کر جام انڑ (م - ۱۳۵۱ء) کو اپنا سردار' بنایا اور سمہ حکومت کی بنیاد ڈالی۔

سمہ خاندان کے کل اٹھارہ حاکموں نے سندھ پر حکومت کی۔ ان دنوں برصغیر میں تغلق خاندان حکومت کرتا تھا۔ اسی لیے دہلی سے اس حکومت کے مسئلوں میں مداخلت ہوتی رہی۔ بالآخر ۱۵۲۰ء/۹۲۶ھ میں شاہ بیگ ارغون نے سمہ حکومت کے آخری فرمانروا جام نیروز (۱۵۰۸ء - ۱۵۱۹ء) کو شکست دے کر سندھ کی آزاد حکومت کو ختم کیا اور ارغون خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

(ب) حکمرانوں کا علمی ذوق اور علم پروری

سمہ دور میں اسلامی علوم کو ترقی ہوئی۔ سومروں کے دورِ حکومت میں اسلامیات کی تعلیم مسجدوں میں دی جاتی تھی لیکن اس حکومت کے زمانے میں مدرسوں کے لیے الگ عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ ٹھٹہ میں مدرسوں کی تعداد یکے بعد دیگرے بڑھتی رہی اور پوری اسلامی دنیا کے لیے ٹھٹہ شہر نے ایک دارالعلوم کی حیثیت اختیار کر لی۔ ٹھٹہ کے علماء اور فضلاء کی عالمانہ شہرت کی وجہ سے خراسان اور ایران سے

---

(۱) حسام الدین راشدی ، مکلی نامہ ، ص ۱۰۳ -

بہت سے عالم و فاضل ٹھٹہ میں آ کر قیام پذیر ہوئے[1] ۔

سندھ میں علم پروری کا خاص سبب یہ بھی تھا کہ خود سمہ سرداروں نے بھی علوم و فنون کی قدر دانی کی اور علمائے کرام کی عزت افزائی اور حوصلہ افزائی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ۔ سمہ حاکم جام نندہ (م - ۱۵۰۸ء/۹۱۴ھ) کا بھائی جام بایزید خود بھی ایک بڑا عالم تھا ۔ اس کے دربار میں علماء و فضلاء بڑے عہدوں پر فائز تھے ۔ شیخ جمال الدین قریشی جو شیخ عالم قریشی کی اولاد میں سے تھا اور مختلف علوم و فنون کا ماہر تھا ، جام نندہ کا وزیر تھا ۔

جام بایزید کی علم پروری کی وجہ سے بہت سے عالم ٹھٹہ میں آ کر رہنے لگے ۔ ان میں سے مولانا فتح اللہ ، مولانا عزیز اللہ ، شیخ بہاءالدین قریشی اور مولانا ابراہیم جیسے جیّد عالم بھی تھے ۔ جام بایزید کا اپنا ایک بہت بڑا اور قیمتی کتب خانہ بھی تھا ، اور خود وہ ایک عالم ، فاضل اور علم پرور حاکم تھا ۔ قاضی قاضن (۱۴۶۵ء - ۱۵۵۱ء) ، سید مراد شاہ شیرازی (۱۴۲۲ء - ۱۴۸۲ء) اور سید علی شیرازی (۱۴۸۶ء - ۱۵۷۲ء) جیسے بزرگ علماء اس کے ہم عصر تھے ۔

سمہ دور میں سیوہن ، بکھر ، دریلہ ، ٹلٹی ، ہیرلو ، ہالا ، کنریسی ، نصیر پور ، اگھامانی اور دیگر شہروں میں اسلامی مدرسے کھل گئے ، جن میں قرآن شریف ، فقہ اور حدیث کی تعلیم دی جاتی تھی[2] ۔ سمہ حکمرانوں نے نہ صرف درس و تدریس میں دلچسپی لی بلکہ درسی کتب کے لکھوانے میں بھی اپنے شوق کا اظہار کیا ۔ اس دور کے مشہور علماء اور فضلاء میں سے چند یہ ہیں :

مخدوم بلاول (م - ۱۵۲۴ء)

سندھ میں وطن پرستی کے جذبے کا ثبوت سومروں کے دور ہی سے ملتا ہے ۔ مخدوم بلاول نے شاہ بیگ ارغون کی حکومت (۱۵۲۰ء - ۱۵۲۳ء) کے خلاف آواز بلند کی ۔ حکومتِ وقت نے انہیں طرح طرح سے رام کرنے کی کوشش کی مگر وہ تابع نہ ہوئے ۔ اسی لیے انہیں سخت سزا دی گئی (۱۵۲۴ء) ۔ مخدوم صاحب سمہ دور حکومت کے ایک بڑے عالم فاضل ، محدث اور تفسیر کے ماہر تھے[3] ۔ یہ ٹلٹی (ضلع دادو) کے رہنے والے تھے ۔ ان کے شاگردوں میں سے قاضی دتہ سیوہانی ایک مشہور عالم فاضل ہوئے ہیں ۔

قاضی قاضن (م - ۱۵۵۱ء)

---

(۱) مولائی شیدائی ، تاریخ تمدن سندھ ، ص ۴۱۳ - سندھ یونیورسٹی پبلیکیشنز ۱۹۵۹ء ،
(۲) ایضاً
(۳) ایضاً

سمہ دور کے ایک مشہور عالم و شاعر قاضی‌القضاۃ تھے۔ محمد مہدی جونپوری سے متاثر ہو کر مہدوی تحریک کے پیرو بنے ۔ انہوں نے ۱۵۵۱ء/۹۵۸ھ میں وفات پائی ۔

اسی طرح اس دور کے دوسرے عالموں کے نام یہ ہیں ۔ قاضی شیخ محمد اچھوی ، جعفری مہدوی ، مخدوم راہو ، مخدوم رشید الدین ، سید علی ثانی شیرازی (م - ۱۵۲۲ء) مولوی شیخ الیاس اور قاضی عبداللہ بن قاضی ابراہیم راہوتی ۔

ہمسایہ ملکوں سے تعلقات

(۱) گجرات اور کچھ سے تعلقات

گجرات ، کچھ اور کاٹھیاوار کے ساتھ سندھ کے تعلقات کافی پرانے ہیں ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ رائے گھرانے کی حکومت کے وقت سمہ قبیلے کے لوگ کاٹھیاوار کی طرف چلے گئے اور وہاں جا کر اپنا تسلّط قائم کر لیا ۔ اسی طرح محمد بن قاسم کی سندھ کی فتح کے وقت بہت سے سندھی لوہانے ، کچھ اور گجرات کی طرف چلے گئے[۱] ۔

سمہ گھرانے کی حکومت کے زمانے (۱۳۵۱ء - ۱۵۲۱ء) میں گجرات میں مظفریہ سلطانوں کی حکومت تھی ۔ اس دور میں سندھ اور گجرات کے تعلقات میں بہت اضافہ ہوا ۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ دونوں ملکوں کے حکمرانوں نے دہلی کی حکومت سے بے نیاز ہو کر اپنی آزاد حکومت قائم کرنے کی کوشش کی ، اسی لیے انہوں نے آپس میں دوستی کے ناطے قائم کیے[۲] ۔

سیاسی تعلقات کے علاوہ سمہ دور میں گجرات اور کچھ کے ساتھ سماجی رشتوں میں بھی اضافہ ہوا ۔ نہ صرف عام لوگوں کے باہمی تعلقات بڑھے بلکہ بادشاہوں نے بھی سماجی رشتے استوار کیے ۔ سمہ حکمران جام جونا اول (۱۳۹۰ء) نے مظفریہ سلطان سے شادی کے رشتے قائم کیے ۔ جام جونا کی دو بیٹیوں میں سے ایک گجرات کے حاکم محمد شاہ سے بیاہی گئی[۳] ۔ جس کے بطن سے ایک شہزادہ پیدا ہوا جس کا نام فتح خان رکھا گیا ، جو بعد میں ''محمود بیگڑہ'' (۱۵۱۱ء تک حکومت کی) کے لقب سے مشہور ہوا ۔ گرنار کے حاکم رائے دیاچ کے بیٹے ''نوگھن'' کی منہ بولی بہن جاسل

(۱) Thadhani, T. S., Article: The Lohanas, J. S. H. S., Vol: VIII, No. 3, January, 1948, P. 166.

(۲) رائے چند ، تاریخ ریگستان ، ص ۳۹ ، سندھی ادبی بورڈ ، ۱۹۵۶ء ۔

(۳) مولائی شیدائی ، جنت السندھ ، ص ۳۴۹ ۔

کی شادی سندھ میں ہوئی تھی[۱] اسی طرح ساموئی (ٹھٹہ) کے حاکم نے کچھ کے چاوڑا خاندان میں شادی کی[۲] - اسی طرح سندھ کے سمہ حکمرانوں نے گجرات کے با اثر صوفی بزرگان کی صاحبزادیوں سے شادیاں کیں -

(۲) راجستان سے تعلقات

کچھ اور گجرات کی طرح سندھ کے راجستھان سے بھی سیاسی تعلقات رہے ہیں - سندھ کے "سوڈھوں"[۳] "رانو"[۴] اور دیگر حکمران خاندانوں کے لوگوں نے راجستھان کے راجاؤں اور سرداروں سے رشتے جوڑے - امر کوٹ کے پرمار راجہ "سوڈھ" کی لڑکی سے ، لاروئی اور ہنگل کے یادونسی راجہ منڈم رائے کی شادی ہوئی تھی[۵] -

اسی طرح تھرپارکر کے سوڈھے خاندان کے سردار اپنی بیٹیاں کچھ ، مارواڑ اور جیسلمیر میں بیاہتے تھے[۶] -

(۳) لسبیلہ اور مکران سے تعلقات

'تحفۃ الکرام' میں بیان کیا گیا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں لسبیلہ اور مکران بھی رائے گھرانے کے حاکم رائے سہارس کے زیرِ نگین تھے - ساتویں صدی عیسوی میں چچ نے یہ علاقہ بدھ حکمرانوں سے حاصل کیا اور کرمان کی سرحد تک سندھ کی حکومت کی سرحدیں بڑھا دیں[۷] -

سمہ دورِ حکومت میں دوسرے خطوں کی طرح لسبیلہ اور مکران کی طرف بھی سندھ کا اثر بڑھ گیا - سومروں کے زوال کے بعد مکران ، "جھالاوانی"، اور "جدگالی"، خطوں نے سمہ خاندان کی حکومت کو تسلیم کیا - ڈاکٹر بلوچ لکھتے ہیں کہ لسبیلے میں رونجھا قبیلے کے عروج کے زمانے میں بہت سے سندھی قبیلے مغرب اور شمال مغرب کی طرف بلوچستان کے علاقے میں جاکر آباد ہوئے - ان کے اثر کی وجہ سے مکران

---

(۱) رائے چند ' تاریخ ریگستان ، ص ۳۹ -
(۲) رائے چند ' تاریخ ریگستان ، ص ۴۰ -
(۳) سوڈھے - ایک قوم ہے جو ضلع تھرپارکر (میر پور خاص) میں آباد ہے -
(۴) رانا - ایک قبیلہ ہے ، راجپوت ہیں ، ضلع تھرپارکر میں آباد ہیں -
(۵) John Wilson: "History of Suppression of Infantiute in western India" Bombay, 1855, pp. 167 & 168.
(۶) رائے چند ' تاریخ ریگستان ، ص ۸۰ -
(۷) میر علی شیر قانع ، تحفۃ الکرام ، ص ۹ ، ۱۵ سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد ، ۱۹۵۷ء

کے خطے میں جدگالی لہجہ روشناس ہوا ۔

(۴) بہاولپور اور ملتان سے تعلقات

سمہ خاندان کے دورِ حکومت میں بہاولپور اور ملتان سے سندھ کے تعلقات میں بھی اضافہ ہوا ۔ سمہ سردار صوفی درویش ، حضرت بہاءالدین زکریا رح ، کی درگاہ کے معتقد تھے ۔ روحانی تعلق کے علاوہ سمہ حاکم جام سکندر نے بہاولپور کا خطہ فتح کر کے سندھ کی حکومت سے ملا دیا تھا ۔ اس کے علاوہ شمس سبزواری ملتانی کے بہت سے اسماعیلی اور غیر اسماعیلی معتقدین سندھ میں رہتے تھے جن کا ملتان آنے جانے کا سلسلہ رہتا تھا ۔

حاصل کلام یہ کہ کچھ ، گجرات راجستھان ، کاٹھیاوار ، لسبیلہ ، بلوچستان ، مکران ملتان اور بہاولپور کے ساتھ سیاسی ، سماجی ، معاشرتی ، اقتصادی ، مذہبی اور روحانی میل جول کا اثر سندھ کی ثقافت ، تہذیب و تمدن ، رسم و رواج اور زبان پر ہوا ۔

(د) سندھی زبان کا عروج

(۱) ہمسایہ زبانوں سے میل جول

ماہرین کی رائے کے مطابق زبانوں کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی وجوہات، مندرجہ ذیل ہیں :

سیاسی حالتیں ، ایک ہی حکومت ، سماجی اور مذہبی حالتیں ، جغرافیائی حالتیں ، یکساں رسم و رواج ، باہمی شادیوں کا رواج اور میل جول ۔

سندھ اور اس کے ہمسایہ خطوں کی زبان میں تبدیلیاں اور یکسانیت کی وجوہات بھی یہی ہیں ، جو اوپر بیان کی گئی ہیں ۔ لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ زبان تھری اور لاڑی پر گجراتی اور کچھی زبانوں کا کس طرح اثر ہوا ۔ تھری زبان کے لہجہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تھر پارکر کی بولی گجراتی آمیز بن گئی ۔ یہی اثرات سندھی کے شمالی لہجہ میں اسموں سے واحد اور جمع (کت ۔ کتاں وغیرہ) بنانے کا طریقہ اس کا واضح ثبوت ہے ۔ اسی طرح حاکموں کی مادری زبان ہونے کی وجہ سے سندھی زبان کچھ ، کاٹھیاوار ، لسبیلہ ، گوادر اور جدگال کے علاقوں میں مادری زبان کی طرح استعمال ہونے لگی ۔

(۴) سندھی زبان کا لسانی جغرافیہ

اوپر بیان کردہ اصول اور وجوہات کے سبب سمہ خاندان کے دورِ حکومت میں سندھی زبان، کچھ، کاٹھیاوار، گجرات، بلوچستان، بہاولپور، لسبیلہ، مکران اور قلات کی سرحد تک پھیل گئی۔ زبان کی یہ وسعت اور پھیلاؤ ''آئسو گلاسز'' کی مدد سے یعنی لسانی حد بندی کرنے والی لکیروں کے ذریعہ سے سیاسی حدوں کو رد کر کے قائم کی گئی ہیں۔ سندھی زبان کی لسانی حد بندی کے لیے آئسو گلاسز مشرق میں بھارت کی سیاسی حدیں پار کر کے کافی اندر کاٹھیاوار، ماناوادر، راج کوٹ اور جام نگر تک نشاندھی کرتی ہیں۔ اس وجہ سے لسانی جغرافیہ کے لحاظ سے ہر ماہر کچھ اور کاٹھیاوار خطوں کی زبان کو سندھی کی سرحد میں داخل کرے گا۔ بالکل اسی طرح شمال میں ملتان اور بہاولپور کے خطے مغرب اور شمال مغرب میں بلوچستان کے سبی، قلات اور بھاگناڑی خطے اور جنوب مغرب میں لسبیلہ اور مکران میں جدگال اور ماڑھ گوادر اور پسنی کے خطے بھی سندھی زبان کے سرحدی دائرۂ اثر میں داخل کیے جا سکتے ہیں۔

(۵) عربی اثرات کا زوال اور فارسی تصنیف و تالیف کا آغاز

سومروں کے دور کی ادبی تاریخ کے جائزے میں بیان کیا جا چکا ہے کہ عربی زبان کا رواج سومروں کے دور ہی میں ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ فارسی زبان نے دفتری اور سرکاری حیثیت حاصل کر لی تھی۔ لیکن حاکموں اور عوام کی روزمرہ کی زبان سندھی تھی۔ ڈاکٹر بلوچ لکھتے ہیں ''سمہ خاندان کے دورِ حکومت سے دو سو برس پہلے فارسی کا دخل شروع ہو چکا تھا کیونکہ صوبائی گورنروں کی دفتری زبان فارسی تھی''[1]۔ ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں کہ سمہ خاندان کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں ہمسایہ علاقے گجرات اور ملتان، دہلی کے ماتحت تھے۔ وہاں کے گورنر سندھ کے سیاسی انقلابات کو غور سے دیکھتے رہتے تھے۔ ملتان کے گورنر عین الملک ماہرو نے سمہ خاندان کے حکمران جام بابینا کو تنبیہہ کی، انہوں نے سندھ کے چند سربراہوں اور با اثر شخصیتوں کو بھی خطوط لکھے۔ یہ خطوط فارسی زبان میں ہیں۔ سندھ میں یہ فارسی خط و کتابت سب سے قدیم شمار کی جاتی ہے[2]۔

اس کے بعد فارسی کا ایک کتبہ ملتا ہے جو سمہ حکومت کے ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ سمہ حکمران جام جونا، ملقب بہ سلطان فیروز شاہ نے اپنے دورِ

(۱) ڈاکٹر بلوچ، سندھی بولی کی مختصر تاریخ، ص ۸۵، ۱۹۶۲ء
(۲) ڈاکٹر بلوچ، بحوالہ انشائے ماہرو، ص ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۹۸، ۲۰۳۔

حکومت (۱۳۷۵ء - ۱۳۸۸ء/۷۷۷ھ - ۷۹۰ھ) میں "تھرڑا،، (گجو اور گھارو ضلع ٹھٹھ کے درمیان - قومی شاہراہ کے جنوب میں) کے شیخ حاجی ابوتراب (م - ۱۳۸۰ء) کے مزار کا گنبد بنوایا اور اس پر فارسی زبان میں مندرجہ ذیل کتبہ لگوایا - اس کتبہ کی ابتدا میں سلطان فیروز شاہ کا نام ، بمع آداب و القاب دیا ہوا ہے - اس کے بعد علاء الدین جام جونا کا نام درج ہے[1] - کتبہ پر جو الفاظ کندہ ہیں وہ یہ ہیں :

بعہد شہریار دہر سلطان داور دوران

شہ فیروز منصور و مظفّر در صف میدان

با مر سرفرازِ سندِ خاص حضرت عالی

کہ پاء قدر او اعلیٰ ز فرِ فرقد تابان

. . . . الخ

یہ کتبہ سمہ خاندان کے دورِ حکومت کا سب سے پرانا کتبہ ہے جو عربی کی بجائے فارسی میں لکھا گیا ہے - اس شاہی کتبے سے ثابت ہوتا ہے کہ سمہ دورِ حکومت کے ابتدائی زمانے سے دفتری کاروبار میں فارسی زبان استعمال ہونے لگی - اس دور سے متعلق چند فارسی شعراء کے نام بھی تاریخوں میں مذکور ہیں جن میں سے بعض قابلِ ذکر یہ ہیں :

جام جونا ، شیخ حماد جمالی (۱۴۳۸ء/۸۳۱ھ) ، شیخ عیسیٰ لنگوٹی (م - ۱۴۲۷ء) جام ندو اور مخدوم بلاول ۱۵۲۴ء[2] -

(و) سندھی ادب

عوام کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے سمہ حکمرانوں نے بڑی دریا دلی دکھائی - انعام کی امید پر 'چارنوں'[3] نے ان کی تعریف کی - چارنوں نے سمہ خاندان کے سرداروں اور بہادروں مثلاً 'جام لاکھا' ، 'جام جکھرا' ، 'اٹھا جکھرانی' ، 'ہنند (ہٹند)' ، 'تھدیانی' ، 'وکیوداتار' ، 'رائے ڈیاچ' ، 'جام ابڑا سمہ' اور دیگر سمہ سرداروں کی بہادری کے کارناموں کو مشہور کیا - ان چارنوں نے سومرہ دور کی عشقیہ داستانوں خصوصاً 'جام لاکھا اور مہروانی' ، 'جام اڈھا اور ہوتھل پری' ، 'جام جراڑ اور بوبنا' ، 'جام تماچی اور نوری' (۱۳۹۰ء - ۱۴۱۳ء) ، 'دولہ دریا خان اور ہموں'

(۱) ڈاکٹر بلوچ ، بحوالہ انشائے ماہرو ، ص ۸۷ -

(۲) Sadarangani, H.I., "Persian Poets of Sind" Sindhi Adabi Board, 1956, Introduction P.X.

(۳) بھاٹوں اور مراثیوں کی طرح ایک ذات ہے جو سمہ دربار میں حاضر رہتی تھی -

(دریا خان کی وفات ۱۵۰۹ء) کو ''گاہوں'' میں پیش کیا ۔ اس لحاظ سے اس دور کے روایتی ادبی ذخیرہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔

(۱) ادب کا روایتی ذخیرہ[1]

(الف) سمہ سرداروں کی صفت سیر گاہیں

سمہ سرداروں کی بہادری اور دریا دلی کی وجہ سے ان کو یاد کیا گیا ۔ جام لاکھا ، جو بہت بڑا بہادر اور سخی مرد تھا ، اس کو ایک گاتھا میں اس طرح یاد کیا گیا ہے ۔

ترجمہ : ایک قسم کے پھول وہ ہیں ،
جو کھیتوں میں نظر آتے ہیں ۔
اور دوسرے قسم کے پھول وہ ہیں
جو پہاڑ میں پک کر کھیل ہو جاتے ہیں
اے لاکھا ، اب مہران کی طرف واپس آ جاؤ ،
کیونکہ تمہارے بغیر ،
'کاچھڑے' کا خطہ سونا نظر آتا ہے ۔

اسی طرح اٹھا جھکرانی کی تعریف میں بہت سی گاتھائیں ملتی ہیں ۔ ''جام اڈھے'' کا بیٹا جاجکھرا ایک سخی آدمی تھا اس کی اولاد میں سے جام اٹھا بہادر اور سخی تھا ۔ جام اٹھا کی تعریف میں کئی گاتھائیں ہیں ۔ ایک گاتھا کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں :

ترجمہ : جام اونٹھے نے لوگوں کو
اس قدر مویشی خیرات کیے ، کہ
ان کے چلنے سے زمین کی گرد
بادلوں تک جا پہنچی ، اور
اس دھول میں سب راجاؤں کی سخا چھپ گئی!

اسی طرح ''ہنند تھدیانی'' کا نام بھی آتا ہے ۔ وہ جام ساہڑ کی اولاد میں سے تھا ۔ ہنند کی بہادری اور سخاوت بھی مشہور ہے ۔ اس کی یاد میں جو گاتھائیں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے :

(۱) روایتی ادب سے وہ ادب مراد ہے جو نقل و روایت کے ذریعہ خلفاً عن سلفٍ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا اور ضبط تحریر میں نہیں آیا ۔

ترجمہ :	ساڑہ جام کی پشت سے ہنند جام پیدا ہوا ،
جس کی والدہ نے اس کو ایسا دودھ پلا یا
کہ تمام سمہ حاکموں کا نسب روشن ہوا ۔

(ب) سمہ سرداروں کی عشقیہ داستانوں کے بارے میں گاتھالیں

اس دور میں بھی عشقیہ داستانیں ملتی ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل مشہور ہیں :

جام لاکھا اور سہر رانی ، جام اڈھا اور ہونہل پری ، جام تماچی اور نوری ، دولھ دریا خان اور ہموں ، جام جراڑ اور ہوہنا ، از راہِ اختصار ان داستانوں میں سے صرف ایک ہی کا تعارف کرایا جا سکتا ہے ۔

جام اڈھا اور ہوتھل پری

جام اڈھا ککر الہ پرگنے (موجودہ تعلقہ شاہ بندر ضلع ٹھٹہ) کے حاکم "جام موہر" کا چھوٹا بھائی تھا ۔ اس پر اس کی بھابی عاشق ہوگئی ۔ جس کی وجہ سے جام اڈھا اپنا دیس چھوڑ کر کچھ کی طرف چلا گیا ۔ جہاں ہوتھل پری سے اس کی محبت ہو گئی اور بالآخر دونوں کی شادی ہو گئی ۔ ہوتھل پری سے جام اڈھا کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ بیٹے کا نام "جکھرو" رکھا اور بیٹی کا نام "سکھر" ۔ اس داستان سے منسوب گاتھاؤں میں سے ایک گاتھا کا ترجمہ بطور نمونہ کے درج کیا جاتا ہے :

ترجمہ :	میں بھولنے کی بہت کوشش کرتی ہوں ،
لیکن میں اپنے محبوب کو نہیں بھول سکتی ،
اگر میں نر ہوتی تو میں تباہ حال ہو کر رہ جاتی !

(۲) مذہبی تحریکیں

سومروں کے بیان میں اسماعیلی تحریک اور اس کے داعیوں کے کلام کا ذکر کیا جا چکا ہے ۔ اس دور میں بھی اسماعیلی تبلیغ جاری رہی ۔ پیر صدرالدین نے اپنی زندگی کا نصف سے کچھ کم حصہ اسی دور میں گذارا ۔ اس کے علاوہ ان کے زیرِ نگرانی ان کے فرزندان ، اُچّہ ، ملتان ، ڈہنڈی ، تلہار ، بدین اور کچھ گجرات کی طرف تبلیغی کام پر مامور تھے ۔ پیر صدرالدین کی طرح ان کے صاحبزادے پیر حسن کبیر الدین (۱۳۴۲ء - ۱۵۱۳ء) اور پیر تاج الدین (م - ۱۳٦۷ء/۸۷۲ھ) کا کلام بھی سندھی ، ملتانی ، کچھی ، گجراتی اور ہندی میں ملتا ہے[1] ۔

---

(۱) علی محمد چنارا ، نور مبین ، بمبئی ، ص ۴۹۸ ، ۵۰۷ اور ۵۱۹ ۔

اس دور میں مہدوی تحریک نے سندھ کے بہت سے علما و فضلا کو متاثر کیا۔ جن میں ماضی قاضن، قاضی شیخ محمد اُچوی جعفری، جام نندا کا وزیر دریا خان (م۔ ۱۵۱۹ء) سان ابوبکر بکوری، پیر آسات، مولوی شیخ الیاس اور شیخ صدرالدین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس تحریک کی وجہ سے ایک ذہنی انقلاب ظہور پذیر ہوا۔

(۳) ماموئی فقیر اور ان کے ابیات[1]

ماموئی فقیروں کے ابیات سمہ گھرانے کے اوائل میں جام تماچی کے زمانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ فقیر "ہفت تن" کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ ان کے ابیات کو سندھ کے مؤرخین نے پیشین گوئیاں قرار دیا ہے۔ سندھ کی تاریخ، جغرافیہ اور ثقافت کے لحاظ سے ماموئی فقیروں کے ابیات خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان ابیات کی روشنی میں ہم سمہ گھرانے کے دورِ حکومت کی تاریخ اور جغرافیہ کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ نہ صرف ادبی لحاظ سے یہ ابیات اہم ہیں بلکہ ننگر، ہاکڑا، پران اور اروڑ وغیرہ کے نام سمہ دورِ حکومت کے جغرافیہ، اہم شہروں، دریاؤں اور ان کی شاخوں کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں، جو سندھی شاعری میں پہلی بار استعمال کیے گئے ہیں۔ ایک بیت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

ترجمہ: ہاکڑا دریا بڑی شان سے بہنے لگے گا،
اور اروڑ کے پاس سے دریا کا بند ٹوٹے گا،
بھی مچھلی سمہ حاکم کی طرف،
تحفے کے طور پر بھیجی جائے گی۔

سندھی ادب کا تحریری ذخیرہ[2]

اس دور میں بھی سندھی ادب کا تحریری ذخیرہ بکثرت ملتا ہے۔ کلام میں مضمون کی وسعت کی وجہ سے شاعری کا میدان وسیع ہوا۔ اسی لیے شعر میں صوفیانہ اور ناصحانہ مضامین کے علاوہ عاشقانہ خیالات کو بھی جگہ دی گئی۔ اس دور کے مشہور شعرا یہ ہیں۔

(۱) پیر حسن کبیر الدین: (۱۳۴۱ء - ۱۴۱۳ء)

---

(۱) ابیات: بیت کا جمع ہے۔ "بیت" سندھی شاعری کی ایک صنف ہے۔
(۲) تحریری ذخیرہ سے مراد وہ ادب ہے جو کتابی صورت میں محفوظ کر لیا گیا۔

آپ پیر صدرالدین کے بڑے فرزند تھے ۔ اپنے والد کی زیر نگرانی ملتان اور اُچّہ کی طرف اسمعیلی عقیدے کی تبلیغ کرتے تھے ۔ آپ کا مزار اُچّہ شریف میں ہے اور آپ حسن دریائی کے نام سے مشہور ہیں ۔ ''بیبی دونتی'' آپ کی بہن ہیں ۔ آپ کا کلام زیادہ تر ملتانی میں ملتا ہے ، لیکن سندھی کے لاڑی اور کچھی لہجوں میں بھی آپ نے شعر کہے ہیں[1]۔ نمونہ ملاحظہ ہو :

ترجمہ : اے غافل ہوشیار رہ !
تمہیں سونا نہیں چاہیے
اس اندھیری رات میں اپنے رب کو پہچانو ،
پیر حسن کبیرالدین رب سے عرض کرتا ہے ،
کہ اے رب ! اس بندہ پر اپنا فضل کر !

(۲) شیخ حماد جمالی (م ۔ ۱۴۳۸ء/۸۳۱ھ)

یہ بزرگ درویش ساموئی نزدیک ٹھٹہ کی ایک خانقاہ میں رہتے تھے۔ ان کے زمانے میں جام جونا نے سازش سے حاکم وقت جام تماچی سمہ کو گرفتار کرا کر دہلی بھجوا دیا ۔ اسی وجہ سے عوام جام جونا سے نفرت کرنے لگے اور جام تماچی کی آزادی کے متمنّی ہو گئے ۔ شیخ حماد درویش نے بھی جام کی آزادی اور دوبارہ تخت حاصل کرنے کی دعا اپنے اشعار میں مانگی ہے ۔ مثلاً :

ترجمہ : جام جونا کم عقل ہے ۔
اے جام تماچی آجاؤ ،
رب نے تم پر فضل کیا ہے ،
اور ٹھٹہ کے عوام تم سے خوش ہیں ۔

(۳) لوح ہوتھیانی

یہ درویش چودھویں صدی عیسوی (آٹھویں صدی ہجری) کے اواخر میں کھیر گاؤں (نزد ہالہ) سے دو میل شمال مشرق میں رہتے تھے ، جہاں ان کی درگاہ اب بھی موجود ہے ۔ جام تماچی اور ان کے صاحبزادے جام صلاح الدین نے آزاد ہونے کے بعد ٹھٹہ جاتے ہوئے راستے میں اس بزرگ سے دعا کی درخواست کی تھی ۔ درویش نے دعا کرتے ہوئے

(۱) علی محمد چنارا ، نور مبین بمبئی ص ۹۸م اور ۵۰۷ اور دیکھئے خواجہ غلام علی الانا ، مقالہ سومروں کے دور کی سندھی شاعری ، سہ ماہی مہران جلد ۹ ، نمبر ۱-۱۹۶۰ء ، ص ۱۴۹-

یہ شعر فرمایا[1]

ترجمہ : آپ جا کر جام جونا کو تباہ کریں،
اور جام تماچی کو تخت پر بٹھائیں ۔

(۴) پیر تاج الدین[2]

پیر صدرالدین کے صاحبزادے اور پیر حسن کبیر الدین کے بھائی تھے ۔ آپ ڈھنڈی، جون فتح باغ اور رزی کی طرف اسماعیلی خیالات کی تبلیغ کرتے رہے ۔ 'تحفۃ الکرام' میں دو بزرگوں (جام نظام الدین اور کرور) کا ذکر کیا ہے وہ انہی کے زمانے میں جماعت کے قائد تھے ۔ ان کا کلام کچھی اور سندھی میں ملتا ہے ۔ ملاحظہ فرمایئے[3] ۔

ترجمہ : مرشد سے وعدہ کر کے جن لوگوں نے،
وفا داری نہیں کی، ان سے تعلق نہیں رکھنا چاہیے ۔
مرشد نے بیالیس سروں میں چھتیس اقوال بتائے ہیں،
اور وہ ان کو نہیں سن سکتے ۔
اس اندھیری رات میں
مرشد کی چاند جیسی حیثیت ہے ۔
مرشد کے علوم سے فضا روشن ہو جاتی ہے !
پیر تاج الدین کہتا ہے کہ شاہ سے صحبت کرو،
اور اس صحبت کا پھل حاصل کرو ۔

(۵) پیر مراد شاہ (۱۴۲۷ء - ۱۴۸۷ء)

آپ کا تعلق شیراز کے سید گھرانے سے تھا ۔ آپ مشہور ولی تھے ۔

(۶) قطب عالم شیخ عبدالجلیل جوئلر (م - ۱۵۰۴ء/۹۱۵ھ)

یہ بزرگ ضلع رحیم یار خان (بہاولپور ڈویژن) کے قدیم شہر "موئے مبارک" کے ایک

(۱) سید عبدالقادر، حدیقۃالاولیاء، سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۶۷ء، مقدمہ، ص ۸۰ ۔
(۲) ایضاً
(۳) علی محمد چنارا، نور مبین، بمبئی، ص ۵۰۹ ۔

عظیم صوفی اور درویش تھے - آپ سلطان بہلول لودھی (۱۴۵۱ء سے ۱۴۸۹ء) کے داماد تھے - آپ کے دربار میں سماع کی محفلیں ہوا کرتی تھیں - جن میں سندھ کے خوش الحان گانے والے فارسی اور سندھی اشعار گاتے تھے -

مخدوم احمد بھٹی (م - ۱۵۲۹ء/۹۳۶ھ)

مخدوم صاحب ہالا کنڈی (ہالا ضلع حیدر آباد) کے ایک مشہور درویش اسحاق بھٹی کے بیٹے تھے - یہ ایک بہت بڑے بزرگ ہوئے ہیں - ایک دن سماع کی مجلس میں ایک سنار کے لڑکے نے ایک دوہا بہت سوز سے گایا - اس سے کلام سن کر مخدوم صاحب نے دم توڑ دیا - وہ دوہا یہ تھا[1] -

ترجمہ : وہ لوگ جو محبوب کی آواز سن کر
واپس نہیں آتے ،
وہ دوستی کا دعویٰ کیوں کرتے ہیں ؟

مخدوم صاحب کی وفات کے بعد سنار لڑکے نے فوراً یہ سورٹھا پڑھا[2] :

ترجمہ : تمہیں ہر صورت میں "کلاڑوں" سے
سودا کرنا چاہیے اور سودے میں ،
اپنا سر دے دینا چاہیے -
مرنے سے مت ڈرو ،
آج زہر کی قیمت کم ہو گئی ہے !

اسحاق آہنگر

گنجے ٹکر (نزد حیدر آباد) کے دامن میں ایک درویش شیخ بھریا ویر داس ایک بیت پڑھا کرتے تھے وہ کہا کرتے تھے کہ یہ بیت شیخ اسحاق آہنگر کی ہے - وہ بیت یہ ہے[3] :

ترجمہ : میں چڑا بن کے محبوب حجاج پر بیٹھ جاؤں ،
کاش وہ اپنی میٹھی زبان سے ،

---

(۱) لطف اللہ بدوی ، تذکرہ لطفی ، جلد اول ، ص ۱۱۹ - ۱۲۰ حیدرآباد ، ۱۹۶۳ء ،
(۲) ایضاً
(۳) ایضاً ص ۱۱۳ ، حسام الدین راشدی ، سلکی نامہ ، ص ۴۲ ، ۱۹۶۷ء

مجھے بھاگ جانے کے لیے اشارہ میں بات کرے !

(۹) سید علی شیرازی ثانی (م - ۱۵۲۲ء)

یہ سید مراد شاہ کے نواسے تھے اور سید علی شیرازی اول کے پوتے تھے - آپ کی ولادت ۱۴۸۶ء/۸۹۱ھ میں ہوئی - آپ نے اپنی عمر کے ابتدائی ۳۴ سال سمہ گھرانے کی حکومت میں گذارے - 'معارف الانوار' میں مندرجہ ذیل بیت آپ کے نام سے منسوب ہے[1] -

ترجمہ : سہیلیوں کو اپنے سکھ پیش نظر ہیں ،
وہ مجھے روک لینا چاہتی ہیں !

قاضی قاضن (۱۴۶۵ء - ۱۵۵۱/ ۸۷۰ھ - ۹۵۸ھ)

آپ سمہ دور حکومت کے ایک بہت عظیم عالم تھے - مہدوی تحریک سے آپ بہت متاثر تھے - سمہ گھرانے کی شکست ، دولہ دریا خاں کی شہادت (۱۵۱۹ء) اور شاہ ارغون کے مظالم انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے - آپ نے مدینہ منورہ میں وفات پائی - قاضی قاضن کے سات ابیات 'بیان العارفین' میں درج ہیں - آپ کی بزرگی اور علم و فضل کی گواہی آپ کے کلام سے ملتی ہے - قاضی صاحب ایک آزاد رو عالم تھے - آپ کا کلام حالانکہ بہت کم ہے ، لیکن اس زمانے کی شاعری کی حیثیت ، زبان ، مذہبی تحریک اور دیگر اثرات کی جھلک اس میں نمایاں ہے - قاضی صاحب پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مشہور عشقیہ داستانوں 'سسّی پنوں' ، 'سوہنی مہینوال' ، 'موڑرو میر بحر' کو کو نظم کیا[2] -

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :

ترجمہ : میں نیند میں سویا ہوا تھا ، اور
ایک جوگی نے آکر مجھے جگا دیا -
اس کے بعد میں محبوب کی طرف رجوع کرنے لگا -
میں نے 'کنز قدوری قافیا سے'
کچھ بھی نہیں پڑھا -
جس راستے سے میں نے محبوب کو پایا ،

---

(۱) لطف اللہ بدوی ، تذکرۂ لطفی ص ۶۹ ، نیز حسام الدین راشدی ، ملکی نامہ ص ۴۷ ، سندھی ادبی بورڈ ۱۹۶۷ - .

(۲) لطف اللہ بدوی ، تذکرۂ لطفی ، ص ۱۲۶ -

وہ راستہ کوئی اور ہے !

(۳) سمہ دور کی ادبی خصوصیات

اوپر دیے گئے ادبی جزئیات کے جائزہ سے سمہ دور کے ادب میں جو خصوصیات نظر آتی ہیں اور اس دور کا ادب جن سیاسی ، معاشرتی اور تاریخی حالات پر روشنی ڈالتا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں :

(۱) اس دور میں دہلی کے حکمرانوں کی شہنشاہیت کے سبب سندھ کے حکمرانوں میں بیرونی مداخلت سے آزادی کے جذبے کو تقویت پہنچتی ہے ۔ غیر سندھی حکومت کو شکوک کی نگاہوں سے دیکھا گیا ۔ مخدوم بلاول نے کولہو میں پس جانا اور مرنا قبول کیا لیکن غیر وطنی حکمرانوں کی غلامی قبول نہ کی ۔

(۲) اس دور میں اسلامی علوم و فنون نے بہت ترقی کی ۔

(۳) گجرات ، کچھ ، راجستان ، بہاولپور ، ملتان ، بلوچستان ، لس بیلہ اور مکران سے سندھ کے تعلقات بڑھے اور اس وجہ سے سندھی زبان ان خطوں میں بھی بولی جانے لگی ۔ اسی طرح کچھی ، گجراتی ، راجستھانی ، بلوچی اور ملتانی زبانوں ، تہذیب و تمدن اور لباس وغیرہ کا سندھ پر اثر ہوا ۔

(۴) عوام کے علاوہ حاکموں کی مادری زبان بھی سندھی تھی اس لیے سندھی زبان کو سیاسی استحکام حاصل ہوا اور اسے درباری زبان بننے کا شرف حاصل ہوا ۔

(۵) اس دور میں سمہ سرداروں کی سخاوت ، بہادری اور عشق و محبت کے قصے بیان ہونے لگے ۔ اس کے علاوہ درویشوں کی خانقاہیں اور صوفی بزرگوں کی سماع کی محفلیں اور مجلسیں بھی سندھی شاعری کے پھلنے اور پھولنے کے لیے مؤثر ذریعہ بنیں ۔

(۶) اس دور میں کافیں اور مذہبی گنیے کے علاوہ سندھی دوہے نے بھی ترقی کی ۔ ان کی ہیئت میں تبدیلی آ گئی اور سورٹھے[1] نے جنم لیا ۔ علاوہ ازیں دوہا سورٹھا میل[2] اور سورٹھا دوہا میل[3] میں بھی اپنے خیالات کا اظہار ہونے لگا ۔ اس

---

(۱) سورٹھا : دو مصرع کا شعر ہے ، دوہے کا الٹا روپ ہے جو مصرع کے درمیان میں ، یعنی پہلے مصرع کے دوسرے رکن اور دوسرے مصرعہ کے دوسرے رکن میں قافیہ آتا ہے ۔

(۲) دوہا : سورٹھا میل سندھی شاعری کی صنف ہے اس میں دو مصرعے ہوتے ہیں پہلے مصرعے کی ساخت دوہے کی طرح اور دوسرے مصرع کی ساخت سورٹھے کی طرح ہوتی ہے ۔

(۳) سورٹھا دوہا میل : یہ بھی سندھی شاعر کی ایک صنف ہے ۔ دوہا سورٹھا میل کا الٹا روپ ہے ۔

ترکیب نے سندھی بیت کو جنم دیا ۔

(۷) الف اشباع کا قافیہ پہلی بار اس دور میں کام آنے لگا ۔

(۸) صوفیانہ اور ناصحانہ مضامین کے علاوہ عاشقانہ مضامین کو بھی سندھی شاعری میں جگہ ملی ۔

(۹) نظم کے علاوہ نثر میں بھی سندھی سرداروں کی سخاوت اور بہادری کے قصے بیان ہونے لگے ۔

(۱۰) اس دور کی شاعری سے اس وقت کے سیاسی ماحول ، تاریخ ، جغرافیہ ، مذہبی تحریکوں ، دینی ، دنیوی اور روحانی تعلیم کے بارے میں اشارے ملتے ہیں ۔ مثلاً شیخ حماد اور نوح ہوتھیانی کے ابیات اور ماموئی فقیروں کی پیشین گوئیاں ہم عصر حکمرانوں اور ملکی حالات کا نقشہ پیش کرتی ہیں ۔ اس طرح ماموئی فقیروں کے ابیات "ہاکڑہ" پرانڑ (پران) دریاؤں ، ننگر ، اروڑ شہروں اور دیگر مقامات کے نام ، اس وقت کے دریاؤں ، نالوں اور مشہور شہروں کی جغرافیائی حالت کے علاوہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس وقت تجارتی بیڑے دوسرے ممالک سے مال لاتے تھے ۔

(۱۱) قاضی قاضن کے بیت کا یہ مصرعہ

لوکاں نحو صرف ، موں مطالع سپرین

ظاہر کرتا ہے کہ اس دور میں مدرسوں میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی تھی اور کیا کیا علوم پڑھائے جاتے تھے ۔

(۱۲) سندھی شاعری میں پہلی بار مشہور رومانوی داستانیں ، 'سسی پنوں' ، 'سوہنی مہینوال' ، 'موڑو میر بحر' اور 'گوکھی' بطور تمثیل پیش کی گئیں ۔ قاضی قاضن کے ابیات اور قطب عالم شیخ چوہڑ کا محفل سماع میں کہا ہوا بیت ، سنار لڑکے کا گایا ہوا دوہا اور سید علی ثانی شیرازی کے ابیات اس بات کے شاہد ہیں ۔ اسی لیے ان ابیات کو 'سرسسی ، سرسوہنی ، سرگھاتو اور سر موکھی' کے عنوان کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے ۔

(۱۳) اس دور کی شاعری میں دیہاتی زندگی اور ماحول کا عکس بھی نظر آتا ہے ۔ چھاج سے اناج کو صاف کرنا ، مچھلی اور دوسری چیزیں تحفے کے طور پر بھیجنا اور ایسی ہی دیگر باتیں دیہاتی رسم و رواج کی طرف اشارہ کرتی ہیں ۔

(۱۴) اس دور کی شاعری کی زبان خالص سندھی اور دیہاتی الفاظ و محاوروں سے پُر ہے
چھاج (چج) ، چڑا (جھرگ) ، بے (بیھ) پیچرو کے علاوہ چڑے کو بھگانے کے لیے
محبوب کا 'ڈھرک' کہنا اور ایسی ہی دیگر گھریلو اصطلاحات اس دور کی
زبان میں عام طور سے ملتی ہیں ۔ علاوہ ازیں اس دور کی شاعری میں صنعتوں کا
استعمال بھی عام ہے ۔

استعارے کے طور پر چڑا ، چھاج ، ہاتھی اور سیلھ (کانٹا) کو پیش کیا گیا ہے ۔
مجاز مرسل ، تجنیس خطّی ، تجنیس حرفی ، تجاہل عارفانہ اور دیگر صنعتوں کا بھی
عام استعمال ملتا ہے ۔

(۱۵) اس دور کی شاعری کی زبان گرامر کے لحاظ سے بھی دلچسپ ہے ۔ جاگایوس
(موں کی جاگایائیں) پر فعل کا استعمال آج کی زبان کے مطابق درست نہیں ہے ۔ اس
کے بجائے 'جاگایوم' کا استعمال آج کی گرامر کے لحاظ سے درست ہوگا ۔ اسی طرح
'یتوس' ، ، 'پڑہیوم' ، 'پؤولد' ، 'تیام' ، 'وریام' صورتوں کا استعمال صرف
لاڑی لہجے میں عام ہے ۔ سندھ کے معیاری لہجے میں 'یتوس' کے بجائے
'یتس' ، 'پڑہیوم' کے بجائے 'پڑہیم' ، اور 'گدوم' کے بجائے 'لدم' مروّج ہے ۔

(۱۶) لسانیاتی نقطۂ نظر سے اسحاق آہنگر کے بیت میں استعمال کیا ہوا لفظ 'کرن'
قابلِ توجہ ہے ۔ اس لفظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فعل کن (کن) میں 'ر' کا
تلفظ عام تھا یعنی 'کن' کے بجائے 'کرن' لفظ سے 'ر' بعد میں حذف کیا گیا
ہے ۔ اسی طرح ماموئی فقیروں کے ابیات میں سے ایک بیت میں اس کے
صیغہ کے الفاظ 'از جا' اور 'ویھجا' آج کل صرف لاڑی لہجہ میں مروّج ہیں ۔
معیاری لہجہ میں 'آز جا' اور 'ویھجا' کے بجائے 'از جو' اور 'ویھجو' الفاظ
عام ہیں ۔ بالکل اسی طرح 'پراٹا پراز' ، 'پچندی پند اروز' ، 'سیمی ویندا سو
کڑی' فقرے بھی گرامر اور لسانیات کے لحاظ سے قابل توجہ ہیں ۔

کتابیات

سندھی کتب

مصنف	نام کتب	پبلشر و سن
۱۔ مخدوم ، امیر احمد	مقالہ	سندھی علماء اور ان کی عربی تصنیفات سہ ماہی مہران نمبر ۳-۴ ، ۱۹۶۶ء ۔

۴۔ الانا ، خواجہ غلام علی — مقالہ، — سومروں کے دور کی سندھی شاعری، سہ ماہی مہران ، جلد ۹ ، نمبر ۱-۲ ، ۱۹۹۰ء ۔

۵۔ الانا ، خواجہ غلام علی — مقالہ — سندھی زبان و ادب ، ایڈیشن ۱۹۹۵ء سندھی صورتخطی

۶۔ رائچند — تاریخ ریگستان — سندھی ادبی بورڈ ، حیدرآباد ، سندھ ۱۹۵۶ء

۷۔ سومار شیخ — مقالہ، مرکھان شیخن ''راحت رسالہ'' تلہار ، سندھ ، اگست ۱۹۶۱ء ۔

۸۔ قانع ، علی شیر — تحفۃالکرام — سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد، سندھ ۱۹۵۰ء

۲۔ جھمٹ مل بھاولانی — ڈولا مارو — ہندوستانی ساہیتہ مالا ، بمبئی ۱۹۵۶ء ۔

راشدی ، حسام الدین — مقالہ — منصورہ کی تاریخ کا ایک باب ، سہ ماہی مہران جلد (۲) ، نمبر ۱ ، ۱۹۶۱ء ۔

۹۔ جولیجو ، عبدالجبار — مقالہ ،قدیم سندھی شعر پر ایک نظر۔ سوکھڑی ، سالانہ مخزن، شعبۂ سندھی ، سندھ یونیورسٹی - ۱۹۶۳-۶۴ء

۱۰۔میر معصوم بکھری — تاریخ معصومی — سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۳ء ۔

۱۱۔مولائی شیدائی — جنت السندھ — سندھی ادبی بورڈ ، حیدرآباد ۱۹۵۰ء ۔

۱۲۔ " " — تاریخ تمدن سندھ — سندھ یونیورسٹی پبلیکیشن، حیدرآباد ۱۹۵۹ء

۱۳۔ محمد خان غنی — مقالہ قدیم سندھی شاعری کے چند نادر نمونے ، سہ ماہی مہران ، نمبر ۴ ، ۱۹۶۲ء ۔

۱۴۔ محمد خان غنی — مقالہ سومنگ چارٹ ، سہ ماہی مہران نمبر ۴ ، ۱۹۶۶ء ۔

۱۵۔ بلوچ ، ڈاکٹر نبی بخش خان — سندھی بولی جی مختصر تاریخ — حیدرآباد ، سندھ ، ۱۹۵۲ء ۔

۱۶۔بدوی ، لطف اللہ — تذکرہ لطفی ، جلد اول حیدرآباد ۱۹۶۳ء ۔

اردو کتب

۱۷۔ ابن ندیم — الفہرست اردو ترجمہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ، ۱۹۶۰ء ۔ ہندوستان عربوں کی نظر میں جلد دوم ۔

۱۸۔ اصطخری — مسالک الممالک اردو ترجمہ، دارالمصنفین اعظم گڑھ ، ۱۹۶۰ء ۔ ہندوستان عربوں کی نظر میں جلد اول ۔

۱۹۔بشاری مقدسی — احسن التقاسیم فی معترفہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ، ۱۹۶۰ء ۔

۲۰-بزرگ بن شہر یار عجائب الہند دارالمصنفین اعظم گڑھ ، ۱۹۶۰ء-
۲۱-جاحظ رسالہ فخر السودان علی البیضان-دارالمصنفین اعظم گڑھ ، ۱۹۰۰ء
۲۲-ندوی ، سید سلیمان عرب و ہند کے تعلقات ہندوستانی اکیڈمی ، ۱۹۲۸-۲۹ء -
۲۳-ندوی ، ظفر تاریخ سندھ مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۴۶ء -
۲۴-چنارا ، علی محمد نور مبین بمبئی
۲۵-اندلسی ، قاضی صاعد طبقات الامم اردو ترجمہ
ہندوستان عربوں کی نظر میں جلد دوم ، ۱۹۶۰ء -
۲۶-زور محی الدین ہندوستانی لسانیات مکتبہ معین الادب ، اردو بازار لاہور ۱۹۰۱ء -
۲۷-یعقوبی تاریخ یعقوبی ، اردو ترجمہ
ہندوستان عربوں کی نظر میں ، جلد اول ، ۱۹۶۰ء -

پنجابی کتب

پبلشر و سن	نام کتب	مصنف
شاہ حسین یادگار کمیٹی ، لاہور ، ۱۹۶۵ء	کافیاں شاہ حسین	۲۸-ڈاکٹر موہن سنگھ

فارسی

۲۹-سید عبدالقادر حدیقۃ الاولیاء سندھی ادبی بورڈ ، ۱۹۶۷ء -
۳۰-راشدی ، حسام الدین مکلی نامہ سندھی ادبی بورڈ ، ۱۹۶۷ء -

31. Delacy O'Leary, "A Short History of Fatimid Khalifate" KeganPaul, Trubner & Co., London, 1923.
32. Elliot, H.M., "History of India", London, 1867.
33. Edward,C.,Sachau,Dr.,"Al-beruni's India", Kegan Paul Trubner & Co., London, 1910.
34. John Wilson, "History of the Suppression of Infanticite in Western India", Bombay, 1855.
35. Khan, F.A , "Bhombhore Excavations, "Department of Archaeology, Govt., of Pakistan, Karachi, 1960, PP. 11 & 12 and Figure No. 10,11 & 12.
36. Thadhani, T. S., Article : The Lohanas, Journal of the Sind His-

torical Society, Vol : VIII، No. 3, January, 1948.
36. Sadaran Gani, H.I., "Persian Poets of Sind", Sindi Adabi Board, Hyderabad, 1956.

عربی کتب

۳۸-سمعانی ، عبدالکریم بن محمد — کتاب الانساب ، لیڈن ، ۱۹۱۲ء۔
۳۹-بلوچ ، ڈاکٹر نبی بخش — نقف من شعر ابی عطاء السندی ، سندھی ادبی بورڈ ، ۱۹۶۱ء۔

باب دوم

(۱۵۲۶ء تا ۱۷۰۷ء)

فصل اول ارغون عہد : ۱۵۳۱ء تا ۱۵۵۴ء

۱ ۔ وسط ایشیا کا سیاسی بحران اور حکومتوں میں رد و بدل

امیر تیمور کی وفات کے ایک سو سال بعد اس کی قائم کی ہوئی شہنشاہیت پارہ پارہ ہوگئی ۔ سولھویں صدی میں دو بڑے فاتح ابھرے ۔ ایک اسماعیل صفوی دوسرا محمد خان شیبانی ۔ شاہ اسماعیل صفوی نے ایران میں صفوی سلطنت قائم کی اور محمد خان شیبانی نے ماوراالنہر میں اپنا اقتدار قائم کیا ۔ شاہ بیگ ارغون نے شیبانی سے صلح کی اور قندھار چھوڑ دیا[۱] ۔ اس کے بعد شیبانی اور اسماعیل میں مقابلہ ہوا ۔ تیموری شہزادے ازبکوں کی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکے اور کچھ مطیع ہو گئے اور کچھ بکھر گئے ۔ سلطان ظہیرالدین بابر فرغانہ چھوڑ کابل آ گیا اور ہندوستان کی فتح کی طرف متوجہ ہو گیا ۔ قندھار کا حاکم ذوالنون محمد خان شیبانی کے ہاتھوں مارا گیا ۔ اس کے بیٹے شاہ بیگ ارغون نے جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے ، شیبانی سے صلح کر لی مگر اسے قندہار چھوڑنا پڑا اور وہ کابل چلا گیا ۔

۲ ۔ سندھ کی سیاسی صورتِ حال (۱۵۰۸ء تا ۱۵۲۱ء)

سمہ خاندان کا عظیم حکمران جام نظام الدین عرف "جام نندو" ۱۵۰۸ء میں فوت ہوا[۲] ۔ دریا خان اس کا وزیر تھا جس نے ہر لحاظ سے سندھ کو مستحکم اور خوشحال بنایا ۔ جام نندو کے بعد اس کا فرزند جام فیروز تخت نشین ہوا جو چھوٹی عمر کا تھا ۔ اس لیے جام نندو کے ایک عزیز جام صلاح الدین نے تخت نشین ہونا چاہا جس پر خانہ جنگی شروع ہوئی ۔ گجراتی لشکر کی مدد سے جام صلاح الدین نے ٹھٹھہ پر

---

۱ ۔ بکھری ، میر معصوم ، تاریخ معصومی (مرتب) علامہ داؤد پوتہ ، ص ۹۸ تا ۱۰۲

۲ ۔ ایضاً ۔ ص ۷۴

حملہ کیا اور کامیاب ہوگیا ۔ دریا خان کی مدد سے جام فیروز نے جام صلاح الدین پر حملہ کیا اور جام صلاح الدین پسپا ہوگیا ۔

گجراتیوں کے علاوہ جام فیروز کے عہد میں ارغونوں کا بھی دخل رہا ۔ دولت شاہی اور نوگاہی ارغون بھاگ کر سندھ آئے اور لشکر میں شامل ہو گئے ۔ ان میں سے میر قاسم کیبکی سندھ کے حالات سے واقف ہو کر شاہ بیگ ارغون کے پاس پہنچا اور اس کو سندھ فتح کرنے کے لیے کہا ۔ شاہ بیگ ارغون ۱۵۱۸ء میں ٹھٹھ کی طرف روانہ ہوا[1] ۔ دریا خان نے اس کا مقابلہ کیا مگر مارا گیا ۔ شاہ بیگ نے ۱۵۲۱ء میں قتل عام کا حکم دیا ۔ لیکن جلد ہی قاضی قاضن نے جو شاہ بیگ کا پیر بھائی تھا ، اس قتل عام کو رکوا دیا ۔

جام فیروز نے شاہ بیگ سے معافی مانگی اور شاہ بیگ نے ٹھٹھ اس کے حوالہ کیا ۔ واپسی پر سیوہن کے قریب ٹلٹی کے میدان میں دریا خان کے فرزندوں اور دوسرے امیروں نے اس کا مقابلہ کیا جس میں شاہ بیگ کامیاب رہا ۔ شاہ بیگ کے سیوی کی طرف روانہ ہونے کے بعد جام صلاح الدین نے جام فیروز پر حملہ کر دیا ۔ جام فیروز نے شاہ بیگ کو اطلاع دی ، جس نے اپنے فرزند شاہ حسن کو روانہ کیا ۔ مقابلہ ہوا جس میں جام صلاح الدین اور اس کا بیٹا قتل ہو گئے اور شاہ حسن کو فتح ہوئی ۔ شاہ بیگ ، سیوی سے سیوہن پہنچا ۔ شاہ حسن بھی فتح کے بعد اس سے آ ملا ۔ دونوں بھکر پہنچے اور وہاں دھاریجا قوم کے سردار مقابلہ میں مارے گئے ۔ ۱۵۲۱ء میں شاہ بیگ گجرات فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا لیکن "اگھم "نامی گاؤں کے قریب ۱۵۲۱ء/۲۲ ۔ شعبان (۹۲۸ھ) میں وفات پائی ۔ لاش کو مکہ مکرمہ دفن کے لیے بھیج دیا گیا[2] ۔

شاہ بیگ کے بعد شاہ حسن تخت نشین ہوا ۔ اس کو معلوم ہوا کہ جام فیروز باغی ہو گیا ہے چنانچہ وہ ٹھٹھ کی جانب بڑھا مگر جام فیروز کچھ کی طرف بھاگ گیا اور لشکر جمع کر کے ٹھٹھ پہنچا ۔ شاہ حسن بھی آگے بڑھا ۔ چاچکن اور رلہمن گاؤں کے قریب دونوں کا مقابلہ ہوا اور شاہ حسن کو فتح ہوئی ۔ فتح کے بعد شاہ حسن بکھر واپس ہوا ۔ راستہ میں ہر جگہ تباہی مچائی[3] ۔ اور ۱۵۲۵ء میں بکھر سے ملتان جاتے ہوئے 'سیوراٗی' ، 'اچہ' اور 'ڈاور' کے قلعے مسمار کیے اور ان مقامات کو لوٹا ۔ آخر ملتان کے حاکم

---

۱ ۔ جلال نثوی ، سید میر محمد بن سید ، ترخان نامہ ، باہتمام سید حسام الدین راشدی سندھی ادبی بورڈ ، ۱۹۶۵ء ۔ پیش گفتار ، ص ۱ ، تاریخ معصومی ، میر معصوم بکھری ، ص ۱۱۴

۲ ۔ بکھری ، میر معصوم ، تاریخ معصومی ، ص ۱۱۷ تا ۱۲۷

۳ ۔ بکھری ، میر معصوم ، تاریخ معصومی ، ص ۱۳۲ تا ۱۳۶

محمود لانگاہ کو شکست دے کر ۱۵۲۶ء میں ملتان بھی فتح کیا ۔ بکھر واپس آنے پر اسے معلوم ہوا کہ کچھ کا راجا گنگھار ٹھٹھہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے اس لیے گنگھار کو شکست دے کر ٹھٹھہ پہنچا[1] ۔

۱۵۴۰ء میں جب ہمایوں شیر خاں سوری (شیر شاہ) سے شکست کھا کر لاہور اور اُچھ سے ہوتا ہوا روہڑی کے قریب پہنچا اور شاہ حسن نے اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تو ہمایوں جودھپور اور جیسلمیر روانہ ہوا ۔ ان ہنگامہ خیزیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ سندھ کے علم و ادب کو نقصان پہنچا ۔ چنانچہ بہت سے علماء و صوفیائے کرام ترک وطن پر مجبور ہو گئے ۔ "ہریلہ" اور "پاٹ" کے علماء و صوفیائے کرام نے عربستان اور گجرات کا رخ کیا ۔ جس کی وجہ سے سندھی علوم کی طرف ان دنوں توجہ نہ ہوئی ۔ قاضی عبداللہ بن قاضی ابراہیم دریلوی ۱۵۲۷ء میں پہلے گجرات اور پھر مدینہ منورہ جا بسے اور وہیں وفات پائی ۔ ان کے خلفاء شیخ رحمت اللہ اور شیخ حمید بھی بعد میں عربستان گئے اور آخری عمر وہیں گزاری[2] ۔ مولانا مصلح الدین لاڑی ۱۵۴۴ء میں مدینہ طیبہ پہنچے ۔ البتہ سندھی زبان کے شاعر قاضی قاضن نے چونکہ ارغونوں کی مدد کی تھی اس لیے ۲۰ سال تک بکھر کے قاضی رہے ۔ آخر میں وہ بھی مدینہ منورہ پہنچ گئے[3] ۔ پاٹ کے بزرگ اور عالم ، محدث شیخ طاہر محمد بن شیخ یوسف اور ان کے بھائی قاسم ۱۵۴۳ء میں ہجرت کر کے گجرات آئے اور برہانپور میں سکونت اختیار کی ۔ انہوں نے وہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا ۔ شیخ طاہر کے دوست مولانا شیخ طیب ابن مخدوم ہارونی بھی برہانپور آئے ۔ ان کے علاوہ شیخ ابراہیم بن عمر سندھی ، شیخ ابراہیم کلہوڑا ، شیخ وہبان سندھی ، قاضی عبدالسلام ، شیخ مبارک ، شیخ موسیٰ بوبکانی ، شیخ ابراہیم قاری شطاری ، سید ابراہیم بکھری ، شیخ لاڈ جیو ، حکیم عثمان بوبکانی ، شیخ اسحاق قلندر ، مولانا شیخ صالح ، شیخ بابو اور مولانا محب علی بھی ہجرت کر کے برہانپور چلے گئے[4] ۔

۳ ۔ علمی حالت

ارغونوں کی زبان فارسی تھی ۔ شاہ حسن فارسی کے شاعر تھے اور سپاہی تخلص کرتے تھے ۔ اس لیے فارسی زبان کو فروغ ہوا ۔ وسط ایشیا میں سیاسی انقلابات کی وجہ سے بہت سے خاندان سندھ پہنچے تھے ۔ شکر الٰہی سادات کے دادا سید شکراللہ نجوی یا

---

۱ ۔ بکھری ، میر معصوم ، تاریخ معصومی ، ص ۱۳۶ تا ۱۶۱
۲ ۔ بکھری ، میر معصوم ، تاریخ معصومی ، ص ۲۰۲ تا ۲۰۳ ۔ نزہۃالخواطر ، ج ۴ ، ص ۷
۳ ۔ بکھری ، میر معصوم ، تاریخ معصومی ، ص ۲۰۳
۴ ۔ راشد برہانپوری ، سید محمد مطیع اللہ برہانپور کے سندھی اولیاء ، ص ۱ تا ۲۲۸

لقوی ٹھٹہ میں آ کر بس گئے ۔ دوسرے برگزیدہ خاندان "شمسی سبزواری" سادات کے بزرگ سید شیر شاہ ۱۵۲۱ء میں سندھ آئے ۔ پرانے سکھر اور ٹھٹہ کے میر محمود ۱۵۲۱ء میں ہرات سے بکھر آئے اور شیخ الاسلام مقرر ہوئے ۔ سکھر اور روہڑی کے موسوی سادات ان کی اولاد میں سے ہیں ۔ شاہ قطب الدین شاہ طبیب خراسان سے ترک وطن کر کے سندھ میں آئے اور بکھر میں مقیم ہو گئے ۔ سید میر کلاں قندہار سے سندھ آئے اور سیوھن کے نواح میں مقیم ہو گئے ۔ مخدوم محمد فخر پوتہ ہرات سے سندھ میں آئے اور کاہان (کاہوں) میں مقیم ہوئے ۔ مولانا یونس سمرقندی ماوراالنہر سے سندھ میں آئے ۔ شاہ حسین تکدری اور شاہ جہانگیر ہاشمی بلند پایہ شاعر تھے اور خراسان سے سندھ میں آئے تھے ۔

باہر سے آئے ہوئے علماء بلا شبہ علم و فضل رکھتے تھے ۔ لیکن ان سے پہلے بھی سندھ میں علماء اور علمی مراکز موجود تھے ۔ مثلاً ٹھٹہ ، سیوہن ، کاہو ، لکھوی ، بالہ کنڈی ، نصر پور ، متعلوی ، کھہڑا ، دربیلہ اور بکھر وغیرہ ایسے ہی مقامات تھے ۔ سندھی علماء کے فضل و کمال سے اسلامی دنیا پوری طرح واقف تھی ، حتیٰ کہ سیوہن کے مدرسے میں مصر کے طلبا بھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے ۔

علماء کے علاوہ کچھ فارسی شعراء کے نام بھی ملتے ہیں ۔ جو سندھ میں پہلے سے ہی موجود تھے ۔ مثلاً حیدر کلوج ، مولانا میر محمد زرگر ، ملا جانی بندری ، مولانا ظہوری اور میر شاہ مسعود مسور وغیرہ ۔

۵ ۔ سندھی ادب

قیاس کہتا ہے کہ ان فارسی گو شعراء کو سندھی اشعار سے بھی دلچسپی ہوگی ۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ 'پاٹ' کے ایک بزرگ حضرت شیخ لاڈ جیو سندھی جب ہجرت کر کے برہان پور گئے تو وہاں بھی ان کی دلچسپی سندھی شعر سے قائم رہی ۔ 'تذکرۃ الابرار' کے مصنف غوشی نے لکھا ہے کہ نغمہ سنجی اور سندھی موسیقی میں مہارت رکھتے تھے ۔ خصوصاً کافی جو سندھ کا مقبول عام راگ ہے اس درد اور سوز کے ساتھ گاتے تھے کہ سامعین جھوم اٹھتے اور وہ خود بھی مست ہو جاتے تھے ۔ مولانا شیخ مبارک سندھی ایلچپور کے مسند نشین بھی 'شیخ لاڈ جیو' کی نغمہ پردازی اور بعض مخلص احباب کے جذبۂ محبت کی کشش کے باعث برہان پور چلے آئے تھے[1] ۔ 'شیخ لاڈ جیو' کی

(۱) برہان پوری ، میر محمد مطیع اللہ برہان پور کے سندھی اولیاء ص ۱۵ تا ۱۷ ۔

وفات ۷۰ سال کی عمر میں ۱۵۹۸ء میں ہوئی[1] ۔ ان کے علاوہ ایک سندھی بزرگ شیخ قاسم بن شیخ یوسف بھی سندھی زبان کے شاعر تھے ۔ ان کا انتقال ۱۵۷۳ء میں ایلچپور میں ہوا[2] ۔

مندرجہ بالا حقائق سے ہم ان نتائج پر پہنچتے ہیں کہ :

(۱) ارغون دور میں اور اس سے پہلے بھی سندھی شعر موجودتھا ۔ لیکن گردشِ زمانہ نے اس عہد کا سندھی شعر ہم تک نہ پہنچنے دیا ۔ صرف قاضی قاضن کے کچھ ابیات ملے ہیں۔

(۲) سندھی شعر دوہڑے کے علاوہ ، کافی کی صورت میں بھی موجود تھا ۔ کافی سندھی شعر کی مقبول عام صنفِ سخن تھی ۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کئی سندھی کافی گو شعراء گذرے ہیں جن کی کافیاں 'شیخ لاڈ جیو' گاتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی شاعر کا کلام بار بار نہیں گایا جاتا ہو گا ۔

(۳) شاہ لطیف سے پہلے 'کافی' مشہور تھی ۔ لیکن بعد میں شاہ لطیف اور شاہ عنایت رضوی کے کلام میں 'وائی' کا نام ملتا ہے ۔ اس پر تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا گیا ہے کہ شمالی سندھ میں 'کافی' کا نام مروّج تھا جیسا کہ پنجاب میں تھا اور جنوبی سندھ میں اسی چیز کو 'وائی' کہا جاتا تھا ۔ کیونکہ ارغون عہد کے بعد فاضل بکّھری کافی کے شاعر ہو گذرے ہیں ۔ شاہ لطیف کے زمانہ میں صاحب ڈنہ فاروقی اور خلیل لاشاری کے کلام میں کافی کا نام ملتا ہے ۔ فنّی لحاظ سے خلیل لاشاری اور صاحب ڈنہ فاروقی کی 'کافی' اور شاہ لطیف کی وائی میں کوئی فرق نہیں ۔

(۴) سندھی راگ اور سندھی شعر میں اتنا اثر تھا کہ برہان پور جیسے دور افتادہ حصہ میں بھی مقبول ہو گئے ۔

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارغونوں سے پہلے اور ان کے ابتدائی دور میں علماء اور صوفیہ کو سندھی شعر سے خاص دلچسپی تھی ۔ لیکن اس کے بعد ارغون عہد میں جب کہ فارسی زبان کو برتری حاصل تھی ، سندھی ادب پر جمود طاری ہوگیا ۔ اس کا اثر سندھی علماء پر بھی پڑا ۔ وہ فارسی میں ہی شعر کہنے لگے اور سندھی شعر سے بے توجہی برتنے لگے ۔ ان حالات میں سندھی سخن گوئی کا رواج کم ہو گیا اور سندھی شعر علمی محفلوں سے دور صرف عوامی مجلسوں کی زینت رہ گیا اور صوفیہ کی سماع کی

---

(۱) برہانپور کے سندھی اولیاء' ص ۱۰۳ تا ۱۰۳ اور ۱۱۱ تا ۱۱۷ ۔ ماہنامہ نئی زندگی ماہ مارچ ۱۹۵۳ء ، مضمون سید حسام الدین راشدی ۔ ص ۱۲ ۔

(۲) ایضاً ۔ ص ۲۱۴ - ۲۱۵ ، ایضاً ص ۱۲ ۔

محفلوں میں گایا جانے لگا ۔ کچھ کلام صوفیہ کے تذکروں اور ملفوظات میں قلمبند ہوا ۔ لیکن باقی کا تمام ادبی سرمایہ سمہ ، ارغون ، ہمایوں اور اس کے بعد ترخانوں اور مغلوں کے مسلسل انتشار میں برباد ہو گیا ۔ شاید باقی بچا ہوا ذخیرہ نور محمد کلہوڑا کے کتب خانہ کے ساتھ نادر شاہ ایران کی طرف لے گیا ۔

صوفیائے کرام کے ملفوظات کے سلسلہ میں سب سے پہلے 'بیان العارفین' کا نام ملتا ہے ، جو بہت بعد میں مرتب ہوئی ۔ لیکن اس میں قاضی قاضن کے ابیات بھی ملتے ہیں جو ارغونوں کے آخری دور میں گذرے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملفوظات مرتب کرنے کا رواج بھی تھا اور ان میں سندھی ابیات شامل کر لیے جاتے تھے ، جنھیں صوفیہ کی محفلوں میں پڑھا جاتا ۔ لیکن وہ ملفوظات بھی محفوظ نہ رہ سکے ۔ قاضی قاضن کا سندھی میں شعر کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ سندھی علماء اور بزرگ ارغونوں کے دور میں بھی سندھی میں شعر کہتے تھے ۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے ، کتب خانوں کی بربادی کی وجہ سے کسی کا شعر محفوظ نہیں ہے ۔

اس کے باوجود 'بیان العارفین' میں قاضی قاضن کے ابیات کے علاوہ 'پراٹ'[1] قوم کے ایک شاعر کا بیت ملتا ہے ۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کا خیال ہے کہ یہ کسی قدیم شاعر یعنی سمہ[2] یا ارغونوں کے دور کا کلام ہو سکتا ہے کیونکہ بیت تین مصرعوں پر مشتمل ہے اور سمہ دور کے جو ابیات ملے ہیں ، وہ صرف دو مصرعوں پر مشتمل ہیں ۔

سمہ دور کے آخر اور ارغون دور میں سندھ کے عالموں اور عارفوں نے انسانی معاشرے کی اصلاح کے لیے سندھی شعر کو ذریعہ بنایا تھا ۔ تزکیۂ نفس ، اللہ تعالیٰ کی معرفت ، دل کا سکون ، دنیا سے بیزاری اور خدمتِ خلق سندھی شاعر کے اہم مضامین تھے ۔ اس سے پہلے واقعات اور داستانوں کے متعلق ابیات ملتے ہیں ۔ لیکن اس دور میں فکر کی گہرائی کا خیال رکھا گیا اور قصوں و داستانوں کو تمثیل اور علامت کے طور پر لایا گیا ۔ فکر اور خیال سے لبریز اس اخلاقی اور عارفانہ شاعری کی شروعات قاضی قاضن سے معلوم ہوتی ہیں ۔

---

۱ ۔ بیان العارفین کے ایک بیت میں لفظ 'پراٹ' آیا ہے ، ڈاکٹر داؤد پوتہ (شاہ کریم بلڑی وارے جو کلام ، ۱۹۳۷ء ، ص ۵۵) نے اس لفظ کو شاعر کے نام یا قوم کے معنی میں نہیں لیا ہے اور بیت کو شاہ کریم کا دکھایا ہے ۔ راقم الحروف نے بھی اپنی کتاب 'کریم جو کلام' (ص ۲۱۳) میں اسے شاہ کریم کا ظاہر کیا ہے ، لیکن ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کا خیال ہے کہ یہ بیت 'پراٹ' قوم کے شاعر کا معلوم ہوتا ہے ۔ (سندھی بولی جی مختصر تاریخ ، ص ۱۳۴ ، ۱۹۶۲ء) ۔

۲ ۔ بلوچ ، ڈاکٹر نبی بخش خان ، سندھی بولی جی تاریخ ، ص ۱۳۴ ، ۱۹۶۲ء

فصل دوم

ترخانی عہد : ۱۵۵۴ء تا ۱۵۹۱ء

۱ - ترخانی حکومتیں

شاہ حسن ارغون ۱۵۵۴ء میں لاولد فوت ہوئے۔ اس وجہ سے سندھ دو خاندانوں میں تقسیم ہو گیا ۔ بالائی سندھ جس کا مرکز بکھر تھا ، سلطان محمود کوکلتاش کے قبضہ میں چلا گیا جو شاہ حسن کے زمانہ میں بکھر کا گورنر تھا ۔ زیرین سندھ میرزا عیسیٰ ترخان کے تسلط میں آ گیا جس کا مرکز ٹھٹہ تھا ۔ میرزا عیسیٰ ، شاہ بیگ ارغون کا تجربہ کار امیر تھا ۔ سلطان محمود اور میرزا عیسیٰ کے درمیان شروع میں کچھ مقابلے بھی ہوئے[1] - ۱۵۷۲ء میں میرزا عیسیٰ فوت ہوا[2] ۔ اس کے بعد اس کا بیٹا میرزا محمد باقی تخت نشین ہوا ۔ وہ سخت مزاج ، بخیل اور ظالم تھا ۔ ۱۵۸۵ء میں اس نے خود کشی کی ۔ اس کے بعد اس کا فرزند میرزا پائندہ بیگ (م - ۱۰۰۲ھ) تخت پر بیٹھا ۔ اس کے دماغ میں فتور تھا ۔ اس لیے حکومت کا کاروبار اس کے ۔ فرزند میرزا جانی بیگ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا مگر وہ بھی ظالم اور جابر نکلا - ۱۵۹۰ء/۹۹۹ھ میں میرزا عبدالرحیم خان خاناں نے اکبر کی طرف سے سندھ پر حملہ کیا اور ۱۵۹۱ء/۱۰۰۰ھ میں سندھ مغل سلطنت کا حصہ بن گیا[3] ۔

مغلوں نے ارغونوں اور ترخانوں کے تمام پسماندگان کو سندھ سے نکال کر ہندوستان روانہ کر دیا ۔ ترخانوں نے سندھیوں سے رشتہ داریاں بھی کیں ، لیکن پھر بھی وہ اس ملک کے نہ بن سکے ۔ ان کی تہذیب و تمدن اور زبان مختلف تھی ۔ سو برس یہاں رہنے کے باوجود فکری ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکی ۔ اس وجہ سے ان کے زوال اور تباہی پر کسی کو رنج نہیں ہوا ۔

۲ - سندھی ادب

ارغونوں کے زمانہ میں فارسی فروغ پا چکی تھی ۔ ترخانوں کے زمانہ میں فارسی کا از سر نو تسلط ہوا ۔ چنانچہ فارسی کے بہت سے شعراء کے نام ملتے ہیں ۔ مثلاً مولانا میر یونس سمرقندی ، مولانا یار محمد ہراتی ، محمد مقیم تتوی ، قاضی قاضن کے ہوتے

---

۱ - جلال تتوی ، سید میر محمد ترخان نامہ ، ص ۴۴ ، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۶۵ء

۲ - ایضاً - ص ۴۸ -

۳ - ایضاً - ص ۵۱ تا ۹۹ -

محمد اشرف سیوہن ، دانشور خان متخلص شہرتی ، تتہ غروری ، غیوری کلیجہ ، حیدر ، میر ابوالمکارم ٹھٹوی ، میر معصوم بکھری اور میر سنجم الدین بکھری -

فارسی شاعری کی سرپرستی کے باوجود کچھ سندھی شعراء کے نام تاریخوں اور تذکروں میں نظر آتے ہیں مثلاً :

۱ - راجوستہ دل

'تحفۃالکرام' میں آیا ہے کہ وہ 'رائلدن' 'یا راؤن' (رادھن) میں مدفون ہیں اور ۹۷۷ھ/۱۵۶۹ء میں فوت ہوئے - ایک مجذوب اور واصل باللہ شخص تھے اور ہمیشہ ننگے پاؤں اور ننگے سر گھومتے رہتے تھے - روایت ہے کہ جب ان کے پاس کوئی معاملہ آتا تھا تو کھڑے ہو کر خوش انحانی سے سندھی بیت پڑھتے تھے اور جو کہتے تھے وہ ہو جاتا تھا -

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ابیات واقعاتی نوعیت کے تھے - سمہ دور میں اس قسم کے ابیات کہنے کا رواج زیادہ تھا - یا تو کسی واقع پر ابیات کہے جاتے تھے یا بیت میں کسی آئندہ واقعے کی طرف اسارہ ہوتا تھا . مندرجہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ترخانی دور میں بھی اس قسم کے ابیات کہے گئے - لیکن 'راجوستہ دل' کا کوئی شعر نہیں مل سکا -

۲ - مخدوم عثمان

'بیان العارفین' میں ان کا ایک بیت ملتا ہے ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی کبھی شعر کہتے تھے ، آگھم نامی گاؤں کے رہنے والے تھے اور مخدوم اسماعیل کے ہمعصر تھے ، جن کی وفات ۱۵۸۹ء میں ہوئی' - 'بیان العارفین' میں ان کا جو بیت ہے وہ اس طرح وجود میں آیا کہ ایک مرتبہ مخدوم اسماعیل کی لڑکی نے ان سے ایک مسئلہ پوچھا جس کے جواب میں انہوں نے ایک بیت پڑھا ، جس کا مفہوم خود ہی یہ بیان کیا کہ :

بادشاہوں سے انعام لیتے ہو ،
اور پھر ایسے مسائل پوچھتے ہو ؟ !

---

۱ - قانع تتوی ، میر علی شیر ، تحفۃ الکرام ، ص ۱۶۱ ، ج ۳ -

۲ - میمن عبدالمجید سندھی ، کریم جو کلام ، ص ۱۳۷ - ۱۳۸ ، سندھی ادبی سوسائٹی ، اسلامیہ کالج سکھر ، ۱۹۶۳ء

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جو علماء حکمرانوں سے انعام لیتے تھے ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ترخان ظالم حکمران تھے اور عوام ان سے تنگ آ چکے تھے ۔

۳ ۔ مخدوم لوح

ہالہ کنڈی کے بڑے بزرگ ہیں ۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی نسل سے تھے ، اور سہروردی سلسلہ کے بانی حضرت شیخ ابو نجیب ضیاء الدین عبدالقادر سہروردی ان کے پڑدادا تھے ۔ ان کے والد کا نام نعمت اللہ تھا ۔ ۲۷ ۔ رمضان ۹۰۵ھ/۱۵۰۰ء میں ان کی ولادت ہوئی اور ۱۵۹۰ء مطابق ۲۷ ۔ ذی القعد (۹۹۸ھ) میں فوت ہوئے ۔ ہالہ میں ان کا مقبرہ موجود ہے ۔ ظاہری تعلیم اتنی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود جب قرآن حکیم کی تفسیر کرتے تو علماء حیران ہو جاتے تھے ۔ انہوں نے قرآن شریف کے فارسی ترجمہ کے علاوہ مختصر تفسیر اپنے مرید بہاءالدین گودڑیہ سے لکھوائی تھی جو آج بھی موجود ہے ۔

ان کے کچھ سندھی ابیات ان کے ملفوظات میں ملتے ہیں ۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ سندھی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے ۔ آپ کے اور بھی ابیات ہوں گے لیکن وہ محفوظ نہ ہو سکے ۔ ان ابیات کا مضمون تصوّف اور اخلاقیات ہے ۔ اس کے علاوہ ان کے ابیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے خاص مریدوں سے بڑی محبت تھی ۔

۴ ۔ شاہ کریم

شاہ عبدالکریم بلڑی والے ، سند کے متعلوی سادات کے خاندان میں سے تھے اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے والد کے دادا تھے ۔ آپ کا سلسلۂ نسب امام موسیٰ کاظم سے جا ملتا ہے ۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام لعل عرف لال محمد تھا ۔ ۱۵۳۷ء/۹۴۴ھ میں شاہ کریم کی ولادت ہوئی اور انہوں نے ۱۶۲۲ء/۱۰۳۲ھ میں وفات پائی[1] ۔ بچپن ہی سے ان کو سماع کا شوق تھا یہاں تک کہ مکتب چھوڑ کر بھی سماع کی محفلوں میں چلے جاتے تھے ۔ اس وجہ سے بہت مختصر تعلیم حاصل کی ۔ حضرت مخدوم لوح کے مرید تھے ۔ بڑے عابد ، زاہد ، صابر اور حلیم الطبع بزرگ تھے ۔ اپنی روزی خود کماتے تھے ۔ پھر بھی مسافروں ، مریدوں اور فقیروں کی مہمان نوازی کرتے رہتے تھے ۔

قدیم شعراء میں یہ سب سے پہلے شاعر ہیں جن کا سب سے زیادہ کلام ملا ہے ۔ سندھ

---

۱ ۔ میمن عبدالمجید سندھی ، کریم جو کلام ، ص ۷ تا ۱۵ ، مطبوعہ ۱۹۶۳ء سندھی ادبی سوسائٹی ، اسلامیہ کالج سکھر ۔

کے عظیم شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی آپ سے بہت متاثر تھے ۔ شاہ لطیف کے بہت سے اشعار ان ہی کے رنگ میں ملتے ہیں ۔ ان کے کلام میں جذبات ، حسنِ بیان اور صوفیانہ رنگ ، یہ تینوں چیزیں موجود ہیں ۔ ابیات میں جو تمثیلات اور تشبیہات ملتی ہیں وہ سندھی ماحول اور معاشرت سے لی گئی ہیں ۔ سندھ میں رواج تھا کہ عورتیں باہر پانی بھرنے جاتی تھیں اور دو گھڑے ایک دوسرے کے اوپر اٹھا کر لاتی تھیں ۔ شاہ کریمؒ کے دو ابیات میں پانی بھرنے والی عورت کا ذکر ملتا ہے ۔ مثلاً :

ترجمہ : پانی بھرنے والی سب ہیں ،
جو سر پر گھڑا رکھ کر پانی بھرتی ہیں ،
لیکن کچھ اپنے محبوب کے لیے بھرتی ہیں ،
اور کچھ مزدوری پر بھرتی ہیں !

اس سے واضح ہوتا ہے کہ عورتیں مزدوری پر بھی پانی بھرتی تھیں ۔ ایک اور بیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں دو گھڑے ایک دوسرے کے اوپر سر پر اٹھا کر لاتی تھیں :

ترجمہ : جس طرح پانی بھرنے والی کے سر پر ،
ایک گھڑا دوسرے پر رہتا ہے ،
اور جس طرح پرندہ پانی پر بیٹھا رہتا ہے ،
اس طرح میرا محبوب میرے دل میں رہتا ہے ۔

اس کے علاوہ سوت کاتنے والی عورت کی تمثیل بھی ملتی ہے اور غواصوں اور ناخداؤں کی تصویریں بھی ان کے ابیات میں ملتی ہیں ۔ کچھ ابیات میں مشہور رومانوی داستان یعنی 'سسی پنوں' ، 'عمر ماروی' وغیرہ کی طرف اشارہ کر کے مطلب بیان کیا گیا ہے ۔ اشعار تصوف اور اخلاقیات سے متعلق ہیں ۔ مگر ان کے ساتھ انسانی فطرت کا تجزیہ بھی ملتا ہے ۔

ان کے ابیات ان کے ملفوظات 'بیان العارفین' میں ملتے ہیں جو ان کے مرید محمد رضا بن عبدالواسع عرف میر دریائی بن داروغہ گہر نے (۱۶۲۸/۱۰۳۸ھ) میں مرتب کی ۔ اس میں ان کے اقوال بھی ہیں اور سندھی ابیات بھی ۔ 'بیان العارفین' میں قاضی قاضن اور دوسرے شعراء کا کلام بھی ملتا ہے ۔ یہ وہ ابیات ہیں جو شاہ کریم نے وقتاً فوقتاً جلسوں میں سنائے تھے ۔ اس میں شاہ کریم کے اپنے ۹۳ سندھی ابیات ملتے ہیں ، جن میں سے دو ، ایک

مصرع پر ، تین ، تین مصرعوں پر ، اور باقی دو مصرعوں پر مشتمل ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کا اور بھی کلام ہو لیکن وہ ہم تک نہیں پہنچا ۔ 'بیان العارفین' فارسی میں تھی ۔ ۱۹۰۴ء میں مرزا قلیچ بیگ مرحوم نے 'بیان العارفین' سے شاہ کریم کا کلام ایڈٹ کر کے شائع کیا تھا مگر علامہ داؤد پوتہ نے نئی طرح ایڈٹ کر کے ۱۹۳۷ء میں دوبارہ شائع کیا ۔ یہ پھر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ۔

۵ ۔ شاہ کریم کے ایک ہمعصر

'بیان العارفین' میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شاہ کریم کو ایک شخص ملا جو مجاہدے اور ترک لباس میں مشہور تھا ۔ لیکن اس وقت ایسے شالدار کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھا کہ وہ شاہ صاحب سے آکر ملا تو شاہ صاحب نے اس کو دیکھ کر فرمایا :

"تم وہ ہی ہو جو پہلے ہوتے تھے" ؟ وہ سمجھ گیا اور ایک بیت پڑھا ، جس کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری پوشاک سے کیا ہوتا ہے ۔ جو دل میں ہے ، وہ اس کو معلوم ہے ۔ شاہ صاحب کو یہ بیت پسند نہ آیا اور اس کے جواب میں ایک بیت پڑھا [1] ۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ کریم کی ایک شخص سے بیت بازی ہوئی ۔ لیکن اس کا نام نہیں ملتا ۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان دلوں اکثر بزرگ شعر کہا کرتے تھے ۔

۶ ۔ سید علی ثانی ٹھٹوی

بڑے عالم ، شاعر اور اہلِ دل ہو گزرے ہیں ۔ ٹھٹھ کے انجوی شیرازی سادات میں سے تھے ۔ مخدوم نوح کے مرید تھے ۔ شاہ کریم سے ملتے رہتے تھے ۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس زمانہ کے اور بزرگوں اور عالموں سے بھی ملاقاتیں کیں ۔ سماع کا آپ کو بہت شوق تھا ۔ اور اپنے مکان پر سماع کی محفلیں باقاعدہ منعقد کرواتے تھے ۔ فارسی اور سندھی کے بلند پایہ شاعر تھے ۔ لیکن آپ کا صرف ایک دوہڑہ ملا ہے ۔ یہ 'معارف الانوار' میں موجود ہے اور چار مصرعوں پر مشتمل ہے ۔ جتنے سندھی ابیات اس زمانہ تک کے ملے ہیں ان میں یہ پہلا سندھی بیت ہے جو چار مصرعوں پر مشتمل ہے ۔ فنی لحاظ سے اس میں پختگی بھی ہے ۔ مفہوم 'سسی پنوں' کی تمثیل کے ذریعے بیان کیا گیا ہے ۔ (۱۵۷۳ء/ ۹۸۱ھ) میں آپ کی وفات ہوئی [2] ۔

---

۱ ۔ میمن عبدالمجید سندھی ، کریم جو کلام ، ص ۷۷ ۔ ۱۹۶۳ء ،

۲ ۔ راشدی ، سید حسام الدین (مرتب) مکلی نامہ ، ۱۹۶۷ء ۔

۷ ۔ ابوبکر لکیاری

مخدوم نوح کے خلیفہ تھے ۔ ایک روایت کے مطابق حضرت مخدوم نوح نے وفات سے کچھ پہلے اپنے خاص خلیفہ ابوبکر کو یاد کر کے ایک بیت کہا ۔ ابوبکر کو یہ حال کشف کے ذریعہ معلوم ہوگیا اور ایک سندھی بیت کہتے ہوئے پیر کی خدمت میں پہنچے[۱] ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سندھی شاعر تھے لیکن اس ایک بیت کے علاوہ ان کا دوسرا کلام ہم تک نہیں پہنچا ۔ ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہ ہو سکیں ۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی وفات مخدوم نوح کی وفات (۱۵۹۰ء/۹۹۸ھ) کے بعد ہوئی ۔

۸ ۔ شاہ خیر الدین بکھری اور ان کے مرید

یہ بزرگ حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں سے تھے ۔ آپ کے والد کا نام سید احمد تھا ۔ آپ (۱۵۰۵ء/۹۱۱ھ) میں بغداد میں پیدا ہوئے ۔ چھوٹی عمر میں ہی بغداد سے مکہ مکرمہ آئے ۔ وہاں سے تحصیل علم کے بعد سیر و سفر کرتے ہوئے سندھ پہنچے اور مخدوم نوح کے مرید ہوئے ۔ مرشد کے ارشاد پر سکھر میں آ کر سکونت اختیار کی ۔ (۱۶۱۷ء/۱۰۲۷ھ) میں آپ کا انتقال ہوا ۔ سکھر پرانہ میں آپ کا مقبرہ زیارت گاہ بنا ہوا ہے[۲] ۔

'لب تاریخ سندھ' سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ایک مرید 'سادھو بیلہ' تھا جو مجاہدے میں مشغول رہتا تھا ۔ ایک مرتبہ اس کے پاس گئے ۔ وہاں ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ سندھی ابیات کی صورت میں ملتی ہے[۳] ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ خیرالدین سندھی میں شعر کہتے تھے اور ان کے وہ مرید بھی سندھی کے شاعر تھے ۔ مرید کا نام نہیں ملتا ۔ اس کے علاوہ ان کا اور کلام بھی نہیں ملتا ۔

۹ ۔ مخدوم پیر محمد لکھوی

یہ بزرگ اصل ٹھٹہ کے تھے ۔ لیکن بعد میں لکھی تعلقہ سکھر میں آ کر سکونت پذیر ہوئے ۔ (۱۵۹۰ء یا ۱۶۰۰ء) کے قریب آپ کی وفات ہوئی[۴] ۔ بڑے پایہ کے شاعر اور خدا رسیدہ بزرگ تھے ۔ ان کی ایک نظم ملی ہے جس میں انہوں نے نسیمِ صبح سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ وہ رسول خدا تک ان کا سلام پہنچا دے ۔ اس کو

---

۱ ۔ داؤد پوتہ ، علامہ عمر بن ، سندھی شعراء اور ان کا شعر ،

۲ ، ۳ ۔ خدا داد خان ، لب تاریخ سندھ ، ص ۱۳۸ ، ۱۹۰۰ء ۔ تذکرہ لطفی ج ۱ ، ص ۲۱۶ ۔ نیز تذکرہ شعراء سکھر ص ۲۷ ، از میمن عبدالمجید سندھی ، سندھی ادبی سوسائٹی اسلامیہ کالج سکھر ، ۱۹۶۵ء ،

۴ ۔ بدوی ، لطف اللہ ، تذکرہ لطفی ، حصہ اول ، ص ۱۵۵ ۔

ایک قسم کی نعت کہا جا سکتا ہے - یہ نظم سندھی شاعری کی ایسی قسم کا پہلا نمونہ ہے جس میں بعد میں دوسرے عالموں نے مکمل کتابیں لکھیں - اس کو الف اشباع کی شاعری کہاجاتا ہے - نظم کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیوی حالات سے کچھ پریشان تھے -

۱۰ - درس علاء الدین سومرو

ٹھٹہ کے ایک بزرگ تھے اور حضرت غوث بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے سلسلہ کے مرید تھے - روایت ہے کہ سید علی ثانی اکثر ان کی خدمت میں جاتے اور ان دونوں کے درمیان سندھی ابیات میں گفتگو ہوتی - لیکن وہ ابیات محفوظ نہیں رہے[۱] - ان کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہ ہو سکیں - البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی میں گزرے ہیں -

۱۱ - پان فقیر

ماڑی تعلقہ سکھر کے بزرگ تھے اور سندھی میں کبھی کبھی ابیات کہتے تھے - خاص طور پر کسی واقعہ سے متاثر ہو کر بیت کہتے تھے - ایک بیت میں آپ نے ایک قوم کو بد دعا بھی دی ہے ، کیونکہ ان کے جانوروں نے ان کی فصل خراب کر دی تھی- ان کے سندھی ابیات کی ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۰۰ء کے قریب کے بزرگ تھے[۲] -

۱۲ - بھرپور شاہ

یہ بزرگ بھی ماڑی تعلقہ سکھر کے تھے - ان کے کچھ ابیات ملے ہیں جو واقعاتی نوعیت کے ہیں[۳] - ان کے ابیات سے گاؤں کے تاریخی واقعات پر روشنی پڑتی ہے - معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں کوئی ہندو جاگیردار اس گاؤں میں رہتا تھا جس کے وزیر مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی - انہوں نے عوام پر ظلم کیے تھے بھرپور شاہ صاحب نے ان کو روکا لیکن وہ باز نہیں آئے - آخر انہوں نے ان کو بد دعا دی - روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۵۰۰ء کے قریب کے بزرگ تھے -

۱۳ - بھارو اور حفیظ

لوک شاعری کے شاعر تھے اور ماڑی تعلقہ سکھر کے رہنے والے تھے[۴] - ۱۵۰۰ء کے

---

۱ - قانع ٹھٹوی ، میر علی شیر ، تحفۃ الکرام ، ج ۳ ، ص ۳۵ -
۲ - میمن عبدالمجید سندھی ، تذکرہ شعرائے سکھر ، ص ۴۷ -
۳ - میمن عبدالمجید سندھی ، تذکرہ شعرائے سکھر ، ص ۱۹ -
۴ - میمن عبدالمجید سندھی ، تذکرہ شعرائے سکھر ، ص ۱۹ -

آخر کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں استاد بھارو تھے اور شاگرد حفیظ۔ انہوں نے بالخصوص سوال جواب میں منظوم پہیلیاں کہی ہیں ۔ ان کے مضمون سے اس زمانہ کے معاشی اور معاشرتی حالات پر روشنی پڑتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے لوگ خوشحال تھے اور انہیں لوک شاعری سے دلچسپی تھی ۔

۱۴ ۔ کالو فقیر

یہ فقیر بھی ماڑی گاؤں کے تھے اور حضرت غوث بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے سلسلہ کے مرید تھے اور ہر سال ملتان جاتے تھے[1] ۔ عوامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۰۰ء کے بالکل آخر میں گزرے ہیں ۔ ان کا ایک مولود ملا ہے جس کی ساخت 'کافی' جیسی ہے لیکن مضمون کے لحاظ سے نعت ہے ۔

ادبی جائزہ

اس دور کے شعری ادب کا تھوڑا سا سرمایہ ہم تک پہنچا ہے ۔ جتنا ملا ہے اس میں فارسی اور عربی الفاظ کی آمیزش نہ ہونے کے برابر ہے ۔ زیادہ سے زیادہ اشعار شاہ کریم کے ابیات ہیں ۔ جن میں ۲۹ الفاظ اور ایک اصطلاح عربی اور ۸ الفاظ فارسی کے ملتے ہیں ۔

بیت

زیادہ تر بیت ملے ہیں جن کو سندھی میں 'دوہیڑو' بھی کہا جاتا ہے ۔ فنی لحاظ سے 'ہندی چھندو دیا' پر معلوم ہوتے ہیں ۔ کچھ ابیات ہندی دوہے کی ساخت پر ہیں ۔ یعنی دو مصرعوں پر مشتمل ہیں اور قافیہ دونوں مصرعوں کے آخر میں آتا ہے ۔ کچھ سورٹھے کی ٹیکنیک کے مطابق ہیں یعنی دو مصرعوں کے ہیں ، لیکن قافیہ دونوں مصرعوں کے درمیان میں آتا ہے ۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن میں دوہے اور سورٹھے کی ساخت کا امتزاج ہے ۔ اس کو خالص سندھی ایجاد کہا جا سکتا ہے ۔

دوہڑے کا مضمون اکثر طور پر تصوف ہوتا ہے لیکن کچھ ایسے دوہڑے بھی ملے ہیں جو اس دور کے واقعات پر مبنی ہیں اور معاشرتی حالات پیش کرتے ہیں ۔ کچھ دوہڑوں میں مشہور رومانی داستانوں مثلاً 'سسی پنوں' ، 'عمر ماروی' ، 'مومل رانو' وغیرہ کی تمثیلیں بھی ملتی ہیں ۔

کافی

---

(۱) میمن ، عبدالمجید سندھی ، تذکرہ شعرائے سکھر ، ص ۲۰ ۔

ابیات کے علاوہ اس دور میں کافی کا وجود بھی تھا ۔ افسوس کہ اس زمانہ کی کافی کا نمونہ ہم تک نہ پہنچ سکا ۔ البتہ صدری روایتوں کے ذریعے کالو فقیر کا ایک مولود ملا ہے جو کافی کی ابتدائی ٹیکنیک میں ہے ۔ یہ وہی ٹیکنیک ہے جو شاہ لطیف کی وائی کی ہے ۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس زمانہ کی کافی کی ٹیکنیک وہی ہو گی جو شاہ لطیف کی وائی کی ہے ۔

الف اشباع

یہ طویل نظمیں ہوتی ہیں جن میں قافیہ نہیں ہوتا ۔ بلکہ مصرع کے آخر میں 'الف' ملا کر قافیہ بنایا جاتا ہے اس قسم کا سب سے پہلا نمونہ اس دور میں پیر محمد لکھوی کی شاعری میں ملتا ہے ۔ اس کے بعد اس قسم کی شاعری میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں ۔ پیر محمدلکھوی کی نظم پختہ ہے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہےکہ شاعری کی یہ قسم سندھ میں پہلے سے مروّج تھی ۔

مولود

خالص سندھی نعتیہ شاعری ہے ، جس کا اپنا مخصوص اسلوب ہے ۔ اس قسم کی شاعری کا سب سے پہلا نمونہ اسی دور میں ملا ہے ۔ یعنی کالو فقیر کا مولود جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ پیر محمد لکھوی کی نظم ٹیکنیک کے لحاظ سے مولود نہیں ہے ۔ لیکن مضمون کے لحاظ سے وہ بھی نعتیہ کلام ہی ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نعتیہ شاعری کا عام رواج تھا ۔

سندھی فقرے

اس دور کی کوئی سندھی نثر کی کتاب نہیں ملی ہے ۔ البتہ اس زمانہ کے ایک سندھی عالم مخدوم محمد جعفر بوبکانی (م - ۱۵۱۴ء/۹۲۰ھ) کے بعد کی عربی کتاب 'حل العقود فی طلاق السنود' ملی ہے ۔ جس میں ان سندھی الفاظ اور فقروں پر بحث ہے جن کے کہنے سے طلاق ہو جاتی ہے[1] ۔ اس سے اس دور کی سندھی زبان کا نمونہ مل جاتا ہے ۔

اختتامیہ

اس زمانہ میں فارسی شاعری کا دور دورہ تھا ۔ جو فارسی جانتا تھا ۔ اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ۔ اس وجہ سے سندھیوں میں احساس کمتری پیدا ہونے لگا

---

۱ قانع ٹتوی ، میر علی شیر ، تحفۃ الکرام ، حواشی ، ص ۳۷۵ ، سندھی ادبی بورڈ ، ۱۹۵۷ء

اور وہ اپنی زبان کو کمتر سمجھنے لگے تھے ۔ کپتان جارج اسٹیک (۱۸۴۵ء - ۱۸۴۷ء) نے لکھا ہے کہ سندھی میں مادری زبان کو مسخروں کی زبان سمجھا جاتا ہے ۔ یہ تاثرات ارغونوں اور ترخانوں کے زمانہ میں فارسی اور غیر ملکی نفوذ کی بنا پر پیدا ہو گئے تھے ، جو جارج اسٹیک کے زمانہ تک ختم نہیں ہوئے تھے ۔ سندھی شاعری کو گویا علمی اور امیروں کی محفلوں سے نکال دیا گیا تھا ۔ جب امیروں نے اسے نکال دیا تو فقیروں اور عوام نے سندھی کی روحانی اور اخلاقی شاعری کو اپنے دل میں جگہ دی ۔ لیکن وہ کتابوں میں محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے مکمل طور پر ہم تک نہیں پہنچ سکی ۔ البتہ کچھ ابیات صوفیہ کے ملفوظات سے ملے ہیں ، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ اپنی محفلوں میں سندھی ابیات سناتے تھے اور سندھی ابیات کے ذریعہ مریدوں کو سلوک کے اسرار و رموز سمجھاتے تھے ۔ ان دنوں صوفیائے کرام میں سماع کا عام رواج تھا اور سماع کی محفلیں سندھی ابیات سے گرم رہتی تھیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ سماع سندھی شاعری کی بقا کا بڑا سبب بنا ۔ اس زمانہ میں جو سماع کا نمونہ مروج تھا ، وہ 'تاریخ معصومی' کے مصنف نے بیان کیا ہے ۔ اس میں لکھا ہے کہ محفل میں ایک آدمی اٹھ کر خوش الحانی سے بغیر سرود کے سندھی ابیات پڑھتا تھا ۔ اس کے بعد صوفیہ پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی ۔

فصل سوم

مغل عہد : ۱۵۹۱ء تا ۱۷۰۷ء

(۱۵۹۱ء/۱۰۰۰ھ) میں سندھ کو فتح کرنے کے بعد مرزا عبدالرحیم خانخاناں نے جانی بیگ سے صلح کر لی اور اس کو اکبر کے دربار میں بھیج دیا ۔ اکبر نے جانی بیگ کو دہلی میں روک لیا اور غازی بیگ کو ٹھٹہ کا نواب مقرر کیا ۔ مگر اس کے خلاف بہت سی بغاوتیں ہوئیں ۔ چنانچہ جہانگیر نے اس کو قندھار کا صوبہ دار بنایا ۔ جہاں ۱۶۱۲ء/۱۰۲۱ھ میں اس کا انتقال ہوا ۔ ادھر ٹھٹہ اور بکھر پر دو الگ الگ صوبیدار آتے رہے ۔ محمد شاہ (۱۷۱۹ء - ۱۷۴۸ء) کے زمانہ میں مغل طاقت کمزور ہو گئی اور سندھ میں کلہوڑا خاندان نے زور پکڑنا شروع کیا ۔ آخر کار کلہوڑوں نے اس ملک پر مکمل قبضہ کر لیا اور مرکز سے گورنر آنا بند ہو گئے ۔

مغل حکمران فنونِ لطیفہ کے بڑے قدردان تھے ۔ اس وجہ سے ایرانی فنکار یہاں بھی آئے تھے ۔ ان کے لیے سندھ ایک سرحدی صوبہ تھا جس سے ان کو گزرنا پڑتا تھا ۔ ٹھٹہ میں غازی بیگ جیسا صوبہ دار آیا جو خود بھی فارسی زبان کا اچھا شاعر تھا اور وقاری تخلص کرتا تھا ۔ اس کے علاوہ شعراء کا قدردان بھی تھا ۔ اس لیے ایرانی شعراء جب سندھ سے گزرتے تو کچھ عرصہ سندھ میں قیام کرتے تھے ۔ مثلاً شیخ علی حزیں ، سرمد مست ، طالب آملی ، ملا مرشد بروجردی وغیرہ ۔ میر نعمت اللہ بھی پہلے سندھ میں آئے اور سندھ میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد گجرات ، ہند اور دکن پہنچے[1] ۔

اس کے علاوہ سندھیوں کی ہندوستان کی طرف آمد و رفت بھی ہونے لگی ۔ اس طرح ٹھٹہ ایک بڑا علمی مرکز بن گیا ۔ اس میں ایک وقت ۴۰۰ چھوٹی بڑی درسگاہیں تھیں ۔ دوسرے دینی اور دنیوی علوم کے علاوہ ٹھٹہ طلا کاری اور خوش نویسی کے لیے ایشیا بھر میں ممتاز تھا ۔ شجاع ٹھٹوی شیرازی کو جو نسخ اور نستعلیق کی خوش نویسی میں یگانۂ عصر تھا ، خانخاناں اپنے ساتھ گجرات لے گئے اور اپنے کتب خانہ میں اعلیٰ نگران کی حیثیت سے

---

۱ ۔ مولائی شیدائی ، رحیم داد خان ، جنت السندھ ، ص ۴۱۴ ۔

رکھا[1] - 'مآثر رحیمی' میں ان سندھی انشا پردازوں اور خوش نویسوں کے نام موجود ہیں جو شاہی درباروں اور آمراء کے کتب خانوں میں نیک نامی حاصل کر چکے تھے - یہاں دو ایک نام مثال کے طور پر دیے جاتے ہیں - ملا عبدالرحیم ہراتی عنبرین رقم ، ملا محمد امین مشہدی وغیرہ ٹھٹہ سے احمد آباد پہنچلے اور بڑی بڑی تنخواہوں پر مقرر ہوئے . ملا عبدالرحیم نے حوش نویسی میں برصغیر ہند میں اتنی شہرت حاصل کی ، کہ شاید محمد حسین کشمیری کے علاوہ دوسرا کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا - انہوں نے اکبر کو بھی 'خمسۂ نظامی' لکھ کر پیش کی جو اس وقت لندن میں ہے - ملا محمد امین کی تنخواہ ان دنوں چار ہزار روپے تھی - اکبر نے اس کو اپنے فتح پور سیکری والے شاہی کتب خانہ میں بڑا عہدہ دیا[2] - سندھ میں بڑے بڑے کتب خانے تھے - سندھ کے شہر لاڑکانہ میں کاغذ بھی بنایا جاتا تھا[3] - خوش نویسوں ، عالموں اور دوسرے شاعروں کے علاوہ دوسرے علوم اور صنعتوں کے ماہرین بھی سندھ سے ہندوستان جاتے رہے - 'توزک جہانگیری' سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا اسد قصہ خوان ٹھٹہ سے جہانگیر کے دربار میں پہنچا - جہانگیر اس کی قصہ خوانی سے اتنا محفوظ ہوا کہ اسے محفوظ خان کا خطاب دیا اور ایک ہزار روپیہ ، خلعت . گھوڑا ، ہاتھی اور ایک پالکی دی - اس کے علاوہ دو صدی ذات اور بیس سوار کے منصب سے بھی سرفرازا[4] -

اس طرح ہندوستانی علماء اور شعراء بھی سندھ میں آتے رہے - ان دنوں بلگرامی سادات وقائع نویسی کے سلسلہ میں سندھ میں آئے اور بکھر ، سیوہن اور ٹھٹہ میں رہے - مثلاً میر عبدالجلیل بلگرامی ، سید محمد اشرف ، سید کرم اللہ ، سید محمد نوح ، سید محمد بلگرامی اور سید غلام علی آزاد بلگرامی اپنے زمانہ کے بڑے عالم اور شاعر تھے - ان کے علاوہ سید محمود صابر رضوی استر آبادی ، محمد سعید راہبر گوالیاری ، میر علی جعفر بے نوا ، سید فضائل علی خان بے قید ، محسن الدین شیرازی سورتی بھی سندھ میں کچھ وقت رہے[5] - اس طرح سندھیوں کا وسط ایشیا کے بجائے ہندوستانی علماء اور شعراء سے ربط و ضبط قائم ہوا -

کیونکہ مغلوں کو فارسی سے گہری دلچسپی تھی ، اس لیے سندھ میں فارسی کا اور

---

۱ - مولائی شیدائی ، رحیم داد خان ، تاریخ تمدن سندھ ، ص ۵۴۵ -

۲ - مولائی شیدائی ، رحیم داد خان ، تاریخ تمدن سندھ ، ص ۵۴۷ - سید یوسف بخاری دہلوی ، خطاطی اور ہمارا رسم الخط ص ۵۱ - ۵۲ - ۱۹۵۹ء

۳ - Shah Abdul Latif of Bhit, Sorely H.T.

۴ - تزک جہانگیری - اردو ترجمہ ، ص ۲۴۱ - ۲۴۲ - ۱۹۶۷ء

۵ - راشدی ، مضمون سید حسام الدین ، ص ۷ - ۸ ، ماہنامہ نئی زندگی - ماہ مارچ ۱۹۵۲ء -

بھی استحکام ہوا ۔ سندھیوں نے بھی فارسی شاعری میں بڑا نام پیدا کیا ۔ اس زمانہ کے بہت سے فارسی گو شعراء کے نام ملتے ہیں ۔ ملا محب علی ، ملا محمد صوفی ، ھیوری ، تتبع اللہ ، محمد فاضل حیرتی ، ملا سلامی ، ملا عبدالحکیم ، محمد میر ، ملا یار محمد خادم ، محمد حسین شوق ، عبدالشکور ، اخوند محمد شفیع ، محمد محسن ، محمد پناہ رجا ، محمد صالح واثق ، اخوند فیض اللہ طپش وغیرہ ۔ میر علی شیر قانع کی کتاب 'مقالات الشعراء' میں ان کا ذکر موجود ہے ۔ فارسی کی مقبولیت کے سبب اس دور میں بھی سندھی شاعری کی طرف کم توجہ دی گئی ۔

نواب حفظ اللہ خان (۱۶۹۱ء - ۱۷۰۱ء) صوبہ دار ٹھٹھ کے زمانہ میں بہت سے غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا ۔ اس لیے ان کے لیے سندھی زبان میں مذہبی کتابوں کی ضرورت پیش آئی ۔ ٹھٹھ کے ایک عالم مخدوم ابوالحسن نے عربی رسم الخط میں کچھ اضافے کر کے عربی سندھی رسم الخط بنایا اور اس رسم الخط میں الف اشباع کی طرز پر ایک مکمل اور ضخیم کتاب 'مقدمۃ الصلوات' ۱۷۰۰ء لکھی گئی ۔ اس کتاب میں نماز کے مسائل ہیں ۔ یہ کتاب 'مخدوم ابوالحسن جی سندھی' کے نام سے مشہور ہے ۔ یہی رسم الخط موجودہ سندھی رسم الخط کی بنیاد ہے ۔ اس کے بعد اس قسم کی بہت سی مذہبی کتابیں سندھی زبان میں لکھی گئیں ۔

سندھی شعراء

فاضل بکھری

'ذخیرۃ الخوانین' ، میں شیخ فرید بکھری نے فاضل بکھری کے لیے لکھا ہے : شعر بزبان ہندی از قسم کافی بکمال فصاحت میگفت و قبولیت داشتہ[۱] ۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافی کے بہت اچھے شاعر تھے ۔ کافی کا ہندی یا اُردو شاعری میں کوئی وجود نہیں ۔ البتہ پنجابی اور سندھی میں کافی ایک مقبول صنف رہی ہے ۔ اس لیے ہم مندرجہ بالا عبارت سے یہ مطلب اخذ کر سکتے ہیں کہ اس سے سندھی کافی بھی مراد لی جا سکتی ہے ۔ فاضل بکھری ، 'تاریخ معصومی' کے صاحب میر معصوم بکھری کے چھوٹے بھائی تھے ۔ یہ پندرھویں و سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں گذرے ہیں ۔

---

۱ ۔ بحوالہ ، سندھ کے اردو شعراء ، مضمون ، سید حسام الدین راشدی ، ماہنامہ نئی زندگی ، ص ۹ ۔ ماہ مارچ ۱۹۵۲ء ۔

شاہ لطف اللہ قادری

حیدر آباد کے قریب 'اگھم کوٹ' نامی گاؤں کے رہنے والے تھے ۔ غالباً ۱۶۷۹ء/۱۰۹۰ھ میں فوت ہوئے' ۔ بڑے عالم اور فاضل تھے اور تصوف میں ان کا وسیع مطالعہ تھا ۔ ان کی تین تصانیف ملتی ہیں ۔ دو فارسی کی ہیں اور ایک سندھی رسالہ ہے ، جس میں سندھی ابیات ہیں ۔ ان کی ایک فارسی تصنیف سے بھی کچھ سندھی ابیات ملے ہیں ۔ ان کے تقریباً ۳۰۰ سندھی ابیات کی نشاندہی ہوتی ہے ، جن کا مضمون تصوف ہے اور جس میں سلوک کا راستہ سمجھایا گیا ہے ۔ اس سلسلہ میں حق کی تلاش میں طالبوں اور سالکوں کی جدوجہد کو تمثیل کے طور پر سمندر کے ناخداؤں کو منزلِ مقصود کی طرف چلنے اور جوگوں کے یاتراؤں کے لیے تکلیفیں برداشت کرنے سے مشابہ کیا گیا ہے ۔ اس قسم کی تمثیلیں اس سے پہلے سندھی شاعری میں نہیں ہیں ۔ بعد میں یہ علامتیں شاہ عنایت رضوی اور شاہ لطیف کے کلام میں ملتی ہیں ۔

شاہ لطف اللہ قادری کی ان تمثیلوں اور تشبیہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں سندھی تاجر سمندر کے ذریعہ باہر تجارت کے لیے جاتے تھے اور ان کی عورتیں ان کے آنے کا انتظار کرتیں ۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سندھ میں یوگی یاتراؤں کے لیے دور دور جاتے تھے ۔ فنی لحاظ سے ان کے ابیات چار مصرعوں سے زیادہ مصرعوں پر مشتمل بھی ملے ہیں ۔ حالانکہ ان سے پہلے صرف چند ابیات چار مصرعوں کے ملتے ہیں ۔

شاہ عنایت رضوی

بکھر کے رضوی سادات میں سے ہیں ان کے جد سید علاءالدین بن سید ابراہیم ثانی بکھر سے نقلِ مکانی کے بعد نصر پور میں آ کر سکونت پذیر ہوئے ۔ شاہ عنایت رضوی ان کی اولاد میں سے تھے ۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام شاہ نصیرالدین تھا ۔ شاہ عنایت کی ولادت ۱۶۲۰ء - ۱۶۲۵ء/۱۰۳۰ھ - ۱۰۳۵ھ کے درمیان ہوئی ۔ وقت کے دستور کے مطابق فارسی کی تعلیم حاصل کی ۔ خوشحال خاندان کے فرد تھے ۔ شروع سے ہی ان کو گھوڑوں کا شوق تھا ۔ اس کے علاوہ بھینسوں اور اونٹوں سے بھی خاص دلچسپی رکھتے تھے ۔ سماع اور موسیقی سے بچپن ہی سے دلی لگاؤ تھا ۔ اس لیے میراثیوں کو اپنے پاس بلواتے اور خود بھی ان کے پاس جاتے تھے ۔ ان کی یہ روش ان کے بھائی اور دوسرے عزیزوں کو ناپسند تھی مگر ان کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے یہ شغل جاری رکھا ۔

---

۱ بلوچ ، ڈاکٹر نبی بخش خان ، شاہ لطف اللہ قادری جو کلام ، ص ۱۰ - ۱۱ ، ۱۹۶۸ء ، سندھ یونیورسٹی

روحانی لحاظ سے اپنے والد کے مرشد شاہ خیرالدین جیلانی (مقبرہ پرانہ سکھر) کے مرید تھے اور ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور ان کی زیارت کے لیے بار بار سکھر جاتے تھے ۔ پیری مریدی کا سلسلہ ان کے خاندان میں قدیم زمانہ سے چلا آ رہا تھا ۔ آپ بھی مریدوں کے پاس جاتے تھے ۔ جب نکلتے تھے تو بڑی شان کے ساتھ ۔ آپ نے بڑی طویل عمر پائی ۔ قریباً (۱۷۰۸ء – ۱۷۱۳ء/۱۱۲۰ھ ۱۱۲۵ھ) کے درمیان فوت ہوئے[1] ۔

شاہ عنایت رضوی ، سندھی زبان کے بلند پایہ شاعر ہیں ۔ یہ پہلے سندھی شاعر ہیں جن کا مکمل 'رسالو' ملا ہے ۔ 'رسالو' میں سندھی موسیقی کے سُروں اور سندھی کی رومانوی داستانوں پر ابیات ہیں اور ابیات کے آخر میں 'وائی' ہوتی ہے ۔ اس سے پہلے سندھی شعراء کے چند ابیات مل سکے ہیں ۔ 'وائی' نمونہ بھی پہلی مرتبہ شاہ عنایت کے کلام میں ملتا ہے ۔ اس سے پہلے صرف یہ روایات ملتی ہیں کہ سندھی میں 'کافی' موجود تھی مگر اس کا کوئی نمونہ نہیں ملتا ۔ سندھی دوہڑوں کو بھی شاہ عنایت نے بڑی ترقی دی ۔ ان کے دوہڑوں میں مصرعوں کی تعداد بھی زیادہ ہے اور فنی پختگی بھی موجود ہے ۔ ان کے کلام میں حسن و عشق اور ہجر و وصال کا دل گداز بیان ہوی ہے ۔ اس لیے کلام میں دلکشی ، رنگینی ، روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ ان کے کلام میں معاشی اور معاشرتی حالات کا عکس بھی ملتا ہے ۔

آپ کا کلام اسی زمانہ میں مقبولیت حاصل کر چکا تھا ۔ لیکن بعد میں شاہ لطیف کے کلام کی مقبولیت کی وجہ سے ان کے کلام کی مقبولیت کچھ کم ہو گئی ۔ شاہ عنایت کا کلام ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے مرتب کیا ہے اور سندھی ادبی بورڈ نے بڑے اہتمام سے اسے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا ہے ۔

سید ہارون ہنگوری

ضلع حیدر آباد کے گاؤں 'ہنگوری' کے بزرگ اور شاعر تھے ۔ مغل گورنروں کے زمانہ یعنی سترھویں صدی عیسوی میں گذرے ہیں ۔ نہ آپ کے حالات ملتے ہیں اور نہ کلام ہی حاصل ہوتا ہے ۔

یوسف سہتو

ٹھٹہ کے بزرگ اور سندھی زبان کے شاعر تھے ۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے مقبرہ پر سندھی شاعروں کا میلہ (مشاعرہ) بھی لگتا تھا[2] ۔ سترھویں صدی عیسوی کے شروع کے

---

۱ ۔ بلوچ ڈاکٹر نبی بخش خان (مرتب) حبیب شاہ عنایت جو کلام ، ص ۲۲ تا ۶۰ ، ۱۹۶۳ء

۲ ۔ بدوی ، لطف اللہ ، تذکرہ لطفی ، ج ۱ ، ص ۲۱۱ ۔

معلوم ہوتے ہیں ۔ ان کے حالات بھی نہیں ملتے ۔

عثمان احسانی

اصل بھاگناڑی (بلوچستان) کے باشندہ تھے ۔ بعد میں ۱٦۴۰ء میں لکھی تعلقہ سکھر میں آکر سکونت پذیر ہوگئے ۔ ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ہو سکیں ، صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ سترھویں صدی عیسوی کے ہیں ۔ آپ کی نظم کی کتاب 'وطن نامہ' ملی ہے جس میں آپ نے موت کا ذکر پر اثر اور پر درد انداز میں کیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی حالات نے ان کو قنوطیت کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کے اکثر ابیات چار مصرعوں سے زیادہ مصرعوں پر مشتمل ہیں ان کے کلام کے علاوہ جو سندھی ابیات ملے ہیں ان میں اکثر قافیہ آخری مصرع کے درمیان میں آتا ہے اور کبھی کبھی مصرع کے درمیان میں بھی آ جاتا ہے ۔ لیکن عثمان احسانی کے ابیات میں قافیہ مصرعوں کے آخر میں آتا ہے ۔

۴ ۔ تبصرہ اور ادبی جائزہ

(۱) اس دور کی شاعری کی زبان خالص سندھی ہے ۔ شاہ عنایت رضوی کے کلام میں عربی اور فارسی کے کچھ الفاظ ملتے ہیں ۔ لطف اللہ قادری کے کلام میں تو کچھ ایسے بھی خالص سندھی الفاظ ملتے ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں ۔ اسلوب بیان لیا ہے ۔ اس میں اثر انگیزی ، روانی اور دلکشی زیادہ ہے خاص طور پر شاہ عنایت کے کلام میں جدت اور انفرادیت ہے ۔ حسن و عشق اور ہجر و وصال کا ذکر بھی ملتا ہے لیکن بیشتر کلام کا مضمون عارفانہ ہے ۔ خاص طور پر دنیا کی بے ثباتی کا ذکر دلگداز انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ عثمان احسانی کے پورے کلام میں موت ہی کا ذکر ہے ۔ لطف اللہ قادری کا موضوع بھی دنیا کی بے ثباتی ہی ہے ۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں سندھی عوام و خواص معاشرہ کے حالات کی وجہ سے مایوسی کا شکار تھے ۔

دراصل زندگی سے فرار اس دور کے سیاسی اور ملکی در و بست کی وجہ سے تھا ۔ یوسف میرک بن میر ابوالبقا بکھری نمکین کی تاریخ 'مظہر شاہ جہانی' میں اس زمانے کے پریشان کن حالات کی ایک واضح تصویر موجود ہے ۔ یہ کتاب شاہ جہان کو سندھ کے حالات سے آگاہ کرنے کے لیے لکھی گئی ، لیکن حالات کے نامساعد ہونے کے سبب وہ کتاب بھی بادشاہ تک نہ پہنچ سکی۴ ۔

---

۴ ۔ یوسف میرک ، تاریخ مظہر شاہجہانی (مرتب) سید حسام الدین راشدی ، ۱۹٦۲ء

ان حالات کے باوجود سندھ کے باشندے تجارت کی غرض سے سمندر کے ذریعے دور دور تک جاتے تھے ۔ شاہ لطف اللہ قادری اور شاہ عنایت رضوی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھی تاجر تکلیفیں برداشت کر کے باہر جاتے اور ان کے فراق میں ان کی عورتیں ان کے لیے روتیں اور انتظار کی گھڑیاں مصیبت سے کاٹتی تھیں ۔

عام مایوسی اور نا امیدی کی وجہ سے اس دور کی سندھی شاعری میں دنیا کی بےثباتی کا ذکر ملتا ہے اور تصوف کی طرف رجحان معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ ایسے پریشان کن حالات میں تصوف کے ذریعے روحانی سکون ملتا ہے ۔ اس لیے عوام و خواص تصوف کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں ۔

اصنافِ سخن

اس دور میں شاہ عنایت رضوی کے کلام میں 'وائی' کے نمونے ملتے ہیں ۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے یہ کافی کا ہی دوسرا نام ہے ۔ شاہ عنایت کے کلام میں ابیات کے بعد ایک یا دو وائیاں آتی ہیں ۔ شاہ لطیف کے 'رسالو' میں بھی یہ ترتیب ہے ۔ اس سے پہلے صرف کافی ہی نظر آتی ہے ۔ لیکن کوئی مستند نمونہ نہیں ملتا ۔ دوہڑہ بھی کثیر تعداد اور ترقی یافتہ صورت میں ملتا ہے ۔ 'الف اشباع' کی شاعری نے بھی اس دور میں بڑی ترقی کی اور اس میں مکمل کتابیں لکھی گئیں ۔

مشاعرہ کا وجود بھی اسی دور میں ملتا ہے ۔ 'یوسف سہتو' کے مزار پر سندھی شاعروں کا میلہ (مشاعرہ) ہوتا تھا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں کے عرس پر شاعروں کا اجتماع ہوا کرتا تھا ۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سندھی شاعری عوام میں مقبول تھی ، لیکن زمانہ کی گردش کی وجہ سے بہت تھوڑے شعراء کا کلام ہم تک پہنچا ہے ۔

(۲) اس دور میں تاریخ نویسی کی طرف بھی خاص توجہ دی گئی ۔ اس سے پہلے کی صرف ایک تاریخ 'چچ نامہ' ملتی ہے ، جس میں محمد بن قاسم کی فتح تک کا ذکر ہے ۔ اس دور میں تاریخ نویسی کا احیاء ہوا اور سندھ کی تاریخیں بھی فارسی میں لکھی گئیں ۔ جن کا مختصر تعارف یہاں پیش کیا جاتا ہے :

تاریخ معصومی ۔

اس کا دوسرا نام 'تاریخ سندھ' ہے ۔ سندھی تاریخ کے لیے اس کتاب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔ اس کے مصنف میر معصوم نامی بن سید صفائی ترمذی الکبیری (م ۔ ۱۰۱۴ھ)

ہیں۔ یہ کتاب انہوں نے (۱۵۹۹ء - ۱۶۰۰ء) میں تصنیف کی ۔ اس کے انگریزی ، اردو اور سندھی ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں ۔

حدیقۃ الاولیاء

اس میں سندھ کے ۴۴ عالموں اور بزرگوں کا ذکر ہے ۔ اسے سید عبدالقادر بن سید محمد ہاشم ٹھٹوی نے سترھویں صدی عیسوی میں تصنیف کیا ۔

بیگلر نامہ

ارغون اور ترخان دور پر ایک مفید تاریخ ہے ۔ اسے ادارکی بیگلاری نے ۱۶۰۸ء میں لکھا ۔

تاریخ طاہری

یہ بھی ارغون اور ترخان دور کے متعلق ہے ۔ اس کے مصنف میر طاہر محمد سیانی ہیں ۔

مظہر شاہجہانی

میر یوسف بن میر ابوالقاسم بکھری نے ۱۶۳۴ء میں شاہجہان کو سندھ کے حالات سے آگاہ کرنے کے لیے لکھی ۔

ترخان نامہ

اس میں ارغون اور ترخان دور کی ابتدائی تاریخ سے لے کر ۱۶۵۰ء تک کے حالات ہیں ۔ اس کتاب کے مصنف سید جمال الدین ہیں اور یہ ۱۶۵۴ء میں تصنیف ہوئی ۔

سندھ میں اُردو شاعری

مغل گورنروں کی وجہ سے سندھ میں کچھ ایسے لوگ بھی آئے جو اردو میں شعر کہتے تھے ۔ کچھ دوسرے اردو شعراء بھی سندھ میں وارد ہوئے ۔ ان میں محمود صابری ، محمد سعید راہب ، میر علی جعفر بے نوا ، سید فضائل علی خان بے قید ، حسین الدین شیرازی اور عماد الملک نواب غازی الدین فیروز جنگ کے نام ملتے ہیں ۔ ان کی

آمد و رفت کی وجہ سے سندھیوں میں بھی اُردو میں شعر کہنے کا ذوق پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس دور کے ایسے سندھیوں کے نام ملتے ہیں جو اُردو میں شعر کہتے تھے ۔ ان کا مختصر ذکر ذیل میں دیا جاتا ہے[1] ۔

شیخ ورو

یہ سندھی شاعر ہیں لیکن ان کا نام اُردو شعراء میں متقدم ہے۔ ان کا زمانہ اٹھارھویں صدی کا تیسرا عشرہ ہے ۔

عبدالسجان فائز ٹھٹوی

یہ بھی شیخ ورو کے زمانے کے شاعر ہیں ۔ ان کی فارسی شاعری ظرافت او بذلہ سنجی کے سبب سے شعریت سے خالی ہے ، لیکن انہوں نے ہندی (اُردو) میں اچھے شعر کہے ہیں۔ ان کا اُردو کلام مرثیہ اور منقبت کی صنف سے تعلق رکھتا ہے ۔

سید حیدر الدین کامل

آپ سندھی ، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ صاحب 'مقالات الشعراء' ان کی بہت تعریف کرتے ہیں ۔ آپ نے ۱۷۵۰ء میں وفات پائی ۔

یہ سندھی شعراء بھی اُردو شعر کہنے میں ہندوستانی طرز کی تقلید کرتے نظر آتے ہیں ۔ چونکہ یہ دور ایہام گوئی کا زمانہ ہے اس لیے ان شعراء کے کلام میں بھی یہی انداز پایا جاتا ہے۔

---

۱ ۔ راشدی ، سید حسام الدین مضمون ، سندھ کے اُردو شعراء ، ماہنامہ نئی زندگی ، ص ۸ ، مارچ ۱۹۵۲ء

باب سوم

فصل اول : ۱۷۰۰ء تا ۱۷۸۲ء

کلہوڑوں کی ابتدائی تاریخ (۱۷۰۰ء - ۱۷۶۳ء)

کلہوڑوں کے مورث اعلی کے متعلق تاریخ 'تحفۃ الکرام' میں اختصاراً ذکر کیا گیا ہے :

ترجمہ : ' تاریخ کے جاننے والوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اسب نامہ کے ماہرین ، اس گروہ کے نسب کو حضرت عباسؓ عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی سمجھتے ہیں'' ۔

اکثر مؤرخین نے کلہوڑوں اور داؤد پوتوں (یہ ایک ہی خاندان کے ہم نژاد تھے) کو عباسی تسلیم کیا ہے ۔ سلطان احمد ۱۳۶۹ء میں سندھ آئے ۔ سلطان احمد عباسی کی اولاد سے ، آدم شاہ ایک صاحب دل بزرگ گزرے ہیں وہ میران محمد جونپوری بانی مہدویہ طریقہ کے مریدوں میں داخل تھے ۔ اور چانڈو کے پرگنہ (لاڑکانہ ضلع) میں آباد ہو گئے ۔ آپ کے دو فرزند تھے ۔ داؤد اور ابراہیم ۔ آپ کے بعد داؤد فقر کی مسند پر بیٹھے ۔ میاں داؤد کے زمانہ میں بھی ارادتمندوں میں اضافہ ہوتا رہا ۔ میاں داؤد کی وفات کے بعد آپ کے دو بیٹوں الیاس اور شاہ علی میں سے الیاس مسند نشین ہوا اور میاں الیاس کے بعد ، میاں شاہ علی ۔ یہ بڑا متقی ، خدا پرست اور عقل مند شخص تھا ۔ اس کے زمانہ میں رشد و ہدایت کا کام ، وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا ۔ ۱۶۵۷ء میں ایک مسلّح جنگ میں وہ شہید ہو گیا ۔ چنانچہ شاہ علی کی شہادت کے بعد اس کا بھتیجا میاں نصیر محمد مسند پر بیٹھا ۔

میاں نصیر محمد سے یار محمد تک

میاں نصیر محمد دلیر انسان تھا ۔ وہ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے ، پنھواڑوں ، بھکر کے مغلوں اور سبّی کے افغانوں سے بیک وقت لڑتا رہا ۔ رفتہ رفتہ اس

نے سندھ کے بڑے حصہ پر قبضہ حاصل کر لیا ۔ پینتیس سال کی کامیاب زندگی کے بعد ۱۶۹۲ء میں وفات پائی ۔

میاں نصیر محمد کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا دین محمد مسند نشین ہوا ۔ میاں دین محمد کے بھائی میاں یار محمد نے اس کے خلاف کچھ عرصہ کے بعد اپنے مریدوں کے ساتھ خروج کیا اور لاڑکانہ اور اس کے مضافات پر قابض ہو گیا ۔ بختاور خان جو علاقہ کا حاکم تھا مارا گیا ۔ پھر سبّی اور کوہستان کی حکومت بتدریج میاں یار محمد کے ہاتھ آ گئی ۔ اس نے خدا آباد (ضلع دادو) شہر کی بنیاد رکھی اور اس کو اپنی جمعیت کا مرکز بنایا ۔ یار محمد کی وفات ۱۷۱۹ء میں ہوئی ۔

کلہوڑوں کی باقاعدہ حکومت

میاں نور محمد کلہوڑا (۱۷۳۶ء - ۱۷۵۷ء)

میاں یار محمد کی وفات کے بعد اس کا بیٹا میاں نور محمد جانشین ہوا ۔ اس امیر کے دور میں سندھ بڑی حد تک مغلیہ حکومت سے آزاد ہو گیا ۔ یار محمد کی وفات سے ، چار روز بعد شہزادہ روشن اختر ، محمد شاہ کے لقب سے اور سادات بارہہ کی مدد سے ، دہلی کے تخت پر متمکن ہوا ۔ شمالی سندھ میں بنگال سے ہند تک ابھی مغل شہنشاہیت قائم تھی ۔ نور محمد کو ابتدا میں سندھ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے لڑ کر اپنی جمعیت بڑھانی پڑی ۔ اس کے چچازاد برادر زادے داؤد پوتے اس کی اطاعت کے لیے تیار نہ تھے ۔ لہذا ان کے درمیان کچھ وقت کے لیے لڑائیاں ہوتی رہیں ۔ شروع شروع میں نور محمد کو کامیابی نہ ہوئی مگر کچھ عرصہ کے بعد ، اس کا داؤد پوتوں کے مرکزی شہر شکار پور پر قبضہ ہو گیا ۔ ٹھٹھ میں آخری مغل صوبہ دار صادق علی خان ۱۷۳۶ء میں اپنے عہد سے فارغ کیا گیا ۔ اب محمد شاہ مغل شہنشاہ اس بات پر مجبور ہو گیا کہ پورا سندھ نور محمد کلہوڑا کو ٹھیکہ پر دے دے ۔ یہ ۱۷۳۶ء کا واقع ہے ۔ اس کے تین سال بعد ہی نادر شاہ کا حملہ ہوا جس سے برِ صغیر کا تمام شمال مغربی علاقہ پائمال ہوا [1] ۔

نادر شاہ کا حملہ

۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے دہلی کو فتح کر لیا ۔ واپسی پر اس نے سندھ کی راہ سے ایران جانے کا ارادہ کیا ۔ جب وہ سندھ کی حدود میں داخل ہوا تو میاں نور محمد ہراساں

---

۱ - فرید آبادی ، ہاشمی ، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ، ص ۸۲ ، ۱۹۵۳ء ۔

ہوا اور اپنے اہل و عیال کو لے کر عمر کوٹ میں پناہ گزین ہوگیا بکھر کے قریب نادر شاہ نے اس سے ایک کروڑ روپیہ تاوان جنگ لے کر ، اس کی حکومت بحال کر دی اور اسے 'شاہ قلی' کا خطاب دیا ۔

نادر شاہ کی طوفانی یلغار کے ٹل جانے کے بعد ، نور محمد کی جارحانہ کارروائیاں کچھ وقت کے لیے تو رک گئیں ، لیکن اس کی وفات کے بعد وہ پھر مطلق العنان ہو گیا ، اور سال ۱۷۴۲ء میں اس نے شکار پور پر فیصلہ کن حملہ کر دیا۔ امیر صادق محمد خان میدان جنگ میں شہید ہوا ، اور شکار پور کا شہر پھر نور محمد کی تحویل میں آ گیا ۔ بقیۃ السیف داؤد پوتوں نے ہمیشہ کے لیے ترکِ وطن کیا اور شمال کی طرف بڑھ گئے ، اور وہاں ایک نئی ریاست یعنی بہاولپور کی بنیاد رکھی ۔

احمد شاہ ابدالی

نادر شاہ کی موت کے بعد ، جب ایران کی سلطنت میں انتشار پیدا ہوا تو نادر شاہ کی فوج کے ایک سردار ، احمد خان درانی نے افغانستان میں اپنی حکومت کی بنیاد رکھی ۔ ۱۷۵۵ء میں احمد شاہ جب پنجاب پر حملہ کرنے کے لیے ، بولان کے درّے سے گزر کر سندھ میں آیا تو نور محمد متوحش ہو کر جیسلمیر کی طرف بھاگ گیا لیکن بعد میں نور محمد کی حکومت بحال کر دی گئی ۔ نور محمد کی موت کے بعد ، اس کے بیٹوں میں تھوڑے وقت کے لیے خانہ جنگی ہوتی رہی اور اس کا بڑا بیٹا ، محمد مراد یاب خان اس جنگ میں کامیاب رہا ، مگر سرداروں نے اسے معزول کر کے قید میں ڈال دیا اور اس کے بھائی ، میاں غلام شاہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی ۔

میاں غلام شاہ ۔ شاہ وردی خان (۱۷۵۶ء - ۱۷۷۲ء)

میاں محمد مراد یاب خان کے قید ہونے کے بعد ، اس کے بھائیوں نے بغاوت کی مگر غلام شاہ اس خانہ جنگی میں کامیاب رہا ، اور ۱۷۶۱ء کے آغاز میں احمد شاہ ابدالی کی طرف سے اسے حکومت کی سند اور شاہ وردی خان کا خطاب ملا[1] ۔ بعض بہادرانہ کارناموں کے باعث احمد شاہ ابدالی نے اسے صمصام الدولہ کا لقب بھی عطا کیا اور ڈیرہ جات (ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازی خان) کی نیابت بھی اسے تفویض کر دی ۔ ان علاقوں میں میاں نے اٹھتی ہوئی بغاوتوں کا خاطر خواہ سدّ باب کیا[2] ۔

---

۱ - قانع تتوی ، میر علی شیر ، تحفۃ الکرام ، جلد سوم ، ص ۱۱۳ ۔
۲ - شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ ، تاریخ سندھ (انگریزی) ، ص ۱۶۲ ۔

تاسیس حیدر آباد

کلہوڑا حکمرانوں کا دارالخلافہ خدا آباد تھا ، لیکن چونکہ غلام شاہ کو تعمیرات کا بڑا شوق تھا ۔ اس نے ایک نیا دارالحکومت بنانے کا ارادہ کیا ۔ دریائے سندھ کے کنارے پر ، نیرون کوٹ کے قدیم مقام کو پسند کر کے وہاں ذی قعدہ ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء میں ایک نئے قلعہ کی تعمیر کا حکم دیا اور اس کو حیدر آباد کا نام دیا ۔ یہ شہر تھوڑے عرصہ میں پُر رونق ہو گیا ۔ قلعے کی تعمیر کے بعد محمد مراد یاب خاں خدا آباد سے یہاں منتقل ہو گیا ۔ اور حیدر آباد مستقل طور پر سندھ کا دارالحکومت بن گیا ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میاں غلام شاہ ایک کامیاب حکمران تھا ۔ اس کے دور حکومت میں ، سندھ کلی طور پر اجنبی طاقتوں سے آزاد ہو گیا اور ہر طرف امن و امان تھا ۔ ملک کی صنعتی ، تجارتی اور اقتصادی حالت ترقی کر رہی تھی ۔ اس نے ۱۷۷۲ء میں وفات پائی ۔

میاں محمد سرفراز خاں

میاں غلام شاہ کی وفات کے بعد ، اس کا بیٹا میاں محمد سرفراز خاں تخت نشین ہوا ۔ وہ خود ایک باکمال سخن گو تھا ، اس لیے اس کا دربار شاعروں اور عالموں کا گہوارہ بن گیا ۔ غلام شاہ کی وفات کے بعد کچھ کے راؤ نے پھر سر اٹھایا ، لیکن محمد سرفراز نے ان کو کچل دیا ۔ کچھ کے راؤ کے ساتھیوں اور جاریجہ قوم کے سرداروں کو پامال کیا ۔ ان کامیابیوں کی بدولت اس کی حکومت پختہ بنیادوں پر قائم ہو گئی ۔ ملک میں ہر طرف امن و امان تھا کہ حالات نے پلٹا کھایا اور میر شہداد خان اور میر بہرام خان یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے ۔ کلہوڑوں کے ابتدائی دور سے ، تالپور خاندان والے اپنی ارادت اور وفا کشی کے باعث اس خاندان کی خدمت کرتے چلے آئے تھے ۔ میر شہداد خان نے جو اس قوم کا رئیس تھا ، میاں یار محمد اور نور محمد کے زمانہ میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں کر کے دکھائے تھے ۔ میر شہداد کی وفات کے بعد اس کا فرزند میر بہرام بھی اسی طرح میاں غلام شاہ کا وفادار ساتھی رہا ۔ میاں غلام شاہ کی وفات کے بعد میر بہرام نے اپنے ولی نعمت کے فرزند محمد سرفراز خان کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں دکھائی ۔ لیکن بدقسمتی سے میاں محمد سرفراز جو ایک الہڑ نوجوان تھا اور بشالہ سیاست سے اتنا واقف نہیں تھا ، میاں میر بہرام کے حاسدوں کے پنجہ میں آ گیا ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موصوف اس کی نگاہوں میں معتوب بن گیا ۔ میاں نے ناعاقبت اندیشی

سے کام لے کر ، میر بہرام اور اس کے فرزند میر صوبیدار کو سر دربار قتل کرا دیا ۔ اس المناک واقعہ کی تاریخ ، کسی شاعر نے اس طرح لکھی ہے :

زہے میر بہرام بہرام رزم — کہ غرمش سر نیزہ بر ماہ زد
بیازیچہ در عرصہ گاہ نبرد — اگر رخ زدے بر رخ شاہ زد
ولیکن چو تقدیر بود این‌چنین — قضا از جفا تیغ ناگاہ زد

بسال وصالش ملک بر فلک
بگفتا بفردوس خرگاہ زد

میر بہرام کے حاسدوں نے ایسے معہ اس کے فرزند کے سازش کر کے سر دربار قتل تو کروا دیا لیکن میر بہرام کی وفات کی خبر جب اس کے عزیزوں کو ملی تو وہ میاں سرفراز خان پر چڑھ آئے اور میاں کو معزول کر کے قید خانہ میں ڈال دیا ۔ وہ اعلیٰ درجہ کا شاعر تھا ۔ اس کا فارسی اور سندھی کلام موجود ہے ۔ سندھی کلام میں اس کی ایک مدح خاص طور پر مشہور ہے ۔ ایک روایت کے مطابق میاں نے یہ مدح ایامِ اسیری میں لکھی تھی ۔ یہاں اس مدح سے چند بند نقل کیے جاتے ہیں :

بسم اللہ سے ابتدا کرتا ہوں ،
کہ اے محمد شاہ ،
خدا کے لیے مجھے پناہ دے !
خود کو دیکھ کر میں نے
آپ کے حضور میں فریاد پیش کی ہے
میری مدد کو پہنچیے میرے سردار !
اس غلام کی التماس کو اچھی طرح سے سنا جائے ،
میں نادان ہوں اور ،
غم میرا ساتھی ہے ۔
آپ صادق ہیں ، میری صدا سنیں ،
اپنے کرم کو پیشِ نظر رکھ کر
مجھے عافیت کے انعام عطا فرمائیں ،
میرے سردار ! اس غلام کی التماس کو اچھی طرح سے سنا جائے ! (ترجمہ)

یہ مدح بہت طویل ہے اور سوز و گداز سے بھری ہوئی ہے ۔ غالباً محمد سرفراز خان پہلا سندھی شاعر تھا جس نے سندھی شاعری میں مدح کی بنیاد رکھی ۔

کلہوڑوں کا زوال

محمد سرفراز خان کے عزل کے بعد ، تالپوروں نے ، سرفراز خان کے بھائی محمود خان کو عارضی طور پر تخت نشین کیا ، لیکن بعد میں اس کو بھی معزول کر کے ، میاں نور محمد کے ایک فرزند غلام نبی کو مسند نشین کر دیا ۔ چونکہ وہ میر بہرام خان کے فرزند میر بجار سے ہر دم خائف رہتا تھا اس لیے ہمیشہ اس کے خلاف منصوبے باندھتا رہا ۔ حتٰی کہ میاں غلام نبی کی مستقل ریشہ دوانیوں سے مشتعل ہو کر وہ غلام نبی پر چڑھ آیا ۔ ایک خونریز لڑائی میں میاں ، خود اپنے حلیفوں کے ہاتھوں بیدردی سے قتل ہو گیا[1] ۔

میاں غلام نبی کی وفات کے بعد ، میر بجار خان خدا آباد میں پہنچا لیکن حکومت کلہوڑوں کے ہاتھوں میں رہنے دی اور غلام نبی کے چھوٹے بھائی میاں عبدالنبی کو تخت نشین کیا ۔ مگر یہ بڑا سفاک انسان نکلا ۔ اس نے تخت حاصل کر کے ، اپنے عزیزوں کو جو قید خانہ میں تھے قتل کروا دیا ۔ چونکہ میاں عبدالنبی کے زمانے میں سندھ کے اندر جا بجا بدامنی موجود تھی اور میاں غلام نبی کے عہد میں، کسی قسم کا خراج افغانستان کے بادشاہ تیمور شاہ (جانشین احمد شاہ) کو نہیں ملا تھا اس لیے وہ بہت آزردہ خاطر ہوئے اور احمد یار کلہوڑے کے فرزند عزت یار خان کو ، جو اس وقت افغانستان میں تھا ، سندھ کی حکومت کا پروانہ دے کر افغانی فوج کے ساتھ سندھ روانہ کیا ۔ لیکن میر بجار کو اس بیرونی مداخلت پر بڑا غصہ آیا اور ایک بڑی فوج سے مقابلہ کے لیے نکلا ۔ احمد یار کلہوڑے کے فرزند عزت یار اور میر بجار کے درمیان یہ لڑائی شکار پور کے قریب لڑی گئی ، اور عزت یار خان اور اس کے افغانی ساتھیوں کو شکست ہوئی ۔ میر بجار نے بڑھ کر شکار پور پر قبضہ کر لیا ۔

تیمور شاہ کی سندھ میں آمد

عزت یار خان کی شکست اور شکار پور پر تالپوروں کے قبضہ کی خبر سن کر تیمور شاہ پسر احمد شاہ ابدالی خود سندھ پر حملہ کرنے کے لیے نکل پڑا ۔ میر بجار بھی اپنا لشکر لے کر روہڑی پہنچا ۔ مگر چند منزل بڑھ کر ایک عریضہ شاہ کی خدمت میں بھیج

---

۱ شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ ، تاریخ سندھ (انگریزی) ، ص ۱۸۳ ۔

دیا ، جس میں اس کی آمد کا خیرمقدم کیا گیا تھا ۔ اس عریضہ کو دیکھ کر شاہ کا غصہ فرو ہو گیا ۔ اس نے میر بجار اور میاں عبدالنبی کو دربار میں بلایا اور بڑی عزت اور تکریم کی اور ان سے لشکر کشی کا خرچ لے کر افغانستان واپس چلا گیا ۔

میر بجار کا قتل

میر بجار کی ان پیہم کامیابیوں کے باعث ، میاں عبدالنبی اس سے خائف رہنے لگا ۔ وہ چاہتا تھا کہ خود مختار بن کر حکومت کرے ۔ مگر میر بجار کے ہوتے ہوئے ، یہ نا ممکن تھا ۔ اس لیے اس نے جودھ پور کے راجا سے سازش کر کے میر صاحب کے قتل کا منصوبہ باندھا اور دو ہندو قاتلوں کے ہاتھوں اسے قتل کروا دیا ۔ چونکہ عبدالنبی اس سازش میں شریک تھا اس لیے وہ تالپوروں کے خوف سے قلات کی طرف بھاگ گیا ۔ تالپوروں کو جب اس حادثہ کی خبر ہوئی تو انھوں نے میاں عبدالنبی کو معطل کر کے ، کلہوڑا خاندان سے ایک فقیر منش فرد کو تخت نشین کر دیا ۔

مدد خاں سندھ میں

میر بجار کی وفات کے بعد اس کا فرزند عبداللہ خان تالپوروں کا سردار منتخب ہوا ۔ اس نے بڑی فوج لے کر ، انتقام لینے کی غرض سے جودھ پور پر حملہ کر دیا ۔ جس میں جودھ پور کے راجا کو شکست ہوئی ۔

اسی اثناء میں افغان فوج کا سپہ سالار ، سردار مدد خاں ، بادشاہ کے حکم سے عبدالنبی کی امداد کے لیے ڈیڑہ اسمعیل خان سے سندھ میں وارد ہوا ۔ میاں عبدالنبی قلات سے چل کر ، مدد خان کے پاس گیا اور سردار مدد خان سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی فوج کے اخراجات کو برداشت کرے گا مگر چونکہ اس کے پاس کوئی خزانہ نہ تھا اس لیے سردار مدد خان کے مطالبہء زر سے وہ گھبرا اٹھا ۔ اور لیت و لعل کرنے لگا ۔ اس پر سردار موصوف نے میاں کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے غارت گری کا بازار گرم کر دیا ۔ بہر حال عبداللہ خان اب مدد خان کے مقابلہ کے لیے تیار تھا ۔ چونکہ مدد خان تالپوروں سے جنگ نہیں چاہتا تھا اس لیے طرفین میں صلح و صفائی ہو گئی ۔ میاں عبدالنبی دوبارہ تخت نشین ہوا اور مدد خان قندھار واپس چلا گیا ۔

کلہوڑوں کے دور میں سندھی شاعری

سندھی شاعری کے اکثر نقادوں نے کلہوڑا دور کو سندھی شاعری کا زرّین دور لکھا

ہے اس دور میں نہ صرف سندھی شاعری کے بڑے بڑے نمائندے پیدا ہوئے، بلکہ سندھی شاعری کی اصناف اور ہیئت میں اہم تبدیلیاں نمودار ہوئیں - کلہوڑوں کے دور سے پہلے ، سندھی بیت ، ہندی دوہے کی مطابقت میں فقط دو بیتی تک محدود تھے - لیکن اس دور میں بیت کے مصرعوں میں اضافہ ہوا ، یہ اضافہ بعض اوقات سات سات مصرعوں تک پہنچ گیا - اس لیے بیت میں مضمون کو تفصیل سے پیش کرنے کی سبیل نکل آئی - اس دور میں ایک اور صنف ایجاد ہوئی جس کو 'وائی' کا نام دیا گیا۔ 'وائی' کے معنی ہیں انوکھی بات۔ اس کی ترتیب بندی بھجن کی سی ہے - اور مضمون کے لحاظ سے غزل سے قریب قریب ہے یہاں ایک وائی کا ترجمہ پیش کیا جاتا :

وہ میرے تن کا طبیب ہو گا ، وہ میرے درد کا علاج ہو گا!
اپنے قرب کی وہ دوا ، کاش وہ عجیب آ کر دے !
وہ میرے درد کا علاج ہوگا -
اس دوست نے خود آ کر ، اس غریب کی حالت پر غور کیا ہے ،
وہ میرے درد کا علاج ہو گا -
عبداللطیف کہتا ہے ، میرا حبیب حاذق ہے
وہ میرے درد کا علاج ہو گا ! (ترجمہ)

کلہوڑوں کے دور میں ہمیں عروضی شاعری کا بھی نشان ملتا ہے - مخدوم عبدالرؤف بھٹی کے چند مولود ، ہمیں عروض کی پابندی میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں - ان کا ہالا کے مشائخ میں شمار ہوتا ہے - اس بزرگ نے ۱۷۵۲ء میں وفات پائی - مولود بھی مقصد نعتیہ شاعری ہے - مخدوم صاحب اس صنف کے اوّلین موجد تھے - ایک مولود کے چند اشعار کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے :

کاش سارے ملکوں کو ڈھونڈ کر ،
میں اپنے میر مرسل کے مناروں کو جا کر دیکھوں -
ہالا سے چل کر میسا میں پہنچوں ،
الٹرپور کو چھوڑ کر آگے بڑھوں ،
مٹاری سے گزر کر ،
آگے گلی مالجی کو قربان کر دوں
لنگر (ٹھٹھہ) یا کانا کلاچی کے بندروں پر آگے بڑھ جاؤں ! (ترجمہ)

شاہ عبداللطیف بھٹائی (۱۶۹۰ء - ۱۷۵۱ء)

کلہوڑوں کے دورِ حکومت کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس میں سندھی زبان کے عظیم المرتبت شاعر اور مفکرِ شاہ عبداللطیف بھٹائی پیدا ہوئے ، جن کے کلام کو غیر فانی درجہ حاصل ہے ۔ شاہ صاحب ، ہلڑی کے متعلوی سادات سے تعلق رکھتے تھے اور سندھ کے نامور شاعر اور صوفی سید عبدالکریم کی اولاد سے تھے ۔ آپ کے والد شاہ حبیبؒ جو خود اہلِ دل میں سے تھے ، اپنے وطن مالوف ہلڑی سے ہجرت کر کے مٹاری (متعلوی) کے نزدیک ایک گاؤں ہالا حویلی میں آباد ہوگئے ۔ اس گاؤں میں سندھ کے یہ جلیل القدر شاعر سنہ ۱۶۹۰ء میں پیدا ہوئے ۔ آپ کی تربیت ، آپ کے والد کے زیر نظر ہوئی ۔ یہ سچ ہے ، کہ آپ نے تحصیل علوم کی تکمیل نہیں کی ، لیکن ابتدائی تعلیم سے ضرور بہرہ ور تھے۔ مشہور مورخ میر علی شیر قانع نے آپ کو بالکل اُمی لکھا ہے : واللہ اعلم بالصواب ۔

سیر و سفر

شاہ صاحب عین جوانی میں وطن سے نکلے اور برسوں تک فقراء کے ساتھ ، سندھ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سیر کرتے رہے ۔ آپ کے بعض سوانح نگاروں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ آپ قندھار اور کابل تک گئے تھے ، لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ۔ بہر حال سیر و سفر سے آپ جب لوٹ آئے ، تو اپنی مستقل رہائش کے لیے ، آپ نے ، ہالا کے نزدیک ، کرار تالار کے ساحل پر ایک ریگستانی ٹیلہ (بھٹ) کو انتخاب کر لیا ۔ اپنے ارادتمندوں کے ساتھ ، آپ یہاں آ کر آباد ہوگئے ۔ یہ ٹیلہ ، 'بھٹ شاہ' کے نام سے مشہور ہوا ۔

آپ 'بھٹ شاہ' کے تعمیری کام سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ آپ کے والد بزرگوار وفات پا گئے ۔

شاہ صاحب کی زندگی کا لافانی کردار

آپ نہ فقط باکمال شاعر اور مفکر تھے بلکہ ایک اعلیٰ انسان بھی تھے ۔ آپ کا ہر قول و عمل کے مطابق تھا ۔ آپ کے کلام میں جو درِ بے بہا موجود ہیں ۔ ان کے ہر جلوہ سے انسانیت کی بہتری اور برتری نمایاں ہوتی ہے ۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ایک شاعر کا کلام اس کی زندگی کی تفسیر ہے تو ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ شاہ صاحب انسانی زندگی کے بڑے شارح تھے ۔ ان کے عظیم کردار کا ایک اہم پہلو انسانیت کا احترام تھا۔ ایک شعر کا ترجمہ ملاحظہ ہو :

جنھوں نے سچ کا بیوپار کیا ،
ان کے لیے لھم البشری کی بشارت آئی !
ان ہی کو ، دوست نے سمندر پار پہنچا دیا - (ترجمہ)

آپ کے کلام میں قلبی وارداتیں کثیر انداز میں موجود ہیں ، جس میں انسانی احترام کے بارے میں سادگی سے سوچا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کے کلام کا مطالعہ کرنے والا ، آپ کے روحانی فیضان میں گم ہو جاتا ہے - ایک مقام پر کہا ہے :

روزے اور نمازیں یہ بھی بہتر کام ہیں ،
لیکن وہ تفہیم اور ہے ،
جس سے اپنے دوست کو دیکھا جا سکے ! (ترجمہ)

یہ تفہیم اور افہام ، انسانیت کا احترام ہے ، جس کے حاصل ہونے سے ، انسان قُرب الٰہی کے مدارج کو طے کر کے ، اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتا ہے - علم الاخلاق کے رہبروں نے انسانیت کے احترام میں ہی ، انسان کے لافانی کردار کو دیکھا ہے - رومی نے سچ فرمایا ہے

طریقت بجز خدمت خلق نیست

شاہ عبداللطیف کا تصوّف

شاہ صاحب کا تصوّف عشقِ الٰہی ہے - آپ فرماتے ہیں تخلیق سے پہلے میں نے خلائے بسیط میں حسنِ ازل کو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دیکھا تھا - اب وہ جلوہ ہر وقت نگاہوں کے سامنے موجود ہے - اسی جلوے نے مجھے سرشار کر رکھا ہے - شاہ صاحب اس جذبۂ عشق کو لے کر شعر کہتے ہیں اور چونکہ ان کا ہر شعر روح کو بیتاب کر کے خدائے واحد کی طرف لے جاتا ہے ، وہ کہتے ہیں میرے ابیات کو شاعری نہ سمجھو یہ تو درحقیقت آیات ہیں - آپ فرماتے ہیں کہ دل اگر خودی ، نفسانیّت اور اغراض سے بھرا ہوا ہو تو بتکدہ ہے - ان بتوں کو توڑ کر 'اللّہ اکبر' کی صدا بلند کرنی چاہیئے - دنیا کے متعلق آپ کا خیال ہے کہ بس یہ سمجھ لو محبوبِ ازل نے تمھیں مضبوط باندھ کر دریا میں پھینک دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ پانی میں دامن کو تر نہ کرو - ان باتوں میں تزکیۂ نفس اور آلائشوں سے دوری کا کتنا عمدہ درس ہے ! عشق کو آپ اس درجہ پر پہنچا دیتے ہیں جہاں عشق ، عاشق اور معشوق میں فرق نہیں رہتا - اِس طرح عشق میں جذب ہو کر آپ ذاتِ واحد کو پالیتے ہیں - حال کی اس

کیفیت کی بدولت ذاتِ مطلق کو آپ نے بڑی شدّت کے ساتھ اپنے وجود میں محسوس کیا تھا ۔ آپ کی شاعری اسی شدید احساس کا بیان ہے ۔

شاہ کے کلام پر طائرانہ نظر

اس میں شک نہیں کہ شاہ صاحب نے سندھی شاعری اور سندھی زبان کو جس اوجِ کمال پر پہنچایا اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ۔ آپ کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ الہامی تھی چنانچہ فرماتے ہیں :

لوگو انہیں بیت نہ سمجھو ،
یہ آیتیں ہیں ۔
یہ انسانی قلوب کو لے کر ،
دوست کی طرف پہنچا دیتی ہیں ۔ (ترجمہ)

آپ کے کلام کا صحیح تجزیہ کرنا آسان نہیں ۔ فصاحت ، بلاغت ، سلاست اور جدّت ، جو مشرق شاعری کی نمایاں خصوصیتیں ہیں ۔ آپ کے کلام میں بدرجہٗ اتّم پائی جاتی ہیں ۔ سادگی ، روانی اور شگفتگی بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی وفات کے دو صدیوں بعد تک بھی آپ کے کلام میں وہی تازگی اور وہی سوز و گداز موجود ہے ۔

آپ کے کلام کی جس خصوصیت کی طرف اِشارہ کرنا ضروری ہے وہ موسیقیت ہے جو آپ کے کلام کے ہر لفظ سے ٹپکتی ہے ۔ آپ موسیقی کے بڑے ماہر تھے ۔ اس لیے ، اشعار میں لفظوں کے زیر و بم کو قائم رکھنے میں آپ نے بڑا کمال دکھایا ہے ۔ ان سب چیزوں نے مل کر آپ کے کلام کو غیر فانی بنا دیا ہے ۔

شاہ کے رسالے کی ترتیب اور تدوین

شاہ صاحب کے کلام کا مجموعہ ، 'رسالے' کے نام سے مشہور ہے ۔ یہ رسالہ اکتیس سروں یا راگنیوں میں منقسم ہے ۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ 'رسالے' میں چند ایسے بھی سر یا باب موجود ہیں ، جن کا موسیقی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے ۔ کھنبایت ، سامونڈی ، کارایل ، رپ وغیرہ ۔ اکثر سروں کے عنوانات ، سندھ کی لوک کہانیوں سے نسبت رکھتے ہیں ۔ مثلاً 'سوہنی مہینوال' ، 'مومل رانو' ، 'سورٹھ' ، 'عمر ماروی' ، 'لیلا چنیسر' وغیرہ ۔

رسالے کا اولین مسودہ شاہ کی وفات کے بعد، آپ کے ارادتمندوں نے مرتب کیا۔ اس کی اولین طباعت کا شرف ایک جرمن، ارنیسٹ ٹرمپ Earnest ~~Trump~~ کو ملا۔ یہ نسخہ سال ۱۸۶۶ء میں لائپزگ Leipzig میں شائع ہوا۔ شاہ صاحب ایک صاحبِ طریقت بزرگ ہونے کے علاوہ ایک صاحبِ بصیرت شاعر بھی تھے۔ سوز و گداز ان کی شاعری کا سب سے بڑا عنصر ہے۔ وہ ابیات لکھتے لکھتے کوئی وائی یا کافی بیچ میں لے آتے ہیں۔ جس سے احساس و جذبات میں شدت اور ابلاغ میں اثر بڑھ جاتا ہے۔ وائی ایک قسم کا گیت ہے جس میں سادگی اور چبھن موجود ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل میں چند ابیات اور پھر ایک وائی درج کی جاتی ہے۔

سامونڈی سر میں

(بیت)

موج در موج بحر بے پایاں	میرے محبوب کی نشانی ہے
حاصل جلوہ ہائے رنگا رنگ	در حقیقت وہی روانی ہے
ظاہری حسن کو ثبات کہاں	ہر تب و تاب آنی جانی ہے
خواہش وصلِ یار کیا معنی	قربِ محبوب جاودانی ہے

(بیت)

آزمودہ ہے جرأت صد شوق	دل کو اب سوگوار کون کرے
دیکھ کر جلوہ ہائے رنگا رنگ	حسن کا اعتبار کون کرے
اے خوشا لذت فراقِ یار !	خواہش وصلِ یار کون کرے
زندگی کشتۂ محبت ہے	موت کا انتظار کون کرے

وائی

سجنا موہے بھول نہ جانا

ہر موتی بھینٹ چڑھاؤں
جب تجھ سا ہیرا پاؤں

من ہی من میں مسکاؤں
سو جان سے واری جاؤں

میری جیون جوت جگانا
سجنا موہے بھول نہ جانا

یہ گیت لطیف کوی کا
سکھ چین ہے میرے جی کا
دو بھر ہے تجھ بن جینا
ٹوٹے نہ مری من و نیا

مرے من کو دھیر بندھانا
سجنا موہے بھول نہ جانا

کھلیان پاک ، ترجمہ از شیخ ایاز ص ۶-۷ -

اسی طرح ''سرسوہنی سے'' کا اقتباس اور اس کی وائی کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

گھڑا ٹوٹا تو یہ آواز آئی — نہیں دونوں میں اب کوئی جدائی
وجود زندگی میں نغمہ زن ہے — رباب روح کی نغمہ سرائی
وصال یار کی راحت پہ قرباں — ثواب زہد و رسم پارسائی

* * *

دل ہے وابستہ غم محبوب — عالم جذب و شوق لا محدود
ہے گراں بار عشق کی زنجیر — جنبش پائے ناتواں بے سود
ہر تمنا جراحت صد چاک — آرزو اک شعلۂ بے دود
بحر غم اور سیل اشک رواں — موج در موج گوہر مقصود

* * *

سوہنی کیا تھی اور کیا مہینوال — راز سر بستہ ہی رہی یہ بات
فہم و ادراک کی رسائی کیا — عشق ہے ماورائے امکانات
یاد عہد ازل رہا اس کو — زندگی بھر وفا پرست رہی
پیارے مہینوال کی محبت میں — سوہنی سر خوش الست رہی

* * *

بحر و بر ہی پہ کچھ نہیں موقوف ساری دنیا ہے حسن سے معمور
کار فرما ہے اے میرے محبوب فرش سے تا بہ عرش تیرا نور
خیر ہو دارو گیر کی یارب ذرہ ذرہ ہے پیرو منصور

* * *

گھڑا کچا ، میں تنہا ، اور چھائے برستی رات کے گھنگھور سائے
فضا ایسی کہ جیسے شیر کوئی کہیں بیٹھا ہو اپنا سر اٹھائے
سہارا دے مجھے اے جوش الفت کمی تیری تمنا میں نہ آئے
نذر ہو کے میں اب دریا میں کودوں بلا سے جان جاتی ہے تو جائے

وائی

کھینچ رہی ہے پریت پیا کی کوئی نہ مجھ کو روکے
اپنے ہی من کو سمجھائے اپنے آپ کو ٹوکے
کوئی نہ مجھ کو روکے
چڑھی ہوئی ہے یہ چنچل ندیا اور یہ آدھی رات
پریتم ہے اُس پار میں پکڑوں کیسے اس کا ہاتھ
یہ لہروں کے جھوکے
کوئی نہ مجھ کو روکے
پریت کی اگنی سلگی ہوئی ہے ، دسواں سا ہے اس پار
میرے من میں آگ بسی ہے لے چل اے منجدھار
کیوں مجھے کوئی روکے
کوئی نہ مجھ کو روکے

(خیابان پاک ، ترجمہ از شیخ ایاز، ص ۳۰۲)

شاہ بھٹائی کے مرید

تمر فقیر

شاہ بھٹائی کے ارادتمندوں میں سے ، جن کا کلام مل سکا ہے ، تمر فقیر ، صالح فقیر اور عنایت اللہ چوڈھو ہیں ۔ تمر فقیر عرب میں پیدا ہوا ۔ اپنے والدین کے ساتھ جب سندھ میں آیا تو بچپن میں ہی ، شاہ صاحب کے ارادتمندوں میں داخل ہوا ۔ تمر فقیر ایک قادر الکلام

شاعر تھا ۔ شاہ صاحب کا روحانی فیضان اس تک براہ راست پہنچا تھا ، اس لیے کلام میں سوز و گداز افراط سے موجود ہے مثلاً چند شعر ملا حظہ ہوں :

جتوں کے جال نے
میرے قلب میں خلش پیدا کر دی ہے ،
کیچ والوں کے کمال نے
میرے تن بدن میں درد پیدا کر دیا ہے !
وہ ہوت (کیچ کے رئیس) میرے غمگسار نہ ہو سکے ،
اس لاچار اور معذور کے عزیز نہ بن سکے ! (ترجمہ)

فقیر عنایت اللہ چوڈھو

فقیر عنایت اللہ ایک رئیس پیر محمد چوڈھو کا فرزند تھا ، جو کلہوڑوں کے دور میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا ۔ لیکن فقیر عنایت اللہ نے فقر کی راہ اختیار کی اور شاہ صاحب کے ارادتمندوں میں داخل ہوا ۔ اس کے کلام کا خاص موضوع ، مرشد کی توصیف اور تعریف ہے ۔ اس کے کلام میں ناصحانہ رنگ زیادہ جھلکتا ہے ۔

شاہ بھٹائی کے 'رسالے' سے ، ایسے گمنام شعراء کا کلام بھی حاصل ہوتا ہے جن کی زندگی کے کوائف تاریکی میں ہیں ۔

شاہ بھٹائی کے معاصر شعراء

شاہ بھٹائی کے معاصر شعراء میں ، اِن کے پیشرو بھی ہیں اور ہمعصر شعراء بھی ۔ پیشرو شعراء میں ، شاہ عنایت اللہ رضوی اور میوں عیسیٰ کا نام قابل ذکر ہیں ۔

شاہ عنایت اللہ رضوی

شاہ بھٹائی کے بزرگ معاصر میں ، شاہ عنایت اللہ رضوی کو بڑی اہمیت ہے ۔ آپ کے والد کا نام نصرالدین تھا ، آپ نصر پور (ضلع حیدرآباد) میں پیدا ہوئے ۔ علوم متداولہ میں کافی دسترس رکھتے تھے ۔ قادری طریقہ کے علاوہ آپ سہروردیہ طریقے میں بھی بیعت تھے ۔ شاہ بھٹائی جب سنِ بلوغت کو پہنچے تو آپ ضعیف ہو چکے تھے ۔ ایک روایت کے مطابق شاہ بھٹائی نے آپ سے ملاقات بھی کی تھی ۔ شاہ بھٹائی کی طرح آپ

کا شمار بھی سندھی زبان کے بڑے شعراء میں ہوتا ہے ۔ لیکن شاہ بھٹائی کے متکبرانہ کلام کے موجود ہونے سے ان کا کلام گمنامی میں رہا ۔ حال ہی میں ڈاکٹر نبی بخش نے ان کے کلام کے مجموعے کو شائع کیا ہے ۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی ایک باکمال شاعر تھے ۔ اس میں بھی شک نہیں کہ شاہ بھٹائی نے ، آپ کے کلام سے استفادہ کیا ہے ۔ اصل معنی میں 'وائی' کے موجد آپ ہی تھے ۔ ان کے زورِ کلام کا کچھ اندازہ ذیل کے دو نمونوں سے ہو سکتا ہے :

میرے جسم سے فولادی زنجیریں کٹ گئی ہیں ،
اور قید سے نجات مل گئی ہے ۔
مجھے وصال کی نوید حاصل ہوئی ہے ،
اور کوے کی آواز سے یہی معلوم ہو رہا ہے
آٹھوں پہر دل کے اندر یہ آس موجود ہے کہ
اے عصمت ماب عورت !
آج کل تیرے عزیز تجھے ملیر میں مل جائیں گے !

★ ★ ★

کینجھر (جھیل) کے کنارے پر
ایسا کوئی نہیں
جو اس کے حسن کی برابری کا دعویٰ کر سکے ۔
اس کے قد و قامت کے ساتھ ،
ارانیوں کی کوئی مشابہت نہیں ہو سکتی ،
تماچی خود اس کے اوپر مورچھل جھلا رہا ہے ! (ترجمہ)

میوں عیسوٰ

میوں عیسوٰ بالہ (ضلع حیدرآباد) کا رہنے والا تھا ۔ روایت ہے کہ شاہ بھٹائی ابھی بچہ ہی تھے کہ میوں عیسوٰ ان کے گاؤں میں آیا ۔ جب اس کی نگاہ شاہ بھٹائی پر پڑی تو فرمایا ، اس بچہ سے وہ گل پیدا ہوں گے ، جن کی خوشبو سے سارا ملک مہک اٹھے گا ۔ آپ کا کلام کم لیکن شیریں اور متین ہے ۔ تصوف اور دین کے پُر اثر نکتوں سے معمور ہے ۔ آپ کی ایک تصنیف 'میوں عیسوٰ کی سندھی' مشہور ہے ۔ چونکہ آپ شاہ بھٹائی

کے ہمعصر تھے - اس لیے آپ کے کلام کا اثر بھی ، شاہ بھٹائی کے کلام میں موجود ہے -

سلطان الاولیاء خواجہ محمد زمان (۱۷۱۳ء - ۱۷۷۴ء)

خواجہ محمد زمان کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے - آپ کے والد شیخ عبداللطیف کا شمار اہل اللہ میں ہوتا ہے - آپ ٹھٹھہ کے قریب ایک قصبہ ، لنواری میں رہتے تھے - خواجہ صاحب اسی گاؤں میں ۱۷۱۳ء میں پیدا ہوئے - ابتدائی تعلم اپنے والد سے حاصل کی اور باقی تعلیم ٹھٹھہ کے ایک جیّد عالم ابو المساکین سے ، اور اسی بزرگ کے ہاتھ پر ، آپ نے طریقۂ نقشبندیہ میں بیعت کی - ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی ، اپنی بڑی عمر میں ، آپ کی شہرت سن کر ملاقات کے لیے لنواری بھی آئے - آپ نے ۱۷۷۴ء میں انتقال کیا - آپ کے ابیات کو آپ کے مرید مخدوم عبدالرحیم گروہڑی نے ملفوظات کے سلسلہ میں یک جا کیا اور فارسی زبان میں اس کی محققانہ تشریح بھی لکھی - جس کا ترجمہ سندھی زبان میں شمس العلماء عمر بن داؤد پوتہ نے کیا ، اور 'ابیات سندھی' کے نام سے شائع کیا - یہ تصنیف آغاز سے لے کر اختتام تک تصوّف اسلامی کی تلقین سے معمور ہے - ذرا نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے!

جنہوں نے خود کو دیکھا ،
انہوں نے اپنے دوست کو پا لیا !
یہ گماں غلط ہے ، کہ
عارف آئینہ میں فقط عکس کو دیکھتا ہے ! (ترجمہ)

مخدوم عبدالرحیم گروہڑی (۱۷۳۷ء - ۱۷۷۸ء)

مخدوم عبدالرحیم گروہڑی صوفی اور عالم تھے - خیرپور ضلع کے کسی گاؤں میں ۱۷۳۷ء میں پیدا ہوئے - تحصیل علم کے بعد خواجہ محمد زمان کے مریدوں میں داخل ہو کر رتبہ پایا - ۱۷۷۸ء میں ایک بت خانے کے بت توڑے اور پجاریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے - آپ کثیر التصالیف تھے - ان تصنیفات میں سے رسالہ 'حقیقت محمدیہ' کو اہمیت حاصل ہے - اس رسالہ میں آپ کے شعر کی روانی اور برجستگی کمال پر نظر آتی ہے - حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اس طرح والہانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں :

اس محبوب کی توصیف کی کوئی حد نہیں !

اس کی تعریف میں بڑے بڑے فصیح حیران ہیں ،
اس حبیب کی حقیقت عبرت میں ڈال دیتی ہے ۔
وہ جہاں لیل ونہار (نور و ظلم) آ کر ملتے ہیں ،
وہاں شفق کی طرح نمایاں ہیں ۔ (ترجمہ)

مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی (۱۶۹۳ء - ۱۷۶۰)

مخدوم محمد ہاشم ، سندھ کے مشاہیر علماء میں سے تھے ۔ مخدوم صاحب ۱۶۹۳ء میں ٹھٹھ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ اس وقت کے محقق عالم مخدوم ضیاء الدین سے علوم منقول اور معقول کی تکمیل کی ۔ آپ کے کمالات کے سبب آپ کو قاضی القضاۃ کا عہدہ تفویض ہوا ۔ آپ نے اُمورِ ملکی میں بہت سی اصلاحات کیں ۔ ستر برس سے کچھ اوپر عمر میں آپ نے ۱۷۶۰ء میں وفات پائی ۔ آپ اپنے دور کے مشہور مصنف گذرے ہیں ۔ عربی ، فارسی اور سندھی میں تقریباً ڈاڑھ سو کتابیں لکھیں ۔ سندھی میں آپ کی مشہور تصنیف 'بناءالاسلام' ہے ۔ جس میں آپ نے اسلامی عقائد کو توضیح اور تشریح سے پیش کیا ہے ۔ یہ تصنیف اشعار میں ہے ۔ جس میں بڑی روانی پائی جاتی ہے ۔ نمونہ ملاحظہ ہو :

سب توصف اس صاحب کی ہے ،
جس نے جہانوں کو بنایا ۔
عرش ، کرسی ، زمین اور آسانوں کو پیدا کیا ،
اپنی رحمت سے ،
آسمان کو تاروں سے روشن کیا ہے
اپنی قدرت سے بے شمار انسانوں کو پیدا کیا ہے ! (ترجمہ)

مخدوم ابوالحسن سندھی (م - ۱۷۴۹)

مخدوم موصوف بھی ٹھٹھ کے رہنے والے تھے اور نامور علماء میں سمجھے جاتے تھے ۔ وقت کے تقاضے اور طالب علموں کی آسانی کے لیے ، انہوں نے ۱۷۰۲ء میں فقہ کے مسائل پر ایک کتاب 'مقدمة الصلواة' سندھی زبان میں مثنوی کی صورت میں لکھی ہے ۔ اگرچہ اس میں علم عروض کی پابندی نہیں کی گئی ۔ یہ کتاب اب بھی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے ۔ یہ عالم دین ۱۷۴۹ء میں فوت ہوئے ۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے :

سر کو پانی سے تر کر کے ،
کانوں کو پانی سے مسح کیجئے ۔
ان تر انگلیوں کو گردن کے گرد گھمانا چاہیے ،
وضو کی سنتوں کو یاد کرنا چاہیے ،
اور دل میں دعائیں پڑھنی چاہیئیں
تاکہ خدا تعالیٰ ہماری خطاؤں سے در گذر فرمائے ! (ترجمہ)

آزاد نظم لکھنے والے

علمائے کرام کے گروہ کے اکثر اراکین نے اپنی تصنیفات کو ، آزاد نظم میں لکھا ہے ، جس میں عروض کی کوئی پابندی نہ تھی ۔ مخدوم گروہڑی ، مخدوم محمد ہاشم اور مخدوم ابوالحسن نے اس قسم کی شاعری کو فروغ دیا ۔ ان تصنیفات کی مقبولیت کے باعث اور بزرگوں نے بھی اس طرف توجہ دی ۔ اس طرز پر جن علماء نے اپنی کتابیں تصنیف کیں ۔ ان کے نام تصنیفات کے ساتھ دیے جاتے ہیں ۔

(۱) مخدوم ضیاءالدین مصنف 'مخدوم ضیاء الدین کی سندھی' (۲) مخدوم محمد شریف رانی پوری مصنف 'ملکی سندھی' (۳) مولوی علی اکبر مصنف 'الاسوال و سبھل الاموال' (۴) مولوی احمد مترجم 'روضۃ الشہداء' (۵) مخدوم عبداللہ ٹھٹوی مصنف 'کنز العبرت' (۶) مخدوم عبدالخالق ٹھٹوی مصنف 'مطلوب المومنین' ، 'قصص الانبیاء' و 'تنبیہہ الغافلین' (۷) مولوی محمد حسین ، مصنف 'سیر بستان' و 'قصص الانبیاء' (۸) مخدوم محمد ابراہیم بھٹی ، مصنف 'سندھی ابراہیم' ۔ (۹) مولوی عبدالسلام مترجم 'شمائل ترمذی' (۱۰) مولوی مورو مترجم 'تفسیر' ، 'پارہ عم' ۔

یہ سب بزرگوار زیریں سندھ کے رہنے والے اور کلہوڑا دور کی پیداوار تھے ۔ ان بزرگوں کے دم سے ، سندھی ادب کو بیش بہا تصانیف حاصل ہوئیں ۔ انہوں نے ابتدائی طور پر سندھی رسم‌الخط کی داغ بیل ڈالی اور خالص سندھی حروف تہجی کو ، عربی آوازوں سے ملانے کی کوشش کی ۔

یہ ساری کتابیں مسلسل نظم کی صورت میں لکھی گئیں ہیں ۔ ان میں علم عروض کی کوئی پابندی نہیں ۔ نہ ردیف اور قافیہ کے بنانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ ان آزاد اشعار کی سطروں کے آخر میں ، الف لگا کر ، لفظوں کو ہم قافیہ بنا دیا گیا ہے ۔ مثلاً :

مومن سے مومنا ، تسلیم سے نسلیا ، مخلوق سے مخلوقا ، موجود سے موجودا وغیرہ ۔

اہل تصوف کے دو مراکز

کلہوڑوں کے ایام حکومت میں ، سندھ میں ، اہلِ تصوف کے دو مرکزوں کا نشوونما ہوا ۔ ایک درازا (خیر پور ضلع) دوسرا کنڈڑی (ضلع سکھر) ۔ یہ غیر معروف مقامات بعد میں صوفی شعراء کے مراکز بن گئے ۔ یہ دو مقام دراصل دو تحریکیں تھیں ، جنہوں نے اس پر آشوب دور میں انسانوں کو سکون بخشا اور مذاہب کے اختلافات کو مٹا کرا نہیں امن اور سلامتی کا پیغام دیا ۔ درازا تحریک کے بانی ، فقیر صاحبڈنہ فاروق اور کنڈڑی کے فقیر روحل زنگیجہ تھے ۔

فقیر صاحبڈنہ فاروقی (م - ۱۷۸۸ء)

تھر کے گاؤں گڈیجی میں فقیر صاحبڈنہ پیدا ہوئے ۔ آپ نے اچھی تعلیم پائی ۔ ابتداء میں کلہوڑوں کی ملازمت کی ۔ بعد میں گوشہ نشین ہو گئے ۔ آپ کے ایک ارادت مند دراز ونڈیر نے ایک نئی بستی بنائی جس کا نام دراز رکھا ۔ یہیں آپ نے سال ۱۷۸۸ء میں وفات پائی ۔ ایک روایت کے مطابق ، شاہ بھٹائی نے درازا میں آ کر آپ سے ملاقات بھی کی ۔ آپ کلہوڑا دور کے عظیم شاعروں میں سے تھے ۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ کا کلام ضائع ہو گیا ۔ اب تھوڑا سا جو رہ گیا ہے اس سے آپ کے مرتبے کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ آپ سندھی شاعری کی ایک صنف 'کافی' کے بانی تھے ۔

روحل صوفی (م - ۱۷۹۷ء)

روحل صوفی، تھر کے علاقہ میں پیدا ہوئے ، آپ کے والد کا نام شاہو تھا ۔ اورذات کے زنگیجہ تھے ۔ ابتدا میں تھر کے ہندو پنڈتوں سے تعلیم پائی ۔ بعد میں اسلامی درسگاہوں میں تعلیم مکمل کر لی ۔ جوانی میں کلہوڑوں کی ملازمت میں شامل ہوئے لیکن اس ملازمت سے مطمئن نہ تھے ۔ چنانچہ جھوک میراں پور میں جا کر ، شاہ عنایت کے فرزند صوفی عزت‌اللہ کے مریدوں میں شامل ہو گئے اور مرشد کے حکم کے مطابق تھر کے علاقہ کو ترک کر کے ایک غیر معروف مقام پر اقامت اختیار کی ۔ جس نے بعد میں کنڈڑی کا نام پایا ۔ آپ نے بڑی عمر پائی اور کلہوڑوں اور تالپوروں دونوں کا دور دیکھا۔ سنہ ۱۷۹۷ء میں وفات پائی اور کنڈڑی میں ہی مدفون ہوئے ۔ آپ کا شمار کلہوڑا دور کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے ۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ سندھ میں سرائیکی زبان کے پہلے

شاعر تھے تو بیجا نہ ہو گا ۔ آپ نے سندھی کے علاوہ ہندی زبان میں اپنی تصنیفات چھوڑی ہیں ۔ آپ کی ہر تصنیف میں وحدت الوجود اور ہمہ اوست کا ذکر ہے ۔ آپ کے شعر شیریں اور متین ہیں ۔ اپنے کلام میں تصوّف کا اظہار برملا کرتے ہے ۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو :

محبوب کے چہرے کے سامنے ،
اور کوئی علمی حرف آ ہی نہیں سکتا ،
سورج کی روشنی کے سامنے ،
رات کی تاریکی ٹھہر ہی نہیں سکتی !
جنہوں نے اس طریقے کو پا لیا ،
ان کے لیے کوئی تاریکی نہیں ۔ (ترجمہ)

مراد فقیر

مراد فقیر ، روحل فقیر کے عزیز اور مرید تھے ۔ آپ کی ساری زندگی مرشد کی خدمت میں گذری اور آپ کی موت بھی مرشد کے سامنے ہوئی ، جس کا روحل فقیر کو بڑا افسوس ہوا ۔ بڑے محب وطن اور زندہ دل شاعر گزرے ہیں ۔ آپ کا کلام سندھی ، سرائیکی ، ہندی اور فارسی میں موجود ہے ۔ تصوّف کے نکتہ نگاہ سے آپ اپنے پیر کے صحیح معنٰی میں مقلد تھے ۔ ان کے کلام کے ہر بیت سے ہمہ اوست اور وحدت الوجود کی تفسیر ملتی ہے ۔ مثال ملاحظہ کیجیے :

قلف کے پہاڑوں میں جا کر ،
تو یہ آہ و فغان
اپنے دوست کے لیے کیوں کر رہی ہے ؟
جن دوستوں کے لیے تو یہ رہروی کر رہی ہے
وہ تو تیرے ساتھی نہیں ۔
مراد کہتا ہے ،
اے نادان عورت !
تو واپس لوٹ جا ،

اولی میں آتے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے :

دلیر حر مردانہ وار صف سے باہر آئے ،
امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں ،
اس نے جھک کر عرض کی ،
میں پروانے کی طرح آگ کا عاشق ہوں ،
یہ سر میں آپ جیسے نوشہہ پر قربان کر کے ،
توقیر حاصل کرنا چاہتا ہوں ! (ترجمہ)

شعرائے لس بیلہ

لس بیلہ کلہوڑوں کے عہد میں ایک جداگانہ ریاست تھی - جس کے بانی جام میر خان اول کے عہد میں سندھ سے شیخون کا ایک قبیلہ ۱۷۵۰ء میں لس بیلہ میں سکونت پذیر ہوا[1] اس شیخ خاندان میں دو شاعر حمر اور ان کے بیٹے شیخ ابراہیم نکتہ سنج اور نکتہ دان گذرے ہیں - شیخ حمر ایک عابد اور زاہد شخص تھا اور اتھل شہر میں اس کا مدرسہ تھا - شیخ حمر کے کلام پر شاہ عبداللطیف کے کلام کا بڑا اثر تھا - نمونہ ملاحظہ ہو :

شب بیداری سے نغمے حاصل ہوتے ہیں ،
سونے سے دوست حاصل نہیں ہو سکتا !
حمر کہتا ہے یہاں سے جو گئے ،
ان کے میدانوں کو جا کر دیکھ ،
اس جہان کے اندر انہیں فائدہ ملتا ہے ،
جو اپنی آنکھوں کو بیدار رکھتے ہیں ! (ترجمہ)

شیخ ابراہیم (پ - ۱۷۳۰ء)

آپ تقریباً ۱۷۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ باپ کی زندگی میں ہی شعر کہنے لگے تھے - شیخ ابراہیم نے درویشانہ زندگی بسر کی - آپ کے کلام میں شاعری کی مختلف اصناف نظر آتی ہیں۔ مثلاً سعا اور ڈور کے بیت ، مدح اور قصے - مندرجہ ذیل قصے آپ سے منسوب ہیں

---

۱ - بلوچ ، ڈاکٹر نبی بخش ، بلوچی جا ،ول ، ۱۹۰ -

۱ - قصہ حضرت علیؓ اور نیلک ۲ - قصہ محمّد حنیفہ
۳ - قصہ جمجمہ سلطان ۴ - قصہ مومل رانو -

وہ فارسی زبان کے الفاظ کو سندھی ابیات میں موزوں جگہ پر استعمال کر سکتے تھے -
نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :

آب و دانہ قوی تھا ،
اور وہی میرے دامن میں پڑ گیا ،
لوحِ محفوظ کے اندر جو کچھ لکھا گیا ہے ،
اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی !
قضا کا قلم لکھ کر ٹوٹ گیا ،
اس نے یہی لکھ دیا ،
کہ میرے عزیز مارو تھر میں ہوں ،
اور میں محلاتوں کے اندر قید میں ہوں ! (ترجمہ)

سید کبیر شاہ

سید کبیر شاہ شیخ ابراہیم کے ہمعصر تھے۔ اور آپ نے لس بیلہ کے اتھل[1] شہر میں سکونت اختیار کی - آپ سندھی الاصل تھے اس لیے آپ کی زبان خالص سندھی ہے اور آپ کے کلام میں سلاست اور روانی ہے۔ آپ کے اکثر ابیات طویل ہیں - بارہا آپ کا شیخ ابراہیم کے ساتھ مقابلہ ہوا لیکن ہر بار آپ کا پلہ بھاری رہا - نمونہ ملاحظہ ہو :

اے موت اس وقت تک مجھے نہ مار ،
جب تک میں اپنے دوست کو نہ دیکھ لوں۔
اے عزرائیل !
اس موت کی ساعت سے کچھ وقت کے لیے در گزر کر ،
اگر نہ ہوا تو میں ،
خدا کے دربار میں آہ و فغان بپا کر دوں گی !
خدا کے لیے مرنے سے پہلے ،

---

۱ - ایک روایت میں ہے کہ کبیر شاہ سن کے رہنے والے تھے ، پیدا بھی وہاں ہوئے ، بعد میں کولٹری میں جا کر رہے اور وہاں سے لس بیلہ گئے (ڈاکٹر نبی بخش بلوچ بلدین جو بول ص ۲۰۵۰) -

مجھے اپنے دوست کو آنکھوں سے دیکھنے دے ! (ترجمہ)

بھر حال لس بیلہ ، شیخ حسر ، شیخ ابراہیم اور سید کبیر شاہ پر ہمیشہ فخر کرتا رہے گا ۔

کلہوڑوں کے دور کا ادبی جائزہ

زبان اور حبّ الوطنی

کلہوڑوں کے دور میں سندھی زبان نے کافی ترقی کی ۔ بیرونی زبانوں کے اثر سے اب یہ آہستہ آہستہ آزاد ہو رہی تھی۔ سندھ کے عظیم شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سندھی زبان کو وسیع پیمانہ پر ترقی دی تھی ۔ اس مفکّر نے عربی اور فارسی زبانوں سے کم استفادہ کیا اور آپ کے بعد آنے والے شعراء نے آپ کی تقلید کی ۔ ایک انگریز نے جس کا نام شرٹ Sl i t تھا ، اس دور کے متعلق جو اپنی ڈکشنری میں سندھی زبان کا جائزہ لیا ہے ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ کی تعداد سندھی زبان میں بہت کم رہ گئی تھی ۔ اس کا تخمینہ یہ تھا کہ کوئی ڈھائی ہزار عربی اور دو ہزار فارسی الفاظ ہوں گے جوسندھی زبان میں اس وقت تک مخلوط ہو چکے تھے ۔ شرٹ نے اپنی 'لغت' ۱۸۷۹ء میں مکمل کی ۔ دہقانی زبان میں ہمیں بہت کم عربی اور فارسی الفاظ دستیاب ہوئے ہیں ۔ شعراء چونکہ اکثر دیہات کے رہنے والے تھے اس لیے انہوں نے دیہات کی زبان کو بہت سُلجھایا اور صاف کیا ۔ غیر مانوس عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال ترک کیا ۔ اس وجہ سے ان کی تصنیفات عوام میں مقبول ہوئیں ۔ ان کے اشعار میں نہ سرو ہے ، نہ صنوبر ، نہ گلاب ہے ، نہ لالہ ، نہ بلبل ہے نہ طاؤس ۔ بلکہ ان کی جگہ وطنی درخت ببول اور نیم ، ڈتھ (تھر کا ایک میوہ) اور سنگر (ببول میوہ) گولاڑا اور گگر (تھر کے جنگلی پھول) کوا اور تاڑا (برسات کا پرندہ) ہیں۔ سندھی شاعری سے ہمیں حُب الوطنی کا ایک انوکھا جذبہ حاصل ہوتا ہے ۔ اس کی تلمیحات وطنی ہیں ۔ مضامین ماحول کے مطابق ہیں ۔ تصّوف کا جہاں ذکر آتا ہے تو اس میں بھی حُب الوطنی کا جذبہ ہوتا ہے ۔ شعراء کے کلام میں جب کبھی اجنبی حکومت کا ذکر آتا ہے ، وہ خواہ مغل ہوں خواہ افغان تو ہمیں یاس ، حزن اور ملال ہی نظر آتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے ، شعراء حُب الوطنی سے سرشار تھے ۔

چنانچہ حضرت بھٹائی فرماتے ہیں :

جب بندر کو خوف ہے ،

تو ملاحو لیند نہ کرنی چاہیے ،
سمندر کے پرے کنارے پر قعر گھوم رہے ہیں !
بالکل اسی طرح ،
جس طرح مٹکے میں چھاچھ چکر لگاتی ہے ،
کیا تجھے اتنے درد اور خوف کے بعد بھی ،
لیند کی تمنا ہے !   (ترجمہ)

کسی دل جلے شاعر نے افغان حکومت کے خلاف کہا تھا :

اے سندھ ہمیشہ اور ہر وقت ،
تجھے قندھار کی طرف سے خوف اور نقصان ہے !   (ترجمہ)

اصنافِ سخن

کلہوڑوں کے عہد میں ابیات کے علاوہ وائی نے بہت ترقی کی ۔ مدح ، مولود ، معجزہ ، داستان اور واقعاتی شعر سندھی شاعری میں داخل ہو گئے ۔ کتابوں کی تصنیف اور تراجم کا شوق پیدا ہوا ۔ مذہبی عقائد ، فقہ اور تصوّف پر رسالے تصنیف ہوتے رہے ۔ خصوصیت سے درس اور تدریس کے لیے سندھی کتابوں کو تصنیف کیا گیا ، تا کہ طالب علم دینی عاوم کو عربی اور فارسی زبان کے بجائے سندھی زبان میں آسانی سے سمجھ سکیں ۔ اس دور میں سندھی زبان مکتبوں اور مدرسوں میں داخل ہوئی ۔ فارسی ، عربی اور ہندی حروف کے امتزاج سے سندھی رسم الخط کی بنیاد رکھی گئی ۔ جس کی سادہ صورت ٹرمپ کی گرامر میں موجود ہے ۔

مہد ویہ تحریک

اس تحریک کے بانی سید محمد جونپوری (۱۴۴۳ء - ۱۵۰۴ء) تھے۔ آپ جام نظام الدین سمہ کے دور میں تشریف لائے ۔ قریباً اٹھارہ ماہ سندھ میں رہے ۔ ۱۴۹۹ء میں افغانستان تشریف لے گئے اور فراہ کے مقام پر ۱۵۰۴ء میں وفات پائی ۔ میاں آرام شاہ کلہوڑا اور قاضی قاضن آپ کے مریدوں میں شامل ہوئے ۔ میاں نور محمد کلہوڑا اپنی تصنیف میں اس ذکر کو اس طرح لکھا ہے ، ”سید میراں محمد جونپور ہمارے مرشد ہیں اور وہ اس طریقہ پر (سہروردیہ) کاربند تھے ۔ رسالہ سہروردیہ مع رسالہ چہار دہ خانوادہ

ہمارے ہاں موجود ہے ۔ مگر اس سفاک کے آنے کی وجہ سے کتب خانہ اور یہ رسالے گم ہو گئے ، ہم نے میراں صاحب کی اولاد کو لکھا کہ وہ یہ رسالے بھیج دیں ۔ اگر وہ مل گئے تو ان کو منشور الوصیت و دستور الحکومت میں شامل کیا جائے گا ۔"

چونکہ ایک لحاظ سے یہ مہدویہ تحریک حب الوطنی سے بھی عبارت تھی ، اس لیے اس تحریک کے اثر سے کلہوڑوں نے سندھ میں مغل حکومت کی مخالفت کی اور اس کے بجائے اپنی حکومت کی جسے ملکی حکومت کہہ سکتے ہیں تاسیس کی کوشش کی ۔ مہدویہ تحریک ، روحانی تحریک کے ساتھ ساتھ سیاسی تحریک بھی تھی ۔ جس سے کلہوڑوں نے فائدہ اٹھایا ۔

درازا اور کنڈڑی

درازا تحریک نے ہمہ اوست اور وحدت الوجود کی تعلیم کی تبلیغ کی جس کے باعث سندھ میں تصوف کی صورت ہی بدل گئی ۔ نمونہ ملاحظہ ہو :

ایک لباس کے بعد
دوسرا لباس پہن کر ،
میرا دوست آتا رہا !
میں اس حالت کو دیکھ کر جل رہا ہوں ، (ترجمہ)
کہ کریم نے کتنی راز داری اختیار کی ہے !

گویا فقیر عبدالحق بھی وہی بات کہہ رہا ہے جو مولانا رومی سے منسوب کی گئی ہے ۔

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام ہفتصد ہفتاد قالب دیدہ ام

درازا کی یہی تعلیم و تربیت تھی ، جس نے بعد میں سچل سرمست جیسا شاعر پیدا کیا ، جس نے تصوف میں مذہب سے آزادی کا سبق دیا بلکہ کنڈڑی کی تحریک نے تو اسلامی تصوف اور ویدانت کے ڈانڈے آپس میں ملا دیے ۔ روحل فقیر کی ہندی تصنیفات سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے ، اپنی تصنیف 'من ہر بودہ' میں وہ لکھتا ہے :

ملنا ہے تو مل بھائی ، سادھو اب ملنے کا ویرا
منش جنم پھر ہاتھ نہ آوے ، چور اسی لاکھ پھیرا

جان میں راجا رہتا ہے ، کایا نگری ایک
سکھ کی انچک نا ملے ، پاوے دکھ انیک

روحل کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندوؤں کے اصول تناسخ کا قائل ہے ۔ یہی حال روحل کے مریدوں اور جانشینوں کا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تصوّف اور ویدانت کو آپس میں ملانے کی کوششوں میں ویدانت سے ایسی رعایتیں کی گئی ہیں جن سے اسلامی عقائد کے تصادم کا خطرہ رہے گا ۔ اس سے اگر کچھ فائدہ ہوا ہے تو یہ کہ ہندو مسلمان میں منافرت کچھ عرصے کے لیے ختم ہو گئی ۔ شاہ عنایت کی تحریک محض صوفیانہ تحریک تھی ۔ اس میں ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے فلسفیانہ مسائل میں اتنا غلو آ چکا تھا کہ اس زمانے کے علماء اس کے خلاف ہو گئے ۔ جس کا انجام افسوسناک نکلا ۔ شاہ عنایت کے مریدوں میں سے سید جان اللہ شاہ 'میر' بلند پایہ فارسی کو شاعر گزرے ہیں ۔ ان کے کلام سے شاہ عنایت کی تعلیم پر کافی روشنی پڑتی ہے ۔

باب سوم

(فصل دوم)

کلہوڑا خاندان کا زوال اور تالپوری حکومت کا آغاز (۱۷۸۳ء - ۱۸۴۳ء)

کلہوڑا خاندان کا آخری فرمانروا عبدالنبی ، مدد خان کی مدد سے دوبارہ تخت نشین ہوا لیکن تالپوروں کے خلاف اس کا بغض و عناد اسی طرح قائم رہا ۔ چنانچہ تالپوروں کے رؤسا کو عہدوں پر فائز کرنے کے بہانہ سے انہیں دعوت دی ۔ اس دعوت میں تین تالپور سرداروں کو جن میں میر عبداللہ اور فیروزخان بھی شامل تھے ، مروا ڈالا ۔ یہی بات ہالانی کی جنگ کا باعث بنی ۔ اس جنگ میں تالپور کے حکمران صوبیداد خان شہید کے فرزند میر فتح علی خان کو فتح نصیب ہوئی ۔ میاں عبدالنبی جنگ سے بھاگ کر قلات پہنچا ۔ خانِ قلات اور راجہ بجیہ سنگھ (راجہ جودھپور) سے امداد حاصل کر کے پھر لشکر کشی کی ، لیکن میر فتح علی خان پھر بھی کامیاب رہا ۔

میر فتح علی خان (۱۷۸۳ء - ۱۸۰۱ء) سے تالپوروں کی باقاعدہ حکومت شروع ہوتی ہے ۔ فتح علی خان نے اپنی حکومت کو پائیدار بنانے کے لیے سندھ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ۔ شمالی سندھ سہراب خان کو دیا اور تھرپارکر میر ٹھارو خان کو ۔ ریاست کے نظم و نسق کے لیے اپنے بھائیوں میر غلام علی ، میر کرم علی اور میر مراد علی کو اپنے ساتھ شامل کر لیا ۔ اسی وجہ سے تاریخ میں یہ چوپاری حکومت کہلاتی ہے ۔

سندھ کے افغانستان کے ساتھ تعلقات

میاں عبدالنبی ڈیرہ جات میں دو سال رہ کر ، تیمور شاہ ، شاہِ افغانستان کے پاس امداد کے لیے گیا ۔ تیمور شاہ نے اس کے ساتھ ایک فوج ، سردار احمد نورزئی کے ماتحت سندھ پر حملہ کرنے کی غرض سے بھیجی ۔ سکھر کے قریب دونوں کا مقابلہ ہوا مگر تیموری فوج کو شکست ہوئی ۔ تیمور شاہ اپنے سالارِ فوج کی شکست سے برافروختہ ہوا اور خود فوج لے کر آیا ۔ اسی اثناء میں اسے خبر ملی کہ بلخ کے صوبیدار نے بغاوت کردی ہے ۔ چنانچہ اسے واپس افغانستان جانا پڑا ، لیکن ۱۷۹۰ء میں اس نے پھر ایک فوج سندھ پر حملے کے لیے بھیجی ۔

میر فتح علی خان نے تیمور شاہ سے صلح کر لی اور اسے خراج دینا منظور کیا - فتح علی خان دس سال کی کامیاب حکومت کے بعد ۱۸۰۲ء فوت ہوا اور اس کے بعد اس کا بھائی میر غلام علی تخت نشین ہوا اور اس طرح یکے بعد دیگرے تالپوری حکمرانوں نے جن میں غلام علی کے بعد کرم علی خان، مراد علی خان، نور محمد خان اور آخر میں میر نصیر خان کے نام قابل ذکر ہیں، تخت نشین ہوئے - یہ لوگ امیرانِ سندھ کہلائے - میر کرم علی کے دور میں علم و ادب اور فن کا فروغ ہوا اور اس امیر نے اہلِ فن کی بہت سرپرستی بھی کی -

سندھ پر انگریزوں کا تسلط

انگریزوں کو جو سندھ میں دلچسپی تھی اس کا سبب اس کی تجارتی اہمیت تھی - یہی وجہ ہے کہ ۱۷۵۸ء میں انگریزوں نے ٹھٹھہ میں ایک فیکٹری قائم کی، پھر انگریزوں کا ایک تجارتی وفد تالپوری میر کے پاس ۱۷۹۹ء میں آیا لیکن اس وفد کی آمد نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی - سندھ سے فرانسیسی اثرات کو ختم کرنے کے لیے برطانوی حکومت نے امیرِ سندھ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا، جس کی تجدید ۱۸۲۰ء میں ہوئی - الگزانڈر برانز ۱۸۳۱ء میں لاہور جاتے ہوئے دریائے سندھ سے جو گزرا تو اس کو دریائے سندھ اور صوبہ سندھ کی فوجی اہمیت کا اندازہ ہو گیا اور اسی دن سے برطانوی حکومت نے سندھ پر اپنا قبضہ جمانے کا فیصلہ کر لیا -

ادھر رنجیت سنگھ، سندھ کو اپنی ہی حکومت کا ایک حصہ سمجھتا تھا، اس لیے کہ اس نے پنجاب ابدالیوں سے حاصل کیا تھا، لیکن وہ اس کو اپنی سلطنت میں شامل نہ کر سکا - انگریز اپنا اثر دن بدن سندھ میں بڑھا رہے تھے - اسی لئے ۱۸۳۱ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ نے رنجیت سنگھ سے اس بات پر مخالفت کی کہ سندھ کی تقسیم کی جائے - اس پر امیرِ سندھ نے برطانوی حکومت کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس میں شرط درج تھی کہ سندھ کی سڑکیں اور دریا تجارتی سامان لانے، لے جانے کے لیے انگریز استعمال کر سکیں گے - لیکن ان راستوں سے فوج یا فوجی رسد گذارنے کی اجازت نہ ہو گی - اس معاہدے کی تجدید ۱۸۳۴ء میں ہوئی - ۱۸۳۸ء تک رنجیت سنگھ کے دماغ سے سندھ کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا خیال نہ نکلا - اس لیے انگریزوں نے اپنا اثر و رسوخ جمانے کے لیے امیرانِ سندھ کو اپنی حمایت کا یقین دلایا اور خود معتبر بن بیٹھے -

جب انگریزوں اور افغانوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو ۱۸۳۲ء کے معاہدہ کی خلاف ورزی کی گئی اور افواج و فوجی سامان سندھ سے گزارا گیا - اس پر امیرِ سندھ نے معاہدہ کی خلاف ورزی کے خلاف آواز بلند کی، تو لارڈ آک لینڈ نے اپنی طاقت کو کام میں

لانے کی دھمکی دی ۔ ادھر شاہ شجاع نے امیران سندھ سے خراج طلب کیا ۔ یہ خراج شاہ افغانستان کی جلاوطنی کے وقت سے (تیس سال) بند تھا ۔ چنانچہ امیر سندھ کے پاس سوائے گورنر جنرل کے استحصال بالجبر کو ماننے کے اور کوئی چارہ نہ تھا ۔ سرجان کین نے امیر سندھ کو ایک نئے معاہدے پر مجبور کیا ۔ لارڈ آک لینڈ نے فروری ۱۸۳۹ء کو یہ نیا معاہدہ پیش کیا کہ حکومت سندھ کی حفاظت کے لیے برطانوی فوجیں رہیں گی اور تین لاکھ روپیہ سالانہ جو اس فوج پر خرچ ہو گا ، امیر سندھ ادا کرے گا ۔ امیر سندھ نے بہ امر مجبوری اس معاہدہ پر دستخط کیے ۔ اب سندھ پر مکمل قبضہ کرنے میں انگریزوں کے لیے کوئی قباحت باقی نہ رہی تھی ۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے میجر جیمز آئرم کی جگہ سر چارلس نیپئر کو مسلح افواج کے ساتھ سفیر بنا کر بھیجا ۔ نیپئر ایک تند مزاج آدمی تھا ۔ اس نے امیر سندھ کے خلاف موہوم الزامات لگانے شروع کر دیے ۔ اور رفتہ رفتہ اپنے سکہ کو بھی جاری کر دیا اور اس سے قبل کہ اسی قسم کی باتوں پر مبنی ایک نیا معاہدہ پیش ہوتا ، امیر سندھ کو امام گڑھ بلا کر بغیر اعلان جنگ کے جنگ چھیڑ دی اور جنوری ۱۸۴۳ء میں فتح حاصل کر لی ۔

نیپئر کے اس سلوک سے متاثر ہو کر جنگجو بلوچیوں نے ۱۵ ۔ فروری ۱۸۴۲ء کو برطانوی سفارت خانے پر حملہ کر دیا ۔ اس وقت آئرم برطانیہ کا سفیر تھا ۔ اس نے بھاگ کر اپنی جان بچا لی اور پھر میانی کے میدان میں باقاعدہ جنگ لڑی گئی ۔ میر پور کے حاکم شیر محمد نے بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا ، لیکن بالآخر نیپئر نے میر پور کو فتح کر لیا ۔ چنانچہ سندھ کا باقاعدہ الحاق انگریزی حکومت کے ساتھ ہو گیا ۔ اور نیپئر سندھ کا پہلا گورنر مقرر ہوا ۔ سر چارلس نیپئر کی اس قسم کی چیرہ دستی اور استبداد کو انگریزوں میں بری نظر سے دیکھا گیا اور برطانیہ نے اس کے جواز کے لیے کوئی ثبوت نہ پیش کیا ۔ مگر سندھ کی قسمت کا فیصلہ باقی برصغیر کی طرح ہو چکا تھا چنانچہ اس وقت سے لے کر ۱۹۴۷ء تک برطانوی شہنشاہیت کا جزو بنا رہا ۔

تالپور حکمران اور علمی سرپرستی

ادب اور فن کی حیثیت سے کلہوڑوں کے دور پر تالپوری عہد کو برتری حاصل ہے ۔ اس کا سبب یہ تھا کہ امیران تالپور خود صاحب ذوق تھے ۔ علم اور فن کے سرپرست تھے ۔ میر فتح علی خان اگرچہ شاعر نہ تھا لیکن شاعر پرور تھا ۔ عظیم ، عطارد اور منیا جیسے فارسی زبان کے قادر الکلام شاعر اس کے دربار سے وابستہ تھے ۔ میر کرم علی خان ، میر مراد علی خان ، میر محمد نصیر خان اور صوبیدار خان خود شاعر تھے ۔

میر کرم علی خان کا تخلص کرم تھا اور وہ صاحبِ دیوان تھے ۔ آپ کے شعر میں سادگی اور شیرینی ہے ۔ فکر کی سادگی کا اندازہ آپ کی اس غزل سے ہو سکتا ہے :

گفتم بناز و لطف بنہہ ہا بچشم من خندید و ناز کرد جفا را بہانہ ساخت
گفتم کہ روئی تو بینم ز شوق دل پوشید رو بدست و دعا را بہانہ ساخت

اُردو میں بھی چند اشعار آپ کی یادگار ہیں :

صبحدم یاد مجھے چاک گریباں آیا
پھر تصور میں میرے وہ رخِ تاباں آیا
سیر گلشن میں نظر میری پڑی غنچوں پر
دل میں پھر میرے خیالِ خنداں آیا

میر کرم علی خان کے دربار کے چند شعراء کے نام یہ ہیں ۔ میر عظیم ، میر عاشق اصفہانی ، مرزا مظہر یزدی ، میر ہوتک افغانی ، سید ثابت علی شاہ ، میر سید علی ، مخدوم نور محمد ہویکائی ، مرزا خسرو بیگ ، میر کاظم سرخوش ، سلیمان صباحی ۔

میر کرم علی خان کی وفات کے بعد میر مراد علی تخت نشین ہوا ۔ وہ بھی اپنے بزرگ بھائی کی طرح شاعر تھا ۔ اس کی دو تصنیفیں 'دیوان علی' اور 'طب مراد' موجود ہیں ۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو :

چہ گویم من آں نازک اندام ز دل صبر بردہ ست و آرام را
بجز لعل شیریں نخواہم شکر بگویند آمد بار گلفام را
علی را حمایت شہہ دین بود ز دم بہشت ہائے بایامد را

آپ نے اُردو زبان میں بھی شعر کہے ہیں ۔ مثلاً :

مجھ پر ہے احسان گرانبار صنم کا میں کیا کہوں ہوں میں تو خریدار صنم کا
نکلا جو کبھی مہر میں ابر سیہ سے یاد آیا مجھے چہرۂ گلنار صنم کا

اس کے عہد میں ایک درباری شاعر محمد بچل نے سندھ کے شعراء کا ایک انتخاب مدون کیا ، جس کا نام 'محک خسروی' تھا ۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد تالپوری میں فارسی شاعری کا خوب رواج تھا ۔ سندھ کا آخری امیر میر محمد نصیر خان تو علم اور فضل میں اپنے پیشروؤں سے بھی زیادہ بڑھا ہوا تھا ۔ بچپن میں اس کی تعلیم ایک ایرانی عالم کے زیر نگرانی

ہوئی ، جس کی وجہ سے وہ فارسی میں خاصی استعداد رکھتا تھا ۔ جب بڑا ہوا تو شعر و سخن سے لگاؤ پیدا ہوا اور جعفری تخلص اختیار کیا ۔ علم نوازی اور قدردانی کی شہرت کی وجہ سے اس کا دربار اہلِ علم سے بھر گیا ۔ اس کے عہد کے مشہور شعراء کے نام درج ذیل ہیں :

آخوند بچل متھلوی ، میاں محمد یوسف ، آغا زین العابدین عابد ، فریدون بیگ قانع ، بہادر خان ، اخلاق ، قاضی گل محمد خان ملتانی ، آخوند احمد ، وفا اور میٹھا رام مسرور

خود اس کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں :

(۱) دیوان فارسی اور دیوان اُردو (۱۸۱۷ء/۱۲۳۳ھ) (۲) 'مثنوی مرزا صاحباں' (۱۸۱۹ء/ ۱۲۳۵ھ) (۳) مثنوی مختار نامہ (۱۸۲۵ء/۱۲۴۱ھ) (۴) 'سفر نامہ جعفری' (۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ) اور مکاتیب جعفری ۔

میر نصیر خان کا چچا زاد بھائی ، صوبیداد خان بھی قادرالکلام شاعر تھا ۔ 'میر' تخلص تھا ۔ اس کی مشہور تصنیفات یہ ہیں :

(۱) دیوان میر فارسی (۱۸۶۴ء/۱۲۴۰ھ) ، (۲) مثنوی فتح نامہ (۱۸۲۸ء/۱۲۴۴ھ) ، (۳) مثنوی سیف‌الملوک (۱۸۳۱ء/۱۲۴۷ھ) ، (۴) مثنوی خسرو و شیریں (۱۸۳۵ء ۱۲۵۱ھ) ، (۵) مثنوی ماہ مشتری (۱۸۳۶ء/۱۲۵۲ھ) ، (۶) مثنوی جدائی نامہ (۱۸۴۴ء/ ۱۲۶۰ھ) ، میر صوبیداد خان نے یہ 'خمسہ' امیر خسرو ، نظامی اور جامی کے تتبع میں لکھا تھا ۔ میر معصوم شاہ بکھری کے بعد میر صوبیداد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے خمسہ' کے رواج کو پھر زندہ کیا ۔

تالپور خاندان کے شعراء کے علاوہ میر شہداد خان اور میر حسین علی خان بھی قادرالکلام شاعر گذرے ہیں ۔ میر شہداد خان کا تخلص حیدری تھا ۔ جہاں تالپور تاجداروں کو شعر و سخن اور ادب سے بڑی محبت تھی وہاں وہ فنونِ لطیفہ میں بڑی دلچسپی لیتے تھے ۔ ان کی بہت سی تصانیف مصوّری اور نقاشی کے شاہکار ہیں ۔ اہل ہنر کی قدردانی کے باعث بہت سے خطّاط حیدرآباد میں آ کر جمع ہو گئے تھے ۔

تالپوروں کے کتب خانے

تالپوروں تاجدار کو کتابوں کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا ۔ ان کے ہاں متعدد کاتب کتابوں کی کتابت کے لیے ملازم تھے ۔ کتابوں کو محفوظ کرنے کے لیے کافور کی پیٹیاں بنائی گئی تھیں جب کوئی کتاب نقل ہو کر آتی تو جلد بند ، ان کی منقش جلد بندی کرتے تھے ۔ تفسیر ، حدیث ، منطق ، فلسفہ ادب ، شعر اور تاریخ ہر قسم کی کتابیں

تھیں اور ان میں ہر وقت توسیع ہوتی رہتی تھی - سنہ ۱۸۴۳ء کے انقلاب کے بعد انگریزی حکام نے ان کتب خانوں کو برباد کر دیا - یہ کتب خانے لندن کے انڈیا آفس یا برٹش میوزیم میں پہنچ گئے - تالپوروں کے کتب خانے کے علاوہ انفرادی طور پر ٹھٹہ حیدر آبارد ، حیدر آباد ، روہڑی اور شکار پور کے عالموں کے ہاں بھی بڑے بڑے کتب خانے موجود تھے -

حیدر آباد کے علمی خاندان

تالپوروں کے دور میں اُمراءکو بھی علم و فن کا شوق تھا - ان میں تین خاندان قابل ذکر ہیں - آغا اسمٰعیل شاہ ، نواب ولی محمد خان اور مرزا خسرو بیگ - ان کا کلام فارسی میں ہے - آغا اسمٰعیل شاہ کا والد ایران سے ہجرت کر کے سندھ میں آیا ، کلہوڑوں کے دور میں شاہی طبیب رہا - باپ کی وفات کے بعد آغا اسمٰعیل شاہ بھی کلہوڑا کا شاہی طبیب رہا - بعد میں تالپوروں کا طرفدار بن گیا - تالپوروں کی حکومت میں امیران سندھ کا مقرب بن گیا - اس کے فرزندوں میں ابراہیم شاہ ، میر زین العابدین اور میر کاظم شاہ تاریخ میں خاص طور پر مشہور گزرے ہیں - میر زین العابدین اور میر کاظم شاہ بڑے پایہ کے شاعر گزرے ہیں - میر زین‌العابدین عرصہ تک شکار پور اور کراچی کے نواب رہے - میر کاظم شاہ شکار پور کا نواب تھا اور اس زمانے میں شاہ شجاع کے مقابلے میں کھرڑی (سکھر کے نزدیک) کی جنگ میں مارا گیا -

اس خاندان کے بعد ، رتبہ میں نواب ولی محمد خان شمار ہوتا ہے جو لغاری بلوچ تھا یہ خاندان ابتدا میں ہی تالپوروں کا طرفدار تھا - 'ہالانی' کی فتح کے بعد میر فتح علی خان نے اس کو وزارت کا منصب پیش کیا اور وہ سالہا سال اس منصب پر فائز رہا - ۱۸۳۲ء میں اس نے وفات پائی - یہ مخدوم عزت اللہ ولد مخدوم عنایت اللہ شہید کا مرید کا اور امیری میں فقیر تھا - وہ اپنے دور کے بلند مرتبہ شعراء میں شمار ہوتا تھا - اس کا دیوان یادگار ہے - یہ اشعار اس کے کلام کا نمونہ ہیں :

ما نقد جان و دل بہ نثار تو دادہ ایم	این است اے صنم محک امتحان ما
خامش ولی کہ طبع نگار تو نازک ست	صندل بدرد سر نکشد زین بیان ما

آخر میں مرزا خسرو بیگ کے خاندان کا شمار ہوتا ہے - مرزا موصوف طفلس (جارجیا) کا رہنے والا تھا - چھوٹی عمر (۱۷۹۰ء) میں روس اور ایران کی لڑائیوں میں ایرانیوں کے ہاتھ آیا - ایرانی فوجی سپہ سالار حاجی محمد ابراہیم اس نے کا سر پرست بنا .اور بڑے ناز سے مرزا کی پرورش کی ، لیکن اس کی وفات کے بعد وہ مرزا شاہ اسماعیل کے ہاتھ آیا - وہ اس‌کو ایران

سے سندھ لایا اور میر کرم علی خان کے حضور میں پیش کیا ۔ چونکہ میر صاحب کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے اس کو متبنیٰ بنایا ۔ تالپوروں کی حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز رہا ۔ جب تالپوروں کی حکومت کا چراغ گل ہوا تو انگریزوں نے اس کو عہدے پیش کیے لیکن اس نے انگریزوں کی ملازمت سے انکار کر دیا ۔ ۱۸۶۰ء میں طویل عمر پا کر وفات پائی ۔ وہ بھی بہت بڑا پر گوشاعر تھا ۔

سندھی شاعری

اگرچہ تالپوری دور میں فارسی زبان کو اہمیت حاصل تھی لیکن سندھی ادب بھی آہستہ آہستہ ترقی کر رہا تھا ۔ کلہوڑوں کے دور میں علمائے کرام نے اپنی اکثر تصانیف سندھی زبان میں لکھیں ۔ تالپوروں کے دور حکومت میں اس تحریک نے زیادہ فروغ حاصل کیا۔ متقدمین کی تقلید میں علمائے کرام نے سندھی زبان کی طرف زیادہ توجہ دی ۔ دراصل شہروں میں فارسی کی حکومت کو ضرورت تھی لیکن دیہاتوں میں سندھی زبان کی تصانیف کو زیادہ مقبولیت تھی ۔ جس طرح کلہوڑوں کے دور میں شاہ عبداللطیف نے سندھی زبان کو بلند مقام دیا اسی طرح تالپوروں کے دور میں سچل سرمست نے سندھی زبان کو فروغ دیا۔

سچل سرمست (۱۷۳۹ء - ۱۸۲۶ء)

سچل سرمست کا نام عبدالوہاب تھا لیکن آپ نے سندھی اور سرائیکی کلام میں اپنا تخلص 'سچو' اور 'سچل' (صداقت والا) رکھا ۔ فارسی کلام میں تخلص 'آشکار' ہے ۔ آپ کی ولادت سنہ ۱۷۳۹ء میں 'درازا' کے گاؤں میں ہوئی ۔ فارسی کی تعلیم کے ساتھ مذہبی اور روحانی تعلیم بھی حاصل کی ۔ اپنے چچا میاں عبدالحق کی صحبت میں آپ نے روحانی مدارج طے کیے ۔ اور آپ کو حال اور قال دونوں نصیب ہوئے آپ کی ساری زندگی جذب اور حال میں گذری ۔ اس وجہ سے آپ سرمست کے لقب سے مشہور ہوئے ۔ آپ کی زندگی کا بڑا حصہ عبادت الٰہی اور گوشہ تنہائی میں گذرا ۔ آپ نے ۹۰ برس کی عمر پائی اور (۱۸۲۶ء - ۱۲۴۲ھ) میں درازا میں وفات پائی ۔

سچل کے تصوف کا رنگ

برِ صغیر میں قادری سلسلہ کا آغاز حضرت سید محمد غوث (م - ۱۵۱۷ء) کے اُچہ شریف میں ورود سے ہوا ۔ ابن العربی (م - ۱۲۴۰ء) چونکہ اسی سلسلہ کے روحانی پیشوا تھے اس لیے اس میں وحدت الوجود کا نظریہ رواج پا چکا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر سندھ میں بھی یہ نظریہ پھیلا جو اہلِ تصوف نے عام طور پر اختیار کر لیا تھا ۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی

اور عبدالوہاب سچل سرمست (م - ۱۸۲۶ء) اسی لیے جام وحدت سے سرشار نظر آتے ہیں۔ سچل سرمست حضرت بلّھے شاہ (ز- ۱۷۶۷ء) سے بھی متاثر ہوئے اور بلّھے شاہ جہاں اصل اعتبار سے اُچّہ گیلانیاں سے تعلق رکھتے تھے وہاں قادری بزرگ بھی تھے ۔ ان کے متعلق سرمست سرائیکی زبان میں کہتے ہیں :

بلّھے شاہ کون بیراگی کیتوئی   جنہاں دا شہر قصور

اس سے پتہ چلتا ہے کہ سرمست بلّھے شاہ کے ترک ماسوا اور وحدت پرستی سے بڑے متاثر تھے ۔ ان تمام سے پہلے ایک اور قادری بزرگ حضرت سلطان باہوؒ (م - ۱۶۹۱ء) بھی یہی آواز بلند کر چکے تھے ۔ لیکن جام وحدت سے سر شاری کے اثرات ان تمام پر مختلف تھے ۔ حضرت سلطان باہوؒ عرفان کی راہ پر بہت آگے نکل گئے اور عالم وجد میں رہے ۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی ذات احد کی تجلّیات میں کھوگئے ۔ بلّھے شاہ نے اس ذات کا جلوہ مقام قریب سے بے تکلّف رفیق کی صورت میں دیکھا اور عبدالوہاب سچّل ایسے مدہوش اور سرمست ہوئے کہ اپنے آپ سے بے خبر ہوگئے اور ان میں من و تو کا امتیاز جاتا رہا ۔ اسی اتّحاد کامل کا نتیجہ ہے کہ ان کے کلام میں رانجھن ، تخت ہزارہ ، رنگ پور اور جھنگ سیال علامات بن کر جدید معنویت کے حامل بن چکے ہیں ۔

سچل سرمست کی شاعری

درارا کے صوفیانہ مرکز کی روح رواں تھے ۔ آپ نے اسلامی تصوّف کے ایرانی رنگ کو پیش کیا ۔ بلکہ ایرانی شعراء سے بھی آگے بڑھ گئے ۔ ہمہ اوست کے فلسفے کا چونکہ گہرا اثر تھا اور وہ وحدت الوجود کے حد سے زیادہ مبلغ تھے ، یہی سبب تھا کہ ان کے کلام پر علمائے دین کی طرف سے کڑی تنقید ہوئی ۔ کلام میں نفی اور اثبات ، فنا اور بقا کا ذکر ہے ۔ ان اسرار و رموز کو بیان کرتے ہوئے وہ فریدالدین عطار ، محمود شبستری اور مغربی رنگ میں ڈوب جاتے ہیں ۔ ایک جگہ منصور کی آواز اناالحق سے متاثر ہو کر یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ ، کہہ اٹھتے ہیں :

میں ایک اسرار ہوں ،
آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں ؟
میں نہ نوری ہوں نہ ناری ہوں ،
میں خود رب جبّار ہوں !   (ترجمہ)

اپنی اس بے خودی کے اثرات پر خود ہی تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

اگر میں اپنے آپ میں ہوں تو ایک دیندار کی طرح
دینداری کے کام کرتا ہوں ،
اگر میں آپے سے باہر ہو جاتا ہوں ،
تو یہ میری خطا نہیں ! (ترجمہ)

ایک اور بیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو :

وہ سرتاپا ایک راز ہے ،
کہیں سچل ہے تو کہیں سچل کی ذات ہے ،
حباب کو موج نے ایک دریا بنا دیا ہے ،
اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ،
کہ وہ اپنے رنگ دیکھنے کے لیے
خود لاکھوں بیکھ بنا رہا ہے ! (ترجمہ)

فکر اور تخیل کی وہ افراتفری جو ان کے کلام میں پائی جاتی ہے اس میں بھی شرع کا احترام کھتے ہیں ۔ سچل سرمست کے ابیات میں وہی رنگ جھلکتا ہے جو شاہ بھٹائی کے کلام میں موجود ہے ۔ آپ کے کلام میں بھی فصاحت اور بلاغت بدرجۂ اتم موجود ہے ۔ مثلاً برسات کا نظارہ اس طرح پیش کرتے ہیں :

ساری رات برس کر ،
بارانِ رحمت نے ،
ریگستانی علاقوں کو پانی سے بھر دیا ،
صبحِ صادق کے وقت
پروندں نے اپنے پروں کو صاف کرنا شروع کیا ،
میدانوں پر ہر قسم کے پھول پیدا ہو گئے ! (ترجمہ)

مہینوال کی جدائی میں سوہنی کی دلی کیفیت کے حال کا اس طرح اظہار فرماتے ہیں :

بھینسوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی صدا نے ،
میرے دل کو دیوانہ کر دیا ہے ،
شب و روز ان کی یاد ،

میرے تن بدن میں سلگتی ہے !
گویا بھینس اور مہینوال کی محبت ،
میرے جسم میں پیوست ہو گئی ہے !　　　(ترجمہ) ۔

جس طرح سندھی شاعری میں شاہ عبداللطیف بھٹائی ، 'وائی' کے موجد مانے جاتے ہیں اس طرح سچل سرمست 'کافی' کے موجد سمجھے جاتے ہیں اگرچہ روحل اور مراد نے بھی کافیاں لکھی ہیں مگر سچل سرمست نے کافی کو بلندی پر پہنچا دیا تھا ۔ کافی بہت عرصہ سے سندھ میں موجود تھی مگر مختلف آراء کے مطالعہ کے بعد یہی نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ کافی کے صحیح موجد سچل سرمست ہی ہیں[1] ۔ سچل نے 'کافی' میں جدا جدا تجربے کیے ہیں ۔ حقیقت میں 'بیت' کی ترتیب میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے اس کو 'وائی' کی صورت دی گئی تھی ، وائی کو زیادہ نکھار کر کافی کی صورت دی گئی ۔ سچل سرمست نے کافی کی سادہ صورت کو بڑھا کر اس کی ڈویڑھی ، دوہری اور اڑھائی ، صورت بنا دی تھی ۔ اور سندھی شاعروں کے لیے یہ ایک محبوب صنف بن گئی ۔

سچل سرمست کا کلام سندھی کے علاوہ اردو اور فارسی میں بھی ہے ۔ فارسی میں آپ کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں :

(۱) دیوان اشکار (۲) رہبر نامہ (مثنوی) (۳) تار نامہ (مثنوی) (۴) گداز نامہ (مثنوی) (۵) درد نامہ (مثنوی) ۔

ان مثنویوں میں تصوّف کے راز و نیاز بیان کیے گئے ہیں ۔ آپ کی ایک اردو غزل یہاں بطور نمونہ دی جاتی ہے :

ایک دن بزاز اندر دیکھا عجب نظارا
طفلوں کے ہاتھ میں ایک بلبل ہوا بیچارا
پرو بال رشتہ اندر اس کے بندھے تھے محکم
تڑپن سے وہ نہ چھوٹا ، کرتا تھا لاکھ پکارا
ہم حال اس سے پوچھا ، کہ بلبلا ہمن سوں
کس حال میں پڑا ہے ، چھوڑا چمن ہزارا

---

۱ ۔ کافی ملکی شاعری کا وہ صنف ہے جو سندھ اور پنجاب کا ایک مشترکہ سرمایہ ہے اس کے موجد شاہ حسین (م ۔ ۱۵۹۹ء) تھے ، اور بلھے شاہ (ز ۔ ۱۷۶۷ء) نے اس کو کمال پر پہنچایا ۔

ہنس ہنس کے گویا ہوا ، تجھ کو خبر نہیں ہے
عاشق کا حال جو ہے ، وہ حال ہے ہمارا
دم عشق جس نے مارا ، اس کے گلے میں رشتہ
سر جان اس پہ صدقہ ، سچو سریر سارا

آپ کی اردو دیکھ کر دکن کی اردو کی یاد تازہ ہوتی ہے ۔

نانک یوسف (م - ۱۸۵۲ء/۱۲۶۹ھ)

سچل سرمست کے مریدوں میں 'فقیر یوسف' کا بڑا درجہ ہے ۔ وہ لاڑکانہ ضلع کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا ۔ کھوکھر قوم سے تھا ، ایک آسودہ خاندان کا فرد تھا ، اس لیے اس کی تعلیم بہت اچھی ہوئی ۔ سرمست سچل سے اس کی ملاقات لاڑکانہ کے قرب و جوار میں ہوئی اور وہ سچل سرمست کا گرویدہ بن گیا اور دنیوی تعلقات کو چھوڑ کر 'قوسف' درزا چلا آیا اور مرشد کے دروازہ پر معتکف ہوگیا ۔ روایت ہے کہ سچل سرمست کا ایک خدمت گار یعقوب نامی تھا ، وہ ہمیشہ دروازہ پر رہتا تھا ۔ ایک دن اتفاقاً یعقوب وہاں موجود نہ تھا ، سرمست سچل نے یعقوب کو آواز دی ، چونکہ وہ غیر حاضر تھا ، یوسف نے جواب دیا کہ حضور یعقوب تو موجود نہیں ہے لیکن اس کا غلام یوسف حاضر ہے ۔ سرمست نے یہ آواز دوبارہ اور سہ بار دی لیکن یوسف نے ہر مرتبہ بڑے عجز و انکسار سے یہی جواب دیا ۔ سومست نے ان کو الدر بلا لیا اور اپنی خاص نظر سے دیکھا ۔ اس دن سے یوسف ، مرشد کے پاس قریب سے قریب تر ہوتا گیا ۔

یوسف اپنے مرشد سچل سرمست میں فنا تھا ۔ اس وجہ سے درازا کی صوفیانہ تحریک کا بڑا مبلغ تھا ۔ سچل سرمست کی وفات کے بعد درازا سے ہجرت کر کے دریائے سندھ کے کنارے پر ایک گاؤں اکڑا میں مقیم ہو گیا ۔ اور یہاں ہی (۱۸۵۲ء/۱۲۶۹ھ) میں وفات پائی ۔ علامہ بیدل روہڑی نے اس کی تاریخ وفات لکھی ۔ ایک روایت ہے کہ یوسف سیر و سفر کرتے ہوئے امرتسر جا نکلا ۔ یوسف نے امرتھر کے خالصہ دربار میں کھڑے ہوکر اپنے نانک ہونے کا دعویٰ پیش کیا ۔ دربار کے خالصوں نے یہ سن کر اس کو یہ پیش کش کی کہ اگر کڑتے ہوئے تیل کی دیگ میں داخل ہو کر سلامت نکل آئے تو ہم اس کے دعویٰ کو صحیح سمجھیں گے ۔ یوسف نے قبول کر لیا ۔ لیکن اتفاقاً اس رات مندر کا بڑا پجاری مر گیا ، اور یوسف کے تقاضے کے باوجود

اس کا یہ امتحان نہ ہو سکا ۔ اس دن سے اس کا 'نالک' لقب پڑ گیا ۔ یہ حقیقت ہے اس کا سرائیکی کلام سندھی سے زیادہ متین اور شیریں ہے ۔ مثلاً :

اپنے آپ میں گم ہو کر ، محبوب کی صورت کا نظارا کر !
فقط اپنے دم کا خیال رکھ ،
اس دم کے ختم ہونے کا خوف نہ بھول !
اپنے جسم کو فراموش کر دے ، یہ آخر گزرنے والا ہے ،
اپنی نگاہ میں نور جمال کو رکھ ، اور
اپنے اندر اپنے نگار کی صورت کو دیکھ ۔
عاشق الٰہی عشق کا تقاضا ہے کیونکہ محبت کو ہی بقا ہے ،
محبت میں بیخود ہو کر اپنے جسم اور جان سے ہاتھ اٹھا لے ،
اسکے بعد ہی محبت کے نقّارہ کو بجا
اور اناالحق کہہ دے ! (ترجمہ)

ایک کافی کا ترجمہ بھی ذیل میں دیا جاتا ہے :

باز نگاہ حیات طرفتہالعین کا تماشا ہے ،
اولے عاشق ! درد کی حالت کا راز جان لے ،
مرشد کی ہدایت کو مان ! ہوشیار ہو غافل نہ بن !
اپنے صاحب کو دل میں پہچان !
یہ جہان ایک فریب ہے !
خوف اور خطرے کو چھوڑ کر محبت کے میدان میں آجا !
برے خیالات کو چھوڑ دے ،
محبت کی راہ سے کچھ حاصل کر !
یہ دنیا پر فریب اور دو رنگی ہے !
اس کے فریب میں نہ جا
اس فنا کے بسیرے پہ فخروناز بیہودگی ہے

یوسف! اس حقیقت کو کوئی سالک ہی سمجھ سکتا ہے
خدا کی باتوں کے ماسوا ہر چیز باتوں کا فریب ہے ! (ترجمہ)

حضرت پیر محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ (۱۷۵۸ء - ۱۸۱۷ء)

حضرت پیر محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ ، سید بقا کے فرزندوں میں سے تھے ۔ آپ کا سال ولادت (۱۷۵۸ء/۱۱۷۲ھ) ہے ۔ آپ پیر گوٹھ (ضلع سکھر) میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں اچھی تعلیم حاصل کی۔ والد کی شہادت کے بعد آپ سجادہ نشین ہوئے۔ مخدوم محمد اسماعیل صاحب سے روحانی فیض حاصل کیا ۔ شباب میں فیض کا شہرہ ہوا اور وفات تک قائم رہا ۔ آپ کی وفات سال (۱۸۱۷ء/۱۲۳۳ھ) میں ہوئی ۔ آپ کے اسم گرامی کی نسبت سے آئندہ آپ کے خاندان پر 'خاندان راشدیہ' نام پڑا ۔ آپ اپنے دور کے محقق عالم تھے اور آپ نے مشہور تصنیفات چھوڑیں (۱) مکتوبات (۲) شرح اسماء الحسن (۳) ملفوظات ۔ آپ کے ملفوظات کو آپ کے مرید خلیفہ محمود نظامانی نے جمع کیا ۔ یہ کتاب اسلامی تصوّف ، تاریخ ، تمدن اور تہذیب کا ایک بے بہا خزانہ ہے ۔ فارسی اور عربی تصنیفات کے علاوہ آپ نے سندھی شعر کا ایک بڑا ذخیرہ بطور یادگار چھوڑا ہے ۔ جس میں تصوّف کے نکتوں کو سلجھا کر بیان کیا ہے ۔ حضرت پیر محمد راشد کی وفات کے بعد آپ کے فرزند پیر صبغت اللہ شاہ راشدی سجادہ نشین ہوئے ۔ آپ کے ایک بیت کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے ۔

میرا دل روزانہ آہ و فغاں میں مبتلا ہے ،
اگرچہ میرا دوست ہر جگہ موجود ہے ،
لکن میرا اشتیاق کم نہیں ہوتا ! (ترجمہ)

پیر صبغت اللہ شاہ راشدی (م - ۱۸۲۰)

حضرت پیر محمد راشدی کی وفات کے بعد آپ کے فرزند پیر صبغت اللہ شاہ راشدی سجادہ نشین ہوئے ۔ آپ کے زمانہ میں سید احمد شہید ، جہاد کی خاطر افغانستان کو جاتے ہوئے ، سندھ سے گزرے ۔ حضرت صبغت اللہ شاہ نے کچھ عرصہ کے لیے آپ کو مہمان رکھا جب آپ جانے لگے تو مجاہدوں کی چھوٹی سی جماعت ساتھ کر دی ، جس پر بعد میں 'حر' نام پڑا ۔ پیر صبغت اللہ شاہ راشدی کی وفات ۱۸۳۰ء/۱۲۴۶ھ میں ہوئی ۔ یہ شعر آپ کے کلام میں سے ہے :

تشنگی صدف چوں شود بسیار
بہر سعیش صحاب می آید

پیر علی گوہر شاہ راشدی اصغر (م - ۱۸۴۶)

پیر راشد کی وفات کے بعد ان کے فرزند صبغت‌اللہ شاہ راشدی سجادہ نشین ہوئے۔ پیر صبغت‌اللہ شاہ کی وفات کے بعد پیر علی گوہر شاہ راشدی مسند نشین ہوئے، روحانی کمال کے ساتھ دینوی جلال بھی رکھتے تھے - پیر صاحب موصوف کو کتابوں کے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا - آپ کا شمار کافی گو شعراء میں ہوتا ہے - آپ کی کافیوں میں فصاحت اور بلاغت کے علاوہ سوز و گداز بھی ہے - آپ نے (۱۸۴۶/۱۲۶۳ھ) میں انتقال کیا - ذیل کی کافی جس کا ترجمہ دیا جاتا ہے آپ کے کلام کی نمائندگی کرتی ہے :

اے عشق تیری حالت غیر ہو،
تو نے مجھے بے سبب کیوں در بدر کیا ؟
قیامت کے روز میرے مصائب کا،
کاش ! تیرے سر پر وبال پڑ جائے!
تو نے مجھے کیوں آوارہ کیا ؟
وہاں سے چل کر جب تو یہاں آیا تو
تو نے میری جان جنجال میں ڈال دی،
تو نے بستیوں سے مجھے ڈھونڈھ کو نکالا،
'اصغر' کہتا ہے، آپ کی محبت نے مجھے پامال کیا
اور ہر عضو کو میرے جانچ لیا ہے - (ترجمہ)

خلیفہ محمود کڑیھہ والا (م - ۱۸۴۴)

پیر محمد راشدی علیہ الرحمۃ کے ارادتمندوں میں خلیفہ محمود کو بڑا رتبہ حاصل تھا - خلیفہ صاحب نے اپنے مرشد کے ملفوظات کو بڑی کاوش سے جمع کیا ہے - آزاد نظم میں ایک تصنیف آپ کی یادگار ہے - جس میں آپ نے 'حقیقت محمدی' کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے - اس نظم کا انتخاب (ترجمہ) درج کیا جاتا ہے - خلیفہ صاحب سال (۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ء) میں وفات پائی -

جس نے مجھے دیکھا اس نے خدا کو دیکھا
اس حدیث کو دل سے پڑھ لے ،
اپنے دوست کو دور نہ ڈھونڈ ،
وہ تو قریب سے قریب تر ہے !
میرے حبیب کی جگہ وہاں ہے ،
جہاں نہ نیست ہے نہ ہست !
نہ وہاں کوئی طالب ہے نہ مطلوب !
تو چراغ جلا کر سورج کی روشنی کو ڈھونڈ رہا ہے ، (ترجمہ)
حضرت محمدؐ کی تابعداری، نور نبوت کا اظہار ہے! خدا نے حضرت محمد صلعم
کو عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے !

خلیفہ عبداللہ

خلیفہ محمود کی وفات کے بعد آپ کا فرزند خلیفہ عبداللہ جانشین ہوا ۔ آپ نے اپنی زندگی خدا کی یاد میں متوکلانہ بسر کی ۔ خلیفہ صاحب سے ایک تصنیف ،'لیلیٰ مجنوں' سندھی ابیات کی صورت میں یادگار ہے ۔ عشق اور محبت کے اس قصہ میں خلیفہ صاحب نے گویا اپنی محبت کی کہانی کو پیش کیا ہے ۔ فرماتے ہیں :

اپنے دوستوں کی محبت نے مجھے پریشان کر دیا ہے ،
میرے دوست جس دیس میں گئے وہاں سے ، واپس نہ آئے ۔
مجھے مصیبت میں ڈال کر انہوں نے کوئی خبر گیری نہ کی ،
کاش ! وہ مہمان پھر میرے یہاں آئیں ۔ (ترجمہ)

سید ثابت علی شاہ ثابتؔ

سید ثابت علی شاہ 'ثابت'، میر کرم علی خان کے مقرب اور درباری شاعر ، اصل ملتان کے رہنے والے تھے ۔ شروع میں سندھ کے مشہور فارسی شاعر محسن ٹھٹوی کے فرزند غلام علی 'مداح' کے درس میں شامل ہوئے ۔ مولوی مداح سندھ کے حکمران میاں سرفراز کلہوڑے کا بھی استاد تھا ۔ ہم مکتب ہونے کی وجہ سے ثابت علی کی واقفیت شہزادے سے ہو گئی ۔ کچھ وقت کے میل جول کے باعث ثابت علی کو شعر

گوئی کا شوق پیدا ہوا اور وہ آپس میں شعر گوئی کی مشق کرتے رہے ۔ میاں سرفراز کی مداح میں انہوں نے بہت سے قصیدے لکھے ۔ جب سرفراز خان کی حکومت میں تنزل آیا تو یہ ٹھٹہ سے ہجرت کر کے سیون میں مقیم ہو گئے ۔

تالپوروں کے دور میں آپ کی بڑی عزت افزائی ہوئی ۔ میر کرم علی خان نے آپ کو درباری شاعر بنا دیا ۔

ثابت علی شاہ کا رتبہ فارسی شاعری میں اپنے ہمعصروں سے بہت بڑھا ہوا ہے ۔ آپ کا دیوان یادگار ہے ۔ سندھی شاعری کو علم عروض کی پابندیوں میں لا کر آپ نے اس کو کمال پر پہنچا دیا ۔ آپ نے سندھی شاعری میں مرثیہ کو متعارف کیا اور اس میں بھی کمال حاصل کیا ۔ سندھ میں مرثیہ نگاری کی تاریخ پر آپ کے اشعار بطور سند کے یادگار ہیں ۔

"اس سے پہلے سندھ میں سندھی مرثیہ موجود نہ تھا ۔ اگر کہیں تھا بھی ، تو ہر جگہ مشہور نہ تھا ، مجھے (دوست) نے کہا ، ہندی زبان میں مرثیہ بہت دردناک ہے ، تو بھی کچھ سندھی شعر میں ، ماتم اور مرثیہ تصنیف کر" ۔ (ترجمہ)

آپ کے مراثی کی تعریف یہاں مکمل طور پر نہیں ہو سکتی ۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کربلا کے خونین واقعہ کا ذکر آپ نے بڑے سوز و گداز سے کیا ہے ۔ آپ کے مرثیوں میں فصاحت ، تمثیل نگاری ، سوز و گداز ، جدت ، واقعات کے بیان کی قوت ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے ۔ میدان کربلا میں امام حسین علیہ السلام آخری مقابلہ کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں ۔ تھوڑی دیر اپنے خیمے میں توقف فرماتے ہیں ۔ اور حضرت زین العابدین سے اس طرح رخصت ہوتے ہیں :

شاہ گھوڑے سے اتر کر خیمے کے اندر اشکبار آئے ،
سرہانے بیٹھ کر کہنے لگے ،
اے میرے دل کے قرار عابد !
تو ذرا آنکھیں کھول اور ہوشیار ہو جا ،
میں تو مرنے چلا ہوں ، اور
یہ ناموس نبی صلعم آپ کے حوالے کر رہا ہوں ، (ترجمہ)

اس کا مدار اب تجھ پر ہے ،
اپنے دل کو سمجھا اور قلب کو ہوشیار کر ،
اور اپنے والد کا آخری دیدار کرے ! (ترجمہ)

★ ★

جب امام علیہ السلام میدانِ کربلا میں تشریف لائے ،
تو کربلا کے بیابان کو گلگوں دیکھا ،
سلطانِ کربلا نے اپنے عزیزوں کو بلا کر کہا ،
اے بیوطن اسیرانِ کربلا !
کربلا کے یتیموں کا یہ صبح حسرت سے بھرا ہوا ہے ،
کربلا کے غریبوں کی غریب شام بڑی تاسف انگیز ہے ۔ (ترجمہ)

★ ★ ★

کافر صفوں میں جمع ہو کر ،
لڑنے کے لیے تیار ہو گئے ،
امام علیہ السلام کو ان کے خیالِ خام کی خبر ہوئی ،
آپ ان کے پاس آئے اور ہمکلام ہوئے ،
اے کوفہ کے رہنے والو ! شام کے شومیو !
آخر تو میں رسولِ خدا کا نورِ چشم ہوں
فاطمہ کا آرام اور علی المرتضیٰ کا سرور ہوں ۔ (ترجمہ)

★ ★ ★

سب نوجوان باری باری ،
میدان جنگ میں ان پر نثار ہوئے ،
اب تنہا امام حسینؑ ہیں
اور کوئی ان کا راز دار نہیں !
اہل بیت میں ایک شور پڑ گیا ،
آہ و فغاں کا ایک محشر برپا ہوا ،

امیر کے بچے دلگیر ہیں ، اور
غم کی تصویر ہیں مگر ان کا
عزم آہنی ہے ! (ترجمہ)

یہ مرثیے تین جلدوں میں ہیں ، جن کو شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ نے جمع کر کے شائع کیا تھا ۔ ان مراثی میں سلام بھی ہیں ، مخمس بھی ہیں ، مسدس اور مربع بھی ۔ آپ نے فارسی شاعری میں بھی بلند مرتبہ پایا اور ۱۸۱۰ء میں سیون میں فوت ہوئے ۔

سید خیر شاہ

سید خیر شاہ سید ثابت علی شاہ کے ہمعصر تھے ۔ حیدر آباد کی مضافات میں پھلیلی کے کنارے پر سیالوں کے گاؤں میں رہتے تھے ۔ پھر حیدر آباد میں سکونت اختیار کی ۔ سید ثابت علی شاہ شیعی تھے اور خیر شاہ سنی العقیدہ ، عقائد کے اختلاف کے باعث ان دونوں میں چشمک پیدا ہوئی ۔ چونکہ ثابت علی شاہ درباری شاعر تھے اور حاکموں کے ہم عقیدہ ، اس لیے میر کرم علی خان نے آپ کو جلا وطن کرنا چاہا ، لیکن چند وجوہات کے باعث کرم علی خان نے یہ خیال تبدیل کر کے آپ کی عزت اور توقیر میں اضافہ کیا ۔ خیر شاہ کی تصنیفات میں 'جنگ نامہ امام حسین' معجزہ حضرت جابر انصاری، اور 'دستار اور کلاہ کا مکالمہ' مشہور ہیں 'معجزہ حضرت جابر انصاری' صحیح معنی میں معجزہ کی صنف کا ایک شاہکار ہے ۔ 'کلاہ اور دستار کا مکالمہ ، بڑی شہرت رکھتا ہے اور شاعری میں چونکہ یہ ایک نئی پیشکش تھی اس لیے مقبول ہوئی ۔ اس طویل مکالمہ کا کچھ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے ۔ سید خیر شاہ ۱۸۱۵ء میں حیدر آباد میں فوت ہوا ۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے :

وہ شے جو دنیا میں پیدا ہوئی ہے ،
زیب و آرائش کی آرزو مند ہے !
تو ان سے مقابل ہو سکتا ہے ،
کیونکہ شادی کے موقعہ پر دستار کے سوا نہیں بنتی ۔
تیرے اندر تو کپڑے کی دھجیاں ہی رکھی جاتی ہیں ،
اپنا ذکر کسی سے نہ کر ، اور
خاموش رہ ، ورنہ

تیری خامیوں کو ایک ایک کر کے ظاہر کر دونگا۔

* * *

تو میرے عیوب کو کیا ظاہر کر سکتی ہے !
یہ خامیاں تو سب میں موجود ہیں !
مجھے تو کوئی نظر نہیں آتا ، جو
میرا مقابلہ کر سکے !
ٹھاکروں نے میرے استعمال کی رسم کو جاری کر دیا ہے ،
اب سارے گاؤں میں کوئی بھی تیری تعریف نہیں کرتا ۔
آب آنتوں جین تجھے اتار کر پھینک گیا ہے ۔ (ترجمہ)

پیر محمد اشرف کا مارو

پیر محمد اشرف قریشی حضرت شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی کی اولاد سے تھے ۔ پیر محمد اشرف بکیرا سے ہجرت کر کے کامارو کے گاؤں (ضلع تھرپارکر) میں آ کر رہے ۔ آپ ہر سال حضرت غوث الحق کی زیارت کے لیے ملتان تشریف لے جاتے تھے ۔ اس آمد و رفت سے آپکی واقفیت نواب محمد صادق ثانی والئی بہاولپور سے ہوئی ، جو آپ کے معتقدین میں شامل ہوئے ۔ اشرف شاہ سندھ کے کافی گو شعراء میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں ۔ آپ کی تصنیفات میں کافی کے علاوہ بیت اور مدیحی شعر بھی موجود ہیں ۔ آپ کا کلام سوز و گداز اور حسن تکلّم سے بھرا ہوا ہے ۔ آپ کی اس کافی کا ترجمہ دیا جاتا ہے جو کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی شہادت کے وقت کہی تھی ۔ نمونہ کلام دیکھیے :

اے عاشق اپنے سر پر قبول کر !
یہ خدا کی رضا مندی ہے ،
شاکر ہو کر شکر کر ،
جو کچھ بنی وہ اچھی بنی ، اور وہ سب حق ہے ،
اس واحد کو یہی منظور ہے !
ہمیشہ خوش رہ ،
اور صبر کے مزے لوٹ لے ،

تیرے رونے اور ہنسنے سے کچھ نہ ہو گا !
ہونے والا ہو کر رہے گا ،
اس محبوب کو معلوم ہے ،
کہ تو کیا کہہ رہا ہے ،
جو قادر کی تمنا ہے ،
وہ کبھی طور پر ٹل نہیں سکتی ! (ترجمہ)

مخدوم محمد امین ہالا

حضرت مخدوم امین عرف 'پکھن دہنی' ہالا کے مشہور بزرگ حضرت غوث الحق مخدوم نوح رحمۃ اللہ علیہ صدیقی و سہروردی کی اولاد سے تھے ۔ آپ کی ولادت ۱۸۳۸ء (۱۲۵۴ھ) میں ہوئی ۔ آپ نے تفسیر ، حدیث ، فقہ اور تصوّف میں مرتبہ حاصل کیا ، روحانی فیض بھی آپ کو اپنے والد محترم سے حاصل ہوا ۔ ۱۸۵۳ء میں آپ والد کی وفات کے بعد فقر کی مسند پر متمکن ہوئے ۔ جوانی بڑی فارغ البالی سے گذری ۔ لیکن بعد میں آپ پر ایک سہروردی درویش سہیل ،نگریہ کی محبت کا اثر ہوا ۔ چونکہ راہوئڈ میں فقط جھونپڑے تھے ، اس لیے آپ بھی ایک جھونپڑے میں آباد ہو گئے ۔ اس اقامت کے باعث آپ کا 'پریکھن دھنی' یعنی جھونپڑے کا مالک لقب پڑ گیا ۔ ریاضتوں کے باعث آپ تارک الدنیا بن گئے ۔ اور بقیہ زندگی یاد الٰہی میں بسر کر کے ۱۸۸۶ء (۱۳۰۳ھ) میں فوت ہو گئے ۔ آپ کے کلام میں کافیاں بھی ہیں اور ابیات بھی ۔ جس میں تصوّف کا عنصر غالب نظر آتا ہے ۔ اس میں سرائیکی کلام بھی شامل ہے ۔ ایک کافی کا ترجمہ مثال کے طور پر دیا جاتا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

میری زندگی شب و روز روتے ہی گزر رہی ہے ۔
اے جان ! مجھے کیچ کے حاکم کی محبت نے ناتواں بنا دیا ہے ۔
قاصد ! میرے دوستوں کے پاس جاتے ہوئے
درمیان میں قیام نہ کر ۔
اے ماں ! کوہستان میں رہنے والوں کے بغیر ،
مجھے چین اور آرام مل نہیں سکتا ،
میں نے عشق کا لبادہ

بڑی سج دھج سے پہنا ہے ! (ترجمہ)

کنڈری کے شعراء

روحل فقیر کی وفات کے بعد ان کا بڑے فرزند شاہو فقیر فقر کی مسند کے وارث بنے۔ آپ کے شعر کا بڑا حصہ ہندی زبان میں ہے - سندھی زبان میں ابیات کی صورت میں مختصر کلام موجود ہے - آپ جوانی میں لاولد فوت ہوگئے - آپ کی وفات سال ۱۸۳۴ء میں ہوئی - مندرجہ ذیل بیت کا ترجمہ آپ کے کلام میں سے ہے۔ ملاحظہ کیجیے :

جب دوست نے خود کو دیکھا ،
بہار کی خوشبو پھیلنے لگی ،
وہ میرے صحن میں آیا !
جدائی کی رات گئی ،
میں نے اسے لامکان سے حاصل کیا ،
جو طریقہ مجھے روحل نے بتایا تھا ،
میں نے اسی پر عمل کیا ، اور اب
خود اپنے آپ میں سمایا ہوا ہے ! (ترجمہ)

فقیر غلام علی

شاہو فقیر کی وفات کے بعد ان کے بھائی فقیر غلام علی آئے - آپ نے بڑی سنجیدہ طبیعت پائی تھی - انگریزوں اور پٹھانوں کی یلغاروں نے تالپوروں کی طاقت کو ضرب لگائی تھی - فقیر غلام علی اس زمانے میں ، لوگوں پر فیض باطنی کی بارش کر رہے تھے - آپ اپنے بڑے بھائی شاہو فقیر کے مرید تھے - آپ کا شمار کافی گو شعراء میں ہوتا ہے - ہم آپ کی ایک کافی کے چند اشعار کا ترجمہ بطور نمونہ کلام پیش کرتے ہیں :

نہ یہ ہے ، نہ وہ ،
عشق کا فقط جلوہ ہی نظر آتا ہے ،
سن لو !
اس طرف ہزاروں میں سے کوئی ایک ہی جاتا ہے !
تو طالب ہے ، تو

ملامت اور نیش عشق سے نہ ڈر !
عشق کا نام لیتے ہی ،
میں گردی ہو گیا !
ہمارے جیسے سینکڑوں عاشق ،
دوست کے در پر پڑے ہوتے ہیں ،
میرا محبوب خود میرے گھر آ گیا !
اب کوئی نہ وہم ہے ، نہ خطرہ ہے ،
میرے مرشد شاہو شاہ ، نے یہ بڑا احسان کیا ۔
غلام علی !
عشق کی راہ پر کسی سے مشورہ کر کے نہ چلنا چاہیے اور
اپنے دوست کے اسرار کو کسی سے نہ کہنا چاہیے ! (ترجمہ)

غلام علی فقیر نے سنہ ۱۸۳۹ء میں کنڈڑی میں وفات پائی ۔ آپ کے بعد اگرچہ آپ کے بڑے بیٹے روحل ثانی فقر کی مسند پر متمکن ہوئے لیکن کنڈڑی کو فقیر غلام علی کے چھوٹے بھائی فقیر دریا خان سے ہی زینت تھی ۔ یہ نجیب الطرفین تھے ۔ آپ کی پرورش فقیر غلام علی نے کی تھی ۔ اور ان سے ہی آپ کو باطنی فیض حاصل ہوا ۔ اگرچہ آپ کے اور ابیات مشہور ہیں لیکن آپ حقیقت میں کافی گو شاعر تھے ۔ آپ کا کلام ہندی ، سندھی اور سرائیکی میں موجود ہے ۔ کافی گو شعراء میں آپ بعد کے شعراء کے رہنما تھے ۔ سنہ ۱۸۵۰ء میں فوت ہوئے

خلیفہ نبی بخش لغاری

تالپوروں کے دور میں لغاری قوم کی بڑی اہمیت تھی ۔ نواب ولی محمد اور ان کی اولاد حکمرانوں کے مقرب بنے رہے ۔ اس قوم کے افراد نے سندھی ادب میں بہت کام کیا ہے ۔ لغاری قوم کے شعراء میں خلیفہ نبی بخش اور حمل فقیر ، چوٹی کے شاعر شمار ہوتے تھے ۔ آپ کی ولادت سال (۱۷۳۲ء/۱۱۴۰ھ) میں ہوئی ہو گی ۔ آپ نے بچپن اور جوانی اپنے آبائی وطن 'میٹھی' ضلع حیدر آباد میں گزاری ۔ تعلیم سے فراغت حاصل کر کے آپ میر پور خاص کے تالپور حکمران میر ٹھارے خان کی ملازمت میں داخل ہو گئے ۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ ترک ملازمت کر کے گوشہ نشین ہو گئے ۔

اسیری کے بجائے فقیری کو پسند کر لیا اور حضرت محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں میں داخل ہو گئے اور اپنی خوش اعتقادی کے باعث خلیفہ کے مرتبہ پر پہنچے۔ اور بقیہ زندگی یاد اللہی میں بسر کر کے سنہ (۱۷۸۵ء/۱۲۰۰ھ) میں جان بحق ہوئے ۔ آپ کا کلام سندھی اور سرائیکی زبانوں میں ہے ۔ آپ کی ایک اور مکمل تصنیف 'سسّی و پنوں' مثنوی کی صورت میں موجود ہے ۔ خلیفہ صاحب بڑے محب وطن تھے ۔ 'کھرڑی' کے شہیدوں پر ابیات کی صورت میں ایک طویل باب لکھا ہے جس میں سندھیوں کی شجاعت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔ بطور نمونہ کچھ کلام ذیل میں پیش کیا جاتا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیں :

آج میدانِ جنگ میں بہادر
بڑے ولولے سے رقص کرتے آ رہے ہیں !
یہ بہادر !
بڑی مستعدی سے لڑ رہے ہیں ،
بہادر آگے ہی بڑھتے جا رہے ہیں ،
جو بزدل ہیں ،
وہ بھاگ رہے ہیں ! (ترجمہ)

شعر میں آپ نے قاسم تخلص اختیار کیا تھا اور اسی نام سے آپ کا رسالہ مشہور ہے ۔ آپ کے کلام پر اکثر شاہ بھٹائی کے کلام کا اثر ہے ۔

حمل خان لغاری (۱۸۱۴ - ۱۸۷۸)

حمل خان ، خیر پور کے نزدیک ایک گاؤں خانپور میں ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو فارسی اور عربی زبانوں پر عبور حاصل تھا اور آپ علوم منقول اور معقول دونو پر دست گاہ رکھتے تھے ۔ آپ نے لغواری کے بزرگوں سے بیعت کی لیکن خاندان راشدیہ بھی عقیدت تھی ۔ بقول مصنف 'تذکرہ لطفی' آپ کی وفات (۱۸۷۸ء/۱۲۹۶ھ) میں ہوئی ۔

حمل لغاری متاخّرین شعراء میں سر فہرست شمار ہوتے ہیں۔ لیکن متقدمین میں بھی آپ کے درجہ کا کوئی شاعر نہیں ۔ آپ عوامی شاعر تھے ۔ ان کا کلام گنجینۂ معانی ہے ۔ اگرچہ کلام عاشقانہ ہے لیکن جب ناصحانہ رنگ میں لکھتے ہیں تو عجیب ظریفانہ انداز

پیدا کرتے ہیں ۔ اس انوکھے طریقہ سے نظم کا تاثر بڑھ جاتا ہے ۔ مثال کے طور پر ایک فارغ البال اور آوارہ نوجوان کی اس طرح تصویر پیش کرتے ہیں :

رفتار کج ہے ،
اور دستار بھی سر پر کج ہے ،
اور ان کی انگلی انگلی میں
چھلّے بھی موجود ہیں !
بالوں کو سنوار کر وہ ،
ٹیڑھی مانگ نکالنے اور بالوں کو پیچ دینے کے عادی ہیں !
بڑے ناز اور غمزے سے یہ آوارہ جوانوں کا گروہ ،
شہر میں گشت کرتا ہے ،
اور طرّوں کو چھوڑ کر ، یہ
پنھگٹ پر آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں ! (ترجمہ)

آپ کا کلام سندھی اور سرائیکی دونوں زبانوں میں موجود ہے ۔ لیکن بیشتر حصہ سرائیکی میں ہے ۔ سندھی کلام میں بڑی شگفتگی اور روانی ہے ۔ کلام میں ابیات زیادہ اور کافیاں کم ہیں ۔ آپ کے ایک بیت کے ترجمے سے کچھ آپ کی قادر الکلامی کا اندازہ ہو جائے گا :

میرے عزیز (مارو) خوشبو دار تیل استعمال نہیں کرتے ،
حمل کہتا ہے ، ان کے ہاتھ مکھن سے تر ہیں ۔
اے سومرے ! یہ میرے عزیز تیری حفاظت میں ہیں
ان سے بد سلوکی نہ کر !
اس بدسلوکی کی سزا ضرور ملتی ہے ! (ترجمہ)

حمل کی تصنیفات میں 'ہیر و رانجو' کے متعلق دو سی حرفیاں اور سلطان جمجمہ کا قصہ بہت مشہور ہے ۔

قطب علی شاہ قطب ، محمد عالم سومرہ اور جمن چارن ممتاز صوفی گذرے ہیں ۔ جو کبھی کبھار تصوف میں ڈوبے ہوئے ، شعر بھی کہتے تھے ۔ جمن چارن

کی ایک مدح آج تک مشہور و مقبول ہے ۔ اس مدح کے کہنے سے ان کی بینائی بھی واپس آ گئی تھی ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے :

تو اللہ کا ولی ہے !
حضرت علیؓ کی اولاد ہے ،
مہر و ماہ کا مرشد ہے !
اے پیر پیران بادشاہ ! (ترجمہ)

صدیق فقیر سومرہ

محمد صدیق سومرہ ، جن کا تخلص صادق تھا ، ڈھورو نارو ضلع تھرپاکرر کا رہنے والا تھا ۔ (۱۷۵۲ء/۱۱۶۶ھ) میں پیدا ہوا ۔ مخدوم عنایت اللہ شہید کے فرزند مخدوم فضل اللہ قلندر کے مریدوں میں داخل ہوا ۔ اور خلیفہ کا رتبہ حاصل کیا ۔ اس نے (۱۸۴۸ء/۱۲۶۵ھ) میں وفات پائی ۔ کیونکہ وحدت الوجود کا قائل تھا اس لیے اشعار کا بڑا حصہ شطحیات سے پُر ہے ۔ ارادتمندوں نے کلام جمع کر کے اس کو رسالہ کی صورت دی ۔ یہاں ایک بیت کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے ۔

وہ سراسر سبحان ہے !
جس کو تو نادان نہیں سمجھ سکا !
عقل کے ہمراہ ہو کر ،
کسی نے خدا کی راہ کو کبھی حاصل نہیں کیا !
یہ محبت کا رشتہ ، فقط ،
ایک سادہ اور انجان انسان کے حصے میں آتا ہے ! (ترجمہ)

خلیفہ کرم اللہ شکار پوری

خلیفہ کرم اللہ کا شکار پور کے اہل اللہ میں شمار ہوتا ہے ۔ آپ (۱۷۸۶ء/۱۲۰۱ھ) میں تولد ہوئے ۔ ابتداء میں رنگریزی کا کام کرتے تھے ۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد کھہڑا (خیر پور) ضلع کے مشہور اہل دل عالم جناب مخدوم محمد فضل اللہ قلندر کے مریدوں میں داخل ہوئے اور خلیفہ کے مرتبہ پر پہنچے ۔ مخدوم موصوف کی صحبت میں آپ نے طبابت کی طرف رجوع کیا اور آہستہ آہستہ نامور طبیبوں میں شمار ہونے لگے ۔ آپ نے (۱۸۵۴/

۱۲۷۱ھ) میں وفات کی - شکار پور کے شاعر اویس نے آپ کی تاریخ وفات لکھی - آپ کا فارسی دیوان اورسندھی کلام بے احتیاطی کے باعث ضائع ہو گیا - اب آپ کی مختصر سی بیاض موجود ہے - دونو زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے - سندھی میں ابیات ، مولود اور غزلیں موجود ہیں - آپ نے زاغ اور مینا کا ایک مکالمہ لکھا - ایک بیت کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے :

کوا گھوم کر پھر درخت پر آ کر بیٹھا ،
مینا کی مقال نے اس کے دل کو فریفتہ کیا ،
بدنیتی اور فریب کو پیش رکھ کر
وہ مینا سے بکواس کرنے لگا -
تو پری سے زیادہ خوبصورت ہے ،
تیری آواز بہت سریلی ہے !
میں نے تجھ سے بڑھ کر حسین نہیں دیکھا -
تو مجھ سے جتنی دور جاتی ہے ،
اتنا ہی تیرے قریب آتا ہوں ! (ترجمہ)

یہ ایک طویل مکالمہ ہے- جس میں شاعر نے نیکی اور بدی کی حقیقت پر انوکھے رنگ میں بحث کی ہے اور آخر میں مینا (نیکی) کی کامیابی دکھائی ہے -

فتح فقیر

فتح محمد فقیر اصل ککڑ (ضلع دادو) کا باشندہ تھا مگر بعد میں حیدر آباد کے قریب 'ڈین واہ' کے کنارے پر آ کر رہا ، وہ ثابت علی شاہ ، اور خیر شاہ کا ہمعصر تھا - سنی ہونے کے باعث تالپوروں کا حکمران طبقہ اس کے خلاف ہو گیا تھا ، فتح فقیر کو جب یہ اطلاع پہنچی کہ تالپوروں کے دربار میں علانیہ اصحاب اربعہ پر ثلاثہ کی تحقیر ہوتی ہے تو اس نے اپنی معرکۃ آراء طویل مدح لکھ کر بھیجی - اس مدح سے کچھ اشعار بطور نمونہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں - ملاحظہ کیجیے :

چاروں نبی کریم کے ساتھ زینت دیتے ہیں !
چاروں کی محبت اپنے دل میں رکھ !

چاروں دین کے محافظ ہیں ،
چاروں ایمان کے عارف ہیں ،
ان سے جو بغض رکھتا ہے ،
وہ شیطان ہے !
چاروں یار نبی کریم ؐ کے ساتھ زیب دیتے ہیں !
چاروں کی محبت اپنے دل میں رکھ ! (ترجمہ)

اس مدح کی وجہ سے تالپوری اس کے سخت خلاف ہوگئے لیکن کوئی گزند نہ پہنچا سکے ۔ انگریزوں کی فتح ہونے کے بعد اسی سال یعنی ۱۸۴۳ء میں انتقال کیا ۔ کافی گو تھا ۔ اس کی کافیاں شیریں اور متین ہیں ۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے :

جس سمجھ اور انداز سے
میرا پنّوں واپس آ سکتا تھا ،
وہ سمجھ مجھے حاصل نہیں !
میں گھر کے صحن میں بیٹھ کر
یہ کہانی کس طرح بیان کروں !
یہ چندن اور عاج کا بنا ہوا چرخہ
کس امید پر بیٹھ کر چلاؤں ؟
اپنے پنوں سے کاش میری محبت قائم رہے ،
فتح کہتا ہے ، کہ
میں دوست کے فراق میں خون کے آنسو رو رہا ہوں ۔ (ترجمہ)

صاحبڈنہ صاحب شکارپوری (۱۷۵۰ء - ۱۸۴۰ء)

مُلا صاحبڈنہ شکارپور کا رہنے والا تھا ، غالباً ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۴۰ء میں وفات پائی ۔ فارسی زبان کے قادرالکلام شعراء میں سے تھا اور ایک دیوان یادگار چھوڑا جو کہ محفوظ نہ رہ سکا ۔ سندھی زبان میں اس کی دو مدحیں یادگار ہیں ۔ ایک حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں خوبصورت زبان میں لکھی ۔ نمونہ کے طور پر ذیل میں دو

چار شعر درج کیے جاتے ہیں ملاحظہ فرمائیں :

میری فریاد کو پہنچ یا نبی خیر البشر !
اے نورِ نافعِ نامور !
اس غمگین پر اک نظر کی جائے !　　　　　(ترجمہ)

دوسری مدح سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی شان میں کہی گئی ہے ۔

اویس شکارپوری (۱۷٦۰ء - ۱۸۳۰ء)

محمد اویس بھی شکار پور کا باشندہ تھا ، وہ ۱۷٦۰ء میں پیدا ہوا اور غالباً ۱۸۳۰ء میں فوت ہوا ۔ عربی اور فارسی زبانوں پر کافی عبور رکھتا تھا ۔ علم معقول میں اسے استادانہ حیثیت حاصل تھی ۔ سندھی اور فارسی شاعری میں بلند رتبہ رکھتا تھا ۔ سندھی زبان میں اس کی چند نظمیں یادگا رہ گئی ہیں ۔ باقی کلام مرور ایام سے محفوظ رہ نہ سکا ۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے :

مروّت کے ساتھ جو سرخرو رہتا ہے ،
وہی لوگوں کے ہاں عزت پاتا ہے !
ہمیشہ اپنے دل کو مروّت سے تازہ رکھ ،
تاکہ جا بجا تیری تعریف ہو ،
ادب ، خوشی اور مسرت کی بنیاد ہے ،
مروّت ، سے خاص اور عام اپنا بن جاتا ہے ،
ہمیشہ اپنے ساتھ ادب اور تمیز کو ہمراہ رکھ
تاکہ جہاں میں تو عزیز اور خوش بخت بن جائے !　　　　　(ترجمہ)

صابر کفش دوز (م - ۱۲۷۹ھ)

صابر کفش دوزؔ مدیجی (ضلع سکھر) کے گاؤں میں ایک غیر معروف شاعر گذرے ہیں ۔ ان سے فقط دو چار بیت منسوب ہیں ۔ کوئی خاص تصنیف ان کے ساتھ منسوب نہیں ۔ اندازاً وہ ۱۲۷۹ھ میں فوت ہوئے ۔ ان کی زندگی کے کوائف بھی بڑی حد تک گمنامی میں ہیں ۔

حسین دیڈر (م - ۱۸۷۰ء)

حسین دیڈر قنبر تعلقہ (لاڑکانہ) کے ایک گاؤں دیڈر میں پیدا ہوا - تالپوروں کے ہاں ملازمت کے سلسلہ میں سخت گیر واقع ہوا - ایک ماتحت ملازم کی طعنہ نما ہدایت سے ملازمت چھوڑ دی اور گوشہ نشینی اختیار کر کے ۱۸۷۰ء میں وفات پائی - صرف دو چار سی حرفیاں باقی ہیں جن میں تصوف کا اور ناصحانہ رنگ غالب ہے - علم عروض سے بھی واقف تھے - کچھ بطور نمونہ پیش خدمت ہے - ملاحظہ کیجیے :

اے بھائی ! تو میری حقیقت کو سن !
کچھ سمجھ کر ، کچھ ہوش کر -
یہ جہان فانی اور خواب خیال ہے ،
دنیا کی یہ زندگی ایک وبال ہے ،
کوشش کر اور یہ رعونت چھوڑ دے -
صاحب کی سرکار بڑی طاقتور ہے ! (ترجمہ)

* * *

اوّل اسم ذاتی (اللہ) کی ترتیب اپنے سینے کو دے ،
اس طلب میں اپنے قلب کو ذوقِ ذاتی میں مشغول رکھ ،
اس ذکر کی تصویر کو نقش ناطق کی طرح شعار کر ،
اپنے تن کو چاند کی طرح روشن رکھ ، اور تقدیر پر راضی رہ ،
اے سالک ! اس سخن کو سمجھ لے ،
تب ہی تو اپنے مطلوب کو حاصل کر سکے گا !
اپنے سینے میں اس معنوی محبوب کی جستجو جاری رکھ - (ترجمہ)

خلیفہ گل محمد (۱۸۱۱ء - ۱۸۵۵)

خلیفہ گل محمد سندھ کے نامور شاعر تھے - ۱۸۱۱ء میں ہالا کے مشہور قبیلہ 'ساونی اخوند' میں پیدا ہوئے - فارسی اور عربی زبانوں پر قدرت تھی۔ آپ کا مشغلہ درس و تدریس دینا اور روحانی تربیت حاصل کرنا تھا - حضرت صبغت اللہ شاہ کے مرید بن کر خلیفہ کے رتبے تک پہنچے - ۱۸۵۵ء میں مکہ شریف پہنچ کر وفات پائی -

سندھی شاعری میں سب سے پہلے علم عروض کے اصولوں پر اپنا شعر قلمبند کیا اور مکمل دیوان یادگار چھوڑا۔ آپ کو سندھی زبان کی لغت اور اصطلاحات پر ملکہ حاصل تھا۔ آپ کا کلام فصاحت و بلاغت سے پر ہے ۔ غزل کو سندھی شاعری میں مستقل مقام دیا ۔ چنانچہ بعد کے شعراء نے غزل کی صنف کو اپنا کر فارسی شاعری کی تقلید میں غزل کو آگے بڑھایا ۔

ایک جگہ اپنے دوست کے حسن و زیبائی کا اس طرح ذکر کرتے ہیں :

اے باغ حسن !
تیرے دیکھنے سے مجھے ،
تین گل حاصل ہوئے ۔
تیرا چہرہ گلاب کا پھول ہے
تیری زلفیں سنبل کی طرح ہیں ۔
اور تیرا دل ،
لالہ کی طرح ! (ترجمہ)

* * *

اے سرمست ! محبوب کے پیالے کو بھر کر کے دے دے ،
تا کہ محبت کی مستی میں اپنے ہوش کھو دوں ،
ایذا اور تکلیف دینے میں ،
یہ عزیز بچھو کی طرح ہیں ،
اگرچہ یہ بھائی ہوں یا چچے یا ابن عم !
اے دل ! خدا کی محبت اور ذوق و شوق سب سے بڑھ کر ہے ۔
دنیا کی عیش و عشرت کو ہو سکے تو بھالے سے چھید دے !
جس کے اندر عشق اپنی جگہ بنا کر جاگیر ہونا ہے ،
ان کی آنکھیں سدا برستی رہتی ہیں !
جن کو اپنی محبت عزیز ہوتی ہے ،
وہ پہاڑوں میں پھرنے سے بھی نہیں ڈرتے ،
ان کے پاؤں پتھروں میں زخمی ہو جاتے ہیں ،

محبت کی طرح جہاں میں ور کوئی چیز شریں نہیں ،
کاش تیرے دردِ غم کا شوق سدا قائم رہے ! (ترجمہ)

میاں محمود (۱۸۱۱ء)

میاں محمود ، سکھر کے منشی خاندان کا فرد تھا ، اس کے آبا و اجداد کچھ ریاست کے باشندے تھے ۔ میاں محمود بھی کچھ کے ایک گاؤں نجر میں سنہ ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوا ۔ اس کا والد ریاست کچھ سے ہجرت کر کے سکھر میں مقیم ہوا ۔ میاں محمود ۱۸۳۹ء میں انگریزوں کی ملازمت میں شامل ہوا اور بعد میں سیٹلمنٹ آفیسر کے عہدے سے پینشن میں آیا ۔ محمود نے سندھی ، سرائیکی اور فارسی زبان میں کچھ شعر کہے ہیں ۔ اس کے فرزند خان بہادر پیر بخش نے اس کا کلام 'گلزار مھدی' کے نام سے شائع کرایا لیکن اس کلام میں کوئی خاص خوبی نظر نہیں آتی ۔

تالپوری دور کے مصنف

حفیظ تیونہ

سندھ میں منظوم قصّوں کی ابتدا حفیظ سے ہوئی ۔ شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ حفیظ کی مشہور تصنیف 'مومل رانو' کی تمہید میں ، حفیظ کا تعارف مختصر اور چند الفاظ میں اس طرح ہو سکتا ہے :

حفیظ ذات کا تیونہ تھا ۔ وہ تعلیم سے عاری اور نابینا تھا لیکن اس کے شعر میں روانی اور شیرینی درجۂ کمال پر ہے ۔ غالباً وہ لاڑکانہ ضلع کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا اور تالپوروں کے عہد میں پیدا ہوا تھا ۔ اس کی ابتدائی زندگی غربت میں گزری ۔ موسیقی سے لگاؤ تھا اور اپنے اشعار محفلوں میں سنا کر انعامات حاصل کرتا ۔ اس کی تصنیف 'مومل رانو' سندھی شاعری کا ایک شاہکار ہے ۔ حفیظ نے قصہ گوئی کے لوازمات کو بخوبی ادا کیا ہے ۔ واقعات نگاری میں تو کمال کی حد تک پہنچ گیا ہے ۔ 'مومل رانو' وادیٔ سندھ کا عشقیہ اور نیم تاریخی قصہ ہے جس کو حفیظ نے درد انگیزی اور سوز سے لکھا ہے اور ہر واقعہ کو تفصیل سے پیش کیا ہے ۔ مومل کے قصہ کا نقشہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس کی ہیبت دل پر بیٹھ جاتی ہے ۔ حفیظ نے سوہنی اور مہینوال کا منظوم قصہ بھی تحریر کیا مگر اس میں نہ الفاظ کی شوکت ہے نہ بر جستگی اور نہ روانی ہے اس کی 'مومل رانو' واقعی ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے ۔

صنعت شکارپوری (۱۷۹۵ء - ۱۸۴۹ء)

محمد عارف صنعت شکار پور میں (۱۷۹۵ء/۱۲۱۰ھ) میں پیدا ہوا ۔ اعوان خاندان سے تھا ۔ ابتدا میں اویس اور صاحب کی صحبت میں شعر و شاعری سے وابستگی پیدا ہوئی ۔ اور فارسی شاعری میں کمال حاصل کیا ۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد خیمہ دوزی کا پیشہ اختیار کیا اور اس کی بدولت حاکمانِ وقت کے ہاں رسوخ حاصل کر لیا ۔ اس زمانہ میں شکار پور کے باذوق گورنروں ، سید زین العابدین ، اور سید کاظم شاہ کی موجودگی میں شعر و سخن کی محفلیں زوروں پر تھیں ۔ صنعت نے ان محفلوں سے استفادہ کیا ، جس سے اس کے شعر میں سنجیدگی اور پختگی آ گئی ۔ زندگی کے آخری ایام گوشہ نشینی میں بسر کیے اور اس نے ۱۸۴۹ء/۱۲۶۶ھ میں انتقال کیا ۔

اپنے ہمعصر شعراء میں بلند مرتبہ رکھتا تھا ۔ اس کا فارسی دیوان موجود ہے جس میں غزلیات کے علاوہ قصائد ، رباعیات ، مسدس اور مخمس موجود ہیں ۔ دیوان کے علاوہ ایک مثنوی 'سلطان جمجمہ' بہت مشہور تھی ۔ اور درسگاہوں میں پڑھائی بھی جاتی تھی ۔ سندھی شاعری میں ایک تصنیف 'کریما سعدی' کا ترجمہ اور چند ابیات یادگار ہیں ۔ کریما کا سندھی ترجمہ نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے ۔

شیر خان (۱۷۶۶ء - ۱۸۸۰ء)

شیر خان ضلع لاڑکانہ کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے ۔ آپ ۱۷۶۶ء/۱۱۸۰ھ میں پیدا ہوئے آپ کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی گئی ۔ جوانی کے سن پر پہنچتے ہی درازا کی درس گاہ کے ارادتمندوں میں داخل ہوئے ۔ آپ کی پوری زندگی فقیرانہ ، گوشہ نشینی اور عبادت میں گذری ۔ ۱۸۸۰ء میں وفات پائی آپ نے مشہور قصہ 'گل بکاؤلی' کو نظم میں لکھا جو مثنوی کی صورت میں موجود ہے اس مثنوی کے کچھ اشعار بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں :

خدایا ! ہم تیری ہی آس رکھتے ہیں ،
اور میں تیری ہی تعریف اور توصیف لکھ رہا ہوں ،
خدایا ! ہمیں یہ عزم عطا کر !
تاکہ ہم شافع کی شریعت پر چل سکیں ۔
خدایا ! اپنی معرفت کی راہ دکھا !

توحید کی تربیت عطا کر !
مجھے اس حقیقت کا شوق تھا کہ ،
کسی قصہ کے لکھنے کی تیاری کروں ،
بکاول اور تاج الملوک کی یہ کہانی ہے ۔
یہ قصہ محبت کی مقدس امانت سمجھیں !
یہ افسانہ بہت مشہور ہے ،
کسی نے یہ ہندی میں تصنیف کیا تھا ۔
خدا پر توکل کر کے اس قصہ کو لکھ رہا ہوں
حق و باطل کی بات خدا ہی جانتا ہے ،
گل کے بغیر بلبل کا سراغ لگانا مشکل ہے ،
یہ اپنی محبت کا قصہ ہے لیکن دوسروں کے پردے میں ! (ترجمہ)

مولوی ولی محمد (۱۷۶۶ء - ۱۸۲۴)

مولوی ولی محمد کمال الدین ۱۷۶۶ء/۱۱۸۰ھ میں ہالا کے ایک قریبی گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ درس و تدریس میں عمر صرف کی ۔ 'حکایت الصالحین' آپ کی تصنیف ہے ۔ یہ کتاب فارسی زبان میں تھی ۔ آپ نے اس کا سندھی میں منظوم ترجمہ ان لوگوں کے لیے کیا جو فارسی اور عربی نہیں جانتے تھے ۔ خود فرماتے ہیں :

> یہ کتاب عام فائدے کے لیے لکھی گئی ہے اور خصوصاً ان کے لیے جو فارسی عربی نہیں جانتے ہیں ۔ جس دن میں نے ترجمہ تمام کیا ، وہ دن خمیس تھا اور (۱۸۰۵ء/۱۲۲۰ھ) کے مہینہ جمادی الاول کی پانچ تاریخ تھی (ترجمہ)

اس میں کل بیس باب ہیں اور ہر ایک باب میں کم و بیش دس کہانیاں ہیں ۔ ان کہانیوں کا تعلق اولیائے کرام کی نصیحت آموز حکایتوں سے ہے ۔ مولوی صاحب غالباً ۱۸۲۴ء/۱۲۴۰ھ میں وفات کر گئے ۔

تالپوروں کے دور میں سندھی ادب کا جائزہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ تالپوروں کے دور میں سندھی شاعری نے کافی ترقی کی ۔

نت اور دوہے کے علاوہ سی حرفی اور مدح کے کلام کو فروغ حاصل ہوا ۔ جس کا ذکر ، صاحب اشرف اور 'جمن چارٹن' کے ضمن میں آیا ۔ مدحیہ کلام کے علاوہ سندھی شعر میں داستان گوئی کی ابتداء 'مومل رانو' ، 'سوہنی مہینوال' ، 'سسی پنوں' ، 'لیلیٰ مجنوں' ، 'گل بکاؤلی' اور 'حکایت الصالحین' سے ہوئی ۔ ثابت علی شاہ نے مرثیہ کی صنف کو بڑے عروج پر پہنچایا ۔ بعد کے شعراء مرثیہ کی صنف میں آپ کے مقلد ہیں ۔ چونکہ سندھ کے تاجداروں کا میلان طبع تشعیت کی طرف تھا اس لیے چند درباری شاعروں میں منقبت کی صنف پیش نظر آتی ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ سندھی شاعری میں ہجو نگاری کی بھی اچھی مثال ہمیں خیر شاہ اور ثابت علی شاہ کے ہاں ملتی ہے ۔ ثابت علی شاہ نے اس فن میں پوری تصنیف یادگار چھوڑی ہے ۔ جس کا نام 'چٹنگ' (شعلہ) ہے ۔ سید خیر شاہ نے مکالمہ نگاری کی ابتدا کی اور اس میں ٹوپی ، پگ (کلاہ اور دستار) کا مکالمہ لکھا ۔

جدید شاعری اور غزل کی ابتد بھی تالپوروں کے دور کی ہی خوبی ہے ۔ خود تالپور تاجدار اچھے غزل گو شاعر تھے اور فارسی میں بڑا بلند مقام رکھتے تھے ۔ ان کی ادب نوازی کے باعث جدید شاعری کو آگے بڑھنے کا موقعہ مل گیا ۔ خلیفہ گل محمد گل نے غزل کی صنف کو کمال پر پہنچا دیا ۔ اگرچہ گل نے فارسی اور عربی تراکیب کو کم استعمال کیا ہے لیکن بعد میں شعراء نے فارسی اور عربی تراکیب کو اپنی سخنوری کا طرۂ امتیاز بنایا ۔ علم و عروض کی سادہ بحروں ، ہزج ، رمل ، او متقارب کے استعمال سے یہ جدید شاعری آگے بڑھ گئی ۔ اور بعد میں مشکل بحور میں طبع آزمائی ہونے لگی ۔ جدید شعراء کے علم عروض کی طرف جھک جانے سے قدیم شاعری کو نقصان ہوا اور مقامی ماحول کے بجائے فارسی شاعری کے خارجی مضامین سندھی شاعری میں داخل ہو گئے ۔ دیوان گل کی اشاعت سال (۱۸۵٦ء/۱۲۷۳ھ) سے ، اس کورانہ تقلیدی شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا ۔ اور آہستہ آہستہ یہ ملک پر چھا گئی ۔ اور خواص سے آگے بڑھ کر عوام میں بھی مقبولیت حاصل کی ۔ اگرچہ صوفی شعراء مثلاً سچل سرمست تو صوفیانہ خیالات میں عطار ، رومی ، شبستری اور حلاج کے مقلد بن گئے تھے اور ساتھ ساتھ اپنے اشعار میں ان کے افکار کی تبلیغ بھی کرتے رہے ، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ سچل نے حلّاج کے خیالات کو سندھی شاعری میں کسی حد تک رواج دیا ۔ آپ کے معتقدین نے آپ کو 'منصور ثانی' کا خطاب بھی دے دیا ہے ۔ سچل نے کافی کی صنف کو اپنے خیالات کے ظہار کے لیے منتخب کیا ۔ اور اس کی تربیت میں نئے نئے تجربے کیے ۔ آگے چل کر کافی نے سندھی شاعری میں مقبولیت حاصل کی اگر کافی کا صحیح معنی میں موجد سچل تھا تو سید ثابت علی شاہ جدید شاعری کا علمبردار تھا ۔ اس نے نہ صرف مرثیے لکھے بلکہ قصائد ، قطعات اور رباعیات کو بھی سندھی شاعری میں لے آیا ۔ مخدوم

قلندر شہباز اور سیون کی شان میں آپ نے جو قصیدہ قلمبند کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک فن پارہ ہے ۔

نثر کی ابتدا

نظم کے علاوہ ، اس عہد میں نثر کی ابتدا ، اخوند عزیزاللہ کے ترجمہ ، قرآن شریف سے ۱۸۴۴ء میں ہوئی ۔ ایک انگریز محقق روتھن صاحب نے سندھی زبان کی گرامر کو ۱۸۳۶ء میں لکھا ۔ گو یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی لیکن یہ کتاب سندھی زبان کے صرف و نحو کا پیش خیمہ بنی اور آگے چل کر اس بنیاد پر دوسرے انگریز محققین ٹرمپ[1] ، اسٹوک[2] اور بیمز[3] نے اپنی تحقیقات کو مکمل کر لیا ۔ صرف و نحو کی تحقیق کے بعد سندھی نثر آگے بڑھنے لگی اور ان مستشرقین نے سندھی لغت کی کتابیں تیار کیں ۔

1. Earnest Trump.
2. Eastwick.
3. Beamis.

چوتھا باب

(۱۸۵۷ء - ۱۹۰۰ء)

انگریزی عہد (۱۸۴۳ء - ۱۹۰۰ء) پہلا دور

انگریزوں کی سندھ سے روشناسی

پرتگیزی امیرالبحر واسکوڈے گاما کی وجہ سے پورا مغرب ہندوستان سے واقف ہوا - اس میں انگریز بھی داخل ہیں - ۳۱ - دسمبر ۱۶۰۲ء کو برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی - ۱۶۰۷ء میں ایک انگریز ملاح کپتان ہاکنس[1] سب سے پہلے سندھ میں آیا، مگر پرتگیزیوں کے غلبے کی وجہ سے ٹھہر نہ سکا، کیونکہ واسکوڈے گاما ہی کے وقت سے پرتگیزی مغربی ساحل ہند پر جگہ جگہ قابض ہو گئے تھے -

سفرنامے

کپتان ہاکنس کے بعد جو لوگ سندھ پہنچے ان کا حال بعض سفر ناموں سے معلوم ہوتا ہے جن کی ضروری تفصیل ذیل میں درج ہے -

(۱) ڈیوویسٹ باز بروسا[2] پرتگالی سولھویں صدی عیسوی کا سیاح ہے - (۲) ٹامس پاویل[3] انگریز (۳) پرتگالی ہندوستان میں[4] (۴) نکولس ونگٹن[5] انگریز کا حال ۱۶۱۳ء (۵) سر تھامس رو[6] انگریز (۶) ولیم فر یمن[7] انگریز ۱۶۳۵ء (۷) سباسٹین مانرک[8] پرتگیزی

---

۱ - ہدوی، لطف اللہ، تذکرہ لطفی ج - ۳، ص ۵ - ۲ - ۳۰۲ جنت السندھ مولفہ مولانی شیدائی ص ۴۷۱ - ۴۷۳ -

۴ - جنت السندھ بحوالہ

The Portuguese in India Vol. I by F.C. Danvers P. 508.

۵ - جنت السندھ ص ۴۷۴ بحوالہ

Early Travels in India p.p. 128-222 by W.W. Foster

۶ - جنت السندھ ص ۴۷۵-۴۷۳ بحوالہ

The Embassy of Sir Thomas Roe P.P. 75-76 by W.W. Foster.

۷ - جنت السندھ ص ۴۷۶-۴۷۷ بحوالہ

From Akbar to Aurangzeb p.p. 114-190 by V.H McLeod.

۸ جنت السندھ، ص ۴۷۷، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲ -

۱۶۴۱ء (۸) نکولا مانوسی[1] اطالوی ۱۶۵۹ء (۹) الیگزنڈر ہیملٹن[2] (۱۰) اسکاٹ ۱۶۶۹ء (۱۰) ہزیک رادھ[3] پرتگیزی (۱۱) سفرنامۂ برنیئر[4] -

سکندر اعظم نے بھی سندھ کے کچھ حالات جمع کیے تھے اور اس سے بہت پہلے یعنی ۴۸۰ ق - م میں ابوالتاریخ ہیرو ڈوٹس نے مغربیوں کو سب سے پہلے سندھ سے روشناس کیا تھا -

تجارتی تعلقات اور پہلی کوٹھی مغلیہ عہد میں (۱۶۳۵ء)

شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں سندھ کی بعض مصنوعات ، مثلاً کپڑا ، نیل اور افیون عموماً انگلستان میں پسند کی جاتی تھیں ، جن کی برآمد کے لیے انگریزوں نے ٹھٹہ میں ۱۶۳۵ء میں سب سے پہلے اپنی تجارتی کوٹھی کھولنے کی اجازت لی -

کلہوڑا دور میں دوسری کوٹھی (۱۷۵۸ء)

غلام شاہ کلہوڑے کے زمانے میں انگریزوں نے ٹھٹہ میں اپنی دوسری تجارتی کوٹھی ۱۷۵۸ء میں کھولی -

عہد نامے

۱۷۶۰ء میں جب غلام شاہ کلہوڑا شاہ بندر میں مقیم تھا تو رابرٹ ارسکین کی درخواست پر اس نے انگریزوں کے ساتھ ایک تجارتی معاہدہ کیا اور فرمان جاری کیا کہ "انگریز سندھ میں جو مال لائیں ، ان سے چونگی وصول نہ کی جائے بلکہ ان کو کوٹھی کھولنے دی جائے اور ان سے نرمی کا برتاؤ کیا جائے"۔ اسے انگریزوں کے ساتھ عہد نامہ سمجھا جاسکتا ہے یا مغل شہنشاہوں کی طرح انگریزوں کے ساتھ غلام شاہ کی رعایت -

افغانستان اور انگریز

جب احمد شاہ ابدالی تخت افغانستان کا مالک بنا تو اس نے بھی سندھ سے خراج وصول کیا اس لیے کہ وہ برصغیر کے شمال مغربی علاقوں میں اپنے آپ کو نادر شاہ کا جانشین تصور کرتا تھا اور نادر شاہ نے سندھ فتح کر لیا تھا - یہی روش احمد شاہ کے

---

۱ ، ۲ ، ۳ ، جنت السندھ ص ۳۸۲-۳۸۱-۳۸۰-۳۷۷

۴ - جنت السندھ ص ۳۸۳

F. Bernier's Travels (1665-1668) Vol.I.P. 457.

بیٹے تیمور شاہ اور اس کے پوتے زمان شاہ نے کی رکھی ۔ مگر جب زمان شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کے بھائی محمود شاہ نے اس کی غیر حاضری میں تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی ۔ محمود شاہ کی جدوجہد میں انگریزوں نے والئی ایران کے ساتھ مل کر محمود شاہ کی مدد کی ۔ اس طرح انگریزوں کا اثر و نفوذ پہلی مرتبہ کابل میں ظاہر ہوا ۔

افغانستان اور سندھ

تیمور شاہ کی اولاد میں تخت افغانستان کے لیے ہمیشہ جھگڑا رہا ۔ محمود شاہ کا بھائی شجاع الملک بھی اس کوشش میں سرگرم تھا کہ اسی اثناء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا اسیر ہو گیا ۔ جب وہاں سے بھاگ کر شکار پور آیا تو میرانِ سندھ نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا مگر جب وہ تخت افغانستان پر قابض ہوا تو سندھ سے خراج وصول کرنے پر مصر رہا ۔

افغانستان کا تخت و تاج حاصل کرنے کی جدوجہد میں افغانستان کی حکومت سردار دوست محمد کے ہاتھ آ گئی ، جس کو انگریز ناپسند کرتے تھے ۔ اس لیے شاہ شجاع کی مدد پر آمادہ ہوگئے ۔ سندھ کی اس وقت عجیب حالت تھی کہ ایک طرف رنجیت سنگھ کی نظر سندھ پر تھی دوسری طرف یہ ملک کابل کے حملوں کا نشانہ بنا ہوا تھا اور تیسرا خطرہ انگریز تھے، جو تجارت کے بہانے سندھ کو ہضم کرنا چاہتے تھے ۔

انگریزوں کا تالپوروں کے عہد ناموں سے فرار

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اور میرانِ تالپور کے درمیان جو عہد نامے ہوئے ان کا زمانہ ۱۸۰۸ء سے ۱۸۳۹ء تک کا ہے ۔

(۱) پہلا معاہدہ ۲۸ جولائی ۱۸۰۸ء[1] (۲) دوسرا معاہدہ ۲۲ ۔ اگست ۱۸۰۹ء[2] (۳) تیسرا معاہدہ ۹ نومبر ۱۸۱۶ء[3] (۴) چوتھا معاہدہ ۱۹ ۔ جون ۱۸۳۲ء[4] اور (۵) پانچواں معاہدہ ۱۰ فروری ۱۸۳۹ء[5] میں ہوا ۔

انگریزوں نے اپنے معاہدات سے کس طرح فرار کیا ، یہ حقیقت تمام معاہدوں کو تفصیل کے ساتھ پڑھنے سے ظاہر ہوتی ہے ۔ تاریخ میں ایک واقعہ ملتا ہے کہ ۱۸۳۹ء میں جب انگریزوں کو نئے معاہدے کی ضرورت ہوئی تو میر نور محمد خان نے سرِ دربار معاہدات کی صندوقچی طلب فرمائی اور پچھلے تمام معاہدے نکال کر انگریزی وفد کے سامنے پھینک دیے اور کہا جو انگریزوں کے معاہدے پر اعتماد کرے وہ بڑا بے وقوف ہے ۔ اس سے صاف

---

۱ تا ۵ ، مولائی شیدائی ، جنت السندھ ، ص ۶۲۳-۶۲۹-۶۴۴-۶۴۷-۷۰۳-

ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں نے اپنی طاقت کی بنا پر جو معاہدے میرانِ سندھ سے کیے وہ سخت سے سخت تر ہوتے چلے گئے -

میروں کی دوسری چوپاری

چوپاری سے مطلب ہے چار مشیروں کی اعلیٰ کونسل جس کے ارکان حسب ذیل تھے - میر نور محمد خان والئی حیدرآباد اور ان کے بھائی میر محمد نصیر خان اور دو چچا زاد بھائی میر محمد خان اور میر صوبیداد خان - انہی کے صلاح مشورے سے حکومت کے کام سر انجام پاتے تھے -

خاندانی اختلافات

تخت و تاج کا معاملہ خاندانی اختلافات کا سبب بن جایا کرتا ہے - اس اختلاف کی وجہ سے میرانِ تالپور کے خاندان کے تین حصے ہو گئے - ایک حیدر آباد میں ؛ جہاں شہدانی قبیلہ حکمران تھا - دوسرا خیر پور میں جو سہرا بانی کہلاتا تھا اور تیسرا میر پور خاص میں جو مانکانی کے نام سے مشہور ہے - ان لوگوں میں باہمی اختلافات کے علاوہ اپنے اپنے خاندانوں میں بھی سلطنت کے متعلق شدید اختلافات تھے -

میر علی مراد خان خیر پور

سہرا بانی خاندان کا صدر مقام خیرپور تھا - میر سہراب خان والئی خیرپور کی وفات کے بعد میر رستم خان تخت و تاج کا مالک بنا - میر رستم خان کے دو بھائی تھے جن میں سے میر مراد علی مختلف البطن تھا - باپ نے مرنے سے پہلے بیٹوں میں ملک کی تقسیم کر دی تھی - چونکہ میر مراد علی خان کمسن تھا اس لیے سنِ شعور کو پہنچ کر اس نے اپنے حق کا مطالبہ کیا - اس بنا پر میر علی مراد خان کو میر رستم خان والئی خیر پور اور اپنے بھتیجے میر نصیر خان ولد مبارک خان سے جنگ کرنی پڑی -

چونکہ سر چارلس نیپئر حیدر آباد کا ریزیڈنٹ تھا اس لیے اس نے درمیان میں پڑ کر میر علی مراد خان کو خیرپور کی ریاست دلا دی - اسی وجہ سے میر علی مراد خان نے انگریزوں کے خلاف میر محمد نصیر خان والئی حیدر آباد کی مدد نہ کی - وہ باوجود انگریزوں کی بدسلوکی کے ان کی مخالفت نہیں کرتا تھا - یہاں تک کہ انگریزوں کی طرف سے اسے جی-سی-آئی-ای کا خطاب بھی ملا - اس نے ۱۸۹۲ء میں وفات پائی -

سر چارلس نیپئر

سر چارلس نیپئر ایک تند خو سپاہی تھا جو یورپ میں نیپولین بونا پارٹ کے

خلاف جنگ میں حصہ لے چکا تھا ۔ وہ ۱۸۴۲ء میں حیدر آباد کا ریزیڈنٹ ہو کر آیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی کی ریشہ دوانیوں اور فوجی قوت سے انگریزوں کا تسلط سندھ پر قائم ہوا ۔

جنگ نامہ میانی

سر چارلس نیپئر ایک سخت گیر فوجی افسر تھا اور انگریزوں کی سلطنت میں وسعت کا شدت سے حامی تھا ۔ چنانچہ اس نے حیدر آباد پہنچتے ہی سندھ کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا اور میروں پر بے بنیاد الزامات زبردستی عائد کرنے شروع کیے ۔ جن میں سے دو مندرجہ ذیل ہیں :

(۱) میروں کی خط و کتابت اور تعلقات انگریزوں کے دشمنوں سے ہیں ۔

(۲) میروں پر ۲۳ لاکھ روپے واجب الادا ہیں ۔

ان حیلہ تراشیوں کا بالآخر یہ نتیجہ ہوا کہ سرچارلس نیپئر نے میروں پر چڑھائی کر دی اور ۱۷ فروری ۱۸۴۳ء کو میانی کے میدان میں انہیں کو شکست دی اور میر نصیر خاں وغیرہ قیدی بنا لیے گئے ۔

دبے کی جنگ

جب انگریزوں نے حیدر آباد فتح کر لیا تو میر شیر محمد خان نے بگڑ کر انگریزوں کو لکھا کہ وہ حیدر آباد خالی کر دیں ۔ اس لیے دبے کے میدان میں میر شیر محمد خان اور انگریزوں کے درمیان ۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء کو جنگ ہوئی ۔ اس جنگ میں ہوش محمد شیدی نے جو میروں کا گولہ انداز تھا اور میانی کی جنگ میں کام کر چکا تھا میر شیر محمد خان کو مشورہ دیا کہ وہ اور نواب احمد خان جو اس کا حلیف تھا ، میدان جنگ سے دور ہو جائیں اور جنگ خود ہوش محمد پر چھوڑ دیں ۔ یہ مشورہ مان لیا گیا ۔ ہوش محمد جنگ میں کام آیا ۔ یہ وہی ہوش محمد ہے جس کی بہادری کے کارناموں کی سندھی شاعروں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ تعریف کی ہے ۔

تالپوروں کی جلا وطنی

میانی کی شکست کے بعد ، میر نصیر علی خان ، میر حسین علی خان ، میر محمد خان ، میر یار محمد خان ، میر شہداد خان اور میر صوبیداد خان ، حیدر آباد سندھ میں نظر بند کر دیے گئے اور اس کے بعد امیر زادوں میر عباس علی خان ، میر فتح علی خان ، حسین

محمد علی خان اور میر حسن علی خان کے ساتھ تمام میران تالپور کو بمبئی قید کر کے بھیج دیا گیا ، جہاں سے ۱۸۴۴ء میں وہ کلکتہ منتقل کر دیے گئے -

سندھ پر انگریزوں کا تسلط اور سر بارٹل فریئر

مارچ ۱۸۴۳ء میں سندھ پر انگریزوں کے مکمل قبضے کے بعد سر بارٹل فریئر سندھ میں چیف کمشنر ہو کر آئے ۔ ان کے زمانے میں سندھ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا اور سندھی زبان پروان چڑھی ۔ اس لیے سر بارٹل فریئر کے عہد کو سندھ کی نشاۃ ثانیہ کا دور سمجھنا بے جا نہ ہو گا ۔

★ ★ ★

فصل دوم

سندھی زبان و ادب اور انگریز

انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کرتے ہی امن و امان قائم کیا اور ملک کی دفتری زبان فارسی کی جگہ سندھی کو مقرر کرنے کی کوششیں شروع کر دیں ۔ سندھی زبان کو دفتری زبان بنانے میں بعض رکاوٹیں تھیں جن کو رفع کرنے کی ان تھک کوشش کی گئی ۔ اس میں سب سے اہم مسئلہ رسم الخط اور حروف تہجی کا تھا ۔

سندھ میں رائج رسم الخط

میران تالپور ہی کے زمانے میں چار رسم الخط رائج تھے دیو ناگری، گور مکھی، فارسی اور عربی ۔ چونکہ کوئی مشترک رسم الخط موجود نہیں تھا اس لیے تصنیف و تالیف اور روزانہ مراسلت میں بعض دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا ۔

فارسی رسم الخط کی دقت

اگرچہ مہاجرین اور کاروباری لوگ دیوناگری رسم الخط سے کام چلاتے تھے اور بعض طبقوں میں گورمکھی بھی مقبول تھی تاہم سندھ میں عام رسم الخط فارسی ہی تھا ۔ مگر فارسی رسم الخط میں چند سندھی آوازوں کے لیے کوئی حروف مقرر نہیں تھے ۔ اس لیے ہر شخص سندھی کے مختصر الفاظ کی املا اپنے اپنے طریقے سے لکھتا تھا ۔ اس کا نتیجہ

یہ ہوتا کہ بعض وقت ایک کا لکھا ہوا دوسرے کی سمجھ میں مشکل سے آتا تھا - یہی حال ان تالیفات کا تھا جو ۱۸۵۳ء تک عربی یا فارسی رسم الخط میں لکھی گئیں -

رسم الخط کے متعلق کمیشن کا تقرر

جب سندھ کے دفاتر میں سندھی زبان مروّج ہوئی تو فارسی رسم الخط کو ختم کرنے کے لیے اور سندھی زبان میں یکسانی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے سر بارٹل فریئر نے ۱۸۵۳ء میں مسٹر ایلس ڈپٹی کمشنر کی صدارت میں جو اس زمانے میں محکمۂ تعلیم کا بھی سب سے بڑا حاکم تھا ، ایک کمیشن مقرر کیا جو حسب ذیل افراد پر مشتمل تھا[1]

(۱) رائے بہادر نارائن جگن ناتھ (۲) خان بہادر مرزا صادق علی بیگ (۳) دیوان پربھداس آنند رام راچندانی (۴) دیوان ادھام رام تھانور داس میر چندانی (۵) دیوان نند پرام میرانی سیوھن (۶) میاں محمد حیدر آباد (۷) قاضی غلام علی ٹھٹھہ (۸) میاں غلام حسین ٹھٹھہ - اس کمیٹی نے ۱۸۵۳ء میں نہایت غور و فکر کے بعد سندھی رسم الخط کے لیے یہ فیصلہ کیا کہ سندھی زبان کو عربی رسم الخط میں ہی لکھا جائے گا - سندھی حروف ہجا میں تین حروف خاص فارسی زبان کے یعنی پ - چ - گ اور نوحروف خاص . . . ۴ زبان کے یعنی ث - ح - د - ص - ض - ط - ظ - ق اور بیس حروف مخصوص سندھی زبان کے داخل ہوں گے اور باقی مشترک حروف کے ساتھ مجموعہ اکاون حروف کا ہوگا - یہی فیصلہ آج تک رائج ہے[2] -

سندھی رسم الخط میں دوسری تبدیلی ۱۸۸۸ء میں مسٹر جیکب ایجوکیشنل انسپکٹر کی کوششوں کا نتیجہ ہے ، جو نون غنہ اور بعض مرکب الفاظ کی تحریر کے قواعد کے

---

۱ - محمد صدیق میمن ' سندھ کی ادبی تاریخ برٹش حکومت سے قبل ' ص ۲۳ -

۲ - سندھی زبان کے مخصوص بیس حروف کا مسئلہ سندھی زبان کی ادبی تاریخ میں صحیح درج نہیں ہوا ہے - اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ نو حروف مفصلہ متن خاص عربی زبان کے ہیں اور سات حروف سندھی زبان کے مخصوص ہیں - ان سولہ حروف کے علاوہ اکاون میں سے باقی تمام حروف اردو اور سندھی میں مشترک ہیں اور ان اکاون حروف میں سے بہت سے حروف ایسے ہیں جو فارسی اور عربی زبان میں نہیں آتے مثلاً بھ - پھ - تھ - ٹ - ٹھ - جھ - چھ - دھ - ڈ - ڈھ - کھ - لھ - مھ - نھ - اسی طرح پ - چ - ڑ - گ عربی زبان میں نہیں آتے اور ژ حرف مخصوص فارسی ہے - سندھی میں ان کی آواز نہیں ہے مگر اردو میں پائی جاتی ہے - اور سندھی کے وہ سات مخصوص حروف جو اردو ، فارسی اور عربی میں استعمال نہیں ہوئے حسب ذیل ہیں - ٻ - ڄ - ڃ - ڏ - ڳ - ڱ ان حروف کا تلفظ الفاظ میں اہل زبان کی آواز ہی سے سمجھ میں آ سکتا ہے -

متعلق تھی - آج تک اسی نہج پر نون غنہ اور مرکبات لکھے اور پڑھے جاتے ہیں[1] -

(الف) گرامر

زبانوں کے مسئلے میں قواعد کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے ، کیونکہ قواعد ہی کے ذریعے سے ہر زبان اپنی حفاظت کرتی ہے - جس زبان کے قواعد اور صرف و نحو جتنے اعلیٰ درجہ کے اور زبان کے مطابق ہوں گے اتنی ہی وہ زبان بلند رتبہ ہوگی اور اپنی زبان کی حفاظت کر سکے گی - سندھی قواعد صرف و نحو کی جتنی کتابیں دریافت ہو سکی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :

سب سے پہلی سندھی قواعدِ صرف و نحو کی کتاب میرانِ سندھ کے عہد میں ڈبلیو ایچ واتھن (W. H. Wathan) نے ۱۸۳۶ء میں لکھی - اس کے ساتھ سندھی لغت بھی شامل ہے - دوسری کتاب کیپٹن جارج اسٹک نے ۱۸۴۹ء میں لکھی - اس کتاب کے آخر میں رائے ڈیاج اور سورٹھ کا قصہ ہے جو دیوناگری میں لکھا ہوا ہے - ادھا رام نے سندھی قواعد صرف و نحو یعنی 'ویاکرن' ۱۸۵۴ء میں انگریزی طریقے پر شروع کی -

میاں محمد حیدرآبادی نے سندھی قواعد صرف و نحو ۱۸۲۰ء میں لکھی اور میجر گولڈسمتھ نے سندھی سیکھنے والے انگریزوں کے لیے اس کا اختصار کیا - ۱۸۶۱ء میں منشی ادھا رام نے 'مفید الطالبین' نامی سندھی قواعد کی کتاب لکھی - یہ سندھی قواعد میں انگریزی گرامر کو داخل کرنے کی پہلی کوشش تھی - اسی سال ادھا رام نے پارسی آموز یعنی پارسی کی صرف و نحو ، سندھی میں لکھی - ڈاکٹر ٹرمپ نے انگریزی میں سندھی قواعد صرف و نحو ۱۸۷۲ء میں تحریر کی - آخوند فتح محمد نے ۱۸۷۵ء میں 'کاشف الغموض' لفظوں کے اشتقاق اور معنی پر لکھی - جمیٹل و سنانی نے ۱۸۹۲ء میں سندھی زبان کا 'ویاکرن' لکھا اور سندھی قواعد صرف و نحو کو سنسکرت کے تابع کرنے کی ، ہندوؤں کی یہ دوسری کوشش تھی -

سندھی گرامر کے متعلق ایک بحث اور فیصلہ

۱۸۴۳ء سے پہلے تک سندھ میں عربی فارسی کی تعلیم عام تھی اور مسلم علماء سندھی زبان کے قواعد صرف و نحو کو عربی فارسی قواعد صرف و نحو سے مختلف نہیں سمجھتے تھے ، مگر ادھا رام نے اپنی قواعد 'ویاکرن' میں انگریزی قواعد صرف و نحو اور چھمٹمل نے اپنی قواعد 'سندھی زبان کے لئے ویاکرن'[2] میں سنسکرتی صرف و نحو کی اصطلاحیں

۱ - محمد صدیق میمن' سندھی ادبی تاریخ برٹش حکومت سے قبل' ص ۲۶ -
۲ - یہ کتاب ہمارے پیش نظر ہے . . . . خلیل

داخل کرنے کی کوشش کی، مگر سندھی زبان نے اسے قبول نہ کیا اور میاں محمد کی بجس میں عربی فارسی اصطلاحات تھیں جو زبان کے مزاج کے مطابق تھیں رائج ہو گئیں اور آج تک رائج ہیں۔

(ب) لغات

ہر زبان کی وسعت اس کے علم لغت سے معلوم ہوتی ہے۔ سندھی زبان میں لغت کا ذخیرہ کافی ہے جو کہ انگریزوں ہی کے زمانے میں تیار ہوا ہے مگر وہ علمی ادبی ضرورتوں کے لیے ناکافی ہے۔ مسلمانوں سے پہلے یا ان کے بعد سے ۱۸۴۳ء سے ۱۹۰۰ء تک جتنی لغات کا نشان مل سکا، ہے حسب ذیل ہیں :

سب سے پہلے سندھی زبان کی لغت میروں کے عہد میں ڈبلیو۔ ایچ۔ واتھن[1] نے ۱۸۳۶ء میں لکھی۔ اس کے ساتھ صرف و نحو بھی شامل ہے۔ ای۔ پی۔ ایسٹ وک[2] نے بھی سندھی زبان کی لغت ۱۸۴۳ء میں چھپوائی۔ اسی سال آر۔ لیچ[3] نے سات زبانوں کی ایک لغت لکھی جس میں دریائے سندھ کے مغرب میں بولی جانے والی زبانوں کی لغت شامل ہے اور اس میں سندھی بھی آ جاتی ہے۔ ۱۸۴۹ء میں کیپٹن جارج اسٹک[4] نے انگریزی اور سندھی لغت تیار کی اور اسی نے ۱۸۵۵ء میں سندھی اور انگریزی لغت لکھی۔ انگریزی اور سندھی لغت لکھشمن وشنو پراچپانے[5] نے بھی ۱۸۶۸ء میں لکھی۔ آخوند عبدالرحیم نے ۱۸۷۱ء میں 'عبدالرحیم جواہر اللغات'[6] نامی کتاب لکھی جس میں الفاظ سندھی کے ہیں اور معنی فارسی میں۔ ۱۸۷۵ء میں جناب شرٹ صاحب[7] اور مرزا صادق علی بیگ دونوں نے مل کر سندھی انگریزی لغت تیار کی جس میں الفاظ سندھی اور معنی انگریزی میں ہیں۔ امام بخش خادم شکار پوری نے کی ایک لغت لکھی ہے جس کا نام 'دو واہو'[8] ہے۔ اس میں الفاظ فارسی کے ہیں اور معنی سندھی میں۔

دو اور کتابوں کا پتہ چلتا ہے جن کو اگرچہ لغت تو نہیں کہا جا سکتا تاہم لغات کی تحقیقات پر مبنی ہونے کی وجہ سے انہیں اسی ذیل میں شمار کرنا چاہیے۔ ان میں سے ایک کتاب 'اکھر دھاتو'[9] شرٹ صاحب کی ہے جس میں سندھی الفاظ کی بنیاد سنسکرت دکھائی گئی ہے۔ دوسری کتاب ولتپتی کوش جھمٹمل و سنانی کی ہے۔ اس میں بھی

---

۱ تا ۵ - بھیرومل (مولف)، سندھی بولی کی تاریخ ، ص ۲۹۷ -

۶ - ۷ - محمد صدیق میمن، تاریخ سندھی ادب ، ص ۳۰ - ۲۱ -

۸ - بدوی، لطف اللہ ، (مرتب) کلیات خادم ، ص ۳۵ -

۹ - بھیرومل (مولف)، سندھی بولی کی تاریخ ۲۷۹ -

لغات کے مادوں اور معنی سے بحث کی گئی ہے ۔ ہندی اصطلاح میں کوش لغت ہی کی کتاب کو کہتے ہیں ۔

(ج) ضرب الامثال

دنیا کی عام زبانوں میں ملتی ہیں ۔ ان کے استعمال سے کلام میں نہ صرف زور پیدا ہو جاتا ہے بلکہ وضاحت میں بھی بڑی مدد ملتی ہے اور کلام مختصر بھی ہو جاتا ہے ۔ سندھی میں ضرب الامثال کی سب سے پہلی کتاب 'گل شکر' ۱۸۶۹ء میں کیولرام آڈوانی نے تالیف کی اور اس کے بعد دو اور کتابیں بنام 'گل' اور 'سوکھڑی'[1] اسی سال لکھی گئیں ۔ اس کے بعد سندھی 'پہاکا'[2] کوڑومل نے ۱۸۹۱ء میں لکھی ۔

ذرائع تعلیم

انگریزوں نے سندھی زبان میں کافی دلچسپی لی اور اس کو فروغ دینے کے لیے کوششیں شروع کر دیں ۔ ۱۸۴۶ء میں کراچی کے کلیکٹر مسٹر پریڈی نے اپنے صرفے سے ایک انگلش اسکول کھولا اور کمیٹی کے سپرد کر دیا لیکن انجیل کی تعلیم لازمی قرار دے دی ۔ ۱۷۵۳ء میں یہی سکول اسی شرط پر چرچ مشن سوسائٹی کی تحویل میں دے دیا گیا ۔ اسی طرح کیپٹن گولڈ سمتھ کی فیاضی سے ایک انگلش سکول شکار پور میں بھی کھولا گیا ۔ یہ انگریزی مشنریوں کی نجی کوششیں تھیں ۔

۱۸۵۳ء میں رسم الخط کا مسئلہ طے کرنے کے بعد انگریزوں نے سندھی کو سرکاری طور پر دفتری زبان بنا دیا ۔ اس لیے انگریز حکام بھی سندھی زبان سیکھنے پر مجبور ہو گئے ۔ سندھی کو سرکاری زبان بنا دینے کے بعد ابتدائی مدارس میں ذریعہ تعلیم سندھی زبان ہی قرار پایا ۔ چونکہ اس سے پہلے سندھ میں چھ سو سے زائد مکتبوں میں فارسی اور عربی اور پاٹشالاؤں میں دیوناگری کی تعلیم دی جاتی تھی[3] وہ یک قلم موقوف ہو گئی اور اب انگریزوں کا مجوزہ نصاب تعلیم جاری ہو گیا ۔ اس سلسلے میں حکومت نے نہایت نکتہ سنجی اور دور اندیشی سے نصاب تعلیم کے لیے نئی کتابیں لکھوانا شروع کر دیں اور ۱۸۵۴ء تک ریاضی اور تاریخ و جغرافیہ وغیرہ پر دس کتابیں تیار ہو گئیں[4] ۔ یہ درسی کتابیں لکھنے کے لیے بہت سے مسلمان اور ہندو تیار ہو گئے جن کے نام آگے آتے ہیں ۔ اکتوبر

---

۱ ۔ معنی تحفہ
۲ ۔ معنی ضرب المثل ۔
۳ ۔ سندھ گزیٹیر ص ۴۷۲ ۔
۴ ۔ ایضاً "

۱۸۵۴ء میں نارمل سکول کراچی میں کھولا گیا مگر سب سے بڑی دقت اساتذہ کی کم یابی تھی ۔ یہ سکول بعد میں حیدرآباد منتقل کر دیا گیا[1] ۔ جس کا ہیڈ ماسٹر سندھ کا پہلا گریجویٹ مسٹر چوہڑمل تھا ۔ آخر میں یہی سکول حیدر آباد میں مردانہ ٹریننگ کالج بنا دیا گیا جو آج تک موجود ہے ۔

سندھ کی تعلیمات کا انتظام ابتدا میں ڈپٹی کمشنر کے سپرد تھا مگر ۱۸۶۰ء میں محکمۂ تعلیم کا قیام عمل میں آیا ، جس کی وجہ سے سندھ میں تعلیمی احساس بڑھ گیا اور بہت سی انجمنیں قائم ہوئیں ۔ کراچی میں انجمن مہدی ۱۸۸۴ء میں خان بہادر حسن علی آفندی نے قائم کی ، جس کی جدوجہد سے ۱۸۸۵ء میں سندھ مدرسہ الاسلام وجود میں آیا[2] ۔ ہندوؤں نے بھی ۱۸۹۰ء میں سدھار سبھا کی بنیاد ڈالی اور حیدر آباد میں نولرائے اور ہیرا نند نے اکیڈمی سکول کھولا ۔ ۱۸۸۷ء میں کراچی میں ڈی ۔ جے ۔ سندھ کالج وجود میں آیا[3] ۔ اسی زمانے کے لگ بھگ ناٹک منڈلیاں بنائی گئیں اور مشاعروں کا آغاز ہوا ۔ اس کے بعد کتابوں کے شائع کرانے کا سلسلہ زور شور سے چل پڑا ۔

سندھی زبان میں طباعت کا انتظام

سندھی زبان میں ایک مفید انقلاب آ چکا تھا اور نصاب تعلیم کے لیے کتابیں لکھی جا رہی تھیں ۔ اس لیے سندھ میں جلد پریس کی ضرورت محسوس کر لی گئی اور کئی پریس جاری ہو گئے جن میں سے بعض کا حوالہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

(۱) محکمۂ تعلیم کا لیتھو پریس کراچی (۲) ایڈور ٹائیزرس پریس کراچی

(۳) مفرح القلوب پریس کراچی (۴) اکلیل پریس کراچی

(۵) لیتھو پریس کوٹری

اس زمانے میں چونکہ سندھ کا الحاق صوبۂ بمبئی سے تھا اس لیے بمبئی میں بھی ایسے پریس تھے جو سندھی کتابیں شائع کرتے تھے ۔

سرکاری اور غیر سرکاری کوششیں

سندھی زبان کی قواعد و لغات کی کتابوں کے نام آ چکے ہیں ۔ اب بعض ایسی

---

۱ ۔ سندھ گزٹیر ص ۴۷۵ ۔

۲ ۔ قائد اعظم مرحوم نے بھی اسی اسکول میں تعلم حاصل کی ہے ۔ خلیل ۔

۳ ۔ بھیرومل (مولف) سندھی بولی جی تاریخ ص ۲۹۸ ۔

کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو سرکاری اور غیر سرکاری متفرق کوششوں کا نتیجہ ہیں۔
۱۸۲۵ء میں سریرامپور کے پادریوں نے بائیبل کا سندھی ترجمہ کیا اور یہ کتابیں لندن سے چھپ کر آئیں۔ اسی کا ترجمہ کیپٹن جارج اسٹیک نے ۱۸۵۰ء میں دیوناگری میں کیا۔ ۱۸۵۱ء میں میاں ولی محمد نے عربی کتاب 'حکایات الصالحین' کا ترجمہ سندھی میں کیا۔ یہی منظوم کتاب دوبارہ ۱۸۷۰ء میں بمبئی میں چھپی۔ ۱۸۵۳ء میں برنس نے 'گاسپل آف سینٹ جان' کا سندھی ترجمہ کیا۔ نندیرام نے بچوں کی درسی کتاب 'باب نامہ'، ادھا رام نے پہلی اور دوسری درسی کتاب، پر بھداس نے تیسری اور چوتھی درسی کتاب کے دو حصے لکھے۔ ۱۸۵۴ء میں نندیرام اور ایلس نے انگریزی سے ایسپ کی کہانیوں کا، 'تاریخ معصومی' فارسی کا، 'تاریخ سندھ' کے نام سے اور قاضی غلام علی نے تاریخ ہندوستان کا اردو سے، سندھی میں ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی مفید کتابیں سندھی میں ترجمہ ہوئی، جن سے سندھی علم و ادب میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

سندھی صحافت کا آغاز

سندھ میں صحافت کا آغاز سب سے پہلے ۱۸۳۲ء میں ایک اردو اخبار 'مسمہ لکھنو'[1] ہفتے وار سے ہوتا ہے اور اس کے بعد سندھ میں صحافیانہ شعور جاگا اور روزانہ، ہفتے وار اور ماہانہ رسائل جاری ہوئے۔ سندھ کی دفتری زبان چونکہ فارسی تھی، اس لیے ۱۸۸۵ء میں شمس العلماء مرزا مخلص علی نے ہفتہ وار اخبار 'مفرح القلوب'[2] جاری کیا۔ اس کے بعد ان کے فرزند محمد شفیع اور محمد شفیع کے بیٹے مرزا محمد صادق اور ان کے فرزند مرزا محمد جعفر نے سندھ میں صحافت کو جاری رکھا۔ ۱۸۸۱ء میں ہفتہ وار اخبار فارسی 'اکلیل'[3] مرزا محمد صادق کی ادارت میں کراچی سے اور دوسرا اخبار فارسی 'خورشید'[4] سکھر سے نکلتا تھا۔ انگریزی اخبارات سے بھی سندھی صحافت اس زمانے میں خالی نہ تھی۔ ۱۸۵۴ء میں مسٹر اسٹرینج کی ادارت میں بدھ اور سنیچر کے روز 'سندھین'[5] (Sindhian) انگریزی میں شائع ہوتا تھا اور اسی سال دوسرا انگریزی اخبار بیکن[6]، (BEACON) نکلا۔

سندھی صحافت

سندھی زبان کا سب سے پہلا اخبار 'سندھ سدھارا' ہے لیکن اس کی تاریخ اجرا کے متعلق

۱۔ ریاض شیخ عبدالمجید سندھی سابق وزیر صوبہ سندھ جو اپنے زمانے کے مشہور صحافی رہ چکے ہیں اور اخبار الوحید اور الحق کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں۔

۲، ۳، ۴، کریم خالد سندھی صحافت ص، ۱۰۰ - ۱۰۱ - ۱۱۴ -

۵۔ کریم بخش خادم، سندھی صحافت، ص ۹۹۔

۶۔ ریاض شیخ عبدالمجید میمن سندھی۔

ذرا سا اختلاف ہے بمبئی کے 'کشف الاخبار' مورخہ ۱۰ - اگست ۱۸۶۶ء کی اشاعت سے معلوم ہوتا ہے کہ "سندھ میں ایک اخبار یکم اگست ۱۸۶۶ء سے جاری ہوا ہے جو ہر مہینے کی پہلی اور پندرھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہے"[1] مگر 'سندھ سدھارا' کے اجراء کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ محکمۂ تعلیم صوبۂ سندھ کا اخبار تھا جو ۱۸۸۲ء[2] میں جاری ہوا - اجراء کا سن بظاہر صحیح نہیں معلوم ہوتا - سندھ سدھارا ۱۸۸۴ء میں 'سندھ سبھا' نامی جماعت کو دے دیا گیا جو اس اخبار کو چلاتی رہی[3] - سندھ سدھارا کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ذریعے سے سندھی زبان میں عروضی شاعری کی اشاعت ہوئی - نیز اس اخبار میں طرح طرح کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے جو صحافت کا حصہ ہیں - اب ان روزانہ ، ہفتہ وار ، پندرہ روزہ اور ماہانہ اخبارات اور رسالوں کا ذکر آتا ہے جو سندھ میں یکے بعد دیگرے نکلتے رہے - ۱۸۷۵ء میں انجمن ہدی نے 'مجمع ہدی' اخبار جاری کیا - اسی سال دوسرا ہفتہ وار اخبار 'معاون' پہلے مولوی اللہ بخش ابوجھو بعد میں شمس الدین بلبل کی ادارت میں نکلتا رہا - ۱۸۸۱ء میں 'معین اسلام' اخبار جاری ہوا - مولوی اللہ بخش ابوجھو نے ایک سندھی رسالہ 'مدرسہ' بھی جاری کیا - ۱۸۹۰ء میں سادھو ہیرانند نے سندھ سبھا سے علیحدہ ہو کر ایک ماہنامہ بنام 'سرسوتی' جاری کیا اور عورتوں کے لیے گورمکھی رسم الخط میں 'سدھار پتریکا' نامی رسالہ نکالا - ۱۹۸۱ء میں لیکھراج تلوکچند نے حیدر آباد میں 'پربھات' اخبار اور ویرومل بیگراج نے سکھر سے اخبار 'سندھی' جاری کیا - ۱۸۹۲ء میں 'الحق اخبار' سکھر سے شیخ محمد سلیمان نے جاری کیا اس کی ادارت اس وقت سید محمود اجمیری اور بعد میں عبدالحمید خان خدا داد خان کے ذمہ تھی - شیخ محمد سلیمان کے فرزند شیخ عبدالعزیز نے یہی اخبار حیدر آباد سے جاری کیا جس کی ادارت کے فرائض مختلف وقتوں میں شیخ عبدالمجید میمن سندھی ، حکیم فتح محمد سیوہانی' محمد ہاشم مخلص اور شمش الدین بلبل کرتے رہے - ۱۸۹۵ء میں حیدر آباد سے 'مسافر' اخبار کراچی سے 'الہلال' اخبار لاڑکانہ سے 'خیر خواہ' اخبار اور سکھر سے

---

۱ ، ۲ - سندھی صحافت ص ۱۱۷ ، سندھی نثر کی تاریخ مؤلفہ خواجہ غلام علی الانا ص ۱۰ اور سندھی صحافت ص ۱۱۵ - تعجب کی بات ہے کہ جو اخبار ۱۸۸۲ء میں جاری ہوا کشف الاخبار مجریہ ۱۰ اگست ۱۸۶۶ء میں ۱۸۸۲ء کی بات سولہ سال پہلے کس طرح لکھ دی - صاف ظاہر ہے کہ سندھ سدھارا کشف الاخبار کی اشاعت مذکورہ کے وقت شایع ہو چکا تھا اس لیے اس کی تاریخ اجراء ۱۸۶۶ء ہی صحیح ہے - خلیل

۳ - شاید سندھ سدھارا کو اخبار سندھ سدھارا سپرد کرنے کی وجہ سے بعض لوگوں کو اس کی تاریخ اجرا میں شبہ ہوا اور اس کا آغاز ۱۸۸۲ء سے تجویز کیا ہو مگر محکمۂ تعلیم صوبہ سندھ ۱۸۶۰ء قائم ہو چکا تھا اور سندھ سدھارا محکمۂ تعلیم کا اخبار تھا اسلئے قیاس چاہتا ہے محکمہ تعلیم کے قیام کے چھ برس بعد ہی اس کی ضرورت محسوس کرلی گئی ہو - سولہ برس بعد ضرورت کا احساس کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے (خلیل) -

سیٹھ احمد نے 'آفتاب' اخبار جاری کیا - ۱۸۹۶ء میں حیدرآباد کے عیسائیوں نے ہفتہ وار 'جوت'، اخبار جاری کیا جس میں نہایت عمدہ مضامین چھپتے تھے - بعد میں ان مضامین کا ایک مجموعہ کتابی صورت میں 'گل پھل' کے نام سے چھپا -

فصل سوم

سندھی ادب دوراہے پر

ہر زبان کے مزاج اور ہیئت کے لحاظ سے ادب میں دو قسمیں ملتی ہیں ، ایک نظم اور دوسری نثر - سندھی زبان بھی انہیں دو ہیئتوں میں منقسم ہے -

سندھی ادب کی نظم کی بھی دو قسمیں ہیں - ایک دوہوں کافیوں اور ابیات پر مشتمل ہے اور دوسری عربی اصول عروض پر - اگرچہ کافیوں اور دوہوں کی ساخت پنگل سے بہت قریب ہے تاہم کافیوں کی نظمی حیثیت پر علم عروض کا پر تو سا پڑتا ہے جبکہ دوہوں اور ابیات کا وزن عروض سے مختلف ہے - یہ نکتہ بھی ایک انتہائی تشابہ کے امکان پر مبنی ہے ورنہ حقیقت میں کافی ، دوہے اور ابیات کا اصول ، عروض سے بالکل مختلف ہے اور غالباً ہر زبان کی نظم میں یہی خصوصیت پائی جاتی ہے جو سندھی زبان میں ملتی ہے - کافی ، دوہے اور ابیاب اگرچہ پنگل سے متاثر ہیں تاہم یہ قسم پنگل کے اصول پر بھی پوری نہیں اترتی بلکہ اہل سندھ نے پنگل میں کچھ تصرف کر کے کافی دوہے اور ابیات کی شاعری پیدا کی ہے اور چونکہ یہ قسم نثر سے ممتاز ہے اس لیے اس پر نظم ہی کا اطلاق ہو سکتا ہے -

سندھی زبان کے دو اسکول ہیں : (۱) قدیم (کافی ، دوہے اور ابیات)

(۲) جدید (غزل و نظم یعنی عروضی شاعری)

سندھی زبان میں جو کافی ، ابیات اور دوہے کی شاعری ہمیں ملتی ہے اس کی بنیادی شکل ہندی زبان کے ساتویں صدی عیسوی کے دوہوں میں نظر آتی ہے - بعض محققین نے دوہے کو رائے خاندان کے زمانے کی تخلیق بتایا ہے -

عربوں کی سندھ میں آمد کے بعد اروڑ کے راجا نے ہباری خاندان کے عرب حکمرانوں سے اسلام کے عقائد کے متعلق سوالات کیے جو ایک قصیدے کی صورت میں والئی اروڑ

کو ۸۸۳ء میں بھیجے گئے' [1] - اگرچہ قصیدے کا لفظ عربی ہے ، لیکن والئی اروڑ کی زبان سندھی تھی اس لیے شاید قصیدہ سندھی زبان میں لکھا گیا ہو گا - سندھی شاعری میں سب سے پہلے پنگل کی شاعری کی ایک قسم دوہے اور پھر قصیدے کا سراغ ملتا ہے - سندھی قدیم شاعری جس میں کافی ، ابیات اور دوہے شامل ہیں ، سومرا عہد سے شروع ہوتی ہے اور اسی عہدِ حکومت کے خاتمے پر یعنی سولھویں صدی کی ابتداء میں ختم ہو جاتی ہے - سندھی زبان میں باقاعدہ شاعری کا سلسلہ قاضی قاضن م ۱۵۵۲ء سے شروع ہوتا ہے اور یہ معتبر سلسلہ ۱۸۴۲ء تک پہنچتا ہے - اب ہم ذیل میں ان شعراء کا ذکر کرتے ہیں جو ۱۸۴۲ء سے ۱۹۰۰ء تک پائے جاتے ہیں -

(الف) پرانی روش کے شعراء

جس طرح موجودہ دور کے شعراء کے افکار میں باوجود عنوانات کی گونا گونی کے یکسانیت پائی جاتی ہے ، قدیم روش کے شعراء بھی اس سے خالی نہیں ہیں - قدیم روش کے جتنے معاصر شعرا ہیں ان میں بھی اندازِ فکر اور اسلوبِ ادا کی یکسانی دیکھنے میں آتی ہے ، مثلاً شاہ کریم بلڑے والے اور شاہ بھٹائی کے کلام کے مطالعہ سے خیالات ، اسلوبِ ادا اور زبان کی ہمرنگی کا پتہ چلتا ہے - قدیم روش کے شعراء بترتیب سالِ وفات حسب ذیل ہیں :

عثمان فقیر سانگی

ولد خیر محمد ساکن جامڑی سانگی لاڑکانہ - پیدائش (۱۷۸۲ء - ۱۸۶۲ء) - انہوں نے فارسی کی تعلیم پائی اور خواجہ عبدالحئی اور ان کے فرزند شاہ نصیر نقشبندی سے بیت کی - وحدت الوجود کے قائل تھے - کلام میں سوز و گداز کی جھلکیاں ہیں -

خیر محمد

ولد رئیس غلام ہیبانی بلوچ ۱۸۰۹ - ۱۸۷۷ء ، سندھی اور سرائیکی زبان کے اعلیٰ کافی گو شاعر تھے - کلام میں وحدت الوجود کا غلبہ پایا جاتا ہے - پیر عبدالحئی نقشبندی کے مرید تھے - آخری عمر ریاضت و عبادت میں بسر کی -

---

۱ - 'منصوورہ جی تاریخ جو ھک باب' مضمون سید حسام الدین راشدی مندرجہ الوحید آزادی نمبر ص ۷ ، ۱۴ - اگست ۱۹۳۹ء -

تم ابن کنڈو

ساکن لسبیلہ پیدائش (م - ۱۸۹۶ء) - جام میر خان ثانی اور جام عالی خان کا درباری شاعر تھا - ان پڑھ تھا مگر موزوں طبع رکھتا تھا - دربار کے حالات مع امراء کے حالات نظم کیے ہیں خوش اخلاق ، ملنسار اور ہر دلعزیز تھا - اس کے کلام کا کچھ حصہ رزمیہ قسم کی شاعری پر مشتمل ہے -

حاجی خان مھ

عرف حاجی خان چنجنی (م - ۱۹۰۰ء) قصبہ میاندار چنجنی تعلقہ وارہ کے باسندے تھے - ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کے اندازے کے مطابق تاریخ پیدائش ۱۸۳۰ء سمجھنی چاہیے - ان کے کلام کا بڑا حصہ مدح ، کافی ، سی حرفی ، دوہے اور سہرے پر مشتمل ہے -

غلام شاہ راشدی

ولد پیر ذوالفقار شاہ ابن سید صبغت اللہ شاہ پیر پگارو (۱۸۴۳ء - ۱۹۰۱ء) - کافیاں کہتے تھے - کلام میں سوز تھا - حالتِ شباب میں وطن کو چھوڑا تھا اس لیے یہی غم اور صدمہ موصوف کی کافیوں سے ظاہر ہوتا ہے - یہ کلام غیر مطبوعہ ہے -

پیزل فقیر

ابن بچو فقیر پھلپوٹو (م - ۱۹۰۶ء) - میر غلام حسین خان تالپور کا ملازم تھا - خیر پور کا مشہور اور مقبولِ عام شاعر تھا - اپنے ناکام عشق کی درد بھری داستان کافیوں میں پیش کرتا ہے - ابیات اور کافیوں کی ایک بیاض یادگار ہے -

مصری شاہ

ابن بلند شاہ نصر پوری ، (۱۸۲۸ء - ۱۹۰۸ء) - فارسی اور عربی سے واقف تھے - 'مثنوی معنوی' کا درس دیتے تھے - کلام میں حدیث کے حصے پائے جاتے ہیں - کافی کے مقبول اور مشہور شاعر تھے - خالص ، سادہ ، فصیح اور جوشیلی سندھی استعمال کرتے تھے - مگر عربی فارسی کے الفاظ بھی بے تکلفی سے لے آتے - کلام میں دنیا کی بے ثباتی اور حیات کی ناپائیداری ، مبدا و معاد کے مضامین ، دلپذیر پیرایہ میں پائے

جاتے ہیں - ایک قلمی بیاض یادگار چھوڑی ہے - کچھ کلام شائع بھی ہوا ہے -

مولوی عبدالغفور مفتون

ابن مولوی محمد یعقوب پیدائش ہمایوں شکار پور (۱۸۴۵ء - ۱۹۱۷ء) - یہ ہمایونی کے لقب سے زیادہ مشہور ہوئے - علوم متداولہ میں دستگاہ رکھتے تھے - ایک دارالعلوم قائم کیا اور کتب خانہ بھی قائم کیا تھا ، جس میں فارسی ، عربی اور اردو کی نایاب کتابیں تھیں - فقہ کی مشہور کتاب 'فتاوی ہمایونی' آپ کی یاد گار ہے - کلام میں جدت ، جوش ، روانی ، شیرینی ، گھلاوٹ ، فصاحت و بلاغت ، تشبیہ اور استعارے پائے جاتے ہیں - اندازِ بیان کی جدت نے حسن و عشق کی واردات کو اور بھی زور دار بنا دیا ہے - مطبوعہ 'دیوانِ ہمایونی' میں کافیاں اور عروضی شاعری شامل ہے -

اسد علی شاہ

ابن سعید غلام حسین شاہ پیدائش روہڑی ، (۱۸٦۰ء - ۱۹۲۴ء) - پولیس کے محکمے سے سبکدوش ہونے کے بعد حکمت شروع کی - فارسی اور عربی اچھی جانتے تھے - قدیم اور جدید شاعری کرتے تھے - ابیات ، کافیاں اور لوریاں 'مجموعہ گلشن' کے نام سے چھپ چکی ہیں اور 'دلپسند خط' جس میں یوسف زلیخا کی مثنوی بھی ہے - آپ نے مولانا ہمایونی کی اکثر غزلیات کا تتبع کیا ہے - کلام میں جدت ، رنگینی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے -

پیدل فقیر

ساکن شکار پور پیدائش (۱۸٦۵ء - ۱۹۳۹ء) ان کا نام غالباً عبدالقادر تھا - یہ پرانی روش کے شعراء میں شمار ہوتے ہیں لیکن عروضی شاعری بھی کرتے تھے -

پیر رشید الدین

گوٹھ جھنڈو کے رہنے والے ، تاریخ ولادت و وفات دستیاب نہیں ہو سکی - انہوں نے ایک بیت نامہ ، آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے مرتب کیا تھا ، جس پر مریدوں سے دستخط لیا کرتے تھے - دینی تعلیم کے لیے ایک مکتب قائم کیا - پند و نصائح ، اخلاق و عارفانہ نکات ان کے صوفیانہ کلام کے جوہر ہیں - 'مجموعۂ کافی' کے نام سے کلام چھپ چکا ہے -

رشد اللہ شاہ

ابن پیر رشید الدین پیدائش پیر جھنڈو گوٹھ (پ۔ ۱۸۶۰ء)۔ عربی ، فارسی اور سندھی زبان میں ستر (۷۰) کتابیں آپ سے یادگار ہیں ۔ والد ماجد کے مکتب کو مدرسہ بنا دیا ۔ جس کے صدر معلم مولانا عبید اللہ سندھی تھے ۔ آپ کے کلام کا ایک قلمی مجموعہ محفوظ ہے جس میں دوہے اور کافیوں کے علاوہ اردو شاعری بھی ہے ۔

سید امیر علی شاہ

ناصرانی کنگری کے ناصرانی پیروں میں سے تھے ۔ صاحبِ کرامت بزرگ تھے ۔ ان کے اشعار شیریں اور متین ہیں ۔ آپ کی زبان سے کلمات شعر اس طرح ادا ہوتے ہیں جیسے ایک ماہرِ ساز کی انگلیاں ساز کے پردوں پر ۔ کافیاں خوب کہتے تھے۔

دریا خان

ابن روحل فقیر ، مشہور کافی گو شاعر تھا ۔ سندھی ، ہندی اور سرائیکی کا باکمال شاعر ہو گزرا ہے ۔ بیت اور کافیوں پر قدرت تھی ۔ ان کی کافیوں میں سوز و گداز اور حقیقت و مجاز جمع ہو گئے ہیں ۔ ان کے بیان میں اسلوب کا تنّوع پایا جاتا ہے ۔

(ب) عوامی شعراء

عوامی شعراء اردو کے نظیر اکبر آبادی سے بعض اعتبارات سے بہت مشابہ ہیں ۔ جس طرح نظیر نے ٹھیٹ سماجی عنوانات اپنائے ہیں ، اسی طرح عوامی شعراء نے بھی کچھ ایسے عنوانات کو موضوع سخن بنایا ہے ، جو عام سماج سے تعلق رکھتے ہیں ۔ مثلاً حمد ، نعت اور وہ داستانیں جو ملک میں رائج ہیں ، مثلاً 'سسی پنوں' اور 'عمر مارئی' وغیرہ ، ان کی شاعری کے بڑے بڑے موضوع ہیں ۔ ذیل میں بترتیب سالِ وفات چند عوامی شعراء کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

دلاور علی دلاور

ایک قصبہ نزد روہڑی میں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۴ء میں وفات پائی ۔ تعلیم کم تھی ۔ فقر کی طرف میلان تھا ۔ بیت ، کافیاں اور مولود کہنے کا شوق تھا ۔

میاں والے ڈنو

ابنِ الہہ و رابو ، ساکن شکار پور (پیدائش ۱۶ - ۱۸۱۵ء وفات ۱۸۸۹ء) فارسی ، سندھی اور سرائیکی میں شعر کہتے تھے - مرفع حال اور دولتمند ٹھیکدار تھے - دیالتدار ، صوم و صلٰوۃ کے پابند اور کارِ خیر میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے - نجوم اور جفر میں دسترس تھی - کافی اور غزل خوب کہتے تھے -

لال محمد لال

وفات ۱۸۹۰ء - آپ کے وطن کے متعلق تین روائتیں ہیں - ایک یہ کہ قصبہ ساکھ کند ہرو تعلقہ پنو عاقل کے ، دوسری یہ کہ اسلام آباد تعلقہ گھوٹکی کے ، تیسری یہ کہ انڈہڑ تعلقہ کندہ کوٹ کے رہنے والے تھے - عربی فارسی زبانیں جانتے تھے - سندھی میں ان کی سی حرفی اور کافیاں مشہور ہیں -

شاہ محمد

جائے پیدائش قصبہ دیدڑ تعلقہ قنبر ضلع لاڑکانہ ، وفات ۱۰ رمضان ۱۸۹۱ء - آپ مشہور شاعر حسین دیدڑ کے نواسے تھے - درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے - آپ کا کلام مولود ، مدح ، خطبہ ، سی حرفی ، جنگ نامہ ، اور مناظر پر مشتمل ہے -

چھتو فقیر

سانگی ابن مولا داد فقیر ، پیدائش بنگلی محبوب ۱۸۲۲ء ، وفات ۱۸۹۶ء - میرون کا انتزاعِ سلطنت آنکھوں سے دیکھا - علمی قابلیت معمولی تھی لیکن عارف روشن ضمیر تھے - میاں عبدالرسول دودائی کی صحبت سے فیضیاب ہوئے - آپ کے کلام میں حسن و عشق اور تصوّف کی چاشنی پائی جاتی ہے -

عبدالرؤف عبد

ابنِ آخوند الہہ رکھیو ، پیدائش قصبہ مرزا پور گڑھی یاسین ۱۸۸۰ء ، وفات ۱۹۱۷ء - مولانا عبیداللہ کے شاگرد تھے - بلبل، قلیچ ، زمان شاہ ساقی ، محمود فقیر وغیرہ کے ہمعصر تھے - ابیات ، کافی ، سی حرفی ، قصیدہ ، غزل وغیرہ کہتے تھے - کلام میں رنگینی اور اخلاقیات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں -

وریل

وریل فقیر ابنِ حمل ، پیدائش ڈتل ابڑو فقیر ۱۸۴۹ء ، وفات جنوری ۱۹۱۸ء ۔ ابڑو قبیلہ میں سے تھے ۔ بڑے مرتاض بزرگ تھے ۔گھوڑے سواری میں لگام ہاتھ میں نہ رکھتے تھے ۔ تمام عمر خدمتِ خلق اور عباداتِ الٰہی میں بسر کی ۔ کلام میں تصوف کے نکات پائے جاتے ہیں ۔

مل محمود

مل محمود ابن طالب درس پلسی مقام پیدائش قصبہ حاجی عبداللطیف پلسی تعلقہ عمر کوٹ پیدا ہوئے ۔ ۱۹۲۸ء میں انتقال ہوا ، عوامی شعراء میں سرآوردہ تھے ۔ ' لیالی مجنون ، 'مجمع العجائب ' اور ' نصیحت انسانی ، آپ کی مطبوعہ تالیفات ہیں ۔

چاکر خان

چاکر خان رستمانی بلوچ ساکن قصبہ چھنی تعلقہ جوہی ضلع دادو ۔ پیدائش اندازاً ۱۸۴۰ء اور وفات اندازاً ۱۹۳۰ء ۔ چاکر کے نام سے مشہور تھے ۔ اپنے گاؤں کے بزرگ تھے ۔ شعر و شاعری سے دلچسپی تھی ۔ آپ نے چیستان ۔ پہیلیاں ، گرچیلے کے بیت اور مناقب لکھے ہیں ۔

بمت علی شاہ

روہڑی کے سادات رضویہ میں سے تھے ۔ آپ کی ایک قلمی بیاض میں ۲۰ ربیع الاوّل (۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء) ، تاریخ وفات درج ہے ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تیرھویں صدی ہجری یعنی انسویں صدی عیسوی کے آخر تک حیات تھے ۔ انہوں نے سندھی کی مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۔ کلام میں مٹھاس ہے ۔

رمضان

رمضان کنبھار ، ساکن قصبہ آمڑن گھنبرن شہر ٹلٹی کے قریب پیدا ہوئے اور وفات فتحپور میں پائی ۔ میروں کے آخری دور کے تھے ۔ لُپٹائی بزرگوں سے فیض حاصل کیا ۔ کافیاں ، معجزے اور مولود لکھے ہیں ۔ ان کا کلام غیر مطبوعہ ہے ۔

عارف شاہ

ساکن قصبہ شاہ پنجو ضلع دادو ۔ ان کی شہرت بھی عوامی شاعر کے لحاظ سے ہے ۔

داستان گو شعراء

اس سے مراد وہ شعراء ہیں جنھوں نے سندھ کی مشہور داستانوں کو گانے کے قابل نظم کیا ہے ۔ یہ داستانیں آج بھی سندھ میں گائی جاتی ہیں حسب ذیل داستان گو شعراء گزرے ہیں ۔

بہار

پٹر قبیلے کا ایک داستان گو شاعر ، غلام شاہ کلہوڑے کے زمانے کا تھا ۔ قصہ 'سیف الملوک' اور 'بدیع الجمال' اس کی یادگار ہیں ۔ آخوند عبدالرحیم عباسی نے اس قصے کو ترتیب دیا اور محکمۂ تعلیم نے کئی مرتبہ شائع کرایا ۔

محمد عارف

محمد عارف کلہوڑو غالباً عبدالنبی کلہوڑو کا بیٹا تھا جو ۱۷۹۰ء کی جنگ میں مارا گیا ۔ اس نے دو داستانیں لکھی ہیں ۔ ایک 'سسی پنوں' اور دوسری 'عمر ماروئی' کی تیس راتیں مع سوال جواب ۔ آخری قصۂ کو تصنیف نا مکمل ہونے کی وجہ سے اس کے فرزند غلام محمد نے مکمل کیا ۔ یہ کتاب دوسری مرتبہ ۱۸۶۳ء میں چھپی[1] اور 'سسی پنوں' کی داستان دوسری مرتبہ ۱۸۶۷ء میں چھپی[2] ۔ ان کتابوں کو آخوند عبدالرحیم عباسی نے ترتیب دیا اور محکمۂ تعلیم کے سپرد کیا ۔

موریو فقیر

موریو فقیر ابن ہرسومل ، ساکن ٹنڈو آدم داستان گو شاعر تھا ۔ اپنے ایک دوست کی فرمائش پر تین دن میں سرائیکی سے سندھی میں داستان سسی پنوں (۱۸۷۳ء) میں ترجمہ کی ۔ میر شیر محمد خان کا ملازم تھا ۔ موصوف کے ساتھ قندھار تک سفر بھی کیا تھا یہ نظم ۱۵ ۔ اپریل ۱۸۷۶ء میں دوبارہ شائع ہوئی ۔

---

۱ ۔ ملاحظہ ہو طبع ثانی ۔ ۲ ۔ تاریخ سندھی ادب ، جلد دوم ، ص ۳۰۰۔ ۳۰۱ ۔

لعلو بھگت[1]

لعلو بھگت عرف حفیظ تیونو ساکن ڈاتو تیونو تعلقہ وارہ - اصلی نام لعل بخش اور بھائی کا نام عمر تھا - ۶۰ - ۶۱ سال کی عمر میں سال ۱۸۸۵-۹۰ء کے درمیان انتقال کیا[2] - جوانی تک تندرست تھا پھر نابینا ہو گیا - خود تو شعر کہتا تھا لیکن اس کا بھائی عمر انہیں یاد رکھتا اور گاتا تھا - یہ بات بات میں شعر کہتا تھا - بیت ، روپے اور کافیاں کثرت سے کہی ہیں - داستان 'مومل رانو' 'عمر مارئی' 'سسی پنوں' اور قصہ 'کامسن کامروپ' اس کی یاد گار ہیں -

سید حیدر شاہ

سید حیدر شاہ ابن سید اسماعیل شاہ پیدائش حیدرآباد ۱۸۱۳ء ، وفات ۱۸۸۹ء عربی فارسی ، علم نجوم اور علم جفر جانتے تھے - آپ کی تالیف 'لیلیٰ مجنوں' سندھ کے مکتبوں میں داخل نصاب رہ چکی ہے - ہیر رانجھو کی داستان بھی آپ ہی کی تالیف ہے -

محمد رحیم

محمد رحیم عاجز ابن سلیمان راجڑ ساکن پیر جوگوٹھ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں گذرے ہیں - ایک مثنوی 'ارن کی عشقیہ داستان' نامی (۱۹۰۳ء) میں لکھی - یہ قصہ پہلے محمد راشد نے بھی منظوم کیا تھا -

ایوب

ایوب ساکن میاں جوگوٹھ شکار پور ، نے ممکن ہے شمشاد کافر کا قصہ لکھا ہو ، لیکن سندھی لوک ادب میں یہ مشہور قصہ عثمان کلھوڑا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے - فقیر محمد برڑو ، ساکن قصبہ گھٹھڑ ، تعلقہ قنبر ، ضلع لاڑکانہ نے ممکن ہے قصہ 'مومل میندھرو' لکھا ہو لیکن فقیر محمد ولد فتح محمد جو ماچھی قبیلہ کا تھا ، اور قصبہ دڑو ماچھی ، تعلقہ ککڑ کا باشندہ تھا ، باقاعدہ عربی فارسی کی تعلیم پاٹ میں حاصل کی معلمی کا پیشہ اختیار کیا - اس نے ۶۱ سال کی عمر میں (۱۸۹۸ء) وفات پائی - یہ ایک مشہور شاعر تھا - اس نے کئی داستانیں صنف معجزے میں لکھی ہیں - کافی ، مدح ، اوٹھان ، مناقب ، اور معجزے وغیرہ بڑی آب و تاب سے قلم بند کیے ہیں - پیرو فقیر نے بھی 'سوہنی مہینوال' کا قصہ لکھا ہے -

---

۱ - بھگت بمعنی فقیر - عابد - ۲ - دیوان حفیظ مرتبہ قربان علی -

صوفی شعراء

تصوّف اور عرفان جو شرحی توحید کا دوسرا نام ہے ، مسلمانوں میں ہمیشہ سے مقبول ہے سندھ کے بڑے بڑے مشہور شعراء صوفیانہ شاعری ہی کی وجہ سے خواص و عام میں مقبول ہیں یہاں تک کہ اس شراب کا نشہ ہندو شعراء کی شاعری میں بھی پایا جاتا ہے ۔ اگرچہ ویدانت اور اسلامی تصوف میں بڑا فرق ہے تاہم بعض ہندو شعراء اسلامی صوفیانہ شاعری ہی کے رنگ میں شعر کہتے تھے ۔ مگر ہم یہاں ان کا تفصیلی ذکر نہیں کر سکتے ۔

صوفی بایزید

ابن صدیق فقیر سومرو پیدائش ۱۷۸۱ء ، وفات ۱۸۴۹ء ۔ انہوں نے قلندر فضل اللہ سجادہ نشین جھوک شریف سے بیعت کی مگر اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد ڈھورو نارو میں جو ان کا وطن تھا درگاہ کے سجادہ نشین ہوئے ۔

قادر بخش بیدل

ابن خلیفہ محمد محسن پیدائش روہڑی ۱۸۱۴ء ، وفات ۱۸۷۲ء ۔ حدیث ، قرآن ، علم کلام ، فلسفہ ، ادب ، دینیات اور تصوّف کو باقاعدہ حاصل کیا تھا ۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کا احترام رکھتے ہوئے اپنا نام عبدالقادر سے قادر بخش رکھ لیا ۔ سیر و سیاحت کا شوق تھا ۔ لال شہباز کی درگاہ پر حاضری دیتے تھے ۔ جان اللہ شاہ ثانی کے مرید تھے اور وہیں سے انہیں خرقۂ خلافت ملا ۔ ان کے فیض سے پیر پگارو کے فرزند علی گوہر شاہ بلند پایہ شاعر ہو گیے ۔ اعلی اخلاق اور بڑے علم وفضل کے مالک تھے ۔ بڑے خود دار تھے اور فقر و فاقہ میں بسر کرتے تھے ۔ سندھی، فارسی ، عربی ، ہندی ، اردو اور سرائیکی میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں[1] ۔ کلام عام فہم ، تصوف کے نکات ، ولدالہ جذبات ، خود فراموشی اور اخلاق سے پر ہوتا تھا ۔

محمد محسن بیکس

ابن قادر بخش بیدل پیدائش روہڑی ۱۸۵۸ء وفات ۱۸۸۰ء فاضل باپ کا قابل بیٹا تھا ۔ کم عمری میں انتقال کیا ۔ کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے ۔

---

۱ ۔ تصنیفات کی تفصیل کے لیے دیکھیے تذکرہ لطفی ، جلد سوم ، ص ۲۱۸ ۔

مولوی غلام محمد

غلام محمد خانزئی کی پیدائش ، وفات اور وطن کا پتہ نہیں چلا ۔ آپ کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۸۵ء میں زندہ تھے ۔ ممکن ہے ۸ ۔ ۱۰ سال کے بعد وفات پائی آپ بروہی قبیلے سے تھے اور تحصیل علم کے لیے قصبہ پیر جھنڈے آئے اور وہیں وفات پائی ۔ کتاب 'منہاج العاشقین' آپ کی یادگار ہے ۔ اس کتاب کے علاوہ کافیاں ، مولود اور غزلیں بھی پائی جاتی ہیں ۔ آپ کا کلام سادگی ، روانی ، بندش ، تخیئل ، حسن بیان اور اسلوب ادا میں شاہ بھٹائی سے ملتا جلتا ہے ۔

جیوت سنگ

ساکن قنبر لاڑکانہ پیدائش ۱۸۴۰ء ، وفات ۱۸۹۹ء ۔ فارسی اور سندھی تعلیم حاصل کی ۔ درویشوں کی صحبت میں عمر گذاری ۔ طبابت کی طرف میلان تھا ۔ کلام میں ویدانتی نکات پائے جاتے ہیں ۔

شاہ نصیرالدین

نصیر ابن عبدالحئی نقشبندی ساکن نوشہرو نیروز ، وفات ۱۸۹۷ء ۔ آپ مجدّد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی کی اولاد میں سے تھے ۔ عربی ، فارسی ، اردو اور سندھی پر کامل دستگاہ رکھتے ہوئے شعر کہتے تھے ۔ تصوف کی تبلیغ فرماتے تھے اور ہندو مسلمان آپ سے عقیدت رکھتے تھے ۔ لاڑکانہ آپ کا مرکز فیض تھا ۔

جان اللہ شاہ

جان اللہ شاہ ثالث ابن علی اکبر شاہ اول ساکن روہڑی نے بیسویں صدی کے ابتدا میں انتقال کیا ۔ ان کا سلسلۂ نسب امام علی نقیؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ سے ملتا ہے ۔ نہایت عالم و فاضل شخص تھے ۔ ابیات اور سی حرفی نہایت برجستہ اور پختہ کہتے تھے ۔ ہندو مسلمان آپ کے معتقد تھے ۔ سندھی ، سرائیکی ، فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے ۔ کلام میں تصوف اور حسن و عشق کی واردات دلکش اور رنگین پیرایہ میں بیان کی ہے ۔ ان کی بیاض عطا حسین شاہ موسوی روہڑی والے کے کتب خانہ میں محفوظ ہے ۔

خواجہ غلام فرید

خواجہ غلام فرید ابن خواجہ خدا بخش ساکن مٹھن کوٹ پیدائش ۱۸۳۵ء وفات

۱۹۰۱ء سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق سے ملتا ہے - ۸ سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا - درس نظامیہ کی تکمیل کی - علم و فضل اور زہد و تقویٰ کا قابل نمونہ تھے - ایسے صوفی شاعر تھے جن کا کلام صوفیہ کی مجالس وجد و حال میں گرمی پیدا کرتا ہے۔ ابتداء میں سندھی زبان میں شاعری کی مگر اس کا بہت سا حصہ ضائع ہو گیا - ملتانی زبان کے قادر الکلام شاعر تھے - یہی آپ کی شاعری کا سرمایہ ہے - کلام میں عرفان کی چاشنی کے ساتھ سوز و گداز ملتا ہے - روانی اور پختگی کلام کا جزو لاینفک ہے -

نواب شاہ سکایل

نواب شاہ ابن سید نواب امام علی شاہ پیدائش روہڑی ۱۸۴۳ء، وفات ۱۹۰۱ء آپ کا سلسلہ حضرت امام علی نقیؑ سے ملتا ہے - خوشحال ہوتے ہوئے بھی فقر و فاقہ میں زندگی بسر کی - فقیر بیکس سے فیض حاصل کیا - ان کا کلام کم ہے مگر جوش اور جذبات سے بھر پور ہے -

موہن فقیر

موہن فقیر قصبہ عاقل لاڑکانہ پیدائش ۱۸۴۳ء بعض کے نزدیک ۱۸۴۵ء، وفات ۱۸ شعبان ۱۹۰۵ء شاہ نصیر نقشبندی کے مرید تھے - ہندو تھے مگر وفات کے بعد اسلامی طریقے پر آپ کی تجہیز و تکفین کی گئی - کلام میں اسلامی عقائد اور خالص اسلامی تصوف پایا جاتا ہے کلام سادہ لیکن محبت سے لبریز ہے -

بھل شاہ

پیدائش مانجھند ضلع دادو ۱۸۰۷ء، وفات سکھر ۱۹۰۶ء - کشمیر تک سیاحی کی ہے - پیراکی اور شکار کا ذوق رکھتے تھے - جان اللہ شاہ ثانی، بیدل اور بیکس سے اکثر صحبت رہتی تھی - جوش اور جذبے کی حالت میں شعر کہتے تھے - کلام میں تصوّف کے باریک نکتے بیان کیے ہیں -

اللہ رکھیو رکھیل

ابن الھہ آندو ساکن حبیب کوٹ تعلقہ گڑھی یاسین، پیدائش ۱۸۴۵ء، وفات ۱۹۱۲ء، داؤد پوتے قبیلے سے تھے - سندھی، فارسی اور اردو تعلیم حاصل کی تھی اور انہی زبانوں میں

شعر کہتے تھے ۔ آپ کا کلام سی حرفی ، ابیات ، کافی ، لوری اور سہرے پر مشتمل ہے ۔ کلام میں سادگی ، تاثیر ، سلاست ، روانی اور رنگینی پائی جاتی ہے ۔ آپ نے فقر و سلوک میں پیر عبدالرحمٰن سرہندی حیدر آبادی ، سخی قبول محمد درازی اور فیض دریا شاہ سے روحانی فیض حاصل کیا تھا ۔

حافظ ہادی ڈلو

ابن حافظ عبدالرحیم میمن ساکن قصبہ ماڑی تعلقہ ، پیدائش ۱۸۶۰ء ، وفات ۱۹۰۷ء ۔ سندھی ، سرائیکی اور فارسی زبان میں شعر کہتے تھے آپ کی ضخیم بیاض سیلاب میں ضائع ہو گئی ۔ کلام میں سلاست ، لطافت ، نزاکت اور فصاحت ہے ۔ موسیقی سے بھی لگاؤ ہے ۔

فیض محمد شاہ

عرف فیض دریا شاہ ابن سید پیر شاہ جیلانی ساکن قصبہ ھنباہ پیدائش ۱۸۶۳ء وفات ۱۹۰۷ء ۔ سندھی اور فارسی کی تعلیم ڈنل شاہ نقشبندی سے حاصل کی تھی ۔ سندھی اور سرائیکی کا کلام صوفیانہ رنگ میں ہے ۔

احمد علی فقیر

پیدائش شکار پور ۱۸۶۹ء ، وفات ۲۹ محرم ۱۹۱۷ء ۔ معلم تھے ۔ ٹریننگ کالج حیدر آباد میں تعلیم حاصل کی ۔ سخی قبول محمد درازی کے معتقد تھے ۔ عابد ، زاہد اور شب بیدار انسان تھے ۔ فطرت نگاری ان کے کلام کی خصوصیت ہے ۔

دیوان بھو جراج

ابن سنت چانڈو مل ساکن لاڑکانہ پیدائش ۱۸۶۷ء ، وفات ۱۹۲۰ء ۔ جیوت سنگ سے فیضیاب ہوئے ۔ ان کے کلام میں فلسفہ ویدانت جھلکتا ہے ۔

صوفی آسورام

رام ابن ڈالدومل ساکن پرانا پالا پیدائش ۱۸۵۴ء ، وفات ۱۵ ۔ فروری ۱۹۱۹ء درویش منش آدمی تھے ۔ جھوک شریف کے اشیاخ ، سید مصری شاہ اور فقیر علی شاہ سے تصوف میں

استفادہ کیا ۔ سردہنا سری میں نعت اور منقبت ، غوث پاک کی شان میں لکھی ۔ کلام میں عربی سنسکرت کے بعض مشکل الفاظ پائے جاتے ہیں ۔ ان کی تین بڑی مجلّدات ہیں ۔ ایک 'دیوان آسو' جو شائع ہو چکا ہے ۔ دوسرا 'رسالہ آسو' اور تیسرا 'پریم غنچہ' ۔

غزل گو شعراء

شاعری اصل میں اظہار جذبات کا نام ہے ۔ جب سے سندھی شاعری میں غزل داخل ہوئی ہے، اس کی ہردلعزیزی بڑھتی چلی گئی ہے ۔ سندھی غزل چونکہ اردو اور فارسی غزل سےمتاثر ہے ، اس لیے حسن و عشق سے علاوہ صوفیانہ ، رندانہ ، واعظانہ ، فلسفیانہ اور اخلاق مضامین کا ایک خوشنما گلدستہ بن گئی ہے ۔ سندھی غزل گو شعراء کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے ۔

آخوند محمد قاسم

آخود محمد قاسم قاضی ہالائی ابن آخوند نعمت اللہ سالونی پیدائش ۱۸۰۶ء ، وفات ۱۸۸۱ء چونکہ عربی فارسی سےکچھ شغف تھا ۔ اس لیے ملازمت چھوڑ کر ایک مکتب کھول لیا اور معلّمی کا پیشہ اختیار کیا ۔ میر حسن علی خان کی طرف سے ۲۰ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر تھا اور میر مراد علی والئی خیر پور ، نواب رامپور ، مہاراجہ بڑودہ ، راجہ بلرامپور اور راجہ رتلام کی شان میں مدحیہ قصائد بھیجا کرتے تھے ۔ یہ تمام قصائد اخبار 'مفرح القلوب' میں شائع ہو چکے ہیں ۔ ترکیب بند اور قصائد کا رواج سندھی شاعری میں آپ ہی نے شروع کیا ۔ آپ کا شمار سنجیدہ اور پسندیدہ ناقدین میں بھی کیا جاتا ہے ۔ سندھی زبان میں کافیاں ، مولود ، قطعات ، مثنوی وغیرہ آپ سے یادگار ہیں اور ' دیوان قاسم ' اور 'قاسم نامہ' ۱۸۷۵ء میں شائع ہو چکے ہیں ۔

قاضی غلام علی

قاضی غلام علی ٹھٹوی ابن قاضی محمد یحییٰ ٹھٹوی (م ـ ۱۸۸۵ء) حضرت جعفر طیار کی اولاد میں سے تھے اور جعفری تخلّص کرتے تھے ۔ ایلس کیٹی کے ممبر تھے ۔ ان کا پیشہ وکالت تھا ۔ کتابوں کا ترجمہ کرتے ، مثلاً 'تاریخ ہند' اردو کا سندھی میں ترجمہ کیا اور اپنی طرف سے ایک باب 'انگریزوں کا سندھ پر تسلط' کے نام سے اضافہ کیا [۱] ۔

---

۱ ـ تکملہ مقالات الشعراء ، مرتبہ حسام الدین راشدی ، ص ۱۱۲ - ۷۵۷ ۔

امام بخش شاہ

امام بخش شاہ فدوی[1] پیدائش ٹھٹہ ۱۸۲۲ء ، وفات ۱۸۸۸ء ۔ رضویہ سادات میں سے تھے ۔ مہدوی عقائد رکھتے تھے ۔ بڑے عالم فاضل بزرگ تھے ۔ میر مرتضائی ٹھٹوی کے بھتیجے اور شاگردِ رشید تھے ۔ ٹھٹہ میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اسی میں معلمی بھی کی ۔ مرثیہ ، منقبت اور غزل کے شاعر تھے ۔ ایک مثنوی 'یوسف زلیخا' بھی تالیف کی ۔ بعض تذکروں میں ان کا تخلص فدائی غلط لکھا گیا ہے ۔

غلام مرتضیٰ شاہ

مرتضائی ٹھٹوی خلف الرشید سید روشن علی شاہ پیدائش ۱۸۳۶ء ، وفات ۱۸۹۹ء، رضویہ سادات میں سے تھے ۔ فارسی اور سندھی میں شعر کہتے تھے 'مثنوی سکندر نامہ' 'یوسف زلیخا' اور 'شاہنامہ' آپ کی مطبوعہ یاد گار ہیں ۔ آپ صاحبِ دیوان تھے ۔ ان کا کلام 'معین الاسلام' ، 'معاون' اور 'مفرح القلوب' کراچی کے اخبارات میں شائع ہوتا تھا ۔ ان کے دیوان میں چند نظمیں[2] ایسی ہیں جن میں انہوں نے اپنے معاصر شعراء کا ذکر بڑی عزت سے کیا ہے۔

حافظ حامد

حافظ حامد ابن محمد ہاشم میمن ٹکھڑائی پیدائش ۱۸۳۲ء ، وفات قصبہ جاریلی جودھپور (بھارت) ۱۸۹۷ء ۔ بچپن میں چیچک سے نابینا ہوگئے تھے ۔ حافظ قرآن تھے ۔ عربی تعلیم مولوی ولی محمد اور قاضی ابوالحسن سے حاصل کی اور بعد میں ستاری میں تکمیل کی ۔ سندھی کے قادرالکلام شاعر تھے ۔ فطرت نگاری خوب کرتے تھے ۔ بہت سا حصہ کلام کا ضائع ہوگیا ۔ بچا کھچا ' ارمغان حامد ' کے نام سے شائع ہوا۔ انہوں نے خطبات بھی لکھے ہیں ۔

محمد فاضل شاہ

فاضل ابن سید حیدر شاہ پیدائش حیدر آباد سندھ ۱۸۳۶ء ، وفات ۱۹۰۰ء ۔ یہ محدث مفسر اور فقیہ تھے اس لیے مفتی کے منصب پر فائز تھے ۔ صوفی منش انسان تھے ۔ سلسلہ شریفہ قادریہ ، سہروردیہ اور نقشبندیہ میں صاحبِ اجازت تھے ۔ کلام کا رنگ اخلاقی اور واعظانہ ہے ۔ اس میں پختگی اور روانی پائی جاتی ہے مگر مذہبی اور صوفیانہ رنگ غالب ہے ۔ علاوہ ازیں بہت سی کتابیں تصنیف کیں جو دیوان فاضل کے دیباچے میں درج ہیں ۔[3] ان کے

---

۱ ۔ فدوی کے تمام حالات علی محمد خالدی ٹھٹوی وکیل سے ملے ۔

۲ ۔ رسالہ عام رائے بابت ماہ اکتوبر ۱۹۵۰ء ، ص ۲۲ مضمون مرتضائی اور اس کا دیوان از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ۔

۳ ۔ مسافر ، محمد صدیق (مرتب) دیوان فاضل ، ص ۲۹ اور ۵۶ ، ۱۹۳۷ء ۔

دیباچے میں فارسی کے ہمعصر شعراء کے نام بھی ملتے ہیں ، جن کا کلام 'مفرح القلوب' میں چھپتا تھا[1] ۔ دیوان فاضل شائع ہو چکا ہے ۔ اس کی ہر غزل پر بحر اور وزن تحریر ہے ۔ ان کی اکثر کافیاں اور مولود شریف مختلف راگوں یا راگنیوں میں موزوں کیے گئے ہیں ۔ باقی کلام فنِ عروض کے اصول کے مطابق ہے ۔ ہر جمعہ کو آپ کے دولتکدہ پر شعراء کا اجتماع ہوتا[2] ۔ اورمشاعرے کےاشعار اخبار 'سندھ سدھارا' اوردیگر اخبارات میں شائع ہوتے تھے[3] ۔

اللہ بخش ابوجھو

اللہ بخش ابوجھو خلف الرشید محمد شاہ وفات ۱۹۰۱ء ۔ خاندان ہاشمی میں سے تھے ۔ ان کی شہرت 'مسدس ابوجھو' کی وجہ سے ہے جس کا کچھ حصہ 'مدّ و جزر اسلام' حالی کا لفظی ترجمہ ہے اور کچھ حصہ طبعزاد ۔ سندھ کے قومی شاعر تھے ۔ چونکہ انگریزی میں مہارت رکھتے تھے فوج میں انگریزوں کو سندھی سکھاتے تھے ۔ سرکاری اسکولوں میں معلّم فارسی مقرر ہوئے ۔ سندھ مدرسے کے قیام کی جدوجہد میں حسن علی آفندی کا ساتھ دیا ۔

حاجی غلام محمد شاہ

غلام محمد شاہ گدا حیدر آبادی ابن سید حسن علی شاہ پیدائش ۱۸۲۶ء ، وفات ۱۱- جنوری ۱۹۰۵ء ۔ عربی ، فارسی اور سندھی میں تعلیم پائی ۔ قادر الکلام شاعر تھے ۔ سندھی ، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ کلام میں پختگی ، سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت پائی جاتی ہے ۔ میر عبدالحسین سانگی کے استاد تھے ۔ مثنوی، قصیدہ اور غزل پرمطبوعہ کلام مشتمل ہے ۔ اپنے کلام میں ہمعصر نوجوان شاعروں کی بڑی تعریف کی ہے[4] ۔

محمد اکرم خان

محمد اکرم خان ابن آدم خان پٹھان شکار پور پیدائش ۱۸۴۱ء، وفات ۱۹۰۵ء ۔ ان کی سندھی اور سرائیکی کی کافیوں میں صوفیانہ رنگ اور سوز و گداز پایا جاتا ہے ۔ مولود بھی کہتے تھے ۔

میر حسن علی خان

میر حسن علی خان خلف میر نصیر خانؒ والئی سندھ ۔ پیدائش حیدر آباد ۱۸۲۴ء وفات ۱۹۰۷ء ۔ باپ کے ساتھ جلا وطن ہو کر کلکتے پہنچے ۔ ۱۸۶۳ء میں واپس سندھ آئے ۔ منقبت ، قصائد ، مرثیہ ، سلام اور رزمیہ شاعری پر زیادہ توجہ کی 'شہنشاہ نامہ' یا 'حملہ'

---

۱ ، ۲ - تاریخ سندھی ادب ، جلد دوم ، ص ۲۶۶ نیز ۲۴۰ اور دیوان فاضل مرتبہ مسافر ص ۲۹

۳ ، ۴ - وہ شاعر یہ ہیں سانگی ، حیدری ، پیرصاحبڈنو شاہ ، ماتی ، مخلص ، مجتبائی فدا وغیرہ ۔

حیدری ' سندھ کا شاہنامہ' اور 'مختار نامہ' منظوم کیا ۔ علم پرور خاندان تھا ۔ لکھنؤ سے زین العابدین اور مولوی ابوالحسن کو سندھ میں بلایا ان کی سرپرستی کی یہ دونوں بزرگ صاحب علم و فضل تھے ان کا آستانہ ذی علم لوگوں کا مرکز تھا[1] ۔

مخدوم محمد ابراہیم

مخدوم محمد ابراہیم صوفی ہالائی پیدائش ۱۸۶۴ء وفات ۱۹۱۲ء ۔ مخدوم عبدالرؤف بھٹی کی اولاد میں سے تھے ۔ بھٹی حقیقت میں دہلی کے راجا جادم کی اولاد ہیں اور سومروں کے عہدِ حکومت میں سندھ میں آ کر بس گئے ۔ مخدوم محمد ابراہیم ہالا پرانے کے ایک کامل اور باعمل صوفی تھے ۔ ان کے فرزند مخدوم محمد صالح بھٹی سندھ کے محکمۂ تعلیم میں تھے اور سندھی زبان کے ایک عمدہ شاعر اور نثر نویس تھے ۔

صاحبڈنو شاہ

صاحبڈنو شاہ ابن محمد شاہ ساکن بلڑی تعلقہ گونی حیدر آباد پیدائش ۱۸۶۸ء ، وفات ۱۹۰۵ء ۔ شاہ کریم کی اولاد میں سے تھے اور ان کی درسگاہ کے مرید ہوئے ۔ فارسی اور اردو کی تعلیم پائی تھی ۔ سانگی کے شاگردوں میں سے تھے ۔ غزل کے علاوہ کافیاں ، دوہے ، تیس راتیں وغیرہ بھی کہی ہیں ۔

امام بخش خادم

امام بخش خادم ابن محمد چھل پیدائش شکار پور ۱۸۵۸ء ، وفات ۱۹۱۸ء ۔ ورنیکلر فائنل پاس کر کے تعلیم کے محکمہ میں معلّم ہوگئے ۔ سندھی کے صاحبِ کلیات شاعر ہیں ۔ نثر پر بھی قدرت رکھتے تھے ۔ 'چہار درویش' ، 'حاتم طائی' اور 'الف لیلیٰ' کا سندھی میں ترجمہ کیا ۔ 'ہیر رانجھو' کا ڈرامہ ۱۸۷۹ء میں تالیف کیا ۔ اگر یہ سال دیباچے میں صحیح دیا ہوا ہے تو ڈرامے کی ایجاد کا سہرا ان کے سر ہو گا ۔ یہ محمد قاسم ہالائی کے شاگرد تھے اور غزل ، مثنوی ، ابیات ، کافیاں اور معجزے وغیرہ لکھے ہیں ۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے ۔

آخوند حاجی فقیر محمد عاجز

پیدائش حیدر آباد ۱۸۴۶ء ، وفات ۱۹۱۸ء ۔ عربی فارسی اور سندھی میں تعلیم پائی تھی اور پٹہ داری کا عہدہ بھی حاصل کر لیا تھا ۔ چونکہ درویشانہ طبیعت رکھتے تھے ، نوکری سے مستعفی ہو گئے اور عینِ حیات میروں کے وظیفے پر خوشحالی سے بسر کرتے تھے ۔ وظیفہ بند ہو جانے پر اڑھائی سو ایکڑ زمین میروں کی معلّمی کے صلہ میں

---

۱ ۔ تاریخ سندھی ادب ، جلد دوم ، ص ۲۸۰ ۔

حاصل کی - ۱۸۸۵ء کو اپنا دیوان اپنے قلم سے مکمل کیا - ایک مثنوی 'لیلیٰ مجنوں' بھی لکھی - کلام نہایت پختہ ہے - ان کے شاگردوں میں سے محمد بخش واصف ، صاحبِ دیوان شاعر گذرے ہیں -

شمس الدین بلبل

شمس الدین بلبل ابنِ بہادر خان ساکن میہڑ پیدائش ۱۸۵۷ء ، وفات ۱۹۱۹ء سندھی اور فارسی میں تعلیم پائی - سندھی میں سلیس نثر نویسی کا طرز انہوں نے ایجاد کیا - قادر الکلام شاعر ، ظریف ، نثر نویس اور کامیاب صحافی تھے - 'معاون' ، 'کراچی گزٹ' ، 'خیر خواہ' ، 'الحق' ، 'مسافر' اور 'آفتابِ سندھ' اخبارات کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے - تحریروں میں کافی ظرافت کی چاشنی ہے - طنزیہ شاعری سے قومی اصلاح کا کام لیا - ان کا دیوان کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے - ان کی ان کے لائق فرزند ضیاء الدین ضیا نے جو خود ایک قابل ادیب اور شاعر تھے ، طنزیہ مثنوی 'رحیا' چھپوائی ہے بلبل کی تصنیفات کی تعداد کافی ہے[1] -

علی نواز علوی شکار پوری

علی نواز ابنِ میر فخر الدین جو حضرت شاہ فقیر اللہ علوی کے پوتے تھے پیدائش ۱۸۵۱ء ، وفات ۱۹۲۰ء - فارسی اوز سندھی کے شیریں کلام شاعر تھے تصوف کے ساتھ کلام میں جمالیات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں - کافی وغیرہ بھی کہتے تھے اور غزل بھی - شکار پور میونسپلٹی کے نائب صدر بھی رہ چکے ہیں -

حکیم محمد واصل درس ٹھٹوی

حکیم محمد واصل ابنِ رحمت اللہ پیدائش ۱۸۵۳ء ، وفات ۱۹۲۰ء - عالم با عمل تھے - عربی فارسی کے عالم و فاضل اور مثنوی 'گلزارِ واصل' کے مصنف تھے - جو ۵۱۸۷ اشعار سے زیادہ پر مشتمل ہے - کہنے کو اس مثنوی میں سسّی پنوں کی داستان ہے لیکن اخلاق نصیحت آموز اور عارفانہ نکات پائے جاتے ہیں - واصل صاحب کا پیشہ حکمت تھا -

میر عبدالحسن سانگی حیدر آباد

میر عبدالحسن سانگی خلف الصدق میر عباس علی خان - پیدائش کلکتہ ۱۸۵۱ء وفات حیدرآباد ۱۹۱۴ء - یہ شاہی خاندان میں سے تھے - والدِ ماجد اپنے اور بھائی کے ساتھ جلاوطن تھے - والدہ محترمہ ایک انگریز خاتون تھیں - ۱۸۶۳ء میں سندھ واپس آئے - ان کا دولتکدہ مرکزِ شعراء تھا - نثر و نظم پر قدرت رکھتے تھے - کلام میں جا بجا ہمعصر شعراء کا ذکر

---

۱ - دیکھئے میری کتاب اہلِ سندھ -

بڑے احترام سے کرتے ہیں ۔ سندھی ، اردو ، فارسی اور سرائیکی میں شعر کہتے تھے۔ ان کے تین دیوان میں سے دو مطبوعہ ہیں ۔ نثر میں تین قصص ، 'راحت افزا' ، 'دلچسپ' اور 'دلا رام وگل اندام' لکھے ہیں ۔ فارسی میں شاہ بھٹائی کی سوانح عمری لکھی ہے ۔ کافیاں بھی خوب لکھتے تھے ۔

ہدایت علی

ہدایت علی ابن ِ تراب علی عرف فقیر اللہ تنیو قصبہ لعلورانئک ضلع لاڑکانہ کے تھے ۔ پیدائش ۱۸۶۰ء ، وفات ۱۹۴۶ء درویش صفت انسان تھے ۔ سندھی ، سرائیکی ، اردو ، فارسی ، عربی اور پشتو ہر زبان میں طبع آزمائی کی ہے ۔ سندھی کے صاحب ِ دیوان شاعر ہیں ۔ انہوں نے چند مثنویاں بھی لکھی ہیں ۔ پہلے نجفی پھر تارک تخلص اختیار کیا ۔

ہدایت اللہ مشتاق متعلوی

ہدایت اللہ مشتاق ۱۸۵۸ء میں بلوچستان میں پیدا ہوئے اور مٹیاری میں قیام کیا ۔ اس لیے متعلوی کہلائے ۔ آخر عمر میں ہالا منتقل ہوئے اور لوگوں نے ہالائی لکھا ۔ کتاب 'ہدایت الانشا' کی وجہ سے شہرت پائی ۔ عربی فارسی کے عالم تھے ۔ انہوں نے خطبات بھی لکھے ہیں ۔

محمد شاہ مجتبائی

محمد شاہ مجتبائی ساکن عامری ضلع دادو ، گدا ، مرتضائی اور سانگی کا ہم عصر نوجوان شاعر تھا[1] ۔ گدا ان کو اپنا دوست اور فصاحت و بلاغت میں عدیم المثال لکھتا ہے ۔ مرتضائی نے بھی اپنے ہم عصروں میں شمار کیا ہے ۔ عامری میں ان دلوں دو مشہور شاعر تھے ایک مجتبائی اور دوسرا مصطفائی ، لیکن ڈاکٹر باوچ نے اپنے مضمون 'مرتضائی اور اس کا دیوان'[2] میں مصطفائی کا نام محمد شاہ اور مجتبائی کا نام جمن شاہ اور رشید احمد لاشاری مولف 'کلیات ِ گدا' نے غلطی سے مجتبائی کا نام غلام مجتبیٰ لکھا ہے[3] ۔

حیدر آباد کے ، لچھی رام خفتی ، محکم الدین محکم ، شکار پور کے عبدالقادر بیدل ، شمس الدین عاصی ، محمد امین' امین، محمد اسلم علوی اسلم اور عبداللطیف ٹھٹوی ان تمام شعراء کے اشعار 'سندھ سدھارا' اخبار میں چھپتے تھے ۔

جہاں تک موضوع میں گنجائش تھی شعراء کے حالات تفصیلات سے لکھے گئے ، لیکن

---

۱ ۔ سچئی ' محمد صدیق' تاریخ سندھی ادب ، جلد دوئم ص ۲۳ ۔
۲ ۔ رسالہ عام رائےبابت ماہ اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۲۳ ۔
۳ ۔ کلیات گدا ، ص ۱۱ ۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مختصر مقالہ نئے اور پرانے شعراء کی کوئی جامع فہرست ہے۔ ابھی بے شمار قدیم اور جدید شعراء ایسے باقی ہیں جو ۱۸۴۳ء سے ۱۹۰۰ء کے درمیانی زمانے میں پائے جاتے ہیں۔ بہت سے شعراء کا ذکر مختلف دواوین اور مذکورہ بالا عہد کے شعراء کی کتابوں میں بکھرا ہوا ہے اور زمانہ مذکورہ کے اخبارات و رسائل سندھی ، اردو اور فارسی کلام سے بھرے ہوئے ہیں۔

* * * *

فصل چہارم

سندھی کے ابتدائی نثر نویس

سندھی نثر کے کچھ نمونے پیش کرنے سے قبل سندھی نثر کی تاریخ کی طرف کچھ کچھ اشارے کرنے ضروری ہیں۔

سندھی نثر کی تاریخ کے متعلق ویسی ہی قیاس آرائیاں ہیں جیسے ہم سابق میں نظم کے لیے کہیں بیان کر چکے ہیں ، جس کا مستفاد یہ ہے کہ سندھ کے کسی راجا نے جب عبداللہ بن ہباری والئی منصورہ سے اسلامی عقائد کے متعلق کچھ تفصیل مانگی تو انہوں نے ایک عراق الاصل سندھی عالم اور شاعر سے اسلامی عقائد پر ایک کتاب سندھی نظم میں لکھوا کر ۲۷۰ھ میں بھجوا دی[1]۔ اسی عراقی عالم نے راجا کی فرمائش پر قرآن مجید کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا۔ سندھی نثر کا سب سے پہلا نمونہ بھی عبداللہ بن عمر ہباری کے زمانے میں پایا جاتا ہے لیکن اس قسم کی حکایتوں سے سندھی نثر کی ابتدائی حالت پر کوئی قابلِ اطمینان بات کہنی بہت مشکل ہے۔

سندھی نثر کے سلسلے میں بعض محققین نے بہت سی سندھی نثری عبارتیں سید عبدالکریم بلڑی (م - ۱۶۲۲ء) سے منسوب کی ہیں وہ سب غلط فہمی پر مبنی ہیں ، کیونکہ سید عبدالکریم بلڑی کے مرید خاص محمد رضا بن عبدالواسع نے اصل کتاب جس کا نام 'بیان العارفین و تنبیہ الغافلین' ہے اپنے شیخ کی وفات سے چھ برس بعد فارسی زبان میں[2] لکھی۔ اس لیے سید صاحب کی سندھی نثر عبارت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب رہا یہ امر کہ مرزا قلیچ

---

۱ - منصورہ کی تاریخ کا ایک باب مولفہ سید حسام الدین راشدی بحوالہ الوحید آزاد نمبر ص ۷ ۱۴ اگست ۱۹۴۹ء۔

۲ - پوتہ ، داؤد ، (مرتب) بیان العارفین و تنبیہہ الغافلین ص ۲ -

بیگ اور پروفیسر غلام علی الانا نے جو سندھی نثری عبارتیں سید عبدالکریم بلڑی سے منسوب کی ہیں وہ سب کی سب فارسی نثر کا ترجمہ ہیں۔ سید صاحب کی نثر سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔

نثری عبارت کے جو نمونے قدیم سے دستیاب ہوئے ہیں وہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

شیخ عبدالرحیم گرہوڑی

شیخ عبدالرحیم واڑ تعلقہ کپروس[1] میں تقریباً ۱۷۳۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۷۲ء[2] میں وفات پائی۔ شمس‌العلماء ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کی مدد سے ہمیں عبدالرحیم گرہوڑی کی نثر کے چند ٹکڑے مل سکے ہیں۔ اس نثری عبارت کی حالت یہ ہے کہ بعض حصے اس کے مقفیٰ ہیں اور بعض مسجع اور رنگین۔

(۱) نثر مقفیٰ

(الف) استاد شاگردوں کو اس طرح تعلیم دیتا ہے جیسے مرغی اپنے بچوں کو دانا چگنا سکھاتی ہے۔ (ترجمہ)

(ب) جن لوگوں نے پا لیا، چھپا لیا اور جن لوگوں نے نہ پایا، انہوں نے اپنا محبوب (مقصود) کھو دیا۔ (ترجمہ)

(۲) نثر رنگین متین مسجع

(الف) اللہ (کی رحمت کا بادل) ہمیشہ برستا ہے، بارش کا آنا موسم پر موقوف ہے (بارش ہمیشہ سال بھر تک نہیں ہوتی)۔

(ب) کسی کے نیک سلوک کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔

(ج) بخشش اسی (خدا) کا کام ہے، بندہ (کسی کو) کیا دے گا، بندہ تو جلدی سے تھک (محتاج) جاتا ہے۔ (ترجمہ)

۱۔ پوتہ، داؤد، (مرتب) کلام گرہوڑی، ص ۸۔

۲۔ جتوئی، علی نواز، سندھی کلام گرہوڑی ص ۵ بحوالہ انگریزی مقالہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔

نثر مرجز

جو کچھ کرتا ہے اللہ کرتا ہے کسی کا کچھ گناہ نہیں ہے۔ (ترجمہ)

عبدالرحیم گرہوڑی مرحوم کی نثر عام رسمی یعنی بول چال یا تصنیف و تالیف کی زبان نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بعض تجربے اور نکتے بیان کیے گئے ہیں۔

آخوند عزیز اللہ

سال پیدائش ۱۷۴۴ء اور سال وفات ۱۸۲۴ء۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن کی نثر کے مستند نمونے پائے جاتے ہیں۔ آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے اس لیے سادگی اختیار کرنی پڑی اور اپنے پیش رو عبدالرحیم گرہوڑی کی نثر سے استفادہ کا کوئی قرینہ نہیں معلوم ہوتا۔

اللہ ہی کی ہے مشرق و مغرب۔ سو جس طرف منہ کرو اس طرف اللہ ہے۔ تحقیق خدا کا فضل وسیع ہے اور وہ جانتا ہے۔ (ترجمہ)

سندھی نثر کے نمونے ہمیں دو سے زیادہ نہیں مل سکے۔ پہلا نمونہ عبدالرحیم گرہوڑی مرحوم کا ہے اور دوسرا آخوند عزیزاللہ کا۔ اب اگر ہم مرقومہ بالا نثری عبارتوں کا مقابلہ ۱۸۵۳ء کے بعد کی نثر سے کریں تو جتنا مواد ہم حاصل کر سکے ہیں وہ اس قابل نہیں ہے کہ حصول مقصد میں مدد دے سکے۔ گرہوڑی اور آخوند عزیز اللہ کی نثر کے نمونے جتنے دستیاب ہوئے ہیں ان کی نوعیت کچھ ایسی ہے جس سے اس زمانے کی نثر کی خصوصیات کا متعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ عبدالرحیم گرہوڑی کی نثر پر شاہجہان کے زمانے کی فارسی نثر کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ 'بہار دانش' کا انداز نثر ایسا ہے جس سے عبدالرحیم گرہوڑی مرحوم کافی متاثر ہوئے ہیں۔ نثر رنگین متین بلکہ کہیں کہیں نثر سنگین متین کے ٹکڑے بھی گرہوڑی کی نثر میں نظر آتے ہیں۔ مقفیٰ، مسجع اور نثر مرجز 'بہار دانش' کا حصہ ہے یہی گرہوڑی مرحوم کی نثر کی خصوصیات ہیں۔ آخوند عزیزاللہ کی نثر چونکہ ترجمے سے تعلق رکھتی ہے اس لیے سیدھی سادھی عبارت ہے مگر قرآن کریم کا لفظی ترجمہ ہونے کی وجہ سے تعقید سے خالی نہیں ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد ۱۸۵۳ء کے بعد کی نثر کے نمونے درج کیے جاتے ہیں۔

سید میران محمد شاہ اوّل لکھڑائی

تاریخ پیدائش ۱۸۲۹ء، وفات ۱۸۹۲ء۔ مقام پیدائش لکھڑ ضلع حیدر آباد۔ عربی،

فارسی اور سندھی زبان کے ماہر تھے ۔ طبابت کا پیشہ ورثے میں پایا تھا ۔ اس زمانے میں دفتری زبان فارسی تھی ، اس لیے چیف کمشنر کے دفتر میں میر منشی ہوئے ۔ بعد میں ترقی کر کے ریزیڈنٹ میجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے مگر بعض وجوہ کی بنا پر ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور وکالت شروع کی لیکن ناکام رہے ۔ اور باقی زندگی آبائی پیشہ طبابت میں گزار دی ۔ ان کی تین کتابیں یادگار ہیں (۱) 'سدھاتوری اور کدھاتوری' (حلالی بیٹا اور بد کردار بیٹا) (۲) 'مفید الصبیان' (۳) 'آکاشی نروار' (علم ہیئت کی ایک کتاب) ۔ عبارت کا ترجمہ ذیل میں درج ہے :

> تب افسر اعلیٰ نے لڑکوں کا استحان لیا اور جو جو لڑکے بہ شوق اور پڑھائی میں بیٹے تھے اور جنہیں پڑھنے لکھنے کا شوق نہیں تھا ، ان کو بلا کر کہا کہ اگر تم دھیان لگا کر پڑھتے اور ترقی کرتے تو تم کو بھی انعام ملتا ۔ دیکھو تمہاری کمی نے تم کو انعام سے محروم رکھا ۔ (ترجمہ)

ان کی عبارت سادہ ، سلیس اور سنجیدہ ہوتی ہے ۔ ضرب الامثال اور محاورات کا استعمال بے تکلف کرتے ہیں ۔

میرزا غلام رضا بیگ

مرزا غلام رضا بیگ ، فریدون بگ کے بڑے بیٹے تھے ۔ گورنمنٹ ہائی سکول میں معلّم فارسی تھے ۔ بعد میں ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر ہوئے اور ۱۸۹۵ء میں وفات پائی ۔ آپ نے ۸ مئی ۱۸۷۱ء میں علم منطق پر سندھی میں ایک کتاب بنام 'مفتاح القلوب' لکھی ۔ مرزا غلام رضا بیگ کی نثری عبارت تقریباً ۹۷ سال پہلے کی عبارت ہے مگر اپنی ساخت کے اعتبار سے دورِ حاضرہ کی نثر سے ملتی جلتی ہے ۔ سنجیدگی ، سلاست اور ادائے مطالب میں ضروری الفاظ سے کام لیا گیا ہے اور اندازِ بیان سادہ اور دلنشیں ہے ، جو انیسویں صدی کے ربع آخر کی خصوصیت ہے ۔

---

۱ - محمد صدیق میمن ، تاریخ سندھی ادب ، جلد دوم ، ص ۵۰۵ ۔

۲ - تعجب کی بات ہے کہ پروفیسر غلام علی الانا نے اپنی کتاب سندھی نثر کی تاریخ کے صفحہ ۱۷ پر فسانۂ عجائب کو ہندی قصہ لکھا ہے اور ان کی کتاب ۱۹۶۶ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہے جب کہ پروفیسر میمن عبدالمجید سندھی نے اپنی کتاب مانک موتی لال کے صفحہ ۱۰۲ پر فسانۂ عجائب کو اردو کا قصہ لکھا ہے اور یہی حقیقت ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے یہ قصہ اردو زبان میں ۱۸۲۴ء میں لکھا ہے اور اس کا کوئی ترجمہ ہندی زبان میں دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا ۔

آخوند لطف اللہ

سال پیدائش ۱۸۴۲ء ، سال وفات ۱۹۰۲ء ۔ ان کے آبا و اجداد مسقط سے سندھ آئے اور شیرازی کہلائے ۔ ان لوگوں کا پیشہ معلّمی تھا ۔ ان کے باپ کا نام آخوند محمد اسحاق تھا ۔ آپ حیدر آباد میں پیدا ہوئے ۔ تعلیم سے فارغ ہو کر لوکل بورڈ مدرسہ میں معلّم ہو گئے اور ۱۸۹۸ء میں پنشن حاصل کی [1] ۔ آخوند لطف اللہ نے 'فسانۂ عجائب' کا ترجمہ اردو سے سندھی میں ۱۸۸۱ء میں کیا ۔

آپ کے کلام میں اپنے معاصرین کے خلاف تصنّع اور رنگینی پائی جاتی ہے ۔ قافیوں کا جگہ جگہ التزام ہے اگرچہ انشاء پرداز نے کہیں کہیں سابقہ سندھی انشاء پردازی کی تقلید کی ہے تاہم عبارت کی رنگینی اور قافیہ کی پابندی نے جگہ جگہ عبارت کو بے لطف اور طویل بنا دیا ہے ۔

مولوی محمد عثمان بن حافظ محمد نورنگ زادہ

کھور واہ حیدر آباد ضلع کے حصہ لاڑ میں ایک قصبہ میں پیدا ہوئے ۔ تقریباً ۱۹۱۳ء میں سندھ مدرسہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن واپس ہوئے اور یہیں ۱۹۱۸ء میں انتقال کیا ۔ مولوی صاحب نہایت ذی‌علم اور فاضل بزرگ تھے ۔ ۱۸۵۰ء میں سندھ مدرسہ میں دینیات کے معلم مقرر ہوئے ۔ 'تنویرالایمان فی تفسیرالقرآن' سندھی زبان میں قرآن کی تفسیر ہے ۔ ابھی ۲۵ سیپاروں کی تفسیر لکھنے پائے تھے کہ انتقال کر گئے ۔ بقیہ پاروں کی تفصیل آپ کے پوتے مولوی محمد نورنگ زادہ نے پوری کی ۔ حسب ذیل کتابیں آپ کی یادگار ہیں [1] ۔

(۱) **فتوح الغیب سندھی**

حضرت عبدالقادر جیلانی غوث الاعظم کی کتاب 'فتوح الغیب' کا سندھی ترجمہ ۔

(۲) **اکسیر الاحمر فی اسرار الجفر**

سندھی زبان میں علم جفر کی کتاب

(۳) **حالات غوث الاعظم :**

حضرت غوث الاعظم کی سندھی زبان میں سوانح عمری ۔

---

۱ ۔ محمد صدیق میمن ، تاریخ سندھی ادب ، جلد دوم ، ص ۴۹۹ ۔

(۴) بینات القرآن

ایک ہندو عامل نے اسلام پر جو اعتراضات کیے ان کا یہ محققانہ جواب ہے۔

(۵) خطباتِ سندھی

سندھی زبان میں جمع کیے ہوئے خطبات ہیں جو آج تک مساجد میں پڑھے جاتے ہیں۔

(۶) تحفۃ الاسلام

پانچ جلدوں میں فقہ کی کتاب ہے جو سندھ مدرسہ کے نصابِ دینیات میں شامل تھی۔

چونکہ مولوی محمد عثمان نورنگ زادے کا انتقال ۱۹۱۸ء میں ہوا ہے اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اس زمانے کا نثر نگار ہے جس میں سندھی نثر نکھر کر ہر قسم کے مطالب کے ادا کرنے کے قابل ہو چکی تھی ، اس لیے عبارت میں سلاست ہے اور اندازِ بیان میں سنجیدگی ۔

آخوند فقیر محمد عاجز

ضروری حالات زندگی حصۂ نظم میں لکھے جا چکے ہیں ۔ ان کی کتاب 'گلشن بہار' ہے۔ ان کی عبارت مقفیٰ ہے مگر اندازِ بیان سلجھا ہوا ہے ۔ کہیں کہیں ایک بدعت بھی نظر آتی ہے ۔ مقفیٰ عبارت کا قاعدہ یہ ہے کہ یا تو دو جملے مقفیٰ ہوتے ہیں یا چار مگر ایک ہی قافیہ کے تین مقفیٰ جملے اردو فارسی میں کہیں دیکھنے میں نہیں آئے۔ یہ بات ان کی نثر میں پائی جاتی ہے ۔ اس سے ایک اقتباس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے :

اے ہمدم محرمِ حال زبان کی کیا مجال ہے جو دل کا حال شرحوار اظہار کرے ۔ ظاہر ہے کہ تو پردہ دار ہے ، اس رمز سے واقف ہے ۔ محبت کے مارے تیرے عشق کے گھائل اور اس درد کے ستائے ہوئے ہیں ۔ اس جینے سے شرمندگی ہے۔ یہ حضرت عشق کی بندگی ہے ۔ (ترجمہ)

★ ★ ★

یعنی جدائی کے درد سے غم ناک ، سوزِ فراق سے بیمار ، ایسی زندگی سے سرشار ہے ۔ (ترجمہ)

امام بخش خادم

حسب بیان لطف اللہ بدوی امام بخش خادم نے ایک خود نوشتہ سوانح عمری اپنی یادگار چھوڑی ہے ۔ کلیاتِ خادم کی ابتدا میں اس سوانح حیات میں سے بعض اقتباسات نقل کیے ہیں ۔ ان میں سے ایک کا ترجمہ درج ذیل ہے :

آٹھ دن کے سفر میں اوپر نیلگوں آسمان تھا اور نیچے سبزی مائل پانی ۔ سورج ڈوبتا اور طلوع ہوتا تھا ۔ اس طویل سفر کے بعد جہاز عدن کی بندرگاہ پر پہنچا ۔ جہاں دو دن ٹھہرا ۔ انگریزی جھنڈا دور سے فوجی چھاؤنی پر لہراتا ہوا نظر آرہا تھا لوگ چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر شہر دیکھنے کے لیے گئے ۔ شہر کچھ ایسا بڑا نہ تھا اس میں کچھ رونق بھی نہ تھی ۔ (ترجمہ)

۱۸۵۳ء کے بعد جب سندھی حروف تہجی کا فیصلہ ہو چکا اور اندازِ تحریر کے لیے ایک اصول مقرر کر لیا گیا تو بیسویں صدی کے تمام انشا پردازوں یعنی مؤلفوں اور مصنفوں کا ایک اندازِ تحریر خود بخود مقرر ہو گیا اور علمی اور فنی کتابیں کثرت سے تصنیف ہوئیں اس لیے اس زمانے کے اندازِ تحریر کی خصوصیات تمام مصنفین اور مؤلفین میں یکساں ملتی ہیں سوائے 'گل خنداں'، 'گلشن بہار' اور ایک آدھ کتاب کے جن کی عبارت مقفلی اور مسجع ہے ۔ چنانچہ امام بخش خادم کی عبارت بھی سادہ ، بے تکلف اور ضرورت کے مطابق ہوتی ہے ۔ کہیں کہیں محاورات کا استعمال بھی خوبی سے کیا گیا ہے ۔

شمس العلماء خان بہادر مرزا قلیچ بیگ خلف مرزا فریدون بیگ

پیدائش ۱۸۵۳ء[1] ، وفات ۳ جولائی ۱۹۲۹ء ۔ سندھ کا یہ نامور فرزند حیدر آباد کے شہر کے محلہ ٹنڈو ٹھوڑو میں اپنے آبائی مقام میں پیدا ہوئے ۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد الفنسٹن کالج بمبئی میں داخلہ لیا لیکن بی ۔ اے میں کامیاب نہ ہو سکے ۔ وطن واپس آ کر ملازمت اختیار کرلی ۔ پہلے تحصیلدار ، اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہو گئے ۔ ۱۹۱۰ء میں پینشن لے کر خانہ نشین ہوئے اور بقیہ عمر علم کی خدمت میں گذار دی ۔ گورنمنٹ آف انڈیا سے علمی خدمات کے صلہ میں شمس العلماء اور سرکاری خدمات کے اعتراف کے طور پر خان بہادر کا خطاب ملا ۔

مرزا صاحب بہت سی خوبیوں کے حامل تھے ۔ مختلف علوم و فنون پر آپ نے چار سو سے زیادہ کتابیں تصنیف و تالیف کیں ۔ غزلوں کا ایک ضخیم دیوان ان سے یادگار

---

۱ ۔ حیات قلیچ' مؤلفہ مرزا ہمایوں بیگ خان مرزا قلیچ بیگ ص ۲۰ ۔

ہے - مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے ، مثلاً تاریخ ، اخلاق ، نباتات ، صرف و نحو، علم عروض ، علم صنائع بدائع ، علم قوافی ، فلسفہ ، تصوف ، مذہب ، ادب ، ناول ، قصہ ، مثنوی ، رباعی ، ناٹک ، فلسفۃ اللسان ، تعلیم نسواں ، غرض ہر علمی اور سماجی ضرورت پر مرزا صاحب کی تصنیف یا تالیف موجود ہے - سندھی ادبی بورڈ نے آپ کی چار سو سے زیادہ تالیفات کی ایک فہرست شائع کی ہے - مگر یہ فہرست بھی جامع نہیں ہے -

سندھی زبان میں ڈرامے اور ناول کے موجد بھی ہیں - آپ کی مختلف زمانوں کی عبارتیں ملتی ہیں ، مگر ہر زمانے کی عبارت چونکہ سادہ ، سلیس ، اسلوب بیان نہایت سنجیدہ اور الفاظ کا استعمال ضرورت کے مطابق مناسب ہے اس لیے ابتدائی زمانے کی عبارت آخر کی نثر سے مختلف نہیں ہے - مثلاً : "سقراط قدیم یورپ کے گریس یا یونان ملک کا ایک بڑا فلسفی اور دانا حکیم تھا - وہ ۴۷۰ سال قبل مسیح میں ایتھنس شہر میں پیدا ہوا تھا - بچپن میں اپنے باپ کا پیشہ اختیار کیا یعنی بت تراشنے لگا - مگر بعد میں وہ بازار میں بچوں کو پڑھایا کرتا تھا" -

ہدایت اللہ مشتاق

یہ فرزند سندھ عجیب خوبیوں کا مالک تھا مولانا شبلی نعمانی نے 'موازنہ انیس و دبیر' میں بلاغت کے عنوان کے تحت کچھ اشارات کیے ہیں جس میں ہر عنوان کے تحت ضروریات بلاغت کو اشارۃً ظاہر کیا ہے - ہدایت اللہ مشتاق نے اپنے انشا میں اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے ، مثلاً ان کے ایک باب کی ایک فصل کے عنوانات حسب ذیل ہیں :

پہلی فصل - پیروں کے ارشادات اور مریدوں کی عرضداشت کے بیان میں ہے -

دوسری فصل - سادات کے نوازش ناموں اور ان کے متعلق عریضوں کے بیان میں -

تیسری فصل - علماء کے سرافراز ناموں ، شاگردوں اور دوسرے لوگوں کے عریضوں کے بیان میں -

---

١ - محمد صدیق میمن صاحب کا بیان مندرجہ تاریخ سندھی ادب جلد دوم ، ص ١٩١ کے فٹ نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ آخوند عبدالرحیم وفا کی مادری زبان سندھی نہ تھی اور اس کا ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ موصوف نے جواہر اللغات میں تذکیر و تانیث میں اہل زبان کے اصول سے بے اعتنائی برتی ہے - یہی ان کے سندھی زبان سے عدم وقوف کی علامت ہے - ان کو فارسی کا عالم بتایا گیا ہے اور ان کی بود و باش کوہستان سے منسوب کی گئی ہے - میرا خیال ہے سندھی زبان میں مذکر مؤنث کا فرق نہ کر سکنا فارسی زبان کے عالم ہونے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ کوہستانی زبان کی مشاق کا سبب ہے - خلیل

چوتھی فصل ۔ چھوٹے بڑے عزیزوں اور رشتہداروں کے خطوں کے بیان میں ۔

ان عنوانات میں جو فرق مراتب پایا جاتا ہے اور اس سلسلے میں جتنے خطوط لکھے گئے ہیں وہ مصنف کی بلاغت کا ثبوت ہیں ۔

آخوند عبدالرحیم وفا عباسی

ان کا بیان نظم کے حصے میں آ چکا ہے ۔

★ ★ ★

فصل پنجم

مثنوی کی ابتداء

(ادب ، اصناف ادب ، مشاعرے ، شاعری)

مثنوی کا فن

مثنوی عروضی شاعری میں داخل ہے ۔ یہ ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک شعر دو مصرعوں سے بنتا ہے اور اس کے ردیف قافیہ مقرر کرنے کی سہولت شاعر کے اختیار میں ہے ۔ ردیف قافیہ کے لحاظ سے شعر جداگانہ ہوتا ہے مگر مثنوی کی سب سے بڑی خصوصیت تسلسل بیان ہے ۔

سندھ کے ارتقائی احساس اور جدّت پسندی نے صنف مثنوی کو ایران سے اخذ کیا ۔ سندھ کے علماء اور فضلاء عربی اور فارسی نظم پر عبور رکھتے تھے ۔ فارسی مثنوی کی صلاحیت سے خوب واقف تھے ، لہذا ان بزرگوں نے مثنوی کی صنف کو اپنی نظم میں شامل کر کے زبان کے دائرے کو وسیع کر دیا کیونکہ سندھی زبان میں مثنوی کو قبول کرنے کی صلاحیت تھی ۔

مثنوی کی ابتدا ہمیں ۱۸۷۳ء سے ملتی ہے ۔ اس سلسلے میں جہاں تک معلومات کا تعلق ہے ۱۸۷۳ء/۱۲۹۰ھ سے پہلے کسی سندھی مثنوی کا نشان نہیں ملتا ۔ اب ذیل میں زمانی ترتیب کے ساتھ کچھ مثنویوں کا ذکر کیا جاتا ہے :

پہلی مثنوی کا نام 'سکندر نامہ'[1] ہے ۔ یہ نظامی کے 'سکندر نامے' سے ماخوذ ہے ۔

---

[1]۔ سکندر نامے سندھ میں چند شعراء نے لکھے یا ترجمے کیے ہیں ۔ یہی حال یوسف زلیخا ، لیلیٰ مجنوں اور ۔ سسی پنوں وغیرہ قصص کا ہے ۔ میں نے سنین کی ترتیب کی وجہ سے ایک ہی موضوع پر چند نظموں کو الگ الگ لکھ دیا ہے ۔ (خاہل)

اس مثنوی کی تاریخ خود مثنوی نگار نے جس طرح پیش کی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے :

"اے ناسور آج بدھ ہے اور صفر کا مہینہ ہے اور اٹھارہ ختم ہو کر انیس تاریخ ہے کہ یہ روشن مثنوی ختم ہوئی اور صاف ہجری سن ہے یعنی ۱۹ صفر ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء اس مثنوی کی طباعت کا سال ۱۸۸۸/۱۳۰۶ھ ہے" -

(۲) 'مثنوی گلزارِ واصل' مؤلفہ محمد واصل ابن درس رحمون (۱۸۸۱ء/۱۲۹۹ھ) - یہ سسی پنوں کی مشہور داستان ہے - 'مثنوی یوسف زلیخا' مؤلفہ عبدالواحد سائل ابن حاجی محمد لقمان حیدر آبادی (۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ھ) کو تمام ہوئی - 'مثنوی عمر ماروئی' مؤلفہ حافظ حاجی ابراہیم دل (۱۸۸۹ء/۸ ذوالقعدہ ۱۳۰۷ھ) - 'مثنوی سیر سلیمان' مؤلفہ مولوی غلام اللہ چودرہ (۱۸۸۹ء/۱۳۰۷ھ) - یہ حضرت سلیمان و بلقیس کا قصہ ہے یعنی فارسی مثنوی کا تتبع - 'مثنوی یوسف زلیخا' مؤلفہ غلام مرتضٰی شاہ مرتضائی ٹھٹوری (۱۸۹۰ء/۱۳۰۸ھ) - 'مثنوی قصہ لیلٰی مجنوں' مؤلفہ آخوند فقیر محمد عاجز ، (۱۸۹۲ء/۱۳۱۰ھ) - 'مثنوی سکندر نامہ'[۲] مولفہ غلام مرتضٰی شاہ مرتضائی ٹھٹوی (۱۸۹۳ء/۱۳۱۱ھ) - 'مثنوی کریما' سندھی مترجم سید عباس علی شاہ ٹھلاہ والا مطبوعہ ۱۸۹۴ء فارسی مثنوی کریما کا ترجمہ - 'مثنوی قصہ سسی پنوں' مؤلفہ واحد بخش مشتاق شکار پوری (۱۸۹۵ء) - شاہ نامہ مولفہ غلام مرتضٰی شاہ مرتضائی ٹھٹوی کا اوپر ذکر آ چکا ہے - سال اتمام و طباعت اس میں درج نہیں ہے - کتاب مطبوعہ ہے - یہ 'شاہنامہ فردوسی' کی چند داستانوں کا ترجمہ ہے -

'شہنشاہ[۳] نامہ' یا حملۂ حیدری مؤلفہ میر حسن علی خاں تالپور (۱۹۰۰ء/۱۳۱۸ھ) غیر مطبوعہ ہے - دوسری مثنوی سندھ کا شاہنامہ عرف کلھوڑوں کی ہار مؤلف مذکور کی

۱- اس مثنوی میں ۱۸۵۷ ، اشعار ہیں - اتنی طویل مثنوی بعد کے زمانے میں نہیں چھپی - نہایت جزیل اور پختہ نظم ہے - ۱۹۰۰ء کے بعد کی مثنویوں میں شاہنامہ عرب جو حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کی پہلی جلد کا ترجمہ ہے - باوجود اپنی فنی اور تاریخی نقائص کے یہ ایک بڑی مثنوی ہے لیکن چند غیر مطبوعہ مثنویاں میری نظر سے گزری ہیں ، جو ۱۶۰۰ زائد اشعار پر مشتمل ہیں - ایک مثنوی " فاتحہ سندھ " محمد خان غنی کی ، دوسری "فتح قسطنطنیہ" محترمہ نور جہاں شاہین سلمہا کی اور میری دو مثنویاں "تقدیر" اور " دو دو چنیسر " ، جن کو میں نے ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں علی الترتیب مکمل کیا ہے - خلیل

۲- مرتضائی نے اپنے سکندر نامے میں غلام محمد نظامانی کے سکندر نامے کے حوالے کے ساتھ تشریح کی ہے کہ اس نے گل محمد رند کا بڑی ایک سکندر نامہ پڑھا ہے جو ۱۲۹۹ اور ۱۳۱۱ھ کے درمیان میں لکھا گیا ہو گا - مگر ہمیں باوجود کوشش کے اس کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہوا - خلیل

۳- اس کا قلمی نسخہ میر نور محمد خان تالپور کے کتب خانہ میں میری نظر سے گذر چکا ہے جو ہزاروں شعروں پر مشتمل ہے -

تالیف ہے جو چھپ چکی ہے ۔

سندھی سرائی کے علاوہ سکندر نامہ ، شاہنامہ ، شہنشاہ نامہ اور سندھ کے شاہنامہ میں رزمیہ[1] شاعری پائی جاتی ہے ۔ سندھی کی بعض مثنویاں فارسی یا دیگر زبانوں کی مثنویوں سے ماخوذ ہیں ۔ یا ان میں فارسی سے تتبع کیا گیا ہے اور کچھ شاہناموں یا داستانوں کے تراجم ہیں ۔ سکندر نامے بھی بہت سے شعراء نے لکھے ۔ اور مثنویوں کے بیشتر موضوعات روایتی ہیں ۔ مثلاً عمر ماروئی ، سسّی پنّوں ، یوسف زلیخا اور لیلیٰ مجنوں وغیرہ ۔ ادبی روایات میں تقلید کا عنصر غالب تھا چنانچہ اس دور کی سندھی مثنویوں میں نہ تو کوئی نیا موضوع نظر آتا ہے اور نہ اندازِ بیان میں کوئی تنوع ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر مثنوی پر ایک ہی قسم کی چھاپ لگی ہوئی ہے ۔

غزل

عروضی شاعری میں سے قصیدہ سب سے پہلے سندھی زبان میں شامل ہوا اور رفتہ رفتہ غزل بھی سندھی زبان میں داخل ہو گئی ۔ دوہے ، کافیاں اور دوسری پنگل کی نظمیں زبان میں پہلے ہی سے رائج تھیں ، غزل کے اضافے نے سندھی زبان میں اچھی خاصی وسعت پیدا کر دی اور یہ فارسی زبان کا سندھی زبان و ادب پر اثر ہے ۔

غزل ایک ایسی صنفِ شاعری ہے جو عربی فارسی اردو کی طرح سندھی زبان میں بھی بڑی آب و تاب سے موجود ہے ۔ یہی سلسلہ انتزاع سلطنت کے بعد ۱۹۰۰ء تک اور ۱۹۰۰ء سے آج تک جاری ہے ۔

چونکہ فارسی ادب ۱۸۴۳ء کے قبل ہی سے سابق سندھ میں جاری تھا اس لیے رستم و سہراب ، جام جم اور ہفت خوان وغیرہ کی اصطلاحات سے اہل سندھ نامانوس نہ تھے ۔ غزل کی وجہ سے زبان میں اور زیادہ وسعت پیدا ہوئی ۔ یہاں تک کہ عربی کی تلمیحات بھی سندھی زبان میں آسانی سے سمجھی جانے لگیں ۔ مثلاً لیلیٰ مجنوں اور یوسف زلیخا وغیرہ ۔

اس عہد کے مشاہیر غزل گو شعراء میں فاضل شاہ ، محمد قاسم ، سانگی ، گدا وغیرہ پیش پیش نظر آتے ہیں جن میں سے اکثر صاحبِ دیوان ہیں ۔

انگریزوں کی حکومت کے بعد سے سندھی زبان کے نشاہ ثانیہ کا جو دور شروع ہوا اس نے سندھی ادب کو اس قابل بنا دیا کہ وہ علمی مسائل کا اہل بن سکے ۔ اس باب میں

۱- سندھی شاعری میں رزمیہ ، فارسی یا اُردو کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کو برائے نام ہی رزمیہ کہہ سکتے ہیں ۔ فردوسی ، میر انیس اور مرزا دبیر کا سا اہتمام نہیں ہے ۔ مثنوی سے بہت پہلے قدیم سندھی شاعری میں رزمیہ کا سراغ ملتا ہے مثلاً قصہ دو دو چنیسر ۔ یہ علاءالدین خلجی کے زمانے کی داستان ہے ۔

سندھی ادب نے فارسی ادب کا اثر زیادہ قبول کیا اور ایسا ہونا قدرتی تھا کیونکہ فارسی زبان سندھ کی سرکاری دفتری زبان تھی ۔ تشبیہات اور استعارات اور فارسی تراکیب نے زبان میں نفوذ کیا اور سندھی صرف و نحو بھی فارسی سانچے میں آسانی سے ڈھل گئے اور رفتہ رفتہ زبان میں اس قدر گھل مل گئے کہ آج وہ زبان کا ایک جزو معلوم ہوتے ہیں ۔ یہاں تک کہ بعض اصطلاحات صرفی و نحوی کے لیے اصل زبان کا کوئی لفظ ہی نہیں پایا جاتا اور سندھی زبان کی لسانی صلاحیت اور طبعی مزاج کی وجہ سے غرابت یا اجنبیت بالکل محسوس نہیں ہوتی ۔ البتہ اتنا ہوا کہ زبان کے ابتدائی ادب کی حالت بدل گئی اور سندھی قدیم شاعری کے مقابلے میں غزل زیادہ عام ہو گئی ۔

سندھی میں قصیدے

قصیدے کا موجد عرب ہے ۔ ایرانیوں نے قصیدے کو اپنایا اور معراج کمال پر پہنچایا ۔ اردو میں سودا ، ذوق اور مومن کی شہرت قصیدے کے لحاظ سے ہے مگر سندھی میں قصیدہ' قصیدے کی شان و شوکت کے ساتھ نظر نہیں آتا ۔ اردو میں داغ اور امیر مینائی وغیرہ نے قصائد کہے مگر ان کی حیثیت غزل سے زیادہ نہیں ۔ سندھی قصائد کا حال داغ ، امیر اور منیر شکوہ آبادی کی طرح بھی نہیں ہے ۔ قصیدے کے چار حصے ہیں تشبیب ، گریز، نفس مضمون اور حسن خاتمہ ، سندھی زبان کے قصائد ان خصوصیات سے خالی ہیں ۔ میر حسن علی خاں کے قصائد مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ ان قصائد میں نہ زبان کی شان و شوکت ہے اور نہ معانی کا زور ۔ طول طویل نظمیں ہیں جن کی صورت بظاہر قصیدے کی سی ہے مگر ان میں قصیدے کی خصوصیات مفقود ہیں ۔

بہر حال ۱۸۴۳ء سے ۱۹۰۰ء کے درمیان پانچ قصیدہ گو شعراء نظر آتے ہیں وہ اور ہیں میر حسن علی خان ، میر عبدالحسین خان سانگی ، آخوند محمد قاسم ہالائی ، غلام محمد شاہ گدا اور مرزا قلیچ بیگ ۔

دوسری اصناف سخن

مثنوی ، قصیدے اور غزل کے علاوہ عروضی شاعری کی حسب ذیل اصناف سندھی شاعری میں پائی جاتی ہیں ۔

مثلث ، رباعی ، مربع ، مخمس ، مسدس ، مسبع ، مثمن ، متسع ، معشر ، یہ اقسام مصرعوں کے شمار سے ہیں ۔ ترکیب بند ، ترجیع بند ، مسمط ، مستزاد ، فرد ، بیت ، قطعہ وغیرہ ۔

مشاعرے اور شعری صحبتیں

سندھ میں ایک ایسا زمانہ بھی گذرا ہے جس میں دلی اور لکھنؤ کی طرح شعر و شاعری کا چرچا تھا ۔

حیدر آباد سندھ میں ایک بزرگ قاضی امام[1] علی صاحب تھے جن کے مکان پر نہ صرف طرحی مشاعرے بلکہ کبھی کبھی فی‌البدیدہ مشاعرہ بھی منعقد ہوتا تھا[2] ۔

میر حسن علی خان تالپور اہل علم اور شعراء کے بڑے سرپرست تھے ۔ موصوف کا دولتکدہ ادب و شعر کا مرکز تھا جہاں اکثر مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے[3]

مجھے آغا سید فتح علی شاہ[4] کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کے دادا سید آغا زین‌العابدین شاہ متخلص بہ عابد جو میران تالپور کے زمانے میں شکار پور کے ناظم اعلیٰ تھے ، انتزاع سلطنت کے بعد اپنے مکان پر ٹنڈہ آغا (حیدر آباد) میں اکثر شعر و ادب کی محفلیں منعقد کرتے تھے ۔ شعراء اور ذی علم حضرات ان صحبتوں میں حصہ لیتے تھے ۔ انتزاع سلطنت کے بعد یہ پہلی صحبت تھی جہاں شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا ۔

مرزا مراد علی بیگ عرف مرزا بڈھل بیگ

ہز ہائینس میر نور محمد خان کے وزیر تھے ۔ خود بھی ذی علم تھے اور اہل فضل و کمال کے قدر دان تھے ۔ ان کے یہاں بھی اکثر مشاعرانہ صحبتیں منعقد ہوتی رہتی تھیں[5] ۔

مولوی زین‌العابدین لکھنوی

یہ ایک عالم فاضل شخص تھے ۔ میر حسن علی خان کے ایما پر حیدر آباد آئے ۔ میر صاحب موصوف ان کے خاص سرپرت تھے ۔ میروں کے قبوں کے پاس قیام فرما تھے ۔ موصوف کا دولتکدہ بھی شعر و شاعری کا مرکز تھا ۔ اردو مشاعروں کے ساتھ سندھی شعر و شاعری کا بھی سلسلہ جاری تھا[6] ۔

مولوی سید ابوالحسن لکھنوی

یہ بزرگ بھی میر حسن علی خان کے طلب فرمانے پر حیدو آباد آئے ۔ ٹنڈہ آغا میں

١- قاضی امام علی مرحوم حیدر آباد میں تعصہ‌الدار کے معزز عہدے پر فائز تھے ۔

٢- محمد صدیق مسافر مولف دیوان فاضل کا دیباچہ ص ٣٥ ۔

٣- محمد صدیق میمن مرتب، تاریخ سندھی ادب جلد ٢، ص ٢٨٠ ۔

٤- راوی کی عمر اس وقت تقریباً سو سال کی تھی اور وہ بھی ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے

٥- اس روایات کا ماخذ مرزا بڈھل بیگ کے خاندانی افراد ہیں ۔

٦- یہ روایت اس قدر مشہور و متواتر ہے کہ اس کے قابل وثوق ہونے میں شبہ نہیں ۔

مقیم تھے ۔ اکثر شعراء کا اجتماع ان کے یہاں بھی ہوتا رہتا تھا[1] ۔

میر عبدالحسین سانگی

میر حسن علی خاں کے بھتیجے تھے ۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے ۔ آپ سے تین دیوان سندھی زبان میں یادگار ہیں ۔ ان کا دولتکدہ بھی اہلِ ادب و شعراء کا مرکز تھا اور ان کے ہاں اکثر مشاعرے منعقد ہوتے[2] تھے ۔

سید محمد فاضل شاہ

'دو ہفتہ سندھ سدھارا' [3] ۱۸۷۹ء سے ایک شعر ہاتھ آیا ہے ، جو لچھی رام خفتی (خبطی) کا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کے دولتکدہ پر بھی جمعہ کے روز شعر و شاعری کی مجلس منعقد ہوتی تھی ۔

اخباری مشاعرے

یعنی وہ مشاعرے جو سندھی اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے تھے ۔ مثلاً سندھ سدھارا ، مجمع مہدی ، اکلیل سندھ ، معین‌الاسلام ، معاون الاسلام ، یہ تمام اخبارات کراچی سے اور رسالہ سرسوتی کراچی اور تعلیم حیدر آباد سے ۔

ان اخبارات میں طرحی اور غیر طرحی سندھی شعراء کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا ۔ 'مفرح القلوب' اخبار مختلف فارسی گو شعراء کا کلام شائع کرتا جس میں قصائد بھی شامل ہوتے تھے ۔

سابق سندھ کے دوسرے حصوں سے بھی اخبارات میں شعر و شاعری کا کافی حصہ شائع ہوتا تھا ۔

اس زمانے کے شعراء نے عروضی شاعری کو سندھی زبان میں سمو کر زبان و ادب کو وسعت دی ۔ واقع یہ ہے کہ ۱۸۶۳ء میں میران تالپور جب کلکتے سے واپس آ گئے تو

۱۔ یہ روایت بڑی اسیے لوگوں کی زبانی ہے جنہوں نے ان صحبتوں میں شرکت کی تھی ۔

۲۔ تاریخ سندھی ادب جلد ۲ ، ص ۳۰۴ ۔ یہ اپنے اشعار میں مشہور معاصر شعراء کا ذکر بھی بڑی عزت و احترام سے کرتے ہیں ۔

۳۔ تاریخ سندھی ادب جلد ۲ ص ۲۶۶ ۔ خفتی کے شعر کا ترجمہ یہ ہے کہ "اے سید فاضل شاہ جمعہ کے دن تمہارے یہاں محفل ہوتی ہے میں بھی آیا کرتا ہوں ۔ آپ اس محفل کی زینت ہیں " ۔ اخبار سندھ سدھارا ۱۸۷۹ء میں اس شعر کا ہونا ثابت کرتا ہے کہ یہ اخبار ۱۸۸۲ء سے پہلے یعنی ۱۸۶۶ء میں چھپ چکا تھا ۔ سندھ سدھارا کے متعلق گذشتہ صفحات میں کہیں یہ بحث ہو چکی ہے اور یہ مزید تحقیق ہے ۔

سندھی ادب و شعر کا چرچہ حیدر آباد میں عام ہو گیا یہ میروں ہی کی ادب دوستی اور علم نوازی تھی ۔

قومی اور اصلاحی شاعری

مولوی اللہ بخش ابوجھے نے ۱۸۸۴ء میں 'مسدس ابوجھو' لکھ کر قومی شاعری کی بنیاد ڈالی ۔ اس مسدس کی ترتیب یہ ہے کہ آدھا 'مسدس حالی' کا ترجمہ ہے اور باقی حصہ طبعزاد ہے ۔ شمس‌الدین بلبل ، مرزا قلیچ بیگ اور مولوی فتح محمد سیوہانی اسی دور کے قومی شعراء ہیں ۔

شمس‌الدین بلبل کی ''رحیا'' اکبر الہ آبادی کے رنگ میں ہے ۔ اس میں کافی طنز و احتجاج پایا جاتا ہے جس سے غرض قومی اصلاح ہے اور مرزا قلیچ بیگ مرحوم نے حالی کے انداز میں بعض قومی نظمیں لکھی ہیں ۔ اسی طرح حکیم فتح محمد سیوہانی نے بھی بہت سی قومی نظمیں کہی ہیں ۔ مجموعی طور پر ایسی تمام نظموں میں حالی کا تاثر پایا جاتا ہے ۔

عوامی شاعری

سندھ کے دیہات میں کافی ، دوہوں اور گیت وغیرہ کی شاعری عام تھی ۔ علم کی اشاعت اور تہذیب کی ترقی نے دیہات میں نفوذ کیا تو عوامی شاعری رو بہ تنزل ہونے لگی یہاں تک کہ عروضی شاعری کا دور شروع ہوگیا ۔ عوامی شاعری کی اصناف حسب ذیل ہیں :

وائی ، کافی ، دوہے ، دوراہے ، ژور ، سینگار ، ڈھس ، ست سری ، پرولی ، ہنر ، سی‌حرفی ، مدح ، مناجات وغیرہ ۔ ان تمام عنوانات کی دو قسمیں ہیں ۔

وائی ، کافی ، دوہے اور ابیات صوری قسمیں ہیں اور باقی تمام معنوی اقسام ہیں ۔

سندھی میں بیت اصطلاحی لفظ ہے ۔ ایک بیت چند مصرعوں سے مرکب ہوتا ہے اور ایک سندھی مصرعے میں دو ، تین ، چار ، پانچ یا اس سے بھی زیادہ سطریں ہوتی ہیں ۔ اس کو ایک بند کے مترادف سمجھنا چاہیے ۔

سندھی کے مصرعوں میں قافیہ مختلف سطروں میں مختلف مقامات پر استعمال کیے جاتے ہیں ، کبھی سطر کے آخر میں کبھی سطر کے درمیان میں اور کبھی کوئی سطر بغیر قافیہ کے بھی ہوتی ہے ۔

وائی بیت سے کچھ مختلف ہوتی ہے ۔ یہی حال کافی کا ہے ۔ یہ قدیم شاعری کی صوری

اقسام ہیں ۔

باقی اصناف حقیقت میں معمے ، چیستان یا بوجھ سے تعلق رکھتے ہیں ، البتہ سہرا ، چھلا ، ہو جمالو ، لولی (لوای) ، مورو وغیرہ معنوی اقسام ہیں ۔

سندھی میں گجھارت کے معنی ہیں پہیلی بوجھنا یا بجھانا ۔ گجھارت کی دو قسمیں ہیں ۔

(۱) سریلی یا سرالتی (۲) بے سری (لٹھ)

پھر سریلی کی تین قسمیں ہیں ، رواجی نمونہ ، ہنر ، دراہو ۔ اور بے سری کی بھی تین قسمیں ہیں ، ہرولی ، بے سری گجھارت اور گرچیلو ۔ یہ تمام اقسام سندھی ادبی کتابوں میں نظر آتی ہیں ۔

ہو جمالو

سندھ کا عوامی نغمہ ہے ۔ اس میں مضامین کا بڑا تنوع پایا جاتا ہے ۔ اس نغمے کو سن کر راستے چلتے لوگ بھی شریک ہوجاتے ہیں ۔ ہو جمالو گاتے جاتے ہیں اور ایک دائرے کی صورت میں جسم کو دائیں بائیں جھکا کر تالیاں بجاتے جاتے ہیں ۔ ان میں رقص کا سا انداز پیدا ہوجاتا ہے ۔ تالیاں اور قدم ڈھولک کی تھاپ پر اٹھتے ہیں ۔

سہرا

یہ بھی ایک خاص قدیم شاعری کی ایک قسم ہے جو اکثر خوشی کے موقع پر گایا جاتا ہے ۔

لوری

وہی گیت ہے جو ماں بچے کو سلاتے وقت گاتی ہے ۔

مورو

ایک عاشقانہ قسم کے تصور پر مبنی نظم ہوتی ہے جس میں اکثر محبوب کے انتظار کی آپ بیتی بیان کی جاتی ہے ۔

چھلا

صوفیانہ قسم کی نظم ہے اس میں عشق حقیقی کے جذبات اور عارفانہ خیالات بیان

کیے جاتے ہیں ۔

اشار

گجھارت اور اس کی اقسام ، سگھڑوں کا فی البدیہہ دلچسپ شاعرانہ مشغلہ ہے ۔ سگھڑ قدیم شاعری کا وہ خاص فرد کہلاتا ہے جو فی البدیہہ گجھارت موزوں کر سکے اور دوسرا سگھڑ فی البدیہہ اس کا جواب دے سکے ۔

اسی طرح سندھی نثر کی ایک سماجی رسم "ملوکن جی مجلس" ہے ۔ اس کی صورت بھی بالکل سگھڑوں کی مجاس کی طرح ہے ۔ مگر یہ اپنی ذکاوت کا مظاہرہ نثر میں کرتے ہیں ۔

صوفیانہ شاعری

تصوف کے متعلق مغرب زدہ اور غیر محقق طبقے نے سخت غلطیاں کی ہیں اور بعض مشاہیر نے اس کو غیر اسلامی عقیدہ کہہ دیا ہے مگر حقیقت یہ نہیں ہے حکیم سنائی ، شیخ فریدالدین عطار ، مولانا روم اور مولانا جامی نے تصوف میں جو کتابیں لکھی ہیں ان کا منبع و ماخذ شریعت و اسلام ہیں ۔

سندھی زبان بھی صوفیانہ شاعری سے خالی نہیں ہے ۔ قدیم و جدید شاعری میں دونوں قسم کے ابیات ، کافی اور دیگر اشعار میں ذات و صفات الٰہیہ کے عرفان و حصول کے مضامین مؤثر پیرایہ میں ملتے ہیں ۔ چونکہ اکثر صوفیانہ شاعری کی بنیاد مسئلہ وحدت الوجود پر ہے اس لیے سندھی زبان کے صوفی شعراء اس کیف سے مست و مدہوش نظر آتے ہیں ۔

شاہ عبداللطیف[1] بھٹائی کے زمانے سے کچھ قبل عرفانی شاعری شروع ہوئی ۔ شاہ نے احتیاط کے ساتھ مسائل فقرو تصوف شریعت کی زبان میں ادا کیے ۔ توحیدِ الٰہیہ ایک تمثیل میں بیان کیا ہے یعنی وحدت الوجود اور کثرت کے متعلق کی نسبت بیان کی ہے ۔ شاہ کا یہ بیت بہت مشہور ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے :

"آواز باز گشت اصل میں آواز والے کی آواز ہی ہے ۔ اگر اس راز کو پا لیا جائے جو اصل میں ایک ہے اور سننے میں دو"

---

(1) وفات صفر ۱۱۶۵ھ ۱۷۵۲ء مزار بھٹ شاہ ضلع حیدر آباد (سندھ) ۔ ، شاہ جو رسالو ، ابیات اور وایوں کا مجموعہ آپ سے یادگار ہے ۔ آپ کا مزار مرجع خاص و عوام ہے ۔ سالانہ عرس نہایت دھوم دھام سے ہوتا ہے ۔

سچل سرمست[1] نے صوفیانہ جذبات سرشاری اور سرمستی کے ساتھ ادا کیے - یہ لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے - اسلام کے ظاہری اور باطنی جہاد سے واقف تھے - ان کے بعد صوفیانہ شاعری کا رنگ عام ہو گیا - عبدالقادر بیدل المعروف بہ قادر بخش بیدل سندھی کی ایک کتاب قلمی جو خود بیدل کے قلم سے لکھی ہوئی ہے اور جس کا نام 'پنج گنج' ہے ہماری نظر سے گذری ہے - اس کے تمام مسائل کتاب اور سنت کے عین مطابق ہیں - آیات اور احادیث کے ساتھ ساتھ اس میں رومی کے اشعار اور شاہ بھٹائی کے ابیات بھی نقل کیے گئے ہیں - دوسرے صوفی شاعر بیکس ، بچل شاہ اور خواجہ فرید مٹھن کوٹی تھے ان کا کلام بھی صوفیانہ ہے - بعض ہندو شعراء جو صوفیانہ شاعری میں شہرت رکھتے ہیں حسب ذیل ہیں پریسنگ ، جیون سنگ ، موھن فقیر ، صوفی آسو رام ، ایسر داس وغیرہ - ان میں سے موھن فقیر خالص صوفی شاعر تھا کیونکہ وہ شاہ نصیر نقشبندی کے زیر اثر رہا تھا - یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ ویدانت اور اسلامی تصوف یا توحید ایک نہیں ہے بلکہ ان میں سفید و سیاہ ، میٹھے اور کڑوے کا فرق ہے[2] -

تاریخ گوئی

اردو اور فارسی میں تاریخ گوئی معراج کمال تک پہنچی ہوئی تھی - اس فن میں بڑی بڑی صنّاعیاں نظر آتی ہیں - سندھی میں مرتضائی ، گدا ، قلیچ ، بلبل ، حکیم ، سائل وغیرہ نے تاریخی مصرعے نکالے ہیں اور بعض بعض تاریخی مصرعے نہایت بے تکلف بھی پائے جاتے ہیں -

قدرتی مناظر اور مخصوص عنوان

حافظ حامد ، میر عبدالحسین سانگی ، مرزا قلیچ بیگ ، شمس الدین بلبل کے کلام میں بھی مناظر قدرت اور خاص خاص عنوانات پر نظمیں ملتی ہیں -

پرانی روش کے شعراء

پنگل کی شاعری سندھ میں ورود اسلام کے بعد ہی سے شروع ہو گئی تھی اور کافی اور

آپ کا مزار دراز ، رانیپور ریاست خیر پور میں ہے - کافیوں کے علاوہ آپ کا ایک فارسی دیوان آشکارا کے نام سے شائع ہو چکا ہے - پورا دیوان صوفیانہ رنگ میں ہے - اس کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی فارسی مثنویاں آپ سے یادگار ہیں - مثلاً راز نامہ - گداز نامہ ، تار نامہ ، عشق نامہ ، مرغ نامہ ، رہبر نامہ ، وصلت نامہ وغیرہ -

٢- دیکھو " نقد اقبال " مؤلفہ مولوی محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی - اس کتاب میں مغربی فلفے اور قدیم فلسفے کا مقابلہ فلسفۂ توحید اسلامیہ سے کیا گیا ہے اور باہمی فرق دکھایا گیا ہے -

ابیات وغیرہ اس زبان میں داخل ہوگئے تھے - اس لیے قدیم روش کی شاعری یعنی کافی وغیرہ میں سندھی شعراء نے اپنی ذہانت اور طباعی کے کھل کر جوہر دکھائے ہیں - جذبات اور احساسات کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا - پنگل کی شاعری کی تقلید میں عورت کی طرف سے اظہارِ عشق کا طریقہ اپنایا گیا مگر سندھی ادب میں کلیۃً اپنے آپ کو پنگل کے حوالے نہیں کیا ، بلکہ سروں کا طریقہ ایجاد کر کے ایک نیا راستہ پیدا کر لیا - سر عمر مارئی وغیرہ سے اس کی نشان دہی ہوتی ہے - اس کی تفصیل ذیل میں سندھی شاعری کے کردار کے عنوان میں ملے گی -

سندھی شاعری کے خاص کردار

اس کا مفہوم یہ ہے کہ چند روایتیں ہیں جن کے گرد سندھی قدیم شاعری گھومتی ہے - یہ روایتیں اس قسم کی ہیں ، جن کی بنا پر سندھی شاعری ہندی ، اردو اور فارسی شاعری سے الگ اور ممتاز ہو جاتی ہے - یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سندھی شاعری کی روایت بھی ہندی شاعری کی طرح ہے ، یعنی عشق عورت کی طرف سے جتایا جاتا ہے مگر سندھی شاعری کی روایات کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چند کردار صنفِ نازک کے ہیں مثلاً سسی ، سہنی ، لیلا . مارئی نوری، مومل ، سورٹھ - یہ صنفِ نازک کی وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے اپنے محبوبوں کے لیے اپنی زندگیاں تج دیں اور عشق و محبت میں ایک مثال قائم کی - ان روایات کی بنا پر آج جو شاعر فراق یا وصال کے مضامین ادا کرے گا ، تو انہی ہستیوں میں سے کسی ایک کی زبان سے ادا کرے گا جو اس کے مخصوص محبوب کے متعلق ہوں گے - ان میں بعض کردار ایسے بھی ہیں جن کا محبوب مرد نہیں بلکہ ان کا وطن ہے - مثلاً مارئی - کرداروں کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ بعض ضمنی کردار بھی پائے جاتے ہیں مثلاً عمر مارئی کے بیان میں پھوگ یا سہنی میہار میں ٹم یا سسی پنوں میں ڈیر جو سسی کے دیور ہیں - یہ چند تلمیحات ایسی میں جو قدیم سندھی شاعری کی جان ہیں - اس سلسلے میں بعض تلمیحات بھی خاص ہیں : مثلاً عمر مارئی میں ملیر جو ایک گاؤں ہے یا سسی پنوں میں کیچ جو مکران کا ایک شہر تھا یا بھنبھور جو سسی کا وطن تھا - کانگ[1] یعنی کوّا ہندی شاعری کی طرح سندھی میں بوی اس کا نام آتا ہے اور سندھی شاعری کے بہت سے مضامین کوّے سے تعلق رکھتے ہیں ، اس پر چاند[2] کو قیاس کرنا چاہیے -

سندھی نثر

اس کی ابتدا تراجم سے ہوئی - نصابِ تعلیم کے ابتدائی درجوں کے لیے نثر کی کتابوں

۱- کانگا لین نکاس دورن یا پاس ان لے جانے پہلے درس دکھانے کے پاچھے لیجو کھانے -
۲- آج چند زما دوئج ہے جک چتوت سں چاند اور - میرے اور نند لال کے نین بھئے اک ٹھور -

کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ ۱۸۵۳ء کے بعد ہندی ، اردو ، فارسی ، عربی اور انگریزی کتابوں کے تراجم سے ہوا ۔ تراجم کی دوسری صورت مسجع اور مقفی عبارت سے ہوئی چونکہ 'بہار دانش' اس زمانے کی نصابی کتابوں میں داخل تھی ، اس لیے سندھی نثر میں اسی عبارت کا تتبع کیا گیا ۔ مگر سندھی زبان میں سادہ نگاری کا رواج بھی ہو چکا تھا[۱] ۔ جیسا کہ دوسری فصل سے ظاہر ہے ۔

کہانی ، قصے اور داستانیں

سندھی زبان میں بھی گھریلو کہانی قصے کافی نظر آتے ہیں ۔ ان کا سلسلہ ۱۸۵۳ء سے شروع ہوا اور یہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور قصے نصاب تعلیم کی کتابوں میں داخل ہوئے ، چنانچہ حکیم ایسپ کی کہانیاں ، بلی چوہے کا قصہ ، بھنبھے زمیندار کی کہانی سدھا توری اور کدھا توری کا قصہ وغیرہ ۔

اس کے بعد طویل داستانوں کے تراجم ملتے ہیں ، مثلاً 'قصہ حاتم طائی' کا ترجمہ ، 'باغ و بہار' یعنی قصہ چہار درویش اور الف لیلی کا ترجمہ ۔ قصہ بہرام گور[۲] (طبعزاد) 'فسانہ عجائب' کا ترجمہ 'گل خنداں' ، اس کی عبارت بھی فسانہ عجائب[۳] کی طرح مقفی ہے ۔ 'ونہین اور ولہے کی داستان' منشی ادھا رام میر چندانی نے تالیف کی ۔

ڈرامہ

سابق سندھ میں ڈرامے کا شوق بمبئی کی وکٹوریا تھیٹریکل کمپنی کے آنے کے بعد پیدا ہوا ۔ تماشہ دیکھنے اور خود ناٹک میں حصہ لینے کے شوق نے سندھی ادیبوں کو ڈرامہ نویسی کی طرف متوجہ کیا ۔

سندھی ڈرامہ نویسی کا پہلا دور ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۰ء تک کا ہے ۔ اس دور میں گجراتی ، سنسکرت ، ہندی ، اردو ، انگریزی اور دوسری زبانوں سے ڈرامے ترجمہ ہوئے ۔ مرزا قلیچ بیگ نے پہلا سندھی ڈرامہ لیلٰی مجنوں ۱۸۸۰ء میں لکھا مگر کلیات خادم کے

۱۔ ۱۸۴۳ء کے بعد نثر کی کتابوں کی جستجو کے سلسلے میں مرزا بدھل بیگ وزیر میراں تالپور کی دو ضخیم غیر مطبوعہ کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔ ایک کتاب مختلو للمہ ثلثی ۹۷۳ صفحات کی اور دوسری مجادلہ صفدری عرف حملہ حیدری دو حصوں میں ۲۰۶۱ صفحات کی ۔ مرحوم کی صاحبزادی اور داماد مرحوم کی تالیف غیر مطبوعہ کے مالک ہیں ۔ ان حضرات کے قبضے میں اور بھی بہت سی قلمی کتابوں کا قیمتی سرمایہ موجود ہے ، جس تک دسترس آسان نہیں ۔ (خلیل)

۲۔ دیکھو کلیات خادم کا دیباچہ ۔

۳۔ آخوند لطف اللہ حیدر آبادی ۔

دیباچے میں امام بخش خادم کے ڈرامے کا سال تصنیف ۱۸۷۹ء بیان کیا گیا ہے ، مگر چونکہ دیباچہ نگار خادم کا خلف الرشید ہے اس لیے سوئے ظن کا پہلو باقی ہے ۔ متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ ڈراما کا موجد مرزا قلیچ بیگ ہی ہے' ۔

۱۸۹۴ء تک صرف ڈرامے لکھے گئے مگر کوئی ڈراما کھیلا نہیں گیا ۔ اسی سال ڈاکٹر جیکسن اور پروفیسر پارشاہ پارسی کی کوششوں سے ڈی ۔ جے ۔ سندھ کالج امیچوئر ڈرامیٹک سوسائٹی وجود میں آئی اور ماسٹر جیٹھا لند بھریا والے کا لکھا ہوا ناٹک 'رمینتی' پہلی مرتبہ کھیلا گیا' ۔ اس کے بعد یہ سوسائٹی ہر سال کراچی اور حیدر آباد میں ناٹک کیا کرتی تھی اور ۱۸۹۶ء میں لیلا رام وطنمل کے دو سماجی ناٹک 'سوہن تار کا' اور 'سوجن رادھا' کھیلے گئے ۔

ناول

سندھی زبان میں ناول انگریزوں کے ملک پر تسلط کے بعد آیا ۔ اگرچہ کہانیوں اور قصوں کی کتابیں پہلے ہی سے موجود تھیں ۔ قلیچ بیگ نے ۱۸۸۷ء میں 'دلا رام' [۳] ناول لکھ کر سندھی زبان میں ناول نویسی کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۹۰ء میں 'زینت' نامی دوسرا ناول لکھا ۔ یہ دونوں طبعزاد تھے ۔

انشاء

کسی شخص کی خط و کتابت کو انشا کہتے ہیں ۔ سرکاری عہدوں کے عرائض ، تمسکات ، بیعنامے ، رہن نامے ، پٹے ، قبالے ، دوسری سرکاری تحریریں اور سوداگروں سے خط و کتابت بھی انشا میں شامل ہیں ۔

مشترکہ ہندوستان کے حصۂ شمالی کی طرح سندھ میں بھی پہلے مراسلات پارسی زبان میں ہوتی تھی ۔ باہمی خطوط ، شادی بیاہ کی تقریبات کے دعوت نامے اور اسی قسم کی دوسری ضرورتیں فارسی زبان ہی سے پوری ہوتی تھیں ۔ سندھی میں سب سے پہلی انشاء کی کتاب 'ہدایت الانشاء' ہے جو ہدایت اللہ مشتاق نے ۱۸۹۴ء میں لکھی ۔ دوسری کتاب 'انشائے خادمی' [۴] ہے جو امام بخش خادم نے ۱۸۹۵ء میں لکھی ۔ اصل کتاب فارسی میں ہے لیکن بین السطور سندھی ترجمہ بھی شامل ہے ۔

۱۔ کتاب ''سندھی ڈراما'' مؤلفہ میر محمد نظامانی ص ۲۷ ۔ سندھی '' ڈراما آئین ناول '' مؤلفہ محمد اسمعیل عرسانی ص ۱۱ ۔

۲۔ مضمون '' سندھی ناٹک جی اوسر '' مصنفہ پروفیسر سنگھا رام ملکانی ۔

۳۔ دیکھیے دیباچہ دلا رام مولفہ مرزاقلیچ بیگ ۔

۴۔ دیباچہ کلیات خادم ص ۶۴ ۔

جدید تعلیم

اس سے مراد انگریزی تعلیم ہے جو یونیورسٹیوں اور اس کے تحت کالجوں اور ا[illegible] منسلکہ مدارس سے تعلق رکھتی ہے - ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد سرسید نے مسلمانو[illegible] تعلیم کا ایک منصوبہ تیار کیا ہے اور ایم - اے - او کالج کی بنیاد ڈالی - سندھ میں ا[illegible] تعلیمی بیداری پیدا ہو چکی تھی اور ۱۸۶۰ء میں محکمہ تعلیم مستقل طور پر قائم ہو[illegible] تھا ، تاہم علی گڑھ تحریک کا اثر سندھ پر کافی پڑا اور ۱۸۸۴ء میں حسن علی آفندی انجمن محمدی قائم کی اور ۱۸۸۵ء میں سندھ مدرسۃالاسلام کی بنیاد ڈالی - اس طرح سندھ مسلمانوں کی تعلیم کا چرچا عام ہو گیا -

سندھ میں سب سے پہلا کالج ڈی - جے سندھ کالج ہے جو ۱۸۸۷ء میں قائم [illegible] اس جدید تحریک سے جو عوام کے نمائندوں اور مصلحین نے شروع کی تھی ، ملک و قو[illegible] بہت اچھا اثر پڑا اور باشندگان سندھ اس قابل ہو گئے کہ اپنے آپ کو تعلیم کے سانچے ڈھال سکیں -

انتظامِ اشاعت

سندھی زبان کی اشاعت و ترویج کے سلسلے میں دو نام قابل ذکر ہیں - م[illegible] ہریسنگ جس نے ۱۸۷۵ء بمقام سکھر اور ماسٹر پوکر داس نے ۱۸۸۹ء بمقام شکار[illegible] اپنے اپنے مطبع قائم کیے اور سندھ میں وہی فرائض ادا کیے جو منشی نول کشو[illegible] ہندوستان میں کیے تھے - ان لوگوں کے بہت بعد ویٹر ہومل کھئن مل نے لاڑکانے اشاعت کا کام شروع کیا -

پانچواں باب

فصل اول

نئی صدی کا ماحول

سیاسی اور سماجی تحریکات

سندھ کے علماء اور عوام کو انگریزوں سے نفرت تھی - اس لیے انگریزی تعلیم کی شروع میں مخالفت کی گئی - اس کے باوجود سرسید احمد کی تحریک سے متاثر ہو کر کراچی کے ایک بزرگ حسن علی آفندی نے نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی شاخ قائم کی اور ۱۸۸۵ء میں کراچی میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے سندھ مدرسۃ الاسلام کی بنیاد ڈالی - آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرس علی گڑھ کی توجہ سندھی مسلمانوں کی تعلیم کی طرف مبذول کرائی گئی - چنانچہ ۱۹۰۷ء میں کراچی میں مولانا حالی کی صدارت میں کانفرس کا اجلاس منعقد ہوا - اس اجلاس میں اور تجاویز کے ساتھ وہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ سندھ کے مسلمان زمینداروں سے مال گذاری پر ایک پیسہ فی روپیہ ٹیکس وصول کیا جائے - اس کے بعد ایک اور اجلاس ۱۹۱۹ء میں خیر پور میرس میں ہوا - کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں کے اجلاس کراچی میں منعقد ہوتے رہے - سندھ میں مسلم لیگ ۱۹۲۷ء میں قائم ہوئی - اس کے علاوہ ترکی کی حمایت میں بھی سندھ کے مسلمان شروع ہی سے بہت مستعد تھے - ۱۹۱۰ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا - جب سندھ کے مسلمانوں نے ترکی کے مسلمانوں پر اٹلی کے مظالم کی داستانیں سنیں تو اٹلی سے نفرت کرنے لگے - اٹلی کی ٹوپیاں جلا دی گئیں اور ترکی ٹوپیوں کا رواج عام ہو گیا - پہلی جنگِ عظیم میں برطانیہ اور ترکی دشمن تھے - اس لیے سندھ کے مسلمان انگریزوں سے اور بھی نفرت کرنے لگے - سندھی شعراء نے اپنے ان جذبات کا اظہار کیا- ان شعراء میں حضرت مولانا تاج محمود امروٹی ، حبیب اللہ خادم شکار پوری ، محمد آدم ، محمد ہاشم مخلص ، نور محمد لظامانی اور حکیم فتح محمد سیوہانی قابلِ ذکر ہیں - محمد آدم گڑھی یاسین ، (۱۸۶۳ء - ۱۹۴۸ء) ، مولانا تاج محمود امروٹی (م - ۱۹۲۹ء) اور خادم شکار پوری جیسے بزرگ یونانیوں کے لیے بد دعا اور ترکوں کی کامیابی کے لیے دعا بھی کرتے رہے -

محمد ہاشم مخلص تو نظم اور نثر کے ذریعہ برطانوی سامراج کے خلاف نفرت کا اظہار اور اسلام اور مسلمانوں کی ہمیشہ مدح سرائی کرتے رہتے ۔

۱۹۲۳ء میں محمد ہاشم مخلص مرحوم نے میر پور خاص سے ہفت روزہ 'مسلمان' جاری کیا جس میں ترکی کے حق میں اور انگریزوں کے خلاف زور شور سے لکھا جانے لگا ۔ اس سے ان کو بہت تکالیف پہنچی ۔ اس دور میں ہندو مسلم کشیدگی پیدا ہوئی اور ہندو اپنی مسلم دشمنی کی بنا پر کھل کر سامنے آئے ۔ انہوں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں جس سے ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے جس کا اثر سندھ میں بھی ہوا مگر اس سے سندھ کے مسلمان متحد ہو گئے اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے 'سندھ محمڈن ایسو سی ایشن' کا قیام عمل میں آیا ۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کے خلاف کتابیں لکھنا شروع کیں ۔ اس دور کے مسلم اخبارات اور خصوصاً 'الوحید' نے مسلمانوں کے حق میں لکھا ۔ البتہ اس دور کے ہندو اخبارات 'ہندو سنسار' ، 'سماچار' ، 'ہندو گزٹ' ، 'سندھی' اور 'بھارت' نے اپنے قلم کا زور مسلم دشمنی پر صرف کیا ۔

تحریکِ خلافت کے علاوہ خاکسار اور احرار تحریکیں شروع ہوئیں ۔ ۱۹۰۸ء میں سندھ کو الگ صوبہ بنانے کی تحریک شروع ہوئی اور ۱۹۳۶ء میں سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کیا گیا ۔ ان دنوں سوشلسٹ نظام کا اثر بھی کچھ لوگوں نے قبول کیا جس کے نتیجہ میں 'ہاری تحریک' کا ظہور ہوا، جس کی روحِ رواں کامریڈ عبدالقادر تھے ۔ حیدر بخش جتوئی نے بھی اس میں حصہ لیا ۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵ء) کی رو سے (۱۹۳۶ء) میں الیکشن کی سرگرمیاں شروع ہوئیں ۔ ۷ فروری ۱۹۳۷ء کو الیکشن ہوا ۔ پہلے سر غلام حسین وزیرِ اعظم ہوئے اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں اللہ بخش سومرو و محمد امین کھوسو وزیرِ اعظم ہوگئے ۔ اپریل یا مئی ۱۹۳۸ء میں سندھ کی صوبائی مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اور جلد ہی سندھ کے مختلف شہروں میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی گئیں اور جلسے ہونے لگے ۔ ۱۰، ۱۱، ۱۲ اکتوبر کو کراچی میں مسلم لیگ کی ایک اہم کانفرنس ہوئی جس میں متحدہ ہندوستان کے تمام مسلم لیڈرز شریک ہوئے اور قائداعظم نے صدارت کی ۔ یہ کراچی کانفرنس کے نام سے مشہور ہے ۔ اس کانفرنس میں شیخ عبدالمجید سندھی نے ایک قرار داد پیش کی جس میں واضح طور پر مطالبہ کیا گیا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں مسلمانوں کی الگ حکومت بنائی جائے ۔ تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں یہ قرار داد لاہور ریزولیوشن سے سوا سال پہلے ہے اور اس میں پاکستان کا واضح مطالبہ ہے ۔

ہندو مسلم فسادات کے سلسلہ میں سب سے بڑا واقعہ ۱۹۳۹ء میں ہوا جو سکھر

کی مسجد منزل گاہ کی واگذاری کے سلسلہ میں تھا ۔ جس پر ہزاروں مسلمانوں نے زبردستی قبضہ کیا ۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم ہوئی ۔ کراچی کو پاکستان کا دارالخلافہ بنایا گیا ۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں کراچی میں سندھ یونیورسٹی قائم ہوئی ، جو بعد میں ۱۹۵۱ء میں حیدر آباد منتقل کی گئی ۔

انیسویں صدی کے آغاز کے شعراء

شمس الدین بلبل (۱۸۵۷ء - ۱۹۱۹ء)

شاعر ، ادیب اور صحافی تھے ۔ ۱۸۵۷ء میں مٹیہر ضلع دادو میں تولد ہوئے اور ۱۹۱۹ء میں وفات پائی ۔ نظم و نثر میں تقریباً بیس (۲۰) کتابیں لکھیں ۔ ظریفانہ انداز میں معاشرہ کی تصویر پیش کرتے تھے ۔ ان کو نظم اور نثر میں جدید اسلوب اور نئے رجحانات کا بانی کہا جاتا ہے ۔ انہوں نے اپنا زورِ قلم اس پر صرف کیا کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کریں اور فرسودہ رسومات کو ترک کریں ۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے لوگوں کو مغربی تہذیب کے نقصانات سے بھی آگاہ کیا ۔

آخوند حاجی فقیر محمد عاجز حیدر آبادی (۱۸۴۶ء - ۱۹۱۸ء)

۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۸ء میں وفات پائی ۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے ۔ شاعر بھی تھے اور انشا پرداز بھی ۔ ان کا ایک دیوان ، مثنوی اور نثر میں ایک طبعزاد داستان 'گلشنِ بہار' یاد گار ہے ۔ یہ اخلاق اقدار پر زور دیتے ہیں ۔

میر علی نواز علوی (۱۸۵۱ء - ۱۹۲۰ء)

شکار پور میں ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۰ء میں فوت ہوئے ۔ نثر میں ان کی اکثر تصانیف عربی اور فارسی زبانوں میں ہیں ۔ سندھی میں آپ نے ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے ۔ آپ کی شاعری بیشتر داخلی ہے لیکن ملکی حالات کا اثر بھی ان کے کلام میں نمایاں ہے ۔ کبھی کبھی حالات سے متاثر ہو کر دل شکستہ ہو جاتے ہیں ، لیکن قنوطیت کا شکار نہیں ہوتے تھے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے نئے دور کے منتظر تھے ۔

میر علی نواز ناز (۱۸۸۴ء - ۱۹۳۵ء)

ریاست خیر پور کے والی ہز ہائینس میر علی نواز ناز (۱۸۸۴ء - ۱۹۳۵ ء) ۱۹۲۱ء میں اپنے والد میر امام بخش کی وفات کے بعد ریاست کے والی بنے - آپ کے زمانہ میں ریاست نے ترقی کی - علم دوست ، سخی ، فقیر منش اور شاعر تھے - سندھی ، اردو اور سرائیکی میں شعر کہتے - زیادہ تر آپ کا کلام داخلی ہے ، جس میں ہجر و فراق کی تصویر ملتی ہے - اس کے ساتھ تصوّف کا رنگ بھی ہے -

مولانا عبدالغفور ہمایونی (۱۸۴۴ء - ۱۹۱۳ء)

آپ کی ولادت ہمایوں تحصیل شکار پور میں ۱۸۴۴ء میں ہوئی اور آپ نے ۱۹۱۳ء میں وفات پائی - آپ کو منقولات ، معقولات اور فقہ کے تمام علوم و فنون پر عبور حاصل تھا - سندھ اور بلوچستان کے مفتی تھے - آپ کے فتوے 'فتاوئ ہمایونی' کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں - اس کے علاوہ آپ سندھی ، فارسی اور سرائیکی کے شاعر بھی تھے - آپ نے زیادہ تر غزلیں ، کافی کی ہیئت میں لکھی ہیں ایک غزل 'لما' کافی بہت مقبول ہوئی - بہت سے شعراء نے اس کے تتبع کی کوشش کی -

مولانا محمد عثمان نورنگ زادہ (م - ۱۹۱۸ء)

بڑے عالم تھے - 'کھور واہ' تحصیل گونی ، ضلع حیدر آباد میں آپ کی رہائش تھی - آپ نے سندھی مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی - 'سندھ مدرسہ کراچی' کے اہم رکن اور مدرس بھی تھے - سندھی اور فارسی میں آپ کی بہت سی تصانیف ہیں ، جن میں سے سندھی میں قرآن شریف کی تفسیر 'تنویرالایمان' ایک شاہکار ہے -

یہ تفسیر الگ الگ پاروں کی صورت میں ہے - ۱۹۱۸ء میں آپکی وفات ہوئی - اس وقت تک آپ نے ۲۵ پاروں کی تفسیر مکمل کی تھی - باقی حصہ آپ کے فرزند مولوی محمد نورنگ زادہ نے مکمل کیا - شاعر بھی تھے - خاص طور پر آپ نے خطبے لکھے ہیں جو سندھ میں مشہور ہیں - آپ کا شعر سادہ لیکن پر اثر ہے -

پیر رشداللہ شاہ صاحب‌العلم رابع (۱۸۶۰ء - ۱۹۲۲ء)

درگاہ پیر جھنڈو کے سجادہ نشین ، عالم اور تحریکِ خلافت کے سر گرم رکن تھے- خلافت کی وجہ سے آپ کو 'خلافت دھنی' کہا جاتا ہے - مولانا عبیداللہ سندھی آپ

کے استاد تھے - پیرو جھنڈو میں ان کے قائم کیے ہوئے مدرسہ کو آپ نے وسیع پیمانہ پر چلایا اور اس کا نام 'دارالرشاد' رکھا - آپ کو مطالعہ اور کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا - اس لیے آپ کی لائبریری میں نایاب اور قیمتی کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا - ۱۸۶۰ء میں آپ کی ولادت اور ۱۹۲۲ء میں وفات ہوئی - آپ نے فارسی اور سندھی میں چند کتابیں تصنیف اور تالیف بھی کیں - سندھی اور فارسی کے شاعر بھی تھے - شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے - آپ کے کلام میں تصوّف کے ساتھ ایک پیغام غفلت کو ترک کرنا اور مسلسل جستجو میں رہنا بھی ہے -

شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ (۱۸۵۳ء - ۱۹۲۹ء)

سندھی زبان و ادب کے عظیم محسن اور نثر و نظم کی لا تعداد کتابوں کے مصنف حیدر آباد کے قریب 'ٹنڈو ٹھوڑہو' میں ۱۸۵۳ء میں تولد ہوئے - ۱۹۱۰ء میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور ۱۹۲۹ء میں فوت ہوئے - نثر میں ناول ، ڈرامہ ، افسانہ جیسی اصناف میں آپ نے کئی کتابیں لکھیں اور ترجمے کیں اس کے علاوہ تاریخ ، فلسفہ ، نفسیات ، طبیعات ، حیوانات ، زراعت وغیرہ پر بھی مفید کتابیں لکھیں اور ترجمہ کیں - صوفیانہ خیالات سے متاثر تھے ، لیکن سماجی اصلاح کی طرف ان کی خاص توجہ تھی - سندھ کے مسلمان تعلیمی ، اقتصادی اور سیاسی نقطۂ نگاہ سے بہت پیچھے تھے - اس لیے آپ نے اپنی ہر تصنیف میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ سندھ کے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف رغبت ہو اور وہ اپنی اقتصادی اور اخلاقی حالت بہتر بنانے کی کوشش کریں - لڑکیوں کی تعلیم کی طرف بھی آپ نے زور دیا - نہ صرف ان کی نظم اور غزل بلکہ ڈراموں ، افسانوں ، ناولوں اور دیگر مضامین میں شہرت کا شعور پیدا کرنے کا مقصد کار فرما ہے - یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں زیادہ تر مسلسل ہیں اور ان میں تغزل بہت کم رہ گیا ہے -

ڈرامہ نویسی میں آپ کو اولیت کا شرف حاصل ہے آپ کا ڈرامہ 'لیلیٰ مجنوں' سندھی زبان کا پہلا مکمل ڈرامہ ہے جو مرزا قلیچ بیگ نے ۱۸۸۰ء میں لکھا - طبعزاد ڈراموں اور ناولوں کے علاوہ آپ نے بہت سے انگریزی اور ہندی سے ترجمے بھی کیے - آپ کے طبعزاد ناول 'زینت' کو سندھی ادب میں شاہکار کی حیثیت حاصل ہے - اس معاشرتی ناول میں عورتوں کو تعلیم کی ترغیب دی گئی ہے -

ان شعراء کے علاوہ رمضان واڈہو ، سید رکھیل شاہ ، منٹھار فقیر ، اور بڈھڑو فقیر وغیرہ نے بھی سخن طرازی میں نام پیدا کیا -

شاعری

نثر کے ساتھ شاعری نے بھی ترقی کی ۔ قدیم سندھی شاعری پر بھی طبع آزمائی ہوتی رہی اور علم عروض کی شاعری نے بڑی رواج پایا ۔ مضمون کے لحاظ سے سندھی شاعر حسن و عشق تک محدود نہیں رہے ، بلکہ انہوں نے شعر میں معاشی اور معاشرتی حالات کی عکاسی بھی کی اور شعر سے قوم کو بیدار کرنے کا کام بھی لیا ۔ ۱۹۰۵ء میں تحریک آزادی کے سلسلے میں سودیشی تحریک شروع ہوئی ۔ سندھی شاعروں نے انگریزی حکومت سے نفرت کا اظہار کیا اور قوم کو جدوجہد آزادی میں لڑنے کے لیے ابھارا ۔ حیدر بخش جتوئی نے ان ہندوستانیوں کے لیے طنزیہ نوع میں لکھا ہے ، جو انگریزوں کو اپنا آقا سمجھتے تھے ۔

"ہندیو ! اپنا جسم ، جان اور دولت جلد ہی ان کے حوالے کر دو ، جنہوں نے قوم کی آزادی کی ہر آواز کو دبا دیا ہے"۔

ریشمی رومال تحریک کے کارکن ، خلافت اور ہجرت تحریک کے ممتاز رکن مولانا تاج محمود امروٹی (م ۔ ۱۹۲۹ء) نے تحریک خلافت کے زمانہ میں بہت سی قومی نظمیں کہیں جن میں آپ انگریزوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں ترکان اور احرار کی فتح کی دعا کرتے ہیں ۔ آپ نے انگریزوں کی ضمیر فروشی ، حود غرضی ، لالچ ، ظلم اور جبر کے واقعات مؤثر انداز میں بیان کیے ہیں اور چھوٹی سی مثنوی 'یوسف زلیخا' لکھی جو بہت مقبول ہوئی ۔ اس کی زبان سلیس اور دلکش ہے ۔ محمد آدم اور دوسرے شاعروں نے بھی اسی قسم کے اشعار کہے ۔

محمد ہاشم مخلص مرحوم (۱۸۶۰ء - ۱۹۳۴ء) باکمال صحافی اور بلند پایہ شاعر تھے ۔ اکثر طنز و مزاح کے رنگ میں لکھتے تھے آپ نے تحریک خلافت میں حصہ لیا اور برطانوی سامراج سے اعلانیہ نظم اور نثر میں نفرت کا اظہار کرتے رہے ۔ اس کے علاوہ ہندو سیاست ، ہندو لیڈروں اور ہندو سماج پر بھی نظم اور نثر میں تنقیدیں کیں ۔

نور محمد نظامانی مرحوم بھی ، مخلص مرحوم کی طرح نظم اور نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے ۔ عظیم طنز نگار اور ہجوگو تھے ۔ خاص طور پر آپ نے اپنی صلاحیتیں آریہ سماجی ہندوؤں کی شرارت کے خلاف استعمال کیں ۔

زمینداروں کے مظالم نے بھی شاعری کو نئے موضوع دیے اور 'ہاری' ادب کا موضوع بن گئے ۔ شعراء اپنے کلام میں اس کی ترجمانی کرنے لگے اور اس کی کسمپرسی

کا حال بیان کر کے اس سے ہمدردی کا اظہار کرنے لگے ۔ اس سلسلہ میں حیدر بخش جتوئی نے بڑی پر اثر نظمیں لکھی ہیں ۔

قدیم نوع کی شاعری

قدیم نوع کی شاعری پر بھی بہت سے شاعروں نے شعر کہے ۔ ان میں سے مولوی ثناء اللہ ثنائی ، غم دل ، ساون فقیر ، راضی فقیر ، رکھیل شاہ ، محمد فقیر کھٹیاں ، صالح شاہ اور روشن الدین روشن کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔ ثنائی نے مولود ، مناجاتیں ، مدحیں ، خطبے ، مناظرے اور منظوم تاریخی واقعات لکھے ہیں ۔ غم دل نے بڑی اچھی کافیاں کہی ہیں ۔ ساون فقیر (۱۸۷۳ء - ۱۹۳۸ء) نے لڑکے طویل ابیات کہے ہیں ۔ راضی فقیر نے نظم اور نثر کے امتزاج سے اپنے افکار بیان کیے ہیں ۔ محمد فقیر کھٹیاں (۱۸۵۲ء - ۱۹۰۷ء) نے کافیوں اور ڈوھیڑوں میں تصوّف کے مسائل بیان کیے ہیں ۔ صالح شاہ (۱۸۷۰ء - ۱۹۴۳ء) ، رکھیل شاہ (۱۸۸۱ء - ۱۹۴۰ء) اور روشن الدین روشن (۱۹۰۵ء - ۱۹۵۰ء) نے صوفیانہ رنگ میں ڈوھیڑے اور کافیاں کہیں ۔

اس دور میں غزل کے بھی بلند پایہ شاعر گذرے ہیں جن میں سے بیشتر نے نظم میں بھی کمال حاصل کیا ۔ مولانا محمد عاقل عاقلی (م - ۱۹۴۱ء) ، نیاز لاڑکانوی (۱۸۹۲ء - ۱۹۵۶ء) ، حاجی محمود خادم لاڑکانوی (۱۸۹۵ء - ۱۹۶۰ء) ، مولانا محمد ابراہیم صاحب (۱۸۸۹ء - ۱۹۶۲ء) ، غلام سرور فقیر لاڑکانوی ، علی اصغر شاہ ، علی راشدی (۱۸۶۱ء - ۱۹۳۵ء) ، مولانا بہاءالدین بہائی (پ - ۱۸۲۳ء) ، آغا غلام نبی المعروف بہ آغا صوفی (۱۸۸۹ء - ۱۹۳۸ء) ، شیخ مراد علی کاظم (۱۹۰۲ء - ۱۹۵۲ء) ، غلام علی مسرور بدوی (۱۸۹۶ء - ۱۹۵۳ء) ، غلام عباس جوش لاڑکانوی (۱۹۰۴ء - ۱۹۶۲ء) ، محمد بخش واصف حیدر آبادی (۱۸۹۲ء - ۱۹۵۲ء) وغیرہ ۔

ضیاء الدین بلبل (۱۹۱۰ء - ۱۹۶۶ء) ، ہدایت علی تارک (۱۸۶۰ء - ۱۹۴۳ء) ، حافظ عبداللہ بسمل تکھرائی ۱۸۸۸ء - ۱۹۵۰ء) ، قادر بخش بشیر (۱۸۹۶ء - ۱۹۵۴ء) ، لطف اللہ بدوی (۱۹۰۴ء - ۱۹۶۸ء) اور مولوی احمد اصلاح (۱۸۹۴ء - ۱۹۶۹ء) انہوں نے قرآن شریف کا مکمل منظوم ترجمہ ڈوھڑوں میں کیا ان میں سے بعض نظم کے بھی بہت اچھے شاعر تھے ۔ مثلاً مولانا محمد ابراہیم صاحب ، آغا صوفی ، محمد صدیق مسافر ، غلام علی مسرور ، ضیاء الدین بلبل ، ہدایت علی ، بسمل تکھڑائی ، بشیر ، لطف اللہ بدوی اور مولوی احمد ملاح ۔ آغا صوفی مرحوم اور مولوی احمد ملاح نے تو ڈوھیڑے اور کافیاں بھی کہی ہیں ۔

غلام محمد نظامی مرحوم (پ - ۱۸۹۵ء) نے حسن و عشق کے قدیم رنگ کو ترک کر کے قومی شاعری اختیار کی ۔ یہی پہلے سندھی شاعر ہیں جنہوں نے سب سے زیادہ قومی شعر کہے ہیں ۔ آپ کو اقبال کے اشعار سے محبت تھی ۔ اس کا تتبع کرنے کی کوشش اور ترجمے بھی کیے ہیں ۔ 'تعمیرِ پاکستان' اور 'پاکستانی مسلمان' آپ کی اچھی قومی نظمیں ہیں ۔ آپ کے کلام کے دو مجموعے 'بیاض نظامی' اور 'ریاض نظامی' شائع ہو چکے ہیں ۔

افسانوی ادب

افسانوی ادب کا آغاز تو ۱۸۵۴ء میں ہوا تھا ، لیکن شروع میں لوک کہانیاں اور داستانوں کا رواج تھا ۔ ان میں تقدیر کو تدبیر پر غالب دکھایا گیا ہے ۔ ان داستانوں میں مافوق الفطرت واقعات ، عشق اور حسن کا ذکر اور جانبازی کے قصے آئے ہیں بعد میں جب انگریزی ناول 'ریسلاس' اور انگریزی ڈراموں کے تراجم شائع ہوئے تو رجحان بدل گیا یہ دکھایا جانے لگا کہ انسان اپنی کوشش سے اپنی زندگی بہتر بنا سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ سماجی ، اخلاق اور سیاسی ناولیں بھی لکھی جانے لگیں ۔

مختصر افسانہ

اس صنف کے لیے یہ ابتدائی دور تھا ۔ اس زمانہ میں جو مختصر کہانیاں لکھی گئیں ، وہ سماجی اور معاشرتی خرابیوں کے متعلق اصلاحی کہانیاں تھیں ۔ سب سے پہلے کوڑو مل نے اس قسم کی کہانیوں کا آغاز کیا ۔ اس نے بنگالی افسانہ نویس بنکم چندر چیٹرجی کے سماجی افسانے ترجمہ کیے ۔ ۱۹۱۴ء میں سندھی ساہت سوسائٹی کے رسالے شائع ہونے شروع ہوئے ۔ جن میں مختصر افسانے بھی آنے لگے ۔ ان افسانوں کے ذریعے افسانہ نویسوں نے صحیح سماجی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی اور معاشرتی خرابیوں کو بھی نمایاں کر کے دکھایا ، مثلاً عورت کی مظلومیت ، بغیر مرضی کے شادی بچپن کی شادی ، ایک سے زیادہ شادیاں ، فرسودہ رسمیں اور روایتیں وغیرہ ۔

لال چندر امرڈنومل کا افسانہ 'کشنئی جاکشٹ' ایک درد ناک افسانہ ہے جس میں سندھی گھریلو زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس قسم کے دوسرے افسانے بھی لکھے ۔ مثلاً 'ڈکھن ڈدھی زندگی' 'نندڑی نینا' وغیرہ ۔ ۱۹۲۳ء میں جیٹھمل پرسرام کے افسانے 'چھڑا ہوشی جون آ کھانیوں' کے نام سے شائع ہوئے ۔ ان میں بھی سماجی خامیوں کا باریک بینی سے تجزیہ کیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ سندھی سرمایہ داروں اور زمینداروں کے گناہوں کو بھی ظاہر کیا گیا ۔

اسی زمانہ میں ایک ماہوار پرچہ 'علمی دنیا' نکلتا تھا ، جس میں مسلمان ادیبوں نے ہندو افسانہ نگاروں سے متاثر ہو کر ہندوستان کے ہندوؤں کے مسائل پر زیادہ لکھا ۔ اس پرچے میں عبداللہ کے افسانے شائع ہوتے تھے ۔ مرزا نادر بیگ عبد نوآبادی (پ - ۱۹۰۰ء) کے افسانے زیادہ تر ماہنامہ 'علمی دنیا' اور 'سندھو' میں شائع ہوتے تھے ۔ ان کے افسانے زیادہ تر اخلاقی مسائل کے متعلق ہیں ۔ 'ماستریانی' ان کے افسانوں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے ۔ رومانوی افسانوں میں سے 'اتفاق' قابلِ ذکر ہے ۔

اسی زمانہ میں لطف اللہ بدوی مرحوم کے افسانے بھی ماہنامہ 'سندھو' میں شائع ہوتے تھے ۔ ان کے افسانوں میں 'غربت' اور 'خوفناک بدلی' کو امتیاز حاصل ہے ۔

ڈرامہ

ناول کی طرح ڈرامہ نویسی میں بھی مرزا قلیچ بیگ مرحوم کو اولیت کا شرف حاصل ہے ۔ آپ کا ڈرامہ 'لیلیٰ مجنوں' سندھی زبان کا پہلا مکمل ڈرامہ ہے جو آپ نے ۱۸۸۰ء میں لکھا ۔ اس کے بعد بہت سے ڈرامے لکھے گئے اور ترجمہ ہوئے ۔ مرزا قلیچ بیگ مرحوم نے بھی بہت سے ڈرامے لکھے اور ترجمہ کیے ۔ اس کے علاوہ ہندو ادیبوں نے معاشرتی ، قومی اور انقلابی ڈرامے لکھے اور ترجمہ کیے ۔

ڈرامہ کی ترقی اور ترویج کے لیے ۱۹۲۳ء میں حیدر آباد سندھ میں 'لٹریری ڈرمیٹک کلب' کا قیام ہوا ۔ اس کلب کا اصول یہ تھا کہ ڈرامہ سندھ کے معاشی اور معاشرتی حالات کے مطابق لکھا جائے اور اس میں معاشرتی اور سماجی نقائص کی مذمت کی جائے ۔ اس اصول کے مطابق بہت سے ڈرامے لکھے گئے ۔ خاص طور پر خالچند دریانی کے ترجمہ کیے ہوئے ڈرامے 'ملک جا مدبر' دیش صدق' 'انسان یا شیطان' 'غلط فہمی' اور طبعزاد ڈرامے 'رتنا' 'زمینداری' 'ظلم' ، 'زمانے جی اہر' اور 'بکھ جو شکار' قابلِ ذکر ہیں ۔ مسلمان ادیبوں میں ، مرزا قلیچ بیگ کے بعد احمد چاگلا نے قابلِ ذکر ڈرامے لکھے اور ترجمہ کیے ۔

آغا غلام نبی صوفی مرحوم نے بھی چند ڈرامے لکھے جن میں سے 'دنیا دو رنگی' 'عرف عشق نیرنگی' معیاری ڈرامہ ہے ۔ ان کے علاوہ عثمان علی انصاری ، محمد عثمان ڈیپلائی اور محمد اسماعیل عرسانی کے نام بھی بلند پایہ اور پرانے ڈرامہ نویسوں میں آتے ہیں ۔ محمد اسماعیل عرسانی کا ڈرامہ 'بدنصیب تھری' (۱۹۳۹ء) شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے ، جس میں سندھ کے ریگستانی علاقہ تھر کی تہذیب و تمدن اور معاشی اور معاشرتی حالات کی عکاسی حقیقت پر کی گئی ہے ۔

ناول

۱۹۰۱ء سے کراچی سے ہندو سماجی ناول شائع ہونے شروع ہو گئے تھے - وہ زیادہ تر ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے تراجم تھے -

سب سے پہلے صحیح قسم کا معاشرتی ناول مرزا قلیچ بیگ مرحوم نے ۱۸۹۰ء میں 'زینت' نامی لکھا تھا - شاہانی نے ایک انگریزی ناول سے متاثر ہو کر ایک سماجی ناول 'بلوکھوکھر' لکھا جو ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا - اس میں مسلمان معاشرہ کی تصویر کشی کی گئی ہے - اور سندھ کی دیہاتی زندگی کی صحیح عکاسی کی گئی ہے -

۱۹۱۵ء میں ڈاکٹر گربخشانی کا طبعزاد تاریخی ناول 'نور جہاں' شائع ہوا جو نور جہاں اور جہانگیر کے رومان کے متعلق ہے - تاریخی ناولوں کے سلسلہ میں فاتح سندھ محمد بن قاسم پر حکیم عبدالخالق خلیق مورائی کا تاریخی ناول 'سندری' شائع ہوا ، جو زبان و بیان اور فن کے لحاظ سے شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے - ان کے علاوہ اور بھی بہت سے تاریخی ناول لکھے گئے - ۱۹۱۵ء سے جاسوسی ناولوں کا سیلاب شروع ہو گیا -

۱۹۲۳ء سے تحریک آزادی کے جذبہ سے متاثر ہو کر سیاسی اور انقلابی نوعیت کے ناول بھی لکھے جانے لگے - مسلمانوں نے تاریخی ناولوں کے ترجمے بھی کیے اور طبعزاد ناولیں بھی لکھیں - تاریخی ناولوں کے سلسلہ میں 'سندری' کے علاوہ 'حور دمشق' 'خنجر ہلال' 'منصور موہنا' 'در یتیم 'جڑ تو شہزادو' وغیرہ شائع ہوئے- ۱۹۳۱ء میں عبدالرزاق کا طبعزاد ناول 'جہاں آرا' شائع ہوا -

جدید تحقیق کا آغاز

اس دور میں جدید طرز پر تحقیق کا آغاز ہوا اور کلاسیکل شعراء کے کلام پر سائنٹیفک انداز اور جدید تقاضوں کے مطابق کام ہوا - اس قسم کی قابل ذکر کتابیں یہ ہیں :

'شاہ جو رسالو' مرتب ڈاکٹر گربخشانی - اس کی پہلی جلد ۱۹۳۱ء میں ، دوسری ۱۹۳۲ء میں اور تیسری ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی - آخری جلد شائع نہ ہو سکی - 'رسالہ سچل سرمست' از آغا غلام نبی صوفی -

'شاہ کریم جو رسالو' (۱۹۳۷ء) مرتب ڈاکٹر عمر بن محمود داؤد پوتہ- تاریخ سندھ پر تحقیقی کام کرنے کے لیے '' سندھ ہسٹاریکل سوسائٹی '' کا قیام عمل میں آیا اور اس کی طرف سے انگریزی میں ایک رسالہ 'سندھ ہسٹاریکل جرنل' جاری ہوا - اس میں تاریخ سندھ پر تحقیقی مقالے شائع ہوئے - ان کے علاوہ سندھی میں بھی اخباروں اور رسالوں میں

تاریخی تحقیقی مقالات شائع ہوتے رہے - جن کے مصنفین مذکورہ بالا ہی تھے -

تاریخی مضامین کے علاوہ تاریخی کتابیں بھی شائع ہوئیں - حکیم فتح محمد سیوہانی کی کتابیں 'میرن جی صاحبی'، 'احوال لعل شہباز قلندر'، 'الفضل'، 'فیضی' اور 'حیات النبی' شائع ہوئیں - شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ مرحوم کی کتابیں 'تاریخ خیر پور' 'قدیم سندھ انجا شہر ماڑھون' ، 'سندھ جاستارا' 'چچ نامہ' اور 'شاہ نامے واراشاہ' شائع ہوئیں -

نثر نویس : اس دور نے بہت سے بلند پایہ مسلمان نثر نویس پیدا کیے - جن میں سے مندرجہ ذیل کے نام قابل ذکر ہیں :

خلیق موراٹی ، دین محمد وفائی حکیم فتح محمد سیوہانی ، محمد صدیق میمن ، محمد صدیق مسافر علی محمد راشدی اور داؤد پوتہ - ان میں اکثر و بیشتر شاعر ، ادیب اور مؤرخ تھے ، خلیق موراٹی نے تاریخی ناولیں اور تاریخی کتابیں لکھیں مثلاً 'تاریخ تعمیر کعبہ'، 'سندری' اور 'آخری رسول' مشہور ہیں - دین محمد وفائی 'الوحید' کے ایڈیٹر بھی رہے - ان کی کتابوں میں لطف اللطیف، 'اور شاہ جی رسالے جو مطالعو' معیاری کتابیں - حکیم فتح محمد سیوہانی کی کتابوں میں 'میرن جی صاجی' 'حیات النبی' مشہور ہیں - محمد صدیق میمن کا بڑا کارنامہ سندھی ادبی تاریخ ہے - ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ تعلیمی ماہر ادیب ، نقاد محقق اور مؤرخ تھے - ان کی کتابوں میں 'شاہ کریم جو کلام' 'ابیات سندھی' اور 'کلام گروڑی' قابل ذکر ہے -

★ ★ ★

فصل دوم

(۱۹۳۷ء - ۱۹۴۷ء)

(الف) ادبی انجمن

۱۹۳۹ء میں حاجی محمود خادم مرحوم کی کوششوں سے 'سندھی سدھار' سوسائٹی قائم کی گئی - جس کے زیر اہتمام ۱۹۴۳ء میں لاڑکانہ میں سندھی ادبی کانفرنس منعقد کی گئی - جس کی صدارت محمد صدیق میمن نے کی - اس کو پانچویں ادبی کانفرنس کہا گیا - ۱۹۴۵ء میں ٹھٹھہ میں چھٹی ادبی کانفرنس اور ۱۹۴۶ء میں لاڑکانہ میں ساتویں ادبی

کانفرنس علامہ داؤد پوتہ کی صدارت میں منعقد ہوئی ۔ اس موقع پر " جمیعۃ الشعراء سندھ" کے نام سے پورے سندھ کے غزل گو شعراء کی انجمن قائم ہوئی ۔ اس کے بعد ہر سال بعد ادبی کانفرنسیں سندھ کے مختلف شہروں میں "جمیعۃ الشعراء سندھ" کے زیر اہتمام ہوتی رہیں ۔ ان میں بعض ہندو ادیبوں نے بھی حصہ لیا ۔ اس کے علاوہ سندھ کے مختلف شہروں میں ادبی انجمنیں قائم ہوئیں جو مشاعرے اور ادبی نشستیں منعقد کرنے لگیں ۔

ادبی کارنامے

قومی رہنماؤں کی کج کردادی ، الیکشن اور انتخابات میں غلط کاریوں سے شعراء متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنی شاعری کا رخ اس طرف موڑ دیا ۔ طنزیہ نظمیں لکھی گئیں جن میں لیڈروں کے کردار ، پارٹیوں کے منشور اور انتخابات پر زبردست تنقیدیں کی گئیں ۔ اس سلسلہ کے شعراء میں غلام احمد نظامی ، حاجی محمود خادم ، حافظ عبداللہ بسمل نکھڑائی ، اختر ہالائی ، حافظ محمد احسن ، حافظ خیر محمد اوحدی ، عبدالکریم گدائی اور حیدر بخش جتوئی کے نام قابل ذکر ہیں ۔

ان دنوں سندھی نوجوانوں پر ترقی پسند تحریک کا بھی اثر ہوا ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سندھ میں بھی ترقی پسند ادب کی داغ بیل ڈالی گئی ۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں ترقی پسند مصنفین نامی جماعت وجود میں آئی جس کے سیکرٹری گوبند مالھی ہوئے ۔ نارائن شیام ، شیخ عبدالرزاق راز ، لچھمن راجپال ، رام پنجوانی (جونئیر) ، شیخ ایاز ، ارجن شاد ، مکن آہوجا ، عبدالستار شیخ ، سنتو لعل ، سوبھو گیانچندانی اور گوبند مالھی اس دور کی پیداوار ہیں ۔

ڈی ۔ جے سندھ کالج کے سندھی سرکل نے ۱۹۴۴ء میں 'لہروں' نامی رسالہ نکالا جس میں سب سے پہلے ترقی پسند رجحانات کو متعارف کرایا گیا ۔ اس کے بعد ترقی پسند نوجوانوں نے 'پیرہ پھٹی' ، 'اگتے قدم' اور 'نئی دنیا' رسالے نکالے ۔ 'باغی' رسالہ بھی جاری ہوا جس میں صرف افسانے شائع ہوتے تھے ۔ اس میں اردو کے بہترین افسانہ نگاروں مثلاً کرشن چندر ، خواجہ احمد عباس اور راج گوپال آچاریہ کے منتخب افسانوں کے ترجمے کیے گئے ۔ اس کے ساتھ مغربی افسانہ نگاروں کے افسانے بھی ترجمہ ہوئے ۔ اور اچھے طبعزاد افسانے بھی لکھے گئے ۔

افسانوں میں سماج پر طنز کی جاتی تھی اور روایت سے بغاوت کا اظہار ہوتا تھا ۔ ہاری اور مزدور کی کسمپرسی مؤثر انداز میں دکھائی جاتی تھی اور اس سے ہمدردی کا اظہار کیا جاتا تھا ۔ سرمایہ دار اور زمیندار کے ظالمانہ کردار اور اخلاقی پستی کو

نمایاں کر کے دکھایا جاتا تھا ۔ مذہبی اقدار پر بھی طنز کی جانے لگی اور فحاشی اور عریانی کی بھی ابتدا ہوئی ۔ عبدالستار شیخ نے اس قسم کے افسانے پیش کر کے لوگوں کو چونکا دیا ۔ شیخ عبدالستار کے علاوہ شیخ عبدالرزاق راز اور شیخ ایاز نے بھی ترقی پسندانہ نوعیت کے افسانے لکھے ۔

افسانوں کے علاوہ شاعری میں بھی نئے نئے تجربے کیے گئے ۔ آزاد نظم کی ابتدا ہوئی اور شیخ عبدالرزاق راز نے سب سے پہلے سندھی زبان میں آزاد نظم لکھی ۔ مضمون کے لحاظ سے بھی ترقی پسند نظریات کی ترجمانی کی گئی ۔ اس زمانہ میں آزادی کی تحریک بھی زوروں پر تھی ۔ شاعری میں جذبۂ آزادی کا اظہار بھی مؤثر انداز میں کیا گیا ۔

حیدر بخش جتوئی کہتے ہیں :

شب و روز ٹھوکریں کھا کر
بے آبرو ہو کر نہیں مرو !
گھر کے بستر کو چھوڑ کر
دیس پر قربان ہو کر مرو ! (ترجمہ)

دین محمد کہتے ہیں :

وطن پر جو اپنی جان
قربان نہیں کرتا ہے
وہ اس دنیا میں
کیوں زندہ رہے؟ (ترجمہ) ۔

اسی طرح عبدالکریم گدائی بھی ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہیں ۔

اس طرح بہت سے شاعروں نے انسانیت کا واسطہ دے کر اتحاد کی استدعا کی ۔ وقت گذرنے کے ساتھ آزادی کی تحریک تیز ہوتی گئی ۔ نئے شاعروں نے انقلاب اور بغاوت کے نعرے لگائے ۔ نئے شاعروں میں شیخ عبدالرزاق راز ، شیخ ایاز ، ہری دیگر ، پرسرام ضیا ، کھیلداس فانی ، نارائن شیام ، ارجن شاد ، سگن آہوجا ، منتو دریانی اور لچھمن آہو جا وغیرہ نے اپنے اشعار میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ، پرانے شاعروں میں غلام احمد نظامی مرحوم ، اللہ بخش ابوجھو ، حافظ محمد احسن ، حکیم فتح محمد سیوہانی ، کشن چند بیوس ، عبدالکریم گدائی ، حیدر بخش جتوئی ، رئیس ضیاء الدین بلبل وغیرہ نے قومی اشعار

کہے - اس قسم کے اشعار اخباروں اور مخزنوں میں شائع ہوتے تھے - کچھ مجموعے بھی شائع ہوئے - مثلاً غلام احمد نظامی کے دو مجموعے 'بیاض نظامی' اور 'ریاض نظامی'، حیدر بخش جتوئی کا 'آزادی قوم'، 'دکھایل' کے 'لالیون'، 'سنگیت پھول' اور 'جھولکار' - ۱۹۴۷ء میں سب سے زیادہ قومی اور انقلابی اشعار کہے گئے -

برصغیر میں تحریک آزادی عروج کو پہنچ چکی تھی چنانچہ اس دور کے بہت سے افسانوں میں بھی تحریک آزادی کا عکس نظر آتا ہے - مثلاً 'پدم' 'قومی سپاہی' 'سفید وحشی' وغیرہ - چونکہ ہر طرف سیاسی اور سماجی تحریکوں کا شور تھا - اس دور کے ۹۰ فی صد افسانوں میں جذبۂ آزادی اور غیر حکومت کے خلاف باغیانہ خیالات ملتے ہیں - ادبی لحاظ سے اس دور کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں افسانے دوسری اصناف ادب سے زیادہ لکھے گئے - اظہار خیال کا ذریعہ بھی افسانہ تھا - ترقی پسند نوجوان سوشلزم اور کیمونزم کا اثر بھی قبول کر چکے تھے - اس لیے ان کے افسانوں میں معاشی اور معاشرتی حالات کا عکس بھی نظر آتا ہے - فحاشی اور عریانی بھی ہے اور اخلاق بد حالی کو بھی مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے - انہوں نے سرمایہ دار اور زمیندار کے مظالم، غریبوں کی بد حالی اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کا ذکر مؤثر انداز میں کیا ہے - کچھ افسانہ نویسوں نے ہندو مسلم اتحاد پر بھی زور دیا - ترقی پسند رسالوں کے علاوہ 'سندھو' نے بھی افسانہ کو بہت ترقی دی افسانوں کے مجموعے بھی شائع ہوئے - عثمان علی انصاری اس دور کے بلند پایہ افسانہ نویس ہیں - ان کے افسانوں کا مجموعہ 'پنج گنج' ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا - ان کے افسانوں میں واقعات پر اثر اور حقیقت پسندانہ ہیں اس کے علاوہ ترقی پسند نوجوانوں کے افسانوں کے مجموعے بھی شائع ہوئے، مثلاً 'سرد آہوں' 'پرہ بھٹی'، 'ریگستانی پھول' اور 'سفید وحشی' وغیرہ -

ڈراموں کے سلسلہ میں بھی محمد عثمان ڈیپلائی کا نام سرِ فہرست ہے - انہوں نے کئی چھوٹے چھوٹے انقلابی نوعیت کے ڈرامے لکھے - جن میں سے 'نور جہاں جوپٹ'، 'سچائی موڑی'، 'کانگریسی جار'، 'شاہدی' اور 'نجومی' قابل ذکر ہیں - 'سچائی موڑی' میں دکھایا گیا ہے کہ وہی دولت ہمارے لیے فائدہ مند ہوتی ہے جو تعلیم پر خرچ کی جاتی ہے، 'شاہدی' میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح پیشہ ور لوگ عدالتوں میں جھوٹی گواہی دیتے رہتے ہیں - 'کانگریسی جار' میں ہندوؤں کی مسلم دشمن حرکتوں کو واضح کیا گیا ہے - ان کے علاوہ کراچی کے 'احمد چاگلا' عثمان علی انصاری نے بھی ڈرامے لکھے - لیکن زیادہ تر شیکسپیئر کے ڈرامے ترجمہ کیے، بعض جیسے

سندھی ماحول دکھانے کی کوشش کی ۔ ان کے دو ڈرامے 'جرم و وفا' اور 'گمراہ دوست' شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ محمد اسماعیل عرسانی نے بھی معیاری ڈرامے لکھے ۔ ان کے شاہکار ڈرامے 'بدنصیب تھری' کے علاوہ ان کے بارہ چھوٹے ڈراموں کا مجموعہ 'ڈزن ڈایا لاگ' شائع ہوا ، جو کافی مشہور ہوئے ۔ ان کا دوسرا ڈراموں کا مجموعہ 'حسن پروین' شائع ہوا جس میں تین ڈرامے ہیں ۔ ہندو ادیبوں میں لال چند ، اس ڈنومل جگتیانی ، منگھارام ملکانی اور دوسرے ہندو ادیبوں نے ڈرامے کے معیار کو بلند کرنے میں معاونت کے ساتھ کانگریسی نظریات ، غلامی سے نفرت اور دیس کی چیزوں کے استعمال پر اپنے ڈراموں میں زور دیا ہے ۔

اس دور تک صحافت اور ادب کا آپس میں گہرا رشتہ تھا ۔ اس دور کے صحافی بلند پایہ ادیب بھی تھے ۔ مولانا عبدالکریم چشتی (۱۸۹۸ء - ۱۹۶۳ء) ، مولانا دین محمد وفائی (۱۸۹۳ء - ۱۹۵۰ء) ، حکیم فتح محمد سیوہانی ، حافظ خیر محمد اوحدی اور شیخ عبدالمجید سندھی اس دور کے مصروف صحافی ، ادیب اور مضمون نگار تھے ۔

صحافت

مذکورہ صحافی ادیب سماجی، اخلاقی اور سیاسی موضوعات پر لکھتے تھے ۔ جن میں غلط کار اور چالباز سیاست دانوں ، راشی افسروں اور سماج کے شر پسند عناصر پر نکتہ چینی ہوتی تھی ۔ لیکن مضمون کی پیشکش ادبی نوعیت کی ہوتی تھی ۔ مضمون کی مناسبت سے منتخب فارسی اور سندھی اشعار بھی شامل کیے جاتے تھے ۔ ہندو ادیبوں میں جیٹھمل کافی معروف صحافی اور ادیب تھے ۔

صحافی ادیبوں کے علاوہ سید میران محمد شاہ (۱۸۹۸ء - ۱۹۶۳ء) ، ماسٹر اللہ بچایو سموں (پ - ۱۹۱۲ء) ، علامہ داؤد پوتہ ، غلام محمد شاہوانی (۱۹۱۲ء - ۱۹۵۰ء) ، عطا حسین شاہ موسوی (م - ۱۹۶۶ء) ، عبدالحسین شاہ موسوی (۱۹۶۷ء) ، شیخ عبد اللہ عبد ، محمد صدیق مسافر ، مولانا نورنگ زادہ ، ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ، محمد صدیق میمن ، لطف اللہ بدوی مرحوم ، میر رحیم داد خان مولائی شیدائی ، حاجی محمود خادم مرحوم ، رئیس ضیاء الدین بلبل مرحوم اور محمد صالح بھٹی نے بھی کئی ادبی مضامین لکھے ۔

مضمون کے سلسلہ میں میران محمد شاہ مرحوم کا نام سرفہرست ہے ۔ آپ نے سیر و سفر، سندھی ثقافت اور ادب پر اچھے مضامین لکھے ۔ جو زبان و بیان کے لحاظ سے شاہکار

ہیں ۔ اس کے ساتھ ان میں فکر کی گہرائی اور اثر انگیزی بھی ہے ، ماسٹر اللہ بچایو سموں نے سندھ کے علاقہ کوہستان کے جغرافیہ اور تہذیب و تمدن پر مضامین لکھے ۔ جو کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے ۔ اس کتاب کا نام ' سیر کوہستان ' ہے ۔ ان کی دوسری کتاب ' سیر لاڑ ' بھی شائع ہوئی ، جس میں علاقہ ' لاڑ ' کے متعلق مضامین ہیں ۔ عطا حسین موسوی صحیح معنوں میں مضمون نگار تھے ۔ آپ نے طنز و مزاح کے رنگ میں سماجی برائیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے اور حقائق کو مؤثر انداز میں پیش کیا ہے ۔ آپ کے مضامین کا مجموعہ ' کچ کوڈیون ' ۱۹۶۶ء تک سات مرتبہ چھپ چکا ہے ۔ آپ کے چھوٹے بھائی عبدالحسین شاہ موسوی بھی مضمون نویس اور مصنف تھے ۔ آپ نے لوک ادب پر بنیادی کام کیا ہے ۔ اس سلسلہ میں آپ کی دو کتابیں ' سگندہ ' اور ' سریان ' شائع ہو چکی ہیں آپ نے سندھی زبان کے دو عظیم شعراء قادر بخش بیدل اور محمد محسن بیکس کے دیوان بھی محنت سے مرتب کیے جنہیں ادبی بورڈ نے شائع کیا ہے ۔ عثمان علی انصاری نے بھی بہترین مضامین لکھے ۔ ان کے مضامین کے دو مجموعے ' درس عمل ' اور ' ادبی انتخاب ' شائع ہوئے ۔ ہندو نثر نگاروں میں جن مضامین کے مجموعوں نے مقبولیت حاصل کی وہ درج ذیل ہیں ۔ لیکھراج کشن چند عزیز کے مضامین کے مجموعے ' ادبی آئینو ' اس مجموعے کے علاوہ نارائن داس ملکانی کے دو مجموعے 'گوٹھانی چھہر' اور 'انار دانہ' ، لال چند امر ڈنومل کے مضامین کا مجموعہ 'سدا گلاب' ، رام پنجوانی اور نارائن داس بھنبھانی کے مضامین کا مجموعہ ' ادبی غنچہ ' وغیرہ ۔

ناولوں ، ڈراموں ، مضامین کے مجموعوں اور افسانوں کے مجموعوں کے علاوہ اس دور میں کئی قابل قدر ادبی اور تحقیقی کتابیں بھی لکھی گئیں ۔ مثلاً 'تذکرۂ لطفی' از لطف اللہ بدوی ، سندھی ادبی تاریخ از محمد صدیق میمن غلام محمد شاہوانی کا مرتب کردہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا رسالو وغیرہ ۔ مختصر یہ کہ اس دور میں مختلف معاشرتی موضوعات پر بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں ۔

فصل سوم
(۱۹۴۷ء تا حال)

ادبی منظر

قیام پاکستان کے بعد سندھی ادب نے نیا رخ اختیار کیا ۔ جدت اور انفرادیت پر زور دیا گیا اور ہیئت اور فن میں نئے نئے تجربے کیے گئے ۔ جدید شاعروں میں سے ایک گروہ نے تقلیدی شاعری کو ترک کرنے کی کوشش کی انہوں نے فارسی الفاظ کی جگہ سندھی

الفاظ استعمال کرنا شروع کیے ۔ محاورے ، تشبیہیں اور علامتیں بھی سندھی زبان ، معاشرہ اور قدیم سندھی شاعری سے اخذ کر کے استعمال کی جانے لگیں ۔ ایک مخصوص گروہ وطن پرستی میں اتنا انتہا پسند ہو گیا کہ ' ڈاہر ' کو اپنا ہیرو کہنے لگا ۔ فاتح سندھ محمد بن قاسم کو غاصب اور لٹیرہ کہا ۔ اس کے ساتھ مذہب کا بھی مذاق اڑایا گیا ۔ اس پر ادیب اور شاعر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ۔ اور نظریاتی اختلاف نے شدید نوعیت اختیار کی ۔ البتہ ایک جدّت پسند گروہ نے میانہ روی اختیار کی ۔ اس گروہ نے صحیح معنی میں جدید رجحانات کی نمائندگی اور فن میں جدّت پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ اس کے ساتھ روایت سے بھی کسی حد تک اپنا تعلق قائم رکھا ۔ ایک گروہ بالکل قدیم ایرانی شاعری کے تتبع میں شاعری کرتا رہا ۔ شاعروں کا ایک گروہ وہ بھی موجود ہے جو قدیم شاعری کے رنگ میں شعر کہتا رہتا ہے ۔

بہر حال اس دور میں شاعری کی ہیئت میں نئے نئے تجربے کیے گئے ۔ غزل کو نیا رنگ دیا گیا اور اس میں نئے مضامین لائے گئے ۔ نہ صرف غزل کے لوازمات کو ترک کیا گیا بلکہ عروضی اوزان کو بھی بعض شاعروں نے ترک کر کے ہندی ' چھندو دیا ' میں غزلیں لکھیں ۔ زبان کے لحاظ سے بھی بعض شاعروں نے خالص سندھی الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کی ۔ مضمون کے لحاظ سے غزل میں قومی اور انقلابی قسم کے مضامین بھی لائے گئے اور معاشی و معاشرتی حالات کا عکس بھی دکھایا گیا البتہ ایک گروہ نے غزل میں مناسب اور موزوں جدّت پیدا کر کے غزل کو زیادہ خوبصورت بنایا ۔

قدیم سندھی صنف شاعری

ڈوہیرو ، کافی اور وائی کو نیا انداز دے کر ان کو زندہ کیا گیا ۔ ان میں نئے نئے مضامین بیان کیے گئے ۔ مثلاً وطن پرستی کے نظریات ، اشتراکی خیالات اور فحش اور عریاں واقعات ۔ ہندی گیت اور مغربی شاعری کی صنفوں ، سانیٹ ، ترائیل ، آزاد نظم اور نظمِ معّرا اور جاپانی صنف شاعری ' ہیکو ' میں دلکش تجربے کیے گئے ۔

واقعات اور حالات کو حقیقت پسندانہ نوع میں بیان کرنے پر زور دیا گیا ۔ اس سلسلہ میں لوگ اتنا آگے بڑھ گئے کہ فحاشی اور عریانی کو بھی ادب کے لیے لازمی سمجھنے لگے ۔ وطن دوستی کا جذبہ ہر ادیب میں کار فرما رہا اور وہ سندھ ، سندھی زبان اور سندھی مشاہیر پر بڑے مؤثر انداز میں لکھ کر جذبۂ حب الوطنی پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے ۔ چند شاعروں نے بین الاقوامی مسائل پر بھی لکھا ۔

فنون لطیفہ اور تاریخ نویسی

پاکستان بن جانے کے بعد سندھ کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ مرتب کرنے اور تاریخی مواد جمع کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں ۔ پیر حسام الدین راشدی کی کوشش سے کئی کتابیں سندھی ادبی بورڈ کی لائبریری میں جمع ہو گئیں ، جن میں سے بہت سی کتابوں پر کام ہوا ہے ۔ جی ۔ ایم ۔ سید نے ماضی قریب کی سندھ کی تاریخ اور سیاست پر کتابیں لکھی ہیں ، جن میں سے ' نئین سندھ لاء جدو جہد ' ' جنم گذاریم جن سین ' ، ' سندھ جی لمبئی کہاں علیحدگی ' قابل قدر ہیں ۔ علی محمد راشدی نے ایک قابل ذکر کتاب لکھی ہے جس میں چند شخصیتوں کے خاکے دیے گئے ہیں ۔

خالص سندھی موسیقی اور لوک سازوں پر خاص توجہ دی گئی ہے ۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے اہم کام کیا ۔ اب ہر جگہ سندھی ساز ، مثلاً یکتارو گھڑو ، الغوزہ ، نڑ ، مرلی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔ سندھی لوک ناچوں میں ' ہو جمالو ' کو پاکستان بھر میں مقبولیت حاصل ہوئی ہے ۔ خالص سندھی دھنوں میں سے ' سندھڑی دا شہباز قلندر ' کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ہے ۔ سندھی دستکاری میں سے سندھی اجرک ، ٹوپی اور سوسی کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے ۔ اور یہ فیشن میں شامل ہو گئے ہیں ۔ سندھی موسیقی ، سندھی سازوں اور سندھی دستکاری پر تحقیقی اور تعارفی مقالات بھی شائع ہوئے ہیں ۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ ، الیاس عشقی ، شیخ عزیز ، میمن عبدالمجید سندھی اور غلام رسول بلوچ کے نام قابل ذکر ہیں ۔

ادبی انجمنیں

۱۹۴۸ء میں حکومت کی طرف سے سندھی ادبی بورڈ قائم کیا گیا ۔ جس نے اب تک کئی معیاری کتابیں شائع کی ہیں ۔ جن میں سے ایک ' سندھی کلاسیکل شعراء ' ہے ۔ اور اس کے علاوہ شاہ عبداللطیف بھٹائی ، شاہ عنایت رضوی ، حضرت قادر بخش بیدل ، محمد محسن بیکس ، حمل فقیر ، خلیفہ نبی بخش وغیرہ پر تحقیقی کتابیں شائع ہوئی ہیں ۔ کئی مفید شائع شدہ کتابیں مثلاً ' سسیا جو سینگار ' ، ' نیکی بدی ' ، ' بلو کھوکھر ' ، ' راسیلاس ' ، ' مقالات الحکمت ' وغیرہ دوبارہ شائع ہوئی ہیں ۔ سندھ کی تاریخ پر بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں ۔ اور سندھی عالموں کی فارسی اور عربی کتابیں بھی شائع کی گئی ہیں ۔ سندھ لوک ادب پر بھی کئی کتابیں مرتب کرکے چھپوائی گئی ہیں ۔ بورڈ کے سہ

ماہی رسالہ ' مہران ' نے جدید افسانے اور شاعری کو بڑا فروغ دیا ۔ اس میں تحقیقی اور تاریخی مقالے بھی شائع ہوئے ہیں ۔

نقسیم سے پہلے بہت سے اشاعتی ادارے کام کر رہے تھے، لیکن تقسیم کے بعد ان کے بند ہو جانے کی وجہ سے ایک خلا محسوس ہونے لگا ۔ شیخ ، لیکن تقسیم کے بعد اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ۔ آپ کی کوشش سے سکھر میں ایک ادارہ ' حبیب پبلیکیشن ' قائم ہوا ، جس نے جدید ادب کے متعلق اچھی کتابیں شائع کیں ۔ تقسیم کے بعد سب سے پہلے اس ادارہ نے جدید افسانہ نویسوں کے افسانے کتابی صورت میں شائع کیے ۔ شیخ عبدالرزاق راز کے افسانوں کا مجموعہ 'ڈاک بنگلہ' شیخ ایاز کے افسانوں کا مجموعہ ' گل ائن مکھڑیوں ' اس ادارے نے شائع کیے ۔ اس کے علاوہ جدید شاعروں کے کلام کے مجموعے بھی سب سے پہلے اسی ادارے نے شائع کیے ۔ مثلاً شیخ راز کا پہلا مجموعہ کلام ' سارنگ ' اور عزیز اللہ مجروح کے دیوان کا پہلا حصہ ' نالہائے دل ' اس ادارہ نے شائع کیے ۔ اس ادارہ نے اور بھی کتابیں شائع کیں جن کا ذکر فصل دوم میں آچکا ہے، جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں ۔ 'سندھی صحافت جی تاریخ' 'فاتح سندھ' اور 'ناظم حکمت' وغیرہ ۔

سنہ ۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم نے ' سندھی ادبی سوسائٹی ' قائم کی جس کی طرف سے علامہ مرحوم کی کتابیں ' کلام گروہڑی ' ' ابیات سندھی ' 'آتم ' وغیرہ شائع ہوئی ہیں ۔ بیگم داؤد پوتہ نے اس ادارہ کی جانب سے کراچی سے عورتوں کا رسالہ ' ادیون ' ۱۹۶۵ء میں جاری کیا ۔

مخدوم محمد زمان طالب المولی کے متعقد ادیبوں نے ان کی سرپرستی میں ۱۹۵۴ء میں ' بزم طالب المولی ' قائم کی ۔ جس کی طرف سے مشاعرے اور ادبی کانفرنسیں ہوتی رہتی ہیں ایک دو کتابیں بھی شائع کی گئی ہیں ، جن میں سے مخدوم محمد زمان کی کتاب ' کافی ' قابل ذکر ہے ۔ اس میں ' کافی ' کے متعلق تحقیق ہے ۔

سچل سرمست کی یاد قائم رکھنے کے لیے اور ان کی کتابوں کی اشاعت کے لیے سچل سرمست اکیڈمی قائم کی گئی ۔ اس اکیڈمی کی طرف سے سچل سرمست کے معتقد اور مرید قاضی علی اکبر درازی کئی کتابیں شائع کر چکے ہیں ۔ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال عرس کے موقع پر ادبی کانفرنس بھی منعقد ہوتی ہے ۔اسی طرح اور بھی کئی ایک ادارے بھی اسی قسم کے کام کر رہے ہیں ۔

جرائد

اس دور میں کئی نئے رسالے نکلے اور بند ہو گئے - سہ ماہی 'مہران' اور پاکستان پبلیکیشن کے ' نئین زندگی ' (۱۹۵۰ء) کے علاوہ محکمہ ولیج ایڈ کی طرف سے ۱۹۵۶ء میں ' گوٹھ سدھار ' جاری ہوا جو پانچ سال تک نکلتا رہا - زینت عبداللہ چنہ نے عورتوں کا رسالہ ' مارئی ' نکالا - اس کے بند ہو جانے کے بعد بیگم خدیجہ داؤد پوتہ نے ' ادیون ' نکالا جو اب تک نکل رہا ہے - ان کے علاوہ بے شمار رسائل مختلف شہروں سے نکلے اور بند ہو گئے - جن میں سے دو چار کے نام یہ ہیں :

'فردوس' ، ہالا - 'اسامیی منزل' 'دادو' 'مجلس' ، سکھر ، 'تقاضا' ، سکھر لاڑکانہ - 'لطیف' ، 'شاعر' ، 'روح ادب' ، 'گلستان' ، 'سرتاج' ، 'اسامیی دنیا' 'طبی میگزین' وغیرہ - اب جو رسالے نکل رہے ہیں ان میں سے 'مہران' 'الرحیم' 'ماہنامہ سندھی' وغیرہ قابل ذکر ہیں -

شاعری کا مجموعی جائزہ

شاعری کے رجحانات پر بحث کی جا چکی ہے - شعراء کا ایک گروہ تو وہ ہے جو ترقی پسند کہلاتا ہے - ان میں عبدالکریم گدائی ، شیخ ایاز ، نیاز ہمایونی ، امداد حسینی ، قمر شہباز ، شبیر الحیدری ، تنویر عباس اور محسن لگڑائی کے نام قابل ذکر ہیں - ان شعراء کے کلام میں اشتراکی نظریات کا اثر ، وطن پرستی کا جذبہ ، عریانی اور فحاشی کا جلوہ اور مذہبی اقدار پر طنز ملتی ہے - داہر پرستی کا پرچار بھی یہی شعراء کرتے ہیں - اس سلسلہ میں شیخ ایاز سب سے آگے ہیں - اس لیے ان پر بڑی تنقیدیں ہوئی ہیں -

ایک طبقہ وہ بھی ہے جو صحیح معنی میں جدید شاعر کہلانے کا مستحق ہے - ان میں شیخ عبدالرزاق راز کا نام سر فہرست ہے - ان کے کلام کے تین مجموعے ' سارنگ ' ، 'پوپوں منجھ پاتال' ، 'سجن سفر ہلیا' شائع ہو چکے ہیں - ایک اردو مجموعہ کلام ' دھڑکنیں' بھی شائع ہوا ہے - سندھی میں سب سے پہلے آزاد نظم راز صاحب نے لکھی - آپ نے نظم اور غزل دونوں میں جدید رجحانات دلکش پیرایہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے - آپ کی غزل میں خیال کی ندرت ، شعور کی پختگی اور خارجی تجربات کی مثالیں ملیں گی - عبدالحلیم جوش کے کلام میں بھی جدّت اور انفرادیت ملتی ہے - آپ اپنی ہی وضع کے غزل گو شاعر ہیں -

ایاز قادری غزل اور نظم کے اچھے شاعر ہیں - ان کی شاعری میں صرف فارسی شاعری کا روایتی انداز ہی نہیں ہے ، بلکہ جدید رجحانات کا بھی گہرا اثر ہے - ان کو

اپنے وطن سے محبت ہے ، جس کا اظہار غزل ہو یا نظم دونوں میں کرتے ہیں - انیس انصاری نے چھوٹی چھوٹی بحروں میں اچھی نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں - ان کے کلام میں بھی قومیت کا شعور ملتا ہے اور اندازِ بیان منفرد معلوم ہوتا ہے - محترمہ نور شاہین نے ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے - ان کے کلام کا مجموعہ ' وس مرزسٹن گھوریو ، حال ہی میں شائع ہوا ہے - بلاشبہ یہ سندھی زبان کی عظیم اور کافی کی واحد شاعرہ ہیں ، جس کے فن میں جدّت ، انفرادیت ، سادگی ، پختگی ، بے پناہ اثر اور نغمگی ہے - سندھی زبان کی صرف یہی ایک شاعرہ ہیں جن کے کلام سے نسوانی جذبات اور احساسات کا اظہار واضح نظر آتا ہے -

ان کے کلام میں ایک پیغام ہے اور وہ یہ ہے کہ غم و اندوہ کے کتنے ہی پہاڑ ٹوٹ پڑیں لیکن امید اور جدوجہد کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے - ہر حال میں زندہ رہنا اور زندگی کو قدرت کی ودیعت سمجھ کر بسر کرنا چاہیے -

ان کے علاوہ غزل کے جن اہم شعراء کا ذکر گذشتہ اوراق میں آچکا ہے - وہ غزل کی روایات کی پوری طرح پابندی کرتے ہیں اور وہ قدیم رنگ میں ہی لکھتے ہیں - عبدالفتاح عبد صاحب قطعہ کے بھی بلند پایہ شاعر ہیں - یہ ملک کے سیاسی اور سماجی حالات ، مادیت اور مغرب کی تقلید پر سخت تنقید کرتے ہیں - اظہر گیلانی کے کلام میں زمانہ کی گردش اور ان کی ذاتی پریشانیوں کا عکس بھی نظر آتا ہے - سردار علی شاہ ذاکر سندھی ثقافت کی روح کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں - حامی حقیقت پسند ہیں وہ غم و عشق کے افسانے سناتے سناتے غمِ دوراں کی طرف گریز کر جاتے ہیں - وہ انسانوں کو ایسی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے ہیں جس کی بنیاد خلوص اور محبت پر ہو - احمد خاں آصف کو غزل کے اور نظم کے ساتھ کافی اور ڈوہڑو میں بھی کمال حاصل ہے - وہ سادگی میں حسن دیکھتے ہیں اور سادگی میں حسن پیدا کر کے سندھ کے مزاج کی ترجمانی کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں - مظفر حسین جوش نے قومی نظمیں بڑے جوش اور جذبہ سے لکھی ہیں اور ان کو مقبولیت بھی حاصل ہوئی ہے - غزل قدیم رنگ میں لکھتے ہیں لیکن اس میں جدّت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں - سلیم گرہوڑی وطن کی ثقافت کی مؤثر ترجمانی کرتے ہیں - عبدالقیوم صاحب غزلوں اور نظموں کے علاوہ گیت بھی لکھتے ہیں - سلاست اور روانی ان کے کلام کی خاص خوبی ہے - نواز علی شوق غزل کے علاوہ گیت اور وائی پر بھی محنت کر رہے ہیں - غزل میں جدّت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں - بردہ سندھی کے کلام میں سندھی ماحول اور رسم و رواج کی ترجمانی ملتی ہے -

اس دور کے پرانے شاعروں میں نواز علی نیاز مرحوم غزل کے با کمال شاعر ہیں -

ان کی غزل رنگین اور پر اثر ہے ۔ غزل کی روایات کو برقرار رکھنے کے باوجود انہوں نے ماحول اور موجودہ معاشرت دکھانے کی کوشش کی ہے ۔ حاجی محمود خادم مرحوم نے عروضی شاعری کی بہت خدمت کی ۔ عروض کے قواعد و ضوابط اور غزل کے لوازمات کا خیال رکھتے تھے ۔ ان کے کلام میں قومی رنگ نظر آتا ہے ۔ محمد صدیق مسافر کے کلام میں سندھ کے معاشی اور معاشرتی حالات کا عکس نظر آتا ہے ۔ محمد بخش واصف مرحوم نے شاعری کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے ۔ خصوصاً غزل اور رباعی کے بلند پایہ شاعر ہیں ۔ رئیس ضیاء الدین بلبل مرحوم کے کلام پر فلسفہ اور اخلاقیات کا رنگ غالب ہے ۔ ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل کا کلام پختہ اور برجستہ ہے ۔ آپ نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے ۔ حافظ محمد احسن کے کلام میں قومی ، مذہبی اور اخلاقی رنگ ملتا ہے ۔ زیادہ تر آپ کا کلام ناصحانہ ہے ۔ رشید لاشاری کے کلام میں ان کی زندگی کا عکس ملتا ہے ۔ آپ نے کامیاب علمی کتب بھی لکھی ہیں ۔

افسانہ

تقسیم کے بعد کچھ عرصہ کے لیے افسانے کی ترقی کسی قدر رک گئی ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر افسانہ نویس ہندو تھے ۔ لیکن جلد ہی ماہوار رسالوں کا اجراء ہوا اور افسانہ کی طرف خاص توجہ دی گئی ۔ حیدر بخش جتوئی شاعر اور ہاری لیڈر ہیں ۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء کے قریب افسانے بھی لکھنے شروع کیے تھے ۔ تقسیم کے بعد انہوں نے کچھ افسانے لکھے ، جن میں ہاری کی مظلومیت اور زمیندار کا ظلم دکھایا گیا ہے ۔ شیخ عبدالرزاق راز اور شیخ ایاز بھی تقسیم سے پہلے افسانے لکھتے تھے ۔ تقسیم کے بعد ان کے افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے ۔ ڈاکٹر غلام حسین جعفری تعلیمی ماہر ہیں لیکن شروع میں آپ نے بھی کچھ افسانے لکھے ہیں ۔ ' بدلو ' ان کا بہترین افسانہ ہے ۔ ۱۹۵۰ء کے بعد سندھی افسانے نے تیزی سے ترقی کرنا شروع کی ۔ اس میں جمال ابڑو ایک اچھے افسانہ نویس کی حیثیت سے ابھرے ۔ انہوں نے کچھ افسانے لکھے ، لیکن اب کافی عرصے سے خاموش ہیں ۔ آپ کے افسانے ماہنامہ ' نئین زندگی ' اور ' سہ ماہی مہران ' میں شائع ہوتے رہے ۔ بعد میں آپ کے افسانوں کا مجموعہ ' پشو پاشا ' کے نام سے شائع ہوا ۔ ان کا اسلوب بیان چھوٹے چھوٹے جملوں ، خالص سندھی محاوروں اور تشبیہوں پر مشتمل ہے افسانوں میں سماج کے مظلوم مجبور اور بیکس انسانوں کو پیش کیا گیا ہے اور سماج کی روایتوں کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے ۔ ان کے افسانوں کے کردار غریب اور مظلوم ہوتے ہوئے بھی سرکش ہیں ۔ ' شاہ جو پہر ' اور ' بد معاش ' ان کے شاہکار افسانے ہیں جمال نے مغربی تہذیب کے شیدائی امیر طبقہ کے نوجوانوں پر بھی تنقید کی ہے ۔

جمال کے ساتھ ایاز قادری کا نام آتا ہے۔ جن کے افسانے 'سہ ماہی مہران' کے ابدائی شماروں اور 'نئین زندگی' میں شائع ہوتے رہے ۔ بعد میں آپ کے افسانوں کا مجموعہ ' بلودادا ' شائع ہوا ۔ اب خاموش ہیں ۔ آپ نے سندھی ادبی سنگت کی بنیاد ڈالی ۔ آپ شاعر بھی ہیں ۔ آپ نے سماج کے بدنام اور غیر معمولی کرداروں پر مؤثر افسانے لکھے ہیں ' بلودادا ' مشہور ہے ۔ آپ جدید رجحانات کی ترجمانی ضرور کرتے ہیں ، لیکن بے راہ نہیں ہوتے ۔ ان کے افسانوں کے کردار فرشتے نہیں ہیں لیکن وہ ان کی خوبیوں کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں ۔

غلام ربّانی کے افسانے بھی 'سہ ماہی مہران' اور 'نئی زندگی' میں شائع ہوئے ، لیکن آپ نے کافی عرصہ سے کچھ نہیں لکھا ۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'آب حیات' کے نام سے شائع ہوا ہے ۔ وہ ہاری کی حمایت اور ان کو زمینداروں کے خلاف ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ان کے اکثر افسانوں میں گاؤں کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے ۔ لیکن کہیں کہیں وہ غلط منظر نگاری بھی کر جاتے ہیں ۔

ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل (پ ۔ ۱۹۰۰ء) بلند پایہ شاعر اور نقاد ہیں لیکن آپ نے اچھے افسانے بھی لکھے ہیں ۔ آپ کے افسانے 'عبرت کدہ' کے نام سے دو حصوں میں شائع ہو چکے ہیں ۔ آپ پاگلوں کے ہسپتال میں ڈاکٹر تھے ۔ اس زمانے میں آپ نے انسانی زندگی کا جو مشاہدہ اور تجزیہ کیا وہ اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے ۔ اس لیے آپ کے افسانوں میں زندگی کے بہت سے مسائل اور الجھنوں کی حقیقت پسندانہ عکاسی ملتی ہے ۔

ابن الیاس سومرو اور دلدار حسین شاہ موسوی نے بھی اچھے افسانے لکھے ہیں ۔ ان کے افسانوں میں معاشرہ کی عکاسی اور اس پر تنقید ضرور ملتی ہے لیکن اس میں اعتدال سے کام لیا گیا ہے ۔

موجودہ نوجوان افسانہ نویسوں میں امر جلیل بہت مقبول ہیں ۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'دل جی دینا' حال ہی میں شائع ہوا ہے ۔ سندھ کے پیر اور زمیندار ان کے قلم کے ہدف بنتے ہیں ۔ ان کی بد کرداری کو نمایاں کرتے ہوئے یہ تاثر دیتے ہیں کہ یہ ڈاکوؤں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں ان کے افسانوں میں کبھی کبھی عریانی بھی آ جاتی ہے ۔

سراج الحق مضمون نویس بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی ۔ وہ افسانوں کے ذریعہ

معاشرہ کے غلط نظام کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کے کچھ افسانے یہ تاثر دیتے ہیں کہ موجودہ دور میں جھوٹ اور سچ اس طرح مل گئے ہیں کہ سچ کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔ 'بھنی' ان کا اچھا افسانہ ہے، ان کے افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔

بشیر ربانی اچھے شاعر بھی ہیں اور افسانہ نویس بھی ہیں۔ آپ نے بھی سندھ کے ہاری کے مسائل پر لکھا ہے۔ کچھ رومانوی افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں میں 'چھڑی'، 'پریم'، 'ٹکری' اور 'زندگی جو روگ' اچھے افسانے سمجھے گئے ہیں۔ علی احمد بروہی طنز و مزاح کے رنگ میں عام کرداروں پر لکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے ہر فقرہ میں مزاح ہوتا ہے آپ نے ایک ہی افسانہ میں معاشرہ کے کئی پہلوؤں پر طنز کی ہے۔ طنز و مزاح کے رنگ میں لکھنے والوں میں آپ کا نام سر فہرست ہے۔

آغا سلیم بھی اس دور کے اچھے افسانہ نویس ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'چنڈ حاتمنائی' اور ناولٹ 'روشنی جی تلاش' شائع ہو چکے ہیں۔ کچھ ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانے زیادہ تر رومانوی ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں نیم عریاں منظر بھی دکھاتے ہیں۔ تعلیم کے سلسلہ میں آسٹریلیا گئے تھے۔ واپس آنے کے بعد آسٹریلیا کی زندگی پر افسانے لکھے جو سندھی ادب میں منفرد حثیت رکھتے ہیں۔ نسیم کھرل نے سندھ کی دیہاتی زندگی پر اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کے افسانے طنزیہ زیادہ ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں معاشرہ پر طنز کرنے کے ساتھ مذہب پر بھی طنز کیا ہے۔ فن کے لحاظ سے کچھ افسانے کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'شبنم شبنم کنول کنول' شائع ہو چکا ہے۔

طارق اشرف افسانہ نویس بھی ہیں اور افسانہ کی ترقی کے خواہاں بھی۔ اس لیے حیدر آباد سے سوہنی کتابی سلسلہ نکال رہے ہیں جس میں ان کے بہترین افسانے چھپے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'سونہن پتھر'، شائع ہو چکا ہے۔ طارق کے دوست اور ساتھی غلام نبی مغل نئے لکھنے والے ہیں لیکن مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ 'نئون شہر' اور 'رات جانیں'۔ ان کے بعض افسانوں میں اس قدر عریانی اور فحاشی ہے کہ ذوقِ سلیم کو ناگوار محسوس ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ جمال رند۔ مراد علی مرزا، حمید سندھی، ناصر مورائی وغیرہ بھی افسانے لکھ رہے ہیں۔ حمید سندھی کے افسانوں کا مجموعہ 'اداس وادیوں' شائع ہو چکا ہے۔ ان میں پاکستان پبلیکیسن کی طرف سے شائع شدہ دو مجموعے 'مہران جون چھولیوں' مرتبہ ثمیرہ زرین اور 'بہترین سندھی ادب و افسانہ' مرتبہ شمشیر الحیدری افسانوں کے بہترین مجموعے ہیں۔

سندھی خواتین میں بیگم زینت عبداللہ چنہ کافی عرصے سے اچھے افسانے لکھ رہی ہیں۔ خواتین میں ثمیرہ زریں بلند پایہ افسانہ نویس ہیں۔ ان کے افسانوں میں فنی پختگی پائی جاتی ہے۔ وہ زیادہ تر شہری زندگی اور اس معاشرہ کی خرابیوں کو نمایاں کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ نور شاہین ، رشیدہ حجاب ، ثریا یاسمین ، ماہتاب محبوب ، بادام ناتواں ، ثریا بھٹی ، مریم نوحانی ، درشہوار سید ، اقبال پروین سومرو ، رشیدہ شیخ ، فاطمہ نور عباسی ، مریم ولی محمد ، زینب مہدی ، آفتاب عباسی ، شمس سرکی ، فریدہ مغل ، نذیر تھیبی ، فہمیدہ خانم ، عطیہ جونیجو اور س ۔ ع ۔ سومرو افسانے اور مضامین لکھتی رہتی ہیں۔

موجودہ دور میں غیر ملکی افسانوں کے بھی تراجم ہوئے اور ان کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں ادارہ 'آواز ادب' حیدر آباد کی جانب سے اس قسم کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ خلیل جبران کے افسانوں کا مجموعہ 'سیؤن' اور میمن عبدالمجید سندھی کے ترجمہ کیے ہوئے افسانوں کا مجموعہ 'دیس دنس جون کہالیاں' شائع ہوئے۔ اس آخری مجموعے میں افسانہ کے فن پر بھی بحث ہے اور افسانہ نویسوں کا تعارف بھی ہے۔

موجودہ دور میں سندھی افسانہ نے بڑی پختگی حاصل کی ہے۔ اس میں سنجیدگی اور متانت کے ساتھ حقیقت نگاری پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ وہ سندھی ماحول کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس میں سندھی معاشرہ کے کئی مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں۔ ان سے سندھی کرداروں کی فطرت اور مزاج کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ بعض افسانے بین الاقوامی مسائل پر بھی لکھے گئے ہیں۔ ہیئت کے لحاظ سے بھی کئی کامیاب تجربے کیے گئے ہیں۔ طویل افسانے ، اور ناولٹ فنٹنے بھی لکھے گئے ہیں۔

ناول

تقسیم کے بعد سندھی ناول نے خاص ترقی نہیں کی۔ تقسیم سے پہلے ترجمے زیادہ چھپتے تھے۔ طبعزاد ناولیں بہت کم چھپیں لیکن ان میں سے اکثر صحیح معنی میں ناولیں تھیں۔ تقسیم کے بعد ناول کے ارتقاء کی رفتار سست ضرور رہی ہے لیکن پھر بھی کئی ناولیں چھپیں مگر ان میں سے بہت کم ناولوں کو صحیح معنی میں ناول کہا جا سکتا ہے۔

شروع میں ' فردوس پبلیکیشن ہالا ' ، ' ادبی ادارہ حیدر آباد ' اور ' پرہ بھٹی حیدر آباد ' جیسے ادارے ناولیں شائع کرتے رہے۔ ' ادبی ادارہ حیدر آباد ' نے زیادہ تر جاسوسی ناولیں شائع کیں ، جو محمد بخش جوہر کی لکھی ہوئی تھیں۔ بعض تاریخی اور

سماجی ناولیں بھی شائع ہوئیں ۔ سماجی ناولوں میں حسنی محمد حافظ کا ناول ' تباہی ' قابل ذکر ہے ۔ ' بزم بسمل ٹنڈو محمد خاں ' کی طرف سے بھی ناولیں شائع ہوئی ۔ ان میں سے ' گناہ جون راتیون ' اور ' شرابی ' قابل ذکر ہیں ۔ ان میں سماجی برائیوں پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے ۔ حیدر آباد کے پبلشر آر ۔ ایچ ۔ احمد اینڈ برادرس اور دوسرے اداروں کی طرف سے بھی کئی ناول شائع ہوئے جن میں کچھ ترجمے بھی تھے ۔ ۱۹۵۲ء سے پہلے شائع شدہ ناولوں میں سے مندرجہ ذیل ناولیں قابل ذکر ہیں :

' زمیندار ' سید حیدر شاہ ۔ ' طوطا مینا ' ' ماسٹر محمد یوسف ابڑو ' ۔ پردیسی جو پیار ، اللہ بخش تالپور ' ' شیر مسرور ' ' گل محمد شلہ رضوی ۔

۱۹۵۲ء کے بعد ادارہ سندھی ادب اور آواز ادب نے کئی ناول شائع کیے ۔ لطف اللہ بدوی مرحوم کی بھی کچھ ناولیں شائع ہوئیں ، جن میں سے ' ابتلا ' قابل ذکر ہے ۔ خواجہ غلام علی الانا نقاد ، محقق اور ماہر لسانیات ہیں ۔ شروع میں افسانے اور ناولیں بھی لکھتے تھے ۔ ان کا ایک ناول ' لاش ' قابل قدر ہے ۔ ڈاکٹر منظور احمد عرسانی نے نسیم حجازی کی ناولیں مؤثر انداز میں ترجمہ کی ہیں ۔ اس کے ساتھ کچھ طبعزاد ناولیں بھی لکھی ہیں ۔ جن میں سے ' کلب اور گھر ' اچھا ناول ہے ۔ ان کے علاوہ رسول بخش خمار ، محمد علی بھٹی ، گل حسن گل ، میمن عبدالمجید سندھی ، محمد داؤد بلوچ اور قاضی عبدالکریم کی طبعزاد اور ترجمہ کی ہوئی ناولیں شائع ہوئی ہیں ۔ محمد عثمان ڈیپلائی نے تقسیم کے بعد بھی کئی تاریخی ناولیں لکھیں جن میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں :

' سانگھڑ ' ، ' امڑا ' ، 'غازی انور پاشا ' ، ' آزادی جی جنگ ' ، ' دکھن جا مجاہد ' ۔

ڈرامہ

افسانہ کے مقابلے میں ڈرامے نے خاص ترقی نہیں کی ہے ۔ پرانے ڈرامہ نویسوں میں شیخ عبدالرزاق راز ، محمد عثمان ڈیپلائی اور محمد اسماعیل عرسانی کے نام قابل ذکر ہیں ۔ ' بدنصیب تھری ' عرسانی صاحب کا شاہکار ڈرامہ ہے ۔ شیخ راز صاحب کا ڈرامہ ' فاتح سندھ ' ایک کامیاب تاریخی ڈرامہ ہے ۔ چنہ شبیر ناز نوجوان ڈرامہ نویس ہیں ۔ آپ کو ڈرامہ سے بہت دلچسپی ہے ۔ نہ صرف ڈرامہ لکھتے ہیں ، بلکہ ڈرامہ کی ترقی اور ترویج کے لیے آپ نے ایک ادارہ بھی حیدر آباد اور شکار پور میں قائم کیا ہے ۔ اس ادارہ کی طرف سے آپ کے دو مکمل ڈرامے ' دریا خاں ' اور ' سنجا سیج پلنگ ' شائع ہو چکے ہیں ۔ سہ ماہی 'مہران' میں بھی کچھ طبعزاد ڈرامے اور ترجمے شائع ہوئے ۔ ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے

گئے ہیں ۔ ریڈیائی ڈراموں کا ایک انتخاب ' ادارہ آواز آدب ' کی طرف سے ' باچھا الّن ٹڑلاء ' کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۔ ریڈیائی ڈراموں کے سلسلہ میں آغا سلیم ، مراد علی مرزا ، اور ممتاز مرزا ، کامیاب فن کار ہیں ۔ ان کے علاوہ مصطفیٰ قریشی ، غلام نبی میمن ، محمد خان جمالی ، ایاز قادری ، میمن عبدالمجید سندھی ، الاھی بخش بلوچ ، محبوب علی جوکھیو ، محمد عثمان ڈیپلائی ، ابن حیات ، ظہور انصاری اور سراج نے بھی ریڈیائی اور دوسرے ڈرامے لکھے ہیں ۔

تحقیق ، تاریخ اور مضمون نگاری

موجودہ دور میں سندھی ادب ، زبان اور تاریخ پر تحقیقی کام بھی ہوا ہے ۔ معیاری مقالات بھی لکھے گئے ہیں اور کچھ مضامین بھی سامنے آئے ہیں ۔ مضامین کے سلسلے میں علّامہ داؤد پوتہ ، علامہ اے ۔ آر ۔ قاضی ، پیر علی محمد راشدی ، ڈاکٹر ممتاز پٹھان علی انصاری ، سید میران محمد شاہ حسین شاہ موسوی، پیر حسام الدین راشدی ،محمد اسماعیل عرسانی، عبدالکریم سندیلو، اللہ بچایو سموں ، میمن عبدالمجید سندھی، عبدالجبار شام ، غلام علی الانا ، انور شاہین ، محبوب علی چنہ اور ڈاکٹر علی احمد قاضی کے نام لیے جا سکتے ہیں ۔ انہوں نے انشائیے بھی لکھے ہیں اور تحقیقی اور معلوماتی مقالے بھی تحریر کیے ہیں ۔

اس دور میں علّامہ داؤد پوتہ کی محققانہ ترتیب 'کلام گرہوڑی ' شائع ہوئی ۔ آخری عمر میں ' شاہ جو رسالو ' ایڈٹ کر رہے تھے ۔ اب غلام مصطفیٰ قاسمی وہ کام مکمل کر رہے ہیں ۔ سندھ کی تاریخ پر پیر حسام الدین راشدی نے بہت کام کیا ہے ۔ انہوں نے کئی کتابیں تصنیف بھی کی ہیں اور فارسی کی کئی کتابوں کو مدون بھی کیا ہے ۔ اس سلسلہ میں آپ کی مرتب کی ہوئی کتاب ' مکلی نامہ ' نمایاں حیثیت رکھتی ہے ۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے سندھی لوک ادب اور کلاسیکل شعراء کی کئی کتابیں مرتب کی ہیں ۔ اس کے علاوہ سندھ کی تاریخ اور سندھی زبان کی تاریخ پر بھی کام کیا ہے ۔ احسن کربلائی مرحوم نے تالپور دور پر تحقیقی مقالات لکھے ہیں ۔ میر رحیمداد خان مولائی شیدائی نے سندھ اور بلوچستان کی تاریخ پر مقالات اور کتابیں لکھی ہیں ۔ سندھ کی تاریخ اور تمدن پر آپ کی دو کتابیں ' جنت السندھ ' اور ' تمدن سندھ ' معیاری کتابیں ہیں اور ہماری ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں ۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے سندھی مشاہیر اور سندھ میں آزادی کی تاریخ پر کئی محققانہ مقالات لکھے ہیں ۔ اس کے علاوہ آپ نے شاہ ولی اللہ دہلوی کی فارسی اور عربی کتابیں اور سندھ کے علماء کی فارسی اور عربی کتابیں محنت سے مرتب کی ہیں ۔ عبدالکریم سندیلو نے سندھی لوک ادب اور لغت پر بڑی جستجو کی ہے آپ کی کتابیں ' وینجھار ' ، ' سندھ جو سینگار ' ، ' پہاکن جی پاڑ ' ، ' ڈھس نام ' اور

'تحقیق لغات سندھی' قابل قدر ہیں ۔ تحقیق لغات سندھی میں سندھی الفاظ کی اصلیت واضح کی گئی ہے محبوب علی چنہ نے سندھی کلاسیکل شعراء، سندھی مشاہیر، اسلامی تاریخ اور تصوف پر مفید مقالات اور کتابیں لکھی ہیں آپ کی کتابیں 'کلیات امین'، ''اسلامی تاریخ جو مطالعو' اور ' ایک کردار دو شخصیتیں ' تحقیق کا اچھا معیار پیش کرتی ہیں ۔ ڈاکٹر ممتاز پٹھان نے سندھ کے عرب دور پر مقالہ لکھ کر سندھ یونیورسٹی سے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے ۔ سندھی میں آپ کے تاریخی مقالات رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ خاص طور پر عرب دور اور سندھ اور سامی اقوام کے تعلقات پر آپ کے لکھے ہوئے مقالات قابل ذکر ہیں ۔

اس دور میں سندھی زبان کی تاریخ ، مزاج اور لسانیات پر بھی اہم کام ہوا ہے ۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ کی کتاب ' سندھی بولی جی تاریخ ' شائع ہوئی ہے ، جس میں سندھی زبان کی اصلیت پر بھی بحث ہے اور سندھی زبان کی ارتقائی تاریخ بھی پیش کی گئی ہے ۔ اس کے جواب میں' سراج الحق ' نے ' سندھی بولی ' نامی کتاب لکھی ہے ، جس میں سندھی زبان کی اصلیت پر مختلف نقطہ ہائے نگاہ سے بحث کی گئی ہے ۔ اس کتاب میں زیادہ تر مفروضے ہیں اور اس کا تحقیقی اور علمی معیار پست ہے لسانیات اور سندھی زبان کے لسانیاتی مزاج پر غلام علی الانا اور علی نواز جتوئی نے مقالات بھی لکھے ہیں اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں ۔ غلام علی الانا کی دو کتابیں ' سندھی صورت خطی ' اور ' صوتیات ' شائع ہوئی ہیں ۔ علی نواز جتوئی کی ایک کتاب ' علم لسان اور سندھی زبان ، شائع ہوئی ہے ۔ ان کے علاوہ اس سلسلہ میں عبدالکریم سندیلو اور میمن عبدالمجید سندھی کے بھی چند مقالات شائع ہوئے ہیں ۔

تنقید

تقسیم سے پہلے ہی تنقید رواج پا چکی تھی ۔ عروضی شاعری پر حافظ خیر محمد اوحدی ، حاجی محمود خادم مرحوم ، محمد بخش واصف مرحوم ، ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل تنقید کرتے رہتے تھے ۔ کلاسیکل شاعری پر تجزیاتی تنقید بھی ہوتی رہتی تھی ۔ اس سلسلہ میں علامہ داؤد پوتہ ، ڈاکٹر گربخشانی ، مولانا دین محمد وفائی ، حکیم فتح محمد سیوہانی ، سید میران محمد شاہ ، عطا حسین شاہ موسوی اور عبدالمحسن شاہ موسوی کے نام قابل ذکر ہیں ۔ تقسیم کے بعد بھی یہ صاحبان تنقید اور تبصرہ کرتے رہے ۔ ان کے علاوہ نئے نقاد بھی ابھرے ، جنہوں نے نئے رجحانات اور نئے تقاضوں کے مطابق تنقیدیں کیں ۔

حافظ خیر محمد اوحدی (پ ۔ ۱۹۱۱ء) عروضی شاعری کے بہت بڑے نقاد ہیں ۔ پارسی زبان و ادب میں آپ کو بڑی مہارت حاصل ہے اور علم عروض پر دسترس رکھتے

ہیں ۔ عروضی شاعری پر مفید اور معیاری تنقید کرتے رہتے ہیں ۔ آپ کا انداز جمالیاتی تجزیاتی اور فنی ہے ۔ آپ کی ایک مسلسل اور مفید تنقید کے ساتھ فکری و نظری بحث بھی کرتے ہیں ۔ اس قسم کی تنقید میں ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل کو بھی مہارت حاصل ہے ان کے علاوہ رشید لاشاری ، عطا محمد حامی اور عبداللہ عبد کے نام بھی اس سلسلہ میں آتے ہیں ۔ کلاسیکل شاعری پر تجزیاتی قسم کی تنقید بھی ہوتی رہی ۔ اس قسم کی تنقید تو بہت سے اہلِ قلم نے کی ہے ۔

اس دور میں نقادوں اور ادیبوں میں نظریاتی اور اصولی کشمکش اور بحث رہی ہے ۔ ڈاکٹر خلیل نے ترقی پسند ادب پر فکری اور نظری بحث کی ہے ۔ اس کے علاوہ آپ نے ثابت کیا ہے کہ ترقی پسند ادب میں بے شمار فنی خامیاں ہیں ۔ رشید لاشاری ، علی نواز جتوئی ، اور عبدالکریم لغاری نے ترقی پسند ادب پر سخت تنقیدیں کی ہیں ۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ترقی پسند ادب میں ہندوانہ ذہنیت ، اسلام دشمنی ، ڈاہرزم اور اشتراکیت کے عناصر پائے جاتے ہیں ۔ اس لیے وہ غیر ملکی نظریات کا اشتہار معلوم ہوتا ہے ۔ میمن عبدالمجید سندھی ، شیخ عبدالرزاق راز اور نور شاھین نے بھی ترقی پسند ادب پر تنقیدیں کی ہیں ۔ ان کا انداز سماجی اور تجزیاتی ہوتا ہے ۔ وہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ فن کار انسانی مزاج اور نفسیات کی ترجمانی میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہے ۔ ترقی پسند ادب پر تنقیدیں روز نامہ 'مہران' ، ہفتہ روزہ 'آزاد' کراچی، ہفتہ روزہ 'الخیر' سکھر اور دوسرے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئیں ۔ خاص طور پر روزنامہ مہران نے اس کو ایک مہم کے طور پر چلایا اور ترقی پسند ادیبوں کے قوم دشمن مقاصد اور نقطہ ہائے نظر کو بے نقاب کیا ۔ ان تنقیدوں کے جواب میں غلام محمد گرامی ، اور رسول بخش پلیجو نے روزنامہ ' عبرت ' اور ' خادم وطن ' میں مضامین لکھے لیکن وہ اتنے مؤثر اور قابل اطمینان ثابت نہیں ہوئے ۔ گرامی صاحب نے اس سلسلہ میں ایک طویل مقالہ ' مشرق شاعری کی قدریں اور رجحانات ' کے عنوان سے سہ ماہی 'مہران' میں لکھا ۔ اس پر بھی سخت تنقیدیں ہوئیں اور گرامی صاحب کے نقطۂ نظر کو غلط اور گمراہ کن ثابت کیا گیا ۔ رسول بخش پلیجو نے ترقی پسند ادب کے حق میں ایک کتاب ' اندھا اوندھا ویج ' چھپوا دی ۔ مگر محمد ابراہیم ایک ایسے نقاد ہیں جو ترقی پسند ادب کی حمایت میں لکھتے ہیں اور ایک انتہا پسند طبقے میں مقبول بھی ہیں ۔

ادبیاتِ پشتو ' پنجابی اور سندھی کا مجموعی جائزہ

یہ جلد تین عظیم ادبیات کی مختصر سی تاریخ پر مشتمل ہے ۔ ساڑھے چھ سو صفحات میں سینکڑوں مشاہیر کے کارناموں کا ذکر اور محاسبہ ایک محال امر تھا ۔ اس لیے بھی کہ تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ادب کے عوامل و محرکات ، اس کا فکری تار و پود اور اس کے جذباتی عناصر کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے معاشرہ کے تقاضوں ، اس کی اقدار ، اس کے شعارِ زندگی اور فلسفۂ حیات کو سمجھنا ضروری ہے ، کیونکہ ہر ادب اپنے معاشرہ کی ترجمانی کرتا ہے ۔

ایک اور مشکل جو ہمیں درپیش تھی یہ ہے کہ پشتو ، پنجابی اور سندھی ادبیات ایک ایسے خطۂ زمین کے مختلف حصوں سے متعلق ہیں ، جو بہت سی تہذیبوں کا مدفن ہے اور یہ سارا علاقہ جسے دریائے سندھ کا طاس کہا جا سکتا ہے ، بے شمار فاتح قوموں کا مرکزِ توجہ رہا ہے ۔ چنانچہ یہ تینوں زبانیں بہت سے قدیم اثرات کی حامل ہیں ۔ اس کے علاوہ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے بعد یہ آریائی قوم کا صدیوں تک وطن رہا ۔ پھر یہاں ایرانی فاتح جو ہخامنشی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ، دو اڑھائی سو سال تک حکمران رہے ۔ اس کے بعد یونانی تہذیبی اثرات نے یہاں اپنے نشان چھوڑے ۔ اس کے عقب میں آنے والی کشان قوم نے یہاں وہ تہذیب پیدا کی جو گندھارا کے نام سے یاد کی جاتی ہے ۔ پھر اس سر زمین نے ہندو تہذیب کا عروج و زوال دیکھا ۔ اس کے پیچھے ہن ، گرجارا اور وسط ایشیا کی بہت سی اقوام نے یہاں قدم رکھا ۔ چنانچہ ان سب لوگوں کی زبانوں نے اس سر زمین کی زبان و لہجہ پر گہرے اثرات مرتسم کیے ۔ پھر عرب ، ترک ، افغان ، مغل ، ایرانی ، تورانی اقوام یہاں آئیں اور اپنے رسوم ، اپنے آئین ، اپنے شعار ، اپنی روایات اور اپنے اپنے ذخیرہ ہائے الفاظ سے اس سرزمین کی تہذیب میں رنگ بھرے ۔ لہذا یہ تینوں زبانیں اگر قدامت کا دعویٰ کریں تو حق بجانب ہوں گی ۔

مشکل فقط اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ اگرچہ یہ زبانیں بہت قدیم ہیں مگر ان کے قدیم ادبیات کی نشاندہی کرنا آسان نہیں اور نہ ہی اس باب میں کوئی مستند

تحقیق ہوئی ہے حتیٰ کہ پشتو ، پنجابی یا سندھی ادبیات کی کوئی میر حاصل لسانی یا ادبی تاریخ بھی نہیں ملتی ۔ اس لیے ہماری کاوشیں اگر نقشِ اولیں نہیں اور نہ نقشِ کامل، تو کم از کم اس لحاظ سے قابل قدر ضرور ہیں کہ ہم نے ادبی اور تنقیدی اقدار کو پیش نظر رکھتے ہوئے ، اپنے قارئین کے لیے ایک جامع تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ امید ہے کہ ہماری محنت قبولیت کا شرف حاصل کرسکے گی ۔

ہمیں اس تحقیق کے دوران میں اس امر کا احساس ہوا کہ اگر ان ادبیات کا کامل محاسبہ کیا جائے تو نظر آئے گا کہ کئی باتوں میں یہ برِّصغیر کی دیگر زبانوں اور ادبیات سے کسی طرح کم نہیں ، بلکہ تنوّع اور توانائی ، گہرائی اور صداقتِ اظہار میں یہ بہت سے ادبیات سے بہتر ہیں ۔ مثلاً تصوّف ہی کو لیجیے ۔ ان تینوں زبانوں میں جو صوفی شاعر ہو گزرے ہیں ، ان جیسا یا ان کے ہم پایہ شاعر اردو اور بنگالی میں بھی نہیں ۔ پشتو میں رحمان بابا اور انصاری ، پنجابی میں لال حسین سلطان باہو، 'بلھے شاہ' ، ہاشم شاہ، غلام فرید ، سندھی میں عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست ایسے عشاق الٰہی ہوئے ہیں جن کے جذب و مستی اور والہانہ شیفتگی کی مثال برِّصغیر کی کسی زبان میں نہیں ملتی ۔ اس کے علاوہ منظوم داستانیں بھی انہی ادبیات کی خصوصیت ہیں ۔ پشتو میں موسیٰ خان گل مکئی ، آدم درخانئی یا یوسف کڑہ مار ، پنجابی میں ہیر رانجھا ، مرزا صاحباں ، پورن بھگت ، سوہنی مہینوال ، سسی پنوں ، سندھی میں عمر ماروئی ، مومل رانو یا لیلیٰ چنیسر ایسی نظمیں ہیں جن سے اس معاشرہ کی پوری تصویر سامنے آ جاتی ہے ۔ یہ نظمیں ایک مربوط اور مستحکم معاشرہ کی نشاندہی کرتی ہیں جس سے ان لوگوں کی قدامت اور استقامت کا پتہ چلتا ہے ۔ ایسی نظمیں جو معاشرہ کی تمام اقدار کی عکاسی کریں کسی اور ادب میں نہیں ملیں گی ۔ تیسری بات جو ہمیں ان ادبیات میں قدرِ مشترک کے طور پر ملتی ہے وہ یہاں کے گیت ہیں ۔ یہ گیت کئی ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں مگر ان میں جو صداقت اور بداہت ، جو سوز اور تڑپ پائی جاتی ہے وہ بھی مغربی پاکستان کے لوگوں کی گہری جڑوں کا پتہ دیتی ہے ۔ غرض یہ کہ ان تینوں ادبیات کے مطالعہ سے ایک جی دار قوم کے مختلف عناصر و اجزا کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے ۔

یہ درست ہے کہ ایک جلد میں اتنے عظیم ادبیات کا ذکر کرنا مشکل تھا ، مگر ہمیں امید ہے کہ اس تعارف سے یہ فائدہ ہو گا کہ ان ادبیات کا تقابلی جائزہ لیا جا سکے گا اور یہ دیکھنا ممکن ہو گا کہ جس ملّی و ملکی ثقافت کی بنا پر پاکستان وجود میں آیا تھا، اس کی اقدارِ مشترک ادبیات میں کہاں اور کس قدر ملتی ہیں ۔ ہمارا مطالعہ

یہ بات واضح کرتا ہے کہ ان ادبیات کے فکری اور جذباتی عوامل میں بہت مماثلت ہے اور بنیادی طور پر یہ ملتِ اسلامیہ کی ایک پہلودار تصویر پیش کرتے ہیں ؛ جن کے پہچاننے سے ہم پاکستانی قوم کی کلچرل وحدت کو صحیح طور پر قائم کر سکتے ہیں۔ اس ثقافتی وحدت کے باوجود ، ان تینوں ادبیات کے پس پشت ایسے عوامل بھی ہیں ، جن کی وجہ سے ان ادبیات میں انفرادیت کا رنگ واضح طور پر موجود ہے ۔ آپ پشتو ادب کو ملاحظہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں ایک خاص قسم کی توانائی ، اعتماد ، خود شناسی اور بے باکی پائی جاتی ہے ۔ یہ خصوصیات ہمیں پشتو کے گیتوں میں بھی ملتی ہیں اور پشتو شعراء کی غزلوں اور نظموں میں بھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ادب کے پیدا کرنے والے انفعالیت کا کبھی شکار نہیں ہوئے ۔ وہ زندگی کے تقاضوں کا بڑے حوصلہ سے مقابلہ کرتے ہیں اور اسلام کے فدائی ہیں ۔ اس ادب میں ہمیں گھریلو زندگی کی جھلکیاں کم نظر آتی ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بقول علامہ اقبال ، وہ مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کرنے کے زیادہ خواہشمند رہے ہیں ۔ یہ شاید اس لیے بھی ہو کہ ان کے علاقے میں متمدن زندگی اتنی قدیم نہیں جیسے مغربی پاکستان کے اور علاقوں میں ، یا یہ سرحد کے رہنے والے ہمیشہ نوواردوں سے برسرپیکار رہنے کے باعث اپنے اندر ایک ایسی برق قوت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو انہیں جزئیاتِ حیات سے بے نیاز کر دیتی ہے ۔

برعکس اس کے پنجابی ادب میں ٹھہراؤ زیادہ پایا جاتا ہے ۔ پنجاب کی داستانیں رزمیہ بھی ہیں ('مرزا صاحباں') ، بزمیہ ('سوہنی مہینوال' ، 'ہیر رانجھا') بھی اور خالصۃ علامتی بھی 'پورن بھگت' ، 'سیف الملوک' مگر ان سب میں ایسا نقطہ ساکن ملتا ہے جس کے گرد ایک پورے معاشرے کی اقدار ، اس کے تقاضے ، اس کے مشاغل اور اس کے جزئی لوازمات گردش کرتے ہیں ۔ پھر 'سیف الملوک' سے لے کر 'سسّی پنوں' تک کوئی منظوم رومان ایسی نہیں جو اپنے اندر کچھ نہ کچھ ماورائیت نہ رکھتی ہو ۔ چنانچہ ان داستانوں کے اکثر کردار ملت سے علامتی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ۔ اگر ہم حضرت لال حسین (م-۱۵۹۹ء) کی کافیوں میں رانجھا یا رانجھن اور ہیر اور کھیڑے ، خیر و شر ، مبداء و معاد ، انسانی روح اور حقیقتِ کل ، روح کی لگن اور تسکین ، وصالِ حق ، اور نور و ظہور کے بیان کے لیے علامت کے طور پر دیکھ سکتے ہیں تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پنجابی رومان چند ایک ایسے نقوشِ اولیں کے حامل ہیں ' جن سے ہر دور کے شعراء اپنے ذہن و تخیل کے لیے نئے معانی و مفاہیم پیدا کر لیتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ رومانیں شعراء کے لیے ایک چیلنج بن جاتی ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ بیسیوں نامور شعراء نے اپنے تجربۂ حیات

کو انہی رومانوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے ۔ کیا اس سے یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ یہ رومانیں (خصوصیت سے ہیر رانجھا ، سوہنی مہینوال سسی پنوں ، یوسف زلیخا) ہمارے معاشرے کی ابدی خصوصیات کو اجاگر کرتی ہیں ۔ مثلاً ایک بات جو ان سب داستانوں میں مرزا صاحباں سے لے کر سسی پنوں تک ، ماسوا پورن بھگت کے کیونکہ پورن بھگت ایک ایسی سطح پر لکھی گئی ہے ، جس میں معاشرے کے عام جذباتی ، ذاتی یا اجتماعی تقاضے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے) ملتی ہے، یہ ہے کہ ان کے ہیر (یعنی بطل قصہ) اور ہیروئن، یعنی اس کی محبوبہ میں بالآخر دائمی فراق یا وصال ہو یا نہ ہو ، وہ اس زندگی میں وصال سے خواہ وہ کتنا ہی تھوڑا کیوں نہ ہو، محروم نہیں رہتے ۔ وہ من تن ، دھن نثار کر کے وصال حاصل کرلیتے ہیں ۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس زبان کے بولنے والوں کی بنیادی خصوصیت استقلال ہے ۔ جیسے پشتو والوں کی بنیادی خصوصیت حریت معلوم ہوتی ہے ۔ یوں پنجابی شاعر و ادیب زمین سے زیادہ قریب بھی ہے۔ معاشرہ کی تصویر کشی میں وہ ارضی ، جنسی بلکہ نجی معاملات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا ۔ چنانچہ موجودہ دور کے شعراء روزمرہ کی زندگی اور دیگر معاشرتی تقاضوں کے ساتھ جزئیات نگاری پر خاص توجہ دیتے ہیں اور تشبیہہ و استعارے میں تو وہ خاص طور پر مقامی اور دیسی مشاہدات ہی کو جزو تخیّل بناتے ہیں ۔

سندھی ادب اور پنجابی ادب میں بہت کافی مماثلت نظر آتی ہے ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان علاقائی تہذیبوں کا مخرج وادیٔ سندھ کی پرانی تہذیب ہے ، اور سیاسی نقطۂ نظر سے بھی ان میں صدیوں تک وحدت کار فرما رہی ہے ۔ چنانچہ رومان نگاری اگرچہ پشتو ، پنجابی اور سندھی تینوں ادبیات میں ایک مقتدر مقام رکھتی ہے مگر پنجابی ادب اور سندھی ادب میں اس کا مقام غالب ہے ، اسی طرح صوفیانہ شاعری میں دونوں ادبیات کسی ادب سے پیچھے نہیں ۔ یہ ٹھیک ہے کہ دونوں ادبیات میں خوشحال خان خٹک جیسا مرد میدان شاعر پیدا نہیں ہوا ، اور سندھی رومانوں میں وہ وسعت بساط اور جزئیات سے دلچسپی نہیں جو وارث شاہ جیسے شاعر کی نظم میں پائی جاتی ہے اور نہ کسی اور صوفی شاعر میں بلھے شاہ جیسی عشق حقیقی کی سرمستی اور وصال حق کی تجلّی ملتی ہے ، مگر حضرت عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست رح جیسے بزرگوں کی علمیت و فضیلت اور طلب حق کی دلآویزیاں ، لذات روحانی کی سرشاریاں اور دوسرے شعراء اور ادباء کی حب الوطنی اور احیائے ملت کی کوششیں اور کسی ادب میں کم پائی جاتی ہیں ۔

گویا یہ کہنا درست ہوگا کہ پشتو ، پنجابی اور سندھی ادبیات میں توانائی اور

پہنائی کے علاوہ اس قدر جوشِ نمو ہے کہ ہم اس امر کی طرف سے مطمئن ہو سکتے ہیں کہ یہ ادبی سوتے خشک نہیں ہوں گے۔ بلکہ دن بدن جو افزونی ان میں لظر آتی ہے اور ہیئت اور موضوع کے جو تجربات پشتو ، پنجابی اور سندھی میں ہو رہے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبیات ایک دن دلیائے ادب میں اعلٰی مقام حاصل کرلیں گی ۔

مدیر عمومی

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹	۱٦	فسم	قسم
۱۱	فٹ نوٹ نمبر ۲	ماخوز	ماخوذ
۱۲	۱۷	بہ الفاظ	بہ الفاظ
۲۰	۳	واضع	واضح
۲۳	فٹ نوٹ نمبر ۳	کیسرو	کیرو
۲۳	۱۰	رسم خط	رسم الخط
۲۸	۷	محاورں	محاوروں
۵۹	۳	واضع	واضح
۱۰۸	۸	بہ	بہ
۱۰۹	۲۳	دوسرں	دوسروں
۱۱۸	فٹ نوٹ نمبر ۱	۱۱۹۵ء	۱۱۹۵ھ
۱۲۳	۸	۱۱۹٦ء اور ۱۲۰۳ء	۱۱۹٦ھ اور ۱۲۰۳ھ
۱۲٦	۲۰	(۱۱۸٦ء - ۱۲۰۷ء)	(۱۱۸٦ - ۱۲۰۷ھ)
۱۲۷	۳	(ز - ۱۷۸۲ء)	(م - ۱۷۸۲ء)
۱۲۷	۱۲	۱۷۵۲ء	۱۷۸۲ء
۱۲۹	۱۱	ڈنکوں	ڈنگوں
۱٦۳	۱۷	تعرجمہ	ترجمہ
۱٦۵	۲	گر	اگر
۲۰۵	۲۵	پنجاب اردو	پنجاب میں اردو
۲۳۳	۱۱	سولھویں میں	سولھویں صدی میں
۲۳۹	۱۰	(پ ۔ ۸۷٦ء)	(پ - ۱۸۷٦ء)
۲۴۳	۲۱	(م - ۱۷۱۲)	(م - ۱۷۰۲ء)
۲۴۵	۱	چو معرعہ	چو مصرعہ
۲۴٦	٦	گاہ	گناہ
۲۵۸	۱۱	امیر خسرو (۱۲۵۳ء - ۱۳۲۵ھ)	(۱۲۵۳ء - ۱۳۲۵ء)
۲۸۰	۱	کوئی	کوئی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۸۸	۳	ات الہی	ذات الہی
۲۸۸	۱۴	سالی	رسائی
۳۰۲	۱۷	ںتدریج	بتدریج
۳۰۹	۱۵	(م - ۱۷۷۱ء)	(م - ۱۷۷۷ء)
۳۲۶	۱۵	چانچہ	چنانچہ
۳۳۴	۲	جوابوں	خوابوں
۳۵۲	۱۰	جس	جن
۳۶۳	۱۳	(۱۵۳۷ - ۱۸۹۰ء)	(۱۸۳۷ء - ۱۸۶۰ء)
۳۶۶	۱۳	پکڑ	پکڑے
۳۷۵	۲۵	باجود	باوجود
۳۸۴	۱۹	ماں سنگھ	میاں سنگھ
۴۲۴	۲	پدنڈی	پانڈی
۵۲۵	۵	بنگا	بنگلہ
۴۳۵	۱۵	(۱۱ - ۱۲ء)	(۱۱ء - ۷۱۲ء)
۴۳۶	فٹ نوٹ نمبر ۱	مطبووعہ	مطبوعہ
۴۳۷	۱۹	(۵۳ء - ۸۰۲ء تک)	(۷۵۳ء - ۸۰۲ء)
۴۳۸	۲۶	ثفافتی	ثقافتی
۴۴۵	۱۵	لام	نام
۴۸۰	۲۲	اگے	آگے
۴۸۲	۱۶	مثلا	مثلاً
۴۹۱	فٹ نوٹ نمبر ۱	تحفتہ الکرام	تحفة الکرام
۴۹۶	۴	پہنچاے	پہنچے
۵۰۱	۲۲	تاغ	تاریخ
۵۰۷	فٹ نوٹ نمبر ۱	تحفہ الکرام	تحفہ الکرام
۵۴۱	۲۲	(۱۷۲۶ء - ۱۲۳۲ھ)	(۱۷۲۶ء/۱۲۳۲ھ)
۵۴۵	۶	(م - ۱۸۵۲ء/۱۶۲۹ھ)	(م - ۱۸۵۲ء/۱۲۶۹ھ)
۵۴۷	۱۱	قوسف	یوسف
۵۴۷	۲۰	(م - ۱۸۲۰ء)	(م - ۱۸۴۰ء)
۵۴۸	۸	(۱۸۴۶ء/۱۶۲۳ء)	(۱۸۴۶ء/۱۲۶۳ھ)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۵۷	۲۱	راشدیہ بھی	راشدیہ سے بھی
۵۶۲	۲۰	(م - ۱۲۷۹ء)	(م - ۱۲۷۹ھ)
۵۶۶	۸	آحری	آخری
۵۶۸	۱۳	بڑھتے	بڑھنے
۵۸۰	۱۳	۱۷۵۳ء	۱۸۵۳ء
۵۸۲	۵	وباره	دوباره
۵۸۳	۲۰	فراض	فرائض
۵۸۳	۱۳	ابیاب	ابیات
۵۸۵	۱۹	بیت	بیعت
۵۹۲	۳	روپے	دوپے
۵۹۳	۷	۱۱۸۱ء	۱۷۸۱ء
۹۷۵	۱۱	آخود	آخوند
۶۲۰	فٹ نوٹ نمبر ۲	آیادی	آبادی
۶۲۰	فٹ نوٹ نمبر ۲	فلفے	فلسفے
۶۳۳	۳	بعھ	بعد
۶۳۳	۳	شیخ ، لیکن	لیکن شیخ عبدالرزاق نے
۶۳۳	۱۳	ادلی	ادبی
۶۳۳	۲۰	کامی	کافی
۶۳۵	۱۹	ترجالی	ترجمانی
۶۳۶	۹	آرمائی	آزمائی
۶۳۹	۱۶	مزاح	مزاج
۶۵۰	۸	تالیور	تالپور
۶۵۷	۱۸	خالصتہ	خالصتہً